حیاتِ طیب رح

فلنحیینہ حیوۃ طیبۃ

اضافہ شدہ ایڈیشن

بیسویں صدی میں قرونِ اولیٰ کے علمی کمالات دینی افکار اور مثالی سیرت و اخلاق کی حامل
ایک ممتاز دینی شخصیت ایشیا کی مثالی دینی دانش گاہ دارالعلوم دیوبند کے طویل المیعاد اور مثالی
مہتمم، فکرِ ولی اللہی کے نقیب، حکمتِ قاسمیہ کے شارح، مسلکِ دیوبند کے ترجمان

حکیم الاسلام حضرت مولانا

محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ

سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند

کی حیاتِ مبارکہ و خدماتِ جلیلہ کا مفصل جائزہ

حسبِ ایماء

خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی قدس سرہ

سابق مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند

نگرانی

حضرت مولانا محمد سفیان صاحب قاسمی مدظلہ

مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند

ترتیب

غلام نبی قاسمی

سابق استاذ حدیث دارالعلوم وقف دیوبند

محمد شکیب قاسمی

نائب مہتمم و ڈائریکٹر حجۃ الاسلام اکیڈمی

دارالعلوم وقف دیوبند

باہتمام

حجۃ الاسلام اکیڈمی

دارالعلوم وقف دیوبند

فَلَنُحْيِيَنَّهُ حَيٰوةً طَيِّبَةً

حیاتِ طیب

اضافہ شدہ ایڈیشن

بیسویں صدی میں قرونِ اولیٰ کے علمی کمالات دینی افکار اور مثالی سیرت و اخلاق کی حامل ایک ممتاز دینی شخصیت ایشیا کی مثالی دینی دانش گاہ دار العلوم دیوبند کے طویل المیعاد اور مثالی مہتمم، فکرِ ولی اللہی کے نقیب، حکمتِ قاسمیہ کے شارح، مسلکِ دیوبند کے ترجمان

حکیم الاسلام حضرت مولانا

محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ

سابق مہتمم دار العلوم دیوبند

کی حیاتِ مبارکہ و خدماتِ جلیلہ کا مفصل جائزہ

حسبِ ایماء

خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی قدس سرہ

سابق مہتمم دار العلوم وقف دیوبند

باہتمام

حجۃ الاسلام اکیڈمی

دار العلوم وقف دیوبند

نگرانی

حضرت مولانا محمد سفیان صاحب قاسمی مدظلہ

مہتمم دار العلوم وقف دیوبند

ترتیب

غلام نبی قاسمی

سابق استاذ حدیث دار العلوم وقف دیوبند

محمد شکیب قاسمی

نائب مہتمم و ڈائریکٹر حجۃ الاسلام اکیڈمی
دار العلوم وقف دیوبند

۲

حیاتِ طیب
جلد دوم

ترتیب : غلام نبی قاسمی / محمد شکیب قاسمی

طبع اولیٰ : ۱۴۳۵ھ-۲۰۱۴ء
طبع دوم : ۱۴۴۳ھ-۲۰۲۲ء (اضافہ شدہ ایڈیشن)

باہتمام : حجۃ الاسلام اکیڈمی، دارالعلوم وقف دیوبند، سہارنپور، یوپی، الہند

Composed by : Umar Ilahi

ISBN : 978-93-84775-22-3

Hujjat al-Islam Academy
Aljamia Al-Islamia Darululoom Waqf Deoband
Eidgah Road, P.O. 247554, Deoband
Distt. Saharanpur U.P. INDIA
Tel : +91-1336-222352, Mob: +91-9897076726
Email : hujjatulislamacademy2013@gmail.com
hujjatulislamacademy@dud.edu.in
Website : http://www.dud.edu.in
Printed at: Al Huda Printer, Delhi

فہرست مضامین

بابِ سوم

............❖............

فکرِ اسلامی کی تشکیل جدید

آج جس کی ضرورت ہے وہ صرف یہ ہے کہ منہاجِ نبوت کو سمجھ کر فکرِ اسلامی کو ایک نئی ترتیب اور نئے رنگِ استدلال سے آج کی زبان اور اسلوب سے مرتب کیا جائے کہ حقیقی معنی میں فکر اسلامی کی یہی تشکیل جدید ہوگی، ورنہ منہاج اور اس کے متوارث ذوق سے ذرا بھی ہٹ کر تشکیل ہوگئی تو وہ تشکیل نہ ہوگی بلکہ تبدیل ہو جائے گی، جو قلبِ موضوع ہوگا۔ اس لئے تشکیل جدید کا خلاصہ دو لفظوں میں یہ ہے کہ ’’مسائل ہمارے قدیم ہوں اور دلائل جدید کہ یہ تشکیل قائم کر کے ہم خلافتِ الٰہی اور نیابتِ نبویؐ کا حق ادا کر سکیں‘‘۔ (حضرت حکیم الاسلامؒ)

باب سوم

حوادث دہر تیری شہرت نہ زندگی بھر مٹا سکیں گے
ترے قدم کی بلندیوں کو عروج والے نہ پا سکیں گے

نواسنجِ انا الحق

اے نواسنجِ انا الحق! ترا کہنا تھا بجا
پر نہیں پاسِ ادب، عشق میں دعویٰ ہونا

ہے انا عشق میں، اک رازِ درونِ پردہ
پر نہیں راز کا حق، راز کا افشا ہونا

عشق خود دار ہے، خود رازِ درونِ عشاق
عشق کی خامی و رسوائی ہے، لب وا ہونا

شور برپا نہ ہو، ہر ایک بلا برسر
یاں ہے برسر ہی ہنر، عیب ہے برپا ہونا

اپنے آپے میں خودی ہو، تو خودی ہے ورنہ
اپنے آپے سے گذرنا ہی ہے، رسوا ہونا

غیرتِ عشق ہے، اسرارِ خودی ہوں خاموش
نہ کہ اسرارِ خدا تک سے بھی گویا ہونا

(حضرت حکیم الاسلامؒ)

............❖............

ہدیۂ تشکر

''حیات طیبؒ'' کے اس جزء میں حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کی حیات وخدمات پر مشاہیر علماء وارباب قلم کی نگارشات پیش کی گئی ہیں، بہ ایں ہمہ حضرت حکیم الاسلامؒ جیسی ہمہ جہت شخصیت کے بعض اہم گوشوں پر تشنگی کا احساس ہوتا ہے مگر کیا کیجئے ۔

طرفیں رکھے ہے ایک سخن ور چار چار
کیا کیا کہا کریں ہیں زبان وقلم سے

بڑی ناسپاسی ہوگی اگر مقالہ نگار حضرات میں سے رفتگاں کے حق میں دعاء **اللّٰھم اغفرھم واکرم مثوٰھم** اور پائندگان کے لئے تہ دل سے شکریہ نہ ادا کیا جائے۔

حکیم الاسلامؒ کی حیات وخدمات پر ملک وبیرونِ ملک سے اہل علم واہل قلم بالخصوص حلقۂ دیوبند سے تعلق رکھنے والے احباب وفضلائے دارالعلوم کی قلمی کاوشیں بڑی تعداد میں حجۃ الاسلام اکیڈمی کو موصول ہوئیں مگر افسوس ہے کہ ہم ان میں سے ''حیات طیب'' کے معیار کو سامنے رکھتے ہوئے چند ایک ہی کو شامل اشاعت کر سکے ہیں۔

اس موقع پر ہم ''حکیم الاسلام عالمی سیمینار'' بمقام دارالعلوم وقف دیوبند پر موصول شدہ بعض مقالات جو ہمیں دفتر ماہنامہ ''ندائے دارالعلوم وقف دیوبند'' سے بذریعہ جناب محترم مولانا عبداللہ ابن القمر الحسینی دستیاب ہوئے ان کے لئے مولانا موصوف کے تہہ دل سے ممنون ہیں۔

............❖............

نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحبؒ

حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ کی شخصیت زمانی رقبہ کے لحاظ سے بھی بہت وسیع اور جامع تھی، اور معنوی رقبہ کے لحاظ سے بھی، زمانی رقبہ تو ۸۸؍سال کا ہے، جس میں سے ابتدائی زمانہ نکال دیا جائے تو بھی ۷۰؍سال کے قریب ہوتے ہیں، معنوی رقبہ اس لئے وسیع ہے کہ علم وفضیلت، بصیرت، وسعتِ علم اور علم کی پختگی و رسوخ، خدمت دین اور اس کے ساتھ اصلاح و وعظ و ارشاد، عوام سے رابطہ، تربیت و دعوت و بیعت وارشاد، ان سب پہلوؤں اور گوشوں پر ان کی زندگی محیط تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ شاید (کم سے کم ہندوستان میں) کسی علمی و دینی شخصیت کو کم ایسی ہر دل عزیزی، عام شہرت ومقبولیت اور مختلف دینی اداروں اور جماعتوں کا اعتماد حاصل ہوا ہوگا جو ان کو حاصل تھا، اس کے ساتھ ان کو طویل عرصہ تک دارالعلوم دیوبند جیسے عظیم وجلیل اور بین الاقوامی شہرت کے ادارہ کی خدمت اور ترقی کا موقعہ ملا ان کے اس عام مقبولیت اور جامعیت اور ان کی ذات کے اختلاف سے بہت حد تک بالاتر ہونے ہی کا نتیجہ تھا کہ آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کی صدارت کے لئے (جو ہندوستان کے مختلف الخیال گروہوں، دینی جماعتوں اور اداروں کا نمائندہ ہے) روز اول سے ان کی وفات کے دن تک ان سے زیادہ موزوں اور متفق علیہ صدر نظر نہیں آیا، اور وہ اس عہدہ پر باتفاق آراء اس کے قیام کے پہلے دن سے وفات کے دن تک صدر رہے۔

ان کو نبیرۂ بانیٔ دارالعلوم دیوبند حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ ہونے کی نسبت گرامی کا شرف حاصل تھا اور وہ نصف صدی تک مسلسل اس مؤقر اور عظیم ادارہ کے منصب اہتمام پر فائز رہے اور ان کے دورِ اہتمام میں اس ادارہ نے ایسی ترقی کی جو اس کے ابتدائی دور کے دیکھنے والوں کے

خواب وخیال میں بھی نہ تھی، انھوں نے بڑے بحرانی موقعوں پر اس ادارہ کی حفاظت اور رہنمائی کی، انھوں نے اپنا نام اور زندگی اس ادارہ کے نام اور اس کی زندگی سے وابستہ کر دی تھی کہ ان میں سے ایک کا تصور دوسرے کے ساتھ آتا تھا۔

انسان کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے خلاف سننے کی صلاحیت رکھتا ہو اور سخت سے سخت بات برداشت کرے، راقم نے حکیم الاسلامؒ کو اس معاملہ میں بہت عالی ظرف اور قوی الارادہ پایا، واقفیت رکھنے والے پورے حلقہ میں یہ بات مسلمات میں سے ہے کہ حکیم الاسلامؒ نہایت کریم النفس، بڑے شیریں اخلاق، نرم خو اور نرم گفتگو تھے، اقبال نے جو کہا ہے:

''نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو'' یہ تعریف حکیم الاسلامؒ پر صادق آتی ہے۔ حکیم الاسلامؒ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے دارالعلوم دیوبند کو ایک ہر دل عزیز ادارہ بنایا اور دارالعلوم کو بغیر کسی اختلاف کے عوام سے متعارف کرایا، اور ان کا اس سے تعلق پیدا کیا، تقسیم سے پہلے تحتی برّ اعظم کے دورے کئے، تقسیم کے بعد پاکستان بار بار گئے، جنوبی افریقہ کا دورہ کیا، انگلستان گئے اور آخر میں امریکہ گئے۔

حکیم الاسلامؒ عوام کی اصلاح اور وعظ وارشاد میں شیخ وقت حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کے متبع تھے، حسن تقریر اور دعوتی و اصلاحی رنگ ان کا امتیاز تھا جس سے ہزاروں انسانوں کو فائدہ پہونچا، ہزاروں دلوں میں دین کے احترام کا جذبہ اور علماء کے متعلق حسن ظن پیدا ہوا، ایسا خوش بیان مقرر و واعظ وسیع المعلومات اور نورانی شکل کا عالم مشکل سے دیکھنے کو ملتا ہے، جس پر پہلی نظر پڑتے ہی قلب شہادت دیتا کہ یہ فطرتاً معصوم ہیں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان میں ضرر پہونچانے کی صلاحیت ہی نہیں ہے، ایسے بے ضرر انسان کی اس خوبی یا کمزوری سے لوگ غلط فائدہ اٹھاتے ہیں اور عزل ونصب کا بھی وہ نشانہ بن جاتا ہے۔

حکیم الاسلامؒ نہایت متین و باوقار شخص اور تواضع واخلاق کا پیکر تھے، اسی کے ساتھ پرشکوہ اور باوقار بھی، حکیم الاسلامؒ ندوۃ العلماء کے بھی ایک مقتدر رکن تھے، اور اس کے کارکن اور ذمہ داران کا بزرگوں کی طرح احترام کرتے تھے، آخری بار آپ اسلامک اسٹیڈیز کانفرنس میں شرکت کے لئے ندوہ آئے اور تقریر فرمائی، دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کا رکن ہونے کی بناء پر بھی راقم کو حکیم الاسلامؒ سے نیاز حاصل ہوتا رہا، اور ہم نشینی کا شرف، بعض مرتبہ ان کو سخت تبصرہ اور تنقید سننی پڑی اور انھوں نے عالی ظرفی اور کریم النفسی کے ساتھ اس کو برداشت کیا، ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ ایک سخت جملہ انھوں نے سنا اور کچھ جواب نہیں دیا، ان کے بعض اہل تعلق سے معلوم ہوا کہ اس کے صدمہ سے ان کو بخار آ گیا۔

حکیم الاسلامؒ خانوادۂ بانی دارالعلوم دیوبند کے چشم و چراغ تھے، اور راقم سطور حضرت سید احمد شہیدؒ کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے جن سے مولانا نانوتویؒ اور مولانا گنگوہیؒ کا تعلق عقیدت کا نہیں بلکہ عشق کا تھا، اور اس کا اندازہ راقم سطور کے والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی صاحبؒ (سابق ناظم ندوۃ العلماء) کی کتاب ''دہلی اور اس کے اطراف'' سے ہوسکتا ہے۔ جس میں مولانا نے اپنے دیوبند اور گنگوہ کی حاضری اور وہاں کے بزرگوں اور قابل احترام ہستیوں کے سید صاحب کے ساتھ اظہار عقیدت و محبت کا تفصیل سے تذکرہ کیا ہے، حکیم الاسلامؒ کے وفات سے چند دن پہلے جب لکھنؤ میں ایک تقریب میں (جس میں ان کو کسی ادارہ یا مکان کے سنگِ بنیاد رکھنے کی زحمت دی گئی تھی) ملاقات و مصافحہ کا شرف حاصل ہوا، مصافحہ کرتے وقت فرمایا کہ کچھ دن آپ کے ساتھ رائے بریلی رہنے کو جی چاہتا ہے۔ و کفی به شرفاً.

افسوس ہے کہ ۶ر شوال ۱۴۰۳ھ مطابق ۱۷ر جولائی ۱۹۸۳ء کو انھوں نے اس دنیائے فانی کو الوداع کہا، اور اپنے اسلاف کرام سے جا ملے، جن کی خدمت دین اور اصلاح مسلمین کی یادگاریں ہندوستان بھر میں پھیلی ہوئی ہیں۔ وَحَسُنَ اولئك رفیقاً.

............❖............

عہد ساز شخصیت اور ترجمان

حضرت مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانیؒ

سابق رکن شوریٰ دارالعلوم دیوبند

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کے وصال سے ایک عہد کا خاتمہ ہو گیا، ان کی شخصیت ایک ایسی کڑی تھی جو حال کو ماضی سے جوڑتی تھی اور جنھیں دیکھنے سے اسلاف اور اکابر کی یاد تازہ ہوتی تھی، ان خیالات کا اظہار امیر شریعت حضرت منت اللہ صاحبؒ نے اپنے تعزیتی پیغام میں فرمایا ہے ،آپ نے لکھا ہے کہ حضرت حکیم الاسلام کو خدائے تعالیٰ نے قرآن وحدیث پر گہری نظر دی تھی، وہ اسلام کے اصول واساس، فلسفہ وحکمت کے رمز شناس تھے، اور انہیں علم وحکمت کی تشریح وتفصیل، اظہار وبیان کی بے پناہ صلاحیت دی گئی تھی، مشکل سے مشکل موضوع پر وہ گھنٹوں اتنے آسان اور دل نشین انداز میں اظہار خیال فرماتے تھے کہ سننے والے کے دل میں بات اترتی چلی جاتی تھی، اپنی اس صلاحیت اور خصوصیت کے لحاظ سے وہ منفرد شخصیت کے مالک تھے، ان کے وصال سے دنیا اسلام کے سب سے بڑے ترجمان سے محروم ہو گئی۔

حضرت امیر شریعت نے تحریر فرمایا ہے کہ ان کی شخصیت عہد ساز تھی، انھوں نے ''مدرسہ اسلامی عربی'' دیوبند کو ترقی دی، اور دارالعلوم دیوبند بنا دیا، دیوبند کے مدرسے کا یہ علمی، دینی اور انتظامی سفر حضرت حکیم الاسلام کی سربراہی میں طے ہوا، وہ تقریباً ۶۵ رسال تک اس ادارہ کے سربراہ رہے، اس طویل عرصے میں مختلف صلاحیتوں وخصوصیتوں کے حامل مختلف ممالک کے ہزاروں طلبہ عالم دین بنے اور اس طرح انھوں نے براہ راست ہندوستان اور دوسرے ممالک کے دینی، سیاسی اور سماجی ماحول پر اثر ڈالا ہے خود حضرت حکیم الاسلامؒ کے خطبات اور مواعظ نے علماء اور دانشوروں کو متاثر کیا ہے اور ملک کے دینی ماحول کی تیاری

اور سماجی اصلاح کے کام میں ان کا اہم حصہ رہا ہے، اس طرح ان کی ذات نے اس پورے عہد کو متاثر کیا ہے، جس میں ہم زندگی گزار رہے ہیں۔

حضرت امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانی نے فرمایا ہے کہ اسلام پر کسی بھی پڑنے والی آنچ کو دور کرنے کے لئے وہ برابر آمادہ رہتے تھے، مسلم پرسنل لاء میں ترمیم کا مسئلہ اٹھا تو انھوں نے دیوبند میں ابتدائی غور وفکر کے لئے اجلاس طلب کیا، اور پھر ممبئی پہنچ کر مسلم پرسنل لاء کنونشن کے لئے فضاء ہموار کی اور ۷۲ء میں وہ تاریخی کنونشن ہوا، جس نے عوام اور حکومت دونوں ہی کو اپنی طرف متوجہ کرلیا، کنونشن کے نتیجہ میں آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کی تشکیل ہوئی تو انھیں متفقہ طور پر بورڈ کا صدر بنایا گیا اور آخر تک وہ اس منصب پر فائز رہے، بورڈ نے اس عرصہ میں جو خدمات انجام دیں، وہ انہی کی سربراہی میں انجام پائی ہیں۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کا وصال اسلام کے رمز شناس دین وشریعت کے ترجمان ایک عالم باعمل، روحانی پیشوا اور ایک عہد ساز شخصیت کا انتقال ہے، خدا تعالیٰ ان کے مراتب بلند فرمائے اور ان کی قبر پر ہمیشہ رحمت کی بارش برسائے۔ آمین

............❖............

حضرت حکیم الاسلامؒ
علمی اور عرفانی نسبتوں کی جامع شخصیت

خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحب رحمۃ اللہ علیہ
مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند

خطیب بے مثال امیر شریعت حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے اپنی طلاقت لسان فصاحت کلام اور جامعیت خطاب پر مشتمل ایک عظیم وطویل حقیقت کو خیرالمدارس جالندھر میں پیرایۂ اختصار عطا کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا کہ:

''اگر حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کی جامع الصفات ذات گرامی کو دیکھنے والاقسم کھا کر یہ کہے کہ میں نے حقائق اسلام کی حکمت آفرینیوں کے ساتھ حضرت اقدس شاہ ولی اللہ دہلویؒ کو، کتاب اللہ کے ظاہر و باطن کے انسانیت نواز علوم کے ساتھ حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کو، حقائق واحکام اسلام پر نا قابل شکست استدلال کے ساتھ حجۃ اللہ فی الارض شیخ الاسلام حضرت الامام مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند کو، تفقہ اسلام کی مدلل راہ نمائی کے ساتھ فقیہ الاسلام حضرت اقدس مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کو، علم وعرفان کی بہم آمیز جرأت ایمانی کے ساتھ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندی کو، عالم بے عدیل حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کو ان کی منفرد قوت حفظ واتقان کے ساتھ، علم حدیث پر مثالی وسعت نظر کے ساتھ محدث جلیل حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ کو، بے مثال طلاقت وفصاحت کے ساتھ شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ کو، تفقہ فی الدین اور کمال اتباع سنت کے ساتھ شیخ الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کو، فراست ایمانی پر تدبر کامل کے ساتھ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانیؒ سابق

نائب مہتمم دارالعلوم دیو بند کو اور علم وعرفان زہد واتقاء اور فضل وکمال کے پیکر جمال کے ساتھ حکیم الامت حضرت اقدس مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ کو دیکھا ہے، تو میرا دل اس پر یقین رکھتا ہے کہ انشاء اللہ وہ عنداللہ حانث نہیں ہوگا''۔

حضرت مولانا عطاء اللہ شاہ صاحبؒ کے اس یقین کی تائید حضرت حکیم الاسلام قدس سرہٗ کے شیخ، شیخ العالم حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کے اس عرفانی قول وعمل سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت تھانویؒ کے مرضِ وفات میں وفات سے دو روز قبل حضرت حکیم الاسلامؒ بغرض عیادت حسب معمول تھانہ بھون تشریف لے گئے اور حضرت حکیم الاسلامؒ کی تشریف آوری پر شدت علالت کی اس حالت میں حضرت تھانویؒ فرمایا کرتے تھے کہ آپ کے آنے سے مجھے علالت میں خفت، بدن میں قوت اور روح میں بشاشت بڑھتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

دوسرے روز حضرت حکیم الاسلامؒ نے ایک روز بعد دارالعلوم دیو بند میں مجلس شوریٰ کے اجلاس کی وجہ سے واپسی کا ارادہ حضرت سے ظاہر فرمایا، اور بعد فجر واپسی کی اجازت خواہی کے لیے حضرت کے دولت کدہ پر تشریف لے گئے۔ جہاں مولانا شبیر علی صاحب بھی تشریف رکھتے تھے، حضرت مہتمم صاحبؒ نے عرض کیا کہ حضرت آپ کے پاس سے جانے کو جی تو نہیں چاہتا لیکن کل مجلس شوریٰ ہے اس کی وجہ سے جانا بھی ضروری ہے، اس لیے میں بطیبِ خاطر نہیں بلکہ بضیق خاطر واپسی کی اجازت لینے کے لیے حاضر ہوا ہوں، یہ سن کر حضرتؒ نے قریب آنے کا اشارہ فرمایا۔ اور فرمایا کہ مجلس شوریٰ کی وجہ سے جانا بھی ضروری ہے، گو میرا دل بھی آپ کو واپسی کی اجازت دینے کے لیے نہیں چاہ رہا ہے، اور پھر حضرت حکیم الاسلام کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر چوما، پھر آنکھوں سے لگایا، پھر سر پر رکھا جس سے حکیم الاسلام غیر معمولی طور پر محجوب بھی ہو رہے تھے اور آبدیدہ بھی۔ پھر حضرت تھانویؒ نے آبدیدہ ہو کر فرمایا کہ میرا وقت اخیر ہے۔ یہ ہاتھ میں نے اس لیے چوما اور قلب ودماغ پر لگایا کہ اس ہاتھ کے لگانے سے مجھے حضرت اقدس نانوتویؒ حضرت مولانا محمد احمدؒ، حضرت شیخ الہندؒ، حضرت گنگوہیؒ اور جماعت کے تمام بزرگوں کی جامع نسبتوں کی برکات اور غیر معمولی سکینت قلب حاصل ہوئی۔ اللہ رب العزت نے آپ کی ذات میں ان تمام نسبتوں کو جمع فرما دیا ہے اور اس وقت جو بھی حضرات وہاں موجود تھے سب پر گریہ طاری تھا۔

حضرت حکیم الاسلامؒ اس واقعہ کو بیان فرماتے وقت آبدیدہ ہو کر فرمایا کرتے تھے کہ حضرت اقدس تھانویؒ کے اس مشفقانہ عمل کو میں اپنے لیے عظیم سعادت، عظیم شہادت اور وسیلہ مغفرت سمجھتا ہوں۔

حضرت حکیم الاسلامؒ کے علمی کمالات، عرفانی رفعت اور نسبتوں کی جامعیت پر یہ واقعہ ایک تاریخ ساز شہادت ہے، اور اس کی توثیق مزید **اشد بلاءً الانبیاء ثم الامثل فالامثل** کے مطابق، تاریخ دارالعلوم کا ہائلۂ کبریٰ ہے کہ جس پر صبر، سکوت اور استغناء کی وہ عظیم مثال قائم فرما کر حضرت حکیم الاسلامؒ دنیا سے تشریف لے گئے کہ تاریخ جماعت اکابرؒ میں اس کی کوئی دوسری نظیر نہیں ملتی۔

حضرت حکیم الاسلامؒ عزم و عزیمتِ مثالی کے ساتھ بتوفیق الٰہی انہی صفاتِ عرفانی کو ''دارالعلوم وقف دیوبند'' کی بنیادوں پر شامل فرما کر گئے ہیں، اس لیے دارالعلوم وقف دیوبند کا اصل اور حقیقی سرمایہ یہی ہے کہ جس کی بحمد اللہ تعالیٰ ''خدام دارالعلوم وقف دیوبند'' اپنی بساط کے بقدر روزِ اوّل سے تاحال تمام بزرگان جماعت کی امانت قرار دے کر بہ دل و جان حفاظت کر رہے ہیں اور ان شاء اللہ کرتے رہیں گے۔ اور عالمی پیمانے پر اسی کا یہ شاید نتیجہ اہلِ علم و بصیرت کے سامنے ہے کہ دارالعلوم دیوبند کا قدیم و بلند ''معیار تعلیم'' عرفانی ذوق، تحفظ مسلک، اور طرز و طریق اکابرؒ کی مکمل رعایت ''دارالعلوم وقف دیوبند'' میں پورے اہتمام کے ساتھ الحمدللہ باقی اور محفوظ ہے۔

اللہ تعالیٰ دارالعلوم وقف دیوبند کے علمی فیضان کو نسبت عرفانی قاسمی و رشیدی کے ساتھ عالمگیر پیمانے پر دوام و استمرار عطا فرمائے۔ (آمین)

............❖............

حضرت حکیم الاسلامؒ
ایک مثالی شخصیت

فخر المحدثین حضرت مولانا سید انظر شاہ صاحب کشمیریؒ
سابق شیخ الحدیث دارالعلوم وقف دیوبند

کس قدر خوش نصیب ہے وہ انسان جسے حسب ونسب کی شرافتیں، گھر کا پاکیزہ ماحول، شریف الطبع والدین، ظاہر وباطن کی تربیت، علم وتعلم کیلئے یگانۂ روزگار شخصیتیں ملی ہوں، واقعی اس سے بڑھ کر کوئی سعید اور جس کے حصے میں یہ سب امتیازات ہوں اس سے بڑھ کر کوئی بخت آور نہیں۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کو یہ سب سعادتیں لگے بندھے انداز میں نہیں بلکہ وافر میسر تھیں۔ ان کی ددیہال میں حضرت نانوتویؒ کا نام نامی کافی ووافی ہے، ننھیال دیوبند کی ایک شریف بلکہ اشرف خانوادہ، گھر کا ماحول علمی، تعلیم اور تعلم کا سلسلہ فخر روزگار شخصیتوں تک پہنچتا ہے، روحانی تربیت کے لئے مجدد وقت سے وابستگی ہے، خود طبعاً شریف حلم کے پیکر، بزرگانہ اداؤں کا مرقع۔

اب ذرا تفصیل اس اجمال کی سنئے والد مولانا احمد صاحبؒ مزاج کے خسرو پیدا ہوئے۔ یہ وہ دور تھا کہ جب نسبتیں سب سے زیادہ بارآور چیز تھیں۔ پھر ان کی نسبت حضرت نانوتویؒ ایسے فرد فرید سے، تجویدی لب و لہجہ میں گفتگو کرتے، مکلّف زندگی بلکہ ٹھاٹ باٹ، لب ولہجہ شاہانہ مگر سینے میں دل برف کی سل بگڑتے تو جوالہ، سنبھلتے تو برگِ گل، طلباء کے ساتھ تعلق دیدنی وشنیدنی، کوئی طالب علم بیمار ہوتا تو عیادت کے لئے بار بار اس کی رہائش پر پہنچتے، اگر اس کی موت ہو جاتی تو حجرہ کے سامنے بیٹھ کر تعزیت لیتے، کیا مجال کوئی استاد اور کارکن حافظ صاحب کو تعزیت نہ پیش کرے۔

مسجد کا بڑا احترام ملحوظ تھا، اوابین وہیں پر ادا کرتے، ایک روز صحن مسجد میں کسی طالب کو ٹانگ پر ٹانگ رکھے

ہوئے پایا پھر کیا تھا مولانا محمد احمد صاحبؒ کا غضب اُبل پڑا تادیب کے ساتھ کھانا بند، دو ایک روز کے بعد اسی طالب علم کے حجرے کے سامنے سے گذر رہے تھے، دیکھا کہ وہ وہ درخت کے پتے کھا رہا تھا، دریافت کرنے پر تفصیل معلوم ہوئی تو خود بھی اس کے ساتھ دیوار گریہ ہوگئے، گھر لے آئے اور ہمیشہ کے لئے وہ دستر خوان قاسمی کا خوشہ چیں ہوگیا۔

بھولے اتنے کہ انگریزی دونی اور چونی میں فرق نہ کرتے، کسی ملازم پر بگڑتے تو فرماتے تم اپنی اس حرکت پر مباح الدم ہو چکے ہو یا تمہارا یہ جرم گردن زدنی ہے۔ مہتمم صاحبؒ کی مرحومہ والدہ مرقع حیا، چہرہ پر معصومیت، گفتگو معصوم بچوں کی طرح بلکہ محسوس ہوتا کہ بات چیت میں فراخ ذہن ہیں، اس کم گفتاری کے نتیجہ میں بہت سے گناہوں سے خود کو بچالیا تھا۔

سردی میں سبز کا ہی شال جس پر چھوٹے پھول ہوتے، گرمیوں کا لباس عموماً ڈھاکہ کی چکن، دوپٹہ بھی اسی کا ہوتا، جواں بخت بیٹے کے جب اسفار عالمگیر انداز میں شروع ہوگئے تو کبھی فرماتیں کہ ''طیب! جب خدا تعالیٰ رزق تقسیم کر رہا تھا تو تیرے حصہ کو دنیا میں بکھیر دیا'' ہمارے یہاں عموماً تشریف فرما ہوتیں خصوصاً میرے برادرِ بزرگوار کی شادی جب رامپور ہوئی تو چند روز مسلسل قیام رہا، ایسی نیک بخت بیبیاں کم از کم پون صدی پہلے کی دلآویز یادگار تھیں، نئی نسل کے طمطراق نے تو انھیں آثار قدیمہ کی فہرست میں داخل کر دیا۔

بے ہمہ و باہمہ اس قدر معصوم کہ ایک قریبی عزیز نے سو روپے کا وہ نوٹ جس سے بچے کھیلتے ہیں امانتاً ان کے پاس رکھوا دیا اور حسب ضرورت وہ پانچ دس لیتا رہا ایک دن اماں بی اس نوٹ کو دیگر کسی خادم سے بازار سے کچھ منگانے لگیں تو راز کھلا کہ سب جعل و فریب تھا، غرضیکہ نیکی و شرافت، معصومیت و محبوبیت مہتمم صاحب مرحوم کے حصہ میں طرفین سے آئی۔

شعور نے آنکھ کھولی تو یہ عصر دارالعلوم کا خیر القرون تھا، حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ اگرچہ بینائی جاتی رہی تھی تاہم حیات تھے، بارہا اپنے سینۂ بے کینہ بلکہ معرفت و عرفان کے گنجینہ سے مہتمم صاحبؒ کو مس کیا، شیخ الہندؒ کا دست شفقت سر پر رہا، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور حضرت علامہ ابراہیم بلیاویؒ سے ابتدائی اسباق لئے۔ حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ نے بڑا وقت آپ کی تعلیم کے لئے صرف کیا اور پھر دارالعلوم جو اس وقت ممتاز شخصیتوں کا کہکشاں تھا ان میں سے ہر ایک افادہ کے لئے سرگرم گویا کہ:

میں چمن میں چاہے جہاں رہوں مرا حق ہے فصل بہار پر

آخر کار اپنے وقت کے محدث جلیل ابن حجر عصر اور ثانی ابن ہمام علامہ کشمیریؒ کے اتھاہ علم سے سیرابی

کے لئے مستعد ہو گئے اور جم کر استفادہ کیا، تا آنکہ جس شب میں علامہ اس خاکدانی ارضی کو چھوڑ رہے تھے عصر تا مغرب اپنی معروف کتاب ''مشاہیر امت'' کے لئے بسلسلۂ ابوالحسن کذّاب استفادہ فرماتے رہے۔

روحانی تربیت کے لئے مفتی اعظم حضرت مولانا محمد شفیع صاحب دیوبندیؒ کی رفاقت میں سفر شروع ہوا، اولاً حضرت شیخ الہندؒ کے دست حق پرست پر بیعت کی، ان کی وفات کے بعد حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ پر نظر جا ٹکی سادگی یہ برتی کہ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ مدیر اہتمام سے سفارشی خط لکھوایا۔

تھانہ بھون کا یہ فقیر غیور بڑے ضابطہ کا انسان تھا، جواب آیا ''کہ اس خاندان کی خدمت میرے لئے سعادت ہے، لیکن استفادہ کیلئے مستفید کا عریضہ مطلوب ہے، نہ کہ کسی مخدوم کی سفارش۔''

مہتمم صاحبؒ فرماتے کہ پہلا سفر مفتی شفیع صاحب کے ساتھ رمضان المبارک میں ہوا، خیال یہ تھا کہ صاحبزادہ نوازی کا مظاہرہ ہوگا، لیکن خانقاہ تھانہ بھون میں چند ساعتی سکون کے بعد اپنے وقت کے حکیم حاذق کا پیغام پہنچا، چونکہ آپ استفادہ کے لئے آئے ہیں، اس لئے کھانے کا نظم خود فرمایئے، تبرعاً یہ بھی بتاتا ہوں کہ یہاں خانقاہ میں چھ پیسے کے عوض صبح و شام کا کھانا میسر ہے جس کی تفصیل کھانے کے علاوہ ایک چراغ، سرسوں کا تیل اور اس میں فتیلہ بھی ہے۔

دیوبند میں مہتمم صاحبؒ کا معمول تراویح کے بعد چائے، بے تکلف احباب، بذلہ سنجی وغیرہ تھا، تھانہ بھون میں بھی اس معمول کو نبھانا چاہا، خلیفہ اعجاز صاحب نے حکیم وقت کے کانوں تک یہ بات پہنچائی، فرمایا کہ ''براہ راست تو خطاب نہ کیا جائے لیکن آج اگر یہ حادثہ پیش آئے تو حجرہ کے سامنے بآواز بلند اعلان ہو کہ خانقاہ کا معمول تراویح کے بعد ذکر و فکر ہے نہ کہ مجلس آرائی۔''

مربی نے انتباہ میں رعایت ملحوظ کی مستفیدین کے پاس گوش شنوا تھا، اس لئے اس لطیف تنبیہ پر معمول بدل گیا، مرحوم پر تحمل، حلم، تواضع اور نبوی اخلاق کا ایسا غلبہ تھا کہ ان مواقع پر بھی تہدید و وعید تو درکنار؛ واجبی تنبیہ سے بھی گریز کرتے، جہاں انتباہ نظم و انتظام کا ضروری حصہ ہے، چنانچہ ایک بار دارالعلوم کے اہم شعبہ میں خرد برد کا حادثہ پیش آیا، مہتمم صاحب نے کمیٹی تشکیل دی۔ تحقیقات شروع ہوگئیں، میں اس زمانہ میں ناظم مجلس تعلیمی تھا، میرے زبردست اصرار پر کہ کمیٹیوں سے کچھ بھی نہیں ہوگا، آپ براہ راست محاسبہ فرمائیں، بڑی رد و قدح کے بعد تیار ہوئے اور اس شان سے کہ مجرموں کے سامنے خود سب سے بڑے مجرم بن گئے، سر بہ جیب آنکھیں بند اور نرم گداز لہجہ میں امانت و دیانت کے اہتمام پر ایک دل پذیر وعظ فرمایا، وہ سمجھ رہے تھے کہ مخاطب کے پاس گوش حق نیوش ہے اور یہ وعظ کام کر جائے گا حالانکہ لاتوں کے

بھوت باتوں سے کب مانتے ہیں۔ یا بقول اقبال ؎

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے، ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر

عمر بھر میں اس جبریہ کارروائی پر خود غایت حیاء سے پسینہ میں شرابور ہو گئے۔

مجرمین سامنے سے ہٹے تو مجھ سے فرمایا کہ ''مولوی انظر شاہ! تم نے مجھ سے بہت سخت کام لیا، ہمیشہ فرماتے کہ ''بھائی کام ضابطہ سے زیادہ رابطہ سے لینا چاہئے'' یہ ٹھیک بھی تھا لیکن تاوقتیکہ خیر القرون کا ڈوبتا سورج دل و دماغ پر سایہ فگن تھا پھر جب فضا بدل گئی، خیر اٹھ گئی، شر نے قدم جمالئے، نیکی رخصت ہوئی اور بدی نے اپنی حکومت قائم کر لی تو رابطہ کا اصول ختم ہو کر ضابطہ پر عمل کی ضرورت تھی، مگر سچی بات یہ ہے کہ وہ جس سانچہ میں ڈھالے گئے تھے، اس میں گرفت و مواخذہ، احتساب و محاسبہ راہ نہیں پا سکتا تھا، لاریب کہ پیدا کردہ مشکلات مسائل اور مصائب کے بہت سے طوفانوں میں انھوں نے اپنے مزاجی ساخت اور ناخن تدبیر سے رشتۂ کار میں پڑی ہوئی گرہیں کھولیں لیکن خاتمۂ عمر پر وہ زبان حال سے کہتے:

بیچارگی میں غالب کچھ بن پڑے تو جانوں

انھیں اپنے بزرگوں سے عشق تھا، وعظ ہو کہ تقریر، مجلس ہو کہ مستفیدین کا حلقہ ہر جگہ اکابر کا وقیع تذکرہ فرماتے۔

ہندوستان کی سرحدوں کو توڑ کر دارالعلوم کا تعارف، بزرگوں کی معرفت ان کے اسی معمول کا دلآویز ثمرہ ہے، بہت سے گمنام متعارف ہو گئے۔ بہت سے نامور جاوید بن گئے، کاش کہ وہ اپنی سوانح جس کے لئے میں نے بہت اصرار کیا قلمبند فرماتے تو ایک صدی کی داستان علم و عمل مرتب شکل میں ملتی، حالانکہ وہ لکھنے کے سلسلہ میں چابک دست تھے۔ مجمع ہو یا رزم و بزم، کاغذ اٹھاتے اور لکھنے میں ڈوب جاتے، ریل بھاگ رہی ہو، ہوائی جہاز چھلانگیں لگا رہا ہو مگر ان کے اس شغل میں کوئی فرق نہ پڑتا۔ پھر خدا جانے وہ اپنی سوانح کی تالیف سے کیوں گریز کرتے رہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ ایمان اگر ظاہر پر آ جائے تو اسلام ہے، اسلام سرایت کرتے ہوئے باطن پر ضو فگن ہو تو ایمان ہے، اسی طرح نفاست ان کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھری گئی تھی، خود نفیس، پوشاک نفیس، گفتگو نفیس، وعظ نفیس، تحریر نفیس، گویا کہ سراپا نفاست، کھانے میں پسندیدہ امر یہ تھا کہ دسترخوان لگا دیا جائے، انھیں جو چیز پسند ہوگی خود ہی اٹھا لیں گے، اگر میزبان زبردستی کھلانا چاہتا تو قدرے ترش ہو کر فرماتے کہ ''بھائی کھانے کا

تعلق رغبت سے ہے ترغیب سے نہیں''۔

ایک دعوت میں مولانا فخر الحسن صاحب مرحوم بار بار رائتہ اٹھا کر پیش کرتے اور کہتے کہ رائتہ فرمایا کہ جی ہاں رأیتُ غالباً اس وقت رائتہ مرغوب نہ تھا۔

مجھ پر شفقت کی خاص نظر تھی اور میری گستاخیوں پر مکدر نہ ہوتے، کبھی حاضر ہوتا تو فرماتے ''تشریف لائیے مولانا'' خود ہی ایک بار فرمایا کہ بھائی تمہیں مولانا کہتے ہوئے تکلف ہوتا ہے جی چاہتا ہے کہ جیسے میں سالم کہتا ہوں، اسی طرح تمہیں بھی انظر کہوں، میں نے عرض کیا کہ حضرت یہ تو میری سعادت ہوگی اور آپ کا غایت تعلق جو میرے لئے وسیلۂ نجات ہوگا۔ انشاءاللہ

میری گستاخیاں بعض اوقات ان کے تکدر کو فرحت وانبساط میں بدل دیتی تھیں، مدراس کے ایک سفر میں نمازِ فجر کے بعد کسی بات پر ان کی طبیعت قدرے مکدر ہوگئی، ناشتہ کے دسترخوان پر تشریف لانے کے بجائے اپنے کمرہ میں قلم کاغذ لے کر بیٹھ گئے۔ میں معمولاً تفریح سے لوٹا تو ان کے کمرے کے باہر یہ منظر دیکھا کہ مدراس کے بہت سے رئیس التجار سہمے ہوئے کھڑے ہیں۔ معلوم ہوا کہ حضرت ناشتہ کے لئے تشریف نہیں لا رہے ہیں اور تحریری شغل میں منہمک ہیں، میں سیدھا کمرے میں حاضر ہوا تو لکھنے میں مستغرق تھے، میں نے ہنستے ہوئے عرض کیا، لگتا ہے آج آپ نے بھوک ہڑتال کر دی، جب نظر اٹھاتے تو چشمہ کے عقب میں داہنا حاجب تن جاتا۔ نظر میری طرف اٹھا کر فرمایا کہ تمہیں ہر وقت مذاق کی سوجھتی ہے، لہجہ تکلف آمیز تھا، میں نے جرأت پائی تو عرض کیا کہ ویسے تو کوئی نقصان نہیں، البتہ دوسروں کے لئے مسئلہ پیدا ہوگیا ہے، فرمایا کیوں؟ عرض کیا آپ نے ہاتھ کھینچ لیا، یہ فرماتے ہوئے اٹھے کہ بھائی پھر بھی نہیں چھوڑتے، دسترخوان پر تشریف فرما ہوئے تو وہی بذلہ سنجی اور نکتہ طرازی پھر یہ نشست دوپہر تک چلتی رہی۔

دارالعلوم سے آپ کو اس درجہ تعلق تھا کہ میری موجودگی میں ایک صاحب کا تجوید میں تقرر ہوا، کسی نے کان میں چپکے سے کہا کہ امیدوار کا تعلق فلاں گروپ سے ہے، جھنجھلا کر فرمایا، اس سے کیا ہوتا ہے کہ فلاں سے ہے فلاں سے نہیں، دیکھنا یہ ہے کہ دارالعلوم کیلئے بھی مفید ہیں یا نہیں۔

............❖............

حضرت حکیم الاسلامؒ

حضرت مولانا محمد اسلم قاسمی صاحب رحمۃ اللہ علیہ
سابق صدر المدرسین و ناظم تعلیمات
دار العلوم وقف دیوبند

اس پردۂ دہر پر اولادِ آدمؑ میں بے شمار بلند و بالا شخصیات نمایاں ہوئیں لیکن مطلق العنان تاجداروں اور فاتحوں کی صف سے لے کر فلاسفہ، مصلحین اور فن کاروں تک کسی نے بھی عالمِ انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے کوئی نمونہ نہیں چھوڑا سوائے اُس مبارک سلسلے کے جو انبیائے کرام کا پاکیزہ طبقہ کہلاتا ہے۔ اس طبقے کے تاجدار پیغمبر آخر الزماں ﷺ کا نمونہ تو ایسا بے مثال ہے کہ قیامت تک حق تعالیٰ نے اُسے ایک ابدی معیار قرار دے دیا جس کی تابانیوں سے دنیا منور ہوتی آ رہی ہے اور آخر تک منور ہوتی رہے گی۔ یہ مبارک نمونہ کتابوں میں تو محفوظ رہے گا ہی مگر ساتھ ہی اس نمونے کی پیروی کرنے والے اکابر امت کے ذریعہ یہ پاکیزہ اسوہ تا قیامِ قیامت غلامانِ محمدیؐ کے پیکروں میں عملی صورت کے ساتھ بھی نمایاں ہو کر دنیا کو دعوتِ شوق دیتا رہے گا۔

ان عاشقانِ نبوتؐ کے طبقے میں شروع سے آج تک ایک جماعت ایسے علمائے مخلصین کی رہی ہے جس نے اتباعِ رسولؐ کو اپنا شعار اور مقصدِ زندگی بنایا حتی کہ اُن کے ہر حرکت و سکون سے سنتیں زندہ ہوتی رہیں۔

ان عاشقانِ رسولؐ کی طویل فہرست میں ماضی قریب میں ایک ممتاز نام حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی ہمہ گیر شخصیت کا ہے جن کی پاکیزہ زندگی آنحضرت ﷺ کی سنتوں کا ایک حسین مرقع رہی اور جن کی پاکباز حیات عشق و اتباعِ رسولؐ میں ایسی ڈوبی ہوئی تھی کہ آپؒ کے ہر عمل کو دیکھ کر یقین ہو جاتا کہ یہ سنتِ نبویؐ کا نمونہ ہے، عادات کے ساتھ ساتھ آپ نے طبیعت کو بھی اس انداز میں

ڈھال لیا تھا کہ اخلاق اور نرم خوئی سے بھی حضرت رحمۃ للعالمینؐ کے اسوۂ پاک کی جھلک نمایاں ہو۔ یہ بھی اتباعِ رسولؐ کا جذبۂ بے اختیار ہی تھا کہ انتہائی ناخوشگوار صورتِ حال میں بھی کبھی چیں بجبیں نہ ہوتے، نہ نرم خوئی کو ترک کرتے، حالاں کہ آپ کے والدِ مکرم حضرت مولانا محمد احمد صاحب رحمہ اللہ کی مزاجی افتاد کا رنگ نرم وگرم بہم آمیز تھا، اُن کا پُر جلال انداز رعب ودبدبہ سنتِ فاروقی کا نمونہ تھا۔ اسی طرح آپؒ کے چھوٹے بھائی مولانا محمد طاہرؒ صاحب قاسمی کی گرمیٔ مزاج بھی مشہور ومعلوم تھی مگر اس کے برخلاف والدِ مکرم حضرت حکیم الاسلام رحمہ اللہ کا حلم، آپ کی بردباری، نرم مزاجی اور نرم گوئی مثالی انداز کی تھی۔ لگتا تھا کہ غصہ کی خو آپ کو چھو کر بھی نہیں گذری۔ گھر میں بچوں کے شور وشغب یا کسی خلافِ ادب بات پر ایک باپ کبھی نہ کبھی تو سخت سست کہہ ہی دیتا ہے لیکن ہمیں حضرتؒ کے ساتھ گذارے ہوئے وقت میں ایک لمحہ بھی ایسا یاد نہیں جب والدِ مکرم نے ڈانٹا ڈپٹا ہو۔

ایک ہی گھر کے افراد میں اس قدر مزاجی فرق کو دیکھ کر یہی کہا جاسکتا ہے کہ اس اعتدالِ طبیعت میں بھی ارادی طور پر اتباعِ رسول کا جذبہ ہی کارفرما تھا۔ جیسا کہ آنحضرتؐ کی مجلس مبارک میں کوئی خلاف مزاج بات کسی سے سرزد ہوجاتی تو آپؐ اس شخص کو برسرِ مجمع نہ ٹوکتے بلکہ لطیف پیرایہ اختیار فرماتے تاکہ اُس کی سبکی بھی نہ ہو اور وہ شخص سمجھ بھی لے۔ غرض جب انسان کسی چیز کا خوگر ہوجاتا ہے تو اُس سے بے اختیارانہ طور پر بھی اسی عادت کا ظہور ہونے لگتا ہے۔ چنانچہ حضرت حکیم الاسلامؒ کی مثال اسی مقولہ کے مطابق ہے کہ آپؒ کو حق تعالیٰ نے عشقِ نبویؐ اور اتباعِ رسولؐ کا ایسا زبردست جذبہ وشوق عطا فرمایا تھا۔ آپؒ نے اپنی رفتار و گفتار، عادات وطریق حتی کہ مزاج وطبیعت کو بھی اسی مبارک اسوہ کا تابع کردیا تھا اور اس طرح آپ کے ہر عمل سے بے اختیارانہ طور پر محبوبِ کبریا کی سنتیں زندہ ہونے لگیں۔

حق تعالیٰ نے حضرت حکیم الاسلامؒ کی شخصیت کو غیر معمولی محاسن اور صفات سے آراستہ فرمایا۔ اس طرح آپ کی ذات ان خوبیوں اور صلاحیتوں کی وجہ سے علماء وعوام اور قدیم وجدید کے درمیان محبوبیت اور احترام کا مرکز بن گئی۔ حضرت کی ہمہ جہت شخصیت نے ایک فقیہ، ایک عارف، ایک عالم، ایک خطیب، ایک شیخ اور ایک مشفق مربی کی حیثیت میں اطرافِ عالم سے شایانِ شان خراجِ تحسین وآفرین حاصل کیا اور دانشوروں اور عوام کے زبان وقلم اعترافِ عظمت کے لئے اپنی صلاحیتیں لٹانے کے باوجود اپنے صحیح جذبات واحساسات کو ظاہر کرنے کے لئے تشنگی محسوس کرتے رہے۔

ایک فقیہ کی حیثیت سے حضرتؒ کی تحریریں نازک مسائل میں اُن نکات کو تلاش کرلائی ہیں جو آپ کی

ذہانت وذکاوت اور علمی گہرائی کی شہادت دیتی ہیں اور جو علمی حلقوں میں اپنی بصیرت افزا نکتہ آفرینیوں کی بنا پر ایک منفرد اور وقیع مقام حاصل کر چکی ہیں۔ آپ کی تصانیف سے مخلوق خدا نے جس قدر نفع اٹھایا اور اٹھا رہی ہے اس کی مثال خال خال نظر آتی ہے۔

ایک عارف کی حیثیت سے حضرتؒ کا بلند مقام اربابِ تصوف وطریقت میں ہمیشہ ممتاز رہا اور آپ کی پوری حیات طیبہ اور کردار واخلاق آپ کے عرفانِ حق کا عکّاس ہے۔ آپ کا اخلاص، آپ کی تواضع و انکسار، مہمان نوازی اور انتہائی ناروا حالات میں بھی توکل علی اللہ، زبان کی غیر معمولی حفاظت، ہر دوست و دشمن کے لئے حرف کلمۂ خیر اور راضی برضا رہنا حضرتؒ کے وہ اوصاف ہیں جن کی فی زمانہ مثال ملنی ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ دنیوی امور سے فطری طور پر اس قدر عدم توجہ اور لاتعلقی تھی کہ گھر پر ہوتے ہوئے بھی گھریلو واقعات سے بے خبر صرف عبادات واذکار اور تصنیف وتحریر میں مشغولیت رہتی حتیٰ کہ کھانے پینے کے لئے یاد دہانی کی ضرورت پیش آتی اور اس پر بھی اکثر وبیشتر بھوک نہ ہونے کا عذر پیش فرما کر پھر اپنے مشاغل میں منہمک ہو جاتے۔ گھر پر رہتے ہوئے جب کبھی اپنی مصروفیات سے تکان محسوس کر کے باہر تشریف لاتے تو گھر کے سب لوگ آپ کے پاس آ بیٹھتے اور مجلس وعظ ونصیحت شروع ہو جاتی۔ اِدھر اُدھر کی بے فائدہ باتوں سے ہمیشہ گریز فرماتے ہوئے سیرت نبویؐ اور صحابہؓ واکابر کے ایمان افروز واقعات بطور عبرت بیان فرماتے اور اس طرح یہ فرصتِ مختصر بھی یادِ الٰہی میں صرف ہو جاتی۔

ایک عالم کی حیثیت سے حضرتؒ کا مقام جس عظمت سے ہم کنار رہا اس کا اندازہ ہم نشینوں اور خوشہ چینوں کو آپ کے اُس استحضار اور قوتِ افہام وتفہیم سے کھلے طور پر ہو چکا تھا جو آپ کی مجالس اور علمی مذاکروں میں طالبانِ علم کی آسودگی واطمینان کا باعث بنتا تھا۔ بڑے بڑے پیچیدہ علمی مسائل آپ کے سامنے رکھے جاتے اور آپ اس پر مختصر مگر جامع الفاظ میں کلام فرماتے جس سے سائل کو تسلی ہو جاتی۔ یہ جوابات صرف ذہانت پر ہی مبنی نہیں ہوتے بلکہ حضرتؒ کے وسعتِ مطالعہ کی بھی شہادت ہوتے کیوں کہ اکثر علمی مسائل کے جواب میں اکابر امت کے حوالوں سے استشہاد بھی فرماتے اور سلف کی عبارات سے استنباط بھی فرماتے۔ وسعتِ مطالعہ کے سلسلے میں راقم الحروف خود اپنا مشاہدہ پیش کر سکتا ہے کہ حضرتؒ کی اپنی زبردست لائبریری تھی جو اَب بھی موجود ہے جس میں تفسیر، حدیث، فقہ، علم کلام، منطق، فلسفہ، تاریخ، سیرت، طب، طبعیات، ادب، عروض اور معانی وغیرہ موضوعات پر تقریباً پندرہ بیس ہزار کے درمیان کتابیں ہیں۔ لائبریری کے لئے گھر کا ایک بڑا کمرہ مخصوص کر دیا گیا تھا جس کے اندر چھت تک اونچی

المار یوں میں یہ تمام کتابیں فن وارلگی ہوئی ہیں۔ان میں زیادہ تر قدیم علماء کی عربی تالیفات ہیں۔حضرتؒ سفر کے دوران ان میں سے چند کتابیں ہمیشہ ساتھ رکھتے اور مطالعہ فرماتے رہتے۔احقر نے ان میں سے زیادہ تر کتابوں میں پایا کہ جگہ جگہ حاشیوں پر متعلقہ صفحہ کے مضامین پر اضافات اور تشریحات حضرتؒ کے قلم سے لکھی ہوئی ہیں جس سے آپ کے محض مطالعہ پر ہی نہیں بلکہ عمیق مطالعہ پر دلیل دی جاسکتی ہے۔اسی کا فیض تھا کہ مشکل سے مشکل سوالات اور الجھنوں کا آپ برجستہ جواب دے کر سائل کو مطمئن فرمادیتے۔

ایک خطیب کی حیثیت سے حضرتؒ کے زورِ بیان، حسن تعبیر اور سحر انگیز تکلم کی صدائے بازگشت سے برصغیر ہندوستان و پاکستان سے لے کر نہرِ سویز اور بحرِ ایٹلانٹک کے ساحل تک گونج رہے تھے۔ جہاں حضرتِ والا کے نشانِ قدم اسلام کے ایک مخلص سپاہی اور عظیم مقرر کی حیثیت سے ثبت ہیں اور جہاں آپ کے بےلوث اور پُر اثر لفظوں کا تاثر عظمتِ دین کے لئے ایک دفاعی حصار کا درجہ رکھتا ہے۔تاریخ اس حقیقت کی بجا طور پر شاہد رہے گی کہ اسلامی خدمات کے باب میں حضرت حکیم الاسلامؒ کی خطیبانہ اور واعظانہ سرگرمیوں نے نئے رنگ بھرے ہیں اور ایک دنیا کے سامنے قرونِ اولیٰ کے اُن مبلغوں کا پیغام تازہ کیا ہے جن کے مدفن آج مسلمانوں کی غفلت پر ماتم کناں ہیں۔

ایک شیخ کی حیثیت سے حضرت حکیم الاسلامؒ نسبتِ قاسمی کی میراث کے ایک سچے اور پرجوش وارث تھے اور ان کے متوسلین و مریدین کا دنیا کے گوشے گوشے میں پھیلا ہوا عظیم سلسلہ آپ کے فیوض و برکات کا مشاہد ہے اور آپ کا بابرکت دامن تھام کر جادۂ روحانیت کے منازل طے کرتا رہا۔ایشیا کے علاوہ آپ کے مریدین و منتسبین کا سلسلہ یورپ، امریکہ اور افریقہ کے براعظموں میں پھیلا ہوا ہے جو آپ کی نگاہِ مسیحا اثر سے حضرت والا کے گرویدہ ہوئے اور آپ کے حلقۂ ارادت سے وابستہ ہو کر تصفیۂ قلب اور تزکیۂ نفس کی طرف متوجہ ہوئے۔سلوک وطریقت میں آپ محققِ اسلام حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے فیض یافتگان اور مجازین میں سے ہیں۔دبستان تھانوی کے وابستگان اپنے شیخ کی بےمثال اصول پسندی اور منفردانہ تربیت کے طفیل اس خانقاہ سے کندن بن کر نکلے اور اخلاص و بےلوثی میں اپنے مرشد کے نقوش قدم پر چلتے ہوئے اِن مشائخ نے زندگی کا ایک ایک لمحہ خدمتِ خلق اور فیض رسانی کے لئے وقف کئے رکھا۔حضرت تھانویؒ کے خلفاء تو تمام کے تمام ہی اس دنیا سے پردہ فرما چکے ہیں لیکن اب تو حضرت حکیم الاسلامؒ کے خلفاء میں سے بھی خال خال ہی باقی رہ گئے ہیں۔

ایک مربی کی حیثیت سے حضرتؒ نے علاوہ اپنے متوسلین و مریدین کی روحانی تربیت کے، دارالعلوم

دیوبند کے اپنے تقریباً ساٹھ سالہ دورِ اہتمام میں طلبائے دارالعلوم کی جس شفقت و محبت کے ساتھ علمی سرپرستی کی اور ان کے سامنے علمی طور پر مستقبل کے لئے ایک طرزِ حیات اور زندگی کے اعلیٰ مقاصد کی طرف سے رہبری فرمائی وہ شاید حضرت قبلہ کی زندگی اور نصب العین کا سب سے تابناک اور قابلِ رشک پہلو ہے۔ فرزندانِ دارالعلوم دیوبند جن میں آج بڑے بڑے مشاہیر علماء اور منفرد شخصیات ابھی موجود ہیں، ہر قدم پر اُن کی رہنمائیوں اور نصائح کو متاعِ عزیز کی طرح حرزِ جاں بنائے ہوئے ہیں۔

آپ کی زندگی کے یہ سب وہ روشن پہلو ہیں جن سے آپ کے ساتھ وابستگی رکھنے والے حلقوں میں افادہ اور استفادہ کا سلسلہ برابر جاری رہا ہے۔ یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ان تمام مشاغل و مصروفیات اور اس دستورِ حیات کے ساتھ آپ کو صنفِ شعر سے دلچسپی لینے کے مواقع شاذونادر ہی ملتے ہوں گے مگر آپ کی کتابِ زندگی کے مطالعہ سے آپ کی قوتِ بیان کا یہ نیا رخ بھی سامنے آتا ہے جو اربابِ ادب کے لئے ایک انکشاف ہوگا اور یقیناً حضرتؒ کی علمی تصانیف اور افادات کے درمیان یہ منظوم کڑی اس خاندانی مذاق کا مظہر ہوگی جس کا مزاج آپ کے جدِّ امجد حجۃ الاسلام حضرت نانوتویؒ کو واہبِ عطایا کی طرف سے ہوا تھا۔ حضرت کا منظوم کلام شوق شعر گوئی کے بجائے واقعات و حادثات پر ذی تاثر حقیقی جذبات اور تبادرِ ذہنی پر مبنی ہے۔ آپ کی تمام نظموں کے محرکات جماعتِ دیوبند یا اپنے خاندان میں پیش آنے والے اہم واقعات و تقریبات یا حادثات ہیں جن سے متاثر ہو کر جذبات نے جامۂ شعر اختیار کر لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے منظوم کلام میں تصنع و پُرکاری کے بجائے سادگی و سلاست اور پرخلوص جذبات ہیں اور یہی بنیاد حضرتؒ کی صنفِ غزل سے عدم دلچسپی کی ہے جس کی تعمیر محض نزاکتِ تخیل اور ندرتِ اظہار و بیان پر ہوتی ہے۔

حضرت نانوتویؒ کی یادگار اور ایشیا کی سب سے بڑی اسلامی یونیورسٹی دارالعلوم دیوبند نے اپنی تاریخ کے ابتدائی دور سے ہی تاریخ کی عظیم و بلند قامت شخصیات کا ایک کہکشانی سلسلہ دیا، یہ بوقلموں شخصیات ایک سے بڑھ کر ایک ثابت ہوئیں جنہوں نے اپنے اخلاص اور اپنی زبردست خدمات سے ساری ملتِ مرحوم پر بالعموم اور ہندوستانی مسلمانوں پر بالخصوص ایک اَن مٹ چھاپ چھوڑی۔ ان میں تصوف و روحانیت کے تاجدار بھی ہیں اور علم و فضل کے کوہِ ہمالہ بھی۔ اگر ایک طرف مصنفین اور قلم کاروں کی صف اِن سے پُرنظر آتی ہے تو دوسری طرف شعلہ بیان خطیبوں، بزمِ سیاست کے جیالوں، ادب و انشاء کے چاند تاروں اور علمِ طب اور علومِ فطرت کے حاذقوں کا جمگھٹ بھی دامنِ دل کو کھینچتا نظر آتا ہے۔

اسی دور میں کاروانِ اسلام کا وہ عظیم سپہ سالار سامنے آیا جس کے دستِ مسیحا کے اثر نے مضمحل ملت

اسلام میں ایک نئی روح پھونکی اور خوابیدہ قوم کو جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ اُس دور میں جب کہ مسلمانانِ عالم تنزل اور انحطاط کی طرف مائل اور دنیا کے ہر گوشے میں استعماری طاقتوں کے آگے بے آبروئی سے دوچار تھے، اِس میر کارواں نے اُنہیں اُن کی کھوئی ہوئی پونجی کا پتہ دیا، انہیں غفلت کی نیند سے چونکا کر پروردگارِ عالم کے جلال کی چوکھٹ پر جھکا دیا اور پیغمبر علم کے درسِ آگہی کا دیوانہ بنا دیا کہ مسائل کا حل صرف رجوع الی اللہ اور علمی ترقی میں چھپا ہے یعنی یہ دور علم و تحقیق و جستجوئے آگہی کا دور ہے اور یہی سید المرسلین ﷺ کا ورثہ ہے۔ ہم اس کے امین ہیں۔ ایک دور تھا کہ ہمارے اسلاف نے پیغمبر اعظم ﷺ کی تعلیمات سے درسِ وفا لے کر اس گنبدِ افلاک کو اپنی تکبیر مسلسل اور علمی صداؤں سے بھر دیا تھا۔ ہم ان ہی کے وارث ہیں۔ اگر ہم نے خاک آغوش ہو کر استعماری وغلامی کو قبول کر لیا اور ساحل پر بیٹھ کر موجۂ علم کے حرف تماشائی بنے رہے تو یہ قناعتِ حیات ہمیں بہت مہنگی پڑنے والی ہے۔ آپ نے دنیا بھر میں علمی بیداری کا پیغام پہونچایا اور مسلمانوں کو چونکایا کہ چشمِ بینا کھول کر دیکھو کہ آج علم و تحقیق کا قافلہ کیسی قیامت کی چال چل گیا، وقت نے کیسی زقند بھری ہے کہ ستاروں سے آگے خلاؤں کے جہان کو اپنی جولان گاہ بنا لیا۔ ہمیں ایک زوال آشنا قوم بن کر نہیں جینا ہے بلکہ ایک زندہ اور متحرک وحدت اور خیر امت کی طرح نفع بخشی کے اصول پر جینا ہے۔

یہ دانائے راز اسی دارالعلوم دیوبند کا ایک عظیم سپوت بلکہ بانی دارالعلوم کے علوم کا امین و وارث اور اُن کا پوتا تھا۔ ظاہری وجاہت وخوبصورتی کا نمونہ، علم و مروت کا پیکر، اخلاقِ اسلامی کا مجسمہ اور متواضع و انکسار کی بہترین تصویر، آپ ہی اسم بامسمّی ہو کر حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند کہلائے۔

آپ حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ (ابن حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ) کے فرزند اکبر ہیں۔ آپؒ ماہ جون ۱۸۹۷ء مطابق محرم ۱۳۱۵ء بروز یک شنبہ دیوبند میں پیدا ہوئے۔ چوں کہ بڑے ارمان وتمنا اور دعاؤں کے بیچ حق تعالیٰ نے حضرتؒ کے یہاں ایک چاند سا بیٹا عطا فرمایا تھا، اس لئے قدرتی طور پر آپ سارے خاندان کی آنکھ کا تارا تھے جس کی پرورش بڑے لاڈ پیار کے ساتھ کی گئی، یہاں تک کہ پانچ چھ سال کی عمر ہوئی تو انتہائی شوق و اہتمام کے ساتھ آپ کو پڑھنے بٹھایا گیا۔ بسم اللہ کی تقریب میں اس وقت کے سارے بزرگانِ دارالعلوم اپنی دعاؤں کے ساتھ شریک ہوئے۔

آپ کو حق تعالیٰ نے حسن صورت کے ساتھ حسنِ آواز اور خوش گلوئی سے بھی انتہائی فیاضی کے ساتھ نوازا تھا، عمر کے ساتھ خوش گلوئی نمایاں ہوئی تو آواز کا جادو بھی ہر ایک کو مسحور کرنے لگا اور پورا گھر اور ماحول

دینی تھا اور خوش آوازی کا مظاہرہ تلاوتِ قرآن کریم سے بڑھ کر اور کیا ہوسکتا تھا اس لئے طے پایا کہ کسی جید قاری کا انتظام کیا جائے۔ اس زمانے میں الہ آباد کے قاری عبدالوحید خاںؒ کا شہرہ فنِّ تجوید و قرأت ہر طرف تھا۔ چنانچہ حضرت تھانویؒ کے اشارے پر قاری صاحب موصوف کو ذاتی مہمان و استاد کی حیثیت سے بلا کر آستانۂ قاسمی میں ہی ٹھہرایا گیا جن کے حق الخدمت اور خورد ونوش کی ذمے داری حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ پر تھی۔ اس طرح حضرت حکیم الاسلامؒ کو وقت کے بہترین قاری نے تجوید و قرأت کے رموز سے آشنا کیا۔ پھر کچھ عرصہ بعد ہی حضرت شیخ الہند کے مشورے پر شعبۂ قرأت قائم کیا گیا، تاکہ دوسرے شائق طلبہ بھی اس فن کی تعلیم حاصل کرسکیں۔ آپ چوں کہ غیر معمولی طور پر ذہین اور محنتی تھے لہٰذا صرف گیارہ سال کی عمر میں شعبان ۱۳۲۶ھ مطابق ۱۹۰۸ء تک مکمل قرآن کریم مع تجوید و قرأت کے حفظ کرلیا۔ اس کے بعد ۱۳۲۹ھ مطابق ۱۹۱۱ء میں فارسی کا پورا نصاب تین سال میں مکمل کیا اور فارسی بولنے کی مشق کر کے اس پر عبور حاصل کرلیا جس کا ثبوت اس حقیقت سے ملتا ہے کہ آپ اپنی طالب علمی کے ابتدائی دور میں ہی فارسی میں بھی شعر کہنے لگے تھے۔ ۱۳۳۰ھ مطابق ۱۹۱۲ء میں آپ نے درجات عربی میں داخل ہو کر علوم اسلامی کی تعلیم کا آغاز کیا۔ خوش قسمتی سے آپ کو اپنے وقت کے مشہور اور بہترین اساتذہ ملے جن کے سامنے آپ نے زانوئے ادب طے کیا۔ ان میں بطور خاص حضرت شیخ الہندؒ، حضرت العلاّم مولانا انور شاہ کشمیریؒ، شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت علامہ مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاویؒ، حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ اور حضرت مولانا رسول خاں صاحبؒ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ۱۳۳۷ھ مطابق ۱۹۱۸ء میں آپ نے دارالعلوم دیوبند سے سند فضیلت حاصل کی۔

آپ کے اساتذہ میں خود آپ کے والدِ مکرم حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند بھی شامل ہیں جن سے آپ نے مشکوٰۃ شریف اور مسلم شریف جیسی حدیث کی اہم کتابیں پڑھیں ہیں۔ چنانچہ آپؒ خود فرمایا کرتے تھے کہ مجھے حدیث کے ساتھ مناسبت اپنے والد مکرم حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کے درس سے حاصل ہوئی۔ تشریح حدیث کا انداز حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ سے پایا اور استخراجِ مسائل کا طریقہ حضرت علامہ شبیر احمد صاحبؒ عثمانی سے ملا۔

علومِ ظاہری کی تکمیل کے بعد آپ اپنے ذوق ومزاج کے لحاظ سے درس وتدریس کے مشغلے کو پسند کرتے تھے۔ اُدھر آپ کی علمی استعداد و ذہانت، قوتِ افہام وتفہیم اور خاندانی لحاظ سے خالص علمی پس منظر کو دیکھتے ہوئے اکابرِ دارالعلوم کی نگاہوں میں بھی آپ کے لئے تدریس کا سلسلہ ہی موزوں ترین تھا۔ چنانچہ

تعلیم سے فراغت کے بعد آپ کا تقرر بحیثیت استاذ دارالعلوم کر دیا گیا۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ میں آپ اپنی ذہانت وذکاوت کی بنا پر نہ صرف دارالعلوم کے اندر مقبول ترین اساتذہ میں شمار ہونے لگے بلکہ تمام علمی حلقوں میں آپ کی فراست وذکاوت، قوت بیان اور علمی گہرائی وگیرائی کی شہرت ہوگئی اور آپ کی نکتہ رسی اور نکتہ آفرینی کے چرچے ہونے لگے۔ دورانِ تدریس تقریباً ہر علم وفن کی کتابیں آپ کے زیر درس رہیں۔ چنانچہ فقہ کے علاوہ نحو وصرف، منطق، فلسفہ اور معانی وغیرہ تمام فنون کی کتابیں انتہائی حسن وخوبی کے ساتھ پڑھائیں جس سے علمی حلقوں میں آپ کی شہرت کو چار چاند لگے اور اکابر کے ذریعہ سندِ اعتراف ملی۔ تقریباً چھ سات سال کے دوران جب تک آپ صرف استاذ دارالعلوم کی حیثیت سے ادارہ کی خدمت کرتے رہے آپ نے کبھی کوئی حق الخدمت یا معاوضہ نہیں لیا۔

حضرت حکیم الاسلامؒ کی ذات اور دارالعلوم دیوبند ہمیشہ ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم رہے۔ نہ آپؒ کا تذکرہ بغیر دارالعلوم کے مکمل ہوسکتا ہے نہ دارالعلوم کی تاریخ آپؒ کے تذکرے کے بغیر مکمل ہوسکتی ہے۔ جس کو آپ نے تقریباً پچپن سال (اور اگر نائب مہتمم ہونے کے زمانے کو بھی شامل کرلیا جائے تو کل مدت ساٹھ سال تک پہنچ جاتی ہے) اپنے خونِ جگر سے سینچا اور حضرت نانوتویؒ کے لگائے ہوئے اس پودے کو بحیثیت مہتمم ایک تناور درخت کے مقام پر پہونچایا جس کی جڑیں حضرت والا کی شب وروز کی جدو جہد، سعیِ پیہم اور مسلسل سفروں نے ہندوستان سے باہر پورے ایشیا، یورپ کے ممالک، امریکہ وکنیڈا اور براعظم، افریقہ کے بڑے سے لے کر چھوٹے غیر معروف جزائر تک پھیلا دیں۔ عرب ممالک میں اس ادارہ کا اعتبار قائم فرمایا اور اس درسگاہ کو ایک یونیورسٹی کی حیثیت دے کر عربوں میں اس کا تعارف بطور ازہرِ ہند اور ''ایشین اسلامک یونیورسٹی'' کرایا۔

حضرت نانوتویؒ کی یہ یادگار جسے اُن کے پوتے حضرت حکیم الاسلامؒ نے پروان چڑھایا آج نہ صرف امت مسلمہ کا ایک قابل فخر ادارہ ہے بلکہ پورے ہندوستان کے لئے سرمایۂ افتخار وناز ہے۔ ایشیا کی اس سب سے بڑی دانش گاہ نے بالخصوص حضرت حکیم الاسلامؒ کے دوراہتمام میں اپنی شہرت وعظمت کی وجہ سے دنیا کے دور دراز ممالک سے طالبانِ علم کو دعوت شوق دی جس کے نتیجے میں چندسو کے بجائے اقطارِ عالم سے ہزاروں تشنگانِ علم اس کی طرف کھنچنے لگے۔ اس ادارہ نے اپنی طویل تاریخ میں وقت کی عظیم وبلند قامت شخصیات کا ایک تابناک سلسلہ دیا جو علمی ذوق سے سرشار تھا۔ اب ظاہر ہے کہ اس شجرۂ طوبیٰ کے فرزندوں میں حکیم الاسلامؒ کو تو اس ذوقِ علمی سے بطور خاص سرشار ہونا ہی چاہئے تھا کہ آپ بانی دارالعلوم کی براہ راست اولاد تھے۔

چنانچہ ایک طرف فراغت کے فوراً بعد ۱۳۳۷ھ مطابق ۱۹۱۸ء میں آپ اپنے شوق اور فطری رجحان کی بنا پر تعلیمی خدمت میں مصروف ہو گئے تو دوسری طرف اربابِ بصیرت کی دوررَس نگاہیں اس ذوق کے ساتھ ساتھ دارالعلوم کے لئے اُس غیر معمولی محبت واخلاص کو بھی تاڑ رہی تھیں جو آپ کے دل میں موجزن تھا۔ اسی مشاہدہ کے تحت ۱۳۴۱ھ مطابق ۱۹۲۱ء میں ہی مجلس شوریٰ دارالعلوم نے آپ کو تدریسی مشغولیت کے ساتھ ہی اتفاق رائے سے نائب مہتمم دارالعلوم کے منصب پر تقرر کر دیا جسے آپ نے بزرگوں کے امتثالِ امر کے طور پر طبیعت پر جبر کر کے قبول فرمالیا۔ اُس وقت حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانیؒ مہتمم تھے۔

۱۳۴۸ھ مطابق ۱۹۲۸ء میں حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ کا انتقال ہو گیا۔ اُدھر حکیم الاسلامؒ کی انتظامی صلاحیتیں اور جوہر گذشتہ پانچ سات برسوں میں عیاں ہو چکے تھے اس لئے مجلس شوریٰ نے آپ کو مہتمم دارالعلوم دیوبند کے اعلیٰ عہدے پر فائز کر دیا۔ اس تقرر کے چند ماہ بعد جب مجلس شوریٰ کا دوبارہ اجلاس ہوا تو اس میں حضرت والا کی اعلیٰ کارکردگی کو دیکھ کر مجلسِ شوریٰ نے ان الفاظ میں آپ کے حسنِ انتظام پر تحسین پیش کی۔

''ہم ممبرانِ شوریٰ اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ جب سے مولانا محمد طیب صاحب نے زمامِ اہتمام اپنے ہاتھ میں لی ہے اُن کے ہر طریقِ عمل سے صدق واخلاصِ نیت، حب فی اللہ اور بغض فی اللہ اور ادائے حقوق نمایاں ہے۔''

آپ نے انتظام دارالعلوم سنبھالتے ہی اپنی بلند فکری کے تحت اس ادارے کو بامِ عروج پر پہونچانے کا عزم کیا اور اس مرکزِ علم کو ایک مدرسہ کے مقام سے بڑھا کر علومِ اسلامی کی ایک منفرد اور عالمی دانش گاہ کے طور پر دنیا کے سامنے پیش کریں جو اپنے طلبہ میں ایک خالص اسلامی مزاج، دینی درد اور مسلکی پختگی کے ساتھ ایسے عمل کے پیکر پیدا کرے جن کے قول وفعل اور نشست و برخواست سے عظمتِ توحید نمایاں ہو اور سننِ نبوی زندہ و تازہ ہوں۔

آپ نے سب سے پہلے تعلیمی نظام پر توجہ دی اور اس کی بہتری واصلاح کے لئے مناسب اقدامات کئے تاکہ معیارِ تعلیم بلند ہو اور طلباء میں صحیح استعداد پیدا ہو۔ ساتھ ہی ادارہ میں مزید انتظامی شعبہ جات قائم فرمائے تاکہ طلبہ اور کارکنان کے درمیان ہر سطح پر رابطہ رہے۔ چنانچہ حضرتؒ کو جب اہتمام سپرد کیا گیا تو پورا ادارہ صرف آٹھ شعبوں پر مشتمل تھا۔ آپ نے طلبہ کی اور نظم کی سہولت کے لئے متعدد ضروری شعبوں کا اضافہ فرمایا جن کی تعداد کچھ ہی عرصے میں چار پانچ گنا بڑھ گئی۔ اسی طرح ادارہ کے کارکنوں کا کل عملہ اُس

وقت ۴۵؍ افراد کا تھا جو آپ کے دورِ آخر تک ڈھائی سو سے بھی متجاوز ہو چکا تھا۔ ایسے ہی اساتذۂ کرام کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا۔ آپ نے طلبائے دارالعلوم کے معاشی مستقبل کے لئے کچھ مفید اقدامات فرمائے تاکہ فراغت کے بعد اُن کے پاس ایک باعزت روزگار کا بھی فی الجملہ وسیلہ رہے۔ چنانچہ آپ نے دارالصنائع کا شعبہ قائم کیا جس میں چمڑے کا سامان بنانا جیسے سوٹ کیس، ہینڈ بیگ اور پرس نیز گھڑی سازی اور جلد بندی کا کام سکھایا جاتا تھا۔ اسی طرح خوش نویسی اور کتابت کا شعبہ قائم کیا پھر جامعہ طبیہ قائم کر کے اس کی وسیع عمارات تعمیر کرائیں جن میں متعدد درس گاہیں، علم الابدان کی نظری تعلیم کے ساتھ ایک اناٹمی میوزیم اور تقریباً بیس تیس بیڈ کے دو وارڈ بھی تھے۔ دوا سازی کا شعبہ علیحدہ تھا، اس کے علاوہ تعمیری ترقیات بے شمار ہوئیں حتی کہ چند ابتدائی مگر بڑی عمارات کے علاوہ باقی تمام آپ کے ہی دورِ اہتمام کی ہیں جیسے مسجد کا بالائی حصہ، دارِ جدید، مطبخ، دارالافتاء، باب الظاہر، افریقی منزلیں قدیم و جدید، دارالمدرسین، درجۂ حفظ، درجۂ دینیات اور فارسی خانہ کی عمارات وغیرہ وغیرہ۔

آپ کی پوری زندگی ایک جہدِ مسلسل رہی جس کا ایک ایک لمحہ دارالعلوم کی خدمت، شہرت اور اُس کے حلقۂ اثر کی توسیع کے لئے وقف تھا۔ ادارہ کی عالمی شہرت کے لئے آپ کے علمی و تقریری کارنامے، دارالعلوم کے انتظامی امور کی ہمہ وقتی مصروفیات، مسلسل اصلاحی مقاصد کے سفر اور پیہم تصنیف و تالیف کا مشغلہ! پھر ان تمام مشاغل کے باوجود آپ نے طبعی ذوق کے مطابق درس و تدریس کا سلسلہ آخر تک برقرار رکھا۔ چنانچہ آپ مشکوٰۃ شریف کے علاوہ صحاح ستہ کی اہم کتابیں مثلاً ابن ماجہ وغیرہ۔ اور آخر کے برسوں میں بخاری شریف بھی پڑھاتے رہے چوں کہ حضرت حکیم الاسلامؒ اپنے جدِّ امجد حضرت الامام النانوتویؒ کی ذہانت و فراست کے علاوہ اُن کے علوم و معارف کے اصلی وارث تھے، اُدھر شیخ الطائفہ حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی حکمت کے امین تھے۔ نیز حدیث کی بصیرت و فہم میں اپنے استاذ مکرم حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے فنِ حدیث میں خوشہ چیں تھے۔ اس لئے تینوں نسبتوں کا ظہور آپ کی شخصیت میں نمایاں ہوا اور آپ کی تحریر و تقریر کی روانی، سلاست، اثر انگیزی اور حکم و نکتہ آفرینی ان خصوصی نسبتوں کی عکاسی تھی۔ یہ آپ کی قوت استدلال ہی تھی کہ احکام منقولہ اور تشریعی امور کو آپ واضح کرتے تو اللہ کی حکمت و دانش پر اس انداز میں روشنی ڈالتے کہ عقل و فکر مبہوت ہو کر حیرت و وجد کی دوگونہ کیفیت میں کھو جاتا۔ یہ حق تعالیٰ کا فضل اور نسبتِ قاسمی کا وہ مسلسل فیضان تھا جو آپ کے خطبات و تصنیفات میں کھلی آنکھوں مشاہدہ ہوتا ہے۔

دارالعلوم کے عظمت و وقار کے لئے آپ کا آخری عظیم کارنامہ اجلاس صد سالہ کا انعقاد ہے جس نے

دارالعلوم دیوبند اور اُس کی سوسالہ عظیم خدمات کو عالمی سطح پر ایک قابل لحاظ ادارے کی حیثیت سے متعارف کرایا اور جس کے ساتھ عرب وعجم کے مسلمانوں کا ایک اٹوٹ مذہبی جذباتی رشتہ ہے حتی کہ مسلمانانِ عالم اس کے شرعی فیصلوں کو دل وجان سے حق جان کر تسلیم کرتے ہیں۔ یہ اعتماد دو چار سال میں نہیں پیدا ہو گیا بلکہ یہ ایک مجاہد کی زندگی کے طویل اور ایک صدی کے تین چوتھائی حصے کی پیہم آبلہ پائی کا پھل تھا۔ یہ اُن مسلسل قربانیوں کا ثمرہ تھا جو ایک انسان اپنے دنوں کے چین اور راتوں کے آرام کو تج کر ہی حاصل کر سکتا ہے۔ یہ صلہ تھا ایک مردِ مومن کے اخلاص کا اور انعام تھا ایک مردِ راہ داں کے ایثار کا۔ اجلاسِ صد سالہ نے ایک بندہ مومن کی زندگی کے اس نصب العین کو مکمل کر دیا جو دارالعلوم دیوبند کو آسمانِ علم وتحقیق کے ایک آفتابِ عالم تاب کی صورت جگمگاتا ہوا دیکھنا چاہتا تھا جس کے خیرہ کن نور سے دنیا کا گوشہ گوشہ منور ہوا اور جو امتِ مسلمہ کے سینے میں دھڑکتا ہوا دل کہلائے ؎

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

............❖............

حکیم الاسلامؒ کی ہمہ جہت شخصیت

حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی مدظلہ

نائب رئیس دارالعلوم کراچی

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب قاسمی نور اللہ مرقدہٗ کی ذات گرامی دارالعلوم دیوبند کے اس بابرکت دور کی دلکش یادگار تھی، جس نے حضرت شیخ الہندؒ، حضرت حکیم الامت تھانویؒ، حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ، حضرت شیخ الاسلام علامہ عثمانیؒ اور ان جیسے دوسرے حضرات کا جلوہ جہاں آراء دیکھا تھا۔ جس ہستی کی تعلیم وتربیت میں علم وعمل کے ان مجسم پیکروں نے حصہ لیا ہو اس کے اوصاف وکمالات کا ٹھیک ٹھیک ادراک بھی ہم جیسوں کے لئے مشکل ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ حضرت حکیم الاسلامؒ کے پیکر میں معصومیت، حسن اخلاق اور علم وعمل کے جو نمونے ان آنکھوں نے دیکھے ہیں ان کے نقوش دل ودماغ سے محو نہیں ہو سکتے۔

حضرت حکیم الاسلام محمد طیب صاحب قدس سرہٗ بانی دارالعلوم دیوبند حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کے پوتے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ نے حکمت دین کی جو معرفت حضرت نانوتویؒ کو عطا فرمائی تھی اس دور میں حضرت حکیم الاسلامؒ اس کے تنہا وارث تھے، حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کے علوم کو جن حضرات نے اپنے مزاج ومذاق میں جذب کر کے انہیں شرح وبسط کے ساتھ امت کے سامنے پیش کیا ان میں شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی قدس سرہٗ کے بعد حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ حضرت حکیم الاسلامؒ کو تعلیم سے فراغت کے بعد تدریس وتصنیف کے لئے باقاعدہ وقت بہت کم ملا۔ اور نوعمری ہی میں دارالعلوم دیوبند جیسے عظیم الشان ادارے کے انتظام وانصرام کی ذمہ داریاں ان کے کندھوں پر آ گئیں۔ ان ذمہ داریوں کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسان کو عموماً علمی مشاغل

سے دور کر کے اس کی علمی استعداد پر بہت برا اثر ڈالتی ہیں۔لیکن حضرت حکیم الاسلامؒ کا معاملہ اس لحاظ سے بھی حیرت انگیز تھا۔انتظامی بکھیڑوں میں مبتلا رہنے کے باوجود ان کا علمی مذاق ہمیشہ تازہ اور ان کی علمی استعداد سدا بہار رہی، احقر کے والد ماجد مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ اور حضرت حکیم الاسلامؒ بچپن سے ایک دوسرے کے ساتھی اور زندگی کے ہر مرحلے میں ایک دوسرے کے رفیق رہے ہیں، دونوں نے دارالعلوم دیوبند میں ساتھ پڑھا، ساتھ فارغ ہوئے، ساتھ ہی پڑھانا شروع کیا، دونوں ایک ہی وقت حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ کے دست مبارک پر بیعت ہوئے، اور پھر حضرتؒ کی وفات کے بعد ایک ہی ساتھ تھانہ بھون حاضر ہوکر حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ کے حلقہ ارادت میں داخل ہوئے اور تقریباً دونوں کو ساتھ حضرت حکیم الامت تھانویؒ کی طرف سے خلافت عطا ہوئی۔ ۱۳۴۵ھ میں سب سے پہلا حج بھی دونوں نے ساتھ کیا۔غرض ظاہری تعلیم اور باطنی تربیت سے لے کر سیر و تفریح تک ہر چیز میں دونوں کی رفاقت مثالی رفاقت تھی۔ پھر جب قیام پاکستان کی تحریک شروع ہوئی اور آزادیٔ ہند کے طریق کار سے متعلق علماء دیوبند کے درمیان اختلاف رونما ہوا تو حضرت والد صاحبؒ کی طرح حضرت حکیم الاسلامؒ کا نقطہ نظر بھی حکیم الامت حضرت تھانویؒ اور حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی رائے کی طرف مائل تھا۔لیکن حضرت حکیم الاسلامؒ نے اپنے کو عملی سیاست سے بالکلیہ یکسو کر کے ہمہ تن دارالعلوم دیوبند کی خدمت کے لئے وقف کیا ہوا تھا۔ اس لئے یہ نقطہ نظر اسٹیج پر نہ آسکا۔حضرت والد صاحبؒ قیام پاکستان کے بعد یہاں تشریف لے آئے اور حضرت حکیم الاسلامؒ کے لئے دارالعلوم کی گراں بار ذمہ داری کے پیش نظر دیوبند چھوڑنے کا سوال ہی نہ تھا۔لیکن یہ بات میں نے حضرت حکیم الاسلامؒ سے بارہا سنی کہ جس روز حضرت مفتی صاحبؒ پاکستان کے لئے روانہ ہوئے اس روز میں دن بھر روتا رہا۔آپ نے حضرت والد صاحبؒ کی وفات کے موقع پر جو تعزیتی مکتوب ارسال فرمایا اس میں بھی لکھا تھا کہ:

''تقسیم ملک کے بعد آپ نے پاکستانی قومیت اختیار فرمائی اور یہاں سے ہجرت فرما کر پاکستان تشریف لے گئے، کسی مرنے والے کے لئے بھی اتنا کبھی نہیں رویا تھا جتنا آپ کے فراق پر رویا تھا، یہ حالت دیکھ کر سب گھر والے پریشان ہو گئے تھے کہ آخر کیا حادثہ پیش آ گیا جو اتنا گریہ طاری ہے۔ یہ تعلق کی بناء پر تھا کہ ابتدائے عہد سے ہم رفیق رہے تھے۔''

اس کے بعد سے وہ ہمہ وقتی رفاقت چھوٹ گئی۔قلب و روح کا رشتہ کسی مرحلے پر نہ ٹوٹا، ایک مرتبہ حضرت حکیم الاسلامؒ نے خط میں حضرت والد صاحبؒ کو لکھا کہ:

''کل یہاں مستحسن صاحب فاروقی کے ساتھ مولوی ظہور احمد صاحب نے میری بھی دعوت کی تھی، آپ ہی کے مکان سے متصل منشی بشیر احمد صاحب مرحوم کے مکان میں کھانا کھلایا۔ مکان دیکھ کر مکینوں کی یاد تازہ ہوگئی اور دیر تک اس تصور میں استغراق رہا۔''

یہ لکھنے کے بعد حضرت حکیم الاسلامؒ نے متمم بن نویرہ کے ان اشعار سے تمثل فرمایا کہ:

و كنا كندماني جديمة حقبة من الدهر حتى قيل لن يتصدعا

فلما تفرقنا كأني ومالكا لطول اجتماع لم نبت ليلة معا

قیام پاکستان کے بعد بارہا حضرت حکیم الاسلامؒ کراچی تشریف لائے، اور یہ ممکن نہیں تھا کہ کراچی تشریف لانے کے بعد آپ دارالعلوم تشریف نہ لائیں، چنانچہ ہر بار خدام دارالعلوم کو اپنی شفقتوں سے بہرہ ور فرماتے، طلباء اور اساتذہ سے خطاب بھی ہوتا۔ اور پھر حضرت والد صاحبؒ اور ان کے درمیان جو باغ و بہار مجلس ہوتی اس میں علمی تبادلہ خیال کے علاوہ ماضی کے تذکرے، زمانہ طالب علمی کی یادیں، اساتذہ کے واقعات اور نہ جانے کتنے موضوعات پر گفتگو ہوتی اور ہم خدام کو افادات کا نہ جانے کتنا خزانہ ہاتھ آجاتا۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت حکیم الاسلامؒ کو تصنیف اور خطابت دونوں میں کمال عطا فرمایا تھا۔ اگرچہ انتظامی مشاغل کے ساتھ سفروں کی کثرت تھی اور یہ سفر حضرتؒ کی زندگی کا جزو لازم بن کر رہ گئے تھے۔ حساب لگایا جائے تو عجب نہیں کہ آدھی عمر سفر ہی میں بسر ہوئی ہو، لیکن حیرت ہے کہ اتنی مصروفیات کے باوجود آپ تصنیف و تالیف کا وقت نکال لیتے تھے۔

چنانچہ آپ کی دسیوں تصانیف آپ کے بلند علمی مقام کی شاہد ہیں اور ان کے مطالعہ سے دین کی عظمت و محبت میں اضافہ ہوتا ہے۔ جہاں تک وعظ و خطابت کا تعلق ہے اس میں تو اللہ تعالیٰ نے حضرتؒ کو ایسا عجیب و غریب ملکہ عطا فرمایا تھا کہ اس کی نظیر مشکل سے ملے گی۔ بظاہر تقریر کی عوامی مقبولیت کے جو اسباب آج کل ہوا کرتے ہیں حضرت حکیم الاسلامؒ کے وعظ میں وہ سب مفقود تھے۔ نہ جوش و خروش نہ فقرے چست کرنے کا انداز، نہ پر تکلف لسانی، نہ لہجہ اور نہ ترنم اور نہ خطیبانہ ادائیں لیکن اس کے باوجود وعظ اس قدر موثر دلچسپ اور مسحور کن ہوتا تھا کہ اس سے عوام اور اہل علم دونوں یکساں طور پر محظوظ اور مستفید ہوتے تھے۔ مضامین اونچے درجے کے عالمانہ اور عارفانہ لیکن الفاظ و معانی کی ایک نہر سلسبیل تھی جو یکساں روانی کے ساتھ بہتی اور قلب و دماغ کو نہال کر دیتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ منہ سے ایک سانچے میں ڈھلے ہوئے موتی جھڑ رہے ہیں۔ ان کی تقریر میں سمندر کی طغیانی کے بجائے ایک باوقار دریا کا ٹھہراؤ تھا جو انسان کو زیر و

زبر کرنے کے بجائے دھیرے دھیرے اپنے ساتھ بہا کر لے جاتا تھا۔

حضرت حکیم الاسلامؒ نے مخالف فرقوں کی تردید کو اپنی تقریر کا موضوع کبھی نہیں بنایا لیکن نہ جانے کتنے بھٹکے ہوئے لوگوں نے ان کے مواعظ سے ہدایت پائی اور کتنے غلط عقائد ونظریات سے تائب ہوئے۔

لاہور میں ایک صاحب علماء دیوبند کے خلاف معاندانہ پروپیگنڈہ سے بہت متاثر اور علماء دیوبند سے بری طرح برگشتہ تھے۔ طرح طرح کی بدعات میں مبتلا بلکہ ان کو کفر ایمان کا معیار قرار دینے والے، اتفاق سے حضرت حکیم الاسلامؒ لاہور تشریف لائے اور وہاں ایک مسجد میں آپ کے وعظ کا اعلان ہوا۔ یہ صاحب خود سناتے ہیں کہ میں اپنے کچھ ساتھیوں کے ہمراہ ان کے وعظ میں اس نیت سے پہنچا کہ انہیں اعتراضات کا نشانہ بناؤں گا اور موقع ملا تو اس مجلس کو خراب کرنے کی کوشش کرونگا۔ لیکن اول تو ابھی تقریر شروع بھی نہ ہوئی تھی کہ حضرت حکیم الاسلامؒ کا معصوم اور پرنور چہرہ دیکھ کر ہی اپنے عزائم میں زلزلہ سا آ گیا۔ دل نے اندر ہی گواہی دی کہ یہ چہرہ کسی بے ادب، گستاخ یا گمراہ کا نہیں ہوسکتا۔ پھر جب وعظ شروع ہوا اور اس میں دین کے جو حقائق ومعارف سامنے آئے تو پہلی بار اندازہ ہوا کہ عالم دین کسے کہتے ہیں؟ یہاں تک کہ تقریر کے اختتام تک میں حضرت حکیم الاسلامؒ کے آگے موم ہو چکا تھا۔ میں نے اپنے سابقہ خیالات سے توبہ کی اور اللہ تعالیٰ نے بزرگان دین کے بارے میں ایسی بدگمانیوں سے نجات عطا فرمائی۔ برصغیر کا تو شاید ہی کوئی گوشہ ایسا ہو کہ جہاں حکیم الاسلامؒ کی آواز نہ پہنچی ہو۔ اس کے علاوہ افریقہ، یورپ اور امریکہ تک آپ کے وعظ وارشاد کے فیوض پھیلے ہوئے ہیں اور ان سے نہ جانے کتنی زندگیوں میں انقلاب آیا ہے۔

دارالعلوم دیوبند کا منصب اہتمام کوئی معمولی چیز نہ تھی، حضرت حکیم الاسلامؒ نے پچاس سال سے زائد اس منصب کی ذمہ داریوں کو خوش اسلوبی سے نبھایا۔ اس دوران دارالعلوم پر نہ جانے کتنے کٹھن اور نازک دور آئے، لیکن حضرت حکیم الاسلامؒ نے ان تمام جھمیلوں کو نمٹایا اور اپنی ساری زندگی دارالعلوم کی خدمت کے لئے وقف کر دی۔ سخت سے سخت مرحلوں پر بھی انہیں پرسکون ہی دیکھا۔ اجلاس صد سالہ کا ہنگامہ دارالعلوم کے منتظمین کے لئے ایک کڑی آزمائش کی حیثیت رکھتا تھا۔ دیوبند جیسی مختصر جگہ میں لاکھوں افراد کے اجتماع کا انتظام انتہائی مشکل کام تھا۔ کوئی اور ہوتا تو اس موقع پر اس سراسیمگی سے نجات حاصل نہ کر سکتا۔ لیکن ٹھیک اجلاس کے افتتاح کے روز حضرت حکیم الاسلامؒ کے پاس حاضری ہوئی تو حسب معمول انہیں متبسم اور پرسکون دیکھا۔ چہرے پر تھکن ضرور تھی لیکن گھبراہٹ اور پریشانی نام کو نہ تھی۔

افسوس ہے کہ اجلاس صد سالہ کے بعد دارالعلوم دیوبند میں باہمی اختلافات نے جن ہنگاموں کی

شکل اختیار کی انھوں نے ماضی کے تمام ہنگاموں کو مات کر دیا۔ دور ہونے کی وجہ سے ہمیں تمام حالات و واقعات سے واقفیت تو نہ تھی لیکن اس بات سے دل بے چین تھا کہ اس آخری عمر میں حضرت حکیم الاسلامؒ پر ان ہنگاموں کی وجہ سے کیا بیت رہی ہوگی؟ اس زمانے کے حالات اس قدر پیچیدہ ہیں اور ان کے بارے میں ملنے والی اطلاعات اتنی متضاد ہیں کہ اب حق و ناحق کا فیصلہ تو شاید آخرت ہی میں ہو سکے گا، لیکن اتنی بات واضح ہے کہ حضرت حکیم الاسلامؒ کے چھوٹوں نے ان کی نصف صدی سے زائد کی خدمات کا جو صلہ اس آخری عمر میں ان کو دیا ہے وہ انتہائی تکلیف دہ ہے۔ حضرت حکیم الاسلامؒ کی زندگی تک ایک ضعیف سی امید باقی تھی کہ شاید اس بحران کا کوئی مناسب حل نکل آئے، لیکن اب ان کی وفات نے اس امید کو بھی خاکستر کر دیا۔ حضرت حکیم الاسلامؒ کے دم سے دارالعلوم دیوبند میں بزرگوں کی روایات زندہ تھیں اور اس کے مخصوص مزاج و مذاق کی جھلک باقی تھی اب دارالعلوم کی ان روایات کا اللہ ہی حافظ ہے۔ حضرت حکیم الاسلامؒ کی وفات بلاشبہ پوری امت کے لئے عظیم سانحہ ہے، وہ ۶؍شوال المکرّم ۱۴۰۳ھ کو ہمیں داغ مفارقت دے کر اپنے مالک حقیقی سے جا ملے تھے۔ حضرت حکیم الاسلامؒ دارالعلوم دیوبند میں سلف کی آخری یادگار تھے۔ ان کی وفات کسی ایک شخص کی وفات نہیں۔ یہ ایک پورے عہد کا اس کے مزاج و مذاق کا اور اس کی دل آویز خصوصیات کا خاتمہ ہے۔ اور اس کے سانحے کی ٹیس نہ جانے کب تک دلوں میں تازہ رہے گی۔

انا للّٰہ وانا الیہ راجعون.

وما كان قيس هلكه هلك واحد

ولكنـــه بنيان قـــوم تهدما

............❖............

حضرت حکیم الاسلامؒ

مولانا قاضی اطہر مبارکپوریؒ

حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ علم وفضل، ارشاد وتبلیغ، اخلاق وعادات، درس وتدریس، حلم وصبر، نظم و ضبط، تصنیف وتالیف، حکمت وموعظت، تقویٰ وطہارت، اور دیگر علمی ودینی وذاتی اوصاف وکمالات میں اپنے دور کے فرد واحد تھے۔ عوام وخواص میں مقبولیت ومحبوبیت اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہے جو مستحقین ہی کو ملتا ہے۔ حضرت حکیم الاسلامؒ اپنے اوصاف جمیلہ کی وجہ سے اس فضلِ خداوندی کے بہترین مستحق تھے، پورے عالم اسلام میں ان کو جو مقبولیت ومحبوبیت حاصل تھی اس میں ان کے معاصرین میں کوئی شریک وسہیم نہیں ہے۔ حد یہ ہے کہ ان کے مخالفین بھی ان کے ادب واحترام میں بخل نہیں کرتے تھے۔

وہ علمائے دیوبند کے اصلاحی وعلمی ودینی تحریک کے سلسلۃ الذہب کی آخری کڑی تھے بلکہ اس حلقہ کے آخری ترجمان تھے، ان پر اس جماعت کا ایک دور ختم ہوگیا اور اس کی جملہ خصوصیات اب کسی ایک ذات میں باقی نہیں رہیں۔

حضرت حکیم الاسلامؒ کی عام خدمات اور ان کے ثمرات سے صرفِ نظر کر کے اگر صرف دارالعلوم دیوبند کی کم وبیش ۵۰ سالہ خدمات ہی سامنے رکھی جائیں تو دینی وعلمی خدمت کا ایک طویل سلسلہ نظر آئے گا جس کے نتیجہ میں دارالعلوم واقعی ازہر ہند بن گیا اور مسلمانانِ عالم کی قدیم ومشہور درسگاہوں جامع زیتون، جامع قرویین، جامعہ ازہر، وغیرہ میں اس کا بھی شمار ہونے لگا۔ انھوں نے ''مدرسہ عربیہ دیوبند'' کو زندگی کا مقصد قرار دے کر واقعی معنی میں دارالعلوم بنایا۔ ان کا یہ کارنامہ علمی دنیا میں عظیم کارنامہ ہے جو ان کی عظمت کے لیے کافی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ آدمی کا اصل روپ سفر میں کھلتا ہے۔ ایک مرتبہ مجھے حضرت حکیم الاسلامؒ کی معیت

وصحبت دو دنوں تک پونہ کے سفر میں حاصل رہی۔ ان کے حلقۂ ارادت سے میرا بھی دینی و علمی تعلق تھا، میرے دوست اور حکیم الاسلامؒ کے بے تکلف خادم جناب سجاد حسین صدیقی نے میری کتاب ''ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں'' حضرت حکیم الاسلامؒ کو سفر میں وقت گذاری کے لیے دیدی تھی۔

ہمارے کئی بزرگ اپنے حلقۂ ارادت و مشیخیت میں دوسروں کی پذیرائی اور موجودگی کو اپنے حق میں مضر سمجھتے ہیں اور ڈرتے ہیں کہ ان کی وجہ سے کہیں ہمارے حلقہ میں دراڑ نہ پڑ جائے اس لئے وہ ہر وقت اسی فکر میں رہ کر اپنے خوردوں سے ایک گونہ بے اعتنائی برتتے ہیں اور کوئی ایسی بات نہیں کرتے جس سے خوردنوازی ظاہر ہو مگر حضرت حکیم الاسلامؒ کے اپنے ذہن و مزاج اور اخلاق کے اعتبار سے اتنا بلند تھے کہ خوردنوازی کو اپنے لئے مضر نہیں سمجھتے تھے اور ان کے ساتھ بڑے انبساط وانشراح سے پیش آتے تھے حتّٰی کہ بعض اوقات ان کے اخلاق کریمانہ سے شرم محسوس ہونے لگتی، کھانے اور ناشتے کے وقت اپنے پاس بٹھاتے تھے۔ سامنے کے خاص خاص کھانے میری طرف بڑھاتے تھے اور اصرار کر کے کھلاتے تھے خود تو عمر کے تقاضے اور مرض کی پرہیزی کی وجہ سے کم خوری پر مجبور تھے۔ اور مجھ کو بسیار خوری پر مجبور کرتے، پچاسوں مریدوں اور معتقدوں سے بھرے دستر خوان پر اس قسم کا مظاہرہ خوردنوازی کے ساتھ وسعت ظرفی، اخلاقی برتری اور حوصلہ مندی کی بات ہے۔

ان واقعات کے نتیجہ میں میرے نزدیک حضرت حکیم الاسلامؒ کی عظمت بڑھ جاتی ہے اسی سفر میں حضرت حکیم الاسلامؒ کا وعظ ہوا۔ ظاہر ہے ان کے نام پر کتنا زبردست مجمع ہوا ہوگا۔ آپ نے مجھے پہلے تقریر کا حکم دیا۔ عام طور سے مصنف وصحافی تقریر وخطابت میں یوں ہی سے ہوتے ہیں جس طرح مقرر وخطیب کے لئے چند سطریں سلیقے سے لکھنا ''کارے دارد'' ہوتا ہے ویسے بھی میں تقریر کے میدان سے دور رہتا ہوں۔ مگر حضرت حکیم الاسلامؒ کی ان کے الفاظ میں گذارش پر انکار نہ کر سکا اور تھوڑی دیر کچھ بیان کیا اس کے بعد آپ نے خطبۂ مسنونہ پڑھ کر اپنے وعظ کی ابتدا میرے بیان کی تعریف وتوصیف سے فرمائی اور کہا کہ اس جامع تقریر کے بعد مزید کی ضرورت نہیں ہے اس لئے اسی متن کی شرح کروں گا۔ چنانچہ شروع سے آخر تک اسی کا حوالہ دیتے رہے اور پورے وعظ کا موضوع یا متن اسی کو قرار دیا۔ اب ایسے لوگ کہاں ملیں گے؟

پھر بات پر بات آ گئی۔ ایک جلسہ میں کئی علماء ومقررین مدعو تھے جن میں میں بھی شامل تھا، میں نے ایک خاص موضوع پر اپنی تقریر میں زور دیا۔ میرے بعد ایک بزرگ نے تقریر فرمائی جس کی ابتدا میری تقریر کی مخالفت سے تھی اور وہ کہتے رہے کہ آج مسلمانوں کو اس کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس بات

کی ضرورت ہے اور میں سوچتا رہا کہ حضرت اپنی بڑائی کا مظاہرہ اس انداز میں نہ فرماتے تو ان کے حق میں اچھا ہی رہتا۔

اسی پونہ کے سفر میں دو دن تک حضرت حکیم الاسلامؒ کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا جس میں میں نے ان کی خلوت وجلوت کے معمولات اور عادات واطوار قریب سے دیکھے۔ ان کی شخصیت قریب سے بڑی پُرکشش معلوم ہوئی جس طرح سے دور سے بڑی پُرکشش معلوم ہوتی تھی۔ اگر شخصیت کے دیکھنے اور پرکھنے میں دوری ونزدیک کی مسافت حائل نہ ہوتو اس کے اصلی خدوخال نظر آتے ہیں۔

............❖............

موت العالِم موت العالَم

مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ

سابق رکن شوریٰ دارالعلوم دیوبند

وادریغا! دودمان قاسمی کا لعل شب چراغ گم ہوگیا۔ چمن زار دارالعلوم دیوبند کا گل سرسبد مرگ کی بادِ صرصر سے نذر خزاں ہوگیا، بزم علم وعرفان کی شمع فروزاں بجھ گئی، حسن بیان وخطابت کے ایوان مین زلزلہ آ گیا، مسند وعظ ومصطبۂ ارشاد وہدایت بے رونق ہوگئے، یعنی ۱۷ر جولائی کو حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب کم وبیش ۸۸ر برس کی عمر میں عالم آب وگل کو خیر آباد کہہ کر عالم آخرت کی طرف منتقل ہوگئے۔ **انا للّٰہ وانا الیہ راجعون.** شب میں عشاء کی نماز کے بعد ہزاروں ماتم گساروں کے مجمع میں نمازِ جنازہ دارالعلوم کے احاطہ مولسری میں ادا کی گئی۔ اور پھر تدفین جدامجد نوراللہ مرقدہٗ کے پہلو میں ہوئی، اس طرح گویا ع

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

کل من علیها فان. ویبقیٰ وجه ربك ذوالجلال والاکرام.

حضرت مرحوم جب پیدا ہوئے یہ دارالعلوم دیوبند کے اوجِ شباب کا زمانہ تھا، اساتذہ کرام اپنے اپنے فن میں یگانۂ روزگار تھے، جن کے علم وفضل اور مہارت فن کا آوازہ ممالک غیر میں بھی دور دور تک پہونچا ہوا تھا۔ پھر اس دور کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ اصحاب درس تدریس خود بھی روحانی اور باطنی کمالات کے حامل اور جامع ہوتے تھے، اور ان کے علاوہ تھانہ بھون سہارنپور اور دیوبند میں مستقل طور پر طریقت ومعرفت کی درسگاہیں قائم تھیں اور دارالعلوم جس کا نام تھا وہ درحقیقت انھیں دونوں قسم کے علوم و فنون کی تعلیم وتربیت گاہ تھی، غرض کہ ایک طرف یہ سرچشمہائے فیض تھے جو پوری آب وتاب کے ساتھ رواں دواں تھے اور دوسری جانب حضرت مرحوم خانوادۂ قاسمی کے چشم وچراغ ہونے کے باعث ہر ایک

کے نورِ نظر اور لختِ جگر تھے اور خود بھی ذاتی طور پر نہایت ذہین اور طباع، روشن ضمیر و نکتہ رس تھے، اور طالب علم کا جو ہر فطری رکھتے تھے، پھر کسر کس بات کی تھی، جوان ہوئے تو حافظ قرآن اور قاری خوش الحان ہونے کے ساتھ ایک پختہ استعداد کے بالغ النظر عالم ہو گئے۔

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی کے انتقال کے بعد حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحب مہتمم بنا دیئے گئے۔ اگر چہ آپ کی شہرت اور ملک میں مقبولیت کا آغاز نیابت اہتمام کے زمانہ میں ہی ہو گیا تھا، لیکن مہتمم ہونے کے بعد وقت آیا کہ آپ کے اوصاف و کمالات پورے طور پر ابھریں اور جلا پائیں، یہ کمالات تین قسم کے تھے: علمی، عملی، اور اخلاقی، اول الذکر کمال تو یہ تھا کہ علوم وفنون میں پختہ استعداد کے ساتھ ایک طرف حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند کی تصنیفات و تالیفات پر گہری نظر رکھتے تھے، اور دوسری جانب حضرت تھانویؒ سے بیعت کا تعلق رکھتے تھے، ظاہر ہے کہ جو شخص ان دونوں نابغہ روزگار بزرگوں کے علوم وفنون پر حاوی ہو اس کو شریعت وطریقت کا رمز شناس و نکتہ داں بننے کیلئے اور کیا درکار ہے پھر اس پر حسن تقریر و خطابت کا ملکہ خداداد سونے پر سہاگہ! گھنٹوں بولتے تھے، زبان بڑی شگفتہ اور شائستہ، کہیں کہیں ظرافت اور مزاح کے چھینٹے، آواز از اول تا آخر یکساں، نہ زیر و بم نہ اتار چڑھاؤ، مگر ساتھ ہی منطقی استدلال اور فلسفیانہ تشقیق، اس لئے تقریر عوام وخواص دونوں کی کام کی، بات سے بات اور نکتہ در نکتہ، پھر معلومات کی کثرت اور طبعیت کی روانی کا یہ عالم کہ کیا مجال ایک تقریر کا مضمون دوسری تقریر میں مکرر آجائے، میرے نزدیک یہ کچھ فیضان حضرت نانوتویؒ اور حضرت تھانویؒ کا تھا۔

عملی کمال یہ تھا کہ کارکردگی کی صلاحیت غیر معمولی تھی، جس کام کو کرتے تھے پوری توجہ اور یکسوئی سے کرتے تھے، ہم نے بارہا دیکھا ہے، ایک مجمع میں بیٹھے ہیں، لوگ بات چیت میں مصروف ہیں، اور آپ ایک گاؤ تکیہ سے ٹیک لگائے اور کاتبوں کی طرح بیٹھے کوئی مضمون مسلسل لکھے جارہے ہیں، خالی بیٹھنا تو جانتے ہی نہ تھے، ہر وقت کام سے کام تھا، اخلاقی اعتبار سے وہ اس شعر کا مصداق تھے۔

ہینون لینون ایسا زور وکرم سو اس مکرمۃ ابناء ایسارٗ

خندہ جبیں و شگفتہ، نرم دم گفتگو اور نرم خو، حلیم و بردبار، متواضع و منکسر المزاج پھر ظاہری حسن و وجاہت بھی ایسی کہ ہزاروں میں ایک نظر آتے تھے، حسن قراءت کا یہ عالم کہ وجد آفریں و کیف آور، غرض کہ یہ کمالات سہ گانہ تھے جنھوں نے مولاناؒ کی شخصیت کو برصغیر کے علماء میں بہت نمایاں اور ممتاز کر دیا تھا۔ اور آپ سچ مچ سرخیل طائفہ بن گئے تھے، اللہ کے فضل و کرم سے عمر کافی طویل پائی، اس لئے جس طرح آپ

کے اہتمام کی مدت دارالعلوم کے تمام سابق مہتمموں کی مدت اہتمام سے زیادہ ہے، اسی طرح مدرسہ میں جو توسیع وترقی آپ کے عہد میں ہوئی، کسی کے عہد میں نہیں، آپ کی فیض رسانی کا دائرہ برصغیر تک محدود نہیں رہا بلکہ ایشیا اور افریقہ کے دور دراز خطوں کے علاوہ امریکہ اور یورپ پر محیط ہوگیا، اس لئے آپ کا حادثۂ وفات عالم اسلام کا وہ عظیم دوسرا المیہ ہے جو حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ کی وفات کے بعد پیش آیا ہے، آپ کے سانحۂ اِرتحال سے دارالعلوم دیوبند کا ایک دَور اور ایک عہد ختم ہوگیا۔

مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ اور حضرت حکیم الاسلامؒ دونوں ہم جماعت اور ہم درس ہونے کے علاوہ وہ بھی صاحبزادہ اور یہ بھی صاحبزادہ، اس لئے ہم مرتبہ ہم مقام بھی تھے۔ اس لئے دونوں میں بڑی دوستی اور بڑی بے تکلفی تھی، لیکن میں ایک جونیر طالب علم تھا، اس لئے حضرت مرحوم سے کوئی سابقہ نہ تھا۔ البتہ ان کے برادر خورد مولوی محمد طاہر مرحوم بڑے ہنسوڑ، خوش مزاج و یار باش انسان تھے، ان سے بڑی دوستی اور بے تکلفی تھی، میں ان کے گھر جاتا اور وہ میرے کمرہ میں آتے، اور ہم دونوں گھنٹوں گپ شپ کرتے رہتے تھے، البتہ ۱۹۶۲ء میں مجلس شوریٰ کا ممبر منتخب ہوا تو اب حضرت مرحوم سے بھی ذاتی تعلقات پیدا ہوگئے جو محض رسمی اور واجبی نہ تھے بلکہ حقیقی اور قلبی وروحانی تھے، اب ان سے صرف ادب واحترام کا تعلق نہ تھا بلکہ محبت اور تعلق خاطر کا بھی تھا، محبت کبھی یک طرفہ نہیں ہوتی، بلکہ متعدی ہوتی ہے، چنانچہ ادھر بھی ایسا ہی تھا، اس کا پائیدار ثبوت یہ ہے کہ حضرتؒ کا ذوق شعروادب بھی بڑا پاکیزہ تھا اور خود بھی قادرالکلام شاعر تھے، ایک مرتبہ انھوں نے اپنے ایک قصیدہ کے ایسے چند اشعار خود اپنے قلم سے لکھ کر مجھ کو عنایت فرمائے جن میں ازراہ شفقت بزرگانہ اس ہیچ میرز کی نسبت ایسے خیالات کا اظہار کیا گیا تھا جن کو پڑھ کر میں شرم سے پانی پانی ہوگیا، میں نے یہ تحریر تبرک سمجھ کر حفاظت سے رکھ لی، ایک مرتبہ خیال ہوا کہ تحدیث نعمت کے طور پر ان اشعار کو برہان میں چھاپ دوں لیکن خودستائی کے ڈر سے، جہاں میں برہان کی ڈاک سے اس قسم کے روزانہ دو تین خط نہیں چھاپتا، ان اشعار کو بھی صرف اپنے تک محدود رکھا، آج یہ شفقت ومحبت اور التفات خاص ومراعات یاد آتے ہیں تو دل بے چین ہوجاتا اور تڑپ اٹھتا ہے اور یہ حادثہ ملی وقومی ہی نہیں بلکہ ذاتی اور شخصی بھی ہوجاتا ہے، مگر بہرحال بقول غالبؔ:

واقعہ سخت ہے اور جان عزیز   صبر کرتے ہی بنے گی غالبؔ

............❖............

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ

مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر صاحبؒ

سابق مدیر ماھنامہ دارالعلوم دیوبند

پچھلی تاریخ میں نہیں بلکہ خود اپنے دور اور اپنی زندگی کے رواں دواں اوقات اور اس زندگی کے پیچ و خم کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ نبوت ختم اور انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا دروازہ بلاشبہ بند کر دیا گیا ہے، مگر امت کی سطح پر اب بھی ان سے مصلحین امت، علماء حق اور قوم وملت کو زندگی کی نئی تب وتاب بخشنے والے مردانِ کار دنیا میں آتے رہتے ہیں، جن کی قابل تقلید زندگی، بے غرض عمل، علم وعرفان کی گہرائیاں، بابرکت صحبت، اور ہمہ گیر تبلیغی اور اخلاقی سرگرمیاں ملت کو از سرنو زندگی بخشتی ہیں، اس سلسلہ میں امام احمد بن حنبلؒ، ابن تیمیہؒ، مجدد الف ثانیؒ، خواجہ معین الدین چشتیؒ، سید احمد شہیدؒ، حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند، مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ کا نام لینا غلط نہ ہوگا، یہ حضرات بعض وقت تو امت کی زندگی کے کسی ایک گوشے میں تجدید وتذکیر کا کام کرتے ہیں، بعض وقت اصلاح وتعمیر کیلئے ان کے سامنے امت کی زندگی کے بہت سے شعبے ہوتے ہیں، اور وہ سب ہی شعبوں میں اپنی کارکردگی کا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ نے تقریباً ۸۷ر برس کی عمر پائی، عمر کے ابتدائی ۲۰ر سال چھوڑ کر جو تعلیم اور تربیت کی نذر ہوگئے بقیہ ۶۷ر برس انھوں نے درس وتدریس، تصنیف وتالیف، دارالعلوم جیسے عظیم الشان ادارہ کی تعمیر وترقی، دنیا کے مختلف طبقوں میں بسنے والے کروڑوں مسلمانوں کو قرآن وسنت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب لانے کے لئے ہزاروں میل کے سفر، دن رات دینی مذاکرت، بیعت وارشاد کی لائن پر ہزاروں افراد کی اخلاقی اور مزاجی تربیت اور ملی اداروں میں کام کرنے والے افراد کی نگہداشت میں گذارے۔

حضرت مرحوم ایک بیحد مصروف زندگی کے انسان تھے، مزاجاً بھی نفاست پسند تھے کہ ان کے اوپر کی کئی پیڑھیاں خوشحال زمینداروں اور قصباتی رئیسوں کی پیڑھیاں تھیں، اچھا لباس اور گھر کا اچھا ماحول پسند

فرماتے تھے، مگر اسی نفاست پسندی کے ساتھ سخت کوش اور اوقات کے سخت پابند تھے، سفر میں ہر طرح کی صعوبت بآسانی برداشت کرتے تھے، سفر و حضر میں کھانا اگر معمول کے مطابق نہیں ملتا تھا تو کبھی ناگواری کا اظہار نہیں فرماتے تھے، غریب سے غریب کسی انسان کے دسترخوان پر بیٹھ کر انھیں دال بھات کھانے میں بھی کوئی عذر نہ تھا، ان کی خندہ روئی، چہرہ کی مسکراہٹ، لب ولہجہ کی شیرینی، بڑی نرمی اور آہستگی کے ساتھ اصلاحی اقدامات کو آگے بڑھانے کا طریقہ ان کے اِردگرد کے لوگوں کو متاثر کرتا تھا، اصلاح کے لئے ان کا طریقہ سخت گیری کا نہیں تھا، بلکہ وہ اپنے ماحول میں اپنے اوقات کے انضباط اور اپنے اخلاق کی مضبوطی سے تغیر پیدا فرماتے تھے، غریبوں کی مالی مدد فرماتے تھے، مگر بہت پوشیدہ طور پر اس طرح کہ لینے اور دینے والے ہاتھ کے سوا اور کسی کو اس کا پتہ نہ چلے، امانت کی ذمہ داری خوب سمجھتے تھے، اگر کوئی شخص انہیں دس روپے بھی کسی دوسرے شخص کو پہونچانے کے لئے دیتا تھا، تو پوری کوشش فرماتے تھے، کہ جسے امانت دینی ہے اس تک خود پہنچ کر امانت سپرد کردیں۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج کی ادائیگی میں ان کا غیر معمولی شغف انتہائی طور پر حیرت انگیز تھا، مغرب کے بعد چند نوافل میں قرآن کریم کے ایک دو سپاروں کی تلاوت ان کا معمول تھا اور اس معمول کو وہ ہوائی جہاز، ریل، ہوائی اڈوں اور ریلوے اسٹیشنوں پر بھی پورا فرماتے تھے، مجلس کے اوقات متعین تھے، اس سے زائد وقت مجلس میں صرف نہیں فرماتے تھے، تحریر و تصنیف کی دنیا الگ تھی، اور اس دنیا سے بھی ان کی وابستگی دائمی تھی، تقریر کی خوبیاں اور کمالات ان پر نازل ہوئی تھیں، سوتے سوتے بھی تقریر فرماتے اور نیند کی یہ تقریریں بھی انتہائی مربوط مؤثر اور منطقی لحاظ سے مکمل ہوتی تھیں، ان کی نیند کی تقریروں کے بہت سے کیسٹ لوگوں کے پاس موجود ہیں، جنہیں سنکر قطعاً اس کا اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ بیداری کی تقریریں ہیں یا نیند کی تقریریں، گھنٹہ گھنٹہ بھر کی پوری تقریر بلند آواز اور اپنے مخصوص لہجہ میں سوتے سوتے فرمادیتے تھے، اور خود انھیں اس کا احساس نہ ہوتا کہ وہ کیا کررہے ہیں۔

اپنے اساتذہ، مشائخ اور بزرگوں کے بیحد مداح، ان کی روایات و کمالات کے عاشق، ان کی بارگاہ میں بیحد مؤدّب تھے، اپنے جدّ امجد حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانیٔ دارالعلوم دیوبند کے علوم پر غائر نظر تھی، جنھیں اپنی سادہ زبان میں اس طرح بیان فرماتے تھے کہ معمولی سی استعداد کا انسان بھی ان سے مستفید ہوتا تھا، علمی لائن پر اپنے اساتذہ محدث عصر حضرت علامہ انورشاہ کشمیریؒ اور حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے بیکراں علوم کے قدر دان تھے، حضرت علامہ انورشاہ محدث کشمیریؒ سے تعلق خاطر غیر محدود تھا، جب بھی محدث جلیل کا ذکر چھڑ جاتا تو وہ ان کے ذکر خیر میں مستغرق ہوجاتے، ان کے علوم، ان کے درس اور ان کی ذاتی زندگی کی ایک داستان انکی زبان پر آجاتی، سیاست و جہاد میں حضرت شیخ الہندؒ کی مردانہ وار سرگرمیوں کے

ورق کے ورق انھیں محفوظ تھے، بعض دفعہ دیر تک حضرت کی زندگی کے اس پہلو پر روشنی ڈالتے تھے۔

منجملہ اور اوصاف کے حضرت مہتمم صاحبؒ کا ایک وصف خصوصی یہ تھا کہ وہ خلوت وجلوت میں کبھی کسی کی غیبت اور برائی نہیں فرماتے تھے، سیاسی اور انتظامی معاملات میں ان پر مخالفین نے سیکڑوں دفعہ یورش اور یلغار کی، دوسرا کوئی ہوتا تو ان کے صبر آزما الزامات اور بدترین لب ولہجہ سے یقیناً مشتعل ہو جاتا مگر حضرتؒ دارالعلوم کی شوریٰ کے جلسوں سے باہر آتے تو ان کے ماتھے پر ایک بھی شکن نہ ہوتی اور انہی لوگوں سے جو خفیہ میٹنگوں میں اچھل اچھل کر ان پر حملے کرتے تھے ان کا لب ولہجہ انتہائی نرم، ادب آمیز اور مشفقانہ ہوتا، ہم لوگ عمر بھر حضرت کے قریب رہے، خلوت وجلوت کے ساتھی رہے مگر بہت سی تلخیوں کا ہمیں بروقت نہ علم ہو سکا اور نہ احساس، ان ہی تلخ واقعات کی گونج جب کبھی باہر اٹھی تو ہمیں معلوم ہوا کہ فلاں جلسۂ شوریٰ میں فلاں صاحب نے یہ دریدہ دہنی کی تھی اور فلاں مٹنگ میں فلاں صاحب اس طرح مقابلہ پر آ گئے تھے۔

حضرتؒ کی زندگی اپنے کمالات معنوی وظاہری کے ساتھ بے حد وسیع اور ہمہ گیر ہے۔ ان کے اخلاق و اعمال، ان کے درس وتدریس ان کی مطبوعہ وغیر مطبوعہ تصانیف افریقہ، امریکہ، لندن اور ممالک عرب تک ان کے اصلاحی مواعظ، دارالعلوم میں ان کی ۶۰ رسالہ خدمات، دارالعلوم کی علمی اور عملی زندگی کو منظّم کرنے کے لئے ان کی بھرپور جدوجہد، بیعت وارشاد کے گوشوں میں ان کی امتیازی خصوصیات، ان کی دیانت، حلم، بردباری، شرافتِ طبعی اور شرافتِ نسبی جمعیۃ العلماء ہند کے تعمیری دور سے ان کی وابستگی اور اس کے بہت سے اجتماعات میں ان کے معرکۃ الآراء خطبات، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں مذہبی شعور کے احیاء کے لئے ان کی ابتدائی خدمات، مسلم پرسنل لاء بورڈ کے پلیٹ فارم پر مسلمانوں کے شخصی اور قومی حقوق کے تحفظ کے لئے ان کا قائدانہ کردار، دارالعلوم کے بے مثال صدسالہ اجتماع جو اس کا نقطۂ عروج تھا اور جسے دیکھ کر مسلمانوں کے شاندار مستقبل کا اندازہ کر کے مخالفین نے وہیں سے دارالعلوم کے لئے زوال کے حالات پیدا کئے اپنے اساتذہ کا احترام اور ان کی اولاد سے ان کا مشفقانہ طرز عمل، طلبائے علوم دینیہ پر ان کی لگاتار شفقت، اپنے مخالفین ومعاندین سے چشم پوشی کی عادت، ان کے لاتعداد ملکی وغیر ملکی سفر، مسلم لیگ اور کانگریس کے سیاسی مراعات کے تحریکی دور میں دارالعلوم کے مفاد کی خاطر ان کا محتاط طرز عمل، دارالعلوم کے انتظامی معاملات میں ان کے بے نظیر تدبر اور مدبرانہ حکمت عملی کے صدہا واقعات، نرمی اور شفقت کے ساتھ دارالعلوم کے سیکڑوں افراد پر مشتمل عملہ سے ان کی درسی اور انتظامی خدمات کی تکمیل کرا لینے کا مخصوص طریقہ یہ سب عنوانات حضرتؒ کی صدابہار زندگی کے پھیلے ہوئے گوشے ہیں، جن میں سے ہر ایک پر ایک مفصل مضمون لکھا جانا چاہئے، کسی ایک مضمون میں ان سب کا احاطہ ناممکن ہے۔

جماعت شیخ الہند کا نورِ نظر

مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلویؒ

وہ پیکر حلم وحیا جس کی مظلومیت کئی سال سے موضوع بحث بنی ہوئی تھی اور جس کی بے چارگی پر عالم اسلام کا ہر دردمند انسان آنسو بہا رہا تھا بالآخر زمانہ کی دست درازیوں کی تاب نہ لاکر اپنے دادا ابا کے پہلو میں آسودۂ راحت ہوگیا ؎

وحشت وشیفتہ اب مرثیہ کہویں شاید　　مر گیا غالب آشفتہ بیاں، کہتا ہیں

یہ قاسم العلومؒ کے پہلو میں کون سکون سے لیٹا ہوا ہے؟ یہ ولی اللّٰہی علوم کا وارث ہے، یہ فکر قاسمی کا ترجمان ہے، یہ محدث کشمیری کی آخری یادگار ہے، یہ شیخ تھانویؒ کے میکدہ کا آخری ساقی ہے، حضرت مدنیؒ کا نورنظر ہے، یہ جماعت شیخ الہند کی آبرو ہے۔

اب ہم اسے تلاش کریں گے کہ ہزاروں کے مجمع میں کھڑا ہوکر اپنی حسین صورت، حسین سیرت اور دل فریب لب ولہجہ میں دین حق کا پیغام دلوں میں اتار دے، لیکن ہمیں وہ نظر نہ آئیگا۔

ہم چراغ لے کر ڈھونڈیں گے کہ علماء ومشائخ کی آبرو بن کر کوئی سامنے آئے، لیکن ہمیں ناکامی ہوگی۔

جسے دیکھ کر چمنستان قاسمی کے پودوں پر بہار آجاتی تھی، وہ نہ رہا، جس کا نام لے کر فرزندانِ دارالعلوم فخر سے سر اونچا کرتے تھے، اسے ہمارے ہاتھوں سے چھین لیا گیا۔

معاصرانہ رقابت کا سب شکار ہوئے لیکن، اس جیسا مبتلا اور محسود نہ دیکھا ؎

کون ہوتا ہے حریف مئے مردافگن عشق　　ہے مکرر لب ساقی یہ صدا میرے بعد

حضرت مولاناؒ نے دارالعلوم دیوبند کو عالم اسلام کے کونہ کونہ میں ایشیا کی ایک عظیم دینی یونیورسٹی کے طور پر متعارف کرایا، آپ کی عظیم علمی اور روحانی شخصیت اکابر اور اساتذہ دارلعلوم کی علمی اور روحانی عظمت

کے تعارف کا ذریعہ ثابت ہوئی۔

دارالعلوم نے آپ کے ساٹھ سالہ دور میں غیر معمولی ترقی کی اور ہر شعبہ کامیابی کی انتہائی معراج پر پہنچا۔

اجلاس صد سالہ کی بے مثال کامیابی کا سہرا آپ ہی کی کامیاب قیادت کے سر ہے، اس اجلاس نے دشمنانِ حق کے دلوں پر لازوال صداقت اسلامی کی دھاک بٹھادی۔

اجلاس کی کامیابی کے بعد یہ عظیم دینی اور ملی ادارہ جن آزمائشوں میں گرفتار ہوا، اگر وہ نہ ہوتا تو دارالعلوم ایک نئے دورترقی میں داخل ہو جاتا، اور مسلمانانِ عالم کی دینی اور سماجی ضرورتوں اور مشکلات میں عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق رہنمائی کا فرض ادا کرتا، جس طرح دارالعلوم نے ماضی کے ہر انقلاب کا چیلنج قبول کر کے مسلمانوں کی دینی اور ملی رہنمائی کا فرض انجام دیا ہے، نئے تعمیری مقاصد کے لئے اور وہ بھی ملی امتحان کے نازک دور میں دارالعلوم جیسے دینی ادارہ کو مضبوط اور مستحکم قیادت کی ضرورت تھی اور اس کے لئے ابھی انتظار کرنا ہوگا اور دیکھنا ہوگا۔

''صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے''

حکیم الاسلامؒ نے علمی اور روحانی سرگرمیوں اور دارالعلوم جیسے بین الاقوامی ادارہ کے کامیاب اہتمام کے ساتھ ساتھ ہندوستانی مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کی جدوجہد میں بھرپور حصہ لیا۔

آپ نے جماعت شیخ الہند کے شانہ بشانہ ۱۹۴۷ء کے ہمت شکن حالات کے اندر ملی تعمیری کاموں میں قائدانہ شرکت فرمائی۔

عوامی تقریروں اور خطبات کے ذریعہ مسلمانوں کے اندر اجتماعی حوصلہ پیدا کیا، مولانا ابوالکلام آزادؒ، مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعیدؒ اور مولانا حفظ الرحمٰنؒ کے رفیق کار کی حیثیت سے احیائے ملت کی تحریک میں معاون و مددگار رہے۔

دینی تعلیمی تحریک کے سلسلے میں آپ کے فاضلانہ خطبات ہمیشہ روشنی دیتے رہیں گے۔

ہندوستان کے قومی سیاسی حلقوں نے سیکولر ہندوستان کی تعمیر و ترقی کے معاملہ میں آپ کے رہنمائی سے زبردست فائدہ اٹھایا، اس سلسلہ میں مذہبی پیرایہ کے اندر فرقہ پرستی کے خلاف حضرت حکیم الاسلامؒ نے اہم کتابیں چھوڑی ہیں، جو ہندوستان جیسے ملک میں دینی تعلیم و دعوت کا کام کرنے والوں کے لئے مشعل ہدایت ہیں۔

ہندوستان میں بعض نام نہاد ترقی پسند مسلمان مسلم پرسنل لاء کے خلاف شکوک وشبہات پیدا کرتے

رہتے ہیں اور مسلمانوں کے مذہبی تشخص کو ختم کرنے کی غرض سے یکساں سول کوڈ کا مطالبہ کرنے والوں کے ہاتھوں میں کھیلتے ہیں۔

اس سلسلے میں حکیم الاسلامؒ نے مسلم پرسنل لاء بورڈ کے صدر کی حیثیت سے مسلم پرسنل لاء کے تحفظ کی تحریک میں قائدانہ رول ادا کیا اور اپنی دانشمندانہ رہنمائی سے تحریک کو تقویت پہنچائی۔

دارالعلوم کے کاز کی اشاعت وتبلیغ کی ذمہ داریوں نے حکیم الاسلامؒ کو بڑی کتابوں کی تصنیف وتالیف سے باز رکھا، لیکن آپ کے حکیمانہ قلم سے جو کتابیں وجود میں آگئیں ان میں سے ہر کتاب اپنے عنوان اور افادیت کے لحاظ سے بڑی اور ضخیم کتابوں پر بھاری ہیں، علاوہ اسکے آپ نے مختلف علوم وفنون کی کتابوں پر جو مبسوط مقدمات تحریر فرمائے ان میں سے ہر مقدمہ اور ہر تبصرہ اس فن کا نہایت جامع اور محققانہ تعارف ہے، مولانا احمد سعید صاحب کے ترجمہ کشف الرحمٰن پر حضرت کا مقدمہ تحریر ہے جو کتاب الٰہی کا مختلف خصوصیات پر ایک جامع تبصرہ ہے اور کتاب وسنت کے باہمی تعلق پر نہایت مکمل اور محققانہ مقالہ ہے۔

مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ کی تقریر بخاری (فضل الباری) پر حدیث نبوی کے تعارف اور حجت شرعی ہونے کی تحقیق بڑے سائز کے اکیس صفحات پر مشتمل ہے اور اس عنوان پر ایک مکمل کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔

مولاناؒ کی تصنیفات پر مستقل تبصرہ وتعارف کی ضرورت ہے جس کے لئے علیحدہ مضمون درکار ہے۔

حکیم الاسلامؒ ”**علماء امتی کا نبیاء بنی اسرائیل**“ کا صحیح مصداق تھے، وہ گلستان محمدیؐ کا شگفتہ پھول تھے اور ہر طرف نبوت محمدیؐ کا رنگ ونور بکھیرتے پھرتے تھے یا پھر بقول اکبر ؎

محمدؐ پھول ہیں اور واعظ صبا ہیں — کہ پھیلاتے پھریں بوئے محمدؐ

وہ مسند درس پر بیٹھے تو دنیائے تعلیم وتدریس پر اپنا سکہ بٹھا دیا، انھوں نے قلم ہاتھ میں لیا تو اسلام کی حکمتوں اور دین کی بصیرتوں کے موتی بکھیر دیئے، اور خواص وعوام دونوں کو دین برحق کا شیدائی بنا دیا، ان پر ولی اللّٰہی توسع اور قاسمی محبت وجمال کا رنگ غالب تھا، مگر امام ربانی حضرت گنگوہیؒ کے اصلاحی درد سے بھی آپ کا دل خالی نہیں تھا۔

بدعت وضلالت کے آہنی قلعے توپ کے گولوں سے نہیں ٹوٹتے تھے وہ آپ کی شہد سے زیادہ شیریں باتوں سے سرنگوں ہو جاتے تھے، اور ان سب باتوں کا سب کو اعتراف تھا اور ہے اور ہمیشہ رہے گا لیکن ؎

حسد سزائے کمال سخن ہے کیا کیجئے — ستم بہائے متاع ہنر ہے کیا کہئے

زندگی کی سخت آزمائش وہ ہے جو اپنوں کے ہاتھوں پیش آئے اور زندگی کی اس منزل میں پیش آئے

جس منزل میں آدمی دو چار گھڑی کا آرام چاہتا ہے، اس آزمائش میں ثابت قدم رہنا ''**علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل**'' کا آخری اور مکمل ثبوت ہے۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ دارالعلوم دیو بند کی ساٹھ سالہ خدمات کے بعد جس امتحان میں ڈالے گئے اور پھر اس امتحان میں حضرت حکیم الاسلامؒ نے جس حلم وکرم کا مظاہرہ کیا وہ صرف ایک عالم کے بس کی بات نہیں تھی بلکہ ایک عارف کامل ہی اس دشوار گزار منزل پر ثابت قدم رہ سکتا تھا۔

حکیم الاسلام مولانا محمد طیبؒ نے اضطراب وبے قراری کی یہ ساری گھڑیاں ایک عارف باللہ کی طرح گزاریں۔

اس ساری کش مکش میں نیک نیت لوگ بھی تھے اور حاسد ومعاند بھی، لیکن مولاناؒ نے کسی کے خلاف زبان نہ کھولی، البتہ قانون قدرت کی پکڑ بہت سخت ہے، وقت فیصلہ کرے گا کہ اس صف میں ذاتی بدخواہ کون کون تھے اور نیک نیت کون کون؟

کچھ ہو رہے گا عشق و ہوس میں بھی امتیاز — آیا ہے اب مزاج ترا امتحان پر

زندگی کی سخت ترین آزمائش میں حکیم الاسلامؒ نے جو اسوۂ حسنہ چھوڑا وہ سلف صالحین کی یاد تازہ کرتا ہے، تاریخ کو انتظار رہے گا کہ جن گوشوں سے عقل وشعور کے متاثر ہونے کی آواز سنائی دے وہ زندگی کی اتنی ہی سخت آزمائش میں گرفتار ہوکر عقل وشعور میں مرد آہن ہونے کا ثبوت پیش کریں۔

یہ عقل وشعور اور بڑھاپے اور کمزوری کا طعنہ دینے والے جس تلوّن وتنزل کا مظاہرہ کر چکے ہیں، ملی تاریخ ہمیشہ اس پر ہنستی رہے گی، ان کے تدین کا مذاق اڑاتی رہے گی، ان کے اندر دارالعلوم کے لئے خیر خواہی کا جذبہ کتنا ہے؟ اس کی آزمائش کے بغیر ان کی زندگی کا ادھورا باب ختم نہیں ہوسکتا۔

ہمارا امتحان لیتے ہو لیکن — تمہارا بھی اسی میں امتحاں ہے

اوپر عرض کیا گیا کہ حضرت حکیم الاسلامؒ نے زندگی کی اس آزمائش کا ایک عالم کی طرح نہیں بلکہ ایک عارف کامل کی طرح سامنا کیا، وہ اس باب میں صبر وحلم کا ایسا نمونہ چھوڑ گئے جو ہم جیسوں کے لئے ایک چیلنج ہے۔

وہ اس شیخ کبیر کی مانند تھے جس کے لاڈلے بیٹے کو اس کے اپنے بیٹے ہی کنویں میں ڈال آئے تھے، پھر وہ کس کے خلاف زبان کھولتا، صبر جمیل کے نعرے لگا کر اپنے آپ کو تسلی دیتا رہا۔

حضرت عثمانؓ نے اپنی زندگی کی سخت آزمائش میں ایک مخالف صاحبزادے سے بس اتنا ہی کہا:

بھتیجے! تمہارا باپ تو اس داڑھی کی بڑی عزت کرتا تھا، بڑے باپ کے بیٹے نے اتنا سن کر حضرت عثمانؓ کی داڑھی چھوڑ دی اور پیچھے ہٹ گیا، لیکن دشمنوں کے خلاف تلوار اٹھانے کی آپ نے اجازت اس

لئے نہیں دی کہ دوستوں کی کرم فرمائیاں بھی سامنے تھیں۔

تیری محفل سے اٹھاتا، غیر مجھ کو کیا مجال　　　　دیکھتا تھا میں کہ تو نے بھی اشارہ کر دیا

امام بخاریؒ صحیح بخاری کی جمع وترتیب سے فارغ ہوکر اسی ۸۰ برس کی عمر میں اپنے وطن بخارا آئے تاکہ حدیث رسولؐ کی خدمت اور حفاظت کی خاطر در بدر کی ٹھوکریں کھانے کی بعد بڑھاپا اپنے بال بچوں میں گزاریں، لیکن ابھی آزمائش کی آخری منزل باقی تھی، بخارا میں آپ کے حلقۂ درس کی کامیابی حاکم بخارا کی آنکھوں میں کھٹکنے لگی، امام کو حکم بھیجا کہ میرے لڑکوں کو گھر پر آکر حدیث پڑھایئے۔ امام نے انکار کر دیا، حاکم وقت کا غرور جوش میں آگیا، علماء بخارا کو بلا کر امام بخاری کو بخارا سے نکالنے کی تدبیریں سوچی گئیں، علماء شہر نے یہ تدبیر نکالی کہ امام کو بدعقیدہ ثابت کیا جائے اور اس طرح عوام میں امام کے خلاف غم وغصہ پیدا کیا جائے۔

چنانچہ باکمال علماء نے خلق قرآن کے پرانے مسئلہ میں امام الحدیث کو الجھا دیا، درس حدیث کے دوران قرآن کریم کے حادث اور قدیم ہونے کی بحث زندہ کر دی گئی، امام بخاریؒ اس مسئلہ میں حضرت امام احمد ابن حنبل کے مسلک پر تھے، کلام لفظی اور کلام حقیقی کے فرق کو عوام کیا سمجھیں، امام کے خلاف پروپیگنڈہ شروع ہوگیا، اسماعیل بخاری بدعقیدہ ہوگئے، حاکم شہر نے فائدہ اٹھایا، امام کو شہر بخارا سے نکل جانے کا حکم دے دیا، امام مستجاب الدعوات تھے، مزاج میں جلال تھا، خالص علمی اور تحقیقی مزاج جلالی ہوتا ہے، تہجد میں حاکم کے لئے بددعا کر دی، خداوندا! اسماعیل پر تیری زمین تنگ ہوگئی ہے، اب اسے اپنے پاس بلا لے اور جس نے اس بوڑھے کو بے وطن کیا ہے اسے بھی وطن میں رہنا نصیب نہ ہو، دعا قبول ہوئی، ادھر امام اس دنیائے دَنی کو چھوڑ کر خدا کو پیارے ہوئے، ادھر حاکم وقت پر خلیفہ کا عتاب نازل ہوا، اور اسے بال بچوں سمیت بخارا سے ذلت ورسوائی کے ساتھ نکلوا دیا گیا۔

امام بخاریؒ وطن سے بے وطن ہوکر سمرقند جاتے ہوئے اپنے رشتہ داروں کے پاس خرتنگ میں مقیم تھے، وہیں وصال ہوا، تاریخ میں اس بدنصیب حاکم بخارا کا نام خالد ابن احمد ذہلی ہے، لیکن جمال قاسمی کا پیکر حسین جلال سے بالکل خالی تھا، حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند کا جمال اور شان عبدیت ان کے تمام معاصرین میں ان کو ممتاز درجہ دیتی ہے، اور یہ رنگ عشق سے شکست کھا لی تھی، حضرت حاجی امداداللہ صاحب مہاجر مکی فرماتے تھے، مولانا قاسم! اتنی تواضع اختیار نہ کرو، علم کی شان بھی برقرار رکھو، لیکن مولانا قاسم عشق نبوی میں فنائیت کا مقام رکھتے تھے، یہی رنگ ان کے پوتے میں نظر آیا۔

امام بخاریؒ کو غصہ آگیا، لیکن حکیم الاسلامؒ کو کبھی غصہ اور غضب کی حالت میں نہیں دیکھا گیا، لیکن واہ

رے جانشین قاسمؒ وانورؒ، اشرفؒ وحسین احمدؒ تیرے دل میں کسی قسم کا نہ خوف پیدا ہوا، نہ غبار و کدورت نے راہ پائی، تو نے شیطان لعین کو پر بازی میں پیدل سے مات دیدی، اس مادی دنیا میں عروج وزوال، آرام و تکلیف کا آنا معمولی بات ہے اور موت وزندگی کا بھی چولی دامن کا ساتھ ہے لیکن اخلاق کردار پر کبھی زوال نہیں، یہ وہ جوہر ہے جس کی تابانی ہر آن بڑھتی رہتی ہے۔

وَلَلْاٰ خرۃُ خیرٌ لكَ مِن الْاٰ ولیٰ: میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

قاسم ومحمود اور انور وحسین احمد کا وہ لاڈلا جنتی تھا، اور اس کے اخلاق حمیدہ اور کریم النفسی اس کے جنتی ہونے کا واضح ثبوت تھا، قرآن کریم نے کہا **و نزعنا ما فی صدورھم من غل الخ** ہم اہل جنت کے سینوں سے حرص وہوس اور باہمی رنجش وکدورت کے جذبات کو نکال دیں گے تاکہ یہ لوگ جنت میں مکمل آرام وسکون کی زندگی گزاریں۔

حکیم الاسلامؒ کے اخلاق شریفانہ کا ان کے دشمن کو بھی اعتراف ہے ان کا سینہ دنیا میں بھی بے کینہ رہا اور وہ اسی سینۂ روشن کے ساتھ اپنے مولا سے جا ملے، وہ دنیا میں رہ کر جنتی تھے تو پھر کیوں نہ امید قوی کی جائے کہ جنت میں بھی ان کا شاندار استقبال ہوا ہوگا۔

یہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے ۔۔۔ کہ غیر جلوۂ گل رہ گزر میں خاک نہیں

موت سے کس کو چھٹکارا ملتا ہے، محبوب خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا: **انك میت و انھم میتون. ثم انکم یوم القیمة عند ربکم تختصمون.**

لیکن افسوس اور قلق اس کا ہے کہ ملت اسلامیہ ہند خاص طور پر قحط الرجال کا شکار ہے، اور علماء کے نام پر شر العلماء کا دوردورہ ہے، علم دین کو بدنام کرنے والے نمودار ہورہے ہیں دنیا کے لئے دین کو قربان کرنے والوں کا زور شور ہے، امام شاہ ولی اللہؒ نے لکھا ہے کہ اگر مسیحی علماء کو دیکھنا ہو تو اس امت کے زر پرست علماء کو دیکھو اور اگر یہودی علماء کی زیارت کرنی ہو تو علماء ومشائخ کی اس اولاد کو دیکھو جو اپنے باپ دادا کی جھوٹی تعریفیں کر کے ان کے نام کی روٹیاں کھاتی ہیں۔

فکر اس کا ہے ورنہ موت کے برحق ہونے میں کسے کلام ہوسکتا ہے۔

حجاج ابن یوسف نے بڑے بڑے لوگوں کو تہ تیغ کردیا ان میں صحابہ کرامؓ بھی تھے اور تابعین عظام بھی وہ اس بات کو برداشت نہیں کرتا تھا کہ آل نبی کو نبی کی ذریت کہا جائے، ان مظلومین میں حضرت سعید ابن جبیر بھی تھے، حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ نے ایک روز حجاج کو خواب میں دیکھا اور پوچھا کیا گزری؟ بولا ہر

مقتول کے بدلہ میں مجھے قتل کیا گیا اور پھر زندہ کیا گیا لیکن سعید ابن جبیرؒ کے بدلہ میں ستر دفعہ قتل کیا گیا، علامہ دمیری نے حیوۃ الحیوان میں یہ واقعہ نقل کرنے کے بعد لکھا کہ ایک صحابی کے بدلے میں تو حجاج ایک ہی دفعہ قتل کی سزا پائے گا مگر ایک تابعی کے بدلہ میں ستر دفعہ سزا کا مستحق ہوا؟ پھر علامہ نے خود ہی اس کا جواب دیا کہ سعید جس وقت مارے گئے اس وقت کوئی ان جیسا نہ تھا جو ان کی جگہ پر کرتا، ان سے پہلے جو حضرات صحابہؓ وتابعین مارے گئے ان کی جگہ بھرنے والے موجود تھے۔

مولوی اور علماء روزانہ پیدا ہو رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے لیکن وہ علماء جو: کأ نبیاء بنی اسرائیل کا مقام رکھتے ہیں وہ بہت مشکل سے پیدا ہوتے ہیں میر صاحب نے کہا ہے ؎

مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

ایک روز عالمگیرؒ اپنے استاد ملا جیون کے ساتھ کسی سفر پر روانہ ہوا، سواری کے لئے ہاتھی لایا گیا، عالمگیرؒ سپاہی آدمی تھا، جست لگا کر ہاتھی کی پیٹھ پر سوار ہو گیا لیکن ملا جی آہستہ آہستہ بڑی احتیاط سے ہاتھی پر سوار ہوئے، عالمگیرؒ دیکھ رہا تھا، ہنس کر بولا، استاد محترم، آپ کو اپنی جان بڑی پیاری ہے؟ ملا جی نے جواب دیا عالمگیرؒ! تیرے بعد تیرا جانشین تیار ہوگا وہ تیری جگہ سنبھال لیگا، میرا جانشین بڑی مشکل سے پیدا ہوگا، زندگی کا بڑا حصہ چراغ کے سامنے اوندھا پڑا رہیگا، تب اس قابل ہوگا۔

حضرت حکیم الاسلامؒ کے بارے میں یہ چند سطریں سچی عقیدت کے تحت تحریر کی گئی ہیں، کوئی منفی جذبہ کارفرما نہیں۔

میں نے اپنے شیخ اور استاد حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ کی زبان مبارک سے یہ سنا ہے کہ: میں خاندان قاسمی کا غلام ہوں، ادنیٰ غلام ہوں۔

جب دارالعلوم کا تاریخی ابتلاء شروع ہوا تو حضرت مدنیؒ کے یہ الفاظ میرے کانوں میں گونجتے تھے، اور میں حالات کی نزاکتوں کو دیکھ کر ششدر رہ جاتا تھا۔

اپنے شیخ واستاذ کے واسطے سے اس خاندان کا جو احترام مجھے ملا ہے میں اسے کیسے فراموش کر سکتا ہوں۔

............❖............

جامع الکمالات شخصیت

مولانا مفتی محمد یوسف لدھیانویؒ

۶ شوال المکرّم ۱۴۰۳ھ مطابق ۱۷ر جولائی ۱۹۸۳ء بروز اتوار حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحب قاسمیؒ ۸۸ سال کی عمر میں عالم فنا سے عالم بقا کی طرف رحلت فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت حکیم الاسلام مرحوم کی عبقری شخصیت گوناگوں فضائل وکمالات کا مجموعہ تھی۔ وہ اپنے دور کے بہترین قاری، جید حافظ، صاحبِ کمال عالم، قوی النسب شیخ طریقت، بے بدل خطیب، صاحبِ طرز ادیب، نامور متکلم، نکتہ رس فلسفی، قادر الکلام شاعر، کامیاب مدرس اور شگفتہ قلم مصنف تھے۔ حکمت قاسمی کے شارح اور روایات سلف کے امین تھے۔

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کے پوتے تھے۔ ۱۳۱۵ھ مطابق ۱۸۹۸ء میں عالمِ وجود کو رونق بخشی، اہل اللہ کی آغوش محبت میں پھلے پھولے۔ قاعدہ بغدادی کی بسم اللہ سے لے کر علوم عالیہ کی تکمیل تک سب کچھ دارالعلوم ہی میں پڑھا۔ دارالعلوم کے اس دور کے خضر صفت اساتذہ نے نہایت محبت وشفقت اور محنت وتوجہ سے پڑھایا۔ حدیث میں حضرت امام العصر علامہ محمد سید انور شاہ کشمیری قدس سرہ سے تلمذ تھا۔

۱۳۳۷ھ میں سند فراغت حاصل کی اور دارالعلوم ہی میں حسبۃ للہ تدریس کی خدمات انجام دینے لگے۔ ۱۳۴۳ھ-۱۳۴۸ھ تک اپنے اکابر کی موجودگی میں دارالعلوم کے نائب مہتمم رہے۔ اور ۱۳۴۸ھ سے اہتمام کے منصب پر فائز ہوئے۔ قدرت فیاض نے انہیں حسن وجمال اور فضل وکمال کے ساتھ ساتھ عقل و دانش، فہم وفراست، حلم ووقار، حسنِ تدبیر اور نظم ونسق کی بے پناہ صلاحیتیں بھی عطا فرمائی تھیں۔

حضرت اقدس شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کی مالٹا سے تشریف آوری پر ان سے بیعت ہوئے

اوران کے وصال کے بعد حضرت اقدس حکیم الامت مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ سے سلوک کی تکمیل کی اور خلافت واجازت سے مشرف ہوئے۔

حضرت مرحوم کا عظیم الشان کارنامہ قریباً ساٹھ سال تک مادر علمی دارالعلوم دیوبند کی انتظامی خدمات ہیں۔صرف دارالعلوم کی تاریخ ہی میں نہیں بلکہ دیگر اداروں میں بھی اتنی طویل مدت تک منصبِ اہتمام پر فائز رہنے کی مثالیں شاذ ونادر ہی ملتی ہیں۔

حضرتؒ کی صحت کافی عرصہ سے مخدوش چلی آرہی تھی۔اور ایک سال سے تو قریباً صاحبِ فراش تھے۔ بالآخر وہ وقت موعود آپہنچا جس سے کسی فرد وبشر کو مفر نہیں،حضرت کی وفات حسرت آیات اہل حق کے لیے عظیم سانحہ ہے۔حق تعالیٰ شانہ مرحوم کو درجات عالیہ عطا فرمائیں۔اور تمام متعلقین اور پس ماندگان کو صبر جمیل نصیب فرمائیں۔آمین

............❖............

ایک جامع کمالات شخصیت

مولانا مفتی ظفیر الدین صاحبؒ
دارالافتاء دارالعلوم دیو بند

اچھی طرح یاد ہے کہ سب سے پہلے حکیم الاسلامؒ کو میں نے شہر مونگیر کے ایک عظیم الشان اجلاس میں دور سے دیکھا جب آپ کرسی پر بیٹھے وعظ کر رہے تھے، وعظ اس قدر دل آویز و دل پذیر تھا کہ پورے مجمع میں کہیں سے کھانسنے کی آواز تک نہیں آرہی تھی، ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ واعظ جادو کر رہا ہے اور پورا مجمع ہمہ تن گوش ان کی طرف متوجہ سکتہ کے عالم میں ہے، خود اپنا بھی اس وقت یہی احساس تھا کہ آپ سے بڑھ کر موثر بولنے والی شخصیت دوسری نہیں ہے دوڈھائی گھنٹہ رات کے دس بجے سے ساڑھے بارہ بجے تک مسلسل بولتے رہے، لیکن مجمع جب وہاں سے اٹھا تو سب کی زبان پر تھا کہ تقریر جلد ختم ہوگئی، کاش کچھ دیر تک اور حضرت مہتمم صاحبؒ بولتے رہتے، اور ہم لوگ سنتے رہتے، تقریر کا عنوان تھا، یبنی **اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَا اَصَابَكَ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ.** (لقمان:۲۰)

حضرت مہتمم صاحبؒ کی زبان بہت شیریں، لب ولہجہ بڑا ہی خوشگوار، اور انداز بیان ہلکا پھلکا بہت سلیس و دلنشیں تھا، قرآن پاک کی آیتیں، احادیث نبوی کے ٹکڑے اور صحابۂ کرامؓ واولیاء اللہ کے تاریخی واقعات اس طرح تقریر میں برجستہ پڑھتے اور بیان کرتے جاتے کہ سننے والا محو حیرت رہ جاتا، پوری تقریر مربوط، مدلل اور ذہن وفکر کو متاثر کرنے والی تھی، اپنا تاثر یہی تھا کہ اس قدر بلیغ، عام فہم اور موثر وعظ کبھی اور سننے میں نہیں آیا، یہ حقیقت ہے کہ آپ جہاں تقریر کرنے گئے چھا گئے، نہ گھن گرج، نہ نشیب وفراز، نہ ہاتھ پاؤں کے اشارے، سنجیدہ ومتین اور صاف وشستہ انداز، کہا جا سکتا ہے کہ آپ بلاشبہ اپنے دور کے بے مثال واعظ ومقرر اور جاندار خطیب تھے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب تک وہ تقریر ذہن کے گوشوں میں گونج رہی ہے۔

اب تک دور سے ہی سنا تھا اور دور سے ہی دیکھا تھا، ان دنوں خاکسار دارالعلوم معینیہ سانحہ ضلع مونگیر کی صدارت تدریس کی خدمت انجام دے رہا تھا، اور اس مدرسہ کو خس پوش چھپر سے پختہ بلڈنگ میں منتقل کرنے کی جدوجہد میں ہمہ تن مصروف تھا، ۳۰؍جون ۱۹۵۶ء کو دارالعلوم دیوبند (یوپی) کا ایک لفافہ ڈاک سے موصول ہوا، حیرت ہوئی کہ دیوبند میں میرا کوئی نہیں، کس نے یاد کیا، کھولا تو دارالعلوم کے پیڈ پر ٹائپ شدہ خط ملا۔

حضرت المحترم زید مجدکم السامی

سلام مسنون، نیاز مقرون، صحتوریٔ مزاج کا خواہاں ہوں، اس وقت ایک خاص ضرورت سے عریضہ لکھ رہا ہوں اور وہ یہ ہے کہ اس وقت دارالعلوم کے شعبہ تبلیغ اور یہاں کے نشر و اشاعت کو ایک ایسے فاضل کی ضرورت ہے، جو صاحبِ قلم، خوش تحریر، اور شرعی مسائل وحقائق کو دلنشیں پیرایہ میں اچھے اسلوب کے ساتھ، موجودہ دور کے تقاضوں کے مطابق پیش کرنے پر قادر ہو، بالخصوص مودودی صاحب اور جماعت اسلامی کے ان نظریات کا جو اہل سنت والجماعت کے مسلک سے ہٹے ہوئے ہیں، اصول ودلائل کی روشنی میں تجزیہ کر کے ان کا کھرا اور کھوٹا واضح کر سکتا ہو، نیز مخالف تحریرات سے انصاف واعتدال کے ساتھ اخذ کرنے اور اس پر سنجیدہ گرفت کرنے کا سلیقہ رکھتا ہو، اور معاندین کے شبہات واعتراضات کا شرعی مواد کی روشنی میں متانت کے ساتھ جواب دینے کی اہلیت رکھتا ہو، ساتھ ہی اکابر دارالعلوم کے بتلائے ہوئے اسالیب بیان وعنوانات کلام پر، ان کے ذوق وفکر کی روح کو محفوظ رکھتے ہوئے، اچھے ڈھنگ سے ان کے مقصود کی ترجمانی کر سکتا ہو، اور اسی کے ساتھ احیاناً دارالعلوم کی ضروریات یا بیرونی دعوت پر حسب موقع تقریر وبیان پر بھی قادر ہو۔

اس سلسلہ میں مختلف شخصیتوں کے نام کے ساتھ جناب کا اسم گرامی بھی سامنے آیا، بندہ کا حسن ظن تو ذات سامی کی نسبت جو ہے وہ ہے، اور وہی اس تحریر کا باعث ہوا ہے لیکن درخواست یہ ہے کہ معیار بالا کی رو سے اپنے بارے میں خود جناب بے تکلف اظہار خیال فرمادیں، کہ ان خدمات مطلوبہ کو جذبات مذکورہ کے ساتھ انجام دے سکیں گے یا نہیں؟ اگر دے سکیں تو مطلع فرمادیں تا کہ میں مجلس انتخاب میں اسم گرامی کو اپنی سفارش کے ساتھ پیش کر سکوں، ساتھ ہی اگر کوئی مقالہ یا رسالہ یا مضمون یا تالیفات میں سے ہو تو اسے بھی ارسال فرمادیں، خواہ مطبوعہ ہو یا مخطوطہ۔ امید ہے کہ مزاج گرامی بعافیت ہوگا۔

والسلام

محمد طیب

مہتمم دارالعلوم دیوبند ۳۰؍جون ۱۹۵۶

خاکسار نے اس خط کو بڑی عقیدت ومحبت کی آنکھوں پڑھا، دل نے گواہی دی کہ ایک عالم ربانی

ایک گمنام ناچیز کی عزت افزائی فرما رہا ہے، اور غالباً دو تین مرتبہ پڑھا، یہاں یہ ظاہر کرنے میں کوئی حرج نہیں کہ اب تک میں تحریر کی جامعیت اور قیود وشرائط میں حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہٗ کا قائل تھا، اور بحمد اللہ اب تک ہوں، مگر اوپر کا خط پڑھ کر حیرت زدہ رہ گیا، اور تحریر بالا کی جامعیت اور شرائط وقیود دیکھ کر دنگ تھا کہ اس میں حکیم الامتؒ کی تحریر کی پوری جھلک موجود تھی، اس پہلی تحریر کو اپنے نام سے پاکیزہ لب و لہجہ میں پڑھ کر دلی مسرت ہوئی، اور میری خود اعتمادی کو مہمیز لگی اور سمجھا کہ ایک گمنام، طالب العلم، اور نوعمر مدرس کو اس طرح خطاب فرمایا گیا، یہ محض رب العالمین کا فضل وکرم ہے، حضرت والا کا وعظ جلسہ میں سن چکا تھا، اب قلمی تحریر دیکھی دل ودماغ میں عظمت اور تقدس پیوست ہوگیا اور یقین کرنا پڑا کہ جیسا سنتا تھا، ویسا ہی بلکہ اس سے کچھ زیادہ پایا، پھر قدرت نے مجھے سانحہ سے دیوبند پہونچا دیا اور زندگی میں بالکل پہلی مرتبہ ۳؍صفر ۱۳۷۶ھ کو خدمت میں حاضر ہوکر اطمینان کے ساتھ ملا، کریمانہ اخلاق سے ملے بیان نہیں کرسکتا، پھر تو یہ دستور ہوگیا کہ دن کے کسی حصہ میں حضرت مہتمم صاحبؒ کی مجلس میں پابندی سے چلا جاتا، اور رات میں حضرت مدنیؒ کے درس بخاری میں حاضری دیتا، سال بھر پوری پابندی کی اور اس طرح مدت کی حسرت پوری ہوئی اور اپنے ان دونوں بزرگوں سے استفادہ کا موقع حصہ میں آیا۔

حضرت مہتمم صاحبؒ کی مجلس کے متعلق پورے تیقن کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اس دور میں ایسی عالمانہ مجلس اور حکیمانہ باتیں ناپید ہیں۔ اب اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا ہے۔ مسلسل گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ طلبہ اور علماء مختلف علمی سوالات کرتے اور حضرت مہتمم صاحبؒ برجستہ ان کا جواب دیتے اور کتاب وسنت سے دلائل بھی پیش کرتے جاتے اور عقلی طور پر ذہنوں میں واضح کرنے کی سعی فرماتے، نہ کسی پر تنقیدی تبصرہ ہوتا، نہ کسی کی غیبت۔ خالص علمی، دینی مسائل پر مسلسل گفتگو، کسی کا نام آیا تو بڑے ادب کے ساتھ نام لیتے اور اس کے فضائل ومناقب بھی بیان کرتے، اکابر دارالعلوم سے بہت گہری مناسبت اور دلچسپی تھی، ہر مجلس میں ان کے دوچار تاریخی حقائق کا تذکرہ ضرور آتا، سیرت سازی کا انداز ایسا دیکھنے میں نہیں آیا، کہ ایک سال رمضان کی مجلسوں کی تقریر یا گفتگو کے لئے بعض لوگوں نے ٹیپ ریکارڈ کا انتظام کیا، اور خاکسار نے ٹیپ ریکارڈ کی مدد سے ان باتوں کو مرتب کیا جو ''حکیم الاسلام اور ان کی مجالس'' کے نام سے کتابی شکل میں بہت پہلے چھپ کر شائع ہوچکی ہے، اس کتاب کو پڑھ کر اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت مہتمم صاحبؒ کی مجلس میں کتنے اور کیسے علوم ہوا کرتے تھے، اور اندازِ بیان کس قدر دلچسپ ہوتا تھا، دنیا جانتی ہے کہ حضرتؒ کا دل کینہ کپٹ اور میل کچیل سے بالکلیہ پاک وصاف تھا، دارالعلوم کے اساتذہ اور دوسرے علماء کا بڑا احترام فرماتے۔

مزاج خالص علمی اور دینی تھا، اہل علم کی بڑی قدر ومنزلت فرماتے تھے، میں جس سال نیا نیا یہاں آیا، سات آٹھ ماہ کے بعد دارالعلوم معینیہ سانحہ سے ایک محضر نامہ آیا کہ ہمارے مدرس جو آپ کے یہاں گئے ہیں ان کو واپس فرمادیں، اس دن مجھے اپنے دولت خانہ پر حضرت نے یاد فرمایا، جب میں حاضر ہو گیا تو اندر سے تشریف لائے، اور بیٹھ گئے، مزاج پوچھنے کے بعد کہنے لگے کہ آپ کے مدرسے سے ایک لمبا چوڑا محضر نامہ ملا ہے، اس سلسلہ میں کچھ دریافت کرنا ہے، پہلے دارالعلوم کے فضائل وحالات پر مختصر روشنی ڈالی، پھر فرمایا کہ جب آدمی نئی جگہ آتا ہے تو نئے حالات سے سابقہ پڑتا ہے، نئے ماحول میں کچھ افراد موافق ہوتے ہیں کچھ مخالف، کوئی تعریف کرتا اور کوئی تنقید، مگر یہ سب عارضی باتیں ہوتی ہیں۔ اور تھوڑے دنوں کے بعد آدمی کا ایک مقام بن جاتا ہے۔ پھر یہ سب بیان کر کے فرمایا کہ میں تو آپ سے صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ گھبرا تو نہیں گئے ہیں؟ میرے جواب کے بعد فرمایا مجھے آپ کا لحاظ وخیال ہے۔ دارالعلوم میں اہل علم کی تعداد میں اضافہ کرنا چاہتا ہوں، سیاسی تو بہت سارے علماء ہونے لگے مگر اہل علم کمیاب ہوتے جارہے ہیں۔ اس کمی کا مجھے احساس ہے، آپ جانتے ہیں آج کل ذوق علمی نایاب ہے، حالانکہ اصل چیز یہی ہے، علم پر تھوڑی دیر بولتے رہے، پھر اصل گفتگو پر آئے، آپ نے اپنی دو ضرورتیں بتائی ہیں، یہ دونوں پوری ہونگی اور دونوں کا ہی انتظام کرونگا، آپ بالکل مطمئن رہیں، اب میں آپ کے مدرسہ کو جواب لکھ دوں گا، آپ کو جو ضرورت ہو مجھ سے آکر بیان کریں۔

حضرت مہتمم صاحبؒ کی ان باتوں سے میں کافی متاثر ہوا اور اب تک جیسا میں نے ان کو سمجھا تھا اس کا تیقن بڑھتا ہی چلا گیا، مجھے یاد نہیں کہ اس کے بعد کبھی بھی میں اپنا کوئی مسئلہ چھبیس سال میں لے کر حضرت کی خدمت میں گیا یا اپنے سلسلہ میں کوئی بات کہی۔ مگر اس کا یقین رہا کہ مہتمم صاحبؒ کی نظرِ عنایت منعطف ہے۔ اہتمام کے نام جب کوئی علمی وتحقیقی سوال آتا تو عموماً میرے نام بھجوادیتے۔ میں جواب لکھ کر دفترِ اہتمام کے سپرد کر دیتا، حضرت نظرِ ثانی کر کے اسے بھجوادیتے۔

دو سال بعد دارالعلوم معینیہ کے اصرار پر ایک دفعہ مجھے تین ماہ کی رخصت لے کر وہاں جانا پڑا۔ حضرت مہتمم صاحبؒ نے اس وعدہ پر چھٹی بلا مشاہرہ منظور فرمادی کہ اس تین ماہ کے بعد فوراً حاضر ہو جاؤں گا۔ رخصت پر میرے چلے جانے کے بعد کچھ لوگوں نے یہ پروپیگنڈا کیا کہ میری واپسی نہیں ہوگی، اس لئے میری جگہ دوسرے صاحب کو رکھ لیا جائے، یہ باتیں حضرت مہتمم صاحبؒ سے بھی بار بار کہی گئیں اور مختلف لوگوں کے ذریعہ کہلوائی گئیں۔ حضرتؒ نے ان کی باتوں پر اعتماد کرنے سے پہلے اپنے قلم سے مجھے باضابطہ ایک خط

لکھا اور میری رائے معلوم کی اور اس کی حقیقت کیا ہے۔ خط یہ تھا۔

حضرت المحترم زید مجدکم السامی

سلام مسنون نیاز مقرون، الحمد اللہ بعافیت ہوں، امید ہے کہ آپ بھی بعافیت ہونگے، آپ نے تین ماہ کی رخصت حاصل کی ہے۔ جس کا تقریباً ایک تہائی حصہ پورا ہو چکا ہے، مجھے اس سلسلہ میں یہ عرض کرنا ہے کہ رخصت تو ایک ضابطہ کی چیز ہے وہ اپنی جگہ ہے، پوچھنا یہ ہے کہ اس رخصت کے بعد حقیقتاً ارادہ واپسی کا ہے یا نہیں؟ اگر ارادہ ہے تو آپ اسے قطعیت کے ساتھ تحریر فرما دیں لیکن اگر واپسی کا قصد نہ ہو، یا تردّد ہو تو عرض یہ کرنا ہے کہ اس منصب کے لئے جس پر کام کر رہے ہیں ایک موزوں شخصیت مل رہی ہے جو اپنی قابلیت اور وجود استحقاق کی بنا پر واجب التوجہ ہے۔ اگر آپ کی تشریف آوری نہ ہو تو ان سے بات چیت کی جائے اس لئے میں چاہتا ہوں کہ ضابطہ سے الگ ہو کر اپنا حقیقی منشاء واضح فرما دیں، آنے کی صورت میں آپ ہر حال مقدم ہیں۔ ساتھ یہ بھی کہ اس رخصت کے بعد کوئی رخصت نہ لیں اور وہ منظور بھی نہ ہو سکے گی اسکے ختم پر جو حقیقی ارادہ ہو اس سے قطعیت کے ساتھ مطلع فرما دیں۔

امید ہے مزاج گرامی بعافیت ہوگا، پرسانِ حال حضرات کی خدمت میں سلام مسنون۔

والسلام

محمد طیب از دیوبند ۷۸/۱۱/۱۸ھ

یہ ایک اجنبی ملازم کے ساتھ ہمدردی اور انصاف کا عالم تھا، خط بار بار پڑھا کہ ایک طرف آپ پر کس قدر دباؤ ہے، دوسری طرف ایک اہل حق کے حق کی کس قدر پاس داری ہے، اور آپ کو یہ معلوم ہو کر حیرت ہوگی کہ حضرت والا نے اپنا یہ خط رجسٹرڈ بھجوایا، معمولی ڈاک سے نہیں بھیجا۔

۲/ذی الحجہ ۱۳۷۸ھ کو خاکسار نے جواب میں لکھا کہ حاضری کا ارادہ ہے وہاں جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ غلط ہے انشاء اللہ خاکسار دارالعلوم دیوبند واپس آئے گا۔

حضرت والا کو جب میرا یہ جواب موصول ہو گیا تو پھر اس کا جواب بقلم خود تحریر فرمایا وہ مکتوب گرامی بھی پڑھا جائے۔

حضرت المحترم زید مجدکم السامی

سلام مسنون، نیاز مقرون! گرامی نامہ نے مشرف فرمایا، سابقہ عریضہ کا مقصد صرف آمد کا متعین کرانا تھا، سو وہ ہو گیا، اب خواہ ابھی آپ تشریف لے آئیں۔ یا رخصت پوری کر کے آئیں۔ بعض لوگوں نے

وثوق سے چونکہ یہ بیان کیا کہ آپ کا ارادہ واپسی کا نہیں ہے اس لئے عریضہ بھیجنے کی ضرورت پیش آئی، سو الحمدللہ بات صاف ہوگئی۔ دعا کا مستدعی ہوں۔

والسلام

محمد طیب از دیوبند ۲/۶/۷۸ھ

آپ اندازہ لگائیں حضرت اقدس مہتمم صاحبؒ کو اپنی ذمہ داری اور دوسروں کے حقوق کا کتنا لحاظ و پاس تھا، اور اپنے ماتحت کام کرنے والوں کی دل جوئی کس طرح کیا کرتے تھے، حضرت مہتمم صاحبؒ کی بڑی خوبی یہ تھی کہ سب پر نظر رکھتے تھے کہ کون کیسا ہے اور کیا کر رہا ہے، جفاکش، محنتی کارکن کو بہت پسند فرماتے تھے، یہ درست ہے کہ ایک معمولی مفاد پر بہت طبقہ غلط فہمیوں کا شکار بنانے کی جد و جہد میں بھی مشغول رہتا تھا، جیسا کہ ہر بڑے کے ساتھ ہوا کرتا ہے، مگر حضرت اپنی فطری ذہانت اور سالہا سال کے تجربہ کے بعد ان کی باتوں میں عموماً نہیں آتے تھے اور صحیح نتیجہ تک پہونچنے کی سعی فرماتے تھے اور اسے پا بھی لیتے تھے۔

جن دنوں میری چھٹی ختم ہو رہی تھی اس زمانہ میں حضرت اقدسؒ ۶ر محرم ۱۳۷۹ھ کو افریقہ روانہ ہو گئے روانہ ہوتے ہوئے دفتر کو تاکید فرما گئے کہ یاد دہانی کا ایک خط دارالعلوم معینیہ سانحہ میرے نام بھیج دیا جائے چنانچہ اس وقت کے نائب مہتمم حضرت مولانا مبارک علی صاحبؒ کی طرف سے یاد دہانی کا خط موصول ہوا۔

محترمی زید مجدکم

بعد سلام مسنون آ نکہ آپ کی رخصت قریب الختم ہے، لہٰذا آپ کو جلد پہونچ جانا چاہئے۔ حضرت مہتمم صاحب کے گرامی نامہ سے کیفیت واضح ہو چکی ہے کہ اس کی رو سے مزید رخصت کا قصد نہ فرمائیں اس کے لئے حالات مساعد نہیں ہیں لہٰذا آپ کا دارالعلوم میں واپسی کا قصد ہے تو فوراً تشریف لا کر اپنے کام میں لگ جائیے۔ تاخیر نہ فرمائیے حضرت مہتمم صاحب ۶ر محرم ۱۳۷۹ھ کو افریقہ تشریف لے جا چکے ہیں امید ہے آپ مع الخیر ہونگے۔

والسلام

محمد مبارک علی

نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند ۱۳/۱/۷۹ھ

یہ خط بھی بذریعہ رجسٹری بھجوا دیا گیا، مجھے غالباً ۲۳ر محرم سے حاضر ہونا تھا۔ بحمد اللہ میں وقت پر دارالعلوم حاضر ہو گیا اور اپنی مفوضہ خدمت انجام دینا شروع کر دی۔

اسی طرح ایک دفعہ فتاویٰ دارالعلوم دیوبند مدلل ومکمل پر بحیثیت مرتب نام کا مسئلہ سامنے آیا تو دفتر نے نہ معلوم کس کے مشورہ سے میرا نام حذف کر دیا اور صرف شعبہ ترتیب فتاویٰ لکھا ہوا رہنے دیا، جب یہ مسئلہ میرے سامنے آیا میں نے کہا اس میں میرا کوئی نقصان نہیں، ذمہ داری ہلکی ہو جائیگی مگر یہ بات دوسروں تک پہونچی، بعض ممبران شوریٰ نے یہ بات سنی تو ان کو حیرت ہوئی کہ بغیر نام اس کی غلطیوں کی ذمہ داری کس پر ڈالی جائے گی، انھوں نے دفتر اہتمام کو اس طرف توجہ دلائی، بالخصوص امیر شریعت حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ نے۔

حضرت مہتمم صاحبؒ پاکستان تشریف لے جا چکے تھے۔ مولانا عبدالحق صاحب پیشکار نے مجھے بلایا اور کہا یہ صورت ہے آپ مناسب سمجھیں تو ایک خط حضرت مہتمم صاحبؒ کے نام لکھ دیں میں اس کو اپنے خط کے ساتھ پاکستان بھجوا دونگا۔ حضرت کے خط آ جانے کے بعد بات صاف ہو جائے گی چنانچہ میں نے فتاویٰ دارالعلوم کے ٹائٹل پر مرتب کے نام لکھے جانے کے سلسلہ میں دریافت کیا کہ حضرت کی رائے کیا ہے؟ چنانچہ حضرت والا نے پاکستان سے جواب میں یہ خط لکھا:

محترمی زید مجدکم السامی

سلام مسنون، اخلاص مقرون، گرامی نامہ ملا میں آج ہی سرگودھا پہونچا ہوں، پرسوں لائل پور کیلئے روانگی ہے، جولائی کے پہلے ہفتہ میں دیوبند پہنچ جانے کی توقع ہے۔ انشاءاللہ۔

فتاویٰ دارالعلوم کے سلسلہ میں ٹائٹل پر بحیثیت مرتب فتاویٰ آپ کا اسم گرامی آنا میرے خیال میں قابل اعتراض نہ ہونا چاہئے، بلکہ حق پسندی کا تقاضہ یہی ہے کہ یہ نام آنا آپ کا حق ہے، جب کہ اول سے آخر تک محنت آپ کی ہے، احقر کی رائے آپ کے گرامی نامہ کے بعد یہی ہے کہ نام کی تصریح ضرور ہونی چاہئے۔

امید ہے کہ آپ بعافیت ہونگے، دعا کا خواستگار ہوں، حضرت مفتی صاحب اور دوسرے بزرگوں سے بشرط ملاقات و یاد سلام فرما دیں۔ مولوی عبدالحق صاحب کا خط مل گیا ہے ان کو سلام فرما دیں۔

محمد طیب از سرگودھا مدرسہ سراج العلوم

یوم چہار شنبہ ۸۲/۱/۹ھ

یہ مکتوب گرامی براہ راست دارالافتاء کے پتہ پر خاکسار کے نام موصول ہوا، میں اسے لے کر نائب صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا، پیشکار اور نائب صاحبؒ نے مشورہ کے بعد سید محبوب رضوی صاحب مرحوم کو بلا کر فرمایا کہ اس بلاک میں مرتب کے نیچے اور شعبہ ترتیب کے اوپر محمد ظفیر الدین کسی کاتب سے بڑھوا

دیں چنانچہ اس طرح فتاویٰ دارالعلوم پر خاکسار کا نام جو خارج کیا جا چکا تھا ٹائٹل پر لکھا گیا اور وہ برابر چلا آ رہا ہے اور بحمد اللہ اس وقت تک فتاویٰ کی بارہ جلدیں چھپ کر شائع ہو چکی ہیں اور ہر سال دو تین جلدوں کے نئے ایڈیشن چھپتے ہیں۔ اس سال ایران کے ایک عالم نے فتاویٰ دارالعلوم کو فارسی میں منتقل کرانے کی اجازت بھی حاصل کی ہے، خدا کرے یہ کام کر رہے ہوں۔ فتاویٰ پر نام کے قصے کے بعد ہی اسی سال دو چار ماہ بعد نہ معلوم کس وجہ سے یہ حادثہ پیش آیا کہ مجلس شوریٰ نے مجھے دارالافتاء سے کتب خانہ دارالعلوم دیوبند میں منتقل کر دیا، اور میرے فرائض میں کتب خانہ کی نئی ترتیب و تنظیم داخل فرمائی، گویا میری ذمہ داری یہ طے پائی کہ اوقات مدرسہ میں کتب خانہ کی تنظیم و ترتیب کا فریضہ میں ادا کروں اور خارج اوقات میں ترتیب فتاویٰ دارالعلوم کی خدمت انجام دینے کی جدوجہد کروں۔

بحیثیت ملازم شوریٰ کا یہ حکم ماننا تھا۔ آپ کو یہ معلوم ہو کر تعجب ہوگا کہ فتاویٰ کی پہلی جلد کے سوا بقیہ گیارہ جلدیں خارج اوقات کی ہی مرتب کی ہوئی ہیں اور یہ سارا کام حضرت مہتمم صاحبؒ کی سرپرستی میں انجام پایا ہے کوئی شبہ نہیں کہ یہ تبادلہ میرے لئے تکلیف دہ ثابت ہوا، جب تبادلہ کا یہ حکم آیا میں وہ کاغذ لے کر حضرت مہتمم صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا حضرت! یہ کیا ہوا؟ فرمانے لگے سو سال سے زیادہ ہو گیا کتب خانہ کی ترتیب و تنظیم نہیں ہوئی، ممبران شوریٰ کو بھی اس کی شکایت ہے اور دوسرے اہل علم کو بھی جب کسی کتاب کی ضرورت ہوتی ہے اس کی تلاش میں کئی کئی دن لگ جاتے ہیں۔ اس جگہ کے خواہش مند دوسرے کئی حضرات تھے کہ ان کا وہاں تقرر کر دیا جائے مگر ممبران شوریٰ کی رائے متفقہ طور پر آپ کے لئے ہوئی۔ جس میں خود میں بھی داخل ہوں۔ لہٰذا آپ اسے منظور کر کے کام شروع کر دیں، میں نے عرض کیا حضرت یہ تو میرا تنزل ہو گیا، میری تنخواہ ناظم کتب خانہ سے اس وقت زیادہ ہے پھر کتب خانہ میں ترقی کی کوئی منزل نہیں، یہاں میرے لئے ترقی کے مواقع تھے، میں نے محسوس کیا کہ میری باتوں سے متاثر ہوئے اور آپ کی سمجھ میں یہ بات آ گئی، تھوڑی دیر خاموش رہے فرمایا دارالعلوم کی علمی خدمت سمجھ کر یہ کام کریں، انشاء اللہ برکت ہوگی، اور میں آئندہ آپ کا خیال رکھوں گا، پھر دارالافتاء میں لے آؤں گا، وہاں دو ایک آدمی اور تھے، انھوں نے مذاقاً کہا کہ تم جمعیتی ہو اور ناظم کتب خانہ بھی سیاسی ہیں، دونوں کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ میں نے دیکھا کہ یہ سنتے ہی حضرتؒ کا چہرہ غصہ سے تمتما اٹھا فرمانے لگے یہ سب بیہودہ باتیں ہیں، پیش نظر دارالعلوم اور اس کی خدمت ہے اور یہی رہنی چاہئے، پھر تھوڑی دیر دارالعلوم کی برکات پر بولتے رہے اور مجھے مطمئن فرماتے رہے اور کہنا چاہئے حضرت کی تقریر سے میرے دل کا بوجھ بڑی حد تک ہلکا ہو گیا۔

یہاں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ حضرت مہتمم صاحبؒ کا ذہن وفکر دارالعلوم اوراس کی خدمت کے گرد کام کرتا تھا اور اپنے ملازم کی دلدہی اپنا اہم فریضہ سمجھتے تھے اور جب کوئی خدمت میں حاضر ہوتا تو اس کو مطمئن کر کے واپس فرماتے تھے۔

حضرت مہتمم صاحبؒ بڑی خوبیوں کے مالک تھے محاسن اخلاق اور اخلاص ومروت کے پیکر تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ساری سادگی کے باوجود بڑا رعب ووقار عطا کر رکھا تھا، بڑے بڑے عظیم المرتبت انسان آپ کے سامنے آ کر مرعوب ہوجاتے تھے، جاہ وجلال، رعب ودبدبہ، اور شرافت ومروت چہرہ سے عیاں تھی، یہی نہیں کہ وہ عوام کے سامنے بے جھجک تقریر فرماتے بلکہ علماء کرام اور صوفیاء عظام کے مجمع میں جب بولتے تو اندازہ ہوتا کہ آپ کا مطالعہ کس قدر وسیع تھا، حافظ قرآن اور قاری تو تھے ہی لیکن اسی کے ساتھ ان احادیث کا بڑا ذخیرہ برزبان تھا، جن کا تعلق عوام وخواص کے اعمال واخلاق اور عقائد سے ہے۔

دارالعلوم میں جب تقسیم انعام کا جلسہ ہوتا تو عام طور پر حضرت مہتمم صاحبؒ کی معرکۃ الآرا تقریر ہوتی، سارے علیا کے اساتذہ، تمام شعبہ جات کے نظماء مفتیان کرام اور پورے دارالعلوم کے طلبہ موجود ہوتے، تقریر کا لب ولہجہ بڑا ہی دلنشیں ہوتا علماء جھوم جاتے تھے اور یہ کہہ کر اٹھتے تھے کہ حضرت مہتمم صاحبؒ کو خطاب کا حق ہے، جیسا مجمع ہوتا اور جہاں جس طرح کا موقع ہوتا اسی انداز کا خطاب بھی ہوتا تھا۔

حضرت مولانا فخر الدین احمد صاحبؒ صدر المدرسین وشیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند کی وفات کے بعد جب سوال پیدا ہوا کہ بخاری شریف کا درس کون دے، تو تمام اساتذہ اور اراکین شوریٰ نے اس خدمت کے لئے حضرت اقدس کا انتخاب کیا، حالانکہ عرصہ سے درس وتدریس کا سلسلہ تقریباً بند سا تھا، مگر باوجود حضرت والا نے تین چار ماہ بخاری شریف کا درس دیا اور جمعہ کو طلبہ کو پڑھایا، کتابی صلاحیت بھی بہت اچھی تھی، چونکہ جوانی میں مستقل یہ خدمت انجام دے چکے تھے، اور مشکوٰۃ شریف کا درس اور اسی طرح حجۃ اللہ البالغہ کا درس تقریباً پوری عمر دیتے رہے، آپ کا ذہن ہر وقت حاضر ہوتا تھا، دماغ بیدار پایا تھا اور فکر صحیح اور دوررسی حصہ میں آئی تھی، اللہ تعالیٰ پر پورا اعتماد تھا، دارالعلوم کے اہتمام نے اعتماد کو اور پختہ کر دیا تھا، جب کوئی یہ بات ذہن نشیں کر دیتا حضرت یہ کام دارالعلوم میں بہت ضروری ہے، اور مفید بھی، اگر یہ بات سمجھ میں آ گئی فوراً اس پر عمل کرتے، کچھ لوگ کہتے حضرت بڑا خرچ ہے روپئے کہاں سے آئیں گے؟ فرماتے یہ خدا کا کام ہے، میرا کام ابتداء کر دینا ہے، تکمیل وہ کریگا، یہ بھی کہتے زندگی کا تجربہ ہے کہ جو کام دارالعلوم کا شروع کر دیا گیا، اللہ تعالیٰ نے پورا کر دیا، حضرت مہتمم صاحبؒ کے زمانہ میں بحیثیت صدر جمہوریہ پہلے راجندر

پرشاد آئے اور پھر فخر الدین علی احمد دونوں ہی حضرات دارالعلوم اور اس کے مہتمم کے اخلاق سے خوش ہو کر گئے اور زندگی بھر مہتمم صاحبؒ کے مدح خواں رہے، عرب ممالک کے سیکڑوں وفود مختلف مواقع سے آتے رہتے ہیں۔ مہتمم صاحبؒ سے ملکر بہت خوش ہوتے تھے، اللہ تعالیٰ نے آواز میں بڑی کشش دے رکھی تھی، حکیمانہ انداز بیان کا سبھوں پر ہی کم وبیش اثر پڑتا تھا، رجسٹر معائنہ جات سے اس کی تصدیق ہوسکتی ہے۔

سرکاری مہمانوں سے کبھی کبھی الجھن محسوس فرماتے تھے اور کہا کرتے تھے ہم فقیروں کے یہاں ان بادشاہوں اور ان کے پیروکاروں کا کیا کام، انھیں دیکھ کر کبھی مجھے وحشت ہوتی ہے، حکومت کی امداد سے بانی دارالعلوم حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے روک رکھا تھا اس لئے کبھی دارالعلوم نے سرکاری امداد قبول نہیں کی، ہندوستان کی آزادی کے بعد مختلف حلقوں سے کہنا چاہئے دباؤ ڈالا گیا کہ اب حکومت سے امداد قبول کرنے میں کیا مضائقہ ہے۔ لیکن حضرت مہتمم صاحبؒ قبول کرنے سے ہمیشہ سے گریز اختیار کیا کرتے اور کسی نہ کسی طرح ٹال جاتے، فرماتے تھے جب مسلمان دارالعلوم کی ساری ضرورتیں پوری کردیتے ہیں پھر حکومت وقت کی امداد کیوں قبول کی جائے۔

طبیعت میں غایت درجہ تواضع تھی، کبھی بھی کبر وغرور کا شائبہ نہیں دیکھا گیا، بارہا دیکھا کہ جب دارالعلوم میں تقریر کے لئے کھڑے ہوئے فرمایا کہ آپ کی ہی طرح ایک ادنیٰ طالب علم ہوں۔ مجھ میں اگر کچھ اچھی بات پائی جاتی ہے وہ دارالعلوم کا اور اس کے اکابر کا صدقہ ہے۔ معمولی سے معمولی آدمی سے بھی بڑے تپاک سے ملتے، یہ بھی فرماتے تھے کہ میں جہاں جاتا ہوں دارالعلوم میرے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ دارالعلوم کو بین الاقوامی ادارہ بنانے میں حضرت کا بڑا ہاتھ ہے۔ یورپ، امریکہ، افریقہ اور عرب ممالک جہاں تشریف لے گئے اولاً تذکرہ دارالعلوم کا فرمایا، دارالعلوم آپ کا اوڑھنا بچھونا تھا، آپ دارالعلوم کے نشان بن گئے تھے جہاں دارالعلوم کا نام آتا ساتھ ہی آپ کا نام آتا اور جہاں آپ کا نام آتا دارالعلوم کا نام آتا، دونوں نام لازم وملزوم سے ہوگئے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے زبان میں بڑی تاثیر دے رکھی تھی، جو بات کہتے ایسا معلوم ہوتا کہ دل میں اتر گئی، یہی وجہ ہے کہ سیکڑوں بدعتی خاندان دیوبندی المسلک ہوگئے اور بدعات وخرافات سے توبہ کی پھر علماء دیوبند کے گرویدہ ہوگئے، جو فرماتے مثبت انداز میں فرماتے، مناظرہ اور بحث ومباحثہ کی عادت نہیں تھی۔ برا تو اپنے دشمن تک کو نہیں کہتے تھے، ذہن وفکر تعمیری تھا، تخریب سے ذرا بھی لگاؤ نہیں رکھتے تھے، تخریب کاروں سے متنفر اور دور رہنا پسند کرتے تھے۔

تصوف میں پہلے شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن عثمانیؒ، پھر محدث کبیر حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ اور اخیر میں حکیم الامت حضرت تھانویؒ سے وابستہ ہوئے، اور خرقہ خلافت اسی دربار سے عطا ہوئی، حضرت نانوتویؒ کی نسبت کی وجہ سے سارے بزرگ آپ سے خصوصی تعلق رکھتے تھے، اور آپ کی طرف متوجہ رہتے تھے، خود ذاتی اوصاف وکمالات کے بھی آپ مالک تھے، علم وفضل چہرہ مہرہ سے ظاہر ہوتا تھا۔ ارشاد و بیعت کا مشغلہ بھی تھا مگر پہلے دارالعلوم پھر کچھ اور، کھلے عام ارشاد و بیعت کا مشغلہ نہ تھا۔ اگر کسی نے اصرار کیا تو بیعت فرمالیا، اس معاملہ میں طبیعت میں بے نیازی کی شان تھی، یہی وجہ ہے کہ آپ کے مسترشدین میں خواص زیادہ ہیں اور وہ بھی اہل علم اور سنجیدہ ومتین، خاموش مزاج لڑنے جھگڑنے سے گریزاں اور اپنے کام سے کام رکھنے والے، پھر بھی ملک اور بیرون ملک میں آپ کے فیض یافتوں کی کافی تعداد ہے، اس راستہ سے بھی ایک بڑے طبقہ نے آپسے فائدہ اٹھایا، ایک گرامی نامہ میں لکھتے ہیں۔

محترمی ومکرمی سلام مسنون

سلام مسنون، نیاز مقرون، گرامی نامہ نے مشرف فرمایا، میں اپنی عدیم الفرصتی کے بارہ میں کیا عرض کروں، چار پانچ سو آدمیوں سے سابقہ روزانہ تعلیم وتلقین اور تقریر کا سلسلہ رات ودن کے مختلف حصوں میں رہتا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وابستہ لوگوں کی تعداد کم ہونے کے باوجود خاصی ہوا کرتی تھی، لیکن یہ سب خدمت خاموشی کے ساتھ انجام پائی تھی، کیوں کہ نہ کوئی مہمان خانہ تھا، نہ خانقاہ تھی، نہ مریدین کا سال کے کسی حصہ میں کہیں اجتماع ہوتا تھا، جب کبھی حضرت کی سوانح مرتب ہوگی تو ممکن ہے اس میں اس کی کچھ تفصیل آئے۔

بڑی خوبی یہ تھی کہ مہتمم صاحب قدس سرہٗ صاف باطن تھے، قلب میں کہیں کھوٹ نہیں تھا، جس سے جتنا تعلق ہوتا، اس کا لحاظ و پاس تھا، اور موقع پا کر اس کا اظہار بھی فرمادیا کرتے تھے، ایک دفعہ پاکستان تشریف لے گئے، اور قیام لمبا ہوگیا، تو دیوبند سے مختلف لوگوں نے لکھا کہ حضرت والا کی جدائی بہت محسوس ہو رہی ہے، جلد تشریف لے آئیں۔ اسی زمانہ میں خاکسار کے اس طرح کے ایک خط کے جواب میں تحریر فرمایا۔

سلام مسنون، نیاز مقرون، گرامی نامہ باعث شرف وانبساط ہوا، نامۂ محبت نے دل میں یاد ومحبت میں تموج پیدا کر دیا۔ یہ محبت نہ مٹنے کی چیز ہے، نہ مٹائی جاسکتی ہے، انشاءاللہ یہ یاد آخرت تک ساتھ جانے والی ہے۔ اس لئے باقی ہے اور باقی رہے گی، یہاں کے عزیزوں اور دوستوں نے ویزہ اکتوبر تک بڑھوایا ہوا ہے، اور اسی کے تحت پروگرام ہیں، جلسوں کے سلسلہ کی بات آپ جانتے ہیں کہ جلسے والے سب کچھ گوارہ کر

لیتے ہیں، لیکن پروگرام کے بارے میں جان لڑا دیتے ہیں۔ میرٹھ، بمبئی وغیرہ میں بارہا اس کی نوبت آئی کہ مجھے بخار شدت کا چڑھا ہوا ہے لیکن جلسے والوں نے اپنی بدنامی کے تصور پر دوسرے کے آرام کو نثار کر دیا، اس لئے پروگرام بہرصورت پورے کرنے پر مجبور ہو گیا ہوں، آپ حضرات کی یاد دل میں کتنی ہے؟ الفاظ میں لانے کی چیز نہیں۔

ایسی ہی یادیں کچھ ادھر بھی ابھری ہوئی ہیں، **وقد یوذیٰ من المقت الجبیب**. یہاں سب اعزہ بعافیت ہیں، ملنے کے لئے دوسرے شہروں سے بھی لوگ آتے رہتے ہیں، وہاں سب پرُسان حال حضرات کی خدمات میں سلام مسنون پہونچا دیا جائے۔ والسلام

محمد طیب

از کراچی نمبر ۱۸/ ناظم آباد نمبر مکان زاہر قاسمی

۷/ ۷/ ۸۸ھ

حضرت مہتمم صاحبؒ میں جہاں بے انتہا مروت تھی وہیں بے پناہ شفقت ومحبت کا بھی جذبہ تھا، اپنے چھوٹوں پر مہربان تھے، جب میں پہلے سال دارالعلوم میں آیا، تو مجھ سے جو کام متعلق تھا، وہ تصنیف وتالیف کا تھا، ''جماعت اسلامی کے دینی رجحانات'' میری پہلی کتاب تھی جو دارالعلوم دیوبند سے شائع ہوئی، رمضان قریب آیا تو زندگی بھر کی عادت رمضان گھر گذارنے کی تھی، یہاں معلوم ہوا کہ شعبہ جات دیگر کو رمضان کی چھٹی نہیں ملتی ہے۔ میں نے خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ رمضان گذارنے کی اجازت وطن میں دیدیں فرمایا ضابطہ میں آپ کے شعبہ کی چھٹی نہیں ہے، میں نے کہا پھر میرا کیا ہوگا، میری اداسی دیکھ کر فرمانے لگے، تصنیف وتالیف کا کام آپ گھر بھی تو کر سکتے ہیں، میں نے جواب دیا ضرور کرتا رہوں گا، اس کے بغیر تو وقت ہی نہیں گذرے گا، فرمانے لگے اچھا پھر پینسل لیکر کچھ لکھنے لگے، وہ کاغذ میری طرف بڑھا کر فرمایا اس مضمون کی درخواست لکھ کر پیش کریں۔ میں نے وہ کاغذ لے لیا وہ باضابطہ درخواست کا مضمون تھا اسے نقل کر کے پیشکار صاحب کے حوالہ کر دیا دوسرے دن پیشکار صاحب نے بتایا کہ آپ کی درخواست منظور ہو گئی ہے۔ جب بھی یہ واقعہ یاد آتا ہے حضرت والا کی شفقت بیتاب کر دیتی ہے، کیا آدمی تھے، واقعی فرشتہ خصلت اور معصوم کردار کے مالک تھے، کبھی کسی معمولی سے معمولی انسان کا بھی دل توڑنا پسند نہیں کیا، انشاء اللہ برزخ و آخرت میں حضرتؒ کی بھی دلجوئی و دلداری ہوگی، اور اللہ تعالیٰ آپ کے ساتھ ایسی شفقت ومحبت کا معاملہ کریں گے جیسی اس کی رافت ورحمت کی شان ہے۔

اخیر بیماری میں دیکھا کہ غم والم نے خون نچوڑ لیا تھا، ذہنی وفکری اذیت نے نڈھال کر دیا تھا، مگر جب بھی کوئی ملنے حاضر ہوتا چہرہ پر وہی بشاشت ہوتی اور مسکراتے ہوئے مزاج پوچھتے، ڈیڑھ ماہ اس طرح گذارا کہ کھانا بالکل نہیں کھایا، مگر چہرہ کی رونق میں کوئی فرق نہیں دیکھا گیا، گفتگو کا وہی انداز رہا جو پہلے تھا، جب قلم لے کر بیٹھتے تو اس کمزوری میں بھی گھنٹوں لکھتے چلے جاتے، گفتگو ہمیشہ علمی دینی فرماتے تھے۔

ایک بار فرمانے لگے ایک حدیث ہے نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ہتھیلی رکھی۔

وضع کفه بین کتفی حتی و جدت بر د أناملِه بین ثدیی. یہ حدیث کہیں آئی ہے کہاں ہے؟ میں نے عرض کیا حضرت یہ حدیث مشکوٰۃ شریف میں بھی آئی ہے، فرمانے لگے اسے نقل کر کے حوالہ بھیج دیں اس کی ضرورت ہے۔ میں سوچتا رہا کہ اتنے دنوں سے بیمار ہیں کھانا بند کر رکھا ہے، خود سے اٹھ بیٹھ نہیں سکتے مگر علم کے ساتھ یہ وابستگی ہے چنانچہ میں نے وہ حدیث نقل کر کے حضرتؒ کے پاس بھیج دی۔ اس لمبی بیماری میں مجھے یاد نہیں کہ خود سے کبھی بیماری یا کمزوری کا شکوہ زبان پر آیا ہو گفتگو ہوتی تو یا کوئی علمی مسئلہ بیان کرتے یا دارالعلوم کی تعلیم کے متعلق پوچھتے کہ تعلیم ہو رہی ہے؟ جواب عرض کیا جاتا حضرت تعلیم جاری ہے، فرماتے الحمدللہ مقصد تعلیم وتربیت ہی ہے، اکابر واسلاف کا جو مسلک ومشرب ہے اس میں فرق نہیں آنے دینا چاہئے۔

کبھی کبھی بڑی حسرت کے ساتھ فرماتے کہ اپنی جماعت میں پھوٹ پڑ گئی اسے ختم ہونا چاہئے۔ یہ بھی ایک دن فرمایا کہ اختلاف ظاہر ہونے کے بعد تقریریں میں نے تقریباً بند کر دیں، شرم معلوم ہوتی ہے کہ ان حالات میں دوسرے کو خطاب کروں، جب اپنے گھر میں اختلاف جاری ہے، ذہن وفکر ہمیشہ بیدار رہا، ایک لمحہ کے لئے بھی غفلت میں نہ پایا گیا، موت بھی ایسی ہوئی کہ کسی کو خبر نہیں ہوئی، بات کرتے کرتے، ذرا سانس تیز ہوئی ایک دو منٹ میں اعلیٰ علیین روح پہنچ گئی، جنازہ میں اتنا بڑا مجمع ہوا کہ بوڑھے تک یہ کہتے نہیں تھکتے کہ آج سے پہلے کسی جنازہ میں اتنے آدمی نہیں دیکھے گئے اور نہ کبھی دیوبند میں اتنے بڑے مجمع کا تصور ہو سکتا تھا۔

............❖............

حکیم الاسلامؒ کا نقش جمیل

مولانا حکیم عبدالرشید محمود گنگوہیؒ

آہ! مولانا محمد طیبؒ رہ گزر آخرت ہوگئے۔ ہونا ہی تھا، نہ کوئی نئی بات ہے نہ غیر متوقع حادثہ، مگر دلوں کی دنیا اور یادوں کی بستی سے ان کا نقش جمیل مٹ جانا ممکن نہیں، وہ باقیات صالحات سے بھی تھے اور ''**وجعلها كلمة باقيةً فى عقبهٖ**'' ان کی زندگی اور زبان یہی تھی۔ ان کی شیریں زبانی، شگفتہ بیانی، صورت نورانی، ہوش مندی وفکرار جمندی ذہن اور دردمندی دل کو کون بھلاسکتا ہے، دوائر علمیہ میں ان کی جامعیت۔ علوم وافکار کا تنوع، تبحر، ادبی ذوق، خوبیٔ تعبیر، حسین وبدیع ترجمانی، مجامع میں خطاب گویا فلک اعلیٰ سے ''**اذا تكلم يخيل الينا انه يويد**'' کا سا کیف، حکمت ربانیہ ولی اللہی بھی، ابن جوزی کی سی سحر انگیزی بھی کس صاحب ذوق جو ہر شناس کو رہ رہ کر یاد نہ آئے گی۔

''**عجزت النساء ان يلدن مثل طيب**'' اب وہ کوہ کن کی بات کوہ کن کے ساتھ کس کس نادرہ اور خلیقہ پر تعجب کریں۔ زبان ایسی کہ سب سمجھیں، بیان ایسا کہ دل مانے، عقل کی پاسبانی بھی۔ ''لیکن کہیں کہیں اسے تنہا بھی چھوڑ دے'' کے سے افکار بھی دلائل عقلی بھی، نقلی بھی، جدلِ عدل بھی انفسی، آفاقی بھی اور حقائق ومعرفت آگیں بھی۔ میں نے مجلس سے اٹھتے ہوئے اکثر لوگوں کو کہتے ہوئے سنا۔

عالم کیا ہے ایک دریا ہے عجیب نابغیت۔

آہ! آخر وہ وقت آگیا ؏

عشية قيل طيب ليس فينا

انہی کا یہ شعر ہے ؎

خوگر عیش وطرب اب آہ اپنا دل نہیں — اے تماشا گاہِ عالم بس تجھے آداب ہے

بے شمار محاسن ومکارم اور مناقب ومحامد کے ساتھ ان کی طبع لین، علم وفضل سے معمور، سیرت، معاملات ومعاشرت میں ستھرا، بے عیب متوازن کیریکٹر، جدال ومراء سے تنفر، غیر متصادم مزاج۔

''(بھائی میں لڑنا نہیں چاہتا لڑنا میری افتادنہیں)'' اہم امور وحوادث میں ان کی ایسی رواداری کہ بعض اشخاص کو تداہن وتہاون کا شبہ ہو جائے مگر سچ پوچھئے تو وہ مسامحت تھی نہ مداہنت۔ اب کون ہے جو اس کا دعویٰ کر سکے۔

ہاں مگر بشری اقسام کا انفکاک بھی ممکن نہیں، ممکن کبھی اس سے مامون نہیں ہوسکتا **الا القوم الخاسرون** اخیر کے چند سال جس ضیق خلجان اور ذہنی انتشار کے گزرے بجز اس کے کیا کہا جاوے کہ **و کان امر اللّٰہ قدراً مقدوراً**.

اللہ تعالیٰ ان کو کفارۂ سیئات بنادے۔ یہ ابتلاءِ عام ہے۔ عوام اور علماء حسب حالات سب ان میں مبتلا ہیں۔ بقول مولانا ندویؒ مسلمانوں سے اجتماعی کام کی صلاحیت اٹھتی جارہی ہے۔ ارتفاقی مزاج کم ہورہا ہے۔ کون تبریہ کرسکتا ہے۔ **الانبیاء اشد بلاء فالامثل**. مگر اس شخصیت کے خدوخال وجمال محبوبی میں ان کا محسوس ہونا ناگزیر تھا۔ پھر ہوا جو کچھ ہوا۔ اور کہا گیا جو نہ کہنا تھا حق بھی ناحق بھی۔ حدود کے اندر بھی، تجاوز بھی۔ اخلاص سے حق کہا گیا کہنے والا ماجور۔ ناحق اور حدود سے متجاوز کہا گیا۔ تو اس کی شکایت ہی کیا۔

مانجیٰ اللّٰہ والرسول معاً من لسان الوریٰ فکیف انا

اب تعزیتاً آپ کے متعلقین، پسماندگان سے وہی کہتا ہوں جو ایک بدوی نے حضرت ابن عباسؓ سے ان کی وفات پر کہا تھا کہ

خیرٌ من العباس اجرك بعدہٗ واللّٰہ خیرٌ منك للعباس

آپ کو عباسؓ سے بہتر ان کی وفات کا اجر مل گیا۔ اور عباسؓ کو آپ سے بہتر اللہ اور لقاءِ رب میسر ہو گیا۔ زیادہ موجب تاسف وتالم یہ مضمون ہے۔

اِذا مات العالم ثلمة فی الاسلام لایسدھا الا عالم آخر. ورنہ ویسے تو

نزلنا ساعة ثم ارتحلنا کذا لدنیا رجالٌ فارتحلنا

قانون ہے۔ اب عالم آخر کہاں کب، اللہ جانے۔ البتہ اس دعا کی ضرورت ہے

قرب الرجال الیٰ دیار الآخرة فاجعل الھی خیر عمری اٰخرة

بڑوں کا اٹھنا حرمان تو ہے ہی پیش آنے والے خطرات کا ارہاض بھی ہے، اب تک جانے کتنے فتنے

رُکے ہوں گے۔ انابت واستعاذت کی ضرورت ہے۔

یہ خط ختم کر چکا تھا کہ لکھنؤ کے کچھ حضرات اور ایک قاری اسلم نامی تشریف لے آئے۔ دفعتہً نصف صدی قبل کا واقعہ ذہنی اسکرین پر ابھرا۔ میرے حضرت والد صاحبؒ علیل ہوکر شفایاب ہوئے تھے۔ دیوبند سے ایک بڑا مجمع حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ، مولانا اعزاز علی صاحبؒ، حضرت علامہ ابراہیم صاحبؒ اور حضرت سید اصغر حسین میاں صاحبؒ وغیرہ مزاج پرسی کو تشریف لائے۔ مولانا محمد طیب ۲۵ رسالہ بھی ساتھ تھے۔ بعد مغرب کا وقت تھا۔ حضرت حکیم صاحبؒ نے فرمایا: طیب ایک رکوع سناؤ یاد ہے۔ **ولقد خلقنا الانسان ونعلم ماتوسوس به نفسه الی آخره** سنایا۔ سماں بندھ گیا۔ آنکھیں پُرنم ہوگئیں۔ میرے کانوں نے یہ خوش لحنی عمر میں پہلی مرتبہ سنی تھی، ساز بھی سوز بھی۔ دل گداز بھی نغمہائے دلکش سحاب اندر سحاب بھی۔ یہ پہلا نقش تھا جو آج بھی تازہ ہے۔ اس کے بعد دیوبند پہنچ کر تو بارہا سنی۔ جہری نمازوں میں بھی اکثر جب وہ ہوتے امامت وہی کرتے۔ جس کا لحن بھی لحن طیبی سے کچھ مشابہ ہوتا۔ میں تاثر لیتا۔ اب برسوں سے اس کی نوبت نہیں آئی تھی کہ کچھ سنتا۔ مولاناؒ کہولت سے گزر کر شیخوخت کی منزل میں آ گئے تھے۔ لحنیت اور گلے کے گھنگروا پناز یروبم ختم کر چکے تھے۔

پرسوں یہ لکھنوی حضرات اور قاری اسلم ندوی آئے میں نے کچھ سنانے کی فرمائش کی۔ برائے نام کچھ تشابہ تھا یا ذہن نے محسوس کیا قریب تھا کہ دل اور آنکھیں بے قابو ہوجائیں۔ بندوضبط ٹوٹ جائے۔ قراءتِ طیب یاد آ گئی۔ اوپر سے یہ حادثہ سن ہی چکا تھا۔ **عشية قيل طيب ليس فينا**۔ آج وہ نہیں ہیں وہ عصر ختم ہوگیا۔ دیوبند کا زمانۂ قیام اپنا قیام، اکابر کا مجمع۔ مولانا محمد طیبؒ کا حسین سراپا۔ ان کی لحنیت، طیبؒ سب کی آنکھ کا تارا تھے۔ ان کی نسبت، حضرت مہتمم سلالہ قاسم الخیراتؒ کے بیٹے ہونا ذاتی جمال وکمال، مکارم، خوش کلامی، خوش خطابی، خوش تعبیری مضامین خوش نوائی لحن۔ لباس وتلبس تک میں گونہ تزئین جمال امتزاج اور رنگ علمی مذاکرہ میں نوالی انداز۔ جمال بھی کمال بھی نوال بھی۔ مگر جلال نہیں (بہ مفہوم عرفی) ورنہ زندگی کے سب پہلو جلالت کے شاہدِ عدل اور فخامت کے غماز جو بعد میں ایسے نمایاں ہوئے کہ فخر اماثل کہے گئے۔ یہ ہرگز نہ اطراء مادح تھا نہ مبالغہ۔ اللہ ان کی گور کو اپنے انوار سے معمور فرمائے۔

میں کہہ سکتا ہوں کہ ان کے بعد سے بہ ظاہر مداح ومعتقدین سے زیادہ مجھے ان کے اوصافِ ذکیہ پر اطلاع ہے۔ مجھے بہت سے زمان ومکان واقعات واحوال میں ان سے اور ان کا قرب رہا ہے۔ سفر میں حضر میں، حج میں۔ ایک ہفتہ ہونے کو آیا۔ ان کا نقشِ جمیل کس کس نوع وجہت سے ابھر کر نہیں آیا۔ ان کی جوانی،

بڑھاپا، کہولت ان کے اقوال، افکار، رفتار، مجالس وہ اپنی ذات سے ایک انجمن تھے۔ اب اللہ ان کو احبار امت کی انجمن میں جگہ دے۔ اور یہ ان کی صحبت کبھی منتھی نہ ہو۔ دل بھی چاہتا ہے کہ بس یہی ذکر کرتا رہا ہوں۔ کوئی ذکر کرتا ہے تو میں گویا اس کے منھ سے نوالہ چھین لیتا ہوں اور خود بات کرنے لگتا ہوں بار بار خیال ہوتا ہے کہ کہاں کس حال میں ہوں گے نہ قاصد ہے نہ سفیر ہے نہ مرغ نامہ بَر ہے۔ کن کن اخیار و آباء صالحین سے ملاقات ہو رہی ہوگی۔ کوئی بے قاعدگی ہوئی بھی ہوگی تو وہ **یعفو عن کثیر** ہے اور اس کا کثیر تو کل ہی ہے۔ سب محو کر دے گا۔

کتنی شہادات ان کے لیے ہوں گی۔ جنازہ پر آنے والے شہدا ہی ہیں۔ کتنوں نے عقیدت سے زندگی میں مصافحہ کیا ہوگا۔ **انتم شهداء الله في الارض**۔ کتنوں نے ان کے محققانہ خطاب سے شہادتِ حق سنی ہوگی۔ اور خود ان کے لیے شہادت دی ہوگی۔

خطہ ہائے ارض میں کون سا مقام ہے جہاں انھوں نے اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نام اور بات نہ کہی ہوگی۔ ایشیا، یورپ، مغربِ اقصیٰ مشرقِ وسطیٰ سب ان کے اعمال نامہ میں مکتوب و محفوظ ہیں۔

اللہ تعالیٰ آپ سب کو صبر دے، اجر دے، حادثہ کی اہمیت نا قابلِ انکار ایسی شخصیت کا فقدان نا قابلِ تلافی۔ **انا لله وانا اليه راجعون**۔

ماخوذ ماہ نامہ الرشید صفر ۱۴۰۴ھ

(ہفت روزہ خدام الدین لاہور)

............❖............

فکر دارالعلوم کی اشاعت میں

حکیم الاسلامؒ کا حصہ

مولانا برہان الدین صاحب سنبھلی
دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید المرسلین

محمد و آلہٖ و اصحابہٖ اجمعین.

ایسی کسی شخصیت پر قلم اٹھانا نسبتًا آسان ہوتا ہے جو بس ایک دوخوبیوں کی مالک یا چند صفات میں ہی امتیاز رکھتی ہو لیکن ایسے افراد میں سے کسی پر کچھ لکھنا جو عبقری صفت اور گوناگوں خصوصیات کے حامل ہوں اور جن کے محاسن بے شمار ہوں جو صفاتِ حمیدہ کا مجموعہ ہوں ان پر لکھنا کاتب کے لئے ایک طرح کا امتحان ہوتا ہے کیوں کہ تمام خصوصیات کا بیان اور شخصیت کے ہر پہلو پر روشنی ڈالنا بالخصوص کسی مقابل میں ممکن نہیں ہوتا اور پھر یہ فیصلہ کرنا کہ ان اوصاف میں سے کسے موضوع بنایا جائے اور کسے چھوڑا جائے حیران و سرگشتہ کرنے کا موجب ہوتا ہے۔

ایسے ہی جامع صفات اور مجموعۂ کمالات افراد میں حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب نوراللہ مرقدہٗ کی ذاتِ گرامی بھی تھی چنانچہ جب راقم سے آں مخدوم پر کچھ لکھنے کے لئے اصرار کیا گیا تو یہ عاجز سرگشتہ و حیراں ہوگیا اور اس کے سامنے یہ شاعرانہ تخیل ؏

دامن نگہہ تنگ و گل حسن تو بسیار   گل چیں ز تنگیٔ داماں دارد!!

حقیقت بن کر کھڑا ہوگیا، کیوں کہ گلِ حسن کی بسیاری پر تنگیٔ داماں کا گلہ کسی اور جگہ استعارہ و کنایہ یا مبالغہ ہو تو ہو مگر حکیم الاسلام نوراللہ مرقدہٗ کی ذات میں تو واقعۃً گلہائے گوناگوں اس طرح پیوست ہوئے

تھے کہ ان کا شمار مشکل، مزید برآں یہ کہ آں ممدوح کی شخصیت کا ہر پہلو "کرشمہ دامن می کشہ کہ جا اینجا است" کا سچا نمونہ ہونے کی وجہ سے لکھنے والے کا دامن پکڑتا ہے کہ مجھے نہ چھوڑو۔ اس بنا پر خیال ہوتا ہے کہ اچھا ہوتا کہ اگر برادرِ موصوف "تذکرۂ طیب" کے ہر تذکرہ نگار کے لئے' حیات طیب کا ایک گوشہ بطور موضوع مقرر کر دیتے کہ اس طور پر' محاسن کے اس گلدستہ کا ایک درجہ میں سراپا اوران کی سوانح بھی آ جاتی جنہیں اب صرف مرحوم کی موئے قلم کے ذریعہ کھینچی ہوئی تصویر ہی دیکھنے کو مل سکے گی۔ ع

سب کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی جو پنہاں ہوگئیں

لیکن جب ایسا نہیں کیا تو راقم نے مرحوم کی زندگی کا وہ پہلو پیش کرنا طے کیا جس پر خیال ہے کہ کسی اور نے (خلاف مصلحت جان کر) قلم نہ اٹھایا ہوگا، حالاں کہ آج بلکہ آئندہ نسلوں کے لئے بھی، اس پہلو کا سامنے لانا کم سے کم راقم کی نظر میں جتنا زیادہ مناسب بلکہ ضروری ہے اتنا کسی اور پہلو کا نہیں ہے، اسی وجہ سے راقم نے آں محترم کی زندگی کا یہی اہم پہلو (بلکہ کہنا چاہئے کہ اہم کارنامہ) یعنی فکر دارالعلوم کی اشاعت وحفاظت میں حکیم الاسلام کا حصہ پیش کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ (وبیداللہ التوفیق)

اس عنوان وموضوع کا قدرتی تقاضہ ہے کہ پہلے "دارالعلوم کا فکر" (جو مجموعہ ہے خاص مسلک، مشرب اور منہج کا) ہو، اس کے بعد ہی حفاظت وبقاء، نیز اشاعت وصیانت کا تذکرہ برمحل قابل اعتناء ہوگا۔

یہاں یہ حقیقت ظاہر کئے بغیر نہیں گذرا جا سکتا کہ فکر دارالعلوم کا یکجا تفصیلی اور جامع تعارف، تحریری شکل میں آج ہمیں اسی کی زبان وقلم سے معلوم ہوسکتا ہے جس کی ساری زندگی اس کی ترجمانی کرتے بلکہ اسی کی فکر میں گھلتے گذری، یعنی وہی شخصیت جو آج کے تذکرے کا موضوع ہے۔ (رحمه الله واسعة كاملة)

اس تحریری فکر کا درجہ اعتبار بڑھانے کے لئے تنہا یہ بات کافی ہونی چاہئے کہ "مسلک دارالعلوم" کے عنوان سے یہ دستاویز اس زمانہ میں ہی منظر عام پر آ چکی تھی جب کہ "دارالعلوم" کے ارباب بست وکشاد میں اکثریت ایسے حضرات کی تھی جو مسلکِ دارالعلوم، یا فکرِ دارالعلوم سے نہ صرف پورے طور پر آگاہ تھے بلکہ تنہا اسی کو اپنی دنیا وآخرت سنوارنے کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ ان میں اس وقت ایسے تو بہت کم تھے جو اس فکر سے ناواقف یا نامانوس ہوں یا اس پر پورا انشراح نہ ہونے کی وجہ سے فلاحِ ذات وقوم کے لئے دوسری راہوں اور فکروں کی تلاش وتجربات میں مشغولیت کو یا اس فکر سے متوحش ہونے کی بنا پر اس کی مخالفت کو حق ودیانت کا تقاضا سمجھتے رہے ہوں (اور ایسا تو شاید ایک بھی نہ تھا یا اس کی جرأت کرسکتا تھا۔ جو کہ محض دنیاوی مصالح کی خاطر حق سے چشم پوشی یا حق دشمنی پر کمر بستہ ہو جانے میں تامل نہ کرے)

دارالعلوم کا مسلک

حاصل کلام یہ ہے کہ ذیل میں ''مسلک دارالعلوم'' کا جو تفصیلی تعارف کرایا جارہا ہے وہ تنہا کسی ایک ذات کی جودۂ طبع یا ترواشِ قلم نہیں ہے بلکہ اس پر زمانہ کے مسلم ''دیوبندیوں'' کی مہر تصدیق ثبت ہے خواہ وہ سکوتی ہی ہو، اس کے بعد ''مسلک دارالعلوم'' نامی رسالہ کے مصنف کے الفاظ میں اس کا تعارف سنئے:

''علمی حیثیت سے یہ ولی اللہی جماعت، مسلکاً اہل سنت والجماعت ہے جس کی بنیاد کتاب وسنت اجماع وقیاس پر قائم ہے'' (ایک دوسری جگہ مصنف نے خود ہی اس کی ایسی بلیغ تشریح کی ہے کہ پڑھ کر بے ساختہ جزاک اللہ نکلا) فرماتے ہیں کہ ''پہلی دوحجتیں تشریعی ہیں، جن سے شریعت بنتی ہے اور آخری دوحجتیں تفریقی ہیں جن سے شریعت کھلتی ہے۔ اس کے نزدیک تمام مسائل میں اولین درجہ نقل وروایت کو اور آراءِ سلف کو حاصل ہے...... اس کے یہاں کتاب وسنت کی مرادات مخفی قوت مطالعہ سے نہیں بلکہ اقوال سلف اور ان کی متوارث مذاق کی حدود میں رہ کر، نیز اساتذہ اور شیوخ کی صحبت وملازمت اور تعلیم وتربیت ہی سے متعین ہوسکتی ہے۔ اسی کے ساتھ بطریق اہل سلوک جو رسمیات رواجی طریقوں اور نمائشی حال وقال سے مبرا اور بری ہے۔ تزکیہ نفس اور اصلاح باطن بھی اس مسلک میں ضروری ہے۔''

مزید فرماتے ہیں:

''دارالعلوم نے اپنے جامع مسلک میں حدیث، تفسیر، فقہ، اصول فقہ، کلام، تصوف، (یا احسانی صفت جس کا اصطلاحی نام تصوف ہے) حقیقت اور معرفت یعنی جملہ دینی علوم اور مقامات کے مختلف الالوان پھولوں کا ایک گلدستہ ایسے جامع انداز میں پیش کیا کہ تمام مسلکی طبقات کے ایک نقطہ پر جمع ہونے کی صورت پیدا ہوگئی۔ (۱)

دارالعلوم کے دستور اساسی میں ص ۶ پر دارالعلوم کے مسلک ومشرب کی مختصر تشریح اس طرح کی گئی ہے:

دارالعلوم دیوبند کا مسلک اہل سنت والجماعت حنفی مذہب اور اس کے مقدس بانیوں (حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ قدس سرہما) کے مشرب کے موافق ہوگا۔ (۲)

مشرب

اس سے پہلے اور بھی اوپر کی سطروں میں دستور کے حوالے سے دارالعلوم کے مسلک کے ساتھ مشرب کا لفظ بھی آیا ہے۔ یہاں اس کی بھی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے۔

مشرب سے مراد جیسا کہ دستور کی عبارت میں گذرا ان دونوں (حضرت نانوتویؒ وحضرت گنگوہیؒ) کا خاص زاہدانہ، متوکلانہ، متصوفانہ یعنی احسانی رنگ ہے جسے صاحب ''مسلک دارالعلوم'' نے دوسری جگہ ''مشرباً صوفی'' سے تعبیر کیا ہے، ایک موقع پر اس کی تفصیل یہ کی ہے، سلاسل علمیہ اور سلاسل فقہیہ کے ساتھ سلاسل صوفیہ (احسانی نسبت) کو بھی جمع کر دیا ہے۔ ایک کے مرجع الامر شاہ ولی اللہؒ تھے اور دوسرے کے حضرت جھنجھانوی خلیفۂ مجاہد اعظم حضرت سید احمد شہیدؒ) کے خلیفۂ اعظم حاجی امداد اللہ تھے (جس کی وجہ سے) سند حدیث کے ساتھ سند خلافت باطنی نقشبندیت کی لائن سے مجددی (یعنی پیروئ سنت اور سید احمد شہیدؒ کے (جذبۂ) اعلاء کلمۃ اللہ کی روح بھی راسخ رہی، اس (مشرب میں) ہر (دینی) فتنہ کی مدافعت بھی داخل ہے، خواہ وہ (فتنہ) نقل وروایت کی راہ سے آیا ہو یا بے لگام عقلیت (نیچریت) کی راہ سے (اس فتنہ نے) خواہ شرک وبدعت کا روپ دھارا ہو یا الحاد و بے دینی اور آزاد خیالی کا، (ان سب باتوں کے ساتھ دارالعلوم کا مشن) تمام مسلک حقہ (بالخصوص ہندوستان کے) واہل مسالک کو باہم جوڑنا ہے۔

اوپر کی تفصیلات سے یہ حقیقت بھی آشکارا ہو جاتی ہے کہ ''دیوبندیت'' کوئی نیا مذہب یا فرقہ نہیں ہے بلکہ وہ مسلک اہل سنت والجماعت کا ایک مرقع ہے، چنانچہ شاعرِ مشرق ڈاکٹر سید محمد اقبال مرحوم (کہ جن کی دینی حمیت اور وسعت نظر نیز محبت رسولؐ معلوم ومعروف ہے) سے جب کسی شخص نے اس بارے میں سوال کیا تو فرمایا ''دیوبندیت'' نہ مذہب ہے نہ فرقہ بلکہ ہر معقول دیندار کا نام دیوبندی ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یا یوں کہہ لیجئے کہ حقیقی دیوبندی کی پہچان مولانا طیب صاحبؒ ہی کے الفاظ میں یہ ہے کہ آدمی میں علمی وقار، استغنا، فروتنی...... ایثار وزہد (صفات جمع ہوتی ہیں) لیکن کبرونخوت (نہیں ہوتی) اور نہ ذلت (کہ عزت نفس پامال کرلیں) جہاں یہ علم واخلاص کی بلندیوں پر پہنچ کر عوام سے بلند ہو جاتے ہیں وہیں تواضع کی وجہ سے عوام میں ملے بھی رہتے ہیں، مجاہدہ ومراقبہ کی وجہ سے خلوت پسند ہونے کے ساتھ مجاہدانہ وغازیانہ نیز قومی خدمات کے جذبے سے سرشار بھی ہوتے ہیں۔ (ان کے نزدیک) محدث ہونے کے معنی فقیہ سے لڑنا یا فقیہ ہونے کے معنی محدث بیزار ہونے، یا صوفی ہونے کا مطلب متکلم دشمنی یا علم کلام میں مہارت کا تقاضا تصوف بیزار نہیں ہے بنابریں (دینی شعبہ کے تمام اربابِ فضل وکمال (کیا محدثین متکلمین، کیا فقہا وصوفیہ، کیا اصولیین ومنطقیین اور کیا امراء وخلفاء) ان کے یہاں سب واجب الاحترام ہیں لیکن ان تمام شعبوں میں سب سے زیادہ اہمیت اس جماعت کے نزدیک تعلیم علم نبوت کو حاصل ہے۔ (۳)

دارالعلوم کے مسلک ومشرب کی قابل لحاظ حدتک تفصلات بیان میں آجانے کے بعد مناسب ہوگا کہ ادارہ کے مقدس بانی نے اس کے چلانے کے غرض سے جو اصول مقرر فرمائے اورتحریر کردیئے تھے ان کا بھی مختصراً تذکرہ آجائے اس کو یہاں منہج کا نام دیا ہے۔

حضرت نانوتویؒ کے مقرر کردہ ان اصول ہشت گانہ سے اب شاید ہی کوئی وابستگانِ دارالعلوم میں سے ناواقف ہوگا جو موصوف نے بطور اصول موضوعۂ یا دستورالعمل کے مقرر فرمائے تھے۔ غالباً اسی لئے زبانی اظہار و بیان پر اکتفا نہیں کیا گیا تھا بلکہ تحریری شکل میں منضبط فرما کر گویا انہیں رجسٹرڈ کردیا تھا، عبارت کا طرز صاف بتارہا تھا کہ ان کے اصول کے اندر دارالعلوم کے چلانے کا دائمی طریقۂ کار بیان کیا گیا ہے، ورنہ ان سے انحراف ہونے کی شکل میں، زوال کی پیشین گوئی نہ ہوتی (حالیہ واقعات نے تو عملی طور پر ان کی دائمی بلکہ الہامی ہونے کا ثبوت فراہم کردیا) یہاں ان تمام اصولوں کے ذکر کی چنداں ضرورت نہیں معلوم ہوتی اس لئے بس چند کے بیان کرنے پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔ جن چند اصولوں کے ملحوظ نہ رکھنے پر اس میں جو پیشین گوئی کی گئی ہے وہ پوری ہوتی صاف نظر آرہی ہے اس قبیل کا ایک اصول یہ ہے۔

مشیرانِ مدرسہ (نا کہ حاکمانہ مدرسہ) کو ہمیشہ یہ بات ملحوظ رہے کہ مدرسہ کی خوبی اور خوش اسلوبی کو اپنی بات کو اونچی نہ کی جائے خدانخواستہ جب اس کی نوبت آئے گی کہ اہل مشورہ کو اپنی مخالفت رائے اور اوروں کی رائے کے موافق ہونا ناگوار ہو تو پھر اس مدرسہ کی بنیاد ہل جائے گی۔

غور کیا جائے کیا حالیہ فتنے میں رونما ہونے والے افسوسناک بلکہ شرمناک واقعات کی ایک اہم بڑی وجہ یہی نہیں ہوگی کہ بعض مشیرانِ مدرسہ (نا کہ حاکمانہ) نے اپنی بات کو اونچی کی اور اپنی مخالفت رائے اور اوروں کی رائے کے موافق ہونا ناگوار ہوا؟

ان اصول ہشت گانہ میں ایک یہ ہے۔

یہ بات بہت ضروری ہے کہ مدرسین مدرسہ باہم متفق المشرب ہوں اور مثل علماء روزگار خود ہوں اور دوسروں کے درپے نہ ہوں، خدانخواستہ جب اس کی نوبت آئے گی پھر مدرسہ کی خیر نہیں۔

کیا یہ مقام حیرت بلکہ عبرت نہیں، کیا حالیہ ہنگامے کے دوران بعض مدرسین خود بینی اور خودسری کی آخری حدتک پہنچ کر کیا دوسروں بلکہ خود مہتمم تک کے درپے آزار نہیں ہوگئے تھے؟ تو پھر ایسی صورت میں کیا مدرسہ کی خیر کی امید جاسکتی ہے؟

ہم یہاں ان اصولوں میں سے صرف ایک کے پیش کرنے کی اور اجازت چاہیں گے جو یہ ہے۔

اس مدرسے میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں جب تک یہ مدرسہ انشاء اللہ بشرط توجہ الی اللہ اسی طرح چلتا رہے گا اور اگر کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہوگئی جیسے جاگیر یا کارخانۂ تجارت یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف ورجاء، جو سرمایۂ رجوع الی اللہ ہے، ہاتھ سے جاتا رہے گا اور امدادِ غیبی موقوف ہوجائے گی اور کارکنوں میں باہم نزاع پیدا ہوجائے گا۔

جیسا کہ اوپر مسلک دارالعلوم کے بیان کے دوران گزرا ان اصول ہشت گانہ سمیت، مسلک دارالعلوم کی پیروی اور حفاظت دستورِ اساسی کی رو سے تمام ارکان متعلقین دارلعلوم پر فرض قرار دی گئی تو کیا یہ واقعۃً ارکانِ دارالعلوم اور اس کے متعلقین نے یہ فرض ادا کیا؟ سب کو بالخصوص 'ارکان' کو (کہ انہوں نے سب سے زیادہ دستور کا ذکر کیا ہے) اپنا بھی محاسبہ کرنے کی ضرورت ہے یا نہیں؟ اس کا فیصلہ خود ان پر ہے۔ (فکر دارالعلوم کا بیان ہوجانے کے بعد آیئے) دیکھیں اس ذاتِ گرامی نے دستور مسلک اور دارالعلوم (مع اصول ثمانیہ) کی رعایت وحفاظت کس درجہ کی؟ کہ جس پر دستور کی خلاف ورزی کا بہت زوردار آواز میں الزام لگایا گیا؟

مرحوم کی فکر دارالعلوم کی اشاعت وحفاظت میں حصہ کے جائزے سے پہلے یہ بھی ضروری معلوم ہورہا ہے کہ دیکھا جائے کہ خود موصوف اس فکر سے کتنے ہم آہنگ تھے اور کس درجہ اس کے مثالی نمونہ بننے کے لائق؟ کہ اس کے بغیر سچ پوچھئے تو نہ ترجمانی کا حق حاصل ہوتا ہے اور نہ بے عملی کی بات میں تاثیر ہوئی اور نہ ہوسکتی ہے، کیوں کہ لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ.....الخ کا تقاضا ہے کہ ایسی صورت میں خداوندتعالی کی رضا کے بجائے شدید ناراضگی حصے میں آئے تو پھر کامیابی کی توقع کیسے کی جاسکتی ہے؟

اس فکر کے پہلے جزو (مسلک) میں سب سے اہم مقام (اس لئے سب سے زیادہ توجہ کا مستحق بھی) علوم نبوت کا اور ان کی تعلیم وتعلم کا بتایا گیا ہے چنانچہ اس بارے میں موافق ومخالف سب ہی متفق ہیں کہ مرحوم کا علمی مقام بہت بلند تھا، واقعہ یہ ہے کہ علم کے بعض شعبوں میں ملک کے خواہ دوسرے علماء امتیاز رکھتے ہوں لیکن مجموعی طور پر، مطالعہ کے تنوع وسعت وعمق میں موصوف کا پایہ اگر سب سے بلند نہیں تو کم از کم یہ بہت بلند تھا اور مشکل علمی مضامین بالخصوص نصوص متعارفہ اور سلف اقوال مختلفہ میں تطبیق دے کر اور ان کی مراد متعین کرکے واضح عام فہم ودلنشیں اور شیریں انداز سے بیان کرنے کے کمال میں اب کوئی حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے بعد ان کا ثانی نہ تھا۔

موصوف کے تبحر اور علمی وسعت کی چھاپ عوام ہی نہیں علماء تک پر کس درجہ کی تھی؟ اس کا اندازہ

کرنے کے لئے شاید یہ بتانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ آج نہیں بلکہ پچیس تیس سال قبل بھی جب کہ آج کل جیسا قحط الرجال بھی نہ تھا اہل علم تک یہ کہتے سنے گئے کہ ہندوستان کے سارے علماء کا مجموعی علم ایک طرف اور تنہا مولانا محمد طیب صاحبؒ کا علم ایک طرف! ظاہر ہے کہ کم سے کم اس وقت یہ قول مبالغہ سے خالی نہ تھا لیکن اس سے بہرحال اتنا تو ثابت ہوتا ہے کہ اہل علم کے نزدیک ممدوح علمی طور پر ممتاز ترین علماء کی صف میں شامل سمجھے جاتے تھے۔

موصوف کے ذوقِ علمی کے تمام دوسرے مذاقوں پر غالب ہونے کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ دارالعلوم کے اہتمام جیسے اعلیٰ اعزاز و اکرام بلکہ ایک درجے میں راحت واحترام کے منصب پر فائز ہوتے اور تعلیمی شعبے سے منتقل ہونے کے لئے موصوف طبعاً تیار نہ تھے مگر اس فکر کے ایک ہی تقاضہ اکابر کے حکم کی تعمیل اور ان کا احترام سے بادلِ ناخواستہ، مہتمم بننا گوارہ کیا۔

اس سے بھی بڑھ کر یہ تقریباً دس بارہ سال قبل مجلس شوریٰ کے بہت سے ممتاز اور بااثر ارکان نے حضرت مہتمم صاحبؒ سے ان کے خلف الرشید کو نائب مہتمم بنانے کے لئے جب اجازت چاہی تو موصوف نے اجازت دینے سے انکار کرتے ہوئے فرمایا کہ خاندانِ قاسمی کا امتیاز علم ہے، نظم نہیں، یہ واقعہ حالیہ حادثات کے موجب کے طور پر جس واقعے کو بہت نمایاں کیا جاتا ہے اس پر روشنی ڈالنے کے لئے بھی اہل نظر کے واسطے کافی ہے۔ اگر واقعۃً موصوف نے حالیہ زمانے میں ایسی خواہش کا اظہار کیا تھا تو وہ کسی اور جذبے سے نہیں بلکہ دارالعلوم ہی کی خیر خواہی کے تقاضے سے کیا ہوگا (کہ ان کی مثال اس بارے میں خود رہنمائی کرتی ہے اور پھر یہ کہ موصوف کی پوری زندگی دارالعلوم کی سچی خیر خواہی کے جذبات پر شاہد ذی عدل ہے، مگر ان پر الزام لگانے والوں کی زندگی کا تو شاید بہت محدود عرصے ہی میں اس کی شہادت پیش کرنا بہت مشکل ہوگا)۔

موصوف کے علمی مقام پر سب سے بڑھ کر شہادات، وہ بیانات بھی ہیں جو ان کی حادثۂ وفات پر زبانی یا تحریری، تمام قابلِ ذکر علماء اور دوسرے طبقات کے آئے، ان میں موافق ومخالف سب ہی نے دوسری خوبیوں کے ساتھ علمی بلندی کا بھی اعتراف واظہار کیا ہے۔

اس سے بھی زیادہ قوی تر دلیل حضرت حکیم الاسلامؒ کے ذوقِ علمی کی یہ کہ اہتمام کے متنوع اور تھکا دینے والے بے پناہ مشاغل نیز دیگر میدانوں میں سرگرم عمل رہنے کے باوجود، ساری عمر موصوف نے علم و مطالعہ سے اپنا رشتہ قائم رکھا، اسی تعلق کا یہ اثر تھا کہ فخر المحدثین حضرت مولانا سید فخر الدین احمدؒ جیسے جلیل

القدر محدث کی وفات کے بعد اور اس کے علاوہ بھی دیگر مواقع پر دارالعلوم جیسی ممتاز درسگاہ میں صحیح بخاری جیسی ادق و اعلیٰ کتاب کا دورۂ حدیث جیسی اہم جماعت کے طلباء کو جس میں ایک خاصی تعداد ماہر اساتذہ تک کی شامل ہوا کرتی تھی اور پھر بعض طلبہ بھی ایسے جید الاستعداد، کثیر المطالعہ اور وسیع النظر ہوتے تھے کہ ہندوستان کے بہت سے مدارس کے اعلیٰ مدرسین 'شیخ الحدیث' کی سند سنبھالنے والے بھی ان کی برابری بمشکل کر سکتے تھے نہایت کامیابی کے ساتھ درس دیا۔

فکر دارالعلوم کے علمی تقاضوں کے علاوہ و دیگر اوصاف و تقاضے مثلاً نصاب فی الدین، دینی حمیت، اسلاف کی عظمت، فرق باطلہ کا حکیمانہ رد، تحمل، حقیقی تصوف (تزکیہ و احسان) مناسبت، تواضع، استغناء وغیرہ، اوصاف تو موصوف میں اس طرح جمع ہو گئے تھے کہ ان کا کٹر سے کٹر دشمن بھی انکار کرنے کی جرأت، آخرةً جواب دہی کا خطرہ مول لئے بغیر نہیں کر سکتا تھا، اس وجہ سے ان کے مذکورہ اوصاف میں کچھ لکھنے کی چنداں ضرورت نہیں، البتہ صرف تین (تواضع، تصوف اور فرق باطلہ کا حکیمانہ رد) کے بارے میں اتنا کہے بغیر آگے بڑھنا مشکل ہو رہا ہے کہ کم سے کم ادھر تیس چالیس سال کے اندران کے جیسے پایہ کے کسی شخص کے یہاں، ان کی جیسی تواضع کا تجربہ و مشاہدہ، کسی کو مشکل ہی سے نصیب ہوا ہوگا وہ اپنے چھوٹوں کے چھوٹوں سے بھی اس طرح پیش آتے تھے کہ برابر والے بھی کم ہی پیش آتے ہیں۔ غرض یہ کہ ان کی جیسی کم سے کم راقم السطور کو تو اور کہیں تواضع نظر نہیں آئی (حالاں کہ سینکڑوں چھوٹے بڑے علماء سے ملنا جلنا ہوا ہے)۔

اسی طبعی تواضع کا یہ اثر تھا کہ ان کے ایک معاصر نے جو عمر میں بھی ان سے کم ہے جب ان سے معافی طلب کی تو ان کی متواضعانہ طبیعت پر سخت بار ہوا اور اس کا اظہار ایسے الفاظ میں کیا جو آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہیں، حضرت حکیم الاسلامؒ نے انہیں جواب دیا، آں محترم سے زیادہ کون جانتا ہے کہ میں نے اپنے چھوٹوں کو بھی خطاوار نہیں سمجھا کہ ان کی زبانی پر معافی کی بات آئے۔

تزکیہ و احسان کی صفت میں امتیاز کی سند کے لئے یہی کافی ہے کہ حضرت حکیم الاسلامؒ اپنی جماعت اور اپنے وقت کے سب سے اہم متقی عالم حضرت شیخ الہندؒ کے دست گرفتہ اور اپنے اثر کے سب سے بڑے مصلح اور بے مثال مربی اور حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے خلیفۂ مجاز تھے۔

فرق باطلہ کی حکیمانہ تردید میں مرحوم کے حکیمانہ اسلوب کی شہادت کے لئے برصغیر کے مشہور صحافی اور مبصر ماہر القادری صاحب مرحوم کا وہ تبصرہ کافی ہے جس میں ماہر صاحب نے اپنے پشتینی مسلک کٹر بریلویت سے ہٹ کر حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ ہی کی تقریر دل پذیر کے اثر سے صحیح العقیدہ بن جانے کی تفصیل

اور دیگر بہت سی مفید باتیں اپنے شہرۂ آفاق ماہنامہ ''فاران'' کراچی میں تحریر فرمائی تھی (جو بعد میں کتابی شکل میں بھی شائع اور مقبول ہوا) اس وصف کی سب سے نمایاں مثال اور جیتی جاگتی تصویر بمبئی شہر ہے کہ جہاں حضرتؒ کے حکیمانہ خطابات ہی کے ذریعہ ابتداءً فضا بدلی اس کے بعد ہی اہل حق کو وہاں پاؤں ٹکانے بلکہ اپنی بات کہنے اور باطمینان سنانے کے لئے زمین مل سکی، یہی وجہ ہے کہ اہل حق میں جہاں تک اندازہ ہے سب سے زیادہ باشعور لوگ ان ہی کے دست گرفتہ پائے جاتے ہیں۔

اس کے علاوہ بھی آں محترمؒ نے ''فکر دارالعلوم'' کی اشاعت وحفاظت کے لئے کیا کیا قدم اٹھائے، آئندہ سطروں میں ان میں سے کچھ کا ذکر کیا جارہا ہے، سب کا ذکر تو کسی مقالے کا نہیں کتاب کا موضوع ہے اوپر کی سطروں سے نیز دوسرے واقعات سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ ہوگا کہ یہ فکر موصوف کے جسم وروح میں اس طرح پیوست ہوکر رچ بس گئی تھی کہ ان کی ذات ہی ''مجسم فکر قاسمی'' اور ''سراپا دارالعلوم'' بن گئی تھی، ان کی وفات پر متعدد اہل علم اور اصحاب فکر ودانش نے جو یہ لکھا ہے کہ انہوں نے اپنی ذات کو دارالعلوم میں اس طرح گم کردیا تھا کہ ایک کا تصور دوسرے کے بغیر ممکن نہ رہا تھا (مفہوم) اس میں نہ غلط بیانی ہے نہ مبالغہ بلکہ حقیقت کی صحیح صحیح ترجمانی ہے کیوں کہ وہ جس جگہ گئے اور دنیا کا کون سا اہم حصہ ہے جہاں وہ نہیں گئے؟ کیا امریکہ ویورپ کیا افریقہ وایشیا کیا عرب وعجم جہاں وہ گئے فکر دارالعلوم کے ساتھ پہنچے، بلکہ ان کی تنہا ذات گرامی کی بدولت مدرسہ دیوبند مدرسہ سے (دارالعلوم) پھر عظیم جامعہ بنا اور شہروں سے لے کر قصبات ودیہات تک دارالعلوم کی صدا ان کی ہم آواز بن کر اس طرح پہنچی کہ وہاں کے حساس دلوں کی دھڑکن اور ان کی اپنی آواز بن گئی اور ان کی آواز کی طرح ذات بھی دارالعلوم میں اس طور پر سما گئی تھی کہ ان کی ذاتی شہرت اور ان کا اپنا نفع ونقصان، دارالعلوم کا نفع ونقصان بن گیا تھا، اسی لئے ان کے لئے (مہتمم صاحبؒ) کا لفظ وصف نہیں ان کا ذاتی نام بن گیا اور ایسا ہونا کچھ تعجب کی بات نہیں، بلکہ اس کے خلاف ہوتا تو حیرت ہوتی کیوں کہ موصوف کی تو آنکھیں ہی اس فکر کے آغوش میں کھلیں اور اسی فکر کے اعلیٰ ترین نمونوں اور مثالی پیکروں کے سائے میں وہ پروان چڑھے تھے۔

سچ تو یہ ہے کہ حکیم الاسلامؒ، حضرت شاہ ولی اللہؒ کے وہ حکیمانہ الفاظ، مہتمم صاحبؒ کی ذات میں جسم و قالب بن کر نظر آنے لگتے ہیں جو شاہ صاحب نے مشہور حدیث رسول (ﷺ) **الائمة من قریش** کی تشریح کرتے ہوئے زیبِ قرطاس کئے ہیں۔ فرمایا ہے:

أن يجعل الخلفاء من بعدهٖ أهل بلدهٖ و عشيرتهٖ الّذين نشوء و اعلى تلك العادات

السنن و ليس التكحل كالكحل و يكون الحمية الدينية فيهم مقرونة بالحمية النسبية و يكون غلوّ أمرهم و نباهة شانهم علواً لأمر صاحب الملة. (۴)

جانشینوں کو ان ہی کے خاندان اور انہیں کے شہر کا ہونا چاہئے کیوں کہ اسی ماحول میں چلنے اور بڑھنے کی وجہ سے ان لوگوں کے اندر (مطلوبہ) عادات اور طریقے رگ و ریشے میں سرایت کر جاتے ہیں (اس کے بعد بہت بلیغ تمثیل کے ذریعے فرق واضح کر دیتے ہیں جس کا مفہوم یہ ہے کہ) جس کی آنکھ قدرتی اور پیدائشی طور پر سرمگیں ہو اس کا وہ شخص مقابلہ کہاں کر سکتا ہے کہ جس نے صرف سرمہ لگا لیا ہو اور یہ بات بھی ہے کہ (اسی خاندان کے جانشین کی) حمیت دینی اور حمیت نسبی دونوں ہم آہنگ ہو جاتی ہیں اور (اسی لئے) اس کی ذاتی بڑائی بھی دین کی بڑائی سے مربوط ہو جاتی ہے۔

اشارۂ نبویؐ اور اسی سے پیدا شدہ حکمت ولی اللہی کا ہی غالباً یہ پرتو تھا کہ دارالعلوم کی فکر کے حقیقی نمونہ اور اس کے سچے خیرخواہ اور اکابرؒ نے اصرار کے ساتھ حکیم الاسلامؒ مولانا محمد طیب صاحبؒ کو منصب اہتمام پر فائز کیا تھا چنانچہ جو تجویز بابت تقرری منظور ہوئی اس میں یہ بھی صراحت تھی کہ مولانا موصوف نوجوان، صالح، صاحب علم اور اعلیٰ خاندان اور دارالعلوم کے ساتھ آبائی نسلاً بعد نسل سچی و دلی ہمدردی رکھتے ہیں۔ (۵)

یہاں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا بھی شاید بے محل نہ ہوگا کہ ''تحویلِ قبلہ'' کی حالیہ مہم کے دوران جن لوگوں نے اپنے ذاتی غور و فکر کے نتیجے میں تبدیلی کو ضروری سمجھا اور اسی لئے اپنا پورا زور سنانِ قلم یا لسانِ ذہن استعمال کر کے صرف کیا ان میں یا تو متکحل تھے یا ایسے تھے جنہیں اس کحل سے مناسبت ہی نہ تھی یا ان کے نزدیک اس سے زیادہ دوسرے مصالح عزیز تھے اور بعض تو ایسے بھی تھے جو اس سے آشنا ہی نہ تھے بلکہ بے گانہ تھے۔ اس لئے اس پر بھی تعجب نہ ہونا چاہئے کہ اس شورش کے درمیان (حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کے دادا) حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتویؒ کے بانی دارالعلوم ہونے کی حیثیت کو چیلنج کیا گیا بلکہ ان کی مقدس ذات (نیز ان کے بلند مرتبہ صاحبزادہ، مولانا محمد احمد صاحبؒ) پر تنقیص کی حد تک پہنچنے والی تنقیدوں میں بھی ذرا تامل یا باک نہیں ہوا، مزید برآں بانی دارالعلوم کے مقرر کردہ اصول ہشت گانہ کو آج کے دور کے لئے نہ صرف ناکافی بتایا گیا بلکہ ان کا مذاق تک اڑایا گیا۔ (**فالی اللہ المشتکیٰ**)

یہاں مہتمم صاحبؒ کے فکر دارالعلوم کی حفاظت کے لئے اہتمام کا پتہ دینے والے ایک خاص واقعہ کا ذکر مناسب معلوم ہو رہا ہے لیکن واقعہ سننے سے پہلے اصول ہشت گانہ میں سے وہ اصول ذہن میں تازہ کر لیجئے جس کے اندر کارخانۂ تجارت جیسی مستقل آمدنی کی سبیل، امداد غیبی موقوف ہونے کا سبب قرار دیتے

ہوئے اس سے منع کیا گیا ہے۔

اجلاس صد سالہ کے موقع پر دارالعلوم کی ہمہ گیر خدمات (اور مہتمم صاحبؒ کے ذریعے ہونے والے عمومی طور پر اس کے تعارف اور) خداداد مقبولیت کی وجہ سے، سارے عالم بالخصوص، ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے آ کر جمع ہونے والے انسانوں کا سمندر کہ جس کی نظیر میدانِ عرفات کے علاوہ اور کہیں نہیں دیکھی جاتی بلکہ نہیں دیکھی جا سکتی، جب دیوبند میں ٹھاٹھیں مارنے لگا تو قدرتی بات تھی کہ دارالعلوم کے چندہ میں غیر معمولی رقم جمع ہوئی، اس جمع شدہ رقم کے بارے میں ''بعض اہل الرائے'' نے تجویز کیا کہ اسے یونٹ ٹرسٹ میں جمع کر دیا جائے (جس کو وہ سمجھتے تھے کہ تجارتی ادارہ ہے اور وہاں جمع شدہ رقم پر تجارتی نفع بھی ملتا ہے جو سود کے شائبہ سے پاک ہوتا ہے) فرمایا دارالعلوم کا موضوع تجارت نہیں، تعلیم ہے، اس لئے بھی وہاں رقم جمع کرنا مناسب نہیں، یہ واقعہ نقل کرتے ہوئے راوی آبدیدہ سے ہو کر کہنے گے کہ بھلا ان نزاکتوں کو کون ملحوظ رکھے گا؟ (اس واقعہ کے راوی بھی وہی ثقہ قاسمی فاضل ہیں جن کے حوالے سے اوپر بھی ایک واقعہ گذر چکا ہے) یہ واقعہ جو ہر طرح دارالعلوم اور اس کے مسلک کے محافظ مہتمم کے شایانِ شان تھا لیکن اس کے کرم فرماؤں کی نظر میں کیا بن گیا؟ اسے جاننے کے لئے دل پر جبر کر کے یہ چند سطریں آپ بھی پڑھ لیجئے، اس وقت بھی بعض ارکان کو یہ اندیشہ تھا کہ مہتمم صاحبؒ کے بعض متعلقین اس تجویز کو اپنے غلط ارادوں کی تکمیل کی راہ میں رکاوٹ سمجھ کر چلنے نہیں دیں گے اور مہتمم صاحبؒ کو اس کے لئے استعمال کریں گے۔ افسوس یہ اندیشہ صحیح ثابت ہوا اور نہ صرف یہ کہ اس تجویز کی تکمیل نہیں کی گئی بلکہ اس کی عدم تعمیل کو مقدس شرعی لباس پہنایا گیا۔

اس موقعہ پر امام شافعیؒ کا یہ مشہور شعر نقل کرنا بھی شاید بے محل نہ ہوگا۔ ع

عین الرضا عن کل عیب کلیلة
ولکن عین السخط تبدي المساویا

اہل نظر کے لئے تنہا یہ مثال آئندہ دارالعلوم کا 'رخ اور قبلہ' دریافت کرنے کے لئے کافی ہے۔

اس لئے یہ سوال قدرتی ہے کہ مہتمم صاحبؒ کے بعد دارالعلوم کی ظاہری شان وشوکت باقی رہنے بلکہ بڑھ جانے کے باوجود کیا اس کی معنویت بھی اس درجہ قائم رہ سکے گی؟ یہ بات اللہ عالم الغیب کے علاوہ اور کون جانتا یا جان سکتا ہے؟

یہی وہ سوال ہے کہ جو خیر خواہوں کو فکر مند بنائے رکھتا ہے اگر چہ کارسازِ حقیقی نے جس طرح اس کے بانیوں اور اولین معماروں کے اخلاص کی برکت سے اب تک نازک سے نازک تر مواقع پر اس کی حفاظت

فرمائی ہے اسی کے فضل و کرم سے امید ہے کہ آئندہ بھی حفاظت فرمائے گا مگر ڈر اس بات سے لگتا ہے کہ حالیہ فتنہ کے درمیان دوسری کوتاہیوں کے علاوہ خداوند تعالیٰ کی ایک بہت عظیم نعمت کی بڑی ناقدری ہوئی اور کفرانِ نعمت ہوا ہے۔

اوپر دارالعلوم کے مسلک و مشرب کے تذکرہ میں ذکر آیا کہ اس کے مقاصد میں ہر دینی فتنے کی مدافعت بھی شامل ہے، اس بارے میں مہتمم صاحبؒ کے بس ایک روشن بلکہ عالم آشکارا کارنامے کا تذکرہ کافی ہوگا، ہندوستان میں جب مسلمانوں کے عائلی قوانین (نکاح، طلاق، میراث وغیرہ) جنہیں مسلم پرسنل لاء کہا جاتا ہے، کے خلاف کچھ نام نہاد مسلمانوں اور روشن خیال سیاست دانوں کی طرف سے، حکومت کی ایماء پر زبردست مہم چلائی گئی اور اس کا پورا خطرہ پیدا ہوا کہ شریعت اسلامیہ کے جن چند قوانین پر عمل کرانے کا مسلمانوں کو ہندوستانی دستور کی رو سے حق باقی رہ گیا ہے بس وہ بھی اب چھینا جانے والا ہے اور پارلیمنٹری جمہوریت جو دراصل اکثریت کا نام ہے کی لاٹھی سے اس کے کچلنے کی تیاریاں آخری مراحل پر ہیں تو سب سے پہلے اس دارالعلوم کو کہ جس کے قیام اور وجود کا اصل باعث ہی دین و شریعت کی حفاظت و بقا ہے، اس کے سربراہ حضرت محمد طیب صاحبؒ بے چین ہو گئے اور پھر بہت سی حکیمانہ تدابیر اختیار کیں جس کا ثمرہ بالآخر تمام ہندی مسلمانوں کے واحد متفقہ پلیٹ فارم ''آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ'' کی شکل میں برآمد ہوا اور ایسے مختلف افکار و نظریات رکھنے والے افراد پر مشتمل بورڈ کی صدارت کے لئے موصوف سے زیادہ موزوں تر اور کوئی شخصیت پورے ہندوستان میں نہ مل سکی، چنانچہ وہی از روز اول تا آخر حیات اس کے صدر رہے۔

(مرحوم کی اس خصوصیت کا خاص طور پر ذکر، ان کی وفات پر دیئے جانے والے بیان میں ہندوستان کے ایک عظیم مفکر نے کیا ہے)

آخر میں مرحوم کا وہ آخری مطبوعہ خط پیش کیا جا رہا ہے، جس کے حرف حرف سے، سوزِ دروں دارالعلوم اور اس کے مسلک و جماعت کی حفاظت کے لئے بے قراری اور اس کی زبوں حالی پر دل فگاری ٹپک رہی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ وہ خط روشنائی سے نہیں خونِ جگر سے لکھا گیا ہے۔

دارالعلوم دیوبند صرف ایک مدرسہ نہیں بلکہ اللہ کی امانت ہے، آج کے لادینی دور میں دین کے ہر شعبہ میں امت کی رہنمائی اور عوام امت کی خدمت اس کا نصب العین رہا ہے، آج اس کا کیا حال ہے؟ اور ہم اللہ کے سامنے مسئول ہیں۔ یہ ہے وہ غم سوز جس سے میرا جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا ہے...... نہ اپنی ذات کا غم ہے نہ اپنے عزیزوں کا غم بلکہ غم دارالعلوم کا ہے۔ وہ جماعت جو ایک سو سولہ برس تک اوروں کے

لئے ہدایت، تقویٰ اور توحید کی علامت تھی بکھر کر رہ گئی ہے، یہی میری بیماری ہے، اس عالم بیچارگی اور بیماری میں آپ کا مکتوبِ گرامی ملا۔ (واضح رہے کہ اس خط کے مخاطب ایک ایسے بزرگ ہیں جن کے اختلافات موصوف سے اس وقت آخری نکتہ تک پہنچ کر اذیت ناک بن گئے تھے) جسے میں اپنے لئے اور دارالعلوم کے لئے روحانی صحت مندی کی علامت سمجھتا ہوں، معاملہ ہم میں سے کسی ذات کا نہیں بلکہ ہمارے اسلاف کی یادگار دارالعلوم کا ہے، ہم سب اپنی خطاؤں کی معافی اللہ سے مانگیں اور کچھ مانگیں تو دعا مانگیں۔ ہم سب کو توفیق نصیب ہو اور آخرت کی جواب دہی سے نجات ملے، زندگی کی آخری آرزو اور آخری دعا یہ ہے کہ دارالعلوم کا پہلا رنگ جس میں روحانیت تھی، خلوص تھا اور سب ایک تھے اور فیصلے ایک رائے سے ہوتے تھے پھر بحال ہو جائے۔ (۵)

آسمان ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

اللّٰھم اغفر له وارحمه

............❖............

(۱) سید محبوب رضوی، تاریخ دارالعلوم دیو بند، ص: ۲۸، ج ۱

(۲) ایضاً، ص: ج ۱، ص: ۴۳۱

(۳) ایضاً، ص: ج ۱، ص: ۴۲۵

(۴) حضرت شاہ ولی اللہؒ، حجۃ اللہ البالغہ، ج ۱، ص: ۱۱۹

(۵) سید محبوب رضوی، تاریخ دارالعلوم دیو بند، ج ۱، ص: ۲۷۹

............❖............

آہ! حضرت حکیم الاسلامؒ

شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحبؒ

دارالعلوم حقانیہ، اکوڑہ کھٹک ،پاکستان

دارالعلوم دیوبند کے مہتمم حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیّب صاحبؒ پچھلے دنوں دیوبند میں انتقال فرما گئے۔اناللہ وانا الیہ راجعون۔وہ ایک پاک باز اور باکردار انسان تھے۔اپنے جدامجد حضرت مولانا قاسم نانوتوی صاحبؒ کے علوم (جب کہ ان کی ہر کتاب علم ومعرفت کی ایک بحرِ ذخار ہے۔اور ان کی تصنیفات جوعلم الکلام،علم الحدیث پر لکھی گئی ہیں کو سمجھ لینا بھی کوئی آسان بات نہیں ہے۔) کے ترجمان تھے۔

الولد سر لابیہ کا مظہر تھے۔حضرت حکیم الاسلامؒ اکابرین دیوبند کے علوم بالخصوص علومِ قاسمیہؒ۔علوم شیخ الہند اور علوم تھانویؒ کا ایک عظیم خزانہ، جامع ماہر اور شارح تھے۔تحریر وتقریر میں ان کو زبردست ملکہ حاصل تھا۔اور سب سے نئی چیز یہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند کو جو خدا تعالیٰ نے علمی لحاظ سے طلباء کے لحاظ سے اساتذہ اور علماء کے لحاظ سے، اقتصادیات اور تعمیرات کے لحاظ سے،غرض اور ہر لحاظ سے جو خوبیاں عطا فرمائی ہیں اور ترقیات سے نوازا ہے۔یہ سب کچھ حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کے دورِ اہتمام اور ان کے زیر نگرانی انجام کو پہنچا ہے۔

حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کے زمانہ میں حضرت علامہ مولانا انور شاہ کشمیریؒ دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس رہ چکے ہیں پھر ان کے بعد مولانا سید حسین احمد مدنیؒ حضرت حکیم الاسلامؒ ہی کے زمانۂ اہتمام میں تدریس کرتے رہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند نے اس زمانہ میں جو عروج اور ترقی حاصل کی ہے۔یہ تاج اور اس کا سہرا حضرت حکیم الاسلامؒ صاحب مرحوم کی مساعیِ جمیلہ کے سر ہے۔اور یہ ان ہی کے مخلصانہ شبانہ روز مساعی کا ثمرہ

ہے۔ بہرتقدیر حضرت حکیم الاسلامؒ ایک پاکیزہ شخصیت، جامع العلوم اور بہترین کمالات سے متصف تھے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے خاندان میں اور ان کے نائبین کے خاندان میں حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ مرحوم والے تمام اوصاف وکمالات پیدا فرمادیئے اور اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ سے اس خلا کو پورا فرمادے۔ آمین

آج شہر شہر، بستی بستی، قریہ قریہ جو آپ کو یہ دینی علوم کے مدارس ومراکز نظر آتے ہیں، اور ہر گاؤں اور ہر بستی میں جو آپ کو دارالعلوم دیوبند کا فاضل، اکابر اساتذہ کا تلمیذ یا تلمیذ التلمیذ آپ کو نظر آتا ہے یہ سب دارالعلوم دیوبند کا فیض اور حضرت حکیم الاسلامؒ کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے۔ اور یہ سب دارالعلوم کی برکات ہیں۔ ایشیا بھر میں پھیلے ہوئے مدارس ان کے اساتذہ منتظمین کا تعلق بغیر واسطہ یا بالواسطہ دارالعلوم دیوبند سے وابستہ ہے۔ حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کو دیگر اساتذہ دیوبند کی طرح دارالعلوم حقانیہ سے حد سے زیادہ شفقت اور حد سے زیادہ محبت تھی جب بھی پاکستان تشریف لاتے تو دارالعلوم حقانیہ ضرور تشریف لاتے۔ جب ہم سالانہ جلسہ دستار بندی کرتے تب بھی حضرت تشریف لاتے ایک مرتبہ اس سامنے والی گیلری (دارالحدیث) کے سامنے برآمدے کے اوپر بالا خانہ میں قیام فرمایا، اور غالباً ایسے ہی ایک موقعہ پر جب آپ نے دارالعلوم حقانیہ اور اس کے مختلف شعبوں اور طلباء کی قیام گاہوں کے مختلف احاطوں کا معائنہ کیا تو فرمایا:

''مجھے دارالعلوم حقانیہ، دارالعلوم دیوبند سے جدا نظر نہیں آتا۔ بلکہ دارالعلوم حقانیہ نے دارالعلوم دیوبند کو اپنے ضمن میں لے رکھا ہے، سارے پاکستان میں دارالعلوم دیوبند کے نمونے اور نقش قدم پر دارالعلوم حقانیہ گامزن ہے۔ اور یہ دیوبند ثانی بن چکا ہے''۔

اور ایک مرتبہ تو یہاں تک فرمایا کہ ''میں دارالعلوم حقانیہ آکر یوں محسوس کرتا ہوں جیسے دارالعلوم دیوبند آگیا ہوں اور گویا اپنے گھر میں موجود ہوں''۔

یہ تاثرات دارالعلوم کی کتاب الآراء میں بھی قلم بند فرمائے ہیں۔ بہرحال یہاں آکر حد درجہ خوشی اور محبت کا اظہار فرماتے اور جو نئے مسائل پیش آتے اس میں بھی دارالعلوم حقانیہ کی رائے کو شامل فرمالیتے۔

میں عرض کر رہا تھا کہ حضرت کو دارالعلوم حقانیہ اور خاص کر مجھ ناچیز پر حد درجہ شفقت تھی۔ دارالعلوم دیوبند میں میں نے جو زندگی کے لمحات گزارے ہیں خاص کر تدریس کا زمانہ جو تقریباً ساڑھے چار سال ہے اور اس زمانہ میں ہر فن میں تقریباً کوئی ایسی کتاب نہ ہوگی جو میں نے نہ پڑھائی ہو۔ دیگر اساتذہ کی شفقت ومحبت کے باوجود چوں کہ اختیارات مہتمم صاحب کے ہوتے ہیں تو حضرت مہتمم صاحبؒ ہر معاملہ میں ترجیحی سلوک میرے ساتھ فرمایا کرتے تھے۔ اسباق اور تدریس کا مسئلہ بھی یوں تھا کہ جب بعض اساتذہ حج کو

تشریف لے جاتے یا کسی اور اعذار سے اسباق نہیں پڑھا سکتے تو ان کے اسباق اور کتابیں جو زیادہ تر فقہ، حدیث، فلسفہ، منطق، معانی اور تفسیر کی ہوتی تھیں کی تدریس کی ذمہ داری بھی مجھے سونپ دی جاتی اور فرماتے کہ یہ نوجوان ہے اور کام اچھا چلا سکتا ہے اور یہ محض ان کا حسن ظن تھا۔

اور ایک موقعہ پر فرمایا کہ: ''دارالعلوم حقانیہ دارالعلوم دیوبند کی بیٹی ہے۔''

حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ دارالعلوم حقانیہ کو بہت ترجیح دیتے تھے۔ اور اس کے ذکر پر فخر فرمایا کرتے تھے۔ اور یہ خدا تعالی کا اپنا فضل وکرم ہے کہ تمام اکابر واساتذہ دارالعلوم دیوبند کو دارالعلوم حقانیہ سے ایک خاص محبت تھی اور سب فرماتے کہ یہ ہمارا اپنا دارالعلوم ہے۔ حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کا سب سے بڑا کارنامہ دارالعلوم کو ترقی وعروج کے بلند معیار پر پہنچا دینا ہے کہ آج تمام دنیا کے لیے دیوبند مشعلِ راہ ہے۔ تکثیر علماء، تکثیر طلباء، تدوین کتب اور تعمیرات ہر لحاظ سے دارالعلوم دیوبند ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ جس کی خدمات مسلّم اور شہرہ کالشّمس فی نصف النہار ہے۔ آج ہم ان کے سایہ شفقت سے محروم ہوگئے ہیں۔ یہ تمام اہل علم کے لیے بہت بڑا صدمہ ہے۔

میں کیا عرض کروں حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کی وفات سے ہمارے قلوب کو بہت صدمہ پہنچا۔ ہم ایک بڑے مشفق، ایک مہربان، ایک بڑے تجربہ کار، بڑے عالم اور خاص کر دارالعلوم دیوبند اور مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کے علوم کے حامل سے محروم ہوگئے۔ قیامت کی علامات سے من جملہ ایک علامت یہ بھی ہے کہ ''**یرفع العلم**'' جیسا کہ امام بخاریؒ نے اس جانب اشارہ فرمایا ہے کہ جب علم ناپید ہوجائے اور لوگ علوم دینیہ سے محروم ہوجائیں تو دین ختم ہوجائیگا۔ دین ہم کو علم ہی بتاتا ہے ہم جو یہاں مدارس میں جمع ہوتے ہیں۔ ہمارا مقصد علم حاصل کرنا ہے کہ نماز، روزہ، زکوۃ اور اللہ تعالیٰ کے دین کے احکام ومسائل سیکھ لیں۔ جب مسائل معلوم ہوجائیں تو اولاً ان پر خود عمل کریں پھر ان کی حفاظت واشاعت کی کوشش کریں اسی تبلیغ واشاعت کے نتیجہ میں ان شاء اللہ عالم آباد رہے گا اور اگر یہ کام چھوڑ دیا جائے تو عالم برباد ہوجائے گا۔ ہمارے اکابر اور اساتذہ اور علماء عمر طبعی کو پہنچ کر وفات پاگئے **کل من علیھا فان**.
مگر الحمدللہ کہ دین کے پودے لگاتے رہے اگر یہ سلسلہ جاری نہ رہتا تو دین کا باغ برباد ہوجاتا۔

اللہ تعالیٰ حضرت حکیم الاسلامؒ اور جمیع اکابر اساتذہ دارالعلوم دیوبند کے درجات بلند فرمادے۔ آمین

............❖............

دارالعلوم دیو بند کا آخری چراغ گل ہوگیا

مولانا سمیع الحق صاحب
اکوڑہ خٹک، پاکستان

داغ فراق صحبت ِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سووہ بھی خموش ہے

دارالعلوم دیو بند کی محفل دوشیں کا وہ چراغِ سحر جو پچھلے دوسال سے حوادث وانقلاباتِ زمانہ کے جھونکوں سے بجھ بجھ کر بھی ٹمٹمار ہا تھا بالآخر شوال ۱۴۰۳ھ کے پہلے ہفتے میں ہمیشہ کے لیے خموش ہوگیا یعنی حکیم الاسلامؒ مظہرِ انوارِ قاسمیہ، مسندنشین جامعہ دیو بند، ترجمانِ حقائق اسلامیہ حضرت مولانا محمد طیب صاحب قاسمیؒ نے داعی اجل کو لبیک کہا اور دیو بندی مکتبِ فکر کے اس میرمجلس کے بساط لپیٹ دینے سے محفلیں اجڑ گئی ہیں اور ہرسووحشت اور ویرانگی کا سا عالم ہے، اب اس دور کا بالکل خاتمہ ہوگیا ہے جو شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیو بندیؒ، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ، علامۃ العصر مولانا انور شاہ کشمیریؒ، شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کا یادگار تھا۔ ان کی ذات ان اکابر کی نہ صرف بقیۃ السلف نشانی تھی بلکہ ان کی ذات میں ان تمام اکابر واساطین دیو بند کی نسبتیں، جمع تھیں۔ اور وہ زندگی بھر اپنی ذاتی حسبی اور نسبی گونا گوں خصائل وکمالات کی وجہ سے ان تمام اکابر کے محبوب بن چکے تھے۔

بلاشبہ ان کی ذاتِ محبوبیت میں تماشا گاہِ عالم تھی۔ وہ اس گلشن علم ومعرفت کے مالی اور شجرۂ طوبیٰ کے امین تھے۔ جس کے لیے شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ۔ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہ اللہ اور شہدائے بالاکوٹ نے زمین ہموار کی۔ جس کی داغ بیل حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور فقیہ الاسلام مولانا رشید احمد گنگوہی نے ڈالی اور جس کی آبیاری میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیو بندیؒ، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ علامۃ

العصر مولانا انور شاہ کشمیریؒ، شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ جیسے عمائدین امت نے اپنی زندگی تج دی۔

یہ امانت جب آپ کے ہاتھوں آئی تو پون صدی کے طویل اور صبر آزما شبانہ روز جد وجہد، خداداد اہلیت وصلاحیت، اخلاص ودیانت اور والہانہ جہد وعمل کے ساتھ آپؒ نے اس مدرسہ علم کو ایک ایسے جامعہ میں تبدیل کردیا جس کے انوار وتجلیات سے ایک عالم جگمگا اٹھا۔ اور وہ اس امانت سے الگ ہوکر جب دنیا سے رخصت ہوئے تو دیوبند کا وہ سرچشمہ علوم نبوت کا ایک بحرذخار بن کر علم ودانش کی پوری دنیا سے اپنی برتری اور فضیلت کا لوہا منوا چکا تھا۔

آپؒ حضرت بانیِ دارالعلوم مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے پوتے اور فخر الاسلام مولانا محمد احمد صاحبؒ مہتمم خامس کے صاحب زادے تھے۔ حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے خصوصی تلمیذ حضرت شیخ الہند سے بیعت اور حضرت حکیم الامت تھانویؒ کے خلیفہ مجاز تھے۔ پورے طبقہ کے محبوب ومنظورِ نظر اور مرکز علمی کی سیادت کے لحاظ سے پوری جماعت کے سید الطائفہ تھے۔ علمی فیض کے علاوہ بیعت وارشاد کے میدان میں بھی لاکھوں مسترشدین کے روحانی رہبر ورہنما تھے۔

۱۳۳۷ھ میں درسِ نظامی سے فراغت پائی اور دارالعلوم دیوبند میں درس وتدریس کا مشغلہ اختیار کیا۔ ۱۳۴۳ھ سے ۱۳۴۸ھ تک دارالعلوم دیوبند کے نائب مہتمم رہے ۱۳۴۸ھ سے لے کر آخر وقت تک اس مرکز علم وہدایت کی سیادت آپ کو حاصل رہی۔ نیرنگی زمانہ یا چرخ نیلگوں کی ستم ظریفی کہیئے کہ زندگی بھر علم وحکمت کے جس ''تاج محل'' (دارالعلوم دیوبند) کی آرائش وتزئین میں مصروف رہے۔ جب وہ بنائے عظیم جشن صدسالہ کی شکل میں عظمت وترقی کے اوجِ کمال کو چھونے لگی تو اس عمارت کا یہ ''شاہجہاں'' جدائی اور ہجوری کے داغ لیے ہوئے دنیائے رنگ وبو سے الگ ہوگیا، جو کچھ پیش آیا گو اس کے محرکات ان کے عہد اہتمام کی طرح دیرینہ اور قدیم تھے اور مشیتِ ایزدی کے سامنے کس کی چلتی ہے۔ مگر پھر بھی بے اختیار جی میں آتا ہے کہ کاش یہ صورتِ حال دو ایک سال مزید پیش نہ آتی۔ اور دارالعلوم دیوبند کا یہ جرنیل ان ہی عظمتوں اور رفعتوں کے ساتھ اور ان ہی قدر شناسیوں کے ساتھ ہم سے رخصت ہوا ہوتا۔ جو زندگی بھر ہم سب نے انہی کے لیے مخصوص کر رکھی تھیں۔ اور جس کے وہ سزاوار تھے کہ سالارِ کارواں کی شوکت وسطوت پوری جماعت اور قافلہ کی شان بڑھاتی ہے۔ **ولکن ماشاء اللہ کان و مالم یشأ لم یکن.**

حکیم الاسلامؒ نسبی اور روحانی رشتوں کے ساتھ ساتھ علم وحکمت کے لحاظ سے اپنی ذات سے بھی ایک انجمن تھے۔ ان کے علوم وتصانیف اور خطبات، حکمت ولی اللّٰہی اور معرفت نانوتویؒ کے ابلتے ہوئے سرچشمے

ہوتے تھے۔ اسرار دین کی تشریح اور شریعت کی ترجمانی میں ان کا شمار گنے چنے حکماء اسلام میں ہوسکتا ہے۔ ان کی ہر تقریر حقائق ومعارف کا ایک سمندر اور ہر تحریر اسرار ونکات کی ایک دنیا اپنے اندر لئے ہوئے تھی۔ ان کے خطبات سے نہ صرف برصغیر کا گوشہ گوشہ بلکہ عالم اسلام کے علاوہ افریقہ اور یورپ کی دور دراز بستیاں بھی مستفید ہوئیں۔ دین اور مادر علمی دیوبند کی آواز پہنچانے میں زندگی کا اکثر حصہ طویل اسفار کی نذر رہا۔

اسلام کے اہم اور عصر حاضر کے جدید مسائل پر ایک سو سے زائد تصانیف چھوڑیں۔ حدیث وتفسیر اور فن حقائق واسرار کی کتابیں اکثر زیر درس بھی رہتیں۔ دعوت وبیان کا انداز حکیمانہ، تصنیف وتالیف کی شان فلسفیانہ ہونے کے باوجود شعر وسخن میں بھی اعلیٰ ذوق اور ثقہ انداز رکھتے تھے۔ ان کی مثنویاں، قصائد اور فصیح وبلیغ نظمیں، اعلیٰ ترین ذوق سخن کی غمازی کرتی ہیں۔

الغرض وہ اپنے جامع الصفات اکابر واسلاف کے کمالات ومحاسن، نجابت وسعادت، شرافت ووجاہت، فضل وکمال، اخلاق وشرافت، وقار وتمکنت، فکر واصابت، تواضع ومتانت کا ایک پیکر جمیل اور دیوبند کی اعلیٰ روایات کا ایک مرقع اور ظاہری لطافت ونظافت اور حسن وپاکیزگی کا ایک مجسمہ تھے۔ ان کا ماتم ان سب صفات کا ماتم ہے۔ پوری قوم اور پوری ملت کا ماتم ہے۔ دنیائے علم وفضل کا ماتم ہے۔ درسگاہوں، جامعات اور خانقاہوں کا ماتم ہے اور دار العلوم حقانیہ کے لیے بھی اس لحاظ سے ایک عظیم ماتم ہے کہ دار العلوم اور اس کے بانی مدظلہ کے ساتھ حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کے علائق وروابط اور خصوصی عنایات وتوجہات کی داستان تقریباً نصف صدی پر پھیلی ہوئی ہے ع

کبھی فرصت میں سن لینا بڑی ہے داستاں میری

الوداع اے فخر دین وملت۔ الوداع اے خادم حصنِ اسلام۔ الوداع اے شارح علوم قاسمیہ، الوداع اے امین گلشنِ نبویہ ﷺ الوداع اے میر کارواں، الوداع تیری تربت پہ ہزاروں رحمتیں ہوں اور تو رب کریم کے بے پناہ لطف وکرم سے مالا مال ہو ؎

نذرِ اشک بے قرار ازمن پذیر
گریہ بے اختیار ازمن پذیر

............❖............

حضرت حکیم الاسلامؒ اور دفاع عن الدین

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب
جنرل سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی، انڈیا

کسی بھی مذہب کی ترجمانی کے لئے دو باتیں ضروری ہیں: اول یہ کہ وہ جن افکار ونظریات کا داعی ہو، ان کو دلائل سے ثابت کیا جائے اور ان کی معقولیت، قانونِ فطرت سے ہم آہنگی اور افادیت کو نمایاں کیا جائے، دوسرے جو نظریات اس کے مغائر اور اس سے متضاد ہوں، ان کے غلط ہونے اور عقل ونقل کے موافق نہ ہونے کو بھی دلائل سے واضح کیا جائے، اسی لئے قرآن مجید میں جہاں عقیدۂ توحید کو کائناتی شواہد سے ثابت کیا گیا ہے، وہیں شرک کے رد پر بھی دلیلیں پیش کی گئی ہیں، جیسے آخرت کے ثبوت کے لئے خدا کی بے پناہ قدرت وطاقت کے حوالے سے استدلال کیا گیا ہے، وہیں انکار آخرت کی تردید بھی کی گئی ہے، کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ خدا نے انسان جیسی عظیم مخلوق کو بے کار اور عبث پیدا کیا ہو، جہاں رسول اللہ ﷺ کی نبوت اور قرآن مجید کی اعجازی شان کو واضح کیا گیا ہے، وہیں جو لوگ آپ کی نبوت ورسالت کا انکار کرتے تھے، ان کی تردید بھی کی گئی ہے، کہ مالک کو اپنی ملکیت میں تصرف کا پورا پورا حق ہوتا ہے، اس لئے اللہ جسے چاہے اپنی رسالت سے نواز سکتا ہے، **اللّٰہ یعلم حیث یجعل رسالتہ**.

اسی لئے ہر عہد میں امت کے اکابر علماء اور اصحابِ نظر نے دونوں پہلوؤں پر توجہ دی ہے، انہوں نے ایک طرف اسلامی تعلیمات کو پیش فرمایا، ان کی مصلحتوں اور حکمتوں پر روشنی ڈالی اور احکام وشریعت کے اسرار ورموز سے پردہ اٹھایا، دوسری طرف اسلام کے خلاف ہونے والی یورشوں کا مقابلہ کیا اور مخالف اسلام نظریات وافکار پر مدلل رد فرمایا، پھر اسلام کے خلاف جو فتنے اٹھتے رہے ہیں، وہ دو قسم کے ہیں، ایک وہ جو غیر مسلموں کی طرف سے پیش آئے اور دوسرے ان لوگوں کی طرف سے جن کے افکار امت کے سوادِ اعظم

یعنی اہل سنت والجماعت کے نظریات سے متصادم تھے، تاہم ان کا شمار مسلمانوں میں کیا گیا ہے جیسے معتزلہ، خوارج، روافض کے بعض گروہ، ان دونوں طرح کے مخالفین کا مقابلہ علماء حق کرتے رہے ہیں، البتہ بعض حضرات کی زیادہ توجہ داخلی اختلافات کی طرف رہی تاکہ امت کو صحیح فکر و عمل پر قائم رکھا جائے اور اس میں کوئی انحراف نہ آنے پائے اور بعض حضرات کی زیادہ توجہ بیرونی فتنوں پر رہی کیوں کہ بیرونی فتنوں کا مقابلہ درحقیقت دین حق اور اسلام کا دفاع ہے اور امت کو ارتداد و ضلال سے بچانا ہے۔

ہندوستان میں جن شخصیتوں نے اس دوسرے محاذ پر کام کیا ہے، ان میں نمایاں مقام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کا ہے، شاہ صاحبؒ نے یوں تو روافض اور اہل بدعت پر بھی رد کیا ہے اور تقلید کے مسئلہ میں افراط و تفریط پر بھی قلم اٹھایا ہے، لیکن ان کی اصل کاوش بیرونی حملوں سے مدافعت کی رہی ہے، شاہ صاحبؒ نے محسوس کیا کہ اب جو دور آرہا ہے وہ عقلیت پرستی کا دور ہوگا، اس میں شریعت کے ہر حکم کو عقل کی ترازو میں تولنے اور حکمت و مصلحت کی کسوٹی پر کسنے کی کوشش کی جائے گی، اسی پس منظر میں انہوں نے 'حجۃ اللہ البالغۃ' جیسی شہرہ آفاق کتاب تالیف فرمائی اور اس میں عقائد و عبادات سے لے کر معاشرت و معاملات، معاشی نظام اور جرم و سزا وغیرہ تک، احکام شرعی کے باہمی ارتباط، عقل و حکمت سے ان کی ہم آہنگی، انسانی فطرت اور ضرورت سے ان کی مطابقت اور ان کے مادی و روحانی فوائد پر تفصیل سے روشنی ڈالی، اس طرح مغرب کی طرف سے اسلام پر جو یلغار ہونے والی تھی گویا قبل از وقت اس کے مقابلہ کے لئے ہتھیار تیار کئے گئے، شاہ صاحبؒ کے بعد جس شخصیت نے اس کام کو آگے بڑھایا، ان میں بہت ہی نمایاں ترین نام حجۃ الاسلام حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ کا ہے، انہوں نے آریہ سماجی اور عیسائی فتنے کے مقابلہ پر خصوصی توجہ دی اور اپنی زیادہ تر کاوشیں مسلمانوں کو ان فتنوں سے بچانے میں صرف کیں، شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور حضرت نانوتویؒ کا ایک مشترکہ مزاج یہ بھی رہا ہے کہ انہوں نے اہل سنت والجماعت کے فروعی اختلاف میں نسبتاً کا پہلو اختیار کیا اور اسلام کی مدافعت اور اس کی فکری تائید و تقویت کو اصل موضوع بنایا۔

پھر ماضی قریب میں جو شخصیت ولی اللہی افکار اور قاسمی علوم کی امین اور شارح و ترجمان رہی ہے، ان میں حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کا نام نامی سرفہرست ہے، وہ واقعی اقبال کے اس شعر کے مصداق تھے۔

ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
بزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

یوں تو حلقۂ دیوبند کے سربراہ اور شارح وترجمان ہونے کی حیثیت سے انہوں نے داخلی فتنوں پر بھی قلم اٹھایا ہے اور جن گروہوں کی فکر میں ایک درجہ انحراف پایا جاتا تھا ان پر بھی نصح کے ساتھ رد فرمایا ہے، چنانچہ حضرت حکیم الاسلامؒ کی فکر کے بارے میں کلیدی کتاب وہ ہے جو آپ نے دیوبند کے مزاج ومذاق اور اس مسلک ومشرب کے اعتدال اور میانہ روی کی نسبت سے لکھی ہے اور واقعہ ہے کہ اس موضوع پر قلم اٹھانا آپؒ ہی کا حق تھا، کیوں کہ فکر دیوبند آپ کی روح میں اس طرح رچ اور بس گئی تھی جیسے گلاب میں اس کی رنگت اور موتیا میں اس کی خوشبو، اس لئے کوئی شبہ نہیں کہ آپؒ فکر قاسمی کے سب سے بڑے نقیب وترجمان تھے اور زندگی بھر اس ترجمانی کا حق ادا کرتے رہے۔ لیکن آپؒ کی زیادہ توجہ اپنے ان دونوں بزرگوں کے مزاج کے مطابق بیرونی فتنوں کی طرف رہی، آپؒ نے فتنہ قادیانیت کی رد میں بھی کوششیں فرمائی ہیں اور خود پنجاب میں اس موضوع پر مؤثر خطابات فرمائے ہیں، جب مسلم پرسنل لاء کے خلاف حکومت ہند نے بال وپر نکالنے شروع کئے اور مغرب زدہ مسلمانوں نے بھی شریعت کے خلاف علم بغات بلند کیا، تو آپؒ نے اس کا بھرپور مقابلہ کیا، اس لئے آپ کی زیادہ تر تالیفات دعوت واصلاح اور اسلام کی حقانیت کے ثابت کرنے سے متعلق ہیں، دین حق کو عقل واستدلال کی قوت کے ساتھ سمجھانا اور مسلمانوں کو بصیرت وشعور پر مبنی ایمان سے ہم کنار کرنا آپ کی فکر ونظر اور جہد وعمل کا خاص ہدف تھا، حضرت حکیم الاسلامؒ کے فکر ومزاج اور علمی ودعوتی مذاق پر اس تحریر سے روشنی پڑتی ہے جو آپؒ نے حضرت نانوتویؒ کے علوم کی تسہیل کے لئے ''مجلس معارف القرآن'' کی تاسیس کے پس منظر میں لکھی ہے، اس تحریر کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

دین عقیدہ وعمل کے مجموعہ کا نام ہے، عقیدہ سے عمل کا وجود ہوتا ہے اور عمل سے عقیدہ کا رسوخ ہوتا ہے جیسے درخت کے بیج سے شاخوں اور برگ وبار کا وجود ہوتا ہے اور پھر شاخیں جوں جوں پھیلتی اور بڑھتی ہیں جڑ کا رسوخ اور اندرونی پھیلاؤ بڑھتا جاتا ہے، مجموعۂ عقائد کا نام ایمان ہے اور مجموعۂ عمل کا نام اسلام اور ان دونوں کے مجموعہ کا نام دین ہے، ایمان تخم کی طرح دل کی گہرائیوں میں مخفی رہتا ہے، جسے عقل وبصیرت کی آنکھ دیکھتی ہے اور اسلام برگ وبار کی طرح فضا میں پھیلا ہوا ہوتا ہے جو سر کی آنکھ سے نظر آتا ہے۔ حدیث نبوی ﷺ میں اس حقیقت کو اس طرح واشگاف فرمایا گیا ہے کہ

الایمان سر والاسلام علانیة.

ایمان (دل میں) چھپی ہوئی چیز ہے اور اسلام (ہاتھ پیر پر) کھلی ہوئی چیز ہے۔

ایمانی عقائد اعمال کے رد وقبول کا بھی معیار ہیں کہ ان کے بغیر بڑے سے بڑا عمل بھی رد، ناقابل

قبول اور اکارت ہے اور یہی کسی مذہب کے حق و باطل کے پہچاننے کا بھی معیار ہیں، کیوں کہ اساسی عقائد ہر مذہب میں گنے چنے چند ہی ہوتے ہیں، لمبا چوڑا قصہ نہیں ہوتا جس کی تحقیق دشوار ہو؛ اس لئے کسی دین کے سمجھنے یا قبول کرنے کا مختصر راستہ اس کے عقائد ہی کا دیکھنا ہے کہ وہ مخالف عقل تو نہیں ہیں، نیز صاحب شریعت تک ان کی سند بھی متصل ہے یا نہیں؟ اس لئے کم سے کم یہ ناگزیر اور ضروری ہے کہ عقائد اور ایمان میں ایک ماننے والے کو بصیرت حاصل ہو اور وہ دین اور شریعت پر خواہ اصول کا حصہ ہو یا کلیات کا، سمجھ بوجھ کر جھکے اور ان پر دلائل اور حقیقت شناسی کے ساتھ جمے، اگر عقائد کا معاملہ محض سنے سنائے پر مبنی ہو، خود اپنی تحقیق یا سمجھ بوجھ کو اس میں دخل نہ ہو تو اسے صورتِ ایمان تو کہا جا سکتا ہے لیکن حقیقت ایمان باور نہیں کیا جا سکتا، اسی بناء پر محقق علماء میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا ہوا ہے کہ ایمان تقلیدی جس میں حجت و برہان اور بصیرت کا دخل نہ ہو بلکہ محض باپ دادا سے سنی سنائی ایک نقل ہو معتبر بھی ہے یا نہیں؟ ایک جماعت ادھر گئی ہے کہ ایمان تقلیدی معتبر بھی نہیں جب تک کہ وہ دلائل و براہین سے تحقیقی نہ بن جائے۔

اسی بناء پر قرآنِ حکیم نے دین و ایمان کے بارے میں تدبر اور تفکر کی دعوت دی ہے، جس کی جیتی جاگتی تصویر حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا وجودِ باجود اور ان کا مثالی ایمان ہے جو صاحب شریعت کے سامنے حاضر رہ کر بھی اپنے ایمان کو تحقیقی بنا کر ہی دل میں جگہ دیئے ہوئے تھے، قرآنِ حکیم نے اس کی تصدیق کرتے ہوئے فرمایا:

اُدْعُوْا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِىْ وَ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ.

بلاتا ہوں اللہ کی طرف سمجھ بوجھ کر میں اور جو میرے ساتھ ہے اور اللہ پاک ہے اور میں نہیں شریک بنانے والوں میں۔

پھر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں اولیت کے ساتھ اور ان کے مابعد کے لوگوں کے بارے میں تبعیت کے ساتھ ارشاد فرمایا گیا:

وَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّ عُمْيَانًا.

اور وہ لوگ کہ جب ان کو سمجھایئے ان کے رب کی باتیں، نہ پڑیں ان پر بہرے اندھے ہو کر۔

اس کلامِ خداوندی سے ظاہر ہے کہ ایمان خواہ اجمالی ہو یا تفصیلی، اس کی بنیاد بصیرت و تحقیق پر ہوتی ہے، گو اس کے درجات حسب استعداد اور مختلف ہوں جس کا ثمرہ فراستِ ایمانی ہے جو ہر مؤمن کا طغرائے امتیاز ہوتی ہے۔ اسی لئے حدیث نبوی ﷺ میں ارشاد فرمایا گیا:

اتَّقُوْا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّهٗ یَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰہِ.

مؤمن کی فراست سے ڈرتے رہو کیوں کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔

جس سے صاف واضح ہے کہ ایمان دار میں بقدر ایمان بصیرت وفراست اور نور حق کا وجود لازمی طور پر ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ جس حقیقت کا ثمرہ بصیرت ہو وہ بے بصیرت حقیقت نہیں ہوسکتی؛ کہ بے بصیرتی سے بصیرت پیدا نہیں ہوسکتی، جس کا حاصل وہی ایمان تحقیقی ہے نہ کہ سنا سنایا ایمان، اسی لئے اس دین میں عقل وبصیرت کی عظمت وفضیلت بیان فرما کر گویا اس کی دعوت دی گئی ہے اور اسی لئے قرآن حکیم نے جگہ جگہ آیاتِ الٰہی میں غور وفکر اور تدبر وتذکر اور حجت طلبی کی طرف بلایا ہے جو دوسرے عنوان سے اسی بصیرت و یقین کے پیدا کئے جانے کا امر ہے، اسی ایمانی حقیقت کو جو عقل وبصیرت اور تحقیقی حجت لئے ہو، آیات و روایات میں کہیں حلاوت ایمان سے، کہیں بشاشت ایمان سے، کہیں طعم ایمان سے، کہیں تفقہ فی الدین سے اور کہیں فہم سلیم سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اس سلسلہ میں خاص طور پر یہ بات قابل لحاظ ہے کہ آپؒ کا لب ولہجہ جرح وتنقید کے موقع پر بھی نہایت نرم اور فریق مخالف کے احترام پر مبنی ہوتا ہے، مثلاً آپؒ کی کتاب 'اسلام کا اخلاقی نظام' ایک عیسائی پادری کے اعتراضات کے رد میں ہے، انہوں نے اسلام پر چار اعتراضات کئے ہیں اور اس ضمن میں خاص کر پیغمبر اسلام ﷺ کے سلسلہ میں نہایت ہی دل آزار لب ولہجہ اختیار کیا ہے، حضرت حکیم الاسلامؒ نے ان اعتراضات کے تفصیلی وتحقیقی جوابات دیئے ہیں۔ لیکن اپنے اسلوب اور طرز تخاطب میں ہمیشہ اس بات کو ملحوظ رکھا ہے کہ مخالف کی گفتگو کا مواد کچھ بھی ہو لیکن ہم رحمۃ للعالمین ﷺ کی امت ہیں؛ اس لئے ہم فریق مخالف کے معیار پر اتر کر گفتگو نہیں کر سکتے۔ چنانچہ آپؒ اپنے جوابی مکتوب کے شروع میں تمہیدی گفتگو کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''گرامی نامہ سے آپؒ کے ذوق تحقیق کے ساتھ انکساریٔ طبع کی روش سے خوشی ہوئی، اختلاف دین کے باوجود اگر طبائع میں یہ جوہر ہو تو غیر مذہب کے انسانوں میں خیر خواہی اور موعظت ونصیحت کا جذبہ قائم رہ سکتا ہے، جو نیک راہ سامنے آجانے اور حق بینی کا ذریعہ بھی بن سکتا ہے، البتہ آپؒ کی تحریر میں الزام و اعتراض کے موقعوں پر جگہ جگہ متانت وسنجیدگی کا رشتہ ہاتھ سے چھوٹ چھوٹ گیا ہے، حتی کہ بعض جگہ استہزاء وتمسخر اور تحقیر وتوہین کا رنگ بھی آ گیا ہے، اگر جواب میں بھی رد والزام کے موقعوں پر کہیں ایسا رنگ نظر آئے تو اسے اپنی ہی تحریر کا آوردہ اور رد عمل سمجھا جائے پھر بھی انشاء اللہ مقتداؤں کی توہین یا استہزاء کا کوئی ایک کلمہ بھی

اس تحریر میں آپ کو نہیں ملے گا اور اگر کہیں ایسا بھی ہوگا تو وہ آپ ہی کے دعووں پر بطور فرض والزام کے ہوگا۔“

اس کتاب میں عیسائی پادری نے اسلام کے خلاف چار سوالات اٹھائے ہیں، ان میں ایک یہ ہے کہ اسلام کے پاس اخلاقی تعلیمات ہیں ہی نہیں، دوسرے رسول اللہ ﷺ کے حضرت زینبؓ سے نکاح کو ہدف تنقید بنایا گیا ہے، تیسرے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی اس روایت کو پیش کیا گیا ہے کہ جس نے ”لا الٰہ الاّ اللہ“ کہا وہ جنت میں داخل ہوگا، گو وہ چوری اور زنا کا مرتکب ہو، چوتھے ان کا دعویٰ ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے؟ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے بائبل کا قرآن پر تفوق ظاہر کرتے ہوئے بائبل کے بعض احکام کا ذکر کیا ہے، جیسے چوری مت کر، زنا مت کر، خون مت کر۔ آپؒ نے ان سوالات کے شافی وکافی جوابات دیئے ہیں، سب سے پہلے آپ نے اخلاق وافعال کے فرق پر روشنی ڈالی ہے، آپؒ نے لکھا ہے کہ اخلاق دراصل قلب کے اندر پیدا ہونے والے مادے صبر وشکر، سخاوت وشجاعت، مروت وعجز، حیا اورغنا وغیرہ سے عبارت ہیں، افعال ان کے آثار ہیں گویا اخلاق جڑ ہیں اور اعمال صالحہ ان سے پھوٹنے والی شاخیں ہیں، اس پس منظر میں آپؒ نے بتایا ہے کہ قرآن نے اعمال صالحہ کی تشریح کے ساتھ ساتھ اخلاقی صلاحیتوں کے پروان چڑھانے کی کوشش بھی کی ہے۔

پھر آپؒ نے اسلام کے نظام اخلاق کی وسعت کو بتانے کے لئے اللہ تعالیٰ کے ننانوے اسمائے حسنیٰ کو قرآن وحدیث سے نقل کیا ہے اوران کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہی اسمائے حسنیٰ اخلاق کی بنیاد ہیں کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: **تخلقوا باخلاق اللّٰہ**، چنانچہ فرماتے ہیں:

یہی حق تعالیٰ کے وہ اصول اخلاق، رحم وکرم، حلم وصبر، عفو ودرگذر، بڑائی وعظمت، قدرت وقوت، محبت، عدل وانصاف، علیمی وخبیری، وسعت واحاطہ، یکتائی، غنا، نورانیت، ہدایت، بزرگی، حفظ ونگہبانی، نفع وضرر رسانی کی طاقت، انعام وانتقام، سلب وعطا، ثبات واستقلال، مصدریت کمالات، تقدس وپاکی، حکومت وملوکیت، لطافت وستھرائی، علوشان، اعزاز وتذلیل، وغیرہ ہیں، جن کی اصولی تعداد ننانوے تک پہنچتی ہے، جنہیں حدیث نے ”اسماءالٰہیہ“ کے نام سے تعبیر کیا ہے اور قرآن نے ”اسماء حسنیٰ“ کے لقب سے یاد کیا ہے، یہی وہ پاکیزہ اخلاق خداوندی ہیں جنہیں حاصل کرنے کے لئے نبی کریم ﷺ نے امت کو امر فرمایا کہ: **تخلقوا باخلاق الله**.

اورانہی اخلاق الٰہیہ سے مخلوق کی اخلاقی تکمیل کے لئے نبی کریم ﷺ مبعوث ہوئے، چنانچہ خود ہی حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

بعثت لأتمّم مكارم الاخلاق.

میں بھیجا گیا ہوں اس لئے کہ پاکیزہ اخلاق کو حد کمال تک پہنچا دوں۔

پھر آپؒ نے لے پالک کے بارے میں شرعی حکم، حضرت زینبؓ سے آپ ﷺ کے نکاح کی مصلحت اور اس سے متعلق بعض روایتوں کی توضیح وتشریح نمبروار دس فقروں میں بیان فرمائی ہے، جو بہت ہی اہم اور چشم کشا ہے اور اس میں بہت سے اہم نکات واضح کئے گئے ہیں، اس سلسلہ میں آپ نے ایک اصولی حقیقت پر روشنی ڈالی ہے جو آپ ہی کے الفاظ میں اس طرح ہیں:

حقیقت یہ ہے کہ جب کسی قوم کے ہاتھ میں مستند دین نہ رہے اور تحریف شدہ کتاب پر دین کا دارومدار رہ جائے جس کی سند ہو نہ روایت ہو اور جس میں وقتاً فوقتاً خواہشات قوم اور حسب ضرورت زمانہ ترمیم وتنسیخ بھی عمل میں آتی رہی ہو، تو اس قوم میں دینی مذاق اور خدا اور اس کے پیغمبروں کے معاملات کو صحیح صحیح سمجھنے اور حدود کو قائم رکھنے اور ادب واحترام کا ذوق کہاں سے آئے۔(۱)

اس جواب کے ذیل میں آپؒ نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد "وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَاهُ"کی بھی بڑی عمدہ توضیح فرمائی ہے، حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ والی حدیث کا جواب دیتے ہوئے آپؒ نے فرمایا ہے:

حدیث ابوذر رضی اللہ عنہ جواز معصیت کے لئے نہیں آئی، بلکہ ایمان کی خاصیت بتانے کے لئے آئی ہے کہ وہ سبب نجات ہے اور اس میں معصیت حارج نہیں ہوسکتی، خواہ نجات کو مؤخر ہونا پڑے اور عذاب بھگت کر آدمی کو نجات ملے، مگر ملے ضرور۔(۲)

اسی ذیل میں آپؒ نے عیسائیوں کا عقیدۂ کفار اور عملی زندگی میں اس کی وجہ سے پیدا ہونے والی خدا ناترسی کا بھی ذکر فرمایا ہے۔ چوتھا اعتراض کہ "اسلام نے زور زبردستی سے مسلمان بنانے اور کفار کو قتل کرنے کی اجازت دی ہے۔" کے جواب میں آپ نے آیت قتال کے پس منظر کو واضح فرمایا ہے، نیز مسلمانوں کی تاریخ پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ کس طرح لوگوں نے رضا کارانہ خواہش ومرضی سے اسلام قبول کیا ہے۔(۳)

آپؒ کی تالیفات میں ایک اہم کتاب "مقالات طیب" ہے جو چار مقالات پر مشتمل ہے، اس میں پہلا مقالہ جو چھیالیس صفحہ پر مشتمل ہے، "اسلام عالمی مذہب ہے" کے عنوان پر ہے، یہ مقالہ عصری افکار کے پس منظر میں اسلام کے تعارف پر نہایت اہم ہے، جس میں تین دعوؤں پر بحث کی گئی ہے۔

- اسلام عالمی دین ہے۔
- اسلام دائمی دین ہے۔

✪ اسلام تنہا مدارِ دین ہے۔

اس میں آپ نے بہت ہی مدلل انداز میں اسلام کی آفاقیت اور عالمگیریت کو ثابت کیا ہے اور اس بات پر زور دیا ہے کہ اسلام میں سارے فیصلے اصولوں کی بنیاد پر ہوتے ہیں، نہ کہ قوم پرستی کی بنیاد پر، کیوں کہ قومیت خواہ رنگ ونسل کی بنیاد پر ہو یا علاقہ وطن کی اساس پر، وہ انسانوں کو تقسیم کرتی ہے، آپ نے اس میں یہ بھی واضح کیا ہے کہ کوئی بات محض قومیت یا آبائیت کی وجہ سے قابل قبول نہیں ہوسکتی، بلکہ اس پر عقلی یا نقلی دلیل ضروری ہے، آپ نے اس میں یہ بھی بتایا ہے کہ اسلام بنیادی طور پر مساوات کا قائل ہے، چنانچہ اس نے تحصیل علم میں کوئی امتیاز رکھا نہ عبادت میں اونچ نیچ، نہ قانون میں تفریق اور نہ حقوق میں جانب داری، یہاں تک کہ

اس کے یہاں قانون کی نگاہ میں مسلم اور ذمی بھی برابر ہیں، جس میں کوئی امتیاز روا نہیں رکھا گیا۔ (۴)

اس مقالہ میں یہودیت ونصرانیت اور اسلام کے مزاج کو سمجھاتے ہوئے تفصیل سے دونوں کے نظریاتی فرق پر روشنی ڈالی گئی ہے، اسی ذیل میں ایک جگہ فرماتے ہیں:

جس کا حاصل یہ نکلا کہ ایک یہودی یہودی نہیں بن سکتا ہے جب تک کہ وہ حضرت مسیح علیہ السلام کا انکار نہ کرے، ایک نصرانی نصرانی نہیں بن سکتا جب کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار نہ کرے، ایک ہندو، ہندو نہیں ہوسکتا جب کہ وہ غیر ہندی پیغمبر کا انکار نہ کرے، یعنی تفریق اقوام کو اعتقاداً وعملاً قبول نہ کرلے، لیکن ایک مسلم، مسلم نہیں بن سکتا جب تک کہ ان کے سارے پیغمبر کا اقرار کر کے ان کی تصدیق نہ کرے، نام بنام مذکور ہوں تو نام بنام اجمالی طور پر بلا ذکر نام مذکور ہوں تو اجمالی اور کلی تصدیق نہ کرے، چنانچہ اسلام نے پیغمبروں کو کبھی نہیں جھٹلایا، اس کے نزدیک پیغمبر کبھی غلط گوئی نہیں کرسکتے۔ (۵)

آپؒ نے اسلام کی 'رحمت عامہ' کے ذیل میں اسلام کے نظامِ عدل پر بھی بڑی بصیرت افروز گفتگو کی ہے، پھر اس کے ضمن میں اس بات پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ نجات کے لئے مسلمان ہونا ضروری ہے اور غیر مسلم کوئی بھی، کتنا بھی اچھا کام کرے دوزخ میں ہی داخل ہوگا، تو ایسا کیوں ہے؟ اور کیا یہ تعصب نہیں ہے؟ آپ نے اسلام کے اصول مساوات اور مغرب کے تصور مساوات پر بھی روشنی ڈالی ہے، آپؒ نے ایک اصولی اور بنیادی حقیقت پر توجہ دلائی ہے کہ ''تقسیم عمل اور تقسیم وظائف میں فرق استعداد وقابلیت کے لحاظ سے ہوسکتا ہے، مساوات کا تعلق حقیقتاً انسان کے اختیاری افعال سے ہے، غیر اختیاری امور سے نہیں'' (۶)

نیز آپ نے تاریخی حقائق اور مثالوں سے ثابت کیا ہے کہ اسلامی نظریات اور اس کے منصفانہ اصول

سے اقوام عالم نے بھی خوشہ چینی کی ہے۔

'مقالاتِ طیبہ' میں ایک اور اہم مقالہ 'دو علمی سوال اور ان کے جواب' کے عنوان سے شامل ہے، پہلا سوال ہے: ''وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا'' کہ اس میں اختلاف نہ ہونے کو کلام الٰہی ہونے کی دلیل قرار دیا گیا ہے، حالاں کہ مطلق اختلاف تو کلام الٰہی میں بھی موجود ہے اور جہاں تک تاویلات وتوضیحات کے بعد تعارض رفع کرنے کی بات ہے تو یہ کلام بشر میں بھی ممکن ہے۔

دوسرا سوال قرآن مجید میں قسم سے متعلق ہے، حضرت مولانا طیب صاحبؒ نے متکلمانہ انداز میں ان دونوں سوالات کے جواب دیئے ہیں۔ جو بتیس صفحات پر مشتمل ہے۔

مذاہب کے درمیان معجزات کا مسئلہ ہمیشہ سے زیر بحث رہا ہے، حضرت حکیم الاسلامؒ کا خطاب اس موضوع پر بڑا مفید اور مدلل ہے جو ''معجزہ کیا ہے؟'' کے نام سے شائع ہوا ہے اور اٹھائیس صفحات پر مشتمل ہے۔

اس دور میں مستشرقین کی جانب سے اسلام کے خلاف جن شکوک وشبہات کو ابھارا گیا ہے اور ان سے بہت سے مغرب زدہ مسلمان بھی متاثر ہوئے ہیں، ان میں ایک حدیث رسول اللہ ﷺ کی حجیت اور اس کے اعتبار واسناد کا مسئلہ بھی ہے، اس موضوع پر آپؒ کی کتاب ''حدیث رسول کا قرآنی معیار'' نہایت ہی بصیرت افروز اور منفرد نوعیت کی حامل کتاب ہے، جس میں حدیث کی مختلف اقسام -خبر عزیز، خبر غریب، خبر متواتر- کی قرآن مجید سے حجیت اور راوی کی مطلوبہ صفات کے بارے میں قرآن کی وضاحتوں وغیرہ پر بڑی عمدہ روشنی ڈالی گئی ہے، خاص طور پر جو لوگ قرآن کو حجت مانتے ہیں اور حدیث کا انکار کرتے ہیں، ان کے فکری انحراف کے علاج کے لئے یہ اکسیر کا درجہ رکھتی ہے۔

آج کل مغربی تہذیب کی وجہ سے جو مسائل پیدا ہوتے ہیں، ان میں مردں کے لئے داڑھی اور عورتوں کے لئے پردہ کے مسائل بھی ہیں، چنانچہ آپ کی تالیف ''داڑھی کی شرعی حیثیت'' آپؒ نے فکری اور فقہی دونوں جہتوں سے گفتگو کی ہے، ایک طرف آپؒ نے بتایا ہے کہ مردوں کے لئے داڑھی مقتضیات فطرت میں سے ہیں اور تمام مذاہب میں داڑھی رکھنے کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا ہے، دوسری طرف آپؒ نے اسلامی نقطۂ نظر سے داڑھی کی اہمیت کو بیان کیا ہے، نیز قرآن وحدیث، آثار صحابہ اور فقہا کی تصریحات سے یہ بات ثابت ہے کہ داڑھی کی کم از کم مقدار ایک مشت ہے، اسی طرح پردہ کے موضوع پر آپؒ کا رسالہ ''شرعی پردہ'' جو ایک سو چھبیس صفحات پر مشتمل ہے نہایت اہم ہے، اس کتاب میں آپؒ نے مسئلہ حجاب کی اہمیت اور اس کی علت اور بے حیائی کے نقصانات، نیز پردہ کے نقطۂ نظر سے مشرقی اور مغربی

تہذیب کا موازنہ جیسے موضوعات پر روشنی ڈالی ہے اور اس سلسلہ میں مغرب کے موجودہ حالات پر بعض اعداد و شمار بھی نقل کئے ہیں، نیز پردہ پر جو اعتراضات کئے جاتے ہیں اور اس کے جو نقصانات بتائے جاتے ہیں، ان کا بھی تفصیلی رد فرمایا ہے، اس رسالہ میں خواتین اسلام کے علمی اور اصلاحی کارنامے کا بھی بڑا تفصیل سے ذکر آ گیا ہے، چنانچہ اس سلسلہ میں ایک طویل اقتباس نقل کئے جانے کے لائق ہے:

صاحب بدائع الصنائع کی بیوی اپنے دور میں ایسی فقیہ سمجھی گئی ہیں کہ ایک درجہ میں فتویٰ کا مدار ان پر ہو گیا تھا، اس فقیہ خاتون کے باپ نے اپنی بیٹی کے فضل و کمال کو دیکھ کر اعلان کیا تھا کہ جو شخص اپنے ممتاز علم اور راسخ تفقہ کا ثبوت دے گا، اس سے لڑکی کی شادی کی جائے گی، صاحب بدائع نے اس اعلان پر کتاب 'بدائع الصنائع' تصنیف کر کے پیش کرائی، جو صاحب زادی کے باپ کو پسند آئی اور نکاح کر دیا، پھر خاوند و بیوی کے علم و کمال نے یہاں تک قلوب پر سکہ جمایا کہ اس زمانہ میں کوئی فتویٰ اس وقت تک معتبر نہ سمجھا جاتا تھا جب تک اس پر صاحب بدائع، ان کی علامہ بیوی اور خسر کے دستخط نہ ہو جاتے تھے۔

امام طحاوی کی صاحب زادی وہ اعلیٰ تعلیم رکھتی تھیں کہ امام ممدوح حدیث و فقہ کا املاء بھی ان ہی کے قلم سے کراتے تھے، خود بولتے تھے اور صاحب زادی قلم بند کرتی رہتی تھیں۔

سعید بن المسیبؒ کی عالمہ صاحب زادی کے فضل و کمال کی تمام اسلامی قلم رو میں شہرت پھیل گئی، خلیفہ وقت نے نکاح کا پیام دیا مگر نامنظور ہوا، نکاح ایک غریب عالم و فاضل سے ہوا، ان جیسی سینکڑوں عالم و فاضل خواتین اسلام کی سوانح عمریاں مستقل کتابوں میں درج کی گئی ہیں، پھر صحابیات میں کتنی ہی وہ خواتین ہیں جن کے فضل و کمال کو لسانِ نبوت پر سراہا گیا ہے، ایک عائشہؓ ہی کو حضور ﷺ نے نبوت کے آدھے علم کا حامل اور امین بتلایا ہے، کیا ان علم پرور خواتین اور ان جیسی دوسری ہزار ہا قابل ذکر خواتین نے اپنا پردہ فروخت کر کے علم کی متاع خرید کی تھی؟ نہیں، بلکہ امام طحاوی کی تو وفات کا سبب ہی اس عالم صاحب زادی کا حجاب و انفعال ہوا ہے، صاحب زادی سے مسائل فقہ کا املاء کرا رہے تھے، اس میں بعض نسوانی مسائل کا ذکر آیا، جس میں بعض مسائل جماع و مباشرت سے متعلق تھے، جن میں یہ لفظ بھی املاء میں آیا کہ ''اذنجامعھن یکون کذا'' (جب ہم عورتوں سے جماع کرتے ہیں تو ایسا ہوتا ہے مثلاً غسل واجب ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ) صاحب زادی نے یہ مسئلہ لکھا اور غیر اختیاری طور پر کچھ ہلکا سا شرم آمیز تبسم کیا، اس پر امام طحاوی کی نظر پڑ گئی، بے حد منفعل ہوئے اور اسی انفعال سے مغلوب ہو کر وفات پا گئے، ظاہر ہے کہ حیاء دار سے حیا کی جاتی ہے، اس سے جہاں امام موصوف کی محجوبیت اور پردہ داری نمایاں ہوتی ہے وہیں صاحب

زادی کی حیاء وعفت اور پردہ داری کا ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ وہ حجاب کی کس حد پر پہنچی ہوئی تھیں، جس نے باپ پر انفعال کا یہ غیر معمولی اثر ڈالا کہ وہ جاں بر نہ ہو سکے۔

اس سے اوپر کے طبقات میں ازواجِ مطہراتؓ، عام صحابیاتؓ اور پھر قرون اسلاف کی عام خواتین اتقیاء پر نظر ڈالو اور غور کرو کہ آیا ان کے علوم کی گہرائیاں زیادہ تھیں جب کہ پردہ وحجاب اپنی اعلیٰ حدود پر پہنچا ہوا تھا، یا آج کی مسلم خواتین علوم وکمالات میں بڑھی ہوئی ہیں جب کہ ہر نہج کی بے حجابی اور آزادی دل و دماغ میں سرایت کر چکی ہے، اگر تعلیم میں حجاب حائل تھا تو حضرت عائشہ صدیقہؓ پردہ میں بیٹھ کر اور بلا کسی اسکول یا مدرسہ میں گئے ہوئے اتنی زبردست عالمہ کیسے ہو گئیں کہ بڑے بڑے علماء صحابہ رضی اللہ عنہم پس پردہ ان سے مسائل حل کرتے تھے اور علوم نبوت کا نصف حصہ ان کے حصہ میں آ گیا، حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ عارف منصب نبوت تھیں جنہوں نے اول وحی پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھبرا جانے پر آپ کو ڈھارس اور تسلی دی اور علاج بتایا کہ یہ معرفت کی بات ہے تو کسی عارف ہی سے اس کا علاج کرایا جائے تو ورقہ ابن نوفل کے پاس لے گئیں، پھر دوسری صحابیاتؓ جن میں ایک سے ایک اعلیٰ علم رکھتی تھیں اور بعد کے قرون میں جیسے حضرت رابعہ بصریہؒ، رابعہ عدویہؒ وغیرہ کہ علماء وعرفاء میں اعلیٰ علم رکھتی تھیں اور مشاہیر عارفات میں سے تھیں، آخر وہی پاکباز عورتیں تھیں جو پردوں میں عفت کے ساتھ خانہ نشیں تھیں، حافظ ابن عساکر جیسے مشہور محدث نے جن اساتذہ سے علم حاصل کیا ہے، ان میں اسّی (۸۰) سے زیادہ عورتیں شمار کرائی ہیں، حفید ابن زہرا کی بہن اور بھانجی علم طب اور فن حکمت میں مشاہیر زمانہ میں سے ہوئی ہیں، یزید بن ہارون کی لونڈی ان کی آخری عمر میں جب کہ وہ ضعیف البصر ہو چکے تھے خود کتب حدیث سے احادیث کو یاد کرتی، انتخاب کرتی اور اپنے آقاء کو حدیثوں پر مطلع کرتی۔

ابن سماک کوفی مشہور عالم کو لونڈی ان کی تقریروں میں اصلاح دیا کرتی تھی اور انہوں نے فن خطابت میں اپنی باندی ہی سے استفادہ کیا، حضرت معاذۂ عدویہ صدیقہ عائشہؓ کی شاگرد ہیں، مشہور مرتاض ونفس کش خاتون گذری ہیں۔

حضرت فاطمہ نیشاپوری ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کے شیوخ میں سے ہیں، جن سے انہوں نے فیض اٹھایا ہے۔

حضرت رابعہ شامیہ علوم معرفۃ میں مشاہدہ کے درجہ پر پہنچ گئی تھیں، جنات اور حوریں انہیں آنکھوں سے نظر آتے تھے۔

حضرت امۃ الجلیل اولیاء کبار میں سے ہیں، مشائخ وقت معرفت کے مسائل دقیقہ ان سے حل کیا کرتے تھے۔

عفیرہ عابدہؒ کے پاس ان کے علوم و کمالات اور قرب الٰہی کے سبب عبادِ زمانہ دعا کرانے کے لئے حاضر ہوا کرتے تھے۔

حضرت شعوانہ ایسی جلیل القدر عالم باطن تھیں کہ فضیل ابن عیاض رحمہ اللہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے اور دعاء کے خواہش مند ہوتے۔

آمنہ رملیہؒ مشہور عارفہ ہیں، بشر بن حارث اور امام احمد بن حنبل امام علوم ان سے نیازمندانہ پیش آ کر دعاء کے خواستگار ہوئے۔

حضرت سیدہ نفیسہؒ کی جلالت قدر کے سبب امام شافعیؒ ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے، حضرت ست الملوکؒ اپنے زمانہ کی مقبول بارگاہِ حق تھیں، بڑے بڑے علماء و مشائخ ان کی عظمت کرتے اور استفادہ کے خواہش مند رہتے۔

یہ بطور نمونہ ان چند مشاہیر عورتوں کے اسماء گنا دیئے گئے ہیں، ان جیسی ہزارہا فاضلہ عالمہ عورتیں امت کے ہر قرن میں پیدا ہوئیں جنہوں نے اپنے فضل میں مردوں کی نوع کو مات دے دی، جن کے لئے کتاب صفۃ الصفوۃ میں مستقل باب رکھا گیا ہے، جس میں ان فاضلات و عالمات کی سوانح عمریاں درج کی گئی ہیں، پھر فنون دین ہی نہیں فنون عصر شاعری ادبیات اور بلاغت و معانی میں بھی عورتیں بڑی بڑی فاضلہ گذری ہیں، مسماۃ نہانی جو والدۂ شاہ سلیمان کی مصاحب خاص اور حسن و جمال میں بے نظیر تھی اس درجہ کی ادیب اور شاعرہ تھی کہ اس نے اپنے نکاح کی شرط ہی یہ قرار دی تھی کہ جو اس کے ذیل کے ادیبانہ قطعہ کا جواب لکھ کر لائے گا وہ اس سے شادی کر لے گا۔ قطعہ یہ تھا:

از مردِ برہنہ روئے زری طلبم	میں خالی ہاتھ مرد سے زر چاہتی ہوں
در خانۂ عنکبوت پر می طلبم	اور مکڑی کے جال میں پر چاہتی ہوں
من از دہنِ مار شکر	میں سانپ کے منھ سے شکر چاہتی ہوں
وز پشۂ مادہ شیر نر می طلبم	اور مچھر کی مادہ سے شیر نر چاہتی ہوں

مردوں میں سے کوئی شاعر اس کا جواب نہ دے سکا، ایک سعد اللہ خاں وزیر آگے آیا جس نے اس قطعہ کا برجستہ جواب دیا:

علمے است برہنہ زرکہ تحصیل زراست

علم خالی ہاتھ سے ہے جس سے زر حاصل ہوتا ہے

تن خانۂ عنکبوت دل بال و پراست

تن خاکی مکڑی کا ایک جال ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں، دل اس کے لئے پر اور بازو ہے جس سے وہ پرواز کرتا ہے اور عرش تک جا پہنچتا ہے۔

زہراست جفائے علم ومعنی شکراست

راہ علم کی محنت سانپ کا زہر ہے اور اس کی معنویت جو اس کے اندر مخفی ہے شکر ہے جس سے روح تک شیریں ہو جاتی ہے۔

ہر پشہ از و چشید آں شیر نراست

مچھر (یعنی کمزور سے کمزور انسان بھی) اسے چکھ لے تو وہی شیر نر ہے۔

ظاہر مسماۃ نہانی کی یہ قابلیت پردہ دری کی رہین منت نہ تھی بلکہ پردہ پوش اور وہی شاہی حرم سرا کے پردوں میں رہ کر تھی جس کا پلہ بھی کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا، ریاض الفردوس میں ایک درجن ایسی فاضلہ عورتوں کے تذکرے ملتے ہیں جو فضلاء وقت تھیں اور مردان سے استفادہ کرتے تھے مگر یہ سب کچھ اسی دور کی تاریخ ہے جو آج کی بے حیائی اور بے پردگی سے بہت دور تھا، اور ان تمام علوم وفنون میں صنف نازک نے اپنے پردہ کو محفوظ رکھ کر ہی ترقی کی تھی، ایسی مثالیں بعد کے قرون میں بکثرت ملتی ہیں جن میں پردہ کے تحفظ کے ساتھ علوم وفنون کی گرم بازاری قائم رہی۔

ان کے یہ سارے علمی وعملی کمالات معاذ اللہ پردہ دری کے نتائج نہ تھے بلکہ پردہ داری اور پاک دامنی کے ثمرات تھے، ہواوٴ ہوس کے نہیں بلکہ ہدیٰ وتقویٰ کے، پس ان جیسی صدہا اور بے شمار فاضل و پاکباز عورتیں آخر پردہ میں رہ کر کس طرح زیور علم سے آراستہ ہوگئیں، یا اگر بفحوائے کریمہ "وَاذْكُرْنَ مَايُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيَاتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَة" خانگی تعلیم مسلمان بچیوں کے لئے ناکافی ہوتی تو اس قدر کافی علم ومعرفت اور فقہ ان جیسی ہستیوں کو کیسے میسر آ گیا۔

مسلمانوں پر فرقہ واریت کا الزام لگایا جاتا ہے اس موضوع پر بھی آپؒ کا رسالہ اسلام اور فرقہ واریت، (صفحات: ۸۰) نہایت اہم رسالہ ہے جس میں آپ نے اسلام کی عالم گیریت اور اس کے علاقائی، قبائلی اور سیاسی تعصّبات سے بالاتر ہونے کی بات بڑے مدلل انداز میں پیش فرمائی ہے، اس ذیل میں ایک جگہ

ہندوستان کے فضائل پر بھی بڑی اچھی گفتگو آ گئی ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

اللہ کا پہلا دارالخلافہ جس میں اولین خلیفۂ خداوندی آدم علیہ السلام نازل ہوئے ہندوستان ہے کیوں کہ آدم جنت سے سراندیپ کے جزیرہ میں دجنی کی وادی میں اترے ہیں جو ہند میں ہیں، چنانچہ ابن جریر ابن حاتم اور حاکم نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے اور اسے صحیح کہا ہے کہ:

اول ما اهبط الله آدم الیٰ ارض الهند (وفی لفظ) بدجنیٰ ارض بالهند.

سب سے پہلے اللہ نے آدم کو زمین ہند میں اتارا (اور ایک لفظ میں ہے) دجنی میں اتارا جو سرزمین ہند میں ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ کی دوسری روایت میں سراندیپ کا لفظ بھی موجود ہے، اس وادی کی فضیلت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

خیر وادٍ فی الناس وادی مکة و وادٍ نزل به آدم بارض الهند.

بہترین وادی لوگوں کی وادئ مکہ ہے (جس میں بیت اللہ ہے) اور وہ وای جس میں آدم سرزمین ہند میں اترے۔

آدم علیہ السلام نے اول ہندوستان ہی کو اپنا وطن بنایا، گویا دنیا کی پہلی آبادی ہندوستان سے شروع ہوئی، آدم علیہ السلام اول النبیین ہیں، اس کے لئے پہلا دارالنبوت خدا کا ہندوستان ٹھہرتا ہے جیسا کہ آخری دارالنبوت حجاز ہے، اول باآخر نسبتے دارد۔

جنت سے دو ہی انسان زمین پر اترے ہیں، آدم ہندوستان میں اور حواء (زوجۂ آدم علیہ السلام) سرزمین حجاز میں، خدا کا پہلا قانون، ہندوستان ہی میں آیا اور یہیں سے دین شروع ہوا جس کی تکمیل بالآخر حجاز نے کی، جبرئیل امین اور روح القدس کا پہلا ورود ہند میں ہوا جو وحی لے کر اترے، پہلی اذان ہندوستان میں ہوئی جس میں توحید کا اعلان ہوا، جیسا کہ روایات میں موجود ہے، اول النبیین کو آخر النبیین کی بشارت ہند ہی میں دی گئی، یعنی سرزمین ہند پہلا دارالتبشیر ہے۔ طبری کی روایت میں ہے کہ آدم حواء علیہا السلام کو لے کر حجاز سے لوٹے تو اسی وادی میں آئے جس میں نزول ہوا تھا اور وہیں رہنے کے لئے گھر بنایا، یعنی ہندوستان پہلے نبی کا وطن ہے، **وکفی به فخراً**، آدم علیہ السلام کی قبر بھی دجنی ہی میں ہے اور بنص حدیث ثابت ہے کہ آدمی کی قبر اس جگہ بنتی ہے جہاں سے اس کے خمیر کے لئے مٹی لی جاتی ہے، اس لئے کہا جاتا ہے کہ خاکِ ہند ہی نے پیغمبری کی بنیاد رکھی، آدم علیہ السلام نے چالیس حج کئے اور ایک حج کے لئے بیل پر

سوار ہو کر گئے ہیں جیسا کہ سبحۃ المرجان نے روایت نقل کی، نیز کھیتی باڑی کے لئے پہلا جانور سرخ رنگ کا بیل اور گائے ہی اللہ نے آدم علیہ السلام کو عنایت فرمایا ہے، گویا بیل کی نسل ہند ہی سے شروع ہوئی ہے، شاید اسی لئے ہندوستان میں اس جانور کی عظمت زیادہ کی جاتی ہے کہ یہ اولین حیوانات بھی ہے اور اسے اول النبیین سے ایک خاص نسبت بھی حاصل ہے۔

انبیاء علیہم السلام میں فہم ادریس معروف ہے گویا فہم کی تیزی حضرت ادریس علیہ السلام کا ممتاز وصف ہے اس لئے ان پر حکمت خصوصیت سے اتاری گئی۔

پس اگر حجاز اس لئے مقدس ہے کہ خاتم النبیین کا مولد ومنشا اور مہبط وحی قرآنی ہے، اگر شام اس لئے مقدس ہے کہ وہ انبیاء بنی اسرائیل کا مولد ومنشا ہے، اگر مصر اس لئے مقدس ہے کہ اسے موسیٰ علیہ السلام سے نسبت حاصل ہے اور اگر عراق اس لئے مقدس ہے کہ اسے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے نسبت ہے، تو بلا شبہ ہندوستان اس لئے مقدس ہے کہ اسے آدم علیہ السلام سے نسبت ہے اور پہلی وحی کا مہبط ہے، پہلا دارالنبوۃ اور دارالخلافہ ہے اور اس لئے مقدس ہے کہ بنص روایت طبرانی وہ حضرت شیث علیہ السلام کا وطن ہے جو آدم علیہ السلام کے جلیل القدر بیٹے اور ان کے خلیفہ ہوئے جنہوں نے آدم علیہ السلام کے جنازہ کی نماز پڑھائی ہے اور اس لئے مقدس ہے کہ بروایت ابن عباس رضی اللہ عنہ (جس کو سبحۃ المرجان نے نقل کیا ہے) وہ نوح علیہ السلام کا وطن ہے، سینکڑوں اہل اللہ کے مکشوفات بھی ہیں، جس سے ہندوستان کے مختلف انبیاء کی قبروں اور آثار کا انکشاف ہوا ہے۔

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ (اول صدر مدرس دارالعلوم دیوبند) نے فرمایا کہ گنگا کے دہانے پر مجھے انوار نبوت محسوس ہوئے، کسی نبی کا جسم مدفون ہے، یا آثارِ نبوت ہیں، حضرت مولانا رفیع الدین صاحبؒ مجددی نقشبندی خلیفۂ ارشد حضرت شاہ عبدالغنی محدث دہلویؒ اور اولین مہتمم دارالعلوم دیوبند کا مکاشفہ ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند کی قبر عین کسی نبی کی قبر میں واقع ہے۔

نماز اسلام کا اہم ترین رکن ہے بلکہ کلمہ شہادت کے بعد رکن اعظم ہے، نماز کی اہمیت اس کی کیفیت اور افعالِ نماز کی مصلحت وحکمت اور اسرار ورموز پر آپ کی کتاب فلسفۂ نماز (صفحات: ۱۶۰) بڑی ہی چشم کشا اور نہایت ہی نادر مضامین کی حامل کتاب ہے، اس میں فلسفہ اور مذہب کا تعلق، انسانی بدن میں جمادات، حیوانات اور نباتات کا اجتماع اور نماز کی تاثیر اور اس میں ترتیبی پہلو وغیرہ جیسے نکتوں پر ایسی نفیس گفتگو کی گئی ہے کہ کہیں اور دیکھنے کو نہیں ملی، حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب میں آپؒ کا قلم امام غزالیؒ، عزالدین بن

عبد السلامؒ اور شاہ ولی اللہ کا ہم رکاب نظر آتا ہے۔

آپ کا ایک اہم خطبہ مذاہب عالم اسلام کے تین بنیادی امتیازات کے عنوان سے ہے جو پچاس صفحات سے زیادہ پر مشتمل ہے، اس خطبہ میں بتایا گیا ہے کہ ''عقل ونقل اور استناد'' تینوں باتیں اسلام کو حاصل ہیں، اس ذیل میں آپ نے حفاظت قرآن اور اس کی ظاہری و باطنی شہادت، حدیث کی حفاظت و حجیت، اسلام کا قانون وراثت، تعدد ازدواج اور ہندوستان میں اسلام کی آمد اور اس کی مقبولیت جیسے موضوعات پر گفتگو کی ہے، یہ بھی آپ کے اہم خطبات میں ہیں۔

برصغیر میں جن لوگوں نے انکار حدیث کے فتنے کو کھڑا کیا، ان کی قیادت کرنے والوں میں ایک پروفیسر غلام جیلانی برق بھی تھے، جن کی کتاب 'دوقرآن' اور 'دو اسلام' نے ایک زمانہ میں پورے ملک میں دھوم مچا رکھی تھی، دوقرآن میں یہ بات دکھائی گئی ہے کہ ایک خدا کا قولی قرآن ہے اور وہ ہے مصحف مقدس اور ایک خدا کا فعلی قرآن ہے اور وہ ہے کائنات، پھر اس پس منظر میں مطالعہ کائنات کی اہمیت کو بتاتے ہوئے دین کے بہت سے مسلمہ حقائق کا انکار بلکہ ان کا استہزاء کیا گیا ہے، آپ نے اس کا جواب ''ایک قرآن'' (صفحات:۱۲۶) کے نام سے لکھا ہے اور اس میں یہ بات واضح کی ہے کہ مادی تمدنی ترقی کے مقابل روحانی تمدنی ترقی زیادہ اہم ہے، یہی انبیاء کی دعوت کا مقصد رہا ہے اور قرآن مجید نے اس کو بار بار تاکید و اہتمام کے ساتھ بیان کیا ہے، اس رسالہ میں ''اَنَّ الْاَرْضَ یَرِثُھَا عِبَادِیَ الصَّالِحُوْن'' پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی اور اس کی صحیح مراد متعین کی گئی ہے، اس کا خلاصہ خود مؤلف کے الفاظ میں اس طرح ہے:

(۱) آیاتِ تکوین کی رو سے صحیفۂ کائنات کا مطالعہ ضروری ہے لیکن معرفتِ صانع کے لئے، نہ کہ محض معرفتِ مصنوعات اور مادہ کی توڑ پھوڑ سے صنعتی کاروبار چلانے کے لئے۔

(۲) مادی اقتدار ضروری ہے، لیکن قانونِ فطرت کو نافذ العمل بنانے اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے نہ کہ استبداد و تعیش اور اعلاء کلمۃ الفسق کے لئے۔

(۳) استخلاف فی الارض ضروری ہے لیکن مادی حوائج سے غنی بن کر کامل بننے کے اور بنانے کے لئے، نہ کہ وفورِ اسباب سے اپنی محتاجگی کو بڑھانے اور دنیا کی نقالی کرنے کے لئے۔

(۴) مدنیت اور تمدنی اکتشافات بقدرِ ضرورت ضروری ہیں لیکن تعاونِ باہمی میں ازدیاد کے لئے نہ کہ مادیت میں غلو اور رفاء فی العیش ہو جانے کے لئے۔

(۵) تسخیرِ کائنات ضروری ہے لیکن روحانی تصرفات کی مشق بہم پہنچانے اور صورتوں کے راستہ سے

حقائق تک پہنچنے کے لئے، نہ کہ مادی تصرفات میں محصور اور محدود رہ کر صورت پرستیوں اور مختلف الاشکال ڈیزائنوں میں غرق ہو جانے کے لئے۔

(۶) اعداء اللہ کی تخویف کے لئے امکانی تیاری (اعداد مستطاع) ضروری ہے لیکن دشمن کی نقالی یا اس کی طرح عَدد اور عُدد پر کلیۃً اعتماد کے ساتھ نہیں بلکہ فی الجملہ ان اشیاء کی رعایت رکھ کر، قوت قلب، حوصلۂ یقین اور حکیمانہ تدابیر کی ضرورت کے ساتھ۔

(۷) اور بالآخر یہ تمام امور، تمدن، سیاست، امارت، تسخیر، تکوین وغیرہ ضروری ہیں، مگر رضائے الٰہی اور قربِ حق کے لئے، نہ کہ رضائے نفس اور ارضائے غیر کے لئے۔

(۸) اور خلاصہ یہ ہے کہ جب کہ تمام دینی مقاصد کی تحصیل بغیر اتباع نبوی ﷺ کے ناممکن ہے جو حقیقتاً عملی قرآن ہے، تو بطور تفنن طبع اگر تعددِ قرآن کا نظریہ موزوں ہے تو ''تین قرآن'' کے عنوان کے ساتھ تا کہ کتاب اللہ علمی قرآن ہو، کائنات اللہ برہانی اور تمثیلی قرآن ہو اور رسول اللہ ﷺ کی ذات اقدس عملی قرآن ہو، نہ کہ ''دو قرآن'' کے نظریہ کے ساتھ، جس میں تمثیلی قرآن تو سرے سے حذف ہو جائے اور عملی قرآن باقی بھی رہے تو تلبیس کے ساتھ اور غیر واقعی ہو کر، یعنی بجائے ذاتِ نبوی ﷺ کے کائنات آ جائے جس سے کوئی اسوہ اور عملی نمونہ اخذ نہیں کیا جا سکتا۔

بہرحال اس مضمون کی جملہ تفصیلات اور آخر میں اس نمبر وار خلاصہ سے یہ مخفی نہیں رہتا کہ میرا مقصد مسلمانوں کی مادی، صنعتی، عسکری اور دوسری انواع کی قوت و شوکت یا حسب ضرورت دنیا کی ترقی یافتہ وسائل کے استعمال سے گریز یا انکار کرنا نہیں بلکہ انہیں آیات تکوین کا مدلول کہے جانے، ان کے معیارِ کفر و اسلام ہونے اور انہیں مقصدِ حیات کہہ کر اپنی ترقی کا میدان بنا لینے یا غلو و افراط اور مبالغوں سے ان میں منہمک اور فنا ہو جانے پر نکیر و انکار کرنا ہے۔

آپ کی ایک تالیف ''خاتم النبیین'' (صفحات: ۸۵) ہے، یہ رسول اللہ ﷺ کی نبوت پر ایک انوکھی کتاب ہے، جس میں ختم نبوت کی دلیلوں کے علاوہ نبوت محمدی کے تمام انبیاء سے فائق ہونے نیز تمام انبیاء کے کمالات و معجزات کے جامع ہونے کا تذکرہ ہے۔

اس سلسلہ میں آپ کی ایک قابل ذکر تالیف ''اصولِ دعوت اسلام'' بھی ہے، یہ دعوتِ دین کی اہمیت و افادیت اور دعوت کے طریقۂ کار کے سلسلہ میں شرعی اصول و احکام پر نہایت ہی اہم تحریر ہے اور دریا بہ کوزہ کا مصداق ہے، اس میں آپ نے دعوتی اسفار، دعوت کی انواع، مدعوین کی قسموں، داعی کے اوصاف وغیرہ

جیسے موضوعات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، اس اہم فریضہ سے غفلت پر افسوس کا اظہار کیا ہے اور کار دعوت کے لئے ایک لائحہ عمل بھی پیش کیا ہے، نیز تمہیدی طور پر مذاہب عالم کا مختصر جائزہ بھی لیا گیا ہے، جس میں عیسائی مذہب، لامی و بتتی مذہب اور یہودی مذہب کا خصوصی تذکرہ ہے۔

جن لوگوں نے حضرت حکیم الاسلامؒ کے خطبات کو سننے اور آپ کی مجلسوں میں بیٹھنے کی سعادت حاصل کی ہے، وہ بخوبی واقف ہیں کہ ان مواقع پر آپ کی زبان سے ایسا لگتا تھا کہ علم وفکر کا آبشار جاری ہے اور اس میں جہاں دعوت و اصلاح اور موعظت و تذکیر کی باتیں ہوتی تھیں، وہیں احکام دین کا باہمی ارتباط، قانون فطرت سے ان کی مطابقت، ان کے اسرار و مصالح اور ان کی عقلی توضیحات پر بھی بڑی حکیمانہ گفتگو ہوتی تھی، جو قلب و روح کے ساتھ ساتھ، دماغ کو بھی مطمئن کرتی تھی، حضرت حکیم الاسلامؒ کے وہ خطبات جو ''خطبات حکیم الاسلامؒ'' کے عنوان سے دس جلدوں میں طبع ہو چکے ہیں، میں بھی بہت سے خطبات کا موضوع متکلمین کے طرز پر اسلام کی صداقت وحقانیت کو ثابت کرنا اور معاندین کے سوال کا جواب دینا ہے اور ضمنی طور پر تقریباً ہر خطبہ میں اس طرح کے مضامین آ گئے ہیں، یہاں چند اہم خطبات کے صرف عناوین ذکر کئے جاتے ہیں۔

❂ راہِ اعتدال	خطبات حکیم الاسلام	جلد سوم
❂ معرفت باری	؍؍	؍؍
❂ تسکین فطرت	؍؍	؍؍
❂ خطبۂ طیبہ	؍؍	؍؍
❂ اسلام۔ عالمی مذہب ہے	؍؍	چہارم
❂ نبوت وملوکیت	؍؍	پنجم
❂ افادات علم وحکمت	؍؍	ہفتم
❂ مسلم پرسنل لاء	؍؍	ہشتم
❂ اسلام اور آزادی	؍؍	؍؍
❂ اشتراکِ مذہب	؍؍	؍؍
❂ نبی امی ﷺ	؍؍	دہم
❂ رہنمائے انقلاب	؍؍	؍؍
❂ اسلامی آزادی کا مکمل پروگرام	؍؍	؍؍
❂ تکمیل انسانیت	؍؍	؍؍

اس سلسلہ میں آپ کے دو اہم خطبات صدارت بھی قابل ذکر ہیں، ایک ''فکر اسلامی کی تشکیل جدید'' کے عنوان سے ہے، جو آپ نے دسمبر ۱۹۷۶ء میں ڈاکٹر ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ دہلی میں دیا تھا، اس خطبہ میں آپ نے فکر و تعقل کی اہمیت، قواعد و اصول اور جزئیات کی افادیت، ضمیر کی آزادی اور حریت رائے، نیز اسلام کی عالمگیریت پر بڑی حکیمانہ روشنی ڈالی ہے۔

دوسرے نومبر ۱۹۷۳ء میں مسلم پرسنل لاء کنونشن بمبئی کا خطبہ صدارت جو نہایت ولولہ انگیز اور تاریخی خطبہ ہے، جس میں قانون شریعت کی اہمیت اور اس کے اعتدال و توازن پر نہایت ہی عالمانہ طور پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اسلام کی حفاظت و مدافعت کے پہلو سے جو علمی و تالیفی خدمات آپ نے انجام دی ہیں، ان کے علاوہ تحریکی اعتبار سے بھی آپ کی خدمات نہایت ہی اہمیت کی حامل ہیں، جن میں سب سے جلی عنوان '' آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ'' کا ہے، ہندوستان میں آزادی سے پہلے معمارانِ قوم یہ وعدہ کرتے آرہے تھے کہ آزادی کے بعد مسلمانوں کے پرسنل لاء کو تحفظ دیا جائے گا، پھر جب دستور بنا تو مذہب پر عقیدہ، اس پر عمل اور مذہب کی تبلیغ کی آزادی کو اقلیت کا بنیادی حق تسلیم کیا گیا لیکن بدقسمتی سے آہستہ آہستہ حکومت کا تیور بدلنے لگا، مسلم پرسنل لاء کے خلاف سرکاری ذمہ داروں کے بیانات کے ذریعہ تبدیلی کا راستہ کھولنے کی کوشش کی گئی، اس موقع پر حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ نے دارالعلوم دیوبند میں اس موضوع پر اجلاس طلب کیا، جس میں علماء اور دانشوران شریک ہوئے۔

پھر نومبر ۱۹۷۲ء میں اس اجلاس کی تحریک پر بمبئی کا وہ عظیم الشان کنونشن منعقد ہوا، جس کے بارے میں بزرگوں کا تصور تھا کہ خلافت تحریک کے بعد ایسا ہمہ مسلکی، ہمہ جماعتی اور ہمہ علاقائی اجلاس منعقد نہیں ہوا، اس اجلاس کی صدارت کے لئے آپ ہی کا انتخاب عمل میں آیا، اس اجلاس نے بورڈ کی تشکیل کا فیصلہ کیا، بورڈ کی تشکیل مسلکی اور جماعتی کشاکش کی وجہ سے بہت دشوار کام تھا لیکن حضرت حکیم الاسلامؒ کی بالغ نظر، معتدل اور مرنجان مرنج شخصیت کی شکل میں ایک ایسی شخصیت موجود تھی جن کی صدارت پر تمام لوگوں کا اتفاق ہو گیا اور پھر آپ کی وفات تک تحفظ شریعت کا یہ کارواں نہایت ہی کامیابی کے ساتھ اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہا اور ایمرجنسی جیسے پرافتاد حالات میں بھی آپ کی حکیمانہ قیادت میں اس نے سفر جاری رکھا۔

حقیقت یہ ہے کہ خارجی فتنوں کا مقابلہ اور دین حق کا دفاع آپ کی کاوشوں کا خاص ہدف تھا اور اس معاملہ میں بھی آپؒ دیوبند کے اصل مزاج و مذاق اور فکر و نظر کے نمونہ تھے، کیوں کہ دارالعلوم کے قیام کے

بعد سے جب بھی اسلام کے خلاف کوئی فتنہ اٹھا، علماء دیوبند اس کا مقابلہ کرنے میں پیش پیش رہے، اس ملک میں ہندو احیاء پسندی کی تحریک اٹھی، عیسائی مبلغین ملک کی گلیوں اور کوچوں میں لوگوں کو دعوت ارتداد دینے لگے، انگریزوں کی مدد سے قادیانیت کے فتنہ نے ایک سیل بلاخیز کی طرح اپنے بال و پر پھیلائے، الحاد اور نیچریت ایک طوفان بن کر نئی نسلوں کے دل و دماغ پر چھانے لگی، اشتراکیت اور کمیونزم نے علمی لباس پہن کر اور اسلامی لبادہ اڑھ کر مسلمانوں کو متاثر کرنا شروع کیا، انکار حدیث کا فتنہ ایک زبردست علمی یلغار کے ساتھ اٹھا اور قانون شریعت کی معقولیت، فطرت انسانی سے اس کی ہم آہنگی اور موجودہ دور میں اس کی نافعیت پر سوالیہ نشانات اٹھائے گئے، خود رسول اللہ ﷺ کی سیرت مبارکہ پر حرف گیری کی گئی، ان فتنوں کے مقابلہ کے لئے جو لوگ اٹھے، یا جنھوں نے اس کاروانِ تحفظ دین کی سالاری کی وہ یا تو علماء دیوبند تھے، یا وہ لوگ جو دیوبند کی فکر سے متاثر تھے۔

دین پر استقامت اور حمیت ایمانی کا امتزاج اور اس کے ساتھ ساتھ اسلام کی ایسی ترجمانی جو دل و دماغ دونوں کو متاثر کرتی ہو، علماء دیوبند کا مزاج رہا ہے اور آج بھی اس بات کی ضرورت ہے کہ ہماری توجہ فروعی اور داخلی اختلافات سے زیادہ دفاعِ اسلام پر ہو، کیوں کہ فروعی اختلافات میں الجھ جانے والے لوگ اکثر خارجی فتنوں کی طرف توجہ نہیں کر پاتے، یہی فکر دیوبند کے سرخیل حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی زندگی کا پیغام ہے، یہی مکتب دیوبند کے بانی و مؤسس حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی کوششوں کا اصل ہدف رہا ہے اور یہی حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کی زندگی کی اصل دعوت ہے۔

............❖............

(۱) حضرت مولانا محمد طیب قاسمیؒ، اسلام کا اخلاقی نظام، ص:۶۷

(۲) ایضاً، ص:۱۷۳

(۳) ایضاً، ص:۱۹۹

(۴) حضرت مولانا محمد طیب قاسمیؒ، مقالاتِ طیبؒ، ص:۱۸

(۵) ایضاً ص:۳۴

(۶) ایضاً ص:۶۸

............❖............

حضرت حکیم الاسلامؒ کی تصانیف پر ایک نظر

مولانا اسیر ادرویؒ
ریوڑی تالاب، بنارس

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کی شہرت ایک سحر البیان خطیب اور شیوا بیان مقرر کی حیثیت سے تھی، ان کا ظاہری جاہ وجلال، حسن و جمال، رکھ رکھاؤ، لباس کی پاکیزگی وزیبائی، پُر وقار چہرہ، عالمانہ تمکنت و وجاہت ان تمام خصوصیات نے مل جل کر ان کی شخصیت کو دل کش اور پُر وقار بنایا تھا، پہلی ہی نگاہ میں ان کو دیکھنے والا مرعوب اور متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا، وہ ایک خطیب اور شیوا بیان مقرر کی جملہ خصوصیات سے متصف تھے، کشیدہ قامت، دل کش شخصیت، سرخ وسپید چہرہ، مخصوص لب ولہجہ، واضح اور صاف لہجہ وآواز، اندازِ گفتگو میں توازن واعتدال، خودداری اور خوداعتمادی، موضوع کے لحاظ سے الفاظ کا استعمال، احادیث وقرآن کے ایک ایک لفظ سے حکیمانہ نکتہ آفرینی، خالص عالمانہ زبان میں حقائق و معارف اور اسرار وحکم کی ایسی نقاب کشائی فرماتے تھے کہ علماء، صلحاء، زہاد، اساتذہ علم وفن تو ایک طرف عوام اور کم پڑھے لکھے لوگ بھی مسحور ہو کر رہ جاتے تھے۔ زبان جادو کرتی تھی اور اندازِ بیان دلوں کو جیت لیتا تھا۔

الفاظ ومعانی کے پھول برساتی ہوئی زبان، شان وشوکت سے مرصع و مسجع کلام، مخصوص لب ولہجہ، خاص طرزِ ادا کے ساتھ موضوع کے دائرے میں رہتے ہوئے ہر ممکن مواد کو سمیٹتی ہوئی، علم وحکمت کا نور بکھیرتی چلی جاتی تھی، سلجھا اور نکھرا ہوا اندازِ بیان، معیاری اور رفیق عالمانہ زبان، پُر شوکت الفاظ کے ساتھ حُسن اخلاص مضمون سے لگن، موضوع سے وابستگی و وفاداری، علم کی گہرائی و گیرائی، مطالعہ کی وسعت، پیش کش کا خوبصورت سلیقہ دلوں پر سحر کرتا چلا جاتا تھا۔ ان کی دقت نظر، سلامتی ذہن، اصابتِ رائے، احتیاط وتیقظ، اکابر علماء و بزرگانِ دین کی صحبت وتربیت، تقویٰ وطہارت، اخلاص و بے نفسی، غیر جذباتی ٹھنڈی طبیعت،

علوم متداولہ پر عبور، ان کی تقریر سے متاثر ہوئے بغیر کوئی شخص نہیں رہ سکتا تھا۔

حضرت حکیم الاسلامؒ درحقیقت منبر و محراب کے بزرگ تھے، اسی میدان میں ان کے جوہر بھی کھلے کیوں کہ ان کا حقیقی میدان یہی تھا، اپنی زندگی اور ماحول، عہدہ ومنصب، ذمہ داری وفرائض کے لحاظ سے بھی خطابت وشیوا بیانی کی ضرورت تھی اور وہ ان کی ذات کا ایک ضروری عنصر بن گئی تھی۔

حضرت حکیم الاسلامؒ بحیثیت مصنف

اپنے فرائض و ذمہ داریوں کی مصروفیتوں اور طول طویل اسفار کے باوجود درجنوں کتابیں بھی یادگار چھوڑی ہیں، ہر کتاب اپنے مواد، اپنی معلومات، اپنے دلائل، استنباط مسائل واستخراج نتائج، حکیمانہ نکتہ آفرینیوں اور پُرشوکت ومرعوب کن کلامی مباحث کے لحاظ سے اپنا ایک خاص امتیاز ومقام رکھتی ہے، ان کتابوں کو پڑھ کر قاری محسوس کرتا ہے کہ دائرۂ معلومات میں بہت سی ایسی باتیں ضرور آ گئی ہیں جن پر اب تک ان کی نگاہیں نہیں پڑی تھیں، ہر کتاب حضرت حکیم الاسلامؒ کی مخصوص طرز تحریر کے ساتھ عالمانہ ومحققانہ مباحث، زبان وبیان کی رعنائیوں اور دل آویزیوں سے آراستہ وپیراستہ ہے۔

آپؒ کی اکثر کتابوں کا اپنا اپنا ایک تاریخی پس منظر ہے، ہر کتاب کسی ناگزیر ضرورت کے پیش نظر معرض تحریر میں آئی ہے، ایسا کم ہوا ہے کہ خود حضرت حکیم الاسلامؒ کے ذہن نے کوئی علمی موضوع منتخب کیا ہو اور اس پر غور وفکر کے بعد اپنی کتاب مرتب کی ہو بلکہ اکثر ہوتا یہ رہا ہے کہ کسی نے ان سے علمی ومذہبی سوالات کئے یا ان کے گردوپیش کچھ ایسے حالات پیدا ہوگئے کہ اس میں مسلمانوں کی رہنمائی کی شدید ضرورت محسوس ہوئی یا اسلامی حلقوں میں کسی فتنہ نے سر اٹھایا اور اس کے دفعیہ کی ایک عالم دین کی حیثیت سے ان پر ذمہ داری عائد ہوئی اور انہوں نے قلم اٹھالیا اور مختصر جواب یا مضمون کے بجائے ایک مستقل کتاب تیار ہوگئی۔

حضرت حکیم الاسلامؒ عرصۂ دراز تک اسلامی دنیا کے ایک عظیم ترین مذہبی ادارے کے سربراہ رہے جس ادارے سے وابستہ عام اہلِ علم کا ملک میں ایک اہم پُروقار اور بلند علمی مقام تھا، یہ ادارہ اپنی علمی ومذہبی خدمات، اصلاحِ مفاسد وبدعات اور اسلامی دستورِ حیات وتعلیمات وروایات کو ہر قسم کی آمیزشوں اور آلائشوں سے پاک وصاف، مصفیٰ ومجلی رکھنے اور ان کو روشن وتابناک بنانے کی جہد مسلسل کی وجہ سے مستقل ایک مکتبۂ فکر بن گیا تھا۔ قدرت نے اس ادارہ میں ایسی عبقری شخصیتیں پیدا کیں جو اپنی بے پناہ علمی صلاحیتوں اور علومِ اسلامی پر مبصرانہ نگاہ کی وجہ سے اپنے اندر اجتہادی شان رکھتے تھے، فرق باطلہ میں ان کی علمی شہرت نے زلزلہ ڈال دیا تھا، ان کے لئے ان کی زبان، ان کا قلم، شمشیر براں کی تیزی اور رعد وبرق کی

کڑک وگرج رکھتا تھا، انہیں اسباب کی بنا پر اسلام پر اعتراض کرنے والوں نے بھی انہیں کو اسلام کے ترجمان کی حیثیت سے خطاب کیا، اپنے شکوک وشبہات اور اعتراضات انہیں کے سامنے پیش کئے، اسی کے ساتھ ساتھ اسلامی تعلیمات وروایات سے محبت رکھنے والوں ان کو روشن وتابناک دیکھنے کی تمنا رکھنے والوں کی نگاہیں بھی انہیں کی طرف اٹھتی تھیں جب اسلام پر اور اس کی تعلیمات وروایات پر کسی طرف سے کوئی حرف آتا تھا۔

حضرت حکیم الاسلامؒ تو اس ادارہ کے سربراہ ہی تھے اس لئے قدرتی طور پر اس طرح کے سوالات ان کے سامنے پیش کئے جاتے تھے۔ خود حضرت حکیم الاسلامؒ اپنی ذہنی وطبعی ساخت وپرداخت اور ایک عظیم علمی سلسلۃ الذہب سے وابستہ ہونے کی حیثیت اور ذہن ومزاج کے لحاظ سے انہیں علماء کے گروہ میں شامل تھے، جنہوں نے کچھ ہی دنوں پہلے عیسائیت کے دہاڑتے ہوئے سیلاب کے آگے بند باندھا تھا، آریوں کی یورشوں اور بدزبانیوں کا سدباب کیا تھا، قادیانیوں کے طائرفکر وخیال کے پرنوچ کر ان کی قوت پرواز چھین لی تھی، انہیں اسباب کی وجہ سے جب وہ ملک میں اصلاحی وتبلیغی دورے کرتے تھے تو ان سے ہر طرح کے لوگ ملتے تھے اور اپنے اشکالات اور شکوک وشبہات پیش کرتے تھے۔

ان شکوک وشبہات، اعتراضات واشکالات کو دور کرنا وہ اپنا مذہبی ودینی فریضہ تصور کرتے تھے اور اپنی ذمہ داری سمجھتے تھے اور وہ قلم ہاتھ میں اٹھا لیتے تھے۔ عام طور پر حضرت حکیم الاسلامؒ کی تصانیف کا یہی پس منظر ہے۔

میں نے حضرت حکیم الاسلامؒ کی تصانیف کا تعارف کراتے ہوئے ان کے پس منظر بتانے کی بھی کوشش کی ہے تاکہ کتاب کے مباحث کو اس سے سمجھنے میں سہولت اور مدد ملے اور کتابوں کی اہمیت کا اندازہ ہو سکے، میرے سامنے حضرت حکیم الاسلامؒ کی جو تصانیف ہیں انہیں پر اظہارِ خیال کیا ہے، اگر ان کی اہم تصانیف کا ذکر اس مضمون میں نہیں ہے تو یہ سمجھ لیجئے کہ مجھے وہ کتابیں دستیاب نہیں ہوئیں اور تادمِ تحریر مجھے نہیں مل سکیں۔

اجتہاد وتقلید

ہندوستان میں تقلید وعدم تقلید کی بحث ایک صدی سے چلی آرہی ہے۔ اس مسئلے پر چھوٹی بڑی کتابیں لاتعداد ہیں، مباحثے ومناظرے بھی بڑی تعداد میں ہوئے ہیں جو بالعموم چند فروعی مسائل تک محدود رہے۔ اس ماحول اور بحث ومباحثہ نے تعلیم وتعلم کے طریقہ کو بھی ایک خاص رنگ میں رنگ دیا، احادیث کے اسباق میں قراءت خلف الامام، آمین بالجہر، رفع یدین، رکعاتِ تراویح کی تعداد کے مسئلے پر اساتذہ دھواں دھار تقریریں کرتے ہیں اور طلبہ کے ذہن میں ان مسئلوں کے سارے پہلوؤں کو اتنی تفصیل سے جاگزیں کردیتے ہیں کہ ذہین طلبہ میں ان مسائل کے دلائل دونوں طرح کی حدیثوں کے درمیان تطبیق، احادیث

کی صحت وضعف اس سلسلہ کے راویوں کی جرح وتعدیل تک سے واقف ہوجاتے ہیں، زیادہ تر یہ بحث انہیں چند جزئی مسئلوں تک محدود رہتی ہے۔ان مسئلوں نے ہندوستان میں دو گروہ بنادیئے ہیں جوآج تک قلمی معرکہ آرائیوں اورنبرد آزمائیوں میں مصروف ہیں، ان مسائل کی بحث بھی ناتمام ہے۔ایک صدی گزر چکی ہے لیکن ہنوز روزِ اول ہے، ہندوستان کی فضا میں اب بھی **ھل من مبارز** کی صدا گونجا کرتی ہے۔

ان دونوں گروہوں کا بنیادی اختلاف تقلید وعدم تقلید کا مسئلہ ہے جو اجتہاد کی ضرورت اوراس کی شرائط کی تفصیلات پر منحصر ہے۔اگر یہ مسئلہ حل ہوجائے تو سارے مسائل از خود حل ہوجائیں۔آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے تک ہندوستان کے مسلمانوں میں ساری تباہیوں اور بربادیوں کے باوجود اس بحث ومباحثہ سے دلچسپی باقی رہی ہے اوراس دور کے ہر قابلِ ذکر عالم نے جس کے ہاتھ میں قلم تھا اس مسئلہ پر کوئی کتاب یا کوئی رسالہ ضرور لکھا، شبلی جیسا مؤرخ اسلام اور محقق انسان بھی اس گروہ بندی اور ہنگامہ آرائی سے دامن نہ بچا سکا اور ''المعتدی'' لکھ کران مجاہدین کی صف میں شامل ہوگیا جو عدم تقلید کے خلاف مصروفِ جہاد تھی۔

حضرت حکیم الاسلامؒ کا دورِ شباب اسی ماحول اور فضا میں گزر رہا تھا وہ کیسے اس سے دور رہ سکتے تھے، اس لئے اس فضا سے متاثر ہوکر آپ نے بھی ایک مختصر رسالہ ''اجتہاد وتقلید'' کے نام سے سپردِ قلم کیا اور حق یہ ہے کہ بحث کا حق ادا کردیا، آپ نے اپنی خداداد صلاحیتوں کے بدیع المثال نمونے پیش کئے ہیں جن کی طرف ابھی ایسی کوئی غائرانہ نظر نہیں ڈالی گئی تھی اور اپنی حکیمانہ نکتہ رسی کی وجہ سے مباحث کے ایسے ایسے پہلوؤں کو منصۂ شہود پر لائے ہیں جن کی طرف عام طور سے اہل علم کے ذہن نہیں گئے تھے۔اس رسالہ میں بھی انہوں نے اپنی انفرادیت برقرار رکھی اور وہ راہ اختیار نہیں کی جس پر دوسرے ہزاروں نقوش قدم پہلے سے موجود تھے بلکہ انہوں نے اپنی راہ خود نکالی۔

آپ نے اصل بحث سے پہلے گفتگو کا آغاز تکوین وتشریع کے درمیان ایک تعلق خاص کو بتاتے ہوئے نتیجہ نکالا کہ جس طرح کائنات عالم کے کلی مادے آب، خاک اور باد وآتش پھر مادوں کی کلی موالید جمادات، نباتات، حیوانات پھران کے علویات اور سفلیات پھر موالید علوی وسفلی کی جامع انواع واجناس انسان، شیر، بکری، شجر، حجر، بحر وبر، جن وملک، سیارات وثوابت، ارض وسماء وغیرہ وغیرہ کی یہ مجموعی ہیئت جیسے 'عالم' کہتے ہیں کوئی کمی بیشی قبول نہیں کرسکتے۔اسی طرح دین کے اصول وکلیات اساسی قواعد وضوابط اور تمام منصوص عقائد واحکام کی اس مجموعی ہیئت کذائی میں جسے عالم کہتے ہیں اب کوئی کمی بیشی اور ترمیم و تنسیخ نہیں ہوسکتی کیوں کہ **لن تجد لسنۃ اللّٰہ تبدیلا** کہہ دیا گیا۔

یہ نتیجہ نکالنے کے بعد حضرت حکیم الاسلامؒ نے بتایا کہ جس جس طرح کائنات کا نظام درجۂ تکمیل کو پہنچ جانے کے بعد اس میں تغیر وتبدل نہ ہوتے ہوئے بھی سیکڑوں اور ہزاروں پہلو ایسے ہیں جو اب تک نگاہوں سے مخفی ہیں اور جب غور وفکر سے کام لیا جاتا ہے تو ایسے ایسے عجائبات وغرائب نگاہوں کے سامنے آتے ہیں جہاں تک عقلِ انسانی کی اب تک رسائی نہیں ہوئی تھی۔ اسی طرح تشریع کے منظّم احکام ومسائل اور قواعد و کلیات کے مخفی علوم واسرار کا پتہ لگا کر ان سے تدیّن کے نئے نئے فروعی مسائل، لطائف وظرائف اور حقائق و معارف پیدا کئے جاسکتے ہیں۔ تکوینی اکتشافات کا نام ایجاد ہے اور تشریعی استخراج کا نام اجتہاد ہے۔

آپ نے کتاب میں آگے چل کر بتایا کہ اجتہاد کا رنگ ہر دور کے علمی ذہنیت اور تقاضوں کے مطابق ہوتا ہے۔ مجتہد انہیں کے مسائل کے استخراج پر اپنی توجہ مرکوز رکھتا ہے جن کی اس دور کو ضرورت ہوتی ہے اور جب ضرورت پوری ہوجاتی ہے تو اس کے بعد اجتہاد کا وہ دور نہیں لوٹتا جو آچکتا ہے کیوں کہ زمانہ کو بات حاصل ہوچکی ہوتی ہے اب صرف اس سے نفع اٹھانے کا موقع رہ جاتا ہے۔ آپ نے مزید ارقام فرمایا کہ ہر دور میں مسلمانوں میں دو طبقے رہے ہیں، ایک وہ جن میں قدرت نے استنباط واستخراج مسائل کی فطری صلاحیت ودیعت کردی تھی اور دوسرے وہ لوگ جو اس نعمت عظمیٰ میں اس کے شریک نہیں تھے، جن کی احادیث کے ذخیرے پر نگاہ ہے وہ جانتے ہیں کہ صحابہ کرام میں بھی دو طبقے موجود تھے، بعض صرف حافظِ حدیث تھے اور بعض فقیہ ومجتہد تھے جیسے ابن عباسؓ، ابن عمرؓ، ابن مسعودؓ حضرات شیخین رضی اللہ عنہم، پھر فقہائے صحابہؓ میں بھی فرق مراتب تھا۔ بعض کے ذہن کی رسائی بہت گہری تھی اور بعض کی اس سے کم کیوں کہ ملکۂ اجتہاد وہبی ہوتا ہے کسبی نہیں، بعض اس کے اہل ہوتے ہیں بعض نہیں۔ احادیث، قرآن اور واقعاتِ صحابہ سے بہت سی مثالیں دیتے ہوئے اس فرقِ مراتب کو آپ نے واضح کیا ہے۔

فرقِ مراتب کی موجودگی نے یہ ثابت کردیا کہ اگر اجتہاد ضروری ہے تو تقلید بھی ضروری ہوجاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ قدرت نے جن لوگوں کو قوت اجتہاد نہیں دی ہے ان کے لئے سوائے اس کے کوئی چارہ کار نہیں رہ جاتا ہے کہ وہ اس مسئلہ میں جو اس کی دسترس سے باہر تھا مجتہد کی تقلید کرے اور اس پر عمل کرے جب خود علم نہیں رکھتا تو علم والے کی اتباع کرے۔ خود ان کے مخفی دلائل وعلل تک نہیں پہنچ سکتا ہے تو دانیان اسرار و علل کے سامنے جھک جائے کیوں کہ علم کے دو ہی مرتبے ہیں یا تو خود سمجھنا یا سمجھے ہوئے لوگوں کی اطاعت کرنا، اس کے علاوہ کوئی تیسرا راستہ نہیں ہے **فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ** اس دعویٰ کی تائید کے لئے شاہد عادل ہے۔

اسلامی تاریخ سے واقف ہر شخص جانتا ہے کہ قرونِ اولیٰ میں بھی یہی صورت حال رہی ہے کہ اگر کوئی صحابی مجتہد ہے تو دوسرے صحابی کے قول وعمل پر عمل کرتے تھے، واقعات شاہد ہیں۔ عبداللہ بن عمر سے پوچھا گیا کہ قرض دینے والا قرض کی مدت سے پہلے قرض ادا کرنے پر قرض کا کچھ حصہ کم کرنے کے لئے تیار ہے تو کیا یہ درست ہے؟ آپ نے اس کو ناپسند فرمایا اور ایسا کرنے سے منع کیا جب کہ اس سلسلہ میں کوئی مرفوع حدیث موجود نہیں تھی، ظاہر ہے کہ یہ ان کا اجتہاد تھا، اسی طرح حضرت عمر فاروقؓ سے پوچھا گیا کہ ایک شخص نے دوسرے شخص کو اس شرط پر غلہ دیا کہ وہ دوسرے شہر میں اس کو ادا کرے گا حضرت عمرؓ نے منع فرمایا اور کہا کہ بار برداری کا کرایہ کہاں گیا؟ اس مسئلہ میں بھی کوئی حدیث مرفوع حضورؐ سے مروی نہیں، کھلی ہوئی بات ہے کہ یہ حضرت عمرؓ کا اجتہاد تھا، مذکورہ بالا دونوں مسئلوں پر عمل کیا گیا، سامعین نے حضرت عمرؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی باتیں مانیں اور انہیں پر عمل بھی کیا، سوال کرنے والوں نے ان حضرت سے دلیل کا مطالبہ نہیں کیا حالاں کہ سائل ومسئول دونوں صحابی ہیں لیکن ایک میں اجتہادی ملکہ تھا دوسرے میں نہیں، اس لئے جو اہل علم نہیں تھے انہوں نے اہل علم کی رائے پر عمل کیا اور ان کی اتباع کی۔

حضرت حکیم الاسلامؒ نے اس شبہ کا ازالہ بھی دلائل و براہین کی روشنی میں بہت واضح طور پر کر دیا کہ اجتہاد کا دروازہ ہر ایک کے لئے کھلا ہوا ہے اور ہر ابجد خواں مدعی اجتہاد بن جائے، شریعت اسلامیہ میں اس کی گنجائش نہیں، ہاں عام تحقیق وتلاش، کتاب وسنت میں تدبر، ان کے لطائف وحقائق کا استخراج، ہر زمانہ کے تکوینی حوادث سے تشریعی مسائل کو تطبیق دے کر مناسب فتاویٰ دینا، معاندین اسلام کے نئے نئے شکوک وشبہات اور اعتراضات کی تردید کے لئے نصوص شرعیہ سے استنباط کرنا، اصول اسلام کے اثبات اور تحقیق کے لئے کتاب وسنت سے تائید پیدا کرنے کا کام باقی ہے اور ہر دور میں اہل علم کے لئے میدان باقی ہے۔ اجتہاد کی یہی نوع کل بھی تھی اور آج بھی ہے اور ہمیشہ رہے گی، اجتہاد کی بحث سے لازمی طور پر ہر شخص کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ مجتہدین کی رایوں میں اختلاف کی صورت میں سوائے امت کی تفریق کے اور کیا حاصل ہوگا؟ امت میں اختلاف ہے کہ شریعت کے احکام کی کوئی معین صورت اور تحقیقی شکل باقی نہیں رہے گی، یہ اختلاف زحمت کے بجائے رحمت بن جائے گا اس خلجان کو دور کرنے کے لئے حکیم الاسلامؒ نے ایک لطیف اور دقیق بحث چھیڑی ہے اور انہوں نے عقل وروایات کی روشنی میں اسے امت کے لئے رحمت ہی ثابت کیا ہے، اس مسئلہ کو واضح کرنے کے لئے آپ نے جو مقدمات ترتیب دیئے ہیں عقل کو اپیل کرنے والے ہیں اس لئے آپ نے ان مقدمات سے جو نتیجہ نکالا ہے عقل اسے خود قبول کر لیتی ہے۔

حضرت حکیم الاسلامؒ نے اس دکھتی ہوئی رگ پر بڑے ماہرانداز میں نشتر لگائے ہیں جس کو تقلید شخصی کہہ کر بدنام کیا جاتا ہے۔ آپ نے محکم دلائل سے ثابت کر دیا کہ اجتہاد مشروع ہے۔ اجتہادیات پر عمل بھی مشروع ہے، ان کا مجموعی ذخیرہ فراہم کرانا بھی شرعی چیز، اس مجموعہ کا نام رکھنا بھی شرعی بات ہے تو اس کے بعد آپ نے بتایا کہ اجتہادیات میں غیر مجتہد کے لئے تقلید کرنا بھی ناگزیر اور ضروری ہو جاتا ہے، یہ صحیح ہے کہ اجتہادی مسئلوں میں دو رائیوں یا اس سے زیادہ کا ہونا فطری اور قدرتی بات ہے اور وہ دائرہ شرع میں داخل ہے تو ایسے اختلافی مسائل میں تقلید شخصی بھی ضروری ہو جاتی ہے۔ آپ نے عقلی مقدمات ترتیب دے کر بطور نتیجہ ثابت کیا ہے کہ ایک مسلمان کے لئے تقلید شخصی کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے، اگر ایک شخص اپنی صواب دید کے مطابق کسی مسئلہ میں کسی امام کی رائے پر عمل کرتا ہے تو وہ تقلید شخصی ہی تو ہوتی ہے کیوں کہ دو مخالف رایوں پر بیک وقت عمل ممکن نہیں ہے اس لئے جب کسی مسئلہ خاص میں کسی امام کی رائے ترک کر کے دوسرے امام کی رائے پر عمل کرتا ہے تو وہ بھی تقلید شخصی ہوئی۔ فرق یہ ہے کہ پہلے امام کے بجائے اب اس نے دوسرے امام کی رائے قبول کر لی ہے پہلے امام کی رائے کو ترک کر دیا ہے۔

سب سے اخیر میں آپ نے اس بحث کو چھیڑا ہے جو حاصلِ کلام ہے اور جس کے لئے یہ کتاب معرض وجود میں آئی ہے اور وہ مسئلہ ہے امام واحد کی تقلید کا۔ اگر تقلید ضروری ہے تو پھر ایک ہی امام کی تقلید کیوں ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر امام اور مجتہد کا اہلِ علم میں شمار ہے اور جن میں اجتہاد کی صلاحیت نہیں وہ اہل علم نہیں ٹھہرے اب وہ کسی بھی اہلِ علم یا مجتہد کی رائے پر عمل کرتا ہے تو اس کا یہ فعل عین شریعت ومنشاء ہونا چاہئے۔ ایک شخص بعض مسائل میں امام ابوحنیفہ کی تقلید کرتا ہے اور بعض مسائل میں امام مالک کی رائے پر عمل کرتا ہے۔ کچھ ایسے مسئلے ہیں جن میں وہ امام شافعیؒ کی رائے قبول کر لیتا ہے اور اس پر عمل کرتا ہے، ہر حال میں وہ اہل علم اور مجتہد ہی کی رائے پر عامل ہوتا ہے پھر یہ بات اس کے لئے ممنوع کیوں ہوگئی جب کہ وہ **فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ** پر عمل کرتا ہے۔

حضرت حکیم الاسلامؒ نے اس بحث کو بڑی تفصیل سے تحریر فرمایا ہے اور نتیجہ یہ نکالا ہے کہ بیک وقت ایک سے زیادہ ائمہ کی تقلید کی صورت میں بعض مسائل میں جزئیاتی تناقض ہوگا بعض میں ان جزئیات کے کلیوں اور اصولوں میں تناقض نمایاں ہوگا اور پھر اس دعویٰ کو درجنوں مثالوں سے واضح کیا ہے اور تناقض کی مختلف صورتوں کو تحریر کیا ہے، پھر بتایا ہے کہ کسی مجتہد کے مزاج میں توسیع کا غلبہ ہے اور کسی کے مزاج میں احتیاط کا، کسی میں شدت ہے کسی میں طینت، کسی میں جمعیت کا غلبہ ہے اور کسی میں جامعیت کا، کسی میں

دیانت کا وفور ہے اور کسی میں اس کے ساتھ سیاست ونظم اور اجتماعیات کا بھی اعلیٰ شعور ہے، کسی میں ظاہریت کا غلبہ ہے اور کسی میں باطنیت کا، کسی میں تأسی باسوۃ السلف کا غلبہ ہے اور کسی میں رجحانات سلف کے تتبع واستقراء کا، ظاہر ہے کہ جہاں ظاہریت غالب ہوگی وہاں سب سے بڑا مرجح ظواہر روایت ہوں گی اور جہاں باطنیت کا غلبہ ہوگا وہاں سب سے بڑا مرجح بواطن روایت یعنی درایت ہوگی، جس امام کی جو ذہنی خصوصیت ہوگی وہی اس کے اصول استنباط سے چھنے گی اور پھر وہی خصوصیات ان اصولوں کے تحت مستنبط شدہ جزئیات سے مترشح ہوگی اور انہیں خصوصیات کا خاص رنگ بالآخران افراد کی تربیت کرے گا جو اس فقہ پر عامل ہوں گے۔ ایک سے زائد امام کی تقلید کرنے والا ہر جگہ متضاد خصوصیات کے مابین متعارض جزئیات کا شکار ہوکر پھر کلیاتی تناقض کا شکار ہوگا، اس تقلید میں دو ذوقی رنگ اپنے تناقض کے ساتھ جمع ہونے کی کوشش کریں گے جس کا لازمی نتیجہ مزاج میں فساد ہوگا اور دو متضاد اثرات کی کشاکش میں گرفتار ہوکر پراگندہ حال بن جائے گا اور اس میں عملی فساد پیدا ہوجائے گا، اس طرح شریعتِ اسلامیہ کی طرف سے عائدکردہ فرائض کی اصل روح اس کے عمل سے ختم ہوجائے گی اور شریعت بازیچۂ اطفال بن کر رہ جائے گی۔

حضرت حکیم الاسلامؒ نے اس پامال موضوع پر اپنے نکتہ آفریں دماغ اور دقیقہ رس نگاہ سے کام لے کر روایت ودرایت کی روشنی میں اتنی لطیف بحث کی ہے کہ عقل اس سے حاصل شدہ نتائج کو قبول کرنے کے لئے مجبور ہوجاتی ہے۔ اب تک اس مسئلہ پر اردو میں بہت کم ایسی کتابیں وجود میں آئیں جو اپنی متکلمانہ اندازِ بیان میں روایات وآیاتِ قرآنی سے ایسے لطیف نکتے پیدا کرتی ہیں جہاں تک عام اہل علم کے ذہنوں کی رسائی مشکل سے ہوتی ہے۔ پوری کتاب استخراج نتائج کے اس خصوصی پہلو کے لحاظ سے شاہکار ہے۔

علم غیب

ہندوستانی مسلمانوں میں ایک گروہ ایسا ہے جو اسلامی تعلیمات وروایات میں عیسائیوں اور یہودیوں کی طرح افراط وتفریط کا شکار ہے، عقائد ومسائل میں یہ افراط وتفریط اس کے ذہن کی پیداوار اور اس کی کم فہمی وکوتاہ علمی کا نتیجہ ہے جس طرح حضرت عیسیٰؑ کے زمانے میں ان پر ایمان لانے والے تو کم ہی رہے اور اتنی تعداد بھی نہ ہوسکی کہ وہ اپنے پیغمبر کو دشمنوں سے بچاسکیں، جب وہ پھانسی پر چڑھانے کے لئے لے جائے جارہے تھے اور جب یہودیوں نے اپنے خیال کے مطابق پھانسی دیدی تو پھانسی کی لکڑی ساری دنیا کے عیسائیوں کے گلے کا ہار بن گئی۔ صلیب یا کراس جو کہتے ہیں ان کے مذہبی شعار میں داخل ہوگئی، ایک

طرف تو ان کو پیغمبر تک ماننے میں غافل رہے اور جب پیغمبر ماننے پر آمادہ ہوئے تو ان کو اتنا بڑھایا کہ خدا بنا دیا، آج پوری عیسائی دنیا اسی وجہ سے تثلیث کے شرک میں گرفتار ہے۔ یہ افراط اور غلو محبت کے اظہار کی حد ہے، جب تک پیغمبر نہیں مانا تو کافر مطلق رہے اور جب ان کی عظمت کو پہچاننے کی گھڑی آئی تو مشرک مطلق ہو گئے، کچھ یہی حال ہندوستان میں اس گروہ کا ہے۔ اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت، علومِ اسلامی کی تعبیر وتشریح، احادیث وقرآن کی تفسیر وتوضیح، اسلام دشمن فرقوں، اسلام کی حقانیت کو ثابت کرنے، دوسرے مذاہب کے اہل علم کے اسلام اور بانیٔ اسلام حضور اکرم ﷺ پر اعتراضات کے جواب دینے، ملک میں اسلام اور مسلمانوں اور ان کے شعائر کو محفوظ کرنے کا کوئی کام بحیثیت مسلمان ہونے کے اپنے ذمہ نہیں سمجھتے، مسلمان تباہ ہوتا ہے ہونے دو، جبر کے ہاتھوں مجبور ہو کر مرتد ہوتا ہے ہو جائے، مسجدیں اصطبل بنا دی جائیں بن جانے دو، اسلام کا نام لینے والوں پر عرصۂ حیات تنگ کیا جائے ان کی بلا سے، ان کو نہ ان باتوں کا غم ہے اور نہ پرواہ، نہ اس کی صلاحیت نہ جذبہ، لیکن جب رسول اکرم ﷺ کی ذات سے زبانی دعوائے محبت پر آمادہ ہوئے تو ان کو رسول اور پیغمبر کے بجائے خدا اور خدائی طاقت وقوت کا مالک بنا دیا اور صفاتِ خداوندی کو حضورؐ کی ذات سے وابستہ کر دیا۔

وہی جو مستوی عرش تھا خدا ہو کر اتر پڑا ہے مدینہ میں مصطفیٰ ہو کر

وہ مالک کائنات بھی ہیں اور مختار کل بھی اور جنت ودوزخ کی کنجی بھی آپ کے دست مبارک میں ہے اور ہر جگہ حاضر وناظر بھی، ازل سے ابد تک کا پورا علم بھی ہے اور سارے مغیبات کا اسی طرح علم رکھتے ہیں جیسے خداوندِ قدوس کا علم محیط ہے جس کو چاہیں جنت دے دیں جسے چاہیں جہنم میں بھیج دیں، وغیر ذالک۔

اسی گروہ نے علم غیب کے مسئلہ کو پیدا کیا ہے اس مسئلہ پر چھوٹی بڑی اتنی کتابیں، رسالے اور مضامین اردو میں لکھے جا چکے ہیں کہ مزید اس پر اضافہ کی گنجائش نظر نہیں آتی اور یہی وجہ ہے کہ اب اس مسئلہ پر کوئی نئی کتاب سامنے نہیں آتی اور فضا میں ایک طرح کی خاموشی ہے۔ حضرت حکیم الاسلامؒ نے آج سے پہلے جب ملک میں اسلامی ذہن رکھنے والوں اور دل ودماغ سے سوچنے والوں اور پیٹ سے سوچنے والوں کے درمیان معرکہ کارزار گرم تھا تو آپ نے علم غیب کے نام سے یہ کتاب لکھی تھی اور شائع تو بعد میں ہوئی جب شور وغوغہ ایک حد تک خاموش ہو چکا تھا۔

''علم غیب کسے کہتے ہیں؟'' حضرت حکیم الاسلامؒ نے بات یہیں سے شروع کی ہے، قدیم علماء کی کتابوں سے علمِ غیب کے مفہوم کو واضح طور پر پیش کرتے ہوئے حاصل کلام یہ بتایا ہے کہ غیب وہ ہے جو

انسان کی اپنی کسی بھی ارادہ کی قوت سے خواہ ظاہری ہو یا باطنی حاصل نہ ہو سکے اور حواس وعقل اور کشف و اکتشاف سے بالاتر ہو اور جب علم غیب کا یہ معنی متعین ہو گیا تو علم غیب کے لئے جو وسائل امت کے حق میں منفی ہیں یعنی عقل ونظر وفکر وبصیرت وغیرہ وہ نبی کے حق میں بھی بدستور منفی رہیں گے کہ انبیاءؑ کو بھی ان وسائل سے علم غیب حاصل نہیں ہوگا، البتہ غیب کی خبر پیغمبر کے بجائے پیغمبری ورسالت ونبوت خدا کی خبر اور علم غیب کا ذریعہ بنیں گی جس کو وحی کہتے ہیں۔ معلوم ہوا مخلوق کے لئے علم غیب کا ذریعہ صرف وحی ہے جو پیغمبر پر براہِ راست آتی ہے اور امتی کو پیغمبر کے ذریعہ، اس طرح نبی اور امتی صرف خدا کی اطلاع ہی سے غیب پر مطلع ہو سکتے ہیں، خود اپنے کسی ارادہ کی قوت، عقل ونظر یا حس و وجدان سے مطلع نہیں ہو سکتے اور ظاہر ہے کہ علم غیب وہی کہا جائے گا جو بلا واسطہ اسباب ہو اور جب وہ بالواسطہ آئے گا تو وہ حقیقی معنی میں علم غیب نہیں ہوگا، اہل اللہ کو کشف والہام کے ذریعے کسی بات کا علم ہو جائے تو لغۃً اسے علم غیب کہیں گے کہ غیبی امور کا انکشاف ہوا لیکن شرعاً علم غیب نہیں کہیں گے، علم کے جملہ حسی وسائل ہوں یا معنوی، کھلے ہوئے ذرائع ہوں یا چھپے ہوئے ان سے حاصل شدہ علم کو شرعاً علم غیب نہیں کہا جائے گا اور ظاہر ہے کہ جب اصطلاحاً علم غیب وہی ہوگا جو عادی وسائل سے بالاتر ہو کر بلا توسط اسباب از خود ہو تو اس معنی میں علم غیب بجز ذات بابرکات خداوندی اور کسی کے لئے نہیں ہو سکتا کیوں کہ غیرِ خدا کو جب بھی علم ہوگا اور جیسا بھی ہوگا وہ عطاءِ الٰہی ہوگا خواہ وحی سے ہو یا کشف والہام سے، تجربے سے ہو یا حواس سے، عقل وخرد سے ہو ظاہری اسباب کے راستے سے ہو یا باطنی اور معنوی اسباب کے طریق سے، ظاہر ہے کہ ان معنوں میں علم غیب خاصۂ خداوندی نکل آتا ہے۔

حضرت حکیم الاسلامؒ نے اپنے دعویٰ کو متعدد آیتوں سے مدلل ومبرہن کیا ہے، الفاظ قرآنی سے ایسے حکیمانہ نکتے اور الفاظ کی معنوی وسعت کو ظاہر کرتے ہوئے اس کے حقیقی مقصود کو اس طرح واضح کیا ہے کہ دل استدلال واستنباط نتائج سے قطعی طور پر مطمئن ہو جاتا ہے، آیتوں کی تفسیر وتشریح کرتے ہوئے آیت کے ایک ایک لفظ اور آیتوں کے انداز بیان سے غیر اللہ سے علم غیب کی کلی نفی اور اس کے متعلق ہر ہر شبہ کا حل اور ذہنی خلجان کو دور کر دیا ہے اور تمام شرک آمیز تصورات کا قلع قمع کر دیا ہے۔

قرآن کی آیتوں میں کئی مقامات پر علم غیب پر رسولوں کو مطلع کرنے کا ذکر آیا ہے اس سے عام ذہن میں یہ خیال آ سکتا ہے کہ جب ذاتِ خداوندی عالم الغیب ہے اور اس نے اپنے علم غیب پر رسولوں کو مطلع کر دیا ہے تو خدا اور رسول دونوں علم غیب میں برابر ہو گئے، زیادہ سے زیادہ ایک کا علم ذاتی ہوگا اور دوسرے کا عطائی

لیکن علم میں مساوات تو پیدا ہوگئی ہے اور یہ سراسر مشرکانہ عقیدہ ہے کہ عبد و معبود دونوں میں کسی طرح کی مساوات پیدا کی جائے۔

حضرت حکیم الاسلامؒ نے اس بحث کو بڑی تفصیل سے لکھا ہے اور خود آیت ہی کے لفظوں سے اس ذہنی خلجان کو واضح طور پر دور کر دیا ہے، اس سلسلہ میں آپ نے تحریر کیا ہے کہ اظہار غیب کے موقع پر رسول کا لفظ قرآن میں ذکر کیا گیا ہے یعنی جس ذات پر غیب کو ظاہر کیا گیا ہے وہ وصف رسالت سے متصف ہے یعنی اطلاع غیب کی مستحق اور متقاضی کسی رسول کی ذات نہیں بلکہ وصف رسالت اور عہدہ و منصب نبوت ہے، اسی وجہ سے خصوصیت کے ساتھ اس موقع پر لفظ رسول لا گیا ہے اور یہ بالکل واضح اور ہر شخص جانتا ہے کہ رسول کی رسالت کا موضوع اور مقصد توحید اور اصلاح خلق اللہ ہے، نیز بندگانِ خدا کی راہِ حق کی طرف رہنمائی اور ان کی تربیت و تکمیل ہے اس لئے وصفِ رسالت کا قدرتی تقاضا وہی علوم غیب ہو سکتے ہیں جو کہ ہدایت و اصلاح میں کارآمد ہوں اور جن علوم غیبیہ کا اصلاح و تربیت میں دخل نہ ہو اس سے وصفِ رسالت کو خود ہی سروکار نہ ہوگا، مغیبات میں قیامت کے وقت، اس کی تاریخ وسن یا اس کی مدت کے قرب و بعد کی اگر رسولوں کو اطلاع نہ ہو جیسا کہ قرآن کی متعدد آیتوں سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کا علم کسی کو نہیں دیا گیا ہے اسی طرح ان بے شمار کائناتی حوادث اور جزئیات کا انہیں علم نہ ہو جو روزمرہ دنیا میں رونما ہوتی رہتی ہیں تو یہ ان کے حق میں نہ صرف یہ کہ کسی طرح کا نقص نہیں بلکہ ان امور کا علم نہ ہونا ہی ان کے وصفِ رسالت کا ایک طبعی و فطری تقاضا ہے۔

جب رسولوں کو علم غیب کی صرف وہی قسم دی گئی ہے جن کا ان کے منصب رسالت سے تعلق ہے اور بقیہ مغیبات کا علم نہیں دیا گیا کیوں کہ ان کے منصب نبوت کو ان کی ضرورت ہی نہیں تھی تو پھر اس سے نبیؑ کی شان میں نقص کہاں لازم آتا ہے؟ ان حقائق کے ہوتے ہوئے رسول کے لئے جمیع ما کان و ما یکون کے علم کا دعویٰ وہی شخص کر سکتا ہے جو قرآن کے اُسلوب بیان اور شریعت خداوندی کے مزاج سے ناآشنا اور وصف رسالت کے فطری تقاضوں سے بے خبر ہو۔

قرآن و حدیث اور عقل و نقل سے علم غیب کے مسئلہ کی صحیح صورت پیش کر کے آخر میں تحریر کیا کہ قرآنی تصریحات و تلمیحات کے ہوتے ہوئے حضرت سید الاولین والآخرین حضور اکرم ﷺ کے لئے علم غیب کا دعویٰ اور وہ بھی علم کلی اور علم ما کان و ما یکون کی قید کے ساتھ نہ صرف بے دلیل و بے سند بلکہ مخالف دلیل معارض قرآن اور اس توحیدی شریعت کے مزاج کے خلاف ہونے میں اب کوئی شبہ باقی نہیں رہا، علم ما کان

و ما یکون حضور ﷺ کے لئے ثابت کرنے کی غرض سے بعض احادیث سے بھی استدلال کیا جاتا ہے، حضرت حکیم الاسلامؒ نے بالاستیعاب ان دلائل کا علمی جائزہ لیا ہے اور ہر ایک کا شافی اور مدلل ومبرہن وغیر مبہم الفاظ میں رد کیا ہے۔

بحث کے آخر میں آپ نے حکیمانہ انداز میں مسئلہ کو پرکھ کر کھوٹے اور کھرے کو علیحدہ علیحدہ کر دیا ہے، اس سلسلۂ بحث میں علم غیب کی حقیقت و ماہیت کو پیش کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ عقلی طور پر بھی علم کلی مخلوق کے لئے ممکن نہیں، آپ نے نظامِ کائنات کی قدرتی ترتیب کو پیش کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ ایک حقیر سے حقیر جز کا بھی علم وادراک اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک کہ موجودہ اور ممکنہ کائنات کا یہ سارا کلیاتی نظام اپنی حقیقت سمیت علم میں نہ آجائے اور ذہن ان سارے حقائق وکلیات کا احاطہ نہ کرلے اور یہ انسانی بساط سے باہر ہے، یہ کلامی اور فلسفیانہ بحث پچاسوں صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ یہ کتاب کا آخری حصہ اتنا بلند اور دقیق ہے کہ جن لوگوں کے دل ودماغ کی تطہیر کے لئے یہ کتاب لکھی گئی ہے ان کے مبلغ علم سے کہیں بلند اور دقیق ہے، لیکن جو لوگ معقول اور معقول دلائل کے متلاشی ہیں ان کے لئے یہ کتاب تسلی بخش دلائل فراہم کرتی ہے اور ذہن کے سارے خلجان کو دلیل وبرہان کی روشنی میں دور کرتی ہے اور مسئلہ کے صحیح پہلو کو متعین کرتی ہے، یہ متکلمانہ بحث دیکھ کر مفکر اسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی کی یاد آجاتی ہے جنہوں نے ایک نئے علم کلام کی بنیاد ڈالی اور دشمنانِ اسلام کے منہ بند کر دیئے۔ حضرت حکیم الاسلامؒ نے بھی اس سے حظ وافر پایا ہے یہ دیکھ کر یہ یقین کرنے پر دل مجبور ہے۔

اسلام کا اخلاقی نظام

ہندوستان میں انگریز آئے تو ان کے ساتھ ہی عیسائیت بھی آئی دونوں کو ایک دوسرے کے سہارے کی ضرورت تھی، عیسائی مذہب کی سرگرمیوں اور ہنگامہ آرائیوں کا مقصد سیاسی استحکام کے سوا اور کچھ نہیں تھا، مگر بڑے پیمانے پر عیسائی پادریوں کی فوج تیار کی گئی اور اس نے ہندوستان میں مسلمانوں سے پنجہ آزمائی شروع کردی۔ بڑے بڑے مناظر ہوئے، قدرت بھی وقت کے لحاظ سے افراد پیدا کرتی ہے۔ علماء اسلام میں بھی ایسے افراد پیدا ہوئے جنہوں نے عیسائیوں کے تار پور بکھیر کر رکھ دیئے مگر پھر عیسائیت نے ہندوستان میں اپنے قدم جمالئے اور لاکھوں ہندوستانی عیسائی ہوگئے۔ ہندوستانی عیسائیوں میں بھی کچھ پڑھے لکھے تھے۔ انہوں نے بھی مسلمانوں سے چھیڑ چھاڑ جاری رکھی۔ اسی طرح ایک پادری نے روڑکی

سے حضرت حکیم الاسلامؒ کو ایک خط لکھا جس میں اس نے اسلام پر کچھ اعتراضات کئے اور اسلام کے اخلاقی نظام کو اپنا نشانہ بنایا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اسلام سے عیسائیت کا نظامِ اخلاق کہیں بہتر اور برتر ہے، اس خط میں سب سے اہم اور بڑا اعتراض حضرت زینبؓ سے حضور اکرم ﷺ کے نکاح پر تھا کہ آپ نے زینب کے حسن سے متاثر ہو کر ایک مسلمہ اصول کو نظر انداز کر دیا اور اپنے منہ بولے بیٹے کی بیوی سے نکاح کر لیا جب کہ خود عرب میں بھی یہ معیوب تھا لیکن زینبؓ کے حسن نے آپ کے دل میں اپنی جگہ بنالی تھی اور چاہتے تھے کہ کسی طرح سے زینبؓ سے نکاح کر لیں۔ قرآن نے خود کہا کہ آپ دل میں جو کچھ چھپا کر رکھتے ہیں اللہ ان کو ظاہر کر دینے والا ہے۔ **و تخفی فی نفسك مااللہ مبدیه** قرآن میں موجود ہے اس خط میں کہا کہ ''قرآنی اخلاقی معیار ایک عجیب چیز نظر آتی ہے جب بیٹے کی بہو پر طبیعت چلی گئی تو پھر آسمانی وحی نے ساری روحانیت، نیکی اور سچائی پر ایسا بھاری پردہ ڈال دیا کہ تمام دینداری چھپ گئی اور اپنے بیٹے کی بہو کو اپنی بیوی بنانے کا حق اللہ میاں سے حاصل ہو گیا۔ آپ کو ماننا پڑے گا کہ زید کی بیوی کو نبی کی جورو بنا دینے کا حکم غلط ہی نہیں بلکہ گناہ اور زنا کاری کو فروغ دینا ہے کیوں کہ خدا ایسی بات نہیں کر سکتا کہ ایک موزوں جوڑے کو توڑ کر ایک نہایت غیر موزوں جوڑا بنا دیا جائے۔''

اس کے بعد پادری نے قرآنی نظامِ اخلاق کے مقابلہ میں بائبل کے بیان کردہ نظام کے دس اصولوں کو ترجیح دی ہے، بائبل کے ان اصولوں میں سے چوری نہ کرنا، زنا نہ کرنا، خون مت کرنا کا خاص طور سے ذکر کیا ہے۔

حضرت حکیم الاسلامؒ نے اولاً بائبل کے حوالے سے پیش کردہ دس احکام کو معیارِ اخلاق دینے پر جو گفتگو کی ہے اس سے محسوس ہوتا ہے کہ حضرت حکیم الاسلامؒ انیسویں صدی میں ہونے والے عیسائیوں سے معرکۃ الآراء مناظروں کی بحثوں سے پوری طرح واقف ہیں جن اسلامی مناظروں کے مستحکم دلائل کی قوت، ان کی تاثیر، ان کی اثر اندازی نے عیسائی دنیا میں تہلکہ مچا دیا تھا اور جس کی وجہ سے ہندوستان سے یورپ تک کے عیسائیوں کے دل و دماغ کو لقوا مار گیا تھا اور میدانِ مناظرہ سے عیسائی مناظرین اس طرح سرپٹ بھاگے کہ قرآن نے باطل کے قرار کی جو محاکات کی ہے اس کا پورا نقشہ سامنے آ گیا۔ **جَاءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا.**

حضرت حکیم الاسلامؒ نے اصل مسئلہ پر گفتگو سے پہلے موجودہ بائبل کو ناقابلِ اعتبار قرار دیتے ہوئے انہیں ناقابلِ شکست دلائل سے اس کو محرف ثابت کیا جو ان کے اسلاف نے عیسائی دنیا کے سامنے پیش کئے تھے جس کے رعد و برق کی طرح کڑکنے اور گرجنے والے عیسائی مناظرین میں شہر خموشاں کا سکوت اور

قبرستان کا سناٹا چھا گیا، بائبل کی تحریف کے ثابت کرنے کے باوجود بائبل کے حوالے سے پیش کردہ ان دسوں احکام کے بارے میں تحریر کیا کہ یہ امور نہ خود معیار اخلاق ہے اور نہ معیار اخلاق بن سکتے ہیں کیوں کہ یہ دس باتیں مثلاً چوری مت کر، زنا مت کر، تو خون مت کر از قسم افعال ہیں جن کا تعلق کرنے نہ کرنے سے ہے، از قسم اخلاق نہیں ہیں جو قلب کے خلقی مادے ہیں۔ اخلاق کی حیثیت بیج کی ہے اور قلب اس کے لئے زمین ہے۔ جب یہ بیج اس کی جڑ کو پکڑ لیتا ہے تو اس بیج سے شاخیں پھوٹتی ہیں، شاخوں سے تخم نہیں بنا کرتا اس لئے اخلاق سے افعال سرزد ہو سکتے ہیں لیکن افعال سے اخلاق پیدا نہیں ہوتا، آدمی میں خلق وشجاعت ہے تو اس سے حملہ کرنے کا فعل ظاہر ہوگا، آدمی میں جو خلق دوستی ہے اس سے داد و دہش کا فعل وجود میں آئے گا۔ اس طرح تمام افعال اخلاق کی بیج سے پیدا ہوتے ہیں قلب میں صبر، شکر، سخاوت، شجاعت، مروت، غیرت، حیاوغنا جن کو اخلاق کہا جاتا ہے اگر انسان میں یہ اخلاق پیدا ہو جائیں تو اس شخص سے انہیں اخلاق کے مطابق افعال سرزد ہوں گے اس لئے آپ کا بیان کردہ چوری نہ کر، زنا نہ کر، خون مت کر معیارِ اخلاق کہنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص شاخوں کو بیج کے اچھے ہونے کا معیار بتانے لگے، پھر ان جملوں سے ان جڑوں کے حرام ہونے کا تو علم ہو سکتا ہے لیکن ان سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ان فعلوں کی ممانعت کی بنیاد کیا ہے اور ان افعال کی حرمت کی علت کیا ہے وہ علت ہی درحقیقت معیار حکم بن سکتی ہے پھر یہ علت جہاں جہاں پائی جائے گی وہ چیز حرام ہوتی چلی جائے گی، ان جملوں سے ان کی علتوں کا کوئی پتہ نہیں چلتا، اس لئے وہ ایک جزئی حکم بن کر رہ جاتا ہے اور بطور حکم کلی اس کا اپنا کوئی وجود نہیں ہوتا اور جزئیات منفردہ کا نام قانون اور ضابطہ نہیں ہوتا، معیار قانون اگر دیکھنا ہے تو یہ ہے جو انہیں احکام کے بارے میں قرآن عظیم نے بتایا ہے کہ ان میں سے ہر ایک جزئی حکم کے ساتھ اس کی جامع علت اور علت وحکم کا درمیانی رابطہ دکھلا کر اسے معیاری قانون بنا دیتا ہے۔

حضرت حکیم الاسلامؒ نے قرآن کی متعدد آیتوں سے اس کی مثالیں پیش کی ہیں ان سے ایسے حکیمانہ نکتے پیدا کئے ہیں، جہاں تک عام اہل علم کی نگاہیں عام طور پر نہیں جاتی ہیں اور ان کے ذہن ونقاد نے جو نتائج نکالے ہیں ان سے قرآن کی جامعیت اور قرآنی الفاظ کی معنوی وسعت، اسلامی قانون کی گیرائی و گہرائی کا یقین ہوتا چلا جاتا ہے اور دل حیرت واستعجاب میں ڈوب جاتا ہے۔ یہ آیتیں روز پڑھی جاتی ہیں لیکن ان لطیف نکتوں کی طرف ذہن نہیں جاتا ہے جو درحقیقت روحِ کلام اللہ کا درجہ رکھتے ہیں، حکیم الاسلامؒ کی نکتہ شناسی اور دقیقہ رسی کی اسی سلسلہ میں ایک مثال پیش ہے۔

آپ نے بائبل کے جزئی فعل کے مقابلہ میں قرآن کے کلی حکم اوراس کی قانونی وسعت کو سمجھانے کے لئے لَاتَقْرَبُو الزِّنَا اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّ سَاءَ سَبِيْلًا کو پیش کیا ہے۔آپ نے بتایا کہ آیت نے زنا سے روکتے ہوئے اس کی بنیادی علت بھی بتادی ہے،اس علت کو لفظ ''فحش'' اور ''سوء سبیل'' سے تعبیر کیا ہے، یہی اس کی ممانعت کا معیار ہے۔انہیں دو باتوں کی وجہ سے فعل زنا میں حرمت پیدا ہوتی ہے،اگر قلب میں فحش اور غلط روی کے بجائے عفت و پاکدامنی ہو اور نکاح اور ملک متعہ کی راہ اختیار کرے تو یہی فعل حرام ہونے کی بجائے حلال ہوجاتا ہے،اس سے ثابت ہوا کہ خود یہ فعل اپنی ذات سے برا ہے نہ ممنوع، 'فحش' سوء سبیل، نے اس میں ممانعت کا حکم پہنچایا ہے،اس لئے اس آیت میں حکم زنا کی ممانعت کے ساتھ اس کا معیار بھی ذکر کر دیا ہے کہ وہ فحش اور سوء سبیل ہے یعنی بے حیائی اور بے راہی، اس لئے اس قرآنی حکم کو معیاری حکم کہیں گے نہ کہ انجیل کے حکم کو کہ جس میں صرف ممانعت زنا تو ہے معیار کا کوئی ذکر نہیں اور جب کہ یہ علت ہی معیارِ حکم ہے اور انجیل میں مذکور نہیں تو انجیل کا یہ حکم معیارِ اخلاق تو کیا ہوتا معیارِ حکم بھی نہیں، حکم اور علت دونوں کو ساتھ ساتھ ذکر کر دینے سے یہ معلوم ہو گیا کہ ممانعت میں فعل زنا اصل نہیں بلکہ فحش اور سوء سبیل اصل ہے تو ممانعت فحش اور سوء سبیل کی چوں کہ زنا میں بھی علت ہے اس لئے وہ بھی ممنوع ہوئی۔ اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہ فحش ممنوع جس فعل میں پایا جائے گا وہ فعل بھی بضمن فحش درجہ بدرجہ ممنوع ہوتا چلا جائے گا جیسے اجنبی عورت پر نگاہ ڈالنا،اس کی طرف بری نیت سے چل جانا،اسے ہاتھ لگانا،دل میں اس کے خیالات پکانا وغیرہ فحش کے افعال تھے اس لئے یہ سب ممنوع قرار دیئے گئے،اسی لئے حدیث میں نگاہ بازی کو آنکھ کا زنا کہا گیا ہے،اجنبی عورت کو چھونے کو ہاتھ کا زنا کہا گیا، بدکاری کی نیت سے چل کر جانے کو پاؤں کا زنا کہا گیا ہے اس لئے فحش کی علت کی بنا پر ایک زنا ہی حرام نہیں ہوا بلکہ وہ سارے افعال بھی ممنوع ہو گئے جس کو فحش اور بے حیائی نے ابھارا ہو جن کو ہماری شریعت میں دواعی زنا کہا گیا ہے بس اس ایک حکم زنا کی ممانعت سے ایک ہی آیت کی بدولت بے حیائی کے ہزاروں افعال حرام ہو گئے جو درحقیقت بیان معیار کا اثر ہے۔حضرت حکیم الاسلامؒ نے قرآن کے اس حکم اور بائبل کے حکم کا موازنہ کرتے ہوئے قرآنی حکم کی وسعت، پھیلاؤ، جامعیت اور اس کے دوررس اثرات کی حقیقت ومعنویت کو اتنا واضح کیا ہے کہ اس کے بعد کسی کلام کی گنجائش ہی نہیں رہ جاتی۔

حضرت حکیم الاسلامؒ نے اپنے دعوے میں کہا ہے کہ قرآن میں ننانوے اخلاقی معیار بتائے گئے ہیں اوران کو خداوندقدوس کے نناوے اسماءِ حسنیٰ سے ثابت کیا ہے،آپ نے سب سے پہلے حدیث سے ننانوے

اسماءِ حسنیٰ کو شمار کرا کے انہیں اسماء سے ننانوے اصول اخلاق ثابت کئے ہیں اور ننانوے اخلاقی قوانین مستنبط کر کے شمار کرائے ہیں، یہ بحث اپنی نوعیت کی منفرد بحث ہے اور حکیم الاسلامؒ کے ذہن کی دقیقہ رسی کا ثمرہ ہے، حیرت یہ ہے کہ جب پوری بحث پڑھیے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ وہ حقیقتیں ہیں جو ہماری زندگی میں جاری وساری ہیں لیکن آج تک ان الفاظ کی معنوی گہرائی تک ہماری رسائی نہیں ہوئی اور جب حکیم الاسلامؒ کے قلم نے ہماری لاعلمی کے پردے ہٹا دیے تو ہماری جانی پہچانی حقیقتیں ہمارے سامنے آگئیں اسی لئے بے ساختہ حضرت والاؒ کے لئے ''حکیم الاسلام'' کا خطاب ہماری زبانوں سے نکل جاتا ہے جس کے وہ صحیح طور پر مستحق تھے۔

آیاتِ قرآنی سے ننانوے اسماءِ حسنیٰ شمار کرانے کے بعد آپ نے بتایا کہ یہی حق تعالیٰ کے وہ اصول اخلاق، رحم وکرم، حلم وصبر، عفو ودرگذر، عظمت، قدرت، قوت، محبت، عدل وانصاف، علیمی وخبیری، وسعت و احاطہ، یکتائی، غنا، نورانیت، ہدایت، بزرگی، حفظ ونگہبانی، نفع وضرر، انعام، انتقام، سلبِ عطا، ثبات واستقلال، مصدریت، کمالات، تقدس، پاکی، حکومت وملوکیت، لطافت، ستھرائی، علوّ شان، اعزاز، تذلیل وغیرہ وغیرہ ہیں جن کی اصولی تعداد ننانوے تک پہنچتی ہے جنہیں حدیث میں اسماءِ الٰہیہ کے نام سے تعبیر کیا ہے اور قرآن نے اسماء حسنہ کے لقب سے یاد کیا ہے۔ یہی وہ پاکیزہ اخلاقِ خداوندی ہے جنہیں حاصل کرنے کے لئے نبی کریم ﷺ نے امت کو حکم **تخلقوا باخلاق اللّٰہ** سے دیا ہے۔ انہیں اخلاقِ الٰہیہ سے مخلوق کی اخلاقی تکمیل کے لئے نبی کریم ﷺ مبعوث ہوئے، آپ نے فرمایا **بعثت لاتمم مکارم الاخلاق**.

اسلام کے قوانین اخلاق کو پیش کر کے آپ نے انجیل کے مذکورہ دس احکام کو بچکانہ بات بتایا اور کہا کہ قرآن کے نظام اخلاق کی وسعت کے سامنے یہ چند سطحی باتیں پیش کر کے سورج کو چراغ دکھانا ہے، اس کے باوجود عیسائی کہتے ہیں کہ اسلام کا کوئی نظام اخلاق نہیں ہے اور اگر معیاری اخلاق ہے تو عیسائیوں کی تحریف شدہ انجیل کی تعلیمات میں ہے، جنوں کا نام خرد رکھ لیا خرد کا جنوں!

روڑکی کے پادری نے دوسرا اعتراض حضرت زینبؓ سے حضور ﷺ کے نکاح پر کیا ہے، یہ اعتراض روڑکی کے اس معمولی پادری کے دماغ کی اختراع نہیں ہے بلکہ مشہور مستشرقین کا چبایا ہوا لقمہ ہے، سوموبر، درمنجم، واشنٹن ارفنج اور کامنس نے اپنی اپنی کتابوں میں بڑے زور وشور سے لکھا ہے جن کا مدلل جواب علماء مصر نے عربی اور انگریزی میں اتنی تفصیل سے دیا ہے کہ اب مزید اس پر اضافہ کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ مستشرقین کی غلط فہمی نہیں اور نہ تاریخ اسلام سے ناواقفیت کی بنیاد پر یہ اعتراض کیا ہے بلکہ تنگ نظری، عصبیت، اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کرنے کی سازش کے طور پر کیا گیا ہے، ورنہ معترضین کو خوب معلوم ہے

کہ مشاہیر مبصرین نے ان آیات قرآنی کی جو تفسیریں کی ہیں اور اسلامی تاریخ میں جو تفصیلات مذکور ہیں ان کو پڑھنے کے بعد کسی انصاف پسند اور حقانیت دوست کے لئے اعتراض کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہ جاتی، یہ علماء اسلام اور مبصرین کرام آیاتِ قرآنی کے مفہوم ومقصد کو ان مستشرقین سے کہیں زیادہ اور بہتر طور پر سمجھتے ہیں اور مستند اسلامی تاریخوں میں واقعہ کی ساری تفصیل موجود ہے ان کی موجودگی میں اعتراض بے غیرتی اور بے حیائی کے سوا اور کچھ نہیں، اس پاکیزہ واقعہ کو بدمنظر بنانے میں مستشرقین کی بدنیتی کو دخل ہے، اس کے باوجود بھی دورِ جدید کے محقق علماء اسلام نے یورپ کو کافی وشافی جوابات دیئے ہیں جس کے بعد اس مسئلہ پر مزید گفتگو عیسائیوں کی بے غیرتی اور بے حیائی ہے اور کچھ نہیں۔

حضرت حکیم الاسلامؒ نے بھی روڑکی کے اس پادری کو تفاسیر اور تاریخِ اسلام کے مستند حوالوں سے جواب دیا ہے وہی اصل حقیقت ہے۔ تفسیر وتاریخ کی تفصیلات کو حضرت حکیم الاسلامؒ نے اپنے مخصوص انداز بیان اور حکیمانہ نکتہ رسی سے اور زیادہ واضح، موثر، باوزن اور باوقار بنادیا ہے۔

حدیث رسول کا قرآنی معیار

آزادی سے پہلے کے پنجاب سے انکارِ حدیث کا فتنہ اٹھا تھا، اس گروہ کا کہنا تھا کہ احادیث کا یہ انبار غیر یقینی رطب ویابس اور متضاد باتوں پر مشتمل ہے، ان احادیث کی روشنی میں اسلام کی جو تصویر بنتی ہے وہ اسلام سے قطعاً مختلف ہوتی ہے جو قرآنی آیات کے رنگ وروغن سے تیار ہوتی ہے اس لئے اگر اسلام کو اپنی اصل ہیئت پر باقی رکھنا ہے تو صرف قرآن کو معیارِ عمل بنانا ہوگا، احادیث کے اس سارے ذخیرے کو آگ لگانی پڑے گی۔ انہوں نے عوام کے ذہن کو خراب کرنے کے لئے احادیث سے تضادات کو جمع کر کے احادیث پر عمل کرنا ناممکن ثابت کرنے کے لئے کتابیں لکھی تھیں ''دو اسلام'' ان کی مشہور کتاب ہے۔

جب یہ فتنہ شباب پر تھا اور بازار میں ان کی کتابیں آئیں تو اسی دور میں ان کی رد میں بہت سی کتابیں اور مضامین لکھے گئے، تدوین احادیث کی تاریخ پر محققانہ کلام کیا گیا، احادیث کی صحت اور ان کے کلامِ رسول ہونے کو دلائل قطعیہ سے ثابت کیا گیا اور بتایا گیا کہ احادیث کے ذخیرے میں صحیح اور موضوع دونوں طرح کی روایتیں ضرور ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ غلط اور موضوع روایتوں کو روکنے کے ساتھ ساتھ صحیح حدیثوں کو بھی ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا جائے، احادیث رسولؐ کے کلام رسولؐ ہونے کی سند اور دلیل دنیا کے تمام مروجہ معیار تحقیق سے کہیں زیادہ مستند اور محقق ہے اور یہ معیار اتنا اونچا، بلند اور یقینی ہے کہ اس سے

زیادہ کھری کسوٹی پر کوئی واقعہ پرکھا نہیں گیا۔ اگر کوئی شخص احادیث کے معیار اور اس کی تسلیم کردہ کسوٹی کی صحت پر یقین نہیں کرتا تو آج دنیا کی پوری تاریخ جھوٹ کا پوٹ ہو کر رہ جائے گی کیوں کہ ان کا معیار تحقیق حدیث کے معیار تحقیق کے مقابل انتہائی گھٹیا اور غیر یقینی ہے حالاں کہ ہر شخص تاریخ کی صحت پر یقین کرتا ہے، پھر کیا وجہ ہے کہ تاریخ سے کہیں زیادہ سچی کسوٹی پر پرکھی ہوئی احادیث کو صحیح تسلیم کرنے سے انکار کیا جاتا ہے۔ احادیث کی حقیقت کو جانچنے کے لئے فن بیوگرافی کو ایجاد کیا جو اس سے پہلے وجود میں نہیں آیا، چار لاکھ اشخاص کے پوست کنندہ حالات مرتب کر کے لکھے گئے۔ ان کے صدق و کذب کی پوری پوری چھان بین کی گئی جب ان کی صداقت، راست بازی کی تحقیق کر لی گئی تو ان کی زبانی سنی ہوئی حدیث کو صحیح قرار دیا گیا، ورنہ اس کے منہ پر مار دیا گیا۔ موضوع روایتوں کے وجود سے انکار نہیں لیکن ایسا بھی نہیں کہ صحیح اور غلط احادیث میں تمیز نہ کی جا سکے اور قطعیت کے ساتھ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کیا جا سکتا ہے، تضادات، اسرائیلیات، بدمذہبوں اور زندیقوں کی الحاقی باتیں کم علم والوں کے ذہن میں تذبذب اور تشکیک کا باعث بن سکتی ہیں، اہل علم جن کی پورے ذخیرۂ حدیث پر مبصرانہ نگاہ ہے وہ کھرے اور کھوٹے کو اس کسوٹی پر پرکھتے تھے جس سے زیادہ قابلِ اعتبار یقینی سچی کسوٹی آج تک دنیا میں وجود میں نہیں آئی۔ فتنہ انکارِ حدیث نے زیادہ پر و بال نہیں نکالے اور جلد ہی اپنی موت آپ مر گیا، غالباً حکیم الاسلامؒ نے بھی اسی دور میں یہ کتاب تحریر فرمائی ہے اور اپنے بلند علمی معیار سے کلام کیا ہے اور قرآن ہی سے احادیث کے واجب العمل ہونے کو جن جن طریقوں سے ثابت کیا ہے اور احادیث کی ساری قسموں کو آیاتِ قرآنی کی روشنی میں مستنبط کیا ہے اور اس کے درجۂ اعتماد کو متعین کیا ہے حق یہ ہے کہ بڑی دیدہ ریزی سے کام لیا گیا ہے، احادیث کی حجت کو قرآن کی آیات سے جس باریک بینی اور الفاظِ قرآنی کی معنوی وسعت کو نمایاں کرتے ہوئے جس گہرائی سے ثابت کیا ہے حق یہ ہے کہ یہ کام حکیم الاسلامؒ کا ہی نکتہ آفریں دماغ کر سکتا تھا اور اسی نے کیا بھی۔

حضرت حکیم الاسلامؒ نے گفتگو کا آغاز اس دعویٰ سے کیا ہے کہ دین کی دو اصلیں ہیں۔ قرآن اور سنت، ان کے علاوہ اجماع اور قیاس بھی حجت اور واجب العمل ہیں مگر بذات خود اصل نہیں ہیں بلکہ بالواسطہ ہیں کیوں کہ اجماع اور قیاس وہی معتبر ہے جو قرآن و حدیث کی تصریحات کے مطابق ہوں۔ اس کے علاوہ کوئی اجماع اور قیاس قابلِ اعتبار اور واجب العمل نہیں، پھر اس دعویٰ کو متعدد آیاتِ قرآنی سے ثابت کیا ہے اور دلائل کا مفصل ذکر کیا ہے اور مثالوں سے واضح کیا ہے۔

آپ نے یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ حدیث کے بغیر قرآن کے صحیح اور حقیقی معنی و مفہوم کو سمجھنا ممکن ہی نہیں اور اس کی نا قابل تردید دلیلیں بھی دیں اور کہا کہ خدا کی ذات جس طرح لامحدود ہے اسی طرح اس کی صفاتِ کمال بھی لامحدود ہیں اور انسان اس کا ادراک بغیر تحدیدات، تعینات اور تشخیصات کے نہیں کرسکتا اور اس کے لئے کسی طرح بھی ممکن نہیں کہ وہ محدود رہتے ہوئے لامحدود ذات وصفات تک رسائی پائے یا اس کا ادراک و معرفت کرلے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے درمیان ایک برزخ اور درمیانی طبقہ پیدا کیا جو ذات حق سے قریب تر اور تعینات کے لحاظ سے بندوں میں شامل اور کمال بشریت کا نمونہ رہتا ہے، انہیں کو ہم انبیاء رسل کہتے ہیں، کمالاتِ ربانی کے نمونے نبی کی ذات قدسی صفات میں ظہور کرتے ہیں تو عام بندوں کے لئے سہل ہوجاتا ہے کہ اس نبی سے وابستہ ہوکر حسب استعداد خدا تک رسائی حاصل کرلیں۔

حق تعالیٰ کی صفاتِ کمالیہ میں ایک صفت صفتِ علم یا صفتِ کلام بھی ہے۔ یہ علوم خداوندی کی ترجمانی اور تعبیر کرنے والی ہے اور صفتِ علم کا مظہر اتم قرآن حکیم ہے جو اپنی اصولیت وکلیت، کمالِ جامعیت اور شئون الٰہیہ سے بھرپور ہونے کی وجہ سے جن سے یہ کلام وجود میں آیا ہے ذاتِ خداوندی کی طرح لامحدود الحقائق، لامحدود المعارف اور لامحدود المطالب ہے جو ایک نوع نہیں بلکہ ماضی و مستقبل اور حال کی ہزار ہا انواع علوم پر حاوی اور مشتمل ہے، اب ایسے کلام کا سمجھنا بنا خدا کی رہنمائی کے ممکن نہ تھا اور اس کے سوا کوئی صورت نہیں ہے۔ ایسا فردِ کلام اور اس کی تفہیم کا واسطہ بنے جس کا متکلم تو ہم جیسوں میں سے ہو لیکن اپنے قلبِ ثانی اور دماغِ عالی جہت سے عرشیوں میں سے ہو جس طرح ذاتِ خداوندی تک بلا رسول کے واسطے کے ہماری رسائی ناممکن تھی اسی طرح کلام خداوندی تک بلا کامِ رسول ہماری فہم کی رسائی ناممکن تھی، ہم اسی کلامِ رسول کو احادیث کہتے ہیں گویا حدیث پر عمل عین قرآن پر عمل اور منشاء خداوندی پر عمل ہے اور اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

آپ نے اپنے دعویٰ کو اور مدلل کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ قرآن کے الفاظ اور معانی دونوں منجانب اللہ ہیں، حضور ﷺ اس کے ناقل ہیں، نزول الفاظ، جمع الفاظ، اقرار الفاظ سب کچھ ذاتِ باری کی طرف سے ہوا اور بیانِ معانی، شرحِ مطالب اور تعیین مراد بھی خدا ہی کی جانب سے ہوئی، ظاہر ہے کہ جب پیغمبر کو بھی معانی و مرادات کے سمجھنے میں بیانِ حق کے تابع رکھا گیا جن پر خود قرآن اترا تو امت کی کیا مجال ہے کہ اس کے فہم کو مطالب قرآنی پر حکم بنا کر چھوڑ دیا جائے کہ وہ سلسلۂ معانی میں مدعی یا مجتہد بن جائے، قرآن کی آیتوں سے اپنے اسی دعویٰ کو ثابت کرتے ہوئے آپ نے یہ بات واضح کردی کہ احادیث رسول درحقیقت مراداتِ قرآن ہے، کلامِ رسول آیاتِ قرآنی ہی کی تشریح ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں، اب اگر کوئی احادیث کو

ترک کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ قرآن کو ترک کرتا ہے۔ اگر احادیث پر ایمان نہیں تو اس کا قرآن پر بھی ایمان باقی نہیں رہا۔

آپ نے بعض اذہان کے ان شکوک کو بھی تفصیل سے بیان کر کے ان کا ازالہ کیا ہے جو ایسی احادیث کے موقع پر پیدا ہوتے ہیں کہ ان میں کسی ایسی بات کا حکم ہے جو قرآن میں مذکور نہیں صرف کلامِ رسول ﷺ میں ان کا ذکر ہے مثلاً حمار اہلی کی حرمت، واشمہ پر لعنت وملامت وغیرہ، حکیم الاسلامؒ نے اس کا اصولی جواب دیا ہے کہ قرآن میں واضح طور پر بتا دیا گیا ہے کہ رسول جو لا کر دیں اسے لے لو اور جس سے روک دیں رک جاؤ۔ اب جو احکام آپ نے ایسے دیئے ہیں جو بظاہر قرآن میں مذکور نہیں ہیں وہ بھی اس آیت کی وجہ سے بالواسطہ قرآن ہی کے احکام متصور ہوں گے۔ صحابہ کرامؓ نے اس طرح کے استدلالات کو احادیث کی کتابوں میں پیش کر دیا ہے۔

اس کے بعد حضرت حکیم الاسلامؒ نے احادیث کی قسموں غریب، خبر، عزیز، خبر مشہور، خبر متواتر کو آیاتِ قرآنی سے ثابت کیا ہے اور اس کا صحیح مقام اور درجہ متعین کیا ہے، یہ بحث بڑی لطیف، دلچسپ اور حقیقت آفریں ہے اور بہت تفصیلی ہے، اس حقیقت کو دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آیاتِ قرآنی سے استخراج نتائج وشواہد اور استنباطِ مسائل پر حضرت حکیم الاسلامؒ کی نگاہ کتنی دقیقہ رس اور نکتہ آفریں تھی، یہ متکلمانہ بحث اور اس ناقابل شکست عقلی دلائل انکارِ حدیث کے فتنہ کے لئے آخری کیل سے کم نہیں۔

کلمہ طیبہ

حضرت حکیم الاسلامؒ کی ایک چھوٹی سی کتاب اسی نام سے ہے جو ایک ابھرتے ہوئے فتنہ کے سد باب کے لئے معرض تحریر میں آئی، آزادی سے کچھ دنوں بعد جب کہ مسلمانوں کا مستقبل غیر یقینی اور انتہائی خطروں میں گھرا ہوا تھا اور ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس سرزمین پر مسلمان نام کی کوئی چیز نہیں رہ جائے گی، پھر آہستہ آہستہ زندگی کے سورج کی ہلکی ہلکی کرنیں نظر آنے لگی تھیں اور یہ آس بن چلی تھی کہ شاید کچھ دن اور یہاں نغمۂ توحید گونجے گا۔ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا نغمہ لاہوتی فضاؤں میں اپنا نورانی ایمان افروز ترنم بکھیرے گا کہ جنوبی ہند سے کسی بد بخت نے ایک شوشہ چھوڑا کہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ جو حریم اسلام کے دروازے کی کنجی سمجھا جاتا ہے یہ صرف اہل عجم کی ذہنی اختراع ہے قرآن وحدیث میں کہیں اس شکل میں اس کلمہ کا وجود نہیں ہے اس پر مستزاد یہ چوں کہ کلمہ طیبہ کی موجودہ شکل عجم کے ذہن کی پیداوار ہے اس لئے

عربی اصول وقواعد کے لحاظ سے بھی اس میں خامی ہے یہی وجہ ہے کہ نہ قرآن میں یہ کلمہ اس شکل میں پایا جاتا ہے اور نہ پورے ذخیرۂ احادیث میں یہاں تک کہ کسی صحابی کے قول سے بھی یہ ثابت نہیں بلکہ اس کلمہ میں نہ عربیت ہے اور نہ شریعت بلکہ ایک ذہنی اختراع اور بدعت ہے جس سے اسلام نے روکا ہے۔

"البدعة ضلالة و کل ضلالةٍ فی النار"

کسی زمانہ میں آریوں نے مسلمانوں پر یہ اعتراض کیا تھا، یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان پر انگریزوں نے قبضہ کے بعد مسلمانوں پر دومحاذ سے آریہ سماجی مسلمانوں پر اعتراضات کے زہریلے تیر برسا رہے تھے، اسی زمانہ میں آریوں کے مسموم ذہن نے یہ اعتراض پیدا کیا تھا لیکن اب کی بار یہ کھلے دشمن کی طرف سے نہیں بلکہ عبداللہ بن ابی کے سلسلۂ نسب کے کسی فرد نے یہ سوال اٹھایا تھا اس لئے یہ اور بھی خطرناک تھا۔

یہ کتاب حضرت حضرت حکیم الاسلامؒ نے اسی اعتراض کے جواب میں لکھی ہے اور حق یہ ہے کہ حق ادا کر دیا۔ آپ نے گفتگو اس کلمہ کے مادہ سے شروع کی اور بتایا کہ اس کا اصل ماخذ کیا ہے، آپ نے اس کلمہ کے دونوں جزوں کو قرآن کی متعدد آیتوں سے نکال کر پیش کیا کچھ آیتوں میں جزءِ اول ہے اور کچھ آیتوں میں جزءِ ثانی موجود ہے، اس طرح دونوں اجزا قرآن میں موجود ہیں، اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ اس کلمہ کی موجودہ ہیئت ترکیبی اور جمع وترتیب اور دو آیتوں کو ملا کر پڑھنے اور انہیں ایک جگہ جمع کر کے ایک کلمہ کہنے کا مسئلہ ہے۔ اس کو قرآن کے اطلاق سے ثابت کیا ہے اور کہا ہے کہ آیاتِ قرآنی کے سلسلہ میں اتصال، انفراد، استقلال، عدمِ استقلال، اضافہ، عدمِ اضافہ، اجتماع، نوشت وخواند اسی طرح کے اور بہت سے احوال اور تقدیریں جو اس کلمہ کو ادا کرتے وقت اس کے ساتھ جمع ہو سکتی ہیں ان سب کے بارے میں قرآن مطلق ہے یعنی اس نے اس قسم کی صورتوں میں سے کسی نہ کسی صورت کو متعین کر کے دوسری صورتوں کی نفی کی ہے اور نہ ان صورتوں میں سے کسی خاص صورت پر زور دے کر اسے حصر کے ساتھ متعین کیا ہے جس سے دوسری صورتوں پر قید و بند اور پابندی عائد ہو جاتی ہو بلکہ یہ سب صورتیں مساوی طور پر اس کے اطلاق کے تحت آجاتی ہیں، اس لئے اصول تفسیر اور عام اصول شرعیہ کی رو سے یہ تمام تقدیریں اور صورتیں اس اطلاق کی وجہ سے نہ صرف جائز ہی رہیں گی بلکہ اس اطلاق قرآنی کا ایک حال اور ایک مصداق بن کر قرآن کی مراد ثابت ہوں گی، جن پر حسب تصریحات اصول قرآن کی دلالت مانی جائے گی اور یہ سب احوال مدلولات قرآن ثابت ہوں گے۔ انہیں احوال میں سے ایک حال ان دونوں آیتوں کو ملا کر پڑھنے کا بھی ہے تو یقیناً وہ بھی مدلول قرآن ہی مانا جائے گا، اسی طرح کلمہ طیبہ کی ہیئت ترکیبی قرآن کی دلالت سے جائز اور

شرعی ثابت ہو جائے گی اور لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ آیتوں کا ایک مجموعہ بن جائے گا جو کلمہ کے مادہ کے بارے میں قرآنی نص ثابت ہوا ہوا اور اس کی ہیئت ترکیبی کے بارے میں قطعی دلالت کے ساتھ دال ثابت ہو جس کو یا تو نص ہی کہا جائے گا یا ماخذ شمار کیا جائے گا جو ماخذ قریب ہونے کی وجہ سے نص ہی کے قریب قریب ہوگا۔

حضرت حکیم الاسلامؒ نے اصولی بحث کر کے کلمہ کی موجودہ ہیئت ترکیبی کی شریعت کو ثابت کر کے اس کے بہت سے شواہد بھی احادیث سے پیش کئے ہیں پھر آپ نے بدلائل قطعیہ یہ ثابت کیا ہے کہ کلمہ کے دونوں جزوں کو علیحدہ نہیں کیا جا سکتا، اس کے لئے بھی آپ نے قرآن ہی سے استدلال کیا ہے، ایک آیت سے اخلاص عبادت اور دوسری آیت سے اتباع سنت کے وجوب کو ثابت کرتے ہوئے آپ نے تحریر فرمایا کہ دونوں مطلوب قرآنی لازم وملزوم ہیں، اخلاصِ عبادت بغیر اتباع سنت کے اور اتباع سنت بغیر جذبہ اخلاص عبادت کے وجود میں نہیں آ سکتا ہے، اگر عبادت میں اخلاص نہ ہو تو وہیں سے شرک کی سرحد شروع ہو جائے گی اور اگر اتباع سنت کو ترک کر دے تو وہیں سے بدعت کا آغاز ہو جائے گا، شرک و بدعت ہی دو اصلیں ہیں جو دین کی عمارت کو منہدم کرتی ہیں اس لئے اخلاص عبادت اور اتباع سنت کا اقرار واعتراف لازم وملزوم ہو گئے اور جب دو حقیقتوں میں تلازم ہے تو ان کی تعبیروں میں تلازم ضروری ہو جاتا ہے، کیوں کہ معانی کا تلازم تعبیرات کے باہمی تلازم کے بغیر ممکن ہی نہیں، ظاہر ہے کہ اخلاص کی تعبیر جو شرک کی ہر قسم سے مانع ہے وہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے اور اتباع سنت کی وہ تعبیر جو ہر قسم کی بدعت سے مانع ہو محمد رسول اللہ ہے۔ اب خواہ ان تعبیرات کو شہادت کے الفاظ سے ادا کیا جائے یا قرار وقول وغیرہ سے یا بلا کسی خاص لفظ کے اضافہ کے صرف اصل الفاظ میں ادا کیا جائے۔ بہر حال لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ میں تلازم باہمی ثابت ہوا اور حاصل تلازم اور حاصل جامع وہی کلمہ طیبہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ نکلتا ہے۔

حضرت حکیم الاسلامؒ نے بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے کلمہ طیبہ کی وجہ تسمیہ کو آیت قرآن سے نکالا اور متعدد احادیث سے کلمہ کی موجودہ ہیئت ترکیبی کو ثابت کیا ہے جن میں اسی جمع وترتیب کے ساتھ یہ کلمہ مذکور ہے، کلمۂ طیبہ کے شرعی وجود کو ثابت کرنے کے بعد کلمہ طیبہ اور کلمہ شہادت کے عمل استعمال کا صحیح معیار اور فرق، مواقع استعمال کی تفصیل بھی پیش کر دی ہے اور بتایا ہے کہ جب اس کلمہ سے عہد و میثاق اور اعلان شہادت مقصود ہوتا ہے تو اس کے دونوں جملوں کو کلمات شہادت 'اُقر ، اشھد' وغیرہ سے مزین کر کے استعمال کیا جاتا ہے اور جب کلمہ کا قول محض یا تکلم محض، ذکر خالص منظور ہوتا ہے تو اسے بغیر ان حروف روابط کے خالص قرآنی الفاظ میں ادا کیا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ جب کسی کو دائرۂ اسلام میں داخل کرتے ہیں چوں کہ توحید ورسالت

کا اقرار وعہد و میثاق لینا مدنظر ہوتا ہے اس لئے کلمہ کے دونوں جملوں کو شہادت کے ساتھ ادا کر دیا جاتا ہے اور کلمہ شہادت کی تلقین کی جاتی ہے اور جب محض ذکر اللہ یا ذکر وحدانیت و رسالت کے رسوخ کے لئے کلمہ کا تکرار پیش نظر ہوتا ہے تو کلمہ طیبہ کی تلقین کی جاتی ہے جس میں ادوات شہادت کا اضافہ نہیں کیا جاتا۔

آخر کتاب میں حضرت حکیم الاسلامؒ نے ان اشکال کو دور کیا ہے جو معترضین نے اس کی عربیت کے خلاف ہونے کی صورت میں پیش کیا تھا اور کہا تھا کہ عربیت اور اصول نحو کے لحاظ سے غلط ہے۔ دونوں جملوں کا ایک ساتھ موجودہ شکل میں استعمال صحیح نہیں ہے، آپ نے اولاً تو اس اعتراض کی بنیاد ہی منہدم کردی کہ جن قواعد واصول کو پیش نظر رکھ کر یہ اعتراض اٹھایا گیا ہے وہ خود اسی قرآن کی طرزِ ادا اور طرزِ تعبیر سے ماخوذ ہیں، اس لئے ان اصولوں پر قواعد عربیت قرآن کی آیتوں کو جانچنا کسوٹی پر سونے کو جانچنا نہیں بلکہ سونے کو کسوٹی پر کھنے کی الٹی منطق اور کھلی ہوئی حماقت ہے، یہ کلمہ اپنے اجزا کے لحاظ سے قرآن میں موجود ہے اور قرآن کے اطلاق کی رو سے ان اجزاء کو انہیں کی ہیئت کے ساتھ ترکیب دے کر یا ملا کر پڑھنا جائز ہے اور اپنی ترکیب کے لحاظ سے بعینہٖ احادیث میں موجود ہے اس کے بعد عربیت کی سند کے لئے کسی رسمی حجت کی ضرورت ہی کہاں باقی رہ جاتی ہے۔

اس کے باوجود حضرت حکیم الاسلامؒ نے کلمہ کی ہیئت کذائی کو درست اور صحیح ثابت کرنے کے لئے فن بلاغت کے قواعد واصول پیش کر کے آپؒ نے ثابت کیا ہے کہ اصول نحو اور قواعد واصول و بلاغت کی رو سے بھی لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی ہیئت ترکیبی درست صحیح اور فصیح ہے اور اس پر کسی کلام کی گنجائش نہیں ہے، کتاب اپنے موضوع اور عالمانہ طرز استدلال کے لحاظ سے منفرد ہے۔

التشبہ فی الاسلام

حضرت حکیم الاسلامؒ کی یہ کتاب اسلامی تہذیب وتمدن اس کی خصوصیات اور اس کی اہمیت پر تفصیلی روشنی ڈالتی ہے، تہذیب کا ایک لفظ مختصر اپنی پنہائیوں اور معنوی وسعت کے لحاظ سے پوری انسانی زندگی کو گھیرے ہوئے ہے اور صرف مادی اور ظاہری زندگی اس کے دائرے میں نہیں آتی بلکہ اس کا اثر انسان کی داخلی زندگی، خیالات، جذبات اور رجحانات پر پڑتا ہے، تہذیب ایک قوم کو دوسری قوم سے ایک دور کو دوسرے دور سے ممتاز کرتی ہے۔ تہذیب کا درحقیقت قوموں کی حیات وموت سے گہرا ربط وتعلق ہے۔ اگر کوئی تہذیب فنا ہوگئی اور اس کا وجود مٹ گیا تو سمجھ لیجئے کہ ایک قوم مرگئی اس لئے اگر کوئی اپنی تہذیب کی

حفاظت کرتی ہے اور اس کو محفوظ رکھنے کے لئے ہر قربانی دینے کے لئے تیار رہتی ہے تو کوئی طاقت اس قوم کو نہیں مٹا سکتی، اگر کسی قوم کا حقیقی اور عملی وجود مٹانا ہے تو اس کی تہذیب کا گلا گھونٹ دو وہ قوم از خود مر جائے گی، اس کی تہذیب کو تہہ و بالا کر دو، اس قوم کو بغیر ایک قطرۂ خون بہائے قتل کر دو گے اور اس کے وجود کو فنا کے گھاٹ اتار دو گے اگر اس قوم کا مادی وجود باقی بھی رہ گیا تو بحیثیت ایک زندہ قوم کے اس کا کوئی وجود نہیں ہوگا، اس کی حیثیت سیلاب میں بہتے ہوئے تنکے کی طرح ہو کر رہ جائے گی، اس کی اپنی توانائیوں کا وجود ختم ہو جائے گا، اس کی زندگی ایک بے مقصد زندگی ہی ہوگی جس کی کوئی منزل نہ ہو، یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اسلامی تہذیب پر بہت زور دیا ہے۔ اسلامی تہذیب میں کسی دوسری تہذیب کی آمیزش کی سختی سے ممانعت کی ہے۔ تہدید آمیز لفظوں میں کہا گیا ہے کہ **من تشبه بقوم فهو منهم** بانی اسلام نے اس لئے اسلامی تہذیب کی بقا کے اصول و قواعد اور حدود مقرر کئے ہیں اور ان سے سرِ مو انحراف کو اسلام برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔

حضرت حکیم الاسلامؒ کی کتاب التشبہ فی الاسلام اسی اسلامی تہذیب کی خصوصیات اس کی اہمیت اس کے حدود کو روشنی میں لانے کی ایک کامیاب کوشش ہے، مصنف نے اپنی دقیقہ رسی و نکتہ شناسی کی صلاحیتوں کی وجہ سے مسئلہ کو پوری جامعیت کے ساتھ پیش کیا ہے، مانعیت کے پہلو سے اسلامی تہذیب کے گرد ایک آہنی حصار قائم کرنے کی قابل قدر کوشش کی ہے۔

ایک قوم کا دوسری قوم کی تہذیب کو قبول کر لینا اپنی زندگی میں جاری و ساری کر لینا اس قوم کی تباہی و بربادی کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ یہ کس طرح ہوتا ہے؟ حضرت حکیم الاسلامؒ نے اس کو احادیث و قرآن اور تاریخ کی روشنی میں بڑی تفصیل سے پیش کیا ہے، آپؒ نے ان حدود کا بھی ذکر کیا ہے جن کے اندر رہتے ہوئے کسی دوسری قوم سے ارتباط و تعلق رکھنا اسلام میں جائز ہے اور ان حدود سے تجاوز کرنا کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں۔

آپ نے متعدد آیاتِ قرآنی و احادیث سے مسلمان قوم کو کسی دوسری قوم کا اثر لینے اور اس کی مخصوص اشکال و افعال میں مشابہت اختیار کرنے کو اسلامی شریعت کے خلاف ثابت کیا ہے۔ آپؒ نے مشہور حدیث **من تشبه بقوم فهو منهم** کی معنوی وسعت کو بتاتے ہوئے ان حدود کی نشان دہی کی ہے جس سے آگے بڑھنا ایک مسلمان کے لئے ممنوع ہے۔ مشابہت سے کیا مراد ہے اور کن چیزوں میں مشابہت ممنوع ہے مفصل بیان کیا ہے، آپؒ نے حضور اکرم ﷺ کے دور سے لے کر صحابۂ کرام، تابعین و ائمہ عظام کے دور تک حوالوں کے ساتھ بتایا ہے کہ کس طرح ہمارے اسلاف دوسری قوموں کی وضع قطع اختیار کرنے

سے اور سختی سے روکتے تھے اور کتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر گرفت کرتے تھے تا کہ دوسری قوموں سے ادنیٰ تشبہ بھی پیدا نہ ہو۔

آپؒ نے بڑی وضاحت سے یہ بات بتائی ہے کہ غیر مسلموں سے مشابہت کا مطلب یہ نہیں کہ غیر اختیاری امور میں بھی مشابہت ممنوع ہے البتہ اختیاری امور میں تشبہ بھی پیدا نہ ہو۔

آپؒ نے بڑی وضاحت سے یہ بات بتائی ہے کہ غیر مسلموں سے مشابہت کا مطلب یہ نہیں کہ غیر اختیاری امور میں بھی مشابہت ممنوع ہے البتہ اختیاری امور میں تشبہ کی سخت ممانعت ہے مثلاً سر، داڑھی اور مونچھوں کے بالوں کے بارے میں خصوصی احکام ہیں کیوں کہ اس کی وضع قطع میں آدمی کے قصد و اختیار کو دخل ہے، اس لئے سر کے بال یورپین طرز کے رکھنا، جدید فیشنوں کے مطابق بنانا، سنوارنا، کٹوانا، یہودیوں کی طرح داڑھی کٹوانا، عام غیر مسلموں کی طرح منڈوانا، یعنی مونچھیں اظہار رعونت کے لئے رکھنا، ان کو بل دینا، داڑھی مونچھ دونوں صاف کرا دینا وغیرہ وغیرہ ان سب باتوں میں اسلامی شریعت کے مقرر کردہ حدود سے تجاوز کرنے کی اسلام اجازت نہیں دیتا، اسی طرح عورتوں کو مردوں کی اور مردوں کو عورتوں کی وضع قطع اختیار کرنا، دونوں ممنوع ہیں، ایک مسلمان کا لباس کیسا ہونا چاہئے، اس کی تراش خراش کیسی ہو، اسلام نے اس کے کچھ بنیادی اصول مقرر کئے ہیں، مثلاً ریشمی لباس صرف عورتوں کے لئے ہے۔ مردوں کو اس کا لباس ممنوع، لباس اظہار فخر و مباہات اور تکبر کی غرض سے نہ ہو، پاجامہ ٹخنوں سے نیچے نہ ہو، آستین اتنی لمبی نہ ہو کہ انگلیاں ان میں ڈوب جائیں، عورتوں کا لباس اتنا باریک نہ ہو کہ جس سے جسم کا رنگ جھلکے، نہ اتنا چست ہو کہ اس سے بدن کی ساخت معلوم ہو، اسلام میں ایسے کپڑوں کا استعمال کرنا ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے جو خوبصورتی اور گراں قیمت میں مشہور ہوں اسی طرح وہ لباس بھی ممنوع ہے جو اپنی بدہیئتی میں مشہور ہو، ایسے لباس بھی استعمال کرنے سے روکا گیا ہے جو فساق، آوارہ مزاج، بازاری اور بدنام افراد عموماً استعمال کرتے ہیں یا زندیق و بدمذہب لوگ پہنتے ہیں۔

مصنف نے یہ نکتہ بھی بیان کیا ہے کہ ایک شخص جس طرح کے لوگوں کا لباس اختیار کر لیتا ہے بتدریج اس کا اندرون بھی اس سے متاثر ہوتا رہتا ہے اور انجام کار اسی ذہن و مزاج کا بن جاتا ہے جس طرح کے لوگوں کا اس نے لباس اور وضع قطع اختیار کی ہے، آپؒ نے مزید بتایا ہے کہ لباس درحقیقت انسانوں میں امتیاز کا بنیادی وسیلہ ہے آپؒ روزمرہ کی زندگی میں اس کا مشاہدہ کرتے ہیں ہر طبقہ کے لوگوں کو آپ صرف اس کا لباس دیکھ کر پہچان جاتے ہیں اور اس کی وضع قطع دیکھ کر اس کی حیثیت، اس کے رجحانات اس کی

شرافت اور رذالت، بدکرداری، نیک کرداری کا اندازہ کر لیتے ہیں، ظاہر کو دیکھ کر باطن کا اندازہ عام طور پر کیا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ اسلام نے دوسروں کے ساتھ مشابہت کو اختیار کرنے سے منع کیا ہے۔

حضرت حکیم الاسلامؒ نے آیاتِ قرآنی واحادیث سے اپنے ہر دعویٰ کو مدلل کیا ہے اور جو کچھ بیان کیا ہے اس کو کتاب وسنت سے ثابت کیا ہے اور ہر بحث کو بڑی تفصیل سے پیش کیا ہے اور بڑی باریک بینی سے اس تشبہ کے مسئلہ اور اس کی حدود کو بیان کیا ہے۔ پوری کتاب شواہد ودلائل وبراہین آیات قرآنی واحادیث سے بھری ہوئی ہے۔ اپنے موضوع پر ایک اہم کتاب ہے۔

فلسفۂ نعمت ومصیبت

یہ کتاب وجودِ باری کے منکرین کے جواب میں لکھی گئی ہے جب انہوں نے حضرت حکیم الاسلامؒ سے کچھ سوالات کئے تھے جن دنوں ہندوستان میں جنگِ آزادی شباب پر تھی اور بچہ بچہ کے دلوں میں آزادی کا سودا سمایا ہوا تھا، اس جنگ میں شریک ہر طرح کے لوگ تھے۔ ہر فرقہ، ہر مذہب اور ہر طبقہ کے افراد اپنے اپنے نقطۂ نگاہ سے اس تحریکِ آزادی سے وابستہ تھے، جنگِ آزادی کے سورماؤں میں وہ طبقہ بھی تھا جو روس کے انقلاب سے متاثر تھا، جو اکتوبر ۱۹۱۷ء میں ہوا، اس انقلاب نے ان ہندوستانی نوجوانوں کو بے حد متاثر کیا جو ان دنوں یورپ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ روس کا یہ انقلاب درحقیقت کارل مارکس کے نظریۂ حیات کمیونزم کی کامیابی تھی، یہ علمی نظریہ حیات عملی وجود کا جامہ پہن چکا تھا، یہ ہندوستانی نوجوان جب یورپ سے اپنی تعلیم مکمل کر کے آئے تو انہوں نے ہندوستان میں ایک مشنری کی طرح کمیونزم کی تبلیغ شروع کر دی وہ خود عملی طور پر سب کے سب ملحد، دہریئے، دین سے بیزار، خدا دشمن تھے کیوں کہ کمیونزم صرف ایک سیاسی دستور ہی نہیں تھا بلکہ وہ مستقل طور پر ایک نظریہ حیات کو عملی حیثیت سے پیش کرنے والا کارل مارکس تھا، اس نے اپنی کتاب کیپٹل میں لکھا ہے کہ دنیا میں جتنے بھی انقلاب آئے چاہے بادشاہوں، قومی لیڈروں، مذہبی رہنماؤں حتی کہ رسولوں اور پیغمبروں نے وہ انقلاب پیدا کئے سب کی اساس معاشی مسائل پر تھی۔ ابتداء آفرینش سے لے کر آج تک کے سیاسی انقلاب کی تہ میں ''روٹی بیٹی کی جنگ'' کارفرما تھی اس کے علاوہ کچھ نہیں، خدا، رسول، مذہب یہ سب روزی روٹی کا مسئلہ کو حل کرنے کی راہیں تھیں، اس کے سوا کچھ نہیں۔ مذہب کا وجود انسانی زندگی میں افیون کا نشہ ہے جو انسان کی قوت علمی کو سست اور بے کار کر دیتا ہے اس لئے ایک طاقتور کے لئے ضروری ہے کہ مذہب سے بہت دور ہو، اور اپنی حدود ومملکت سے اس کو

دیس نکالا دیدے، اسی نقطہ نگاہ کی وجہ سے ہر کمیونسٹ ہندوستان میں خدا بیزار اور مذہب دشمن رہا اور خود ان کی اپنی زندگی الحاد کا شکار تھی لیکن ہندوستان جیسے مذہبی ملک میں اپنے اس عقیدہ کا برملا اظہار نہیں کر سکتے تھے اور وہ محتاط تھے لیکن اپنی تحریروں میں ڈھکے چھپے لفظوں میں بیان کرتے رہتے تھے، چوں کہ ہندوستانی معاشرہ اتنا مربوط اور مستحکم تھا کہ کسی خاندان کے کسی جوان کو ہندوستان کے مذہبی ماحول میں دین سے بیزاری کے برملا اظہار کی ہمت نہیں تھی اس لئے وہ اپنی بدعقیدگی اور الحاد کو اپنے تک ہی محدود رکھتے تھے، زیادہ سے زیادہ اپنے بے تکلف دوستوں میں اپنا ہم نوا بنانے کے لئے اس کا اظہار کرتے رہتے تھے اور ملک میں کھلم کھلا مذہب بیزاری کی تحریک نہیں چلائی گئی لیکن ذہنوں کو تیار ضرور کیا جاتا رہا اور نوجوان طبقہ اس سے متاثر بھی ہوتا رہا، تاکہ جب وقت آجائے کہ اشتراکی نظام بروئے کار لایا جائے تو آسانی کے ساتھ سمرقند و بخارا اور ایشیاء کوچک کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کی طرح یک بیک مذہب کے خلاف طبل جنگ بجا دیا جائے اور مذہب کو دیس نکالا دیا جائے۔ روسی انقلاب کی تاریخ ہمارے دعویٰ کی شاہد عادل ہے۔

آزادی سے پہلے ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۷ء تک یہ تحریک دہریت بڑے شباب پر تھی اسی زمانہ میں کچھ لوگوں نے خدا کے وجود سے انکار پر مشتمل کچھ سوالات حضرت حکیم الاسلامؒ کو لکھ کر بھیجے تھے جس میں ان سے ایسے جواب کی فرمائش کی گئی تھی جو عقل و روایت کی روشنی میں دیا گیا ہو اور جواب اس کسوٹی پر پورا اترے، قرآن و حدیث سے کسی مسئلہ کو ثابت کرنا ان کے نزدیک کوئی وزن نہیں رکھتا تھا، ان کو یقین تھا کہ کارل مارکس نے جو تھیسس دنیا کے سامنے پیش کی ہے وہ فلسفیانہ نا قابل شکست دلائل سے مسلح ہے، بوسیدہ روایتوں، فرسودہ عقائد اور دقیانوسی نظریہ رکھنے والے مولویوں میں کہاں سے یہ علم پیدا ہوگا کہ اس کا کوئی عقلی جواب دے سکیں اس لئے سوال نامہ میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ جو جواب دیا جائے وہ عقل و خرد کی میزان پر پورا اترے، محض قرآن و حدیث کا حوالہ دینا کافی نہیں ہے کیوں کہ ان کے نزدیک ان دونوں کی کوئی قدر و قیمت اور کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ پہلے ذہین لوگوں نے اپنے دور میں انقلاب برپا کرنے کے لئے یہ کتابیں لکھی تھیں اور اس کی وجہ سے وہ انقلاب برپا کرنے میں کامیاب بھی ہوئے لیکن ان کا دور اب ختم ہو چکا ہے اور نئے انقلاب کے لئے ایک نئے نظریہ حیات کی ضرورت ہے اور وہ کمیونزم ہے۔

وہ سوالات جو حضرتؒ کو بھیجے گئے تھے اور ان کے رسالہ ''مذہب کے آنسو'' میں بھی شائع ہوئے تھے مختصر طور پر یہ تھے کہ اگر اللہ رحیم و کریم ہے تو اس کے رحم و کرم کا یہ تقاضہ تو نہیں کہ انسان ہمہ وقت درد و غم اور آفات و مصائب میں گرفتار رہے، اگر انسان اپنے اعمال کی وجہ سے گرفتار بلا ہے تو آسمانی بلائیں پیہم اور

ہر دم نازل ہوتی رہتی ہیں۔ یہ رحم و کرم کی نگاہ ہی نہیں کرتا اور اگر یہ آفات و مصائب انسانوں کے گناہوں کے نتیجہ میں آتی ہیں تو بچے اور معصوم افراد نیک اور دیندار لوگ حتیٰ کہ بے قصور جانور تک اس خدائی عذاب کو بھگتنے کے لئے کیوں مجبور کئے جاتے ہیں؟ ان کا کون سا گناہ ہے اور کون سا قصور جس کی پاداش میں وہ مبتلائے درد و غم ہوتے رہتے ہیں اور اگر یہ مصائب انسان کو عبرت و سبق دینے کے لئے آتی ہیں تو خدا کو ایسا ظالمانہ اور بے رحیمانہ طریقہ اختیار کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ کوئی دوسرا آسان طریقہ اختیار کرتا جیسے ڈاکٹر کوئی بڑا آپریشن کرتا ہے تو کلوروفام سنگھا کر پہلے بے ہوش کر دیتا ہے تب آپریشن کرتا ہے تا کہ مریض نشتر کی اذیت نہ محسوس کرے، اگر روحانی اسلحہ میں یہ بھی نہیں تو اس کو سوائے بے رحمی اور ظلم کے اور کیا کہا جائے گا؟ اور اس کی کمال قدرت بھی مشتبہ ہو جاتی ہے کہ اس طریقہ کے علاوہ اس کو کسی طریقہ علاج پر قدرت ہی نہیں ہے اس سے زیادہ تو انسان ہی ہے کہ وہ رحم و کرم کا پتلا بن سکتا ہے، وہ ایسی دوائیں ایجاد کرتا ہے اور طریقۂ علاج کو کام میں لاتا ہے کہ اس سے اجتماعی وبائیں اور بیماریاں بھی کم ہو جاتی ہیں، کالرا، طاعون، چیچک، ملیریا کی وبائیں، ڈاکٹروں کی محنت کے نتیجہ میں بڑی حد تک کم ہو گئیں اور انسانیت کو ان مصیبتوں سے انہوں نے نجات دلا دی ورنہ خدا تو پہلے مسلسل یہ بلائیں بھیجتا رہتا تھا۔

اور اگر یہ مصائب انسانوں کی آزمائش اور جانچ کے لئے ہیں تو اس کو علیم و خبیر بھی تو کہا جاتا ہے تو کون سا ایسا راز رہ گیا کہ ہزاروں برس کے بعد بھی اس کو معلوم نہیں ہو سکا اور انسانوں کو مسلسل آزمائے چلا جا رہا ہے، اگر انسان خدا کو چھوڑ کر اپنی عقل اور تجربہ کی رہنمائی میں کام کرے تو اس سے زیادہ آرام میں رہ سکتا ہے، جن ملکوں کی سائنس نے ترقی کی ہے آج ان کو دنیا کی ساری آسائشیں اور سہولتیں میسر ہیں وہ ہر طرح پرسکون اور مطمئن زندگی گذارتے ہیں، ان کا معیارِ زندگی، ان کا رہن سہن ساری دنیا کے لئے باعث رشک ہے۔ اگر وہ بھی خدا کے بھروسے پر بیٹھے رہتے تو دانے دانے کے محتاج رہتے، چیتھڑے لپیٹے رہتے، خدا سے دعائیں کرتے رہتے اور خدا ان کو سسک سسک کر مرتے ہوئے دیکھتا رہتا اور ان کو اس سے چھٹکارے کی بات بھی نہیں سوچتا جیسا کہ عام طور سے مذہب کے نام لیوا ملکوں کے باشندوں کا حال ہے۔ ان حالات و اسباب کی بنا پر اگر کوئی خدا کے وجود سے انکار کرتا ہے تو کیوں قابلِ ملامت ہے اور اس کا کیا قصور ہے؟

حضرت حکیم الاسلامؒ نے اپنی کتاب میں دو طرح کے جوابات دیئے ہیں، ایک تو الزامی جواب ہے دوسرا اصولی اور تحقیقی، الزامی جواب میں آپ نے انہیں کے انداز پر بات پلٹ کر مسکت جواب دیا ہے بذاتِ خود یہ جواب بھی خاموش کرنے کے لئے کافی ہے۔ آپؒ نے تحریر کیا کہ اگر ایک طرف آفات و

مصائب آتی رہتی ہیں جن کی تم شکایت کرتے ہو تو انہیں کے مقابل بے شمار نعمتیں اور لطف و کرم کے بے پناہ احسانات بھی موجود ہیں! اگر بیماری پھیلانے والے، ایذا دینے والے جانور ہیں تو اس کے بالمقابل ایسے بھی جانور ہیں جو صحت بخش اور قوت آفریں ہیں، اگر زمین پر آفاتِ سماویہ آتی ہیں تو دوسری طرف فضاؤں کی نسیم جانفزا، فرحت بخش ہوائیں، بادلوں کی سخاوت، بارش کی حیات بخشی، دریاؤں کی حیات آفریں روانی، عالم کے لئے صد ہا نعمتوں اور زندگیوں کا سہارا بھی موجود ہے، غرض جتنی مصیبتیں آپ شمار کرا سکتے ہیں ان کے مقابل میں ان سے کہیں زیادہ ہم نعمتیں گنوا سکتے ہیں بلکہ ہر ملک میں جہاں مصیبت کا پہلو ہے وہیں اسی میں راحت وسکون کا بھی پہلو موجود ہے، اگر زہر جان لیوا ہے تو انہیں زہروں سے بہت سی بیماریوں کا علاج بھی کیا جاتا ہے اس لئے اگر تم ان مصائب کی وجہ سے خدا کا انکار کرتے ہو تو ان نعمتوں پر خدا کے وجود کا اقرار کیوں نہیں کرتے؟ یہ کون سی منطق ہے کہ مصیبت بھیجنے کا فعل تو اس کے انکار کے لئے حجت ہو مگر اس کی نعمتیں نازل کرنے کا فعل اس کے اقرار کی حجت نہ ہو؟ ان آفتوں پر خدا کا شکوہ تو جائز ہو مگر ان کے مقابل اضداد یعنی نعمتوں پر اس کا شکریہ جائز نہ ہو؟ یہ عقل وفہم کا کیسا فیصلہ ہے؟ اور یک طرفہ فیصلہ کیوں ہے؟

الزامی جواب کو حضرت حکیم الاسلامؒ صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں بڑی تفصیل سے تحریر فرمایا ہے اس کے بعد جو تحقیقی جواب دیا ہے وہ اردو میں کلامی مباحث کا ایک بے مثال شاہکار ہے، یہ جواب چھوٹے سائز کے ڈھائی سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے، ترتیب مقدمات واستخراج نتائج کی ایک طویل بحث پر مشتمل ہیں اور یہ بحث کتاب ہی میں پڑھنے کی چیز ہے، یہ جواب ایسے عقلی مقدمات پر مشتمل ہے اور ہر استدلال اتنا محکم اور ناقابلِ تردید ہے کہ اس کی صداقت کو تسلیم کئے بغیر کوئی چارہ کار نہیں، وجود باری پر جتنے شبہات بھی وارد ہو سکتے ہیں ان کا مدلل ومبرہن جواب دیا ہے۔ کتاب نوع بنوع مباحث طرز استدلال واستخراج نتائج کے اعتبار سے ایسی ہے کہ عوام کے بجائے اہل علم کے مطالعے کی چیز ہے۔ منکرینِ وجودِ باری تعالیٰ میں اگر ضد کا مادہ نہیں ہے تو یقیناً ان کا دل ان دلائل پر مطمئن ہو جائے گا ورنہ ضد کے سامنے تو سر پر چمکتے ہوئے سورج کا بھی انکار کیا جا سکتا ہے۔

آفتابِ نبوت

حضرت حکیم الاسلامؒ کی تقریر شیریں زبانی وحلاوت بیانی کے ساتھ الفاظ مرصع مع انداز بیان جچا تلا، احادیث وآیاتِ قرآنی کے ایک ایک لفظ سے نکتہ آفرینی کی خصوصیت کی وجہ سے ہر ایک کے لئے اپنے اندر بڑی دلکشی رکھتی تھیں، وہ ایک فصیح وبلیغ خطیب کی حیثیت سے پورے ملک میں قابل رشک شہرت رکھتے تھے، یہ شہرت سطحی باتوں کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ ان کی تقریروں کی معنوی قدر وقیمت کی بنا پر تھی، ان کی ہر

تقریر اپنے اندر ایسے علمی جواہر پارے رکھتی تھی جہاں تک عام اہلِ علم کی رسائی نہیں تھی۔ کچھ قدرتی طور پر آپ کا ذہن گہرائیوں میں ڈوب کر ایسے نادر و نایاب اور بیش قیمت گوہر نکال لاتا تھا جو دوسروں کی دسترس سے باہر تھا اس لئے اگر ان کی تقریر کو قلم بند کر کے شائع کر دیا جائے تو کم ہی لوگ سمجھ پائیں گے کہ یہ سنبھل سنبھل کر لکھی ہوئی کتاب ہے یا کوئی برجستہ تقریر، مثال میں حضرت حکیم الاسلامؒ کی یہی کتاب ''آفتابِ نبوت'' پیش کی جاسکتی ہے۔

یہ حضرت حکیم الاسلامؒ کی سیرت نبوی پر ایک عالمانہ تقریر ہے جو قلم بند کر کے شائع کر دی گئی ہے اور خود حضرت حکیم الاسلامؒ کے قلم سے ہے، حسب دستور ابتداء میں ایک لمبی تمہید، خوبصورت الفاظ کے برمحل استعمال اور اس کی معنویت کے نئے نئے پہلو تراشنا، استعارات و مجازات کا ایک طویل سلسلہ جو ابتداء کتاب سے آخر تک یکساں پایا جاتا ہے، کتاب پڑھتے جایئے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی اہل علم مرصع عبارت میں شاندار تقریر سنا رہا ہے، اندازِ تحریر، اندازِ بیان اور لب ولہجہ سے ہم آہنگ ہے، صاف پتہ چلتا ہے لکھا نہیں جا رہا بلکہ بولا جا رہا ہے، آفتابِ نبوت ذاتِ نبوی کا استعارہ کیا گیا تو آخر کتاب تک اس استعارہ کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے اور سیرت کے ہر ہر پہلو کو اسی آفتاب، اسی کے نور اور اس سے متعلق اشیاء و کیفیات و خصوصیات کے استعاروں میں گفتگو کی گئی ہے، اگر اس کو تصنیف مان لیا جائے تو کہا جائے گا کہ سیرت کے موضوع پر اپنی نوعیت کی یہ منفرد کتاب ہے جس میں تقریر و تحریر دونوں کی چاشنی موجود ہے۔ اس میں دو لذتیں ہیں ایک سے دل محظوظ ہو رہا ہے اور دوسری سے قوت سامعہ لطف اندوز ہو رہی ہے۔

حضرت حکیم الاسلامؒ کا شمار ان علماء میں تھا جن کا اپنا ایک علمی مقام تھا اور وہ اپنے دل میں اصلاح و تبلیغ کا پاکیزہ جذبہ رکھتے تھے۔ ان کی تقریر کا مقصد عوام و خواص کو اسلامی تعلیمات و روایات کی اہمیت و غفلت سے آگاہ کرنا، سیرتِ نبوی کے ان گوشوں کو روشنی میں لانا جو دلوں میں سرکارِ دو عالم ﷺ کی قدر و منزلت، علوشان، علوئے مرتبت کو جاگزیں کر دیں۔ وہ اپنے موضوع سے ایک لمحہ کے لئے بھی صرفِ نظر نہیں کرتے تھے، ذخیروں سے واقفیت کی بنیاد پر اپنی طویل ترین تقریروں میں بھی اسے اپنا موضوعِ سخن بنا لیا، اس سے سر مو انحراف نہیں کرتے تھے۔ جب تقریر ختم ہوتی تو ہر سننے والا محسوس کرتا کہ اپنے موضوع پر ایک سیر حاصل اور مفید بحث سے استفادہ کا موقع حاصل ہوا، اگر کوئی شخص تقریر کا خلاصہ بتانا چاہے تو دوسرے کو آسانی سے بتا سکتا تھا کیوں کہ وہ ایک مربوط بیان اور علمی شاہکار ہوتا تھا میرے اس بیان کی وہ تمام لوگ شہادت دے سکتے ہیں جنہوں نے کبھی بھی حضرت حکیم الاسلامؒ کی تقریر سنی ہے اور ان کے وعظ میں شریک ہوئے ہیں۔

''آفتاب نبوت'' کی تقریر داعیاً الی اللّٰہ باذنہٖ و سراجاً منیراً آیت کی تفسیر وتشریح پر ہے اورحق یہ ہے کہ پوری تقریر ایک مرصع، شاندار اور خوبصورت سیرتِ پاک کا مرقع ہے جو کتابی شکل میں آفتابِ نبوت کے نام سے پیش ہے۔

مضامین کے مجموعے

میرے سامنے حضرت حکیم الاسلامؒ کی جتنی کتابیں بروقت موجود تھیں میں نے ان کا تعارف پیش کر دیا ہے ان کے علاوہ ان کے مضامین کے بہت سے مجموعے میرے سامنے ہیں ان میں اہم مضامین (۱) معجزہ کیا ہے؟ (۲) نسب اور اسلام (۳) میلاد النبی کی حقیقت (۴) تصویر اسلام کے آئینہ میں (۵) اردو کی شرعی حیثیت (٦) سیرتِ قرآنی (۷) اسلام کے دو امتیازی پہلو (۸) فہم قرآن اور تعلیم مذہب کے دو بنیادی اصول (۹) سورہ فیل میں پرویزی تحریف خصوصیت سے قابل ذکر ہیں ان میں بعض طویل مقالے کی حیثیت رکھتے ہیں جو کامل غور وفکر کے بعد سپردِ قلم کئے گئے ہیں۔ یہ تمام مضامین حکیم الاسلام کے حکیمانہ طرز استدلال، ٹھوس معلومات، مستحکم دلائل، آیاتِ قرآنی سے استنباط مسائل اور استخراج نتائج کے بہترین شاہکار ہیں لیکن فی الحال ان پر تبصرہ میرے موضوع سے خارج ہے اس لئے ان پر گفتگو نہ کرکے اتنی بات کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ اگر اہل علم ان مضامین کا مطالعہ کریں تو وہ محسوس کریں گے کہ ان کے علم میں اضافہ ہوا، ان کی معلومات کا دائرہ مزید وسیع ہوگیا، کیوں کہ حضرت حکیم الاسلامؒ نے جس موضوع پر قلم اٹھایا ہے سطحی طرزِ کلام اختیار نہیں کیا ہے، ان میں سے کوئی بھی مقالہ یا مضمون ان کی عالمانہ محققانہ اور حکیمانہ شان سے فروتر نہیں ہے۔

آخری بات

حضرت حکیم الاسلامؒ ایک عظیم المرتبت علمی خانوادے کے فرد فرید ہیں۔ اس خانوادے کا ہر فرد علم وفضل کا آفتاب و ماہتاب ہے اور کہا جائے کہ ''ایں خانہ ہمہ آفتاب است'' تو اظہارِ واقعہ ہوگا، حکیم الاسلامؒ کے جد امجد حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ نے جس علم کلام کا علماء میں ذوق پیدا کیا تھا حضرت حکیم الاسلامؒ کو اس سے حظ وافر ملا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی بیشتر کتابوں پر ان کا یہ متکلمانہ رنگ چھایا ہوا نظر آتا ہے، اسی کی وجہ سے تصنیفات مرعوب کن، وقیع اور شاندار ہو جاتی ہیں اور ان کی قدر و قیمت بہت بڑھ جاتی ہے، چوں کہ زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے اس لئے دقیق مباحث کو اردو میں سہل بنا کر پیش کرنے میں ان کو کمال حاصل ہے، البتہ زبان بالعموم وہ استعمال کی گئی ہے جو ہمارے عربی مدارس کی درسی تقریروں میں رائج

ہے جس کی وجہ سے زبان بوجھل ہو جاتی ہے، عربی زبان کے ایسے مغلق اور اجنبی الفاظ استعمال کرتے ہیں جن سے اردو داں طبقہ بڑی حد تک نامانوس ہے۔ جب کہ اردو کو سہل اور سادہ بنا کر اس میں علمی مباحث کو ادا کرنے کی جدو جہد کی جارہی ہے، مولانا شبلی نعمانیؒ نے اس دور میں اپنی کتابیں لکھ کر ایک روشن مثال قائم کردی ہے جب کہ اردو پر ابھی پورے طور پر نکھار بھی نہیں آیا تھا لیکن انہوں نے اپنی معرکۃ الآرا کتابیں لکھ کر ثابت کر دیا کہ دقیق علمی مسائل بھی سلیس اردو میں اس طرح پیش کئے جاسکتے ہیں کہ اظہار و مطالب کو ادنیٰ ٹھیس بھی نہیں لگ سکتی ہے، اردو زباں تو اس کے بعد اور بھی وسیع ہو چکی ہے۔ اب ہر طرح کے مباحث کے لئے اس کے پاس ایک عظیم الشان ذخیرۂ الفاظ ہے کہیں بھی قلم کو اردو کی تنگ دامانی کی شکایت لاحق نہیں ہوسکتی ہے، میں صرف ایک کتاب کے ایک صفحہ سے چند الفاظ بطور مثال پیش کرتا ہوں بعض الفاظ کا تلفظ بھی اردو داں طبقہ کو دشوار محسوس ہوگا، مثلاً متصر نجانہ، مالوفات، زیّ دہئیۃ، تجمل و تزین، فتنہ عمیار، دور التباس، مستقلاً بغتۃً، تدین متشتت، مائدہ، باصرہ اہل نظر، وغیرہ جب اردو تحریر میں ان لفظوں کو استعمال کیا جاتا ہے تو یہ الفاظ اس طرح دہشت زدہ نظر آتے ہیں جیسے کوئی اجنبی بے تکلف دوستوں کی محفل میں گھس آئے۔

حاصل کلام

حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ علم و فضل کے بلند ترین مقام پر فائز تھے۔ اس سے نیچے اتر کر باتیں کرنا ان کے لئے ممکن ہی نہیں تھا، یہی وجہ ہے کہ ان کی تقریر یا تحریر دونوں میں وہ علمی جواہر وافر مقدار میں پائے جاتے ہیں جو عام کتابوں کے مطالعہ سے حاصل نہیں کئے جاسکتے، ان کی تقریر و تحریر جہاں ان کے وسیع مطالعے و معلومات کا پتہ دیتی ہیں وہیں یہ بھی یقین کرنے پر مجبور کرتی ہیں کہ حضرت حکیم الاسلامؒ کو قدرت نے علماء متکلمین کا ذہن عطا فرمایا ہے، اسی لئے ایک ایک لفظ سے معارف و حقائق کے اتنے نکتے خود پیدا کر لیتے ہیں جو کتابوں میں آسانی سے دستیاب نہیں ہو سکتے اس لئے اگر اہل علم حضرت حکیم الاسلامؒ کی تصنیفات کو اپنے مطالعے میں رکھیں تو ان کو علمی زندگی میں بڑی روشنی ملے گی، حضرت حکیم الاسلامؒ کی یہ تصانیف درحقیقت اہل علم پر احسانِ عظیم ہیں اور جب تک یہ کتابیں پڑھی جائیں گی ان کا نام نیک زندہ و پائندہ رہے گا اور جن نیک مقاصد و مقدس جذبات کے تحت یہ کتابیں وجود میں آئی ہیں ان کی وجہ سے امید ہے کہ قدرت نے اپنی رحمتوں مغفرتوں اور انعامات سے یقیناً نواز دیا ہوگا اور رحمتِ خداوندی نے استقبال کرتے ہوئے ان کی روح سے کہا ہوگا۔ **ادخلی فی عبادی وادخلی جنتی**

............❖............

حکیم الاسلامؒ ایک باکمال شاعر بھی

مولانا عبدالحفیظ رحمانی

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کی ہمہ جہت شخصیت، ہر سمت سے پرکشش اور بے نظیر ہے، جولان گاہ علم وفضل میں کوئی گوشہ ایسا نظر نہیں آتا جوا چھوتا ہو اور حضرت حکیم الاسلامؒ کے فکروفن نے ہر گوشہ کی تزئین کاری میں اپنی جدت طرازی کا لوہا نہ منوایا ہو۔

تصنیف وتالیف کے میدان میں وہ منفرد اسلوب کے مالک ہیں تو خطابت میں بے مثال ہیں، فقہی ژرف نگاہی میں باکمال ہیں تو احادیث کے رمز شناس ہیں، اسرار وحکم میں وہ اپنے دادا کے عکس جمیل ہیں تو تدریس اور افہام وتفہیم میں لاثانی ہیں، انتظام وانصرام میں دارالعلوم کا ساٹھ سالہ اہتمام گواہ ہے۔ اگر یوں کہا جائے کہ حضرت مولانا طیب صاحبؒ بہ یک وقت دیدہ ور مصنف، بے مثال خطیب، ژرف نگاہ فقیہ، ثاقب النظر محدث، وسیع المطالعہ مدرس، فطری شاعر وادیب اور اسرار وحکم کے ادا شناس تھے تو حقیقت کی طرف اشارہ ہی ہوگا، اس لئے کہ کتاب زندگی کا ہر عنوان تفصیل طلب ہے، یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر عنوان پرکشش ہے اور دامن علم وفضل کا ہر تار نظر وفکر کی دعوت دے رہا ہے۔

کتاب زندگی کے انہی عناوین میں ایک شعروشاعری بھی ہے، اکابر علماء دیوبند کا ایک طرۂ امتیاز یہ بھی رہا ہے کہ وہ واردات قلبی کو شعری قالب میں ڈھالنے میں یدطولیٰ رکھتے تھے، شعروشاعری کو انہوں نے اپنا مشغلہ تو نہیں بنایا لیکن سوز دروں کی آنچ نے جب بے قرار کیا تو خود بخود جذبات نے شعر کا قالب اختیار کرلیا، پڑھنے والے کو محسوس ہوا کہ شاعر نومشق نہیں کہنہ مشق ہے، محاسن شعری سے خالی نہیں کلام محاسن سے شعری معمور ہے، بلند مضامین، اعلیٰ درجہ کا تخیل، نکتہ آفرینی، روانی وسلامت اور ردیف وقافیہ کی پابندی، نیز واردات قلبی کا شفاف آئینہ ہے۔

اکابر علمائے دیو بند درحقیقت علما ربانیین تھے۔ گفتار و رفتار، نشست و برخاست، عبادات و معاملات اور سیاست و اصلاح میں اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی ہی پیش نظر تھی، اتباع سنت سے سر مو انحراف بھی ان کے تصور سے خارج تھا اس لئے ان کی زبان سے جو موزوں کلام صادر ہوا وہ ان کے عرفان حقیقت کا عکس جمیل ہے، یہی وجہ ہے کہ اکابر علما نے مجال شعر میں قدم رکھا تو اپنی شناخت الگ بنائی۔ غزلیات وقصائد سے وہ نباہ نہیں کر سکے، حقیقت بیانی ان کا شعار رہا اور جو کچھ کہا وہ معبود حقیقی کی ذات وصفات میں گم ہو کر کہا، سچ پوچھئے تو عشق و محبت کا مرکز ذات باری ہی ہے، تمام محاسن اور اوصاف حمیدہ اسی میں ہیں تو لو لگایئے تو اس سے لگایئے، گن گایئے تو اس کے گایئے، محبت کیجئے تو اس سے کیجئے، ان علماء دیو بند نے یہی کیا اور اسلامی فطرت کے مطابق اسی محبوب حقیقی کی بارگاہ میں عشق و محبت کے ترانے پیش کئے۔ ذات وحدت کے بعد ذات نبوت سے عقیدت و محبت کا اظہار ان کا سرمایۂ حیات تھا۔

حجۃ الاسلام حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ کے پیر و مرشد حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے تو متعدد مجموعہائے کلام ہیں۔ مثنویوں میں عشق و محبت اور فریاد کا وہ رنگ ہے جو ایک صاحب دل کے کلام میں ہونا چاہئے۔ یہ رنگ عام شاعروں کے کلام میں نظر نہیں آتا۔ یہ صاحبان دل ہی ہیں جو عشق و محبت کے سمندر میں ڈوبے ہوئے محبت کے آبدار موتی نکالتے ہیں اور دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتے ہیں، مرشد کا اثر مسترشد پر بھی صاف دکھائی دیتا ہے، جذب و مستی نے انگڑائی لی تو قلبی واردات الفاظ کا جامہ پہن کر منظر عام پر آ گئے، یہ علماء دیو بند بھی کیا گذرے ہیں کہ عربی و فارسی اور اردو پر یکساں قدرت تھی، کبھی عربی کو اظہار جذبات کا ذریعہ بنایا تو کبھی فارسی کو اور کبھی اردو کو۔

حضرت نانوتویؒ نے فارسی اور اردو میں جو کچھ کہا ہے وہ متعدد کتابوں میں نظر آ جاتا ہے۔ کوئی مستقل مجموعۂ کلام نہیں ہے اور اگر کبھی شائع بھی ہوا ہو تو راقم الحروف کی نظر سے نہیں گزرا۔ حضرت نانوتویؒ کا شجرۂ چشتیہ فارسی زبان کے شاہکار شجرات میں منفرد ہے۔ روحانی اور برجستگی ایک ایک شعر کا حسن ہے اور سلاست ایسی کہ قربان جایئے، بطور تبرک شجرہ کے دو چار اشعار آپ بھی سماعت فرمالیجئے۔

الٰہی غرق دریائے گناہم — تو میدانی و خود ہستی گواہم
گناہ بے عدد را بار ستم — ہزاراں بار توبہ ہا شکستم
حجاب مقصدم عصیان من شد — گناہم موجب حرمان من شد
بآں رحمت کہ وقف عام کردی — جہاں را دعوت اسلام کردی

نمی دانم چرا محروم ماندم رہین ایں چنیں مقصود ماندم
گدا خود را ترا سلطان چو دیدم بدرگاہ تو اے رحمان دیدم

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد رشید وشیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ جن کی انگریز دشمنی اور مجاہدانہ کارنامے روز روشن کی طرح واضح ہیں بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ شیخ الہند رحمہ اللہ اپنے استاذ گرامی کے عکس جمیل تھے تو بے جا نہ ہوگا۔ یہ شیخ الہندؒ کی مجاہدانہ سرگرمیوں کا نتیجہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کا سر بلند ہے اور ہمیشہ جہاد حریت کی تاریخ میں شیخ الہند کے قابل فخر کارناموں کو یاد کیا جاتا رہے گا، حضرت شیخ الہند اپنے بلند قامت اساتذہ کی طرح مجموعۂ کمالات تھے، مفسر ومحدث، فقیہ ومتکلم، خطیب ومصنف، ادیب وشاعر اور مفکر ومجاہد نیز بہت کچھ تھے اور حضرت شیخ الہند کو جس نام سے یاد کیجئے بجا ہے۔

اس موقعہ پر مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ حضرت شیخ الہند ایک باکمال ادیب وشاعر بھی تھے، ”کلّیات شیخ الہند“ کے نام سے حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مجموعۂ کلام شائع کیا تھا اور حال ہی میں ایک فاضلانہ مقدمہ کے ساتھ ابوسلمان شاہ جہاں پوری نے پاکستان سے شائع کیا ہے، دیوبند کے کتب خانوں میں بھی دستیاب ہے۔

کلّیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ الہندؒ دبستان دہلی کے ایک کامیاب اور باکمال شاعر تھے۔ کلّیات میں وہ ایک کہنہ مشق اور قادر الکلام شاعر دکھائی دیتے ہیں لیکن شاعری کا محرک خارجی اثرات نہیں بلکہ قلبی واردات ہی محرک ہیں اور کلام کا بیشتر حصہ قلبی واردات اور جذبات کا ہی آئینہ دار ہے، جو کچھ دل نے محسوس کیا وہ اشعار کے سانچے میں ڈھل گیا، اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ وارداتی اشعار سوز دروں کی آنچ سے لفظوں میں ڈھلے ہیں، اکابر علماء دیوبند کی شاعری کا یہی طرۂ امتیاز ہے۔

چوں کہ حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نمونۂ اسلاف اور اُن کے علوم ومعارف کے امین ووارث تھے اس لئے ان کا ادب وشعر بھی اسلاف کے محور پر گھومتا ہے، اسلاف کی روش سے کہیں انحراف نہیں ملتا اور نہ ہی ان کی شاعری میں آورد ہے، کسی شخصیت سے متاثر ہوئے یا واقعات وحوادث نظر سے گذرے اور انہوں نے اظہار جذبات پر مجبور کیا تو خیالات وتاثرات اشعار کے سانچے میں ڈھلتے گئے اور ادبی دنیا میں ایک وقیع اضافہ ہوتا گیا، شعر وشاعری مستقل مشغلہ نہیں تھا اور ایک عالم باعمل اس کو مشغلہ بنائے بھی تو کیسے؟ کتاب وسنت کی اجازت تو محدود ہے، ان حدود سے حکیم الاسلامؒ قدم باہر کیسے نکال سکتے تھے؟ پھر اسلاف کے جو وارث وامین تھے تو نرے شاعر کیسے ہو سکتے تھے؟ ہاں جو کچھ کہا

اورشاعری کے جونمونے منظر عام پر آئے وہ اپنی نظیر آپ ہیں، شاعرانہ محاسن پر تو حیرت ہوتی ہے کہ تمام تر مصروفیات اور علمی مشاغل کے ساتھ ساتھ اتنی اچھی شاعری کیسے وجود میں آ گئی جس کی داد و تحسین صاحب طرز ادیب و نقاد عبدالماجد دریابادی کے قلم حقیقت رقم سے بھی نکلی۔ جی چاہتا ہے کہ مولانا دریابادی کے الفاظ آپ کو اسی موقع پر سنا دیئے جائیں تو لیجئے سماعت فرمایئے:

حضرت محترم، السلام علیکم

''آنکھ کی کہانی آں محترم کا عطیہ، یہاں آتے ہی پڑھ ڈالی، سبحان اللہ، ماشاء اللہ مجھے علم نہ تھا کہ آپ کو شعر و نظم پر بھی اس درجہ قدرت حاصل ہے، ذٰلک فضل اللہ، کیا کیا قافئے نکالے ہیں، کیسے کیسے مضمون باندھے ہیں کہ پیشہ ور شاعروں کے بھی چھکے چھوٹ جائیں، نہ کہیں جھول، نہ اتنی طویل نظم میں کہیں آورد، بس آمد ہی آمد، خوش دماغ تو بہ حیثیت ایک سچے قاسم زادہ کے آپ تھے ہی، اب معلوم ہوا کہ ماشاء اللہ خوش فکر بھی اسی درجہ میں ہیں۔ ماشاء اللہ۔

دعا گو و دعا جو

عبدالماجد

۱۵ر ستمبر ۱۹۶۴ء

اس داد و تحسین کے بعد کسی اور داد کی ضرورت بھی کیا رہ جاتی ہے، لیکن انسانی فطرت اور اختلاف ذوق و فکر کو نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا، ہر صاحب فکر و فن کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنے زاویہ فکر و نظر کے مطابق کلام کا جائزہ لے، چنانچہ بہت سے ارباب فن نے حضرت حکیم الاسلامؒ کی شعر و شاعری پر بہترین تبصرے کئے اور قادر الکلامی کی بھرپور داد دی۔

حضرت حکیم الاسلامؒ کی تمام نظموں میں ''اسلام کی روانی'' اور ''آنکھ کی کہانی'' کو امتیاز حاصل ہے، اکبر الٰہ آبادی مرحوم کی نظم ''پانی کی روانی'' کی زمین میں حضرت حکیم الاسلامؒ نے اپنے اسلامی ذہن و فکر کے جلو میں ''اسلام کی روانی'' میں جو روانیٔ طبع دکھائی ہے وہ ہر زاویہ سے ''پانی کی روانی'' سے کم نہیں بلکہ ''اسلام کی روانی'' کے حُسن کو دو چند کر دیا ہے۔ نظم خاصی طویل ہے لیکن زور بیان، روانی و برجستگی اور حقیقت بیانی میں کہیں جھول نظر نہیں آتا۔ اس کو قادر الکلامی اور شاعرانہ کمال نہ کہئے تو کیا کہئے؟ چند اشعار آپ بھی سماعت فرمالیں تو ہمنوائی میں ذرا تامل نہ ہوگا۔ لسان العصر اکبر الٰہ آبادی مرحوم ان الفاظ میں اس نظم کی داد دے چکے ہیں:

مولانا محمد طیب صاحبؒ کی نظم ''روانی اسلام'' نظر سے گذری
ماشاءاللہ، صل علی، جزاک اللہ، نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اولیٰ۔
خاکسار اکبر

ہاں تو مرحوم اکبرالٰہ آبادی کے اعتراف کمال کے بعد اشعار کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا بھی مشکل، تو لیجئے اشعار سماعت فرمائیے:

چلا ارض بطحا سے اک بحر ذاخر　　کہ تھا جس کی موجوں کا اول نہ آخر
وہ توحید کی لے بجاتا ہوا　　سرود حجازی میں گاتا ہوا
وہ جنگل میں منگل مناتا ہوا　　وہ شہروں میں شادی رچاتا ہوا
پہاڑوں پہ نعرے لگاتا ہوا　　سمندر میں طوفاں اٹھاتا ہوا
محیط زمیں پر وہ چھاتا ہوا　　خباثت کی وسعت گھٹاتا ہوا
صداقت کے جھنڈے اڑاتا ہوا　　وہ باطل کو نیچا دکھاتا ہوا
بتوں سے وہ رشتے تڑاتا ہوا　　خدا سے ہر اک کو ملاتا ہوا

یہ ہے ''اسلام کی روانی''، جس کی روانی پر علماء و حکماء انگشت بدنداں تو ادباء و شعرا محو حیرت، اس میں فنی محاسن کیا ہیں جن کو دیکھ دیکھ اہل فن عش عش کر رہے ہیں، تفصیل میں کیوں جایئے، یہی جو چند اشعار پیش کئے گئے، انہی کا حسن دیکھ لیجئے۔ جنگل میں منگل منانا۔ کون نہیں جانتا کہ مشہور محاورہ ہے اس کو کس خوبصورتی سے مصرع میں موزوں کیا گیا ہے اور محاورہ کو زمین سے اٹھا کر آسمان کی رفعتوں تک پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ بھی نظر میں رہے کہ عرب کی سرزمین کیا تھی اور بروقت بھی کیا ہے؟ اس تناظر میں دیکھئے تو محاورہ محض تخیل کی پرواز حقیقت کا عکاس ہے، اسی طرح لے اور سرود کی مناسبت نے شعری حسن میں اضافہ کر دیا ہے۔ پہاڑوں پر صدائے توحید بلند کرنا حقیقت ہے، فاران کی چوٹیاں آج بھی نعرۂ توحید کی تاثیر سے رشک آسماں ہیں، بتوں سے رشتے ناتے تڑانا اور خدا سے رشتہ جوڑ دینا تجنیس معنوی کی اچھی مثال ہے، ان اشارات سے مقصود صرف اتنا ہے کہ اشعار میں صرف روانی ہی نہیں محاسن شعری بھی جگمگا رہے ہیں۔

اب آیئے دوسری مشہور ترین نظم ''آنکھ کی کہانی'' پر آنکھیں جما دیں اور دیکھیں کہ بیمار آنکھ نے کیا کیا رنگ دکھائے ہیں۔ روانی و برجستگی کا تو کہنا ہی کیا، اظہار واقعہ میں بھی کہیں جھول نظر نہیں آتا اور جہاں آنکھ کے کارنامے اور محاورے باندھے ہیں ان میں تغزل کا رنگ اتنا چمک گیا ہے کہ آنکھ کام نہیں کرتی اور محسوس

ہوتا ہے کہ شاعر نے گو غزلیں نہیں کہی ہیں لیکن غزل گوئی پر پوری قدرت حاصل تھی۔ چند اشعار آپ بھی سماعت فرمالیں تو دل میں گدگدی اور آنکھوں میں چمک پیدا ہو جائے۔ یوں تو پوری کہانی سننے اور پڑھنے کے لائق، آمد ہی آمد، آورد کا کہیں نام ونشان نہیں۔ ہر شعر میں محاسن شعری کا حسن اور ہر شعر میں واقعیت کی کشش، مبالغہ آرائی کو راہ ہی نہیں مل سکی اور شاعر کا کمال یہی ہے کہ اس نے واقعیت کو پر کشش بنادیا ہے، مبالغہ آرائی وہ شعراء کریں جو اس کے بغیر جولاں گہ شاعری میں نہیں اتر سکتے، حکیم الاسلامؒ نے میدانِ شعر وادب کو ایک نئی سمت عطا کی ہے اور نیا رجحان پیش کیا ہے، نظامی گنجوی کا فارمولہ ''احسن اوست اکتب اوست'' سر پٹختا ہوا نظر آرہا ہے اور حکیم الاسلامؒ کی شاعری آنکھ دکھا رہی ہے تو لیجئے آنکھ کے چند اشعار پر آنکھ جما ہی دیجئے:

ہو کھلی آنکھ تو اس سے ہے ظہور عیاں — اور ہو بند تو ہے زیرِ نظر عالم خواب
آنکھ کھل جائے جو بھرپور ہے بجلی دل پر — نیم وا ہو تو بھری اس میں ہے مستیٔ شراب
آنکھ نیچی ہو تو ہے نور حیا چشمہ — اور اٹھ جائے تو ہے نار فروزاں کا عتاب
آنکھ پھر جائے تو ہے شعلۂ نفرت کی بھڑک — اور بھر آئے تو ہے بارش رحمت کا سحاب
آنکھ ترچھی ہو تو پھٹ جائے فضاء پیشیں — اور سیدھی ہو تو سیدھا ہے جہان اسباب
آنکھ اگر امن پسند ہے تو ہے دل بھی آزاد — آنکھ لڑ جائے تو پھر دل ہے گرفتار عذاب
آگئی آنکھ تو کہتے ہیں کہ بیمار ہوئی — اور نہ آئی تو سمجھتے ہیں صحیح اور صواب
چشم حق بیں ہو تو ہے نافع دین و دنیا — چشم بد بھی ہو تو دارین کا خسران و عذاب
آنکھیں دو ہیں تو وہ ہیں کاشف الوان جہاں — چار ہو جائیں تو ہیں سر محبت کا نقاب
کشش و دفع کی نظریں ہیں بہم آنکھوں میں — پر کشش تار نظر، تیر نظر وجہ عذاب
تیر اندازی نگاہوں سے ہے آنکھوں کا عمل — آنکھ کے سارے ہی ایام ہیں یوم الاحزاب
خبر مہر و وفا لائے اگر تار نگاہ — یہی ایام پھر ہو جاتے ہیں یوم الاحباب
غرض آنکھوں کا کوئی رخ نہیں بے کار و قبیح — ہو تو دنیا ہے، نہ ہو گر تو نہ ز ہے یوم حساب

حضرت حکیم الاسلامؒ نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کے وفور علم اور پرواز خیال نے آنکھ کے ایسے نظارے کرائے ہیں جو دیدہ وروں کے بھی خواب وخیال میں نہیں آتے۔ دیکھنا تو درکنار لیکن کہانی کا رنگ یہی ایک نہیں بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ کہاں ہفت رنگ اور قوس قزح ہے تو بے جا نہ ہوگا۔

اس ''آنکھ کی کہانی'' کا آغاز قدیم شعرا کی طرز پر حمد ونعت سے ہوا ہے۔ اس میں بھی شاعر نے خوب

خوب مضمون باندھے ہیں اور طبعِ رسانے، دیدہ زیب گلکاریاں کی ہیں، حمد کا پہلا شعر ہے۔ سماعت فرمائیے:

مستحق حمد و ثنا کا ہے خدائے وہاب جس نے دی آنکھ ہمیں آنکھ کو دی نور سے آب

حمد کے بعد نعت پاک کے اشعار ہیں وہ بھی اپنے رنگ میں منفرد اور آنکھ کی رعایت سے پاکیزہ مضامین سے صاف وشفاف کہ آنکھ نہ ٹکے، دو شعر آپ بھی سن لیں، کیا خوب نعت کے اشعار ہیں:

نعت و توصیف ہے اسی ذات مقدس کیلئے دل کی بند آنکھ کے جس ذات نے کھولے ابواب

ختم جس ذات پہ ہے عین نبوت کا کمال خوشہ چیں جن کے ہیں انسان و ملک اور دواب

حمد و نعت کے بعد حکیم الاسلامؒ نے صحابۂ کرام کی مدح و منقبت میں چند اشعار کہے ہیں اور قرآنی ترتیب کا تقاضا بھی یہی تھا۔ اس کو اگر حکیم الاسلامؒ نہ پورا کرتے تو کون کرتا؟ جس درجہ میں جس کی محبت ہونی چاہئے اور جس طرح محبت کا اظہار ہونا چاہئے، حکیم الاسلامؒ کے اشعار میں آداب و محبت کے وہ سب رموز پائے جاتے ہیں۔ مدح وثنا کا پہلا ہی شعر دل و دماغ کے تاروں کو چھیڑ دیتا ہے اور سامع پر صحابۂ کرام کی عظمت کا سکہ بیٹھ جاتا ہے۔ سماعت فرمائیے:

مدح اعلیٰ کے ہیں حقدار وہ اصحاب نبی عقل کو آنکھ ملی جن سے بآیاتِ کتاب

اشعار تو ایک سے بڑھ کر ایک، کسی پر نہ انگشت نمائی کی گنجائش اور نہ آنکھ دکھانے کی مجال، ہاں ہر شعر دل میں بسانے کے قابل اور آنکھوں میں کھپ جانے والا۔ دیکھئے کیا شعر کہا ہے:

جو ہیں امت کے لئے علم وعمل کا معیار راہ بینا کی ہے، ان ہی کے رسوم و آداب

آنکھ ان کی تھی، نظر ان کی، بصیرت ان کی ان کے آثار سے روشن ہیں بیوت و ابواب

حمد و نعت اور مدارج صحابہ کے بعد متعدد عنوانات کے تحت بصیرت افروز مضامین کی جھڑی نظر آتی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سلسلہ عالم ناسوت سے نہیں کسی اور جہان سے ہے۔ کہاں تک تفصیل بیان کیجئے۔ صرف عنوانات سنا دیئے جائیں تو غواص معانی کی جودت طبع کا اندازہ ہو جائے۔ لیجئے عناوین سن لیجئے اور شاعر کی طبع رسا کی داد دیجئے۔

آنکھ کی اہمیت، آنکھ کی افادیت، آنکھ کی افادیت کے مختلف پہلو، آنکھ کے جامع مقامات، آنکھ کی اصلی اور سابقہ کیفیت، آنکھوں میں تغیر، تلاش علاج، معالجہ کا آغاز، معالجہ کی کیفیت، تعمیر نو، انکشاف عالم خواب، نتیجۂ علاج، سپر یئر اور احتیاط کی بندشیں، تسلی اور اطمینان دہانی، معاون کریم، شکریہ اور دعاء نتیجہ اور خاتمۂ کلام، تتمۂ کلام اور چشمۂ صافی۔ یہ عناوین آنکھ کی کہانی حصہ اول کے تھے۔

کہانی کا دوسرا حصہ بھی ہے، اس کا آغاز بھی حسب سابق حمد سے ہوا ہے، اس میں بھی متعدد عناوین ہیں اس حصہ میں بھی رنگ و آہنگ وہی ہے، وہی قافیہ، مضامین کی ندرت، روانی و برجستگی اور بندش کی خوبیاں، کہیں نہ کوئی جھول اور نہ آورد کا شبہ، عنوانات بھی جداگانہ، ذرا سنئے توسہی، عناوین یہ ہیں۔

حمد الٰہی، ربوبیت کا مقام، ربوبیت مستجمع صفات ہے، ربوبیت اور رحمت، ربوبیت اور مالکیت، ربوبیت اور قہر، ربوبیت اور حفظ ونصرت، ربوبیت اور غناء وعطا، ربوبیت اور صمدیت، ربوبیت اور حلم، ربوبیت کا منشاء معرفت ہے۔ ہر انقلاب مال پر رب کا سوال، ربوبیت کی جامعیت، حمد جامع اعتراف ربوبیت ہی سے ممکن ہے۔ حمد ذات وصفات کی ترتیب ربوبیت ہی سے قائم ہے، توحید ربوبیت، ربوبیت مجازی ـــــ اس عنوان کے تحت بارہ عنوانات ہیں۔ اسی طرح ''نعت رسالت پناہی'' کے تحت آٹھ عناوین ہیں۔ نعت کے بعد دوسری آنکھ کے آپریشن کی نوبت آگئی، اس کی کہانی تمہید سے شروع ہوتی ہے اور ۳۵ عناوین میں کہانی مکمل ہوجاتی ہے۔ دونوں حصوں میں سات سو اشعار ہیں، دائیں آنکھ کے آپریشن کے موقعہ پر جو اشعار موزون ہوئے تھے، کون سوچ سکتا تھا کہ دو سال کے بعد بائیں آنکھ کے آپریشن پر نئے مضامین نئی سج دھج کے ساتھ اتنے ہی اشعار پر مشتمل مزید موزوں ہوجائیں گے۔ اس کی حیرت انگیزی پر کس کو شبہ ہوسکتا ہے، یکساں حالات کے باوجود اشعار بالکل نئے مضامین کے ساتھ اپنی داد لینے کے لئے منظر عام پر، ایک ایک شعر کے محاسن کہاں تک گنائے جائیں، اشعار سے لطف اندوزی کا تعلق تو سننے اور پڑھنے سے ہے، خواہ یہ ''اسلام کی روانی'' کے اشعار ہوں یا ''آنکھ کی کہانی'' کے، جس عنوان کے تحت بھی نظمیں لکھی گئی ہیں وہ اردو ادب وشاعری میں وقیع اضافہ ہیں کیوں کہ ان تمام نظموں کا تعلق تخیلات سے نہیں واردات وتاثرات سے ہے، مجموعۂ کلام میں ستاون عناوین کے تحت نظمیں جمع کی گئی ہیں۔ ان میں قند پارسی کی چاشنی بھی ہے اور عربی کا زور بیان بھی، طویل نعت کے بعد ''بارگاہِ نبوت میں فریاد'' کے جو فریادی اشعار ہیں، اس کا ہر شعر اضطراب قلب اور سوز دروں کا آئینہ دار ہے، محسوس ہوتا ہے کہ امت کا حال زبوں دیکھ کر شاعر کا دل پارہ پارہ ہے اور اس نے جگر لخت لخت کو نظم کے قالب میں ڈھال دیا ہے، فریاد میں شاعر نے پہلے فخر موجودات ﷺ کے اوصاف عالیہ اور رفعت ومنزلت کو خطاب کیا ہے اور پھر بند کا یہ شعر اس خطاب کے بعد مدعا کا آئینہ ہے، ملاحظہ فرمائیے۔

بنگر سوئے امت شکستہ جاں باختہ، دل بجاں گستہ

جی چاہتا ہے کہ فریاد کے آخری بند کے چند اشعار جو فریاد کی روح اور قلب حزیں کا مظہر ہیں پیش کر

دیئے جائیں۔ سماعت فرمائیے:

چشمے بمن گدائے خستہ　　　گوشے بصدائے دل گرفتہ
چشم و جگر و دل و دماغم　　　مام کدۂ بہار رفتہ
آں رشتۂ کہ رشتۂ خدا بود　　　حسرت کہ زدست قوم رستہ
قسمت کہ شد است پارہ پارہ　　　شیرازۂ دیں کہ بود بستہ
سلکے کہ ز درّ آبگوں بود　　　اے آہ کنوں ز سنگ سفتہ
کوشے کہ زمحدثات و بدعات　　　مخلوط کنیم دین شستہ

فریاد کا آخری شعر ہے:

برخیز کہ خالی انجمن شد　　　بے برگ و ثمر ہمہ چمن شد

کہنا چاہئے کہ شاعر نے اپنا دل وجگر نکال کر رکھ دیا ہے اور بارگاہِ رسالت پناہی میں عقیدت کے پھول ہی نچھاور نہیں کئے ہیں بلکہ امت کی کس مپرسی پیش کر کے سفینۂ ملت کو ساحل سے ہمکنار کرنے کی فریاد کی ہے۔ خواجہ الطاف حسین حالی نے اپنا دردِ دل ہندی ساز پر چھیڑا ہے تو حضرت حکیم الاسلامؒ نے فارسی کی شیرینی میں اپنا درد گھول دیا ہے۔ دونوں بزرگوں کی فریادیں آمنے سامنے رکھ کر پڑھئے تو قلب و جگر پر عجیب کیفیت طاری ہوتی ہے۔

اے خاصۂ خاصاں رُسل وقت دعا ہے　　　امت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے

یہ درد وغم، سوز وگداز اور دل ربودگی ان مرثیوں میں بھی ہے جو حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ اور دیگر بزرگوں کی وفات پر لکھے گئے ہیں، کہاں تک ایک ایک نظم کا تعارف کرائیے اور اشعار کی داد دیجئے، ہر نظم اس کی متقاضی ہے کہ اس کو پڑھا جائے اور ہر شعر ایسا کہ اس پر سر دھنا جائے، مجموعہ کلام کی ضخامت ۲۸۰ صفحات ہے، آخر میں عربی کلام ہے، ہے تو مختصر لیکن عربی پر عبور وقدرت کا مظہر ہے، پہلی نظم فکاہیہ ہے، پہلا مصرعہ عربی میں ہے اور دوسرے مصرع کا قافیہ اردو ہے، نظم بھی ماشاء اللہ طویل سو اشعار پر مشتمل ہے، خاصی دلچسپ اور حکیمانہ مضامین سے معمور ومرصع، دو ایک شعر ضیافت طبع کے لئے حاضر ہیں، سنئے اور لطف اٹھائیے:

الا یا صدیقی اترك الدهر کلّه　　　فان متاع الدهر لعوق و بوکس
و ماهی الا زینة ذاتُ کدرةٍ　　　و قشر بلا لب و قصبٌ بلا رس

دوسری طویل نظم مشاہیر امت کے عنوان سے ہے، اس میں مشاہرین کا مختصر ترین تعارف، نہایت بلیغ

انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ مشاہیر بالترتیب یہ ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ، اخلاق وعلم نبوت اور علم انساب ہیں۔ حضرت عمرؓ شدت دین میں، حضرت عثمانؓ صفتِ حیاء میں، حضرت علیؓ علم و قضا میں، حضرت ابوذر غفاریؓ حق گوئی میں، حضرت ابوعبیدہ امانت داری میں، حضرت خالد بن ولیدؓ شجاعت میں، حضرت ابی بن کعبؓ علم تجوید وقرأت میں، حضرت عبداللہ بن عباسؓ علم تفسیر میں حضرت زید بن ثابتؓ علم فرائض میں، حضرت حسن بصریؒ وعظ میں، حضرت وہب بن منبہؒ علم قصص وتاریخ میں، حضرت محمد بن سیرینؒ علم تعبیر رویا میں، حضرت جنید بغدادیؒ علم تصوف میں، حضرت فضیل بن عیاضؒ علم معرفت میں، حضرت نافع مدنیؒ علم قرأت میں، حضرت مقاتل بن سلیمان علم تاویل القرآن میں، محمد بن السائب کلبی علم القصص میں، امام اعظم ابوحنیفہؒ علم الفقہ میں، امام شافعیؒ علم معرفۃ الحدیث میں، امام مالکؒ علم الحدیث میں، امام احمد بن حنبل عمل بالسنۃ میں، حضرت علی بن المدینی علم معرفۃ العلل میں، حضرت محمد بن نصر علم الخلافیات میں، ابوالقاسم علم العوالی میں، ابن اسحاق علم المغازی میں، یحییٰ بن معین علم اسماء الرجال میں، امام بخاری علم نقد حدیث میں، ابن مندہ سیاحت میں، ابن حزم ظاہری فن ظواہر میں، ابوالحسن اشعری علم کلام میں، خطیب بغدادی علم اداء قرآن میں، محمد بن زکریا رازی علم طب میں، ابومحمد حریری فن ادب میں، حبیب الطائی علم الشعر میں، بختر علم تشبیہ میں، ابوالفرج اصبہانی علم محاضرۃ الادباء میں، قاضی فاضل صنعت انشاء میں، ابن نباتہ فن خطابت میں، اصمعی علم النوادر میں، سیبویہ علم النحو میں، خلیل بن احمد علم العروض میں، ابومحشر علم نجوم میں، علی بن ہلال صنعت خوش نویسی میں، شیخ بوعلی سینا فن منطق میں، ابوعلی جبائی صنعت اعتزال میں، موصلی اور معبد فن موسیقی میں، ابوالحسن کذاب صفت کذب میں، عطاء سلمی صفت بزدلی میں، اشعب طماع صفت طمع میں مادر صفت بخل میں۔

یہ وہ مشاہیر امت ہیں جن کو امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تحریر میں علم وفن کی تعیین کے ساتھ بیان کیا تھا۔ علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مشہور کتاب تاریخ الخلفاء میں ان مشاہیر کو بجنسہٖ نقل کر دیا ہے، حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ نے علامہ سیوطی کے بیان کو نہایت بلیغ انداز میں شعر کا جامہ پہنا دیا ہے۔

مشاہیر امت کے علاوہ دو نظمیں اور اسی مجموعہ میں شامل ہیں، حیرت ہے کہ شاعر گرامی مرتبت نے یہ عربی اشعار زمانۂ طالب علمی میں کہے ہیں جب وہ حماسہ پڑھ رہے تھے، ہاں حماسہ کے استاذ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی تھے جن کے ادب وشعر کا چرچا علمی حلقوں میں تو تھا ہی، عوام میں بھی ادبی مجلسوں کی صدائے بازگشت سنائی دیتی تھی تو آپ تینوں زبانوں میں شاعری کا لطف اٹھا چکے ہیں، محاسن شعری بھی آپ کی نظر میں ہوں گے لیکن جی چاہتا ہے کہ چند محاسن شعری کو اجاگر کر دیا جائے اور حسن کی داد دی جائے۔

شاعری کا ایک حسن سہل ممتنع ہے، اس کو کمالِ حسن بھی کہتے ہیں۔ لیجئے ایک شعر زبان پر آ گیا جو بلاغت کی بھی داد چاہتا ہے۔

آ گئی آنکھ تو کہتے ہیں کہ بیمار ہوئی　　اور نہ آئی تو سمجھتے ہیں صحیح و صواب

ذرا توجہ دیجئے تو استعارہ کی ہر قسم کے جلوے نظر آتے ہیں، استعارہ بالتصریح ہو یا استعارہ بالکنایہ، استعارۂ بلیغ ہو یا استعارۂ تمثیلیہ، استعارۂ عامیہ ہو یا استعارۂ عنادیہ، استعارۂ غریبہ ہو یا استعارہ وفاقیہ، سب کچھ مجموعہ کلام میں موجود۔ دیکھئے استعارہ بالتصریح کا شعر سامنے آیا اس کو کیسے نظر انداز کر دیا جائے۔

آنکھ نافذ ہے کتابوں میں مثال سوزن　　کیا تعجب ہے، کہیں گر کہ ہے آنکھ اہل کتاب

اسی طرح استخدام، تضاد، حسن تعلیل اور دیگر صنعتوں کے اشعار مجموعۂ کلام میں جابجا موجود ہیں، اہل فن نے ان کو بہ نظر استحسان دیکھا ہے اور مرور ایام کے ساتھ ان کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا جائے گا۔

ہاں اس شعری مجموعہ اور حضرت حکیم الاسلامؒ کی شاعری کا ایک اہم گوشہ تو رہا ہی جاتا ہے وہ ہے تصوف اور عرفان حقیقت، کوئی عنوان دیکھئے اس میں تصوف کی چاشنی ضرور ملے گی، حق بھی یہی تھا کہ مجاز کو حقیقت سے آشنا کر دیتے اور وہ حقائق جو پردۂ خفا میں تھے ان کی نقاب الٹ، سب کے روبرو کر دیتے، آخر تھے حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی کے خلیفۂ اجل، اس لئے جب تصوف کی جولان گاہ میں قدم رکھا تو گوئے سبقت لے گئے، عشق و محبت کے حدود و آداب کی پاسداری میں اسی تصوف اور عرفان حقیقت کا نتیجہ ہے، منصور نے انا الحق کا نعرہ بلند کیا تو کسی نے سبحانی ما اعظم شانی کہہ کر عشق کو بے حجاب کر دیا، حکیم الاسلامؒ نے اس راز داروں کو افشاء کرنے پر جن خیالات کا اظہار کیا ہے، وہی تصوف کی روح ہیں، دیکھئے حضرت حکیم الاسلام کے اشعار میں شریعت و تصوف دو جدا گانہ راستے نہیں۔ ایک ہی نظر آتے ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ تصوف شریعت سے جدا نہیں بلکہ اس کی آب و آبرو ہے، اب ذرا حضرت حکیم الاسلامؒ کے اشعار میں عشق و محبت کے حدود و آداب کی پاسداری ملاحظہ فرمائیے۔

اے نوا سنج انا الحق، ترا کہنا تھا بجا　　پر نہیں پاس ادب، عشق میں دعوی ہونا
ہے انا عشق میں اک راز درون پردہ　　پر نہیں راز کا حق، راز کا افشاء ہونا
عشق خوددار ہے خود راز درون عشاق　　عشق کی خامی و رسوائی ہے لب وا ہونا
شور برپا نہ ہو ہر ایک بلا ہو برسر　　یاں ہے برسر ہی ہنر، عیب ہے برپا ہونا
اپنے آپے میں خودی ہو تو خودی ہے ورنہ　　اپنے آپے سے گذرنا ہی ہے رسوا ہونا

انا الحق کے عنوان سے عشق ومحبت کے جو اسرار ورموز اور آداب سامنے آئے ہیں وہ نہ صرف تصوف کا پتہ دیتے ہیں بلکہ عرفان حقیقت کی سراغ رسانی بھی کرتے ہیں، یہ تو ایک نظم کے چند اشعار ہیں ''آنکھ کی کہانی''، میں بھی ایسے اشعار کی کمی نہیں ہے جن میں تو تصوف کا گہرا رنگ ہے اور شاعر نے اپنا مقصد زندگی نہایت سادگی سے بیان کیا ہے۔

مقصد زندگی ہے طاعت حق   نہ کہ فکر جہاں میں پڑنا

یہی ہے وہ تصوف جو حکیم الامتؒ کے فیض صحبت نے حکیم الاسلامؒ کے دامن علم کو آہ سحر گاہی سے آشنا کر دیا اور ہزاروں بندگانِ خدا نے اپنی عاقبت سنوار لی۔

مجموعۂ کلام کے تقاضے تو ابھی بہت ہیں لیکن کہاں تک سمع خراشی کیجیے، اسی پر اکتفا کرتے ہوئے دل مسرت سے لبریز ہے کہ حکیم الاسلامؒ کی صحبت اسی قدر بہت ہے۔

............❖............

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم

مولانا محمد حنیف صاحب ملیؒ
معہد ملت، مالیگاؤں

یہ عالم آب وگل دنیائے کون وفساد ہے۔ یہاں ہر آنے والا جانے کے لئے آتا ہے، حضرت الاستاذ حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کا حادثۂ وفات بالکل متوقع تھا۔ اخبارات اور دوستوں کے خطوط کے ذریعہ حضرتؒ کی صحت سے متعلق خبریں آنے لگیں تو دل نے بڑے اندیشے کے ساتھ یہ دھڑکا محسوس کیا، بالآخر وہ وقت آ ہی گیا کہ حضرت مہتمم صاحبؒ اپنے رب کے حضور پہنچ گئے۔

فان ما كنا نحذر قد وقع. جس کا ڈر تھا وہ ہو کر رہا۔

حضرت مہتمم صاحبؒ جس عظیم ترین منصب کے مالک اور اسلاف کے نمونۂ کامل تھے، آج نقطۂ نظر کا اختلاف رکھنے والوں کو بھی اس کا شدید اعتراف ہے، ان کی جدائی پر صدمہ برداشت کرنے والے دل اور اثر لینے والے ضمیر اس وقت تک اشکبار رہیں گے جب تک یہ حادثہ تازہ رہے گا۔ بلکہ حضرتؒ کی یاد ہر نازک موڑ اور ہر تقریب کے موقع پر خون کے آنسو رلائیگی۔ عمر عزیز کے اخیر حصہ میں جن دوستوں نے حضرت کو حریف بنا کر خوب خوب لکھا آج ان کی پشیمانی کا یہ حال ہے کہ **یالیتنی مت قبل هذا** کہہ کر غم غلط کر رہے ہیں، لیکن کیا کوئی نوشتۂ تقدیر بھی بدل سکتا ہے۔ ہمیں یقین اور اطمینان ہے کہ مہتمم صاحب نے ملت کی عظمتوں کے لئے جو خطوط عمل اور خدمت دین کے ان مٹ نقوش ثبت کئے ہیں۔ آج بظاہر اس کو نظر انداز کرنے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں، لیکن **اما ما ينفع الناس** کے حتمی فیصلہ کے مطابق ظلم اور ستم گر زمانہ کبھی نہیں مٹا سکتا، بلکہ چشم عالم ایک بار پھر وہ دلکش اور جلوہ افروز منظر دیکھے گا جو حضرت کے دورِ اہتمام کا اہم ترین کارنامہ ہے۔

خوش قسمتی سے اس فرومایہ راقم کو بھی حضرتؒ سے شاگردی کی نسبت حاصل ہے، اس نسبت پر تعزیت کے لئے حضرتؒ کے مکان دیوبند کو حاضری کا موقع بھی ملا۔ افسوس کہ کل تک حضرت کا سادہ مکان جو علوم ومعارف کے ساتھ انوار وتجلیات کا مرکز تھا اب وہاں سکوت سناٹا نظر آتا ہے، تاہم جب باپ کا علم بیٹے کو ازبر ہوتا ہے تو قدرت کے غیبی تصرفات اس امانت کے لئے نہ صرف نمودِ کامل بلکہ کامل حفاظت کا سامان بنتے ہیں، حضرتؒ نے اپنے خانوادہ میں علم ومعرفت کی جس شان سے تخم ریزی کی ہے، انشاءاللہ آئندہ بھی اس کے اثرات باقی رہیں گے، حضرت مولانا محمد سالم صاحب خلفِ اکبر ہیں، جو بلاشبہ اپنے والد کے سچے جانشین ہیں، حضرت مہتمم صاحبؒ کا وصال پوری ملت اسلامیہ کا وہ جانکاہ حادثہ ہے، جس پر ساری کائنات اشکبار ہے، وصال کے وقت موسم خوب گرم تھا، بارش کا نام ونشان بھی نہ تھا، وصال پر فلک ناصبور نے بھی آٹھ آٹھ آنسو بہائے، جسے تمام لوگوں نے محسوس کیا، حقیقت یہ ہے کہ حضرتؒ کے وصال سے علم ومعرفت کا آفتاب، کاروان فضل وکمال، امام علم وتقویٰ، امت کے مسائل کا گرہ کشا حکیم الاسلام اور ہمہ گیر انسانی اوصاف وکمالات کا پیکر اٹھ گیا، سچ ہے ؎

کہاں کہاں دلِ صد چاک اشک خوں روئے
دیا ہے داغ جدائی کا اک مسیحا نے

حضرت مہتمم صاحبؒ اپنے بزرگوں کی آخری نشانی تھے، وہ حکیم الامتؒ کے جانشین، علوم انور شاہ کے امین، امانت ومسلک دارالعلوم کے بیباک نقیب اور مذہب اسلام کے سچے ترجمان تھے۔ انھوں نے اپنی ذات سے نصف صدی تک طلبۂ علم کو فیضیاب کیا، وہ نہ صرف دارالعلوم کے باوقار اور موثر مہتمم تھے، بلکہ علوم شرعیہ کے مایۂ ناز مبلغ اور قابل فخر استاذ بھی تھے، علوم نبوت اور دارالعلوم کی خدمت یہی حضرتؒ کی زندگی کا روشن مشن تھا، مولانا کا صبر وشکیب، صبر ایوبی کا اعلیٰ نمونہ تھا۔ اپنے پرایوں کی بے وفائیاں اور طعن و تشنیع پر عمر کے آخری حصہ میں حضرتؒ نے صبر کے دامن کو ہاتھ سے جانے نہ دیا، انتقام لینا تو وہ جانتے ہی نہیں تھے، ان کی زبان ہر خورد وکلاں کی تعریف میں تر تھی۔ ان کی مجلسیں غیبت سے پاک ہوتی تھیں، ہنگامۂ دارالعلوم کے دوران جو کچھ ہوا، اسے حضرت ابتلاء سمجھ کر برداشت کرتے رہے لیکن اللہ رے صبر کہ کبھی کسی کے خلاف اپنی زبان سے کوئی ناشائستہ لفظ بھی استعمال نہیں کیا، مجھے مولانا ازہر شاہ صاحبؒ نے بتایا کہ جو لوگ حضرتؒ کی مخالفت میں سرگرم تھے، جب معافی طلب کرنے آئے تو حضرت نے بلا کسی تامل کے معاف کر دیا۔ مولانا منظور صاحب نعمانی جن کے فکر وقلم نے حضرت کے خلاف محاذ آرائی میں سب سے

نمایاں رول ادا کیا ہے اور سینکڑوں صفحات سیاہ کئے حضرت کو معافی نامہ لکھا تو اس پر حضرت نے فرمایا کہ مجھے آپکی ذات سے کوئی شکایت نہیں ہے، اس لئے معافی کا کیا سوال؟ حضرت مہتمم صاحبؒ نے مولانا منظور کے معافی نامہ کے جواب میں جو کچھ تحریر فرمایا اس سے اہل اللہ اور خاصانِ خدا کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ مہتمم صاحبؒ لکھتے ہیں ''اس عالم بے چارگی میں آپ کا مکتوب گرامی ملا، جسے میں اپنے لئے اور دارالعلوم کے لئے روحانی صحت مندی کی علامت سمجھتا ہوں، آں محترم نے معافی کے الفاظ لکھے ہیں، آں محترم سے زیادہ کون جانتا ہے کہ میں نے اپنے چھوٹوں کو بھی کبھی خطاوار نہیں سمجھا کہ ان کی زبان پر معافی کی بات آئے، معاملہ ہم میں سے کسی کی ذات کا نہیں، نہ معافی کا ہے بلکہ ہمارے اسلاف کی یادگار دارالعلوم کا ہے، ہم سب اپنی خطاؤں کی معافی اللہ سے مانگیں، دعا مانگیں، ہم سب کو توفیق نصیب ہو اور آخرت کی جوابدہی سے نجات ملے۔''

دارالعلوم دیوبند کا دور اہتمام اور انتہائی فرض شناسی اور چابک دستی کے ساتھ دارالعلوم کی ترقی مولاناؒ کی زندگی کا وہ عظیم کارنامہ ہے جسے وقت کا مورخ نمایاں اور سنہرے حرفوں سے لکھے گا۔ مولاناؒ کی استقامت پسند طبیعت نے یہ بتا دیا کہ صحرا کو چمن اور ویرانے کو مرغزار کس طرح بنایا جاتا ہے، وطن عزیز کا دورِ غلامی خصوصاً خود کفیل مدارس کے لئے ایک چیلنج تھا، انگریز کی شاطرانہ چالوں نے ارباب فکر ونظر علماء کے ہوش اڑا دیئے تھے، انگریز کی آخری کوشش تھی کہ مسلمانوں کو نہ صرف ان کی تہذیب بلکہ مقامات مقدسہ سے بھی دست بردار کر دیا جائے، چنانچہ آئے دن یہ مدارس حکومت کی ریشہ دوانیوں کا نشانہ بنتے رہے۔ پھر دارالعلوم دیوبند جو اُم المدارس ہے وہ انگریزوں کے دست بُرد سے کیسے محفوظ رہتا، اہل نظر جانتے ہیں کہ ۵۶ رسالہ دور اہتمام میں بڑے حوصلہ شکن حالات آئے، دارالعلوم کی خانہ تلاشی، کبھی پاکستانی طلبہ کی تحقیق، کبھی پاکستانی سراغ رساں مرکز کہہ کر بدنام کرنے کی کوشش اور کبھی مقامی شرپسندوں کی شرارت جیسے متعدد حربے غیروں کی طرف سے دارالعلوم کی عظمت کو تاراج کرنے کے لئے استعمال ہوتے رہے، مگر حضرت مہتمم صاحبؒ کا علم و تدبر ہر موڑ پر رنگ لایا۔ اور کسی حکومت وقت اور جماعتوں کو حضرتؒ نے دخل در معقولات کا کوئی موقعہ نہ دیا۔ ٹھیک اس وقت جب کہ پورے ملک میں انگریزوں کے خلاف الاؤ دہک رہا تھا، دار و گیر اور قید و بند کے گہرے بادل ملت اسلامیہ پر منڈلا رہے تھے، مہتمم صاحبؒ نے نزاکت کا احساس فرمایا اور دارالعلوم کے نظام تعلیم کو ذرا بھی متاثر نہیں ہونے دیا۔ اکابر علماء اور حضرت مدنیؒ کی مسلسل گرفتاری بھی دارالعلوم کے لئے ایک سخت ابتلاء تھی لیکن حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کی دور

بینی اور وقت شناسی نے دارالعلوم کی ہر طرح سے حفاظت فرمائی، آزادی مل جانے اور تقسیم ملک کے بعد جو دن آئے، وہ اور بھی زیادہ سنگین تھے، سارا ملک ہنگامۂ کشت وخون میں ڈوبا ہوا تھا، قوم وطن اور ذات کے نام پر جتنا زبردست قتل عام ہوا، اس کی تلخ یادیں آج بھی ذہنوں میں تازہ ہیں۔ لازمی طور پر اس کا سب سے زیادہ نشانہ مسلمان اور اسلامی آثار بنے، دارالعلوم جو ملت کی عظمت کا نشان اور پیام اسلامی کا ترجمان ہے اس کا بھی متاثر ہونا فطری تھا، لیکن خدا کی غیبی مدد نے حکیم الاسلام مولانا طیب صاحبؒ کو وہ حوصلہ بخشا کہ فرقہ پرست اور سپہ زور طاقتوں کے ہر حملے کو پسپا کر کے چھوڑا، دارالعلوم کی عظمت وتحفظ کی خاطر حضرتؒ نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا، جسے تذکرہ نگار حضرتؒ کے ذکر سے کبھی جدا نہیں کر سکتے، اس زمانہ میں پاکستان سے آنے والی امداد بلکہ اوقاف کی آمدنی کا مسئلہ بھی الجھ رہا تھا، وہ حضرتؒ ہی کی حکمت عملی تھی کہ امداد بحال ہوئی، اور حکومت ہند نے خود اسے ضروری اور ملک کی آبرو سمجھ کر بحال کیا، دارالعلوم خدانخواستہ جب گردش میں آئے گا تو اس ملت کو اس مردِ مجاہد اور پیر ودانا کی یاد خون کے آنسو رلائے گی۔

مولانا مرحوم اسلامی اقدار کے عظیم داعی، ملی روایات کے زبردست حامی تھے، انھوں نے ایک سکنڈ کے لئے بھی غیر اسلامی زندگی برداشت نہیں کی، ان کا فکر وقلم اور ان کی ظاہری اور معنوی توانائیاں طاغوتی تحریکات کے لئے آتش فشاں تھیں۔

قادیانیت، بہائیت، مغربیت اور نظریہ دو قرآن جیسے فتنے پاکستان میں سر اٹھا رہے تھے، تو مولاناؒ نے اپنے قلم گہر بار اور زبان فیض ترجمان سے ڈٹ کر مقابلہ کیا، بلکہ پسپا کر کے دم لیا، مولاناؒ کی ذات مسلک اعتدال کے لئے میزان عدل تھی، وہ کتاب وسنت کے خلاف ادنیٰ سی فروگذاشت برداشت نہیں کر سکتے تھے، مزاج انسانیت نواز تھا لیکن گروہِ باطل کے لئے وہ تیر پیکاں اور طوفان بکف تھے، رموز زمانہ کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر ہی حضرت نے زبان وقلم کا استعمال فرمایا۔ وہ اس شعر کی عمدہ اور عملی تصویر تھے ؎

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

میری طالب علمی کا زمانہ تھا، ۱۹۵۷ء میں محمود احمد عباسی نے اپنی کتاب خلافت ویزید کے ذریعہ یزید کو حق پرست ثابت کرتے ہوئے اس کی نسبت علماء دیوبند کی طرف کر دی۔ اور اس طرح مسلک دارالعلوم کو بدنام کرنے کی گھناؤنی سازش کی، اس فتنہ کو اس وقت کے زمانہ ساز اخبارات نے بھی خوب ہوا دی۔ اس لئے سب سے پہلے دیوبند کی سرزمین سے اس مرد حق آگاہ نے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور

مدرسہ کی مسجد میں، اساتذہ طلبہ اور معززین شہر کے ایک احتجاجی جلسہ کے ذریعہ اس ناپاک سازش کو بے نقاب فرمایا اور حکومت ہند سے مطالبہ کیا کہ اس کتاب کے ذریعہ مسلمانوں کے اندر انتشار اور بے چینی پیدا ہونے کا خطرہ ہے، اس لئے کتاب کی رائلٹی اور ناشر سب پر سخت ترین قانونی چارہ جوئی ہونی چاہئے، حکومت نے بروقت کتاب کو ضبط کر کے ملت کو بڑے انتشار سے بچالیا، پھر حضرت مہتمم صاحبؒ نے مسلک حق کی ترجمانی کے لئے انتہائی موثر، شگفتہ اور دلائل وحقائق سے معمور کتاب ''شہید اعظم و یزید'' لکھی جسے نہ صرف علماء بلکہ ارباب نظر نے خوب پسند کیا۔ یہ اقدام حضرت مہتمم صاحبؒ کی زندگی کا زریں کارنامہ ہے۔

دارالعلوم دیوبند کی عالمی مقبولیت کے ساتھ عالمی اسلامی یونیورسٹی بنانے میں حضرت مہتمم صاحبؒ نے جس بے جگری کے ساتھ جہاں گیر پیمانہ پر مختلف ممالک کا سفر کیا ہے، اسے کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور نہ حضرتؒ کے اس مخلصانہ کارنامہ کا دنیا کوئی بدل پیش کر سکتی ہے، حضرتؒ کے ان دوروں ہی کا نتیجہ ہے کہ دنیا کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں دارالعلوم کا روحانی فیض نہ پہنچا ہو۔ اور جہاں فضلاء دیوبند دین کے مختلف شعبوں میں نہایت اہم اور وقیع خدمت انجام نہ دے رہے ہوں۔ ہندوستان میں دینی مدارس کی تاریخ ایسے آفاقی اور ہمہ گیر طوفانی سفر کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے، اپنے اسلاف کی اس مقدس امانت کے لئے حضرت حکیم الاسلامؒ نے جوانی کی توانائی اور عہد پیری کا فکر وتجربہ سب کچھ قربان کر دیا اور دارالعلوم کی ترقی کے لئے ایسا بے لوث اہتمام کیا کہ لفظ مہتمم ان کے نام کا جزبن گیا۔

اب انھیں ڈھونڈ چراغِ رخ زیبا لے کر

حضرت مہتمم صاحبؒ کی سیاسی بصیرت کا رشتہ حضرت شیخ الہندؒ سے ملتا ہے، دارالعلوم جب کسی سیاسی مشکل میں گرفتار ہوا تو حضرتؒ نے اس کے لئے ہر امکانی کوشش فرمائی، حکومت کی طرف سے جب کبھی مسلم مسائل کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلی گئی یا مسلمانوں کے پرسنل مسائل میں حق تلفی کی گئی تو مہتمم صاحبؒ خاموش تماشائی نہیں بنے رہے چنانچہ مسلم اوقاف پر جب کبھی حکومت نے مشکوک نظر ڈالی تو حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ کی رفاقت میں حضرت حکیم الاسلامؒ نے بھی زبان وقلم سے اس کے خلاف جہاد کیا۔ پرسنل لاء بورڈ کا قیام اور اس کی صدارت کے ساتھ مولانا کا قلمی جہاد تو ان کی کتاب زندگی کا عہد آفریں باب ہے۔ ایوان حکومت سے لے کر ایک معمولی عہدہ دار کی زبان پر یہی تھا کہ بس ملک کے باسیوں کا سول کوڈ یکساں ہونا چاہئے، اس زہر آلود فکر کی پشت پر حکومت کا ہاتھ تھا۔ انتہاء یہ ہے کہ سرکاری مسلمانوں کی

زبان پر بھی بس یہی ورد تھا۔ ایسے نازک موقعہ پر عروس البلاد بمبئی میں ملک گیر پیمانہ پر مولانا نے بڑی جرأت وحکمت سے تمام مکتب فکر کے علماء، دانشور، تعلیم کے ماہر، ماہرین قانون اور سنجیدہ غیر مسلموں کی کانفرنس طلب کی اور بڑی شان بے نیازی کے ساتھ حکومت کو للکار کر فرمایا تھا کہ ''مسلمان اپنی زندگی سے دست بردار ہوسکتا ہے لیکن اپنے پرسنل لاء اور شریعت سے کسی وقت دست بردار نہیں ہوسکتا'' مولاناؒ کی بروقت رہنمائی اور صورِ اسرافیل نے ملت کے افراد میں ایسی گرمی پھونک دی کہ خواب غفلت میں پڑی ہوئی ملت بیدار ہوئی۔ نام نہاد مسلمانوں اور حکومت کو بھی بالآخر یہ کہنا پڑا کہ حکومت مسلم علماء کے بغیر مسلم پرسنل لاء میں ترمیم کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ پرسنل لاء بورڈ کا قیام اور اس کی کانفرنس جہادِ زندگانی میں مولانا کا وہ کارنامہ ہے جسے تاریخ بھلا نہیں سکتی، مولانا کی زندگی میں خدمات کا یہ وہ گوشہ ہے جس نے انہیں نہ صرف یہ کہ علماء کا نقیب بلکہ جامع اوصاف شخصیت کا مالک بنادیا ہے۔

حضرت مہتمم صاحبؒ اپنے علم وتقویٰ کے ساتھ حدیث میں بھی ایک خاص مقام رکھتے تھے، انھوں نے برسوں دیوبند میں رہ کر حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت مولانا محمد انور شاہؒ کے علوم کی اشاعت کی ہے۔ حدیث کے نکات، رموز واشارات، حقائق وحکم اور نکتہ آفرینی میں دست گاہ رکھتے تھے۔ پھر اندازِ بیان اس حقیقت آفرینی کے ساتھ سونے پر سہاگہ تھا۔ حدیث کی تشریح میں وہ بیک وقت متعدد توجیہ فرماتے تھے، جس سے ان کی بالغ نظری، نکتہ رسی اور ژرف نگاہی کا اندازہ ہوتا ہے۔ خدا نے ان کی زندگی میں اتنی برکت رکھی تھی کہ بیک وقت علماء کرام کی چھ چھ پشت کے استاذ تھے، ان سطروں کے راقم کو بھی ۱۹۵۹ء میں مسلسل ۳/ماہ حضرتؒ سے حدیث شریف پڑھنے کی سعادت حاصل ہے۔ ان کے فضل وکمال اور تفوقِ علمی کا یہ عالم تھا کہ ایک حدیث پر خوب شرح کے ساتھ گھنٹوں بحث فرماتے تھے، اگر اثناء درس کسی طالب علم نے کچھ دریافت کرلیا تو پھر حضرت کی موزوں اور عبقری اور ہمہ گیری طبیعت کی نکتہ آفرینی نہ پوچھئے، حضرتؒ کی زبان سے ایسے صدف پارے نکلتے تھے کہ بس سنتے رہئے اور سر دھنتے رہئے، موطا امام مالکؒ کے درس میں ''اشتکت النار الی ربھا'' اس حدیث پر حضرتؒ نے تقریباً دو گھنٹہ تقریر فرمائی، رفیق محترم مولانا عبدالحمید صاحب ازہری نے ایک خالص علمی سوال کیا۔ تو حضرتؒ نے پورے شرح وبسط کے ساتھ سائنسی نقطۂ نظر سے حدیث کے ایسے مخفی گوشوں کو بے نقاب کیا جس کا لطف آج بھی غور کرنے کے بعد نہیں جاتا مولاناؒ کی وہ پوری تقریر بعد میں ماہنامہ نقش دیوبند میں شائع ہوئی۔ بلاشبہ حکیم الاسلام اپنے جدّ امجد حجۃ الاسلام مولانا قاسم صاحب نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند کے علم لدنی کے جانشین تھے جس کی جھلکیاں ان کے

مواعظ حسنہ میں بکثرت دیکھی جاسکتی ہیں۔انھوں نے زبان وقلم سے دین کی سچی اور بے مثال خدمت کی ہے جیسا کہ ان کی سینکڑوں وقیع تصنیفات سے اندازہ ہوتا ہے۔اسی نکتہ آفرینی اور دقیقہ سنجی نے انہیں سارے عالم کے لئے حکیم الاسلام بنادیا۔خطابت ان کا خاص جوہر تھا جس میں ان کا کوئی مقابل نہ تھا۔ان کی زبان میں بلا کی کشش تھی۔حضرتؒ کی تقریر کیا تھی ایک جادو تھا جو دل ودماغ کو یکساں متاثر کرتا ہے۔ جملوں کی بندش، حکیمانہ اندازِ تفہیم،عربی فارسی اور اردو اشعار کا برمحل اور برجستگی سے استعمال، زبان کی شیرینی، حکایات وامثال کے ساتھ مقصد کی تشریح حضرت حکیم الاسلامؒ ہی کا حصہ تھا۔ پھر دریا کی روانی کی طرح حضرت پہروں تقریر کرتے لیکن کوئی اکتاہٹ نہیں محسوس ہوتی تھی۔ بلاشبہ سحبانِ وائل قُس بن ساعدہ جیسے ممتاز مقررین کا دور حضرت کی تقریر سے تازہ ہوجاتا تھا،حضرت نے مخالفتوں اور دشمنی کے ماحول میں جب تقریر کی تو مخالفتوں کا فسوں اور عداوتوں کا انداز بھی ٹوٹ گیا اور مخالفین نے بہر حال اعتراف کر ہی لیا کہ ایسے نامور افراد اور ممتاز ہستیاں صفحۂ دہر پر ہمیشہ پیدا نہیں ہوتیں۔حضرت کی جدائی ملت کا ناقابل تلافی نقصان ہے۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

حضرت کی خوردنوازی نے نہ جانے کتنوں کوشہرت کے آسمان ہفتم پر پہنچا دیا۔ان کی شرافت نفس تھی کہ ہم جیسے گمنام فرد مایہ طالب علم کو بھی اپنے قلم گہر بار سے نوازتے رہے۔اور اپنی زریں نصیحتوں سے سرفراز فرماتے رہے۔ان کی عظمت کا بڑا نشان یہ تھا کہ وہ چھوٹوں کو بھی بذریعہ خط مخاطب فرماتے تھے، وصال سے چند ہفتہ پہلے ۹ر رمضان کو حضرتؒ نے مجھے جو خط لکھا ہے اس پر میں اپنے مضمون کو ختم کررہا ہوں۔ملاحظہ ہو:

محترم ومکرم جناب مولانا محمد حنیف صاحب زیدکرمکم

سلام مسنون۔نیاز مقرون!

مزاج گرامی!

عرصے سے بیمار ہوں۔عدم اشتہاء کی وجہ سے غیر معمولی نقاہت وضعف بھی مستقل مرض بن گیا ہے۔ اس عرصہ میں مختلف علاج تبدیل کئے گئے،مگر معتدبہ فائدہ نہیں ہوا۔بحمد اللہ چند روز سے قدرے افاقہ ہے۔دعا کا طالب ہوں۔اس وقت دارالعلوم جامع مسجد کے لئے فراہمی چندہ کے سلسلے میں جناب مولانا محمد یحییٰ صاحب صاحبزادے حضرت مولانا عبدالحق صاحب مدنیؒ آپ کی خدمت میں حاضر ہورہے ہیں۔

موصوف کے لئے مناسب قیام کا انتظام فرمادیں اور اصل مقصد میں مکمل تعاون اور رہنمائی فرمائیں۔ چونکہ بے سروسامانی کے عالم میں یہ نظام قائم کیا گیا ہے، ہر ایک ضرورت کی چیز از سرنو مہیا کی جارہی ہے۔ اس لئے کثیر سرمایہ کی ضرورت ہے، اور آپ سے خصوصی توجہ اور تعاون کی درخواست ہے۔ امید کہ مزاج سامی بعافیت ہوگا۔ ماہِ مبارک کی دعاؤں میں ضرور یاد رکھیں۔

والسلام

محمد طیب

۹؍ رمضان المبارک ۱۴۰۳ھ

بہر حال مہتمم صاحبؒ کا وصال پوری ملت کے لئے نا قابل تلافی سانحہ ہے بظاہر آج مولانا ہمارے درمیان نہیں رہے لیکن وہ اپنی زریں خدمات، روشن کارنامے، والہانہ سرفروشی، اور نا قابل تسخیر اخلاق و عادات کے ساتھ امر ہیں۔ اور قیامت تک رہیں گے۔ ہمارے لئے ان کی زندگی پیغام فکر و عمل اور تاریخ دعوت وعزیمت ہے۔ ہماری دعا ہے کہ مولیٰ کریم حضرتؒ کو ان کی بے لوث خدمات کا عظیم ترین صلہ دے۔ اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین

............❖............

الوداع

حضرت حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ

مولانا مفتی محمد اشرف سعودی
مہتمم سبیل الرشاد، بنگلور

اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے، جس نے ہمیں پریشان کن حالات میں اِسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ کا حکم دیا اور اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ. کی بشارت سنا کر ہماری ڈھارس بندھائی۔

درود وسلام ہو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جو خاتم النّبیین ہیں۔ رحمۃ اللعالمین بھی اور بالمومنین رؤف رحیم بھی کہ آپ نے صاحبزادہ حضرت ابراہیم کے انتقال پُر ملال پر اِنَّا بِفِرَاقِكَ يا اِبْرَاهِيْمَ لَمَحْزُوْنُوْنَ (ابراہیم! ہم تمھاری جدائی سے غمگین ہیں) فرمایا کہ ضعفاء امت کو تھاما۔ سہولت وآسانی کی راہ پیدا کی اور تسلی خاطر اور اطمینانِ قلب کا نسخۂ کیمیا عطا فرمایا۔

ہم اس عظیم المناک حادثے پر جو بتاریخ ۶ رشوال ۱۴۰۳ھ مطابق ۱۷ر جولائی ۱۹۸۳ء بروز یکشنبہ صبح گیارہ بج کر دس منٹ پر حکیم الاسلام حضرت علامہ مولانا محمد طیبؒ کی وفات حسرت آیات کی شکل میں پیش آیا۔ خدائے رحمٰن ورحیم سے توفیق صبر مانگتے ہیں اور اسوۂ حسنہ کا اتباع کرتے ہوئے حضرت حکیم الاسلام ہی سے اپنا صدمۂ فراق بیان کرتے ہیں۔

حضرت والا! کیسے یقین کرلیں کہ آپ نے ہم نیازمندوں سے منھ پھیرلیا۔ نورِ معرفت سے روشن اور تابناک آنکھیں بند فرمالیں، علم وحکمت کے موتی برسانے والی زبان پر مہر سکوت ثبت فرمادی۔ ہمارے سروں پر سے اپنا دستِ شفقت اٹھالیا۔ اپنے الطاف وعنایات کا وسیع دامن سمیٹ لیا۔ ہم سے کنارہ کشی

اختیار فرمالی۔ گوشہ تنہائی آپ کو پسند آ گیا۔ اور بڑی خاموشی کے ساتھ آپ ہماری مشتاق اور بے چین نگاہوں سے مستور ہوگئے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ. اَنْتُمْ لَنَا سَلَفٌ وَنَحْنُ لَكُمْ خَلَفٌ وَاِنَّا اِنْ شَآءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَاحِقُوْنَ.

حکیم الاسلامؒ! آپ علم وحکمت کا چمکتا ہوا چاند تھے، جس کی خنک اور ٹھنڈی چاندنی ہزاروں کے لیے وجہ سکون اور سامانِ قرار تھی۔ کسی بھی محفل میں آپ قدم رنجہ فرماتے تو واقعی ایسا محسوس ہوتا کہ ماہتاب علم وحکمت طلوع کر رہا ہے، چادرِ مہتاب پھیلتی چلی جارہی ہے اور دل ودماغ سکون وطمانیت کی ایسی لطیف کیفیات سے آسودہ ہوتے چلے جاتے جن کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا، اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ آپ حکیم الاسلام تھے، خطیب الاسلام تھے، فخر الاماثل تھے، زبدۃ الافاضل تھے۔ عظیم المرتبت تھے، رفیع المنزلت تھے، رئیس المتکلّمین تھے، سلطان الواعظین تھے، میرِ کارواں تھے، پیرِ رہرواں تھے، سالارِ قافلہ تھے، سرخیل طائفہ تھے، یادگارِ سلف تھے، تاجدارِ خلف تھے، بزرگوں کی آبرو تھے، خردوں کی آرزو تھے، چشم و چراغِ خاندان قاسمی تھے، گل سرسبدِ چمنستانِ تھانویؒ تھے، ملتِ اسلامیہ کی شان تھے، جماعتِ علماء کی آن تھے۔ اللہ رب العزت نے آپ کو اتنے اوصافِ عالیہ سے نوازا تھا، اور آپ کی ذات بابرکات میں اتنے کمالات ودیعت فرمادیے تھے کہ ہر خطاب آپؒ پر جچتا تھا اور ہر لقب آپ کی کلاہِ افتخار میں نگینے کی طرح جڑ جاتا تھا۔

بطلِ جلیل: لوگ کہتے ہیں کہ آپؒ بڑے نرم مزاج اور نرم گفتار تھے۔ اس میں کیا شک ہے؟ یہ امر واقعہ ہے کہ آپ خلق ومروت، تواضع وانکساری، حلم وبردباری اور نرم روی ونرم گفتاری کا حسین وجمیل پیکر تھے۔ جو بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا وہ آپ کی خوش اخلاقی وخوش گفتاری کی لطیف شبنم میں ضرور بھیگا۔ لیکن اس نرم دم گفتگو سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ آپ گرم دم جستجو نہیں تھے۔ آپ کی یک رخی اور غلط تصویر کشی ہوگی۔ بے وقت کا راگ چھیڑنا، بے محل شور مچانا اور خواہ مخواہ کی زور آزمائیوں میں لگنا یقیناً آپ کا وطیرہ اور شیوہ نہیں رہا، لیکن وقت پڑنے پر آپ نے جس جرأت وہمت، بے باکی وبے خوفی، حمیتِ ملی، غیرتِ قومی، جوشِ اسلامی اور جلالِ ایمانی کا اظہار فرمایا وہ اس بات کا بین ثبوت تھا کہ آپ اپنے نرم قالب میں ولولوں اور حوصلوں سے بھرپور اور بڑا مضبوط اور قوی قلب رکھتے تھے اور رزم گاہِ حق وابطال میں بے دریغ نبرد آزما ہوسکتے تھے چناں چہ تحفظِ دین وشریعت کے سلسلہ میں حکومتِ وقت کے خلاف سب سے پہلے آپ ہی نے آواز بلند کی اور پھر آپ ہی کی زیرِ صدارت بمبئی میں آل انڈیا مسلم پرسنل لاء کنونشن عظیم الشان پیمانے پر منعقد ہوا، کرسی صدارت پر رونق افروز ہوکر آپ نے جو معرکۃ الآراء خطبہ دیا اور اربابِ اقتدار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر

جس واشگاف انداز میں گفتگو فرمائی وہ بے مثال لازوال اور آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔

آپؒ نے کس بلند آہنگی کے ساتھ فرمایا:

''آج پرسنل لاء کے نام پر ان تبدیلیوں کا مواد بنام اصلاح و ترمیم پیش کیا جارہا ہے یہ اصلاح اسی قسم کی ہے جسے قرنِ اوّل کے منافقین اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ کے نعرے کے ساتھ لے کھڑے ہوئے تھے۔ لیکن عالم الغیب والشہادۃ نے کھلا اعلان فرما دیا: اَلَا اِنَّھُمْ ھُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰکِنْ لَّا یَشْعُرُوْنَ''۔

مجھے اس وقت ایک سخت لفظ کہنے پر معاف کیجئے کہ وہ سماج کتنا دیوث ہے جو لاکھوں ماؤں بہنوں بیٹیوں کو بازار میں بیٹھنے کی اجازت دیتا ہے اور چار شادیوں کی محض اجازت اور وہ بھی خاص شرائط عدل و دیانت سے مشروط اجازت پر اعتراض کرتا ہے۔

جس ملک میں راتوں کے کلب ہوں۔ مادرِ وطن کی بیٹیوں کے بدن سے عفت و عصمت کا لباس رات بھرا تار کر تار تار کیا جارہا ہو اور خدا کے غضب سے حکومت اور سماج بے نیاز ہو۔ ایسے ملک کے چند ایسے سر پھرے مصلحین کو مسلم پرسنل لاء کے بارے میں کچھ کہنے سے پہلے سو بار خود شرمانا چاہیے تھا جنھیں بے شرم سماج کو ٹوکنے تک کی بھی ہمت نہیں۔ ان میں اسلام کے فطری اور اعلیٰ و ارفع قانون عصمت پر حرف زنی کرنے کی ہمت آخر کہاں سے پیدا ہوئی''۔

بہر حال نعرہ زنوں کا انداز قد ہر لباس میں عریاں ہے، خواہ وہ آئین کا لباس پہن کر آئیں یا سماج اور معاشرہ کی اصلاح کا۔ لیکن اگر ان میں سے کوئی فرد دینِ خداوندی میں ترمیم و تبدیلی کا نعرہ بزعم خود کوئی اصولی بات سمجھ کر لگا رہا ہے تو میں اس اجتماع کے موقع پر اپنے تمام علماء کرام اور دانشورانِ محترم کی طرف سے یہ اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ ہم اپنے اس عقیدے پر اٹل ہیں کہ جس طرح خدائے بزرگ و برتر نے اپنے نظامِ خلق کو اپنی سچی فطرت پر قائم کیا ہے جس میں تبدیلی ناممکن ہے کہ لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰہِ اسی طرح اس نے اپنے نظامِ امر کو بھی جس کا نام دین ہے، اپنی فطرت کی اساس پر قائم کیا ہے، اس لیے اس میں تبدیلی ممکن نہیں۔ لَا تَبْدِیْلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰہِ'' یہ قانونِ فطرت ہے اور فطرت تبدیل نہیں ہوسکتی، اگر کوئی زمین، آسمان چاند سورج اور کواکب و نجوم کو نہیں بدل سکتا۔ صرف اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے تو دین کے کلیات و جزئیات، احکام و آداب، اخلاق و عقائد، معاملات و معاشرت اور اجتماعی قوانین تک کی فطری حدود کو نہیں بدل سکتا۔ وہ صرف فائدہ اٹھانے کے لیے اتارے گئے ہیں۔ بدلنے کے لیے نہیں لائے گئے۔ بدلنے کی جب بھی سعی لاحاصل کی جائے گی تو خدائی حدود تو اپنی جگہ قائم رہیں گی لیکن بدلنے والوں کے حق میں سماج

کا ڈھانچہ بکھر کر غلاظتوں اور گناہوں کا ڈھیر ہو جائے گا۔

علامہ اقبالؒ نے ایسے ہی موقع کے لیے فرمایا تھا ؂

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

میر کارواں! آپ سے زیادہ کون اس حقیقت کو جانے گا کہ علم کا راستہ کتنا کٹھن اور دشوار ہوتا ہے، اس میں کیسی خطرناک گھاٹیاں آتی ہیں، کیسے بھیانک موڑ ملتے ہیں اور کیسے خوف ناک مرحلے درپیش ہوتے ہیں۔ قدم قدم مشکلات ومصائب سدِ راہ بنتے ہیں اور جگہ جگہ عوارض وموانع کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ سفر بڑا صبر آزما اور بہت تھکا دینے والا ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر اور اولوالعزم پیغمبر نے علم ہی کا راستہ طے کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ ''اس سفر میں تو ہم بہت تھک گئے'' لَقَدْ لَقِيْنَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا. (الکہف)

سفر کی یہی دشواریاں اور راستے کے یہی پیچ وخم ہیں جن سے گھبرا کر بہت سے عازمین سفر پہلے ہی قدم پر ارادۂ سفر ترک کر دیتے ہیں، بعض کچھ آگے بڑھتے ہیں لیکن تھوڑا ہی فاصلہ طے کر کے ہمت ہار جاتے ہیں۔ بہت کم ہی جیالے اور سورما ایسے ہوتے ہیں جو مشکلاتِ راہ سے بے پرواہ آگے اور آگے چلے جاتے ہیں۔ لیلائے علم کی دُھن انھیں مسلسل رہ نوردی اور دشت پیمائی پر مجبور کرتی رہتی ہیں۔ اور جب تک وہ عروس علم سے ہم کنار نہیں ہو جاتے، سراپا اضطراب اور مجسم حرکت بنے رہتے ہیں۔

زعیم العلم! آپؒ ان ہی جیالوں اور سورماؤں کے رہبر وقائد تھے، آپؒ نے اپنے لیے اسی دشوار گذار اور صبر آزما راستے کا انتخاب فرمایا اور رَبِّ یَسِّرْ کہہ کر اس پر قدم رکھا تو پھر رکنے کا نام نہیں لیا۔ میدانِ علم میں بڑھے تو بڑھتے ہی چلے گئے اور کوہِ علم پر چڑھے تو چڑھتے ہی چلے گئے۔ آپؒ زندگی بھر جادۂ علم کے نشیب وفراز کو ہموار کرنے اور اس کے جھاڑ جھنکاڑ کو گل وگلزار بنانے میں لگے رہے۔ آپ نے اسی سنگلاخ راستے پر ایسے لالہ وسوسن اُگائے اور نسرین ونسترن کھلائے جو فردوسِ نظر بنے۔ ایسی دلنواز لے چھیڑی جو جنت گوش بنی اور علم کے متوالوں کو ایسی شرابِ طہور پلائی کہ دل ودماغ کیف وسرور کی ایک نئی دنیا سے آشنا ہوئے اور رہروانِ علم کو پتہ بھی نہ چلا کہ منزل مقصود نے کب ان کے قدم چوم لیے۔

لیکن کیا معلوم تھا کہ جن کے لیے آپ نے یہ سب کچھ کیا جن کے لیے آپ نے اپنے دھن کی بازی لگا دی، جنھوں نے آپؒ سے بہت کچھ پایا۔ آپؒ کا نام لے کر اور آپ کی نسبت بتا کر اپنی دینی ودنیوی حیثیت بنائی۔ آپؒ کے روبرو زانوئے تلمذ تہ کیا۔ آپ کے دستِ مبارک سے اپنے سروں پر دستارِ فضیلت

بندھوائی، اپنی کتابوں پر آپ سے تقریظیں لکھوائیں، آپؒ کی شیریں بیانی سے اپنے جلسوں کی رونق بڑھائی، وہی آپؒ کے خلاف طوفان اٹھائیں گے، جاں گداز آوازے اور روح فرسا طعنے کسیں گے، مخالفتوں، ایذا رسانیوں، دشنام طرازیوں اور الزام تراشیوں کا ایسا شیطانی چکر چلائیں گے کہ چشم فلک حیران، اخلاق و آداب شرمسار اور تہذیب و شائستگی آب آب ہو کر رہ جائیں اور اس طرح گویا حق وفاداری ادا کریں گے۔ شیخ سعدیؒ نے بہت پہلے کہا تھا ؎

یا وفا خود نبود در عالم — یا مگر کس دریں زمانہ نکرد

کس نیاموخت علم تیر از من — کہ مرا عاقبت نشانہ نکرد

عزیمت پناہ! آپ کے دورِ ضعیفی اور پیرانہ سالی میں ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ آپ کو سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا، آپ کے لیے دیدہ و دل فرشِ راہ کیے جاتے۔ آپ کی طویل اور زریں خدمات کا بھرپور اعتراف کیا جاتا۔ عقیدت و محبت کے پُر خلوص نذرانے پیش کیے جاتے اور اعزاز و اکرام کے بلند ترین منصب پر آپ کو فائز کیا جاتا۔ اس کے برخلاف ناشکری، ناسپاسی اور احسان ناشناسی کے ایسے نفرت انگیز نظارے دکھائے گئے اور دنائتِ طبعی اور خستِ جبلی کے ایسے مکروہ مظاہرے کیے گئے کہ نبض عالم تھم تھم گئی لیکن آفریں ہے آپ کی ہمت مردانہ پر کہ ایک طرف تن تنہا آپ کی نحیف و نزار ذات اور دوسری طرف ہر قسم کے اسلحوں اور ہتھیاروں سے لیس بھیانک لشکر لیکن آپ نے سپر نہیں ڈالی، ہار نہیں مانی، جان سے جانا گوارا فرمالیا لیکن آن نہیں چھوڑی، بلاشبہ آپ نے عین میدانِ جنگ میں جان دی ہے اور علم کے راستے میں آپ نے جام شہادت نوش فرمایا ہے۔

حکیم الاسلام! ہدیۂ مبارک باد قبول فرمائیے۔ آپ شہیدِ علم بنے، بیشک شہیدِ علم! ؎

جان ہی دیدی جگر نے آج پائے یار پر — عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا — ہر مدعی کے واسطے دارورسن کہاں

ممکن ہے کہ بعض نافہم بغلیں بجائیں اور ان کی کوتاہ بینی اور کم نگہی اس میں اپنی کامیابی کا سراب دیکھے لیکن دنیا جانتی ہے کہ سنگ ریزوں اور جواہر پاروں کا کوئی مقابلہ نہیں۔ بے قیمت پتھر سونے کے قیمتی پیالے کو چکنا چور کرسکتا ہے لیکن اس دنیا پر نہ پتھر قیمتی بن سکتا ہے اور نہ سونا بے قیمت، اسی کو جہاں دیدہ اور سرد و گرم چشیدہ سعدی نے کہا تھا ؎

سنگِ بدگوہر کاسۂ زریں شکند — قیمت سنگ نیفزائد و زر کم نشود

حلیم الطبع! آپ نے ٹھیک ہی کیا۔ آخر آپ کب تک ان حالات میں ہمارے درمیان رہتے۔ صبر

وتحمل کی بھی ایک حد ہوتی ہے اور جذبات، ضبط و برداشت بھی لامتناہی نہیں ہوتے، حلم وبُردباری کے پیالے کو ایک دن چھلکنا ہی تھا، وہ چھلکا اور آپ نے رختِ سفر باندھ لیا۔

فروغِ بزم! آپ کیا تشریف لے گئے، پوری محفل بے نور اور بے رونق ہوگئی، دانش وحکمت کا قصر درخشاں شب گزیدہ ہے اور اندھیروں کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ وہ عزت وآبرو داستانِ پارینہ بن گئی جو آپ کی رہینِ منت تھی۔ عظمت وقار اور تفوق و برتری کا وہ شاندار محل زمین بوس ہوگیا جو آپ کے دم قدم سے سرفراز تھا۔ آپ کی شان تو وہ تھی کہ جب آپ کسی علاقے کا سفر فرماتے تو یوں محسوس ہوتا جیسے کوئی فرمانروا اپنی قلم رو کا دورہ کر رہا ہے۔ اور آپ کے بعد اب نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے ع

پھرتے ہیں میرؔ خوار کوئی پوچھتا نہیں

علوم ومعارف کا لہلہاتا چمن خزاں رسیدہ ہے اور اپنے بوڑھے مالی کو رو رہا ہے، خوب صورت روشیں پامال اور دل کش کیاریاں خاک بسر ہیں۔ پتہ پتہ سوگوار اور ڈالی ڈالی بے قرار ہے، ہر غنچہ گریاں اور ہر پھول ماتم کناں ہے۔ گوشے گوشے سے سسکیوں کی آوازیں آرہی ہیں۔ آہوں کا دھواں اٹھ رہا ہے اور پوری فضا پر غبار الم چھاتا چلا جارہا ہے۔

لطیف المزاج! اب آپ دور پہنچ گئے، ناروا گستاخیوں اور بے جا جسارتوں سے بہت دور، ظالمانہ حملوں اور سنگ دلانہ یورشوں سے بہت پرے، حاسدوں اور معاندوں کی رسائی اب آپ کے حریمِ ناز تک نہیں ہوسکتی۔ اب آپ اطمینان وسکون کے ساتھ سور ہے ہیں اور دائمی راحت وآرام کے مزے لوٹ رہے ہیں۔ مبارک ہو آپ کو بستر گل اور پھولوں کی سیج۔ مبارک ہو آپ کو نومۃ العروس اور سکھ کی نیند، لیکن خدارا یہ بتائیے کہ آپ کے پسماندگان خصوصاً مولانا محمد سالم، مولانا محمد اسلم، مولانا محمد اعظم اور ہزاروں عقیدت مندوں اور ارادت مندوں کے سینوں میں آپ کے اس طرح چلے جانے سے حسرت ویاس کا جو گہرا داغ اور کاری زخم لگا وہ کیسے مٹے گا، وہ کیسے مٹے گا، وہ کیسے مٹے گا؟

ارحم الراحمین! حضرت حکیم الاسلامؒ کو پوری ملتِ اسلامیہ کی طرف سے بہترین جزا عطا فرما! ان کے درجات ومراتب کو بلند سے بلند فرما اور انھیں جنت الفردوس کا اعلیٰ مقام نصیب فرما۔ آمین ے

آسماں اس کی لحد پر شبنم افشانی کرے سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

............❖............

حضرت حکیم الاسلامؒ
شکوہِ ترکمانی، ذہنِ ہندی، نطقِ اعرابی کی حامل بے نظیر شخصیت

مولانا محمد اسجد قاسمی ندوی
جامعہ عربیہ، امدادیہ، مرادآباد

کیف علم اور سوزِ عشق کی جامعیت، در کفے جامِ شریعت در کفے سندانِ عشق کی مصداقیت، تعلیمی و تدریسی مشاغل اور انتظامی وانصرامی مصروفیات گویا پنبہ وآتش کو کمال توازن کے ساتھ اکٹھا کرنے اور تاعمر نبھاتے رہنے کی صلاحیت، جمالِ ظاہر اور حسن باطن کا دل کش اجتماع، اخلاق وکردار کی بے نظیر پاکیزگی اور وقار ومتانت، خطیبانہ جوہر بے مثال، حکیمانہ شانِ بلند۔

یہ ہیں چند روشن نقوش ہمارے ممدوح حکیم الاسلامؒ مولانا محمد طیب صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی شخصیت گرامی کے، جن کی زندگی کا ہر لمحہ خدمتِ علم دین کے لئے وقف تھا اور جو اپنی وفات کے بعد بھی اس طرح زندۂ جاوید ہیں بقول شاعر ؎

بندۂ آزاد را شانے دگر
مرگ او را می دہد جانے دگر

جامع کمالات ہستی

یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ جتنی علمی وعرفانی نسبتیں حضرت حکیم الاسلام قدس سرہٗ کی شخصیت میں جمع ہوگئی تھیں ایسا اجتماع خال خال ہی ہوتا ہے، حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا بیان بے حد حقیقت پسندانہ ہے کہ:

''اگر حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند کی جامع الصفات ذات گرامی کو دیکھنے والا قسم کھا کر یہ کہے کہ میں نے حقائق اسلام کی حکمت آفرینیوں کے ساتھ حضرت اقدس شاہ ولی اللہ دہلویؒ کو، کتاب اللہ کے ظاہر و باطن لیے انسانیت نواز علوم کے ساتھ حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کو، حقائق واحکام اسلام پر نا قابل شکست استدلال کے ساتھ حجۃ اللہ فی الارض شیخ الاسلام حضرت الامام مولانا محمد قاسم صاحبؒ نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند کو، تفقہ اسلام کی مدلل راہ نمائی کے ساتھ فقیہ الاسلام حضرت اقدس مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کو، علم وعرفان کی بہم آمیز جرأت ایمانی کے ساتھ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحبؒ دیوبندی کو، عالم بے عدیل حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کو ان کی منفرد قوت حفظ واتقان کے ساتھ، علم حدیث پر مثالی وسعت نظر کے ساتھ محدث جلیل حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ کو، بے مثال طلاقت وفصاحت کے ساتھ شیخ الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کو، فراست ایمانی پر تدبر کامل کے ساتھ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانیؒ سابق نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند کو اور علم وعرفان زہد واتقاء اور فضل وکمال کے پیکر جمال کے ساتھ حکیم الامت حضرت اقدس مولانا شاہ اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کو دیکھا ہے تو میرا دل اس پر یقین رکھتا ہے کہ انشاء اللہ وہ عنداللہ حانث نہیں ہوگا''۔(۱)

عظمت

تجزیہ نگاروں اور ماہرین نفسیات کی رائے میں انسانی عظمت کے نمایاں اور بنیادی طور پر تین عناصر ہوتے ہیں، پہلا عنصر فطری خصوصیات سے متعلق، دوسرا عنصر خاندانی اور نسبی اقدار واوصاف سے مربوط اور تیسرا عنصر انسان کی اپنی کاوش ومحنت سے جڑا ہوا ہے، گویا تیسرا عنصر اکتسابی اور پہلے دو عناصر وہبی ہیں، ایک دانشور کے بقول

''حضرت حکیم الاسلامؒ اتنے خوش بخت تھے کہ انہیں عظمت کے یہ تینوں عناصر قادر مطلق نے پوری فیاضی سے عطا کر دیئے تھے۔''(۲)

حضرت حکیم الاسلامؒ اس خانوادۂ قاسمی کے گوہر شب چراغ تھے جس نے برصغیر کی تاریخ میں محیر العقول انقلاب برپا کر دیا تھا، وہ اس چمنستان قاسمی کے گل سرسبد تھے جس کا فیض مشرق تا بہ مغرب پھیلا اور جس کا سیل رواں تب سے اب تک اس طرح فیض رسانی کرتا آرہا ہے، وہ قال اللہ وقال الرسول کی ان صداؤں کے امین تھے جو انہیں اپنے خاندان اور اکابر سے ورثے میں ملی تھیں، پھر ان کی شبانہ روز جد وجہد،

صامت و ناطق سرگرمیاں اور تکبیر مسلسل کے ساتھ تسبیح و مناجات کا حسین و دل کش امتزاج، اساتذہ کی عطا کردہ فکر و نظر کی رعنائیاں اور ان پر مستزاد بے لوثی اور خلوص کی دولت گراں مایہ۔ ان سب نے مل کر ان کی شخصیت کو عظمت کے منارۂ بلند پر پہونچا دیا تھا۔

خطیبانہ مقام بلند

ان کی حیاتِ مبارکہ کے متنوع گوشوں اور پہلوؤں میں ایک نمایاں پہلو ان کا خطیبانہ اور واعظانہ مقامِ بلند ہے، بلاخوف تردید یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ پورے برصغیر میں ان جیسا متبحر اور قابو یاب خطیب ان کے زمانے میں نہیں تھا، ان کا خطیبانہ پر وقار اور دھیما انداز، ان کے علمی، تمثیلی اور لطیف استدلالات، شریعت کے اسرار و رموز پر ان کی گہری نگاہ، شیریں بیانی، سلاست و فصاحت، وسعتِ معلومات ان کے انفرادی امتیازات ہیں جن میں کوئی ان کا سہیم و شریک نہ ملے گا۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ رقم طراز ہیں:

حضرت حکیم الاسلامؒ عوام کی اصلاح اور وعظ و ارشاد میں شیخ وقت حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے اسلوب کے متبع تھے، حسن تقریر اور دعوتی و اصلاحی رنگ ان کا امتیاز تھا، جس سے ہزاروں انسانوں کو فائدہ پہونچا، ہزاروں دلوں میں دین کے احترام کا جذبہ اور علماء کے متعلق حسن ظن پیدا ہوا، ایسا خوش بیان مقرر و واعظ، وسیع المعلومات اور نورانی شکل کا مشکل سے دیکھنے کو ملتا تھا، جس پر پہلی نظر پڑتے ہی قلب شہادت دیتا کہ یہ فطرتاً معصوم ہیں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان میں ضرر پہونچانے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔'' (۳)

حضرت مولانا محمد تقی عثمانی لکھتے ہیں:

''جہاں تک وعظ و خطابت کا تعلق ہے، اس میں تو اللہ تعالیٰ نے حضرتؒ کو ایسا عجیب و غریب ملکہ عطا فرمایا تھا کہ اس کی نظیر مشکل سے ملے گی، بظاہر تقریر کی عوامی مقبولیت کے جو اسباب آج کل ہوا کرتے ہیں، حضرت حکیم الاسلامؒ کے وعظ میں وہ سب مفقود تھے، نہ جوش و خروش، نہ فقرے چست کرنے کا انداز، نہ پر تکلف لسّانی، نہ لہجہ اور ترنم، نہ خطیبانہ ادائیں، لیکن اس کے باوجود وعظ اس قدر مؤثر، دلچسپ اور مسحور کن ہوتا تھا کہ اس سے عوام اور اہل علم دونوں یکساں طور پر محظوظ اور مستفید ہوتے تھے، مضامین اونچے درجے کے عالمانہ اور عارفانہ، لیکن اندازِ بیان اتنا سہل کہ سنگلاخ مباحث بھی پانی ہوکر رہ جاتے، جوش و خروش نام کو نہ تھا، لیکن الفاظ و معانی کی ایک نہر سبیل تھی جو یکساں روانی کے ساتھ بہتی اور قلب و دماغ کو نہال کر دیتی

تھی، ایسا معلوم ہوتا کہ منھ سے ایک سانچے میں ڈھلے ہوئے موتی جھڑ رہے ہیں، ان کی تقریروں میں سمندر کی طغیانی کے بجائے ایک باوقار دریا کا ٹھہراؤ تھا جو انسان کو زیروزبر کرنے کے بجائے دھیرے دھیرے بہا کر لے جاتا تھا"۔(۴)

برّصغیر کے ہر گوشے میں حضرت حکیم الاسلامؒ کی آواز پہونچی اور اس سے نہ جانے کتنی زندگیوں میں انقلاب آیا، مخالف فرقوں کا رد کبھی ان کا موضوع نہ رہا لیکن بے شمار گم گشتگانِ راہ کو ان کے مواعظ سے راہِ ہدایت ملی، تذکرہ نویسوں کے بقول یہی رنگ علامہ ابن الجوزی کا تھا جن کے سادہ خطاب و وعظ کی اثر انگیزی کا یہ عالم تھا کہ ایک مجلس میں سینکڑوں لوگ تائب ہوجاتے تھے، کچھ یہی رنگ حضرت حکیم الاسلامؒ کے مواعظ وخطبات کا بھی تھا۔

ایک تذکرہ نگار لکھتا ہے:

"ان سے لاکھوں افراد نے ایمان باللہ کی تب وتاب اور سنت رسول ﷺ کی روشنی حاصل کی، وہ یورپ، افریقہ اور امریکہ کے قریب قریب ہر ہر گوشے میں گئے اور ہر جگہ دین قیم کی شمعیں فروزاں کرآئے، وہ جہاں بھی گئے ان کی تقریریں الحاد وباطل پر بجلیاں گراتی اور ایمان ویقین کے گلاب اگاتی چلی گئیں ؎

جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں(۵)

شہید اسلام مولانا محمد یوسف لدھیانوی فرماتے ہیں:

"حق تعالیٰ شانہٗ نے حضرت حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحب رحمہ اللہ کو خطابت کا خاص ذوق، زبان وبیان کا خاص انداز اور افہام وتفہیم کا خاص ملکہ عطا فرمایا تھا: اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں بلاتکلف خطاب فرماتے تھے، زبان ایسی صاف اور شستہ، جملے ایسے نپے تلے کہ گویا سامنے کتاب رکھی ہے اور اس کی عبارت پڑھ کر سنا رہے ہیں، حقائق و واقعات کی ایسی منظرکشی فرماتے تھے گویا واقعہ متمثل ہوکر سامعین کے سامنے کھڑا ہے، شریعت کے اسرار وحکم اور طریقت وحقیقت کے رموز ولطائف اس طرح بیان فرماتے تھے گویا دریائے علم ومعرفت وہبیہ کا طوفان اُمڈ آیا ہے۔(۶)

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی کے بقول:

خطیبانہ امتیازات

یوں تو حکیم الاسلامؒ کے خطیبانہ امتیازات بے شمار ہیں مگر

- مشکل سے مشکل مسائل کو دل کے نہا خانوں میں اتار دینا۔
- بات بات میں نکتہ پیدا کرنے کی صلاحیت۔
- اندازِ تکلم میں جوئے آب رواں نغمگی۔
- موضوع کا مکمل احاطہ۔
- با حوالہ گفتگو۔
- عقلی ونقلی دلائل کا اجتماع۔
- قرآن وسنت سے عالمانہ اور حکیمانہ استدلال۔
- واقعات کے ذریعہ افکار ومضامین کی مکمل تفہیمات۔
- دل نشین انداز واسلوب کے ذریعہ اپنی بات سامعین کے دلوں میں راسخ اور جاگزیں کر دینا۔
- تمثیلات کی فراوانی۔
- حقائق واسرارِ شریعت کی ترجمانی۔
- تخلیق وایجادِ مضامین۔

ان کی خطیبانہ شان کے نمایاں اور روشن پہلو ہیں۔

خطبات حکیم الاسلام پر ایک طائرانہ نظر

اِس وقت ہمارے سامنے خطبات حکیم الاسلامؒ کی دس ضخیم جلدیں ہیں جو کم وبیش ساڑھے چار ہزار صفحات کی ضخامت رکھتی ہیں۔ اِن جلدوں میں سیرتِ رسول ﷺ کے انسانی، اخلاقی، عملی پہلوؤں، مقامِ نبوت، مقاصد وآثارِ نبوت، قرآن کریم، صحابۂ کرام، حیاتِ طیبہ، فلسفۂ علم، عبادت وخلافت، اخلاص، صحبتِ صالح، راہِ نجات، راہِ اعتدال، مقصد حیات، فلسفۂ موت، اسلام میں تصور آخرت، بیت اللہ الکریم، فضیلت روزِ جمعہ، سنت خلیل، حقیقت نکاح، ذکر اللہ، معرفت باری، رضائے الٰہی، طریق اصلاح، تعارف اہل حق، تسکین فطرت، ادب اور اختلاف رائے، حقوق مالیہ، خطبہ طیبہ، مقصود بعثت، یادِ حق، نبوت وملوکیت، ثمرات العلم، عمل صالح، انسانی زندگی کا نصب العین، پرسکون زندگی، سیرت اور صورت، شعب الایمان، تعلیم وتبلیغ، تبلیغی جماعت اور اصلاح، جماعت تبلیغ، فضیلت وسنت، پیغام ہدایت، فکر اسلامی تشکیل جدید، اسلامی تمدن، درس ختم بخاری، شان بعثت، عناصر سیرت، اسلام عالمی مذہب، انسانی فضیلت کا راز، مقصد نعمت ومصیبت، افادات بخاری، علمی معجزہ، نجوم ہدایت، تعلیم وتدریس، تاثیر الاعمال، آداب دعا، الہامی

ادارہ اوراس کے فضلاء کی تنظیم، سائنس اور اسلام، اساسِ توحید، حج، اہمیت تزکیہ، جواہر انسانیت، ملت اسلامیہ کا المیہ اوراس کا علاج، تعلیم نسواں، افاداتِ علم وحکمت، مذہب اورسیاست، مسلم پرسنل لا، اسلام اور آزادی، عروج وزوال، تیونس ومراکش کی جدوجہد آزادی، فلسطین کا مسئلہ، آئینۂ خدمت جمعیۃ علماء ہند، نصابِ تعلیم کی تدوین، تصویر سازی کی مذہبی وتمدنی حیثیت، اشتراک مذہب، دنیا وآخرت، عالم اصغر، اساسی عبادات، اہمیت نماز، رمضان اوراس کے مقاصد وبرکات، فضیلت تقویٰ، اسلام میں عید کا تصور، محبت ومعیت، تعلیم جدید، امتیاز دارالعلوم، اکابر دیوبند وآزادئ ہند، امارتِ شرعیہ، جامع مذہب، نبیٔ امی، راہنمائے انقلاب، عظمتِ حفظ، اسلامی آزادی، تکمیل انسانیت، حضرت نانوتوی جیسے موضوعات پر سیر حاصل گفتگو ملتی ہے۔

خطبات حکیم الاسلام کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت حکیم الاسلامؒ کی نگاہ کتنی دوررس تھی اور علوم نقلیہ وعقلیہ میں حضرت کو کتنا درک حاصل تھا، خطبات حکیم الاسلام کے مباحث علمی اور فقہی بھی ہیں، ادبی اور فنی بھی ہیں، اصلاحی وتربیتی بھی ہیں، ان میں حکایات وتمثیلات بھی ہیں، ان میں ملی اور سیاسی مسائل کا تجزیہ بھی ہے اور صاحب خطبات کا ملی درد بھی اس کے ہر ہر جملے سے واضح ہوتا ہے، اسی طرح حضرت کی علوم جدیدہ پر گہری نگاہ کا اندازہ ہوتا ہے اور حکمت ولی اللہی ہر ہر سطر سے مترشح ہوتی ہے۔

حکیم الاسلامؒ کے حکیمانہ خطبات کے چند نمونے:

معارف القرآن

قرآن کریم کے ایک تو الفاظ ہیں، ایک معانی ہیں جو الفاظ میں پوشیدہ ہیں، پھر ان معانی کی تہہ میں حقائق ہیں، حقائق کے تحت معارف ہیں اور معارف میں کیفیات ہیں جو قلوب پر طاری ہوتی ہیں، کتاب اللہ کے نزول کا مقصد محض الفاظ ومعانی کی سمجھ بوجھ ہی نہیں بلکہ اس کا مقصد ایسے قلوب واذہان کی تربیت و تزکیہ بھی ہے جو الفاظ ومعانی کی تہہ میں چھپے ہوئے حقائق ومعارف کے ادراک کے قابل بھی ہوں اور ان معارف کی کیفیات کا محل بھی بن سکیں۔(۷)

فلسفۂ موت

موت جیسے فزع اکبر ہے جیسے عظیم مصیبت ہے ویسے ہی عظیم ترین نعمت ہے، عظیم ترین انعام خداوندی بھی ہے، موت کے بارے میں صرف ایک پہلو ہی سامنے نہ رہنا چاہئے۔ ہائے افسوس، ہائے افسوس کا بلکہ

خوشی کا بھی ایک پہلو ہے کہ یہ تحفۂ مؤمن بھی ہے، یہ طریقہ ہے۔ راستہ ہے، اللہ تعالیٰ کو ملنے کا، یہ طریقہ ہے دنیا کی آبادکاری کا، یہ طریقہ ہے نئے نئے علوم پیدا ہونے کا اور نئے مربیوں کے پیدا ہونے کا، اس لئے موت کا ایک پہلو نہیں کہ اس سے ڈریں بلکہ موت میں پہلو خوشی کا بھی ہے کہ اس کا انتظار بھی کرے اس کی تمنا بھی کرے۔ (۸)

تعلیم جدید

کالج کے اندر جہاں اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ کائناتی اشیاء کو سمجھا جائے وہیں اس کی بھی ضرورت ہے کہ اس کا آخری نقطہ خدا کی معرفت ہو، اسلام نے ان چیزوں کی طرف توجہ محض عیش وعشرت کرنے کے لئے نہیں دلائی، عیش وعشرت کوئی دوامی چیز نہیں، یہ تو چندروزہ قصہ ہے۔ آدمی دنیا میں آیا ہے، مسافر کی طرح سے، اس کو ایک بڑی منزل تک جانا ہے۔ اگر وہ اصل منزل کو گنوا بیٹھا تو اس نے کائنات کی حقیقت کو نہیں سمجھا، یہ تو راستہ اور رہ گزر ہے مگر چوں کہ راستے کے نشیب وفراز کا جاننا ضروری ہوتا ہے اس کے بغیر آدمی راستہ نہیں چل سکتا اور نہ ہی آدمی منزل تک پہنچ سکتا ہے، اس لئے دنیا کے عجائبات کا دیکھنا اور سمجھنا بھی ضروری ہے کہ ''یہ وہی تو راستہ ہے جس پر چل کر آدمی اپنے خدا کی معرفت تک پہنچتا ہے۔'' (۹)

لغزش اور گناہ

ایک گناہ وہ ہے جس کا منشاء کبر ونخوت ہے اور ایک لغزش وہ ہے جس کا منشاء حرص ہے، حرص سے سرزد ہونا تو آدم کی جبلت ہے اور کبر سے سرزد ہونا یہ شیطان کا کام ہے، کبر میں ٹھیک مقابلہ ہوتا ہے حق تعالیٰ شانہٗ کا، آپ بڑے ہیں، میں بھی بڑا ہوں اور بندہ سے جو گناہ ہوتا ہے اس میں آدمی خود اپنے کو ہیچ سمجھتا ہے کہ میں حرص میں مبتلا ہوں، اس سے اللہ کی بڑائی میں دل کے اندر کوئی کمی نہیں آتی۔

اب نتیجہ نکالئے کہ آدم علیہ السلام سے جو لغزش ہوئی وہ جاہ سے ہوئی یا باہ سے۔ ہمیں غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ آدمؑ کے قلب میں عظمت خداوندی بدستور موجود تھی اور دوسرے کی عظمت جب ہی ہوسکتی ہے جب اپنے آپ کو کم سمجھے، لہٰذا حضرت آدمؑ کی لغزش میں کبر کا شائبہ تک بھی نہ تھا، ادھر اس کم بخت کے دل میں حق تعالیٰ کی عظمت تھی ہی نہیں اس لئے وہ ابدالآباد کے لئے ملعون ہوگیا اور ادھر ان کے سر پر خلافت کا تاج رکھا گیا جب کہ توبہ کی اور چالیس برس تک برابر روتے رہے اور بے حد توبہ واستغفار کی، حالاں کہ وہ گناہ نہ تھا بلکہ وہ ایک فکری لغزش تھی، بہرحال میں نے عرض کیا کہ دو ہی قوتیں ہیں ایک جاہ طلبی کی ایک باہ طلبی کی۔ (۱۰)

تبلیغی اجتماع

اگر آپ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ تبلیغ اصلاح کے ان چاروں طریقوں کا ایک مجموعہ مرکب ہے تو یہ تبلیغی جماعت ایک معجون مرکب ہے، گویا یہ نسخہ امرت کا بن گیا جس پر اصلاح نفس کے یہ چاروں طریقے جمع ہوگئے ہیں، الغرض اس میں محنت کرنے سے بہت ہی بڑا فائدہ ہوگا، آپ کہیں گے کہ تبلیغ میں نکالا کیوں جاتا ہے؟

تو تبلیغ میں اس لئے نکالا جاتا ہے کہ اس میں بزرگوں کی صحبت میسر ہوتی ہے، پھر ساتھی اچھے ملتے ہیں جو ایک دوسرے کو برائی سے روکتے ہیں اور پھر جب وہ اپنا خرچ کر کے باہر نکلا ہے تو دینی جذبات بھی ابھریں گے اسے اپنی اصلاح کا خیال پیدا ہوگا، اس لئے کہ وہ جب اپنا گھر چھوڑ کر گیا ہے اور ہر قسم کی مشقت برداشت کر رہا ہے تو وہ کچھ نہ کچھ اثر لے کر ضرور ہی آئے گا، اس کے بعد بھی اگر یہ اثر لے کر نہ لوٹے تو وہ انسان نہیں ہے بلکہ پتھر ہے، اگر انسان ہے تو ضرور وہ اثر لے کر آئے گا، کیوں کہ وہ نیک لوگوں کی صحبت میں رہا ہے۔(۱۱)

اختصار کے پیش نظر نمونے کے طور پر یہ پانچ پیراگراف پیش کئے گئے ہیں، جن سے بجا طور پر حضرت حکیم الاسلامؒ کی عقلی و فقہی بصیرت، ملی درد، سیاسی بصیرت اور حکمت کے ساتھ اصلاحِ امت کا جذبہ بے پناہ واضح ہوتا ہے اور حضرت کی علمی و عملی عظمت و جلالت کو تسلیم کئے بغیر کوئی چارہ نہیں رہتا۔

حرف آخر

ہم اس مقالے کا اختتام حضرت مولانا عبدالرشید محمود گنگوہی مرحوم کے ان الفاظ پر کرتے ہیں کہ یہ ایک معاصر کا اپنے ہم عصر کے لئے حقیقت پسندانہ تبصرہ ہے اور جس میں بجا طور پر حضرت حکیم الاسلامؒ کی شخصیت و کمالات کو چند لفظوں میں سمو اور پرو دیا گا ہے، لکھتے ہیں کہ ”ان کی شیریں زبانی، شگفتہ بیانی، صورت نورانی، ہوش مندیٔ فکر، ارجمندیٔ ذہن اور دردمندیٔ دل کو کون بھلا سکتا ہے، دوائر علمیہ میں ان کی جامعیت، علوم و افکار کا تنوع، تبحر، ادبی ذوق، خوبیٔ تعبیر، حسین و بدیع ترجمانی، مجامع میں خطاب، حکمت ربانیہ ولی اللٰہی بھی، ابن جوزی کی سی سحر انگیزی بھی کس صاحبِ ذوق جوہر شناس کو رہ رہ کر یاد نہ آئے گی۔ **عجزت النساء ان یلدن مثل طیب** اب وہ کوہ کن کی بات کوہ کن کے ساتھ، کس کس نادرہ اور خلیفہ پر تعجب کریں، زبان ایسی کہ سب سمجھیں، بیان ایسا کہ دل مانے، عقل کی پاسبانی بھی لیکن کہیں کہیں اسے تنہا

بھی چھوڑ دے کے سے افکار بھی، دلائل عقلی بھی، نقلی بھی، انفسی و آفاقی بھی، حقائق و معرفت آ گیں بھی۔‘‘(۱۲)

دل سے دعا نکلتی ہے کہ ؎

آسماں اس کی لحد پہ شبنم افشانی کرے
سبزۂ نو رستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

............❖............

(۱) ندائے دارالعلوم، ۱۵ر جولائی تا یکم ستمبر ۱۹۹۴ء، ص:۲

(۲) عبدالرشید ارشد، بیس مردانِ حق، ص:۹۷۷

(۳) مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ، پرانے چراغ ج ۳، ص:۱۴۳

(۴) مولانا محمد تقی عثمانی، نقوش رفتگاں، ص:۱۹۲

(۵) عبدالرشید ارشد، بیس مردانِ حق، ص:۹۷۷

(۶) ایضاً، ص:۱۸۸

(۷) مولانا محمد ادریس ہوشیار پوری، خطبات حکیم الاسلام، ج ۲، ص:۱۷

(۸) ایضاً، ج ۲، ص:۳۴۰

(۹) ایضاً، ج ۹، ص:۲۰۵

(۱۰) ایضاً، ج ۹، ص:۴۰۸

(۱۱) ایضاً، ج ۴، ص:۳۹۱

(۱۲) حافظ محمد اکبر شاہ بخاری، ذکر طیب، ص:۱۹۵

............❖............

حضرت حکیم الاسلامؒ: میری نظر میں

مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی
ناظم جامعۃ الرشاد، اعظم گڑھ۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کی زندگی کے بے شمار پہلو ہیں جن پر واقف کار حضرات اپنے اپنے انداز سے لکھیں گے، راقم الحروف ان سے بہت قریب سے واقف نہیں ہے اس لئے اپنے لئے یہ عنوان اختیار کیا ہے کہ اس میں واقعات سے زیادہ ذاتی مشاہدات اور تاثرات کے اظہار کا موقع ہے۔

حضرت حکیم الاسلامؒ کے انتقال پر راقم الحروف نے الرشاد میں اداریہ لکھا تھا اس میں بہت سی باتوں کے ساتھ اپنے اس تاثر کا بھی اظہار کیا تھا کہ اپنی نظروں نے طبقۂ علماء میں دو ایسی باوقار دینی شخصیتوں کو دیکھا ہے کہ جو اپنے پروقاری نورانی اور معصوم چہروں کے ساتھ جس مجمع میں پہونچ جاتے تھے پوری مجلس پر چھا جاتے تھے، اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ رحمت کے فرشتوں کا نزول ہو رہا ہے، ایک حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندویؒ، دوسرے حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ۔

حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ بانی دارالعلوم حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی نسبت اور مولانا تھانویؒ کی خلافت کی وجہ سے تو قابل احترام تھے ہی مگر ذاتی طور پر بھی اپنے علم وفضل، اعتدال و توازن اور شیریں مقال کی وجہ سے پورے حلقۂ علماء میں ایک ممتاز شخصیت ہی کے مالک نہیں بلکہ اس حلقۂ کے گل سرسبد تھے، انھوں نے دس پانچ سال نہیں بلکہ نصف صدی دارالعلوم دیوبند کی جو بے لوث خدمت انجام دی ہے ممکن ہے کہ وہ موجودہ تاریخ سازی کی نذر ہو جائے مگر ہندوستان کی علمی و دینی تاریخ سے ان کی خدمت کے نقوش تاباں کو مٹایا نہیں جا سکتا، جس وقت ان کو اہتمام کا عہدہ سپرد کیا گیا تھا دارالعلوم کے حلقہ کے اندر اور اس کے حلقہ کے باہر بڑی بڑی شخصیتیں موجود تھیں، مگر سب کی نظر انتخاب اسی ۲۹/۲۸ برس

کے نوجوان پر پڑی اور انھوں نے بزرگوں کے حسن ظن کو نہ صرف قائم رکھا بلکہ آگے چل کر بذات خود ایک بڑی شخصیت بن گئے، جس وقت انھوں نے اہتمام سنبھالا دارالعلوم دیوبند ایک متوسط درجے کا مدرسہ تھا، جسے انھوں نے اپنے حسن انتظام سے ہندوستان کا جامعہ ازہر بنا دیا ان کی غیر معمولی صلاحیت ہی تھی، حضرت حکیم الاسلامؒ کی ایک خاص خصوصیت عام مدارس اسلامیہ سے ان کا تعلق تھا وہ اگر کسی گاؤں کے کسی مکتب کے جلسہ میں بھی بلائے جاتے تھے تو اس میں بھی اسی اہتمام و انشراح کے ساتھ شریک ہوتے تھے، جس طرح کسی بڑے مدرسہ کے جلسہ میں وہ شریک ہوتے تھے، خواہ جامعۃ الرشاد میں ان کو جب بھی بلا یا گیا تو پورے انشراح قلب کے ساتھ شریک ہوئے، خود جامعۃ الرشاد کی ابتداء۱۹۶۲ء میں ایک کرایہ کی عما رت اور مسجد میں ہوئی مگر ۱۹۶۵ء میں اس کی جدید عمارت کا سنگ بنیاد جن علماء وصلحاء کے ہاتھوں رکھا گیا ان میں خاص طور پر حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ نے اس کی پہلی اینٹ رکھی، اس موقع پر انھوں نے مدرسہ کی افادیت پر جو مؤثر تقریر کی اس سے متاثر ہو کر شہر اعظم گڑھ جیسے غریب مقام کے باشندوں نے کئی ہزار روپئے کی رسید کٹوائی۔

حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ دوسری بار اس وقت تشریف لائے جب جامعۃ الرشاد کی طرف سے مشرقی اضلاع کے عربی مدارس کے ذمہ داروں کی مجلس بلائی گئی تھی، اس وقت مدرسہ کا ہال جہاں بنا ہوا ہے، وہاں ایک بڑا چھپر پڑا ہوا تھا، اسی چھپر میں مجلس ہوئی حضرت حکیم الاسلامؒ مجلس سے کئی گھنٹہ پہلے تشریف لے آئے اور مجلس کے بعد بھی کئی گھنٹوں اسی چھپر کے نیچے لیٹے رہے اور فرماتے رہے کہ آج اس میں بیٹھ کر بزرگوں کی یاد تازہ ہوگئی، انھوں نے اپنے معائنہ میں لکھا کہ جو کام کسی بڑے مدرسہ کو کرنا چاہئے بحمداللہ وہ جامعۃ الرشاد کر رہا ہے، تیسری بار ۱۹۶۷ء میں دستار بندی کے جلسہ میں تشریف لائے، اسی موقع پر انھوں نے اسلامی ہاسٹل کا بھی معائنہ کیا جو جامعۃ الرشاد کی طرف سے انگریزی طلبہ کی تربیت کے لئے قائم کیا گیا تھا انھوں نے ہر موقع پر اپنا معائنہ بھی تحریر فرمایا جو ان کی اعلیٰ ظرفی کا ثبوت ہے ان کی ہمت افزائی اور اعلیٰ ظرفی جامعۃ الرشاد ہی کے ساتھ مخصوص نہیں تھی بلکہ کسی بھی مدرسہ کی طرف سے جب ان کو مدعو کیا جاتا تھا تو وہ اس انشراح کے ساتھ تشریف لے جاتے تھے کہ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ان کے نزدیک اس مدرسہ کی بھی اتنی ہی اہمیت ہے جتنی کسی بڑے دارالعلوم کی ہے۔

حضرت حکیم الاسلامؒ کی ایک بڑی خصوصیت ان کی طبعی شرافت، مروت اور نرم خوئی تھی، انھوں نے زندگی میں شاید ہی کسی کے آبگینہ دل کو ٹھیس پہونچائی ہو جن لوگوں نے اس پیرانہ سالی میں ان کے معصوم

دماغ کو مجروح کیا اور بے داغ شیشہ دل کو چور چور کرڈالا ان کے ساتھ بھی انھوں نے کبھی تلخ کلامی نہیں کی۔

ان کی علالت کے آخری زمانے میں مولانا منظور صاحب نعمانی ممبر مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند جنھوں نے ان کے خلاف بہت کچھ لکھا تھا بلکہ بعض ناگفتنی باتیں بھی لکھ ڈالی تھیں معافی کا خط لکھا تو انھوں نے جواب میں انھیں لکھا کہ میرا ذاتی کوئی معاملہ نہیں ہے، اور نہ مجھے کوئی شکایت ہے، دارالعلوم کا معاملہ ہے اس سلسلہ میں آپ اس کے ذمہ داروں ہی سے معافی مانگیں تو بہتر ہے اس جواب میں قدرے ناراضگی کا اظہار ہے مگر انداز کتنا شریفانہ ہے۔

مجلس شوریٰ کے بعض ممبران نے بسا اوقات ان کے خلاف بہت سخت انداز اختیار کئے تھے اور ان کے بہت سے کئے ہوئے اقدامات کو ردکرادیتے تھے مگر وہ کبھی چیں بہ جبیں نہیں ہوتے تھے اور نہ اپنے کارناموں اور شخصیت کی بناپر ان کی ان باتوں کو بے وزن سمجھتے تھے اور نہ یہ کوشش کرتے تھے کہ مجلس شوریٰ سے یہ کانٹا نکل جائے، اس کے برخلاف ایک بڑے ادارے کی مجلس انتظامیہ میں لکھنؤ کے ایک مرحوم ممبر صاحب نے کچھ اعتراضات کردیئے تو ادارے کے ذمہ دار صاحب بلڈنگوں کی طرف اشارہ کرکے کہنے لگے کہ آپ لوگوں کو یہ سب کچھ نظر نہیں آتا، صرف اعتراض کرنا آتا ہے۔

ببیں تفاوت رہ از کجا است تا بہ کجا

دارالعلوم دیوبند میں اساتذہ کا ایک گروپ ہمیشہ حضرت حکیم الاسلامؒ کا مخالف رہا مگر انھوں نے کبھی کسی سے انتقام نہیں لیا، ممکن ہے کہ کسی مخصوص وجہ سے کسی کی علیحدگی ہوئی ہو مگر عام طور پر انکا طرز عمل یہی رہا، یہی حال طلبہ کے ایک گروپ کا رہا مگر وہ ہمیشہ ان کو معاف ہی کرتے رہے۔

۱۹۶۴/۶۵ء میں ایک بار دارالعلوم میں کچھ مالی بحران پیدا ہوگیا تو حضرت حکیم الاسلامؒ نے ذاتی طور پر جدوجہد کی اور اس کے لئے حضرت مولانا وصی اللہ صاحبؒ اور بعض دوسرے بزرگوں سے دعا کی درخواست کی اس خط سے متاثر ہوکر مولانا وصی اللہ صاحبؒ نے اپنی عام عادات کے خلاف دارالعلوم کے لئے مالی اعانت کی اپیل کی جس سے دارالعلوم میں ہزاروں روپئے پہنچ گئے۔

اوپر عرض کرچکا ہوں کہ وہ اعتدال توازن اور نرم خوئی کا مجسمہ تھے، کسی مسئلہ کے سلسلہ میں وہ شدت کو پسند نہیں کرتے تھے، اسی طرح ہندوستان کی مسلم جماعتوں کے سلسلہ میں بھی ان کا طرز عمل ہمیشہ اعتدال کا رہا، یہی وجہ تھی کہ وہ ہر طبقہ میں قبول کرلئے جاتے تھے۔

۱۹۴۰ء میں ندوہ کے طلبہ کا ایک وفد دارالعلوم دیوبند کے لئے گیا تھا، اس وقت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ

حیات تھے، انھوں نے اور حضرت حکیم الاسلامؒ نے وفد کا اعزاز کیا اور ان کے استقبال میں مسجد کے اندر ایک جلسہ کیا، جس میں حکیم الاسلامؒ نے تقریر فرمائی، اور اکبر الہ آبادی کا وہ مشہور قطعہ پڑھا جس میں دارالعلوم دیوبند، ندوہ کا اور علی گڑھ کی خصوصیات کا ذکر کیا ہے۔

سیاست میں بھی ان کا طرزِ عمل انتہا پسندی کا کبھی نہیں رہا، وہ دارالعلوم کے مصالح کو پیش نظر رکھتے تھے، ایمرجنسی کے زمانہ میں ان کے ایک بیان سے کچھ لوگوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ وہ فیملی پلاننگ کے موافق ہو گئے ہیں، حالانکہ ایسا نہیں تھا ان کے بیان کا خلاصہ یہ تھا کہ کسی مسئلہ میں جائز اور ناجائز کا فتویٰ دینا دارالعلوم کے دارالافتاء کا کام ہے اور وہ فتویٰ دے چکا کہ یہ جائز نہیں، البتہ یہ مسئلہ چونکہ نیا ہے اس لئے اس پر علماء کو غور کرنا چاہئے کہ اس کی کچھ صورتیں بعض حالات میں مباح ہوسکتی ہیں یا نہیں؟ ظاہر ہے کہ اس میں کوئی اعتراض کی بات نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو علمی و دینی حیثیت کے ساتھ دنیاوی وجاہت سے بھی نوازا تھا اسی وجہ سے ان کے گھر اور معاشرتی زندگی میں جو رکھاؤ تھا وہ بھی بہت کم سواد لوگوں کی نظروں میں کھٹکتا اور وہ اس کو ان کا سب سے بڑا عیب بنا کر پیش کرتے تھے۔

کور بختا آرزد خواہند　　مقبلاں را زوال نعمت و جاہ

بہر حال دارالعلوم میں تعلیم ہو رہی ہے اور ہوتی رہے گی اور نظم و انتظام چل رہا ہے اور چلتا رہے گا مگر ان کی ذات سے جو اس کو دینی و علمی وقار حاصل ہوا تھا وہ آسانی سے پورا نہیں ہوگا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ حضرت حکیم الاسلامؒ کو اعلیٰ علیین میں جگہ عنایت فرمائے اور ملک کی امانت دارالعلوم کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے اور اخلاص وللّٰہیت جو اس ادارہ کی سب سے بڑی خصوصیت تھی اس کے کارکنوں اساتذہ اور طلبہ کے سینوں میں پھر سے جاگزیں کردے۔

............❖............

یادِ ماضی

مولانا خالد حسین بلیاویؒ
سابق استاذ دارالعلوم دیوبند

ہزاروں حمد و سپاس اس خالق بیچون کو کہ جس نے عالم کو بنایا اور اس میں بنی آدم کو رتبۂ اعلیٰ عطا فرمایا اور سو ہزاروں رحمتیں اُن کی جان پاک پر کہ آپ بچے اور اوروں کو بچایا اور بھکے ہوؤں کو سیدھا راستہ دکھایا اب یہ چند سطور پیش خدمت ہیں اور پیش کنندہ ہے ایک ناچیز مسمی خالد حسین بلیاوی عفا اللہ عنہ اور ان سطور میں کچھ یادیں ہیں جو عظیم ترین شخصیت حضرت اقدس مہتمم دارالعلوم دیوبند حکیم الاسلام مولانا طیب صاحبؒ برّد اللہ مضجعہ کی ذات بابرکات سے متعلق ہیں۔ یہ ناچیز الہ آباد میں مدرسہ وصیۃ العلوم میں زیر تعلیم تھا، مدرسہ کے قریب ہر سال جلسہ ہوتا تھا، اسی درمیان میں حضرت حکیم الاسلامؒ بھی تشریف لائے اور بندہ نے پہلی مرتبہ حضرت کو دیکھا اور سنا ایسا محسوس ہوا کہ یوسف گم گشتہ سامنے ہے اور **''إن هذا من البيان لسحرا''** کا جادو مجمع کو مسحور کئے ہوئے ہے (**كنتم خير امة**) کی آیت مبارکہ موضوع سخن ہے اور خیریت کے تمام پہلو زیر نظر ہیں اور بلبل شیریں بیان کی شیرینی نے ہر صاحب سماع کو حلاوت العسل المصفی سے ہمکنار کیا ہوا ہے اور اس بندہ نے اس تقریر سے جو سمجھا وہ یہ تھا کہ امت تین اجزاء سے وجود پذیر ہوتی ہے:

(۱) شخصیت سے (۲) کتاب سے (۳) اور مرکز سے اور اس امت کو جو شخصیت ملی وہ خیر الانبیاء ہیں جو کتاب ملی وہ خیر الکتاب ہے اور جو مرکز ملا وہ کعبہ خیر المراکز ہے پھر حضرت نے ہر ایک دعویٰ کو کس طرح مدلل کیا بس اسے تو بحر بیکراں کہئے۔ یہ ہے بندہ کا حضرت سے لقاء اول، اس کے بعد بندہ دارالعلوم دیوبند میں حاضر ہوا، ہدایہ آخرین اور دوسری کتابیں زیر درس رہیں اور ساتھ ساتھ حجۃ اللہ البالغہ کے درس میں حضرت سے استفادہ رہا۔ اور خوب رہا ایک موقع پر حضرت نے درس میں فرمایا: لغات میں سب سے زیادہ فطرت کے قریب عربی زبان ہے

اوراس کی مثال پیش فرمائی مثلاً نیزہ مارنے کے لئے عربی میں طعن کا لفظ آتا ہے، دراصل نیزہ چلانے اور مارنے کے وقت اس کی فطری آواز کا صوتی انداز ہے اس لئے کہ جب نیزہ حرکت کرتا ہے تو طعن طعن کی آواز سنائی دیتی ہے۔ بندہ بعد عصر حضرتؒ کی مجلس میں حاضری دیتا تھا، ماشاءاللہ حاضرین کی جانب سے سوالات اور حضرت کے جوابات سننے والے اپنے دامن میں کیسا کیسا موتی سمیٹتے تھے، ایک موقع پر بندہ نے سوال پیش کیا کہ امت کا اجماعی مسئلہ ہے کہ روضۂ اطہر عرش سے افضل ہے مگر اس کی وجہ کیا ہے؟ یہ ایک مشکل سوال ہے۔ حضرتؒ نے فی البدیہ جواب عنایت فرمایا کہ ظاہر ہے کہ عرش پر اللہ کی تجلی ہے مگر وہ تجلی غیر مدرک ہے اور قلب اطہر نبوی پر بھی تجلی ہے اور وہ مدرک ہے اور بلاشبہ مدرک غیر مدرک سے افضل ہے اور وہ جسم جو ایسے قلب کا حامل ہے وہ بھی اس قلب کی طرح افضل اور جو بقعۂ زمین اس جسم افضل سے متصل ہے وہ بھی اتصال کی بناء پر افضل ہے پس ثابت ہو گیا کہ روضۂ اطہر عرش سے افضل ہے۔ لیجئے ایک ایسا مسئلہ جو لا ینحل نظر آرہا تھا حضرتؒ نے چٹکی میں حل فرمادیا۔ یہی تو وجہ ہے کہ بندہ جب ایک موقع پر حضرت مولانا مسیح اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں حاضر تھا اور حضرت حکیم الاسلامؒ کا ذکر خیر آیا تو فرمایا کہ حضرت تھانویؒ حکیم الامت تھے تمام امت کے علوم کو پیش فرمایا امت اجابت ہو یا امت دعوت، اور مولانا محمد طیب صاحبؒ نے اسلام کے تمام مسائل علمیہ اور اسرار شرعیہ کو حل فرمایا اس لئے حکیم الاسلام کے لقب سے انھیں یاد رکھا گیا۔ اس طرح بندہ دارالعلوم دیوبند کی جانب سے آگرہ گیا ہوا تھا وہاں الہ آباد سے ایک بزرگ قاری حبیب صاحبؒ جو ڈاکٹر عیسی صاحبؒ (جو کہ حضرت تھانویؒ کے اولین خلفاء میں شمار کئے جاتے ہیں) کے خلیفہ تھے تشریف فرما تھے، انھوں نے حضرت حضرت حکیم الاسلامؒ صاحب کے سلسلہ میں ایک واقعہ بیان فرمایا کہ جب حضرت تھانویؒ علاج کے سلسلہ میں لکھنؤ تشریف لے گئے اور حضرت کی قیام گاہ علماء اور مشائخ کا پرکشش مرکز بنی ہوئی تھی اور حضرت حکیم الاسلامؒ بھی وہاں موجود تھے تو ایک موقع پر حضرت تھانویؒ کے سامنے جہاں یہ بندہ (قاری حبیبؒ) بھی موجود تھا تمام علماء اور مشائخ نے حضرت تھانویؒ سے یہ کہا کہ ہم سب حضرت حکیم الاسلامؒ سے درخواست کررہے ہیں، کہ تقریر فرمائیں مگر وہ انکار کررہے ہیں، آپ حکم دیدیجئے کہ وہ تقریر کریں تو حضرت تھانویؒ حکیم الاسلامؒ مولانا محمد طیب کے سامنے فرمایا کہ میں بھی درخواست کرتا ہوں کہ تقریر فرمائیں، اس جملہ پر حضرت حکیم الاسلامؒ بیٹھے ہوئے پورے طور پر حضرت کی جانب اپنے کو جھکالیا اور اس طرح خلیفۂ شیخ نے شیخ کی اطاعت کا اظہار کیا۔

وزیرے چنیں شہریارے چنیں

پھر جناب قاری حبیب صاحب جو اس واقعہ کے روای ہیں فرماتے ہیں کہ اتنی لاجواب تقریر فرمائی کہ ماشاءاللہ تبارک اللہ۔

صد سالہ کے موقع پر یہ بندہ حضرت حکیم الاسلامؒ کے ہمراہ مرادآباد گیا، بندہ خادم تھا مگر اپنی تمام ضروریات حضرتؒ بلاطلب خدمت کے خود پوری فرماتے۔ احساس بھی نہ ہونے دیتے کہ خدمت کی ضرورت ہے، پھر مرادآباد پہنچنے کے بعد حضرتؒ نے جہاں قیام کیا وہاں حضرتؒ کے لئے مسہری کا انتظام تھا جو آٹھ افراد کے لئے کافی تھی، بندہ نے حضرت کے سونے کے لئے بستر ہ مسہری پر بچھایا اور خود قالین پر مگر حضرتؒ نے فرمایا کہ مولوی خالد آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟ آپ بھی اپنا بستر ہ اوپر ہی بچھائیں بندہ کو تعمیل حکم کرنی پڑی۔ اسی طرح شہر مرادآباد والوں نے حضرتؒ کے اعزاز میں رات کا کھانا رکھا اور بڑے بڑے اہل کمال کو اس میں مدعو کیا مقصد حضرتؒ کی تعظیم وتوقیر تھی مگر حضرتؒ کی طبیعت کچھ موزوں نہ تھی چنانچہ معززین جب حضرت کو لینے آئے تو فرمایا کہ میری نیابت کے لئے مولوی خالد کو لے جایئے جب یہ بندہ مقام دعوت وعزیمت پر پہنچا تو سب دیکھ رہے تھے کہ یہ کون آرہا ہے ایک ذرۂ بے مقدار سراپا صاحب قدر ومنزلت صاحب اقتدار کے بجائے؟ اس سفر میں جب لوٹا ہوا تو سفر کار سے طے پایا پچھلی سیٹ پر حضرتؒ نے ہمیں ساتھ بٹھایا، ایک موقع پر میں نے حضرت سے عرض کیا کہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے بنارس میں ایک جلسہ رکھا تھا، تمام علماء مدارس وہاں جلوہ افروز تھے اور مولانا مدنیؒ شیخ الادب مولانا اعزاز علی صاحبؒ کو اپنے ساتھ لے گئے تھے مگر تقریر آپ کی ہوئی تھی، میں نے یہ واقعہ سنا ہے اور یہ بھی سنا ہے کہ مولانا ابوالکلام مرحوم نے درس نظامی پر سخت اعتراض کیا تھا مگر آپ کی تقریر اوران کے اعتراضات کے جواب سے ان کی گردن جھک گئی، میں آج اس واقعہ کی سند متصل اور عالی کرنا چاہتا ہوں اس پر حضرت گویا ہوئے کہ میں تو اس جلسہ میں خصوصی طور پر مدعو بھی نہیں تھا بلکہ کسی اور بنا پر بنارس گزرنا ہوا تو سوچا کہ مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ یہاں آئے ہوئے ہیں ان سے ملتا چلوں اس طرح وہاں جاناں ہوا، مگر جب مولانا ابوالکلام مرحوم کو معلوم ہوا کہ میں آیا ہوا ہوں تو انھوں نے باقاعدہ خصوصی انتظام کرلیا اور جلسہ میں شرکت کے لئے روک لیا اس طرح میں بھی شریک ہوگیا، پھر جب اپنے وقت پر جلسہ شروع ہوا تو ابوالکلام صاحب نے درس نظامی کے خلاف خوب خوب رد کرنے کی ناکام کوشش کی اور خطاب کے بعد کہا کہ کسی صاحب کو کچھ کہنا ہے تو تشریف لائیں۔ چنانچہ بڑے بڑے علماء اور مدارس کے ناظم تعلیمات سبھی موجود تھے مگر سب کی نگاہیں مولانا مدنیؒ کی طرف اٹھی کہ اٹھیں اور جواب دیں مگر مولانا مدنیؒ نے ہمیں دیکھا اور اشارہ فرمایا کہ آپ آئیں، میں نے کہا

حضرت آپ نے تو مجھے جلسہ کے لئے پوچھا تک نہیں، اب آپ جانیں۔ حضرت نے اصرار کیا کہ نہیں آپ ہی کو جواب دینا ہے پھر میں اٹھا اور مولانا ابوالکلام صاحبؒ کی ایک ایک بات کا بحمد اللہ جواب دیا ان کا اعتراض مقامات حریری اور حماسہ پھر ملا حسن، قاری مبارک ملا رحمہ اللہ اور اس قسم کی فنی کتابوں پر تھا۔ میں نے بتایا کہ احادیث وقرآن میں جو سہل الفاظ ہیں وہ تو آپ لغات اور ڈکشنری سے حل کر سکتے ہیں مگر چوں کہ بعض ایسے کلمات ہیں جو اہل عرب کی خصوصی بدوی ماحول سے متعلق ہیں ان کے لئے مقامات حریری اور حماسہ جیسی کتابوں کے بغیر آپ ایک قدم نہیں چل سکتے اور آپ کا علم ناقص رہے گا، رہا معقولات کی کتابوں کا مسئلہ تو اب حالات وامزجہ جدل ومناظر کے عادی بن چکے ہیں، دو دو چار جیسی بدیہی باتیں بھی لوگ سادہ انداز میں ماننے کو تیار نہیں بلکہ اس کے لئے بھی جنس ونوع وفصل اور عرض عام اور قضایا شرطیہ وغیرہ کے بھاری بھر کم الفاظ ہی سے تسلی پاتے ہیں اور علم کی دھاک بیٹھتی ہے اور چوں کہ درس نظامی کا مقصد ایسے رجال کار اور ماہرین اور جامع منقولات ومعقولات پیدا کرنا ہے جو ہر میدان میں اور ہر ماحول کے لئے نسخۂ شفا پیش کر سکیں، اس کے لئے یہی کچھ کتابیں درکار تھیں الخ حضرت کی باتیں وہ حضرت ہی کا حق ہیں یہ جو کچھ بندہ نے پیش کیا یہ ایک ناقص کی انقص ترجمانی ہے۔ اس کے بعد حضرت نے جو بات فرمائی اور خوب فرمائی حضرتؒ نے فرمایا کہ جناب ابوالکلام صاحبؒ! آپ ہمیں نصیحت فرما رہے ہیں آپ کو تو چاہئے کہ جدید علوم کی اصلاح کی جانب توجہ فرمائیں جو آپ نے کالج اور یونیورسٹیوں میں نافذ کر رکھا ہے اس لئے کہ یہ نصاب انگریزوں نے آپ کو دیا ہے اور ان کا مقصد اس نصاب سے صرف کلرک پیدا کرنا تھا، افسر اور اوپر کے گریڈ والے تو وہ لندن سے لاتے تھے اور اب آپ کو سب اہل کار یہیں تیار کرنے ہیں لہٰذا شدید ضرورت ہے کہ ادھر توجہ کی جائے ہم مدارس والے اس کے محتاج نہیں، ہاں آپ سخت خسارے میں ہیں آپ کو یہ زیبا تھا مگر آپ کچھ اور کر بیٹھے اس کے بعد ہمارے حضرت نے فرمایا کہ میری تقریر کے بعد آخری کلمات کیلئے جب مولانا ابوالکلام صاحب کھڑے ہوئے تو صرف اتنا کہا کہ حکیم الاسلام مولانا محمد طیبؒ کی تقریر سے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ حضرت قاسم نانوتویؒ کی روح ان میں حلول کر گئی ہے مگر مولانا ابوالکلام صاحب کے پاس ہماری بات کا جواب نہ تھا۔

دارالعلوم دیوبند میں شش ماہی امتحان کے بعد ہر سال جلسہ ہوتا تھا جس میں گزشتہ سالانہ امتحان کے نتائج کے پیش نظر انعامات تقسیم ہوتے تھے تا کہ آنیوالے سالانہ امتحان میں طلبہ خوب محنت کے ساتھ امتحان دیں، صد سالہ سے پہلے اسی قسم کا ایک جلسہ تھا اسٹیج پر میں موجود تھا، حضرت تشریف لا چکے تھے اور اساتذہ

آرہے تھے بندہ نے ایک خواب دیکھا تھا کہ حکیم الاسلام مولانا محمد طیبؒ کا سفر آخرت درپیش ہے، بندہ نے اس موقع پر حضرت سے خواب کا تذکرہ کیا اور کہا کہ حضرت آپ اپنی زندگی میں مولانا سالم صاحب دامت برکاتہم کو اپنی جگہ متعین فرمادیں تو اچھا ہوگا حضرت کا جواب کیا تھا سنئے مولوی خالد صاحب! معاملہ میں نے اللہ کے حوالہ کررکھا ہے وہ جس کو چاہیں یہ اسی کا حق ہے میں نے نہ کبھی ایسا پہلے سوچا نہ اب سوچتا ہوں نہ آگے ایسا ارادہ ہے، یہ ہیں وہ الفاظ جس کو میں نے پورے ہوش وحواس کے ساتھ سنا اور محفوظ رکھا۔ اب جو حضرات ہمارے حضرت پر تہمت لگاتے ہیں اور بے سند کی اڑاتے ہیں ایسے فرشتہ صفت انسان کے بارے میں وہ جانیں اور ان کا معاملہ اللہ کے حوالہ و الی اللّٰہ المشتکیٰ، اسی طرح حضرت اقدس کا معاملہ دارالعلوم دیوبند کے سلسلہ میں کس طرح تفویض وتوکل کا تھا، تین واقعات مجھے یاد ہیں، پیش کرتا ہوں۔

پہلا واقعہ جو براہ راست حضرت حکیم الاسلامؒ سے میں نے سنا وہ یہ کہ جب پاکستان بنا تو مولانا مدنیؒ حکیم الاسلامؒ کے پاس اہتمام میں تشریف لائے اور حضرت حکیم الاسلامؒ سے فرمایا کہ اب مدرسہ کیسے چلے گا؟ حکیم الاسلامؒ نے کہا کہ حضرت میں نے مطلب نہیں سمجھا۔ فرمایا چندہ دینے والے اکثر امیر حضرات پاکستان چلے گئے اب مدرسہ کا کیا ہوگا؟ حضرت حکیم الاسلامؒ نے کہا کہ حضرت اس مدرسہ کا معاملہ تو پہلے بھی اللہ کے حوالہ اور توکل پر تھا اب بھی ایسا ہی رہے گا۔ اس پر حضرت مولانا مدنیؒ گویا ہوئے وہ سب صحیح مگر اسباب بھی تو چاہیئے پھر حضرت حکیم الاسلامؒ نے فرمایا کہ حضرت آخر کون سے اسباب اختیار کرنے چاہئیں تو مولانا مدنیؒ نے فرمایا کہ حکومت کو درخواست دیجائے کہ وہ مدرسہ کے لئے فنڈ متعین کرے اس پر حضرت حکیم الاسلامؒ نے کہا حکومت سے درخواست کرنا تو کسی بھی درجے میں صحیح معلوم نہیں ہوتا، بہرحال حضرت حکیم الاسلامؒ نے حسن حیل سے بات ٹال دی پھر حضرت حکیم الاسلامؒ نے اگلی بات جو کہی وہ یہ تھی کہ اسی درمیان میں میرا سفر پیش آگیا اور چند ماہ کے لئے میں سفر پر چلا گیا جب کئی ماہ بعد مدرسہ کے اہتمام میں حاضر ہوا تو چند دن بعد حکومت کی ایک تحریر سامنے آئی جس میں حضرت حکیم الاسلامؒ کے الفاظ کے مطابق چھتیس سوالات تھے۔ میں سمجھ گیا کہ میری عدم موجودگی میں چوں کہ مولانا مدنیؒ ہی منصب اہتمام پر ہوتے تھے تو حضرت نے اپنی صوابدید پر حکومت کو درخواست بھیج دی اور امداد بھی مدرسہ میں آگئی اب امداد کے بعد یہ سوالات کی فہرست تھی جو میرے سامنے تھی میں نے کسی ملازم کے ذریعہ حضرت مدنیؒ کو اہتمام میں بلایا اور بلا کے کچھ کہے بغیر وہ سوالات کی پرچی حضرت کے سامنے رکھ دی، بس کیا تھا حضرت مدنیؒ حکومت پر خوب چراغ پا ہوئے اور فرمایا کہ فوراً آئی ہوئی رقم اس پرچی کے ساتھ واپس کردی جائے۔ ظاہر ہے کہ رقم تو خرچ

ہوچکی تھی۔لہٰذا دیوبند کے رئیس اعظم جمیل کو بلایا گیا جن سے مدرسہ بوقت ضرورت قرضہ لیا کرتا تھا، چنانچہ اتنی رقم ان سے قرضہ لی گئی اور عطائے تو بلقائے تو وہ رقم اور پرچی حکومت کو واپس کردی گئی۔

دوسرا واقعہ جو ہمارے سامنے تھا کہ حضرت حضرت حکیم الاسلامؒ کسی سفر میں تشریف لے گئے جب واپس آئے تو نائب مہتمم صاحب مولانا معراج الحق صاحبؒ نے حضرتؒ سے کہا کہ حضرت خزانہ خالی ہورہا ہے، مدرسہ کا خرچہ کیسے چلے گا تو حضرتؒ نے فرمایا کہ اسکا مطلب یہ ہے کہ ہم سے کوئی بڑی غلطی ہوئی ہے جس کا یہ نتیجہ ہے۔آیئے بیٹھ کر سوچتے ہیں اور اس کا تدارک کرتے ہیں، اس کے کہنے کے بعد مولانا معراج الحق صاحبؒ نے فوراً کہا حضرت آپ سے نہیں بلکہ مجھ سے غلطی ہوئی ہے جب آپ سفر میں تشریف لے گئے تو میں نے تعمیر کے مد کی رقم بینک کے سود حاصل ہونے والے شعبہ میں ڈال دی تا کہ اس سودی پیسے سے حمامات وغیرہ طلبہ کے لئے بنادیئے جائیں تو معاً حضرت حکیم الاسلامؒ نے فرمایا کہ فوراً سود والے اکاؤنٹ سے رقم نکال لیجئے، چنانچہ ماشاءاللہ رقم نکالتے ہی چندہ آنا شروع ہوگیا اور خزانہ اپنی سطح پر پہنچ گیا۔

تیسرا واقعہ جو مجھے حضرتؒ کے خاص لوگوں نے بتایا کہ حضرتؒ احمد آباد سے دلی تشریف لارہے تھے اور سفر ہوائی جہاز کا تھا راستہ میں پائلٹ نے اعلان کیا کہ جہاز خطرہ میں ہے۔ چنانچہ تمام لوگ پریشان ہوگئے مگر حضرتؒ پر کچھ بھی اثر نہ تھا اسی اثناء میں حضرتؒ کے بڑے پوتے جو کم عمر تھے گھبرا کر کہنے لگے کہ دادا جان اب کیا ہوگا؟ حضرتؒ کا جواب سنئے اور امین خزانہ دارالعلوم دیوبند کی امانت کی برکت دیکھئے کہ فرمایا بیٹا کچھ نہیں ہوگا ہم اللہ کی حفاظت میں جہاز سے دہلی پہنچیں گے، اس لئے کہ دارالعلوم کی رقم میرے پاس ہے اللہ تعالیٰ اس کو ضائع نہیں فرمائیں گے۔ فللّٰہ درہ.

بندہ کا انٹرویو تدریس کے سلسہ میں جب ہوا تو دس حضرات میں سے دو کو مدرس رکھنا تھا بندہ کو حضرت والاؒ نے عارضی طور پر مدرس رکھ لیا تھا، اس لئے کہ مہتمم کو اتنا ہی اختیار تھا اصل تقرر تمام شوریٰ والوں پر موقوف تھا، چنانچہ انٹرویو کے بعد بندہ کو پورے نمبر ملے جب کہ انٹرویو لینے والوں میں سعید احمد اکبرالہ آبادیؒ، قاری سجاد صاحبؒ، صدرالمدرسین مولانا فخرالحسن صاحبؒ، اور مولانا مرغوب الرحمٰن صاحبؒ اور جناب حضرت مہتمم صاحبؒ تھے چنانچہ جب دوسرے دن میں حضرت والاؒ کی مجلس میں حاضر ہوا تو حضرت ہمیں دیکھ کر کرسی سے کھڑے ہوگئے اور فرمایا چونکہ مولوی خالد اب دارالعلوم دیوبند کے استاذ ہوگئے تو ہمارے بھی استاذ ہوگئے اللہ اللہ دارالعلوم دیوبند کی عظمت کو سمجھنے والے اور چار چاند لگانے والی یہ ہستیاں تھیں اور اگلی بات جو فرمائی وہ تو میرے لئے نعمت بلکہ سامان مغفرت ہے وہ یہ ہے مولوی خالد نے میری لاج رکھ لی۔

اب حضرتؒ کی وفات کے موقع پر بے ساختہ کچھ بے قافیہ اور بے وزن اشعار بن گئے تھے، اس کو پیش کرر ہا ہوں، جو درج ذیل ہیں:

اللہ کو پیارے ہوئے وہ طیب والا صفات — جنت الفردوس میں جن کا تھا بے حد انتظار
اشرفؔ ومحمودؔ واحمدؔ قاسمؔ نانوتویؒ — سب کے سب بس منتظر تھے انکے با صد اضطرا
کہہ رہے ہیں سب فرشتے آ رہا ہے کون یہ — اور حوریں منتظر تھیں ہر طرف اور بے قرار
تاریخ چھ شوال کی اور وقت بعد عصر کا — کر گئے رحلت جو تھے ماوائے علم بے شمار
سیرت وصورت میں اکمل مظہر علم وعمل — کون اب ثانی ہے ان کا بلکہ سب ہیں اشکبار
دین کی خدمت میں گزری عمر ان کی بے شبہ — علم کے نشو ونما میں ان کا حصہ صد ہزار
مرکز دین ہے جو شہرت یافتہ دیوبند سے — اس کے رأس المال بھی تھے اور تھے اس پر نثار
مہتمم بھی تھے وہ اس کے اور حقیقی سرپرست — ہمدرد بھی سچے تھے اس کے اور سچے غمگسار
آہ! اے دیوبند تو صد آہ اے دیوبند تو — اٹھ گیا سر سے تیرے وہ تیرا سچا غمگسار
کس طرح توصیف انکی میں کروں کیسے کروں — کچھ بھی کہوں جتنا کہوں ان سب کا ہوگا اک شمار
علم کے مورد بھی وہ تھے علم کے منہل بھی تھے — اب پیاسے کیا کریں گے لاکھ پائیں جوئے بار
اے خدا تو مغفرت انکی کرے اور بخش دے — **جنة من تحتها الانهار تجری** بے شمار
کر معیت سرور کونین کی ان کو عطا — عرش کے نیچے جگہ دے تا کہ ہو ان کو قرار
جس طرح عثمانؓ ذی النورین بیحد نرم تھے — شورشیں لاکھوں ہوئیں لیکن رہے وہ صبر یار
بے شبہ یہ بندۂ طیب ترا بھی نرم تھا — شورشیں سہتا رہا وہ صبر سے ہوا ہمکنار
صبر کے بدلے میں انکو اپنی ذات پاک دے — رات دن تیری زیارت بس رہے ان کا شعار
اے خدا اس طیّبی کو بھی فلاح دین دے — اور دنیا میں غنا دے آخرت میں اپنا پیار

............❖............

حکیم الاسلامؒ کے خانوادۂ فاروقی سے روابط

مولانا عبدالعلی فاروقی

دارالعلوم فاروقیہ، کاکوری، لکھنؤ

رب کائنات کے اس انعام کی شکرگزاری کے لئے زبان وقلم میں سکت نہیں کہ اس نے ایک ایسے خانوادہ کا فرد بنا کر اس عالمِ رنگ وبو میں بھیجا جہاں علمی ودینی شخصیات سے ربط وتعلق کے لئے خاندانی نسبت ہی کافی تھی اور اب آباء واجداد کی نسبت سے اس ''حلال کمائی'' کا کیوں نہ ذکر کروں کہ اس بے سواد راقم الحروف نے گھر بیٹھے ہی وقت کی ایسی ایسی اہم اور جلیل القدر شخصیات کی زیارت اور جوتیاں سیدھی کرنے کی سعادت حاصل کرلی جن کی ایک جھلک پانے کے لئے ''باتوفیق'' لوگوں کو نہ جانے کیسے کیسے پاپڑ بیلنا پڑتے تھے؟ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاء.

ان مقتدر شخصیات میں ایک نمایاں نام حضرت حکیم الاسلامؒ کا بھی ہے، جن کی زیارت اور بار بار زیارت ''حدشعور'' میں داخل ہونے سے کتنا پہلے ہوچکی تھی؟ یہ یادنہیں! ہاں یہ ضرور یاد ہے کہ اس وقت بھی ان کا اُجلا اُجلا سراپا، ان کا روشن روشن چہرہ، ان کا نرم نرم لہجہ اور ان کی نسیم برلب گفتگو اتنی اچھی لگتی تھی کہ بے ساختہ ان جیسا بن جانے کی ''طفلانہ تمنائیں'' مچلنے لگتی تھیں اور پھر سن شعور تک پہنچنے پر ان تمناؤں نے یہ تعبیر اختیار کرلی کہ اگر ''اجالوں کے سفیر'' مذہب اسلام کو عالم مثال میں جسمانیت عطا کی جائے تو وہ مجسم ہو کر وہی ہوگا جسے ہم ''حکیم الاسلام'' کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔''

بلاشبہ حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ ایک بلند پایہ خطیب تھے۔ بے مثال منتظم تھے، متکلم اسلام تھے، عظیم المرتبت مرشد تھے، سرمایۂ اسلاف کے جامع تھے، مقبول ترین استاذ تھے اور اپنے لب ولہجہ، اثر ونفوذ، اخلاق وکردار اور حسنِ ظاہر وباطن کے لحاظ سے ہماری اس زمین پر حق کی ایک چلتی پھرتی، مسکراتی

بولتی نشانی تھے اوران کی کتاب زندگی کے ان حسین عنوانوں کا اجاگر ہونا اخلاف کے لئے ضروری بھی ہے اور محسن شناسی کا تقاضا بھی، تاہم راقم الحروف نے ان سب سے ہٹ کر جو عنوان اختیار کیا ہے اس کے ذریعہ اپنی تہی مائیگی کے اعتراف کے ساتھ ہی حکیم الاسلام کی نسبتوں کی قدردانی اور انداز خردنوازی کی ایک جھلک دکھانا بھی مقصود ہے۔

امام اہل سنت حضرت مولانا محمد عبدالشکور فاروقیؒ اوران کے برادرِ خورد جامع العلوم حضرت مولانا محمد عبدالرحیم فاروقیؒ سے حکیم الاسلامؒ کے برادرانہ رشتہ اور ربط باہمی کی تفصیلات پیش کرنے سے تو راقم الحروف عاجز ہے، ہاں حکیم الاسلام کے وہ تعزیتی خطوط پیش نظر ہیں جوان دونوں بزرگوں کی وفات کے موقع پران کے ورثاء کے نام بھیجے گئے۔

دسمبر ۱۹۵۶ء میں جامع العلوم حضرت مولانا محمد عبدالرحیم صاحب فاروقیؒ کی وفات کے موقعہ پران کے برادرا کبر امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور صاحبؒ کے نام ایک اور صاحب زادۂ گرامی حضرت مولانا عبدالحلیم فاروقیؒ کے نام یکے بعد دیگرے بھیجے گئے۔ دوخطوں میں حضرت حکیم الاسلامؒ نے نہ صرف اپنے گہرے ربط وتعلق کے ساتھ صدمہ کا اظہار فرمایا ہے بلکہ حضرت مولانا محمد عبدالرحیم صاحبؒ کی جلالتِ علم اوراخلاق وتواضع کا جس والہانہ وغیررسمی انداز میں ذکر فرمایا ہے اس سے ہم خردوں کو اپنے جدامجدؒ کے مرتبہ ومقام کو سمجھنے میں بہت کچھ رہنمائی ملی۔ اسی طرح اپریل ۱۹۶۲ء میں امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقیؒ کی وفات کے موقع پر حضرت حکیم الاسلامؒ نے اپنے تعزیتی خط میں اور پھر وفات کے بعد ان کے قائم فرمودہ ''شہدائے اسلام'' کے سالانہ جلسوں میں پہلی تشریف آوری میں دورانِ تقریر حضرت امام اہل سنتؒ کے سانحۂ وفات پر جس گہرے قلق اور فکرمندی کا اظہار فرمایا، اس کا لفظ لفظ درد و محبت میں ڈوبا اور ہرقسم کے تکلف وتصنع سے پاک تھا اوراس کی تاثیر ''از دل خیزد بردل ریزد'' والی تھی۔

۱۹۶۲ء تک چوں کہ راقم الحروف سن بلوغ کو بھی نہیں پہنچا تھا اس لئے خانوادۂ فاروقی کے ان دونوں بزرگوں کے ساتھ حضرت حکیم الاسلامؒ کے روابط شعوری مشاہدہ وحفظ کے لائق نہ تھے، البتہ ان کے اخلاف اوراپنے بزرگوں سے اس سلسلہ میں جو کچھ سنا اوراس خانوادہ کے سلسلہ میں حکیم الاسلامؒ کی جن مراعات کا مشاہدہ کیا وہ بے غرض اور گہرے دینی رشتہ کے ثبوت کے لئے کافی ہے۔

(ا) امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور فاروقیؒ کے قائم فرمودہ لکھنؤ کے تاریخی پندرہ روزہ جلسہ ہائے ''شہدائے اسلام'' میں ہرسال کسی ایک روز حکیم الاسلامؒ نے شرکت اوراپنی گہربار تقریر کو لازمی رکھا، حتیٰ کہ

آخر کے دور ضعف ونقاہت میں جب کہ اطباء کے مشورہ پر رات کے جلسوں میں شرکت موقوف فرمادی تھی، قدیم ربط وتعلق اور وضع داری کا پاس ولحاظ رکھتے ہوئے ناغہ نہ فرما کر تشریف لائے اور باشندگان لکھنؤ کو دن کی ایک پر ہجوم خصوصی نشست میں اپنے ارشادات عالیہ سے مستفید فرماتے ہوئے اصلاح عقائد کے سلسلہ میں ان تاریخی جلسوں کے خصوصی کردار، جلسوں کے بانیان اور اس وقت کے منتظمین سے اپنے خصوصی ربط ورشتہ کو تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا۔

(۲) حج بیت اللہ کے لئے خانوادۂ فاروقی کے متعدد افراد اور حکیم الاسلامؒ ایک ہی بحری جہاز میں سفر کر رہے تھے۔ دوسری طرف اسی جہاز میں بریلوی مسلک کے مشہور جارح مقرر ومناظر مولوی حشمت علی بھی ہم سفر تھے اور اپنی عادت کے مطابق موقع بہ موقع جراحت پاشی کرتے جارہے تھے، ان کے لئے یہ منظر ہی کیا کم روح فرسا تھا کہ حضرت امام اہل سنتؒ، حضرت جامع العلومؒ، حضرت حکیم الاسلامؒ اور خانوادۂ فاروقی کے دیگر علماء کے علاوہ متعدد علمائے حق، ایک ساتھ اسی جہاز میں سوار ہو کر زیارت حرمین کے لئے جارہے تھے جس میں سوار ہو کر سفر کرنا آں موصوف کی بھی مجبوری تھی؟ چنانچہ بحری جہاز کے اس طویل سفر میں آتے جاتے، چلتے پھرتے وہ ہمارے علمائے حق کو دیکھ کر اپنی عادت کے مطابق کوئی نہ کوئی فقرہ کس دیتے اور اپنے لئے نشاط روح کا سامان فراہم کر لیتے، خصوصاً حکیم الاسلامؒ کو دیکھ کر وہ بلند آواز میں یارسول اللہ کہہ کر اپنے خیال کے مطابق ''فریضۂ حق'' ادا کرنا نہیں بھولتے تھے؟

امام اہل سنتؒ کے فرزند اور حکیم الاسلامؒ کے شاگرد رشید حضرت مولانا محمد عبدالسلام فاروقیؒ نے کئی مرتبہ یہ چھیڑ چھاڑ دیکھ کر آخر اپنے استاذ محترم سے اصرار کے ساتھ درخواست کی کہ حضرت! یا تو آپ خود ان کی ''زبان بندی'' کا انتظام کیجئے یا پھر مجھے جواب دینے کی اجازت دیجئے؟ حکیم الاسلامؒ اس وقت تو مسکرا کر خاموش ہو گئے، لیکن اگلے موقع پر جہاز کی بالائی منزل سے اترتے ہوئے حکیم الاسلامؒ کو دیکھ کر جب مولوی صاحب موصوف نے یارسول اللہ کا نعرہ بلند کیا تو حکیم الاسلامؒ نے زیر لب مسکراہٹ کے ساتھ برجستہ فرمایا **انی لستُ برسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم** (میں رسول اللہ ﷺ نہیں ہوں) اس برجستہ اور حکیمانہ جواب نے مولوی صاحب کی بولتی بند کر دی اور پھر وہ پورے سفر کے دوران نظریں بچا کر گذر جانے ہی میں عافیت سمجھتے رہے۔

(۳) خانوادۂ فاروقی کے ایک فرد کی حیثیت سے خود راقم الحروف بھی حضرت حکیم الاسلامؒ کی شفقتوں وعنایتوں سے خوب مالا مال ہوا۔ از ہر ہند دارالعلوم دیوبند میں زمانۂ طالب علمی (۹۰-۱۳۸۷ھ) کے قیام

کے دوران ''طیب منزل'' کی عصر بعد کی مجلس میں برابر حاضری ہوتی، اس کے علاوہ دارالعلوم کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے اپنی مادر علمی کے سربراہ اعلیٰ کی خدمت میں اپنی غرض لے کر بھی کبھی کبھی حاضری ہوتی اوراپنے فخر واعزاز کے لئے بس یہی کیا کم تھا کہ ہزاروں طلبہ کے درمیان حضرت حکیم الاسلامؒ مجھے بھی پہچانتے تھے اوراس پہچان سے فائدہ اٹھانے کا ایک واقعہ اس وقت بھی یاد آرہا ہے کہ اپنے ساتھی کو (جو غریب اور غیر مستطیع تھے اورایک کتاب میں نمبر کم آنے کی وجہ سے ان کی امداد موقوف ہوگئی تھی) لے کر ایک ''خاص اعتماد وزعم'' کے ساتھ دارالعلوم کے دفتر اہتمام میں حاضر ہوا اور امداد جاری کئے جانے کے سلسلہ میں پہلے سے لکھی ہوئی درخواست حضرت والا کی خدمت میں پیش کردی، حضرت والا نے درخواست دیکھ کرفرمایا، یہ تو ایک کتاب میں فیل ہے۔ضابطہ کے مطابق ان کا کھانا جاری نہیں رہ سکتا۔ میں نے ''پہچان کے اسی نشہ'' میں عرض کردیا،لیکن حضرت! آپ کو پچاس طلبہ کا کھانا جاری کرنے کا خصوصی اختیار بھی تو ہے؟ جواب میں حضرت والا نے مسکراتے ہوئے فرمایا: اچھا آپ لوگوں کو اس کا بھی علم ہے اور پھر خانوادۂ فاروقی کے اس ایک ادنیٰ طالب علم کی لاج رکھتے ہوئے درخواست پر کھانا جاری کئے جانے کا حکم تحریر فرما دیا، نہ خوشامد کرائی، نہ سفارش طلب کی، نہ ہی معاملہ کو التوا میں ڈالا تو پھر اسے خانوادۂ فاروقی سے حکیم الاسلام کے خصوصی ربط وتعلق کے سوااور کیا کہا جاسکتا ہے؟

(۴) ۱۹۷۲ء میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے قیام وتشکیل کے سلسلہ میں منعقد ہونے والے ''بمبئی کنونشن'' کا دعوت نامہ علمائے دارالمبلغین کے نام بھی آیا، اس وقت کی ''خاص مصلحتوں'' کی وجہ سے اس کنونشن اور مجوزہ بورڈ میں شرکت کا دعوت نامہ علمائے شیعہ کو بھی دیا گیا تھا، علمائے دارالمبلغین کو اس کا علم ہوا تو خانوادۂ فاروقی کے اس وقت کے سربراہ حضرت مولانا عبدالسلام فاروقیؒ نے حکیم الاسلامؒ کو خط لکھ کر اس کنونشن میں اپنی اوراپنے ساتھیوں کی رائے سے معذرت کرلی۔

اس کنونشن میں شرکت کرنے والوں کی اور شرکت کی خواہش رکھنے والوں کی کمی نہیں تھی، نہ ہی چند علمائے مبلغین کے شریک نہ ہونے سے کنونشن کی ناکامی کا کوئی اندیشہ تھا، تاہم یہ حکیم الاسلامؒ کی قدرافزائی اور خانوادۂ فاروقی سے خصوصی ربط کی بات ہے کہ حکیم الاسلامؒ دیوبند سے سفر کرکے لکھنؤ تشریف لائے اور اپنے خردوں کے سامنے ان کے موقف کی صحت کا اعتراف کرتے ہوئے ''مصلحت وقت'' کے پیش نظر کنونشن میں ان کی شرکت پر اصرار فرمایا اور یہاں تک فرمایا کہ حضرت امام اہل سنتؒ، ان کے رفقاء اور اخلاف نے مسلمانوں کو ایک ''فکر صالح'' عطا کی ہے، جس کے اعتراف میں آپ حضرات کی اس کنونشن

میں شرکت کو میں ضروری سمجھتا ہوں اور آپ حضرات کی عدم شرکت سے اس کنونشن میں مسلمانوں کے ایک ''صالح مکتب فکر'' کی کمی محسوس کی جائے گی۔

حضرت حکیم الاسلامؒ کی اس قدر افزائی اور اس ربط وتعلق کا یہ نتیجہ تو نکلنا ہی تھا کہ پھر خانوادۂ فاروقی سے حضرت مولانا عبدالسلام فاروقی صاحبؒ، حضرت مولانا عبدالحلیم فاروقی صاحبؒ اور دارالمبلغین کے استاذ حضرت مولانا قاری محمد صدیق صاحبؒ نے اس کنونشن میں شرکت کی۔

(۵) اور خانوادۂ فاروقی کے حکیم الاسلامؒ کے گہرے ربط و رشتہ کا برملا اظہار تو اس وقت ہوا جب ۱۹۳۸ء میں حضرت حکیم الاسلام لکھنؤ کے ایک رئیس کی خصوصی دعوت پر تشریف لائے اور حضرت مولانا عبدالحلیم فاروقی صاحب کی اس درخواست کو شرف قبول بخشا کہ قصبہ کاکوری میں ان کے قائم کئے ہوئے نوخیز مدرسہ دارالعلوم فاروقیہ تشریف لے جا کر ادارہ کی ترقی وقبولیت کے لئے دعا فرمادیں، بعد نماز عصر کا وقت طے ہوا اور حضرت والا نے از راہِ شفقت اپنے میزبان پر اعتماد کرتے ہوئے مولانا عبدالحلیم صاحب سے فرمایا کہ آپ کاکوری پہنچیں۔ میں انشاء اللہ مقررہ وقت پر پہنچ جاؤں گا اور پھر جب کاکوری سے روانگی کا وقت آیا تو کچھ یارانِ ستم پیشہ نے سواری، ڈرائیور اور راستہ کی خرابی کے حوالوں سے حضرت والا کے خیر سے دارالعلوم فاروقیہ اور قصبہ کاکوری کو محروم کردینے کی تدبیریں کیں۔ حضرت والا نے اس سازش کو بھانپتے ہوئے اپنے ''عمومی مزاج'' کے خلاف سخت رخ اختیار کرتے ہوئے صاف فرمایا کہ ''یہ تو ہوسکتا ہے کہ کسی پروگرام میں شرکت کئے بغیر میں یہیں سے دیوبند واپس چلا جاؤں لیکن یہ نہیں ہوسکتا کہ میں یہاں رہ کر کاکوری نہ جاؤں اور مولانا عبدالحلیم صاحب کی دل شکنی کروں'' اور پھر تمام راہیں آسان ہوگئیں اور حکیم الاسلام اپنے وعدے کے مطابق کاکوری پہنچے اور مدرسہ میں چند منٹ ٹھہرنے اور دعا کرنے کے بعد واپس تشریف لائے۔

یہ چند واقعات وہ مشاہدات ہیں جن سے خانوادۂ فاروقی سے حکیم الاسلامؒ کے اس ربط کا اظہار ہوتا ہے جس کے ذریعہ حضرت حکیم الاسلامؒ کے ذاتی جواہر، اخلاقی کمالات، دین اور اہل دین سے الفت، مرتبہ شناسی اور خردنوازی کے نمونے بھی سامنے آجاتے ہیں۔

............❖............

حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ
اور
خطابت

مولانا عمید الزماں قاسمی کیرانویؒ

واقعہ یہ ہے کہ فن خطابت (بالخصوص زیر بحث اردو زبان میں فن خطابت) میں علماء کرام کا حصہ بہت ہی نمایاں نظر آتا ہے۔ تفصیلی جائزے کے بغیر قطعیت کے ساتھ تو نہیں کہا جاسکتا لیکن بادی النظر میں مقررین اور خطیبوں کی صف میں علماء دوسروں کے مقابلہ تعداد اور امتیاز دونوں ہی اعتبار سے غالب وفائق نظر آتے ہیں۔

ماضی قریب میں جب ہم صفِ اوّل کے خطیبوں کی تلاش میں حافظہ پر زور ڈالتے ہیں تو سطح ذہن پر جن شخصیات کے اسماء گرامی فوری طور پر ابھر کر آتے ہیں ان میں سے چند حسبِ ذیل ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا احمد سعید دہلویؒ، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ، مولانا محمد طیب صاحبؒ، مولانا محمد منظور نعمانیؒ، مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ۔

ان مقررین اور خطیبوں میں سے ہر ایک کا اپنا ایک الگ مرتبہ ومقام ہے، اور ہر ایک کی اپنی خطیبانہ خصوصیات ہیں، یہ وہ خطیب ہیں جنھوں نے خطابت کے دامن کو وسیع بھی کیا ہے اور مزین وآراستہ بھی، اور اس کو نئی جہات وابعاد (Dimension) عطا کر کے فن کی بلندیوں تک پہنچا دیا ہے۔

مذاکرۂ علمی کے لائق ومحترم منتظمین کی جانب سے بطور مثال تجویز کردہ عنوان ''فن خطابت میں علماء کا

حصہ'' کو اپنے عموم کے ساتھ جوں کا توں رکھنے کی صورت میں میرے لیے چوں کہ مصروفیات اور کم مائیگی کے باعث نہ موضوع کے ساتھ انصاف ممکن تھا اور نہ ہی اس کی وسعتوں کو سمیٹنا، اس لیے میں نے اپنے عمل کو مختصر اور آسان بنانے کے لیے ضروری سمجھا کہ کسی ایک ہی شخصیت کو موضوع بنایا جائے چناں چہ اس سلسلہ میں تھوڑا غور وفکر کیا گیا اور نتیجہ کے طور پر مذکورہ بالا عنوان کو ترجیح حاصل ہوگئی۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کی شخصیت گوناگوں اوصاف وامتیازات کی حامل تھی، انھوں نے اپنے ان اوصاف وامتیازات کو استعمال کرتے ہوئے دین وملت کی بے مثال خدمات انجام دیں، وہ علمی وعملی دونوں سطحوں پر سرگرم رہے اور دونوں ہی کے تعلق سے اپنی الگ تاریخ بنائی، دارالعلوم دیوبند کے منصب اہتمام وانتظام کی گراں بار ذمہ داریوں اور اس میں شبانہ روز اشتغال اور آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کی سرپرستانہ مصروفیات کے باوجود ان کا اشہبِ لسان وقلم اپنے معمول کی تیز رفتاری کے ساتھ زندگی بھر دوڑتا رہا۔ جس کے نتیجے میں ڈیڑھ سو سے زائد علمی شہ پارے اسلامی مکتبات کی زینت بنے اور وہ آج تشنگانِ علم کی سیرابی وآسودگی کا ذریعہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت حکیم الاسلامؒ جیسی عبقری اور متنوع الجہات شخصیت پر اب تک بہت کم کام ہوسکا ہے، ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ آپ کی شخصیت اور آپ کی دینی وملی خدمات کو اجاگر کرنے کے لیے دیوبند اور دیوبند سے باہر متعدد علمی اکیڈمیاں قائم کی جاتیں اردو کے علاوہ دوسری اہم زبانوں عربی انگلش وغیرہ میں آپ کی منتخب پُر مغز اور اپنے موضوع پر نادر کتابوں کا ترجمہ کرایا جاتا اور ان کی اشاعت وتوسیع کی جاتی۔ یہ دارالعلوم دیوبند سے نسبت اور اس کے اکابر واسلاف سے عقیدت ومحبت رکھنے والے ہر فرد کا فریضہ ہے۔

اس وقت ان سطور میں حضرت حکیم الاسلامؒ کی پہلو دار شخصیت کے صرف ایک پہلو ''خطابت'' پر کچھ اظہار خیال کرنا ہے۔ حضرت کی شخصیت کے تعلق سے یہ موضوع کچھ کم اہمیت کا حامل نہیں، ضرورت کا تقاضا تو یہ تھا کہ اس پر قلم اٹھانے سے قبل آپ کے کل یا بیشتر تقریری سرمایے کا مطالعہ کیا جاتا۔ اس پر تجزیاتی نگاہ ڈالی جاتی، اسی کے ساتھ اس قبیل کی دوسری اہم شخصیات اور ان کے مدوّن لسانی کارناموں کو پیش نظر رکھا جاتا، فنی تقاضوں سے بھی بحث کی جاتی اور نتائج پر گفتگو کی جاتی، اس طرح کے محاکے اور موازنے کے بعد ہی کسی شخصیت کا متعلقہ موضوع کے حوالے سے امتیاز واضح ہو پاتا ہے۔ میں یہ اعتراف ضروری سمجھتا ہوں کہ اپنی بے بضاعتی کے ساتھ ساتھ کثرتِ مشاغل کی بناء پر مجھے اس کا موقع نہ مل سکا۔

میں نے بنیادی طور پر (کتاب) ''خطبات حکیم الاسلام'' کو پیش نظر رکھا ہے، جس کی اب تک دس جلدیں شائع ہوچکی ہیں، اسے حکیم الاسلام اکیڈمی دیوبند کی طرف سے مولانا محمد ادریس ہوشیار پوری نے

مرتب کیا ہے، میرے سامنے دارالکتاب دیوبند کا طبع کردہ نسخہ ہے، ان دس جلدوں میں مجموعی طور پر کل ۱۰۸؍خطبات شامل ہیں، جن میں سے بعض تو خود ان کی زندگی میں تصنیف کی شکل میں شائع ہو چکے ہیں اور اب ان کی حیثیت باضابطہ اپنے موضوع پر لکھی گئی کتابوں کی ہے۔ان میں سے ایک اہم تقریر وہ ہے جو آپ نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ''انجمن اسلامی تاریخ وتمدن'' کی دعوت پر ''اسلام اور سائنس'' کے موضوع پر کی تھی۔ زیرنظر خطبات کے مجموعے میں یہ خطبہ یا تقریر چھٹی جلد میں تقریباً سو صفحات پر مشتمل ہے۔اس تقریر کو اس وقت بھی کافی شہرت و پذیرائی حاصل ہوئی تھی اور آج بھی علمی حقائق ودقائق رموز ونکات اور بصائر وعبر کے اقتباسات وواقعات سے اس کی سطر سطر پڑ اور پڑھنے کے لائق ہے، اپنے منصب وشہرت کے اعتبار سے تقریر وخطابت حضرت حکیم الاسلامؒ کی ضرورت تو تھی ہی بلکہ شاید یہ کہنا غلط نہ ہو کہ وہ لوگوں کی توقعات اور اصرار کے باعث ایک مجبوری بھی تھی۔ ملک و بیرون ملک اسفار کا سلسلہ زندگی کے اخیر کے سالوں تک جاری رہا اور شاید ہی کوئی سفر ایسا ہوتا ہو جس میں آپ کو تقریر بلکہ تقریریں نہ کرنی پڑتی ہوں۔ مولانا احمد سعید دہلویؒ نے آپ کے بارے میں کہا تھا کہ اب تک مہتممین دارالعلوم دیوبند ثوابت تھے اور مولانا محمد طیب صاحب سیارہ ہیں۔اس کے علاوہ ۲۰/۲۲؍سالوں تک جامع مسجد دیوبند میں جمعہ کے دن تقریر آپ کا معمول تھا۔ مسلسل لکھتے اور بولتے رہنے کی وجہ سے کہنا چاہیے کہ آپ کو معلومات و یادداشت آپ کی زبان پر رہتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ تقریر کے دوران نہ آپ کو لکنت لگتی اور نہ آپ آدھی ادھوری یا ناقص بات یا حوالہ کے ساتھ آگے بڑھنے کی کوشش کرتے۔ کئی کئی گھنٹے کی تقریر میں تکرار کا نام ونشان نہیں ہوتا۔ حقائق ومعارف اور اسرار شریعت کے بند اس طرح کھولتے چلے جاتے جیسے سب کچھ حفظ کر کے آئے ہوں، یہ سب آپ کی قادرالکلامی، قوت گویائی اور جودت طبع کا فیض تھا۔ بات بات میں نکتہ پیدا کرنا آپ کا خاص امتیاز تھا۔ ان کے خطبات کی بعض اور بھی خوبیاں ہیں جیسے وہ اختلافی مسائل کو کبھی نہیں چھیڑتے تھے۔ ایسے کسی مسئلے پر انھوں نے شاید ہی کبھی کوئی تقریر کی ہو۔ گویا وہ ''تو برائے وصل کردن آمدی نے برائے فصل کردن'' کے داعیانہ نکتے پر پوری طرح عمل پیرا تھے۔ بے سروپا قصوں کے بیان سے پرہیز کرتے اور ہمیشہ مستند روایات کے سہارے اپنی بات کو ثابت یا مدلل کرتے۔ ذیل میں ان کی بعض اہم خوبیوں پر بطورِ نمونہ الگ الگ عنوانات کے ساتھ روشنی ڈالی جارہی ہے۔

جداگانہ طرز

نثر کے تعلق سے مرزا غالب کا ایک اہم ادبی کارنامہ خود ان کے بقول مراسلے کو مکالمہ بنادینا تھا۔ خطوط میں انھوں نے بالالتزام جو اسلوب اختیار کیا وہ روزمرہ کی باہمی گفتگو سے مشابہ تھا۔ اس ندرت

اسلوب سے ادب کا ایک نیا نثری باب وَا ہوا۔ حکیم الاسلامؒ کے تعلق سے بلا مبالغہ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ انھوں نے اپنی برجستہ اور فی البدیہہ تقریروں میں تحریر وتصنیف کا علمی رنگ بھر دیا۔ جنھیں صاحب تقریر کی زبان سے سنیے تو مکمل معنوی میں تقریر اور اگر انھیں زیب قرطاس کر دیا جائے تو مکمل معنوی میں ایک مقالہ اور مضمون۔

یہ وصف اور رنگ اسی وقت اور انہی شخصیات کے یہاں پیدا ہوسکتا ہے جنھیں زبان اور قلم دونوں پر یکساں قدرت حاصل ہو، وہ دونوں کا شہسوار اور دونوں ہی کا رمز شناس ہو، میں نے حضرت حکیم الاسلامؒ کو خود بھی سنا ہے اور ان کو سننے والوں سے بھی آپ کے بارے میں سنا ہے۔ آپ کی زبان شستگی و شائستگی کا نمونہ تھی، ''نرم دم گفتگو'' آپ کا شعار تھا۔ نہایت نپے تلے جملے، ہر قسم کے حشو وزوائد، گنجلک پن سے پاک، فلسفیانہ مضامین کو بھی اسی سادگی اور پرکاری کے ساتھ بیان کرتے۔ بذلہ سنجی اور شگفتہ مزاجی بھی اس کا ایک حصہ ہے۔ لیکن اس اعتدال کے ساتھ کہ نام کو بھی آپ کی زبان اسلوب میں رکاکت اور غیر سنجیدگی نہیں آتی۔ طویل سے طویل تقریروں میں بھی نہ تو تکرار کا گزر ہوتا اور نہ ہی اصل لہجے اور اسلوب میں کوئی فرق پیدا ہوتا۔ بس شروع سے اخیر تک دریا کی سی روانی کے ساتھ آپ بولتے چلے جاتے تھے۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی لکھتے ہیں۔

''گھنٹوں بولتے تھے۔ زبان بڑی شگفتہ اور شائستہ کہیں کہیں ظرافت اور مزاح آمیزی، آواز از اوّل تا آخر یکساں، نہ زیر و بم نہ اتار چڑھاؤ، مگر ساتھ ہی منطقی استدلال اور فلسفیانہ تشقیق اس لیے تقریر عوام و خواص دونوں کے کام کی''۔

عوام کی رعایت

علامہ ابن قیم جوزیؒ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں عوام کو خطاب کرنے کے حوالے سے لکھا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ مخاطبین کی ضرورت و مصلحت کے تقاضوں کے مطابق خطاب فرماتے تھے۔ (**وکان يخطب فى كل وقت بما تقتضيه حاجة المخاطبين ومصلحتهم**) بسا اوقات ایک بڑا عالم اور لسان خطیب سامعین پر مطلوبہ اثر قائم نہیں کر پاتا۔ اس کی دیگر وجوہات کے علاوہ ایک بڑی وجہ یہی ہوتی ہے کہ موضوع تقریر کے مناسب انتخاب اور اس کے مشمولات کی ترسیل و تفہیم میں زبان و اسلوب کے اعتبار سے عام حاضرین کی رعایت نہیں ہو پاتی۔ اس سلسلے میں بہت سی عظیم شخصیات کا نام لیا جاسکتا ہے جو اپنے علم وفن میں نادرۂ روزگار و یکتائے زمانہ تھیں لیکن جہاں تک خطبات کے حوالے سے عوامی سطح پر ان سے استفادہ کا تعلق ہے تو اس کا دائرہ نہایت محدود اور مختصر ہی رہا۔ حضرت علیؓ کا قول: **حدثوا**

الناس بما یعرفون أتریدون أن یکذب اللہ ورسولہ تنبیہی طور پر اس حقیقت کی ترجمانی کرتا ہے۔
حضرت حکیم الاسلامؒ اہم سے اہم علمی، دینی اور فکری موضوعات کو سہولت و جامعیت کے ساتھ اس طرح عوام وخواص کے سامنے پیش فرمادیتے کہ استفادے کا معیار دونوں کے لیے کم وبیش یکساں ہوتا، اس کی سب سے بڑی مثال ان کی علی گڑھ کی مذکورہ بالا تقریر ہے دیکھنے کا مقام ہے کہ سائنس اور اسلام کے درمیان تقابل وتجزیہ کے موضوع کو انھوں نے کس خوبی سے نبھایا ہے، کتنی آسان اور جامع تعبیرات اور مثالوں کے ذریعہ اس سخت اور سنگلاخ موضوع کو عوام کے لیے قریب الفہم بنادیا ہے لیکن اس حوالہ سے یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ آپ کا لہجہ عوامی تھا، عامیانہ نہ تھا جس میں خطیبانہ ادائیں تو ہوتی ہیں، لیکن علمی شوکت ووقار سے خالی اور خوش بیانی اور حسن ادا تو ہوتا ہے لیکن پر تکلف ادب آمیزی کے ساتھ، حضرت حکیم الاسلامؒ فطری ذوق اور وہبی صلاحیتوں کے حامل تھے ان کے اندر تکلف وتصنع کا شائبہ بھی نہ تھا۔ مجمع خواہ بڑوں کا ہو یا چھوٹوں کا اور وہ خود چھوٹا ہو یا بڑا، حضرت حکیم الاسلامؒ کے لب ولہجے اور انداز بیان پر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

مولانا تقی عثمانی مدظلہ نے حضرت حکیم الاسلامؒ کے انداز خطابت پر روشنی ڈالتے ہوئے بالکل صحیح لکھا ہے:

''بظاہر تقریر کی عوامی مقبولیت کے جو اسباب آج کل ہوا کرتے ہیں، حضرت حکیم الاسلامؒ کے وعظ میں وہ سب مفقود تھے۔ نہ جوش نہ خروش، نہ فقرے چست کرنے کا انداز، نہ پر تکلف لسّانی، نہ لہجہ نہ ترنم، نہ خطیبانہ ادائیں، لیکن اس کے باوجود وعظ اس قدر مؤثر، دلچسپ اور مسحور کن ہوتا تھا کہ اس سے عوام اور اہل علم دونوں یکساں طور پر محظوظ ومستفید ہوتے تھے، مضامین اونچے درجے کے عالمانہ اور عارفانہ لیکن بیان اتنا سہل کہ سنگلاخ مباحث بھی پانی ہوکر رہ جاتے۔ جوش وخروش نام کو نہ تھا، لیکن الفاظ ومعانی کی ایک نہر سلسبیل تھی جو یکساں روانی کے ساتھ بہتی اور قلب ودماغ کو نہال کردیتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ منہ سے ایک سانچے میں ڈھلے ہوئے موتی جھڑ رہے ہیں۔ ان کی تقریر میں سمندر کی طغیانی کے بجائے ایک باوقار دریا کا ٹھہراؤ تھا جو انسان کو زیروزبر کرنے کے بجائے دھیرے دھیرے اپنے ساتھ بہا کرلے جاتا ہے۔''

ادبی اور لسانی ذوق

حکیم الاسلامؒ کی تقریروں میں جابجا ایسے نمونے ملتے ہیں جن سے ان کے ادبی ذوق ومزاج کا پتہ چلتا ہے۔ ادب صرف خوب صورت الفاظ، نادر تشبیہات واستعارات اور شعری ترکیبوں کے استعمال کا نام نہیں۔ ادب کے ظاہری ڈھانچے کی تشکیل میں یہ ضرور معاون ہوتی ہیں لیکن اصل چیز جس سے ''از دل

خیز د بر دل ریز د" والی کیفیت متکلم کے کلام میں پیدا ہوتی ہے دراصل لفظوں کا موزوں اور برمحل استعمال اور ان کی معنوی تہہ داری ہے جو صرف سامعہ نواز ہی نہیں بلکہ دل نواز بھی ہوتی ہے، جس میں صرف "فردوس گوش" ہونے کا ہی سامان نہیں ہوتا بلکہ قلب کو مہمیز کرنے کی صلاحیت بھی ہوتی ہے۔ غالب کے اس مشہور شعر میں اسی کیفیت کے اظہار کی نقشہ کشی یوں کی گئی ہے کہ ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

تاہم اگر لفظوں کے دروبست، جملوں کی ساخت، ترکیبات وتشبیہات کو ادب کی تعریف کے حوالے سے ذہن میں رکھیں تو اس کی مثالیں بھی حضرت حکیم الاسلامؒ کے یہاں کم نہیں ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

"صنائع حرف کے سلسلے میں لوہے لکڑی کے خوش نما اور عجیب وغریب سامان تعمیرات کے نئے نئے ڈیزائن اور نمونے، سیمنٹ اور اس کے ڈھلاؤ کی نئی نئی ترکیبیں اور انجینئروں کی نئی سے نئی اختراعات جب سامنے آئی ہیں تو سائنس کا نظر فریب چہرہ بھی سامنے کر دیا جاتا ہے کہ یہ سب اسی کے خم ابرو کی کارگزاریاں ہیں۔ ریل کی پٹریوں پر یہ دوطرفہ لاکھوں من پتھروں کے ڈھیر انہی پہاڑی پتھروں کے جگر پارے ہیں لیکن یہی طاقت ور لوہا جس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کا بڑے بڑے پہاڑوں نے لوہا مان رکھا ہے، جبھی تک طاقت ور ہے، جب تک کہ پتھروں کے سر پر ہے لیکن اگر اس لوہے کو کہیں آگ چھو جائے تو اس کا رنگ روپ متغیر اور چہرہ فق ہو جاتا ہے۔

"پانیوں کا سب سے بڑا گھر، بلکہ ابوالمیاہ سمندر اعظم کہ جس کی بے پناہ عظمت سے ڈر کر دنیا کا ربع مسکون گویا ایک طرف پڑا ہوا ہے اور جس کی کوہِ پیکر موجوں کا لگا تار سلسلہ خشکی کے کناروں پر اس طرح حملہ آور محسوس ہوتا ہے کہ گویا کرۂ زمین کو نگل جائے۔

"گویا وہ ایک آگ جو سر نیچا ہی نہیں کرتی تھی (دیا سلائی کی شکل میں) انسان کے سامنے تنکے چننے لگی اور اس کی رفعت وتعلّی خاک میں مل گئی۔ گویا برقی رو کی ایک عظیم الشان فوج ایک دبلے پتلے سپاہی (بجلی کے تار) کی قید میں گرفتار ہے"۔

پندرہ اگست ۱۹۵۷ء کو یوم آزادی کے دن اس موضوع پر آغاز تقریر کے یہ جملے کہ ملاحظہ فرمائیں اس میں لسان وبیان دونوں کی قوت کس حد تک کارفرما ہے:

"یہ آزادی آسمان سے بارش کی طرح ایک دم برس نہیں گئی بلکہ کتنے ہی صبر آزما دنوں کتنے ہی دار ورسن کے ہنگاموں اور قید وبند کے ہیبت ناک کٹہروں بلکہ کتنی ہی تڑپتی ہوئی لاشوں سے گزر کر یہ آزادی کی

دولت ہم تک پہنچی ہے۔ گو آج کی تاریخ میں آزادی کا پارسل ہمیں بیک دم اور پر امن طریق پر اچانک شب کے بارہ بجے موصول ہو گیا لیکن وہ کتنے تاریک سمندروں سے گزرتا ہوا ہندوستان پہنچا، کتنے طوفانوں میں سے نکلا، اور کتنی خطرناک خلیجیں اس کی راہ میں حائل ہوئیں جن کا کتنے ہی آہنی قسم کے انسانوں نے مقابلہ کیا۔''

خطبات حکیم الاسلامؒ کے مرتب لکھتے ہیں کہ: ایک موقع پر یہ مضمون ارشاد فرما رہے تھے کہ مطالب ومعانی کو صرف الفاظ سے ہی نہیں ادا کیا جاتا بلکہ لب ولہجہ اور انداز تکلم سے بھی الفاظ میں معنی بھرے جاتے ہیں اور اس کی مثال میں اردو کا ایک فقرہ ''کیا بات ہے'' پیش کیا کہ یہ انکار کے لیے بھی ہے اور اقرار کے لیے بھی۔ استفہام کے لیے بھی اور اخبار کے لیے بھی۔ داد وتحسین کے لیے بھی ہے اور زجر وتوبیخ کے لیے بھی۔ مرتب موصوف لکھتے ہیں کہ ایک گھنٹے تک حضرت حکیم الاسلامؒ ''کیا بات ہے'' کی تشریح کرتے رہے اور مجمع آپ کے بیان سحر سے عش عش کرتا رہا۔

حضرت حکیم الاسلامؒ اردو کے علاوہ فارسی اور عربی پر بھی اچھی دسترس رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ ان دونوں زبانوں میں بھی ضرورت کے وقت تقریر فرماتے۔ بالخصوص فارسی پر ایسے زمانے میں عبور جب کہ ہندوستان سے اس کی طنابیں کب کی اکھڑ چکیں، نیز شعر وشاعری سے فطری شغف اور اس کا ملکہ جس کی مثال ''عرفانِ عارف'' کے نام سے آپ کا شعری مجموعہ ہے یہی وہ سب صلاحیتیں تھیں جنھوں نے مل کر آپ کے لسانی اور ادبی ذوق میں غیر معمولی نکھار پیدا کر دیا تھا۔

تاثیر کلام

خطبے کی تعریف لغت میں اس طرح کی گئی ہے کہ: ''وہ ایسے نثری کلام کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ متکلم (خطیب) لوگوں کی جماعت کو خطاب کر کے اسے (اپنی بات کا) قائل بناتا ہے''۔ (**الكلام المنثور يخاطب به متكلم فصيح جمعا من الناس لإقناعهم.المعجم الوسيط**) اقناع (Convincing) کا عمل بغیر کلام کی تاثیر کے ممکن نہیں، تاثیر اقناع کے مقدمے کی حیثیت رکھتی ہے۔ حضرت حکیم الاسلامؒ کے خطبات کی انتہائی اہمیت وافادیت ان کی اس خوبیٔ تاثیر میں مضمر ہے۔ یہ تاثیر کیسے اور کیوں کر پیدا ہوتی ہے؟ حضرت حکیم الاسلامؒ خود اپنے لفظوں میں اس پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں:

''متکلم کے قلبی جذبات مخاطب پر اثر انداز ہوتے ہیں، زبان تو محض آلۂ ظہور ہے۔ اس لیے قلب میں خوف وخشیت، تقویٰ وطہارت اور تعلق مع اللہ ہے تو معمولی درجہ کے مضمون سے سامعین متاثر ہوتے ہیں ورنہ اونچے درجے کے علوم ومعارف بھی دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں''۔

حضرت حکیم الاسلامؒ کی واعظانہ تاثیر کے بہت سے واقعات مشہور ہیں، پہلی مرتبہ بمبئی ورود کے موقع پر ایک فرقے کے لوگوں نے حضرت حکیم الاسلامؒ کے خلاف اشتہارات چسپاں کرائے اور عوام الناس کو آپ اور علمائے دیوبند سے متنفر کرنے اور اس جلسے میں شرکت سے دور رکھنے کے سارے حربے اور ہتھکنڈے آزمائے۔ مخالفین کا ایک گروہ وہاں جلسے کو منتشر اور پراگندہ کرنے کے لیے موجود تھا حتی کہ اس میں بعض لوگ مسلح بھی اسٹیج سے کچھ فاصلے پر بیٹھے تھے۔ لیکن جب آپ کی تقریر ہوئی تو فضا یکسر تبدیل ہوگئی۔ مجالس حکیم الاسلامؒ میں اس اجتماع سے متعلق تحریر ہے کہ اس سے قبل کسی دیوبندی عالم کے دوسرے فرقے کی مسجد میں داخل ہوجانے پر مسجد دھلوا کر پاک کرائی جاتی تھی۔ لیکن اس اجتماع کے بعد نوعیت یہ ہوئی کہ جن لوگوں نے حضرت مولانا عبدالشکور صاحبؒ کو پستول دکھا کر مرعوب کرنا چاہا تھا وہی لوگ حضرت حکیم الاسلام کے ہاتھ پر بیعت ہوئے اور ان لغویات سے توبہ کی اور اہل اللہ میں ہونے کی جدوجہد میں مصروف ہوگئے۔

مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری فرماتے ہیں کہ: ’’ان کی تقریر سے میری سال بھر کی سینکڑوں تقریریں تیار ہوجاتی ہیں‘‘۔

ایک مرتبہ خیر المدارس کے سالانہ جلسے کے موقع پر حضرت حضرت حکیم الاسلامؒ تقریر فرما رہے تھے۔ جس میں مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری بھی موجود تھے، کچھ دیر تک تو وہ خاموش ہوکر حضرت حکیم الاسلامؒ کی تقریر سنتے رہے پھر ان پر وجد کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ بے اختیار نعرۂ تکبیر کہہ کر چند منٹوں کی اجازت لے کر مائک پر آ کھڑے ہوئے اور اپنے دو شعر حضرت حکیم الاسلامؒ کی نذر کرتے ہوئے حضرت حکیم الاسلامؒ کی طرف ہاتھ کے اشارے سے بار بار اشعار کو پڑھتے رہے۔

سامع کے دل کو موہ لینے اور دماغ کو قید کر لینے والی ایسی تاثیر کی مثالیں فی زمانہ کم ہی دیکھنے کو ملتی ہیں کیوں کہ خطابت کا فن عام طور پر پیشہ ورانہ ہاتھوں میں پڑ کر اپنی عظمت کھوتا جا رہا ہے۔

بہر حال تقریر و خطابت کے باب میں حضرت مولانا محمد طیب صاحب کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع اور گوناگوں ہے۔ انھوں نے اس موضوع کو فن کے نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ وقت کی ضرورت اور اپنی فطری مناسبت کے لحاظ سے اختیار کیا۔ اس لیے فنی میزان پر انھیں پرکھنے کے بجائے ان کے اثرات و نتائج کو نگاہ میں رکھنا چاہیے۔ تقریر مجلس کو لوٹ لینے اور اسے زیر و زبر کر دینے کا نام نہیں، تقریر تو دراصل ذہن و فکر کی دنیا میں انقلاب برپا کر دینے اور اسے لوٹ لینے کا نام ہے۔

............❖............

آہ! حکیم الاسلامؒ

باتیں ان کی یاد رہیں گی!

مولانا بدرالحسن صاحب قاسمی

سابق ایڈیٹر الداعی دارالعلوم دیوبند

عصرِ حاضر کے نامور عالم دین اور مشہور دینی درسگاہ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کے انتقال سے برصغیر کی دینی وعلمی تاریخ کا ایک اہم باب ختم ہوگیا ہے، وہ اس عہد کی یادگار تھے جس کی خصوصیت علم وفن کی جامعیت، تقویٰ و دیانت اور اخلاق وشرافت رہی ہے۔ ۸۸؍سال کی زندگی (۱۲۱۵ھ تا ۷؍شوال ۱۴۰۳ھ) میں انھوں نے بڑے نشیب وفراز دیکھے چنانچہ وہ خود ہی ایک چلتی پھرتی تاریخ بن گئے تھے۔

انھوں نے نصف صدی سے زائد عرصہ ۱۳۴۳ھ سے ۱۴۰۳ھ تک دنیا کے ایک ایسے دینی مرکز کی سربراہی کی جس کا برصغیر کی دینی وسیاسی تاریخ پر بڑا گہرا اثر رہا ہے۔ اور جس سے برصغیر میں برپا ہونے والی تمام دینی علمی، اور سیاسی تحریکات کسی نہ کسی حیثیت سے ضرور متاثر ہوئی ہیں اور لاکھوں مسلمانوں کے دلوں میں آج بھی اس سے ایک والہانہ لگاؤ پایا جاتا ہے، یہ مرکز جنگ آزادی کا مرکز بھی رہا ہے اور اس نے مسلم لیگ اور کانگریس دونوں کو مذہبی قیادت دی ہے۔ چنانچہ موجودہ عہد کا کوئی انصاف پسند مؤرخ دارالعلوم دیوبند کی تاریخ اور اس کے عوامی اثر کو نظرانداز نہیں کرسکتا۔

ذاتی طور پر حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ کی حیثیت ایک عظیم دینی عالم، خوش بیان مقرر اور اچھے مذہبی مفکر اور سینکڑوں کتابوں کے مصنف کی تھی، ان کا نسبی تعلق حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانیٔ دارالعلوم دیوبند متوفی ۱۲۹۷ھ سے تھا، جنھوں نے انگریزوں کے خلاف ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں

نمایاں حصہ لیا تھا اور شاملی کے جہاد میں بہ نفس نفیس شریک تھے، اس کے علاوہ ہندو پنڈتوں اور عیسائیوں پادریوں سے ان کے مناظرے بھی بڑے مشہور ہیں، لیکن ان کی خدمات کا شاہکار دارالعلوم دیوبند جیسے عظیم دینی ادارے کی تاسیس ہے۔ حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ ان کے حقیقی پوتے تھے، ان کے والد بھی بلند پایہ عالم دین اور سلطنت آصفیہ حیدرآباد کے مفتی رہ چکے ہیں، ان کی وفات ۱۳۴۲ھ میں ہوئی اور حیدرآباد کے خطۂ صالحین میں ہی وہ دفن بھی ہوئے۔

حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ کے اساتذہ میں ریشمی رومال تحریک کے قائد اور جامعہ ملیہ دہلی کے بانی شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ، نامور محدث علامہ انور شاہ کشمیریؒ، شیخ الاسلام پاکستان علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور ہندوستان کے عظیم مفتی مولانا عزیز الرحمان عثمانیؒ کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے، اس کے علاوہ مولانا اشرف علی تھانویؒ سے بھی ان کو خصوصی فیض حاصل تھا اور سیاسی خیالات میں بھی ان کے ہی ہم مسلک تھے۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کو خدا نے بڑے فضل و کمال سے نوازا تھا، ذہانت و ذکاوت میں تو بچپن ہی سے طاق تھے، لیکن جس وصف میں اپنے ہم عصر علماء پر ان کو امتیاز حاصل تھا وہ دین کے اصول پر ان کی نظر اور شریعت کے اسرار و حکم کے بیان میں غیر معمولی بصیرت ہے، انہیں لوگوں نے حکیم الاسلام کے لقب سے تاعمر یاد کیا اور یہ حقیقت واقعہ ہے کہ حکمت آفرینی میں ان کا ذہن اپنے دادا حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ متوفی ۱۲۹۷ھ اور شاہ ولی اللہ دہلوی متوفی ۱۱۷۶ھ کے مشابہ تھا، ان کی ذہنی ساخت ہی گویا حکیمانہ تھی کسی بات کو شرعی دلائل سے ثابت کرنے میں ان کو بڑا ملکہ حاصل تھا، ان کی تقریر و تحریر دونوں میں یہ رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔

''اسلام اور سائنس'' کے موضوع پر جو تقریر انھوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے یونین ہال میں کی تھی ''فکرِ اسلامی کی تشکیل جدید'' پر جو مقالہ انھوں نے جامعہ ملیہ دہلی کے سمینار کے لئے لکھا تھا، اسی طرح قرآن وسنت کے باہمی تعلق پر جو کتاب انھوں نے لکھی تھی یا جو مقالہ قطر کی سیرت وسنت کانفرنس کے لئے قلمبند کیا تھا وہ ان کی مجتہدانہ بصیرت اور قرآن وسنت اور فقہی اصولوں پر غیر معمولی دسترس کا آئینہ دار ہے۔

برصغیر کے مسلمان عام طور پر ان کو ایک بلند پایہ عالم دین اور خوش بیان مقرر کی حیثیت سے جانتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ طویل اور مربوط عالمانہ تقریر جس سے عوام وخواص یکساں طور پر مستفید ہو سکیں ان کا بڑا کمال تھا اور اس میدان میں ان کا کوئی ہمسر نہیں نظر آتا۔ برصغیر کا چپہ چپہ پون صدی تک ان کی آواز سے گونجتا رہا، کسی اجتماع میں ان کا نام ہی اس کی کامیابی کی ضمانت بن گیا تھا، ہندو پاک کے علاوہ

افریقہ، لندن اور امریکہ تک ان کے تقریری پروگراموں کا سلسلہ تاعمر جاری رہا لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ان کی چھوٹی بڑی تصنیفات کا سلسلہ بھی ۱۲۰ر سے متجاوز ہے۔

حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ کی ذات علم و حکمت کے ساتھ تواضع اور بردباری کا اعلیٰ نمونہ اور انسانیت و شرافت کا پیکر تھی، طبیعت میں بڑی پاکبازی اور مزاج میں اعتدال تھا، اسی لئے ہر جماعت میں عزت و وقار کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کی مرنجان مرنج طبیعت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے تاعمر انہی لوگوں کی پرورش کی جو ان کے ساتھ سخت بغض رکھتے تھے، دارالعلوم کی سطح میں جب کبھی اُبال آتا اور شورش بڑھتی تو وہ اپنے لوگوں کو بڑی صفائی سے کہتے، بھائی! اگر صلح و صفائی چاہتے ہو تو میں چند منٹ میں کرا دیتا ہوں اور اگر جنگ و جدل مطلوب ہو تو یہ بات میری افتادِ طبع کے خلاف ہے۔ اپنا قائد بدل دو۔

............❖............

حکیم الاسلامؒ اور مسلم پرسنل لا بورڈ

مولانا محمد اسلام قاسمی
استاذ حدیث دارالعلوم وقف دیوبند

ہندوستان میں مغلیہ عہد حکومت کے زوال کے بعد انگریزوں کی ہندوستان آمد اور مغربی تہذیب وعلوم کی اشاعت شروع ہوئی اور سقوط حکومت ۱۸۵۷ء کے بعد تو ملک میں مکمل طور پر انگریزوں کا تسلط ہو گیا، اور استعماری قوت نے خاص طور پر مسلم معاشرہ اور اسلامی تہذیب وقوانین کو اپنے جور واستبداد کا نشانہ بنایا، علماء دین اور دانشوران ملت پر ظلم وستم ڈھائے، کیونکہ یہی طبقہ انگریزی حکومت سے بغاوت کیلئے عوام کی رہنمائی اور سربراہی کرتا رہا، پھر مغربی علوم وثقافت کو تمام باشندگان ملک پر مسلط کرنے کی پالیسی جاری ہوئی، اسلامی علوم وتہذیب کی بقاء وتحفظ کیلئے ملک کے گوشے گوشے میں علماء ومفکرین نے مسلمانوں کیلئے تعلیمی اداروں کی بنیادیں ڈال دیں، اس وقت تک ملک میں مسلم حکمرانوں کے ذریعہ جاری کردہ ملکی وعائلی قوانین ہی کا نفاذ ہوتا رہا، مسلم امت کے عائلی اور معاشرتی قوانین کی تنسیخ کی کوششیں نہیں ہوئیں، نہ ان میں تبدیلی کی پالیسی حکومت کے زیر غور رہی، یہ بھی حکومت وقت کی ہندوستان میں بغاوت اور افراتفری یا بدنظمی سے بچے رہنے کی ایک مصلحت اور ملکی نظم کی ضرورت تھی، البتہ انگریزوں نے اسلامی قانون کو رفتہ رفتہ ختم کرنے کی ابتدا کردی تھی، سب سے پہلے ۱۸۲۶ء میں حکومت برطانیہ نے فوجداری قانون کو ختم کیا، پھر قانون شہادت اور قانونِ معاہدات منسوخ کئے اور بالآخر مسلمانوں کے ''معاشرتی قوانین'' میں تبدیلی کی راہیں ہموار کی جانے لگیں اور اس کیلئے حکومت نے ''رائل کمیشن'' مقرر کیا، اس کمیشن نے قوانین اور صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد حکومت کو واضح کردیا کہ ان قوانین کا تعلق مذہب سے بہت گہرا ہے، اس لئے ان میں تبدیلی کا مطلب براہ راست مذہبی امور میں مداخلت اور مذہبی آزادی کو مجروح کرنا ہوگا، چنانچہ حکومت نے

اقتدار کے تحفظ کیلئے مذہبی معاملات میں مداخلت کا ارادہ ترک کردیا اور کسی طرح کی تبدیلی کی بجائے مسلمانوں کیلئے ''قانون شریعت'' اور ہندوؤں کیلئے ''دھرم شاستر'' پر عمل آوری کو جاری کردیا۔ اسی دوران ۱۹۳۶ء میں ایک عدالت نے ہندو رواج کے مطابق وراثت میں بہن کو حصہ دینے سے انکار کردیا، ظاہر ہے کہ یہ فیصلہ اسلامی قانون کے خلاف تھا اس لئے اس وقت کے علماء کرام نے تحفظ شریعت کے عنوان سے اس فیصلے کے خلاف آواز بلند کی اور زبردست جدوجہد کی، ان کی کوششیں بارآور ہوئیں اور ۱۹۳۷ء میں ''شریعت اپلی کیشن ایکٹ'' بنا جس کے مطابق مسلمانوں کیلئے اس کی گنجائش ہوئی کہ وہ اپنے عائلی قوانین (نکاح، طلاق، خلع، ظہار، فسخ نکاح، حق حضانت، ولایت، میراث، وصیت، ہبہ اور شفعہ) میں شریعت اسلامیہ کے پابند رہیں، عدالت کو پابند کیا گیا تھا کہ فریقین مسلمان ہوں تو شریعت اسلامی کے مطابق فیصلہ ہوگا، خواہ ان کا عرف ورواج کچھ بھی ہو، بہرصورت قانونِ شریعت کو اس پر بالادستی حاصل ہوگی۔

۱۹۴۷ء میں ملک برطانوی غلبے سے آزاد ہوا تو ملک دو حصوں میں منقسم ہوگیا، ہندوستان کا مغربی اور مشرقی حصہ الگ ہوکر ایک نئی مملکت بنا، ہندوستان میں رہنے والوں میں ہر مذہب کے ماننے والے موجود تھے، ہندوؤں کی بڑی اکثریت تھی اور دوسری بڑی اکثریت مسلمانوں کی تھی، ان کے علاوہ عیسائی، سکھ، بودھ، جین اور دیگر مذاہب کے ماننے والوں کی بڑی تعداد رہی، اب نہ مسلمانوں کی حکومت باقی رہی، نہ برطانوی استعمار، ملک کو منظّم اور متحد رکھنے اور تمام فرقوں کو یکساں حقوق حاصل ہوں ان بنیادوں پر حکومت کی تشکیل ہوئی، نئے ملک کیلئے دستور سازی کا مرحلہ پیش آیا، تو اسکو ایک جمہوری اور عوامی ملک قرار دیا گیا، جسکی تشکیل برطانوی طرز حکومت پر ہوئی۔ عوام کے منتخب نمائندوں پر مشتمل ایوان قانون ساز ادارہ قرار پایا، آئین اور دستور بنائے گئے۔ ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر کی سربراہی میں بنیادی اور رہنما اصولوں پر مشتمل دستور بنا، جس میں دفعات کے تحت حقوق، عدل وانصاف اور ملک کیلئے قوانین کی تصریحات موجود ہیں، ان میں سیکولرزم کو بنیادی حیثیت دی گئی، یعنی غیر مذہبی حکومت، دستور ساز کمیٹی نے بنیادی اصولوں میں ملک کے تمام شہریوں کو اپنے مذہب، تہذیب اور عائلی قوانین پر عمل کی آزادی رکھی، چنانچہ دفعہ ۲۹ میں وضاحت ہے کہ تمام شہریوں کو اپنے رسم ورواج اور شریعت کے مطابق عمل کرنے کی آزادی حاصل ہوگی۔ اسی کے ساتھ دستور میں کچھ رہنما اصول بھی طے کئے گئے تھے جن میں ایک دفعہ (۴۴) تھی جس کے مطابق حکومت کو ہدایت یا اجازت دی گئی کہ وہ پورے ملک میں ''یکساں سول کوڈ'' کے نفاذ کی کوشش کرے، اس رہنما اصول میں مسلمانوں کے عائلی قوانین (مسلم پرسنل لاء) میں مداخلت کی گنجائش موجود تھی، اسلئے مسلم ممبران اور

قائدین نے اس پر سخت اعتراضات کئے اور اس میں ترمیمات پیش کیں، مگر ڈاکٹر امبیڈکر نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ کیا کوئی حکومت یہ پسند کرے گی کہ ملک کی ایک بڑی آبادی مسلمان اسکے خلاف ہو جائے، اور کوئی پاگل حکومت ہوگی جو ملک میں یکساں سول کوڈ کے نفاذ کی کوششیں کرے گی۔

اس رہنما اصول کے علاوہ بھی کچھ رہنما اصول شاملِ دستور کئے گئے جو ملکی مفادات میں تھے، مگر ان اصولوں پر توجہ دینے کی حکومت کی جانب سے کوئی کوشش ہی نہیں ہوئی، البتہ چند سال گذرنے کے بعد ہی حکومت کی بعض ایجنسیوں کی جانب سے یکساں سول کوڈ لاگو کئے جانے کی آوازیں اٹھنے لگیں۔ ۱۹۵۶ء میں جب ہندو پرسنل لاء میں تبدیلی کی گئی تو اس وقت کے وزیر قانون مسٹر پاٹیکر نے اس بات کا اشارہ دیا کہ یہ ترمیم یکساں سول کوڈ کے نفاذ کی پہلی کڑی ہے، بتدریج اسکو پورے ملک میں نافذ کیا جائے گا۔ اس سے علماء دین ودانشوران ملت چونک اٹھے، پھر جب حکومت کو محسوس ہوا کہ مسلمانان ہند قانون شریعت میں کسی بھی تبدیلی کو ہرگز قبول نہیں کریں گے تو حکمت عملی بدل دی گئی، اور اعلان کر دیا گیا کہ جب تک مسلمان خود مطالبہ نہ کریں ان کے پرسنل لا (عائلی شرعی قوانین) میں تبدیلی نہیں کی جائے گی، مگر کچھ فرقہ پرست جماعتوں اور حکومت میں شامل عناصر کی جانب سے یکساں سول کوڈ کے نفاذ کی آوازیں گاہے بگاہے سنائی دیتی رہیں، پھر درپردہ کچھ ایسے افراد کے ذریعہ سے اس طرح کی باتیں کہی جانے لگیں، یا کہلائی جانے لگیں جو نام کے مسلمان تو تھے مگر ایمان وعمل اور شریعت کی ضرورت واہمیت سے بے گانے تھے، گویا حکومت کیلئے مسلم پرسنل لا میں تبدیلی کے راستے ہموار کئے جانے لگے، اس کا اظہار ۱۹۷۲ء میں ''متبنّٰی بل'' کی صورت میں ہوا، جو تمام شہریوں (بشمول مسلمان) کیلئے قابل نفاذ ہوتا، اس وقت کے وزیر قانون نے واضح الفاظ میں کہا تھا کہ یہ مسودہ قانون یکساں سول کوڈ کی طرف پہلا مضبوط قدم ہے۔ اس بل کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے سامنے متوقع درپیش خطرات کے بادل منڈلانے لگے، علماء دین، قائدین اور دانشوران قوم کے سامنے تحفظ شریعت کے حوالے سے سوالیہ نشانوں کی ایک لمبی لائن کھڑی ہوگئی۔

دارالعلوم دیوبند صرف ایک تعلیمی ادارہ ہی نہیں، بلکہ ایک علمی اور دینی تحریک کا عنوان ہے، ۱۸۶۶ء میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے رفقاء علماء دین کے ذریعہ بغاوت ۱۸۵۷ء کے بعد کے پرآشوب دور میں ایک علمی اور دینی تحریک کا آغاز ہوا، جسکے مقاصد میں جہاں دینی علوم کی حفاظت و اشاعت تھی، وہیں تحفظ شریعت اور اسلامی تہذیب وتمدن کی بقاء کیلئے جدوجہد کرنا بھی تھا، ہندوستان کی آزادی کے وقت برصغیر ہند کے علاوہ بیرونی دیار میں بھی ایک دینی واسلامی مرکز کی حیثیت سے معروف و

مستند بن چکا تھا، ملک کی آزادی کے بعد مسلمانوں کی پسماندگی، مایوسی اور پریشانی کے حالات میں دین و شریعت کیلئے ایک منارۂ نور تھا، جہاں اس ادارے نے قرآن وسنت اور فقہ حنفی کی تدریس واشاعت کی عظیم الشان خدمات انجام دیں وہیں مسلمانوں کے دین وشریعت اور عائلی قوانین میں ان کی رہنمائی کا فریضہ بھی ادا کیا۔ دین، اسلامی احکام اور شریعت کے دفاع میں بھی دارالعلوم اور اس کے فرزندوں نے قابل قدر کارنامے انجام دیئے، اس حوالے سے ہندوستان کے مسلمانوں کی نگاہیں بھی دارالعلوم دیوبند کی جانب اٹھتی رہی ہیں۔

مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام

دارالعلوم دیوبند میں اکابرامت کی نشست کے بعد حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے مؤرخہ ۲۷/۲۸/دسمبر ۱۹۷۲ء میں بمبئی میں وہ عظیم الشان تاریخ ساز ''مسلم پرسنل لا کنونشن'' منعقد ہوا، جہاں مسلم پرسنل لا بورڈ کے قیام کی داغ بیل پڑی، یہ اجلاس ہندوستان کی تاریخ میں لاثانی اور بے مثال تھا، اس میں شرکت کرنے والوں کی تعداد کے لحاظ سے بھی، اور اس میں جلوہ افروز ہونے والی مسلم تنظیموں، فرقوں، مختلف مسالک کے اعلیٰ ترین علماء ومشائخ، مسلم قائدین، سیاسی مسلم رہنماؤں اور اہل علم، دانشوروں کی شخصیتوں کے اجتماع کے لحاظ سے بھی، جس میں پہلی بار مسلمانوں کے تمام مسالک اور تنظیموں کے جلیل القدر رہنما موجود تھے، اتحاد امت کا ایسا نظارہ برصغیر ہند نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، مسلمانوں کے اتحاد کا ایسا انوکھا اور نمائندہ اجتماع کہ کسی نے سچ کہا تھا کہ آج ہندوستان کے کسی گوشے میں جاکر دریافت کرو کہ مسلمانوں کے فلاں رہنما، قائدین اور علماء کہاں ہیں تو ایک ہی جواب ملے گا کہ وہ سب آل انڈیا مسلم پرسنل لا کنونشن میں ہیں، بمبئی کے نامور افراد نے شرعی قوانین کے عنوان پر اس عظیم کنونشن کیلئے انتھک جدوجہد کی، علماء، دانشوران اور دیندار مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ اس کی کامیابی کیلئے سرگرم رہا، خاص طور پر جناب یوسف پٹیل صاحب جو بعد میں بورڈ کے سکریٹری منتخب ہوئے۔

تحفظ شریعت اور مسلمانوں کے ملّی تشخص کی بقاء کا عنوان تھا اور حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب علیہ الرحمہ کی دعوت تھی، بلاتفریق مسلک ومشرب سب ہی جمع ہوئے، حنفی، شافعی بھی تھے، اور اہل حدیث بھی، سنی بھی اور شیعہ بھی، دیوبندی بھی تھے اور بریلوی بھی، داؤدی بوہرہ بھی اور سلمانی بوہرہ بھی تھے، اور سبھوں کی ایک ہی آواز تھی، ہم شرعی قوانین پر عمل پیرا رہیں گے، اور اس میں کسی طرح کی کوئی ترمیم اور مداخلت قبول نہیں ہوگی۔ یہ خالق کائنات کے بنائے قوانین ہیں اس میں ترمیم وتبدیلی کی گنجائش نہیں،

پورے اجلاس کا ایک ہی عنوان تھا ''لا تبدیل لکلمات اللّٰہ '' (اللہ کے فرمان میں کوئی تبدیلی نہیں)

اس اجلاس کے صدر حکیم الاسلامؒ حضرت مولانا محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے خطبۂ صدارت میں سب سے پہلے حاضرین اور منتظمین کا شکریہ ادا کیا تھا، پھر بڑی تفصیل کے ساتھ واضح فرمایا کہ اسلامی شریعت کوئی انسان کا وضع کردہ نظام نہیں ہے، جس میں تبدیلی کی گنجائش ہو، یہ خدا کا قانون ہے، قانون فطرت ہے اور فطرت تبدیل نہیں ہوسکتی، اگر کوئی زمین، آسمان، چاند، سورج اور کواکب ونجوم کو نہیں بدل سکتا، صرف اس سے فائدہ ہی اٹھا سکتا ہے تو دین کے کلیات و جزئیات، احکام وآداب، اخلاق وعقائد، معاملات ومعاشرت اور اجتماعی قوانین سے لے کر عائلی قوانین تک کی فطری حدود کو بھی نہیں بدل سکتا۔

پھر مختصر طور پر عائلی قوانین اور مسلم پرسنل لا کی تبدیلیوں اور امت کے علماء ربانی ومشائخ حقانی کے دفاع کا سرسری تذکرہ کرتے ہوئے اس وقت سرکاری کارروائیوں اور اعلانات کا ذکر کیا اور مسلمانوں کی آواز کے بارے میں فرمایا تھا:

''پرسنل لا کے بارے میں سرکاری طور پر گو یہ بھی اعلان ہے کہ اس میں مسلمانوں کی مرضی کے بغیر کوئی بھی ترمیم وتبدیلی نہیں ہوگی، لیکن ساتھ ہی بالواسطہ قانون سازی کے ذریعہ تبنیت اور سرکاری ملازمین کے لیے نکاح ثانی کے حق پر پابندی نے جو پرسنل لا میں عمل ترمیم کا آغاز ہے پرسنل لا کے بارے میں مسلمانوں کی تشویش کو حق بجانب بنادیا ہے۔ اس لئے وہ متفقہ آواز اٹھانے پر مجبور ہوئے اور جس کی گونج ان شاء اللہ رائیگاں نہیں جائے گی۔''

اسی کنونشن میں ایک متحدہ پلیٹ فارم کی تشکیل پر تمام افراد متفق ہوئے اور طے پایا کہ اگلے ہی سال حیدرآباد میں ایک اجلاس عام منعقد کرکے ''آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ'' کا آغاز ہوجائے، چنانچہ ۱۹۷۳ء میں حیدرآباد میں اس سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے اجلاس منعقد ہوا اور باتفاق آراء حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب رحمۃ اللہ کو بورڈ کا صدر منتخب کیا گیا۔

خاندان نانوتویؒ کے روشن چراغ اور اکابر دیوبند کے علمی جانشین حکیم الاسلامؒ حضرت مولانا محمد طیبؒ کے اندر مسلمانوں کے مختلف طبقوں، مکاتب فکر اور مسلک ومشرب کے لوگوں کو ساتھ لیکر چلنے کی بے پناہ صلاحیت تھی اور عالمی دینی تعلیمی مرکز دارالعلوم دیوبند کے انتظام وانصرام کا پچاس سالہ تجربہ تھا، دارالعلوم دیوبند کے تعارف اور دعوت کے مقصد سے دنیا کے تمام براعظموں کا سفر ہوچکا تھا، پوری دنیا میں ان کے مواعظ وخطبات کا شہرہ تھا، اور ہندوستان کے تمام علاقوں میں اور ہر مسلک وفرقے میں انھیں مقبولیت

حاصل تھی، اس وقت ان جیسی جامع العلوم، حامل اخلاق فاضلہ اور معروف ومقبول شخصیت انھیں کی تھی اور متحدہ طور پر سب ہی کو اُن پر اعتماد تھا۔

''آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ'' کی باضابطہ تشکیل اور ہندوستان کے تمام مسلمانوں کے اجتماع عظیم کی ساری کارروائی حکومت ہند تک بھی پہنچی، چنانچہ حکومت نے اس ''متبنّٰی بل'' کو سرد خانے میں ڈالدیا اور بالآخر ۱۹۷۸ء میں جنتا حکومت نے اسے واپس لے لیا تھا۔

ابھی اس تنظیم کے تعارف اور اسکے اغراض و مقاصد کو عام مسلمانوں تک پہنچانے کا عمل جاری تھا کہ ۱۹۷۵ء میں وزیر اعظم اندرا گاندھی نے ملک میں ایمرجنسی نافذ کردی اور تمام بڑے سیاسی وسماجی رہنماؤں کو جیل میں ڈال دیا گیا، جمہوری نظام معطل ہوگیا اور ہر فیصلہ بزور قوت نافذ کیا جانے لگا، خاص طور پر ''تحدید نسل'' کیلئے جبری نسبندی کا عمل شروع ہوگیا، عمل تولید کے فطری قانون پر رکاوٹیں کھڑی کردی گئیں، اور حکومت کے فیصلوں پر احتجاج کی ساری راہیں جبراً مسدود کردی گئیں، یہ قانون بھی شریعت اسلامیہ کے خلاف تھا، مسلمانوں کے عائلی قوانین پر تنسیخ کا عمل تھا۔

اس لئے حضرت حکیم الاسلامؒ کی قیادت اور جرأت مندانہ اقدام کے تحت اس پر آشوب اور سخت کٹھن مرحلے میں دہلی میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے مجلس عاملہ کا اجلاس منعقد ہوا اور تمام متوقع خطرات اور قید و بند کی صعوبتوں کے علی الرغم بورڈ نے حکومت کے اس فیصلے کی سخت مخالفت کی اور واضح کیا کہ مسلمانوں کیلئے قانون ضبط ولادت کے لئے جبری نس بندی قطعی قبول نہیں ہے، یہ ایک تاریخی نشست تھی اور تاریخ ساز فیصلہ جسے آج بھی تاریخ مسلم پرسنل لا بورڈ کی نمایاں ترین خدمات اور کارنامے کے بطور محفوظ کئے ہوئے ہے۔

پھر ۱۹۷۸ء میں الٰہ آباد ہائی کورٹ کے لکھنؤ بنچ نے مساجد و مقابر کو ایکوائر کرنے کے سلسلے میں ایک ایسا فیصلہ صادر کردیا جو نہایت سنگین نتائج کا حامل تھا، جس کے مطابق حکومت مساجد و مقابر کی ملکیت کبھی بھی سلب کرسکتی تھی، بورڈ نے اسکے خلاف پورے ملک میں تحریک چلائی، اس جدوجہد کے نتیجے میں یوپی اور راجستھان نے ایکوائر کے احکام واپس لے لئے۔

پھر ۱۹۸۰ء کو اوقاف کی جائیدادوں پر حکومت کی جانب سے ٹیکس عائد کرنے کے احکامات جاری ہوئے، مسلم پرسنل لاء بورڈ نے اس کی سخت مخالفت کی اور اوقاف کی جائدادوں کو ٹیکس سے مستثنیٰ کروانے میں بورڈ کامیاب رہا۔

۱۷ر جولائی ۱۹۸۳ء کو بورڈ کے بانی ومحرک وقائد اوّل حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب علیہ الرحمہ کا

انتقال ہوا۔ اگست ۸۳ء میں مدراس کے اجلاس عام میں نئے صدر کے بطور مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ منتخب ہوئے، ۲۰۰۰ء میں ان کی وفات کے بعد فقیہ وقت حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمی صدر بنے، انکی مدت صدارت مختصر رہی، دوسال کے بعد ہی حیدرآباد کے اجلاس عام میں موجودہ صدر حضرت مولانا محمد رابع ندوی زیدمجدہم کی سربراہی طے پائی جواب تک جاری ہے۔

عالم ربانی حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ کی وفات ۱۹۹۱ء کے بعد حضرت مولانا سید نظام الدین (امیر شریعت بہار واڑیسہ وجھارکھنڈ) بحیثیت جنرل سکریٹری اس متحدہ تنظیم کی قیادت کو اپنے تجربات، دوراندیشیوں اور دیگر عہدے دارانِ بورڈ کے مشوروں سے پوری ذمہ داری سے بخوبی انجام دے رہے ہیں۔

اس طرح ملک کے مسلمانوں کیلئے ان کے معاشرتی اور عائلی قوانین پر عمل آوری اور کسی طرح کی تبدیلی قبول نہ کرنے کی علامت یہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ عمل میں آیا، جس کی تحریک دارالعلوم دیوبند سے شروع ہوئی اور مہتمم دارالعلوم دیوبند حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب قدس سرہٗ کی صدارت میں باضابطہ ایک تنظیم کی شکل اختیار کرگئی۔

اس کی ابتداء کے وقت بمبئی میں جو آل انڈیا کنونشن منعقد ہوا اور جس میں مسلمانوں کے تمام مکاتب فکر اور مؤقر تنظیموں کے علاوہ ملک کے علماء وفضلاء، ودانشوران شریک ہوئے، حضرت حکیم الاسلامؒ نے اسلامی قوانین کی حقانیت اوراس کی اہمیت وافادات پر مشتمل جو خطبۂ صدارت پیش فرمایا تھا اس کے چند صفحات قارئین کی نذر ہیں جن میں واضح طور پر ''لاتبدیل لکلمٰت اللّٰہ'' کی ابدیت اوراس کی تشریح نمایاں ہے۔

مسلم پرسنل لاء پر حضرت حکیم الاسلامؒ کا پہلا خطبہ

الحمد للّٰہ و کفیٰ و سلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ. و بعد:

حضراتِ گرامی قدر!

اس عظیم نمائندہ اجتماع کے لئے جس میں مسلمانوں کے تمام مکاتبِ فکر اور مؤقر تنظیموں کے علماء و فضلاء اور ملک کے تمام دانشور جمع ہیں، صدارت کسی ایسی بڑی اور نمایاں شخصیت کے سپرد ہونی چاہئے تھی جو اس عظیم اجتماع کے شایانِ شان اوراس کے لئے مزید عظمتوں کا باعث ہوتی، اس کے برخلاف ایک ایسے شخص کے سپرد کردی گئی جو جسم وروح وظاہر وباطن دونوں کے لحاظ سے کمزور اور قلیل البضاعت ہے اور جتنی بضاعت ہے وہ بھی مزجات ہے۔

دراں حالیکہ اس مؤقر مجمع میں ایسے اکابر علم وفضل موجود ہیں جو بسطۃً فی العلم والجسم دونوں لحاظ سے اس ذمہ دارانہ منصب کے لئے حق اور ملک وقوم پر اثر انداز ہونے کی اعلیٰ صلاحیتیں رکھتے ہیں۔اس صورت میں مجھ جیسے طالب علم کے لئے اس بڑی ذمہ داری سے بہ ادب معذرت کردینے کا موقع تھا،لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اَقویا کے مقابلہ میں اس درجہ کا کمزور ہونا بھی بہرحال ایک امتیاز ہے اور بڑے کمال کے مقابلہ میں بڑا نقصان بھی کمال ہی سے نسبت رکھتا ہے، جو درحقیقت اس کمال کے نمایاں اور واضح کردینے کا ایک بڑا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔و **بضدها تتبين الاشياء.** ضد ہی سے اصل کا تعارف اور تبین ہوتا ہے، اضداد نہ ہوں تو کمالات کی بہت سی قوتیں چھپی کی چھپی رہ جاتی ہیں، اگر ظلمت نہ ہو تو نور کے پہلو نہیں کھل سکتے، اگر رات نہ ہو تو دن کی قدر و قیمت معلوم نہیں ہوسکتی، اگر جہل نہ ہو تو علم کی عظمت نمایاں نہیں ہوسکتی، اگر ضعف نہ ہو تو قوت کی قدریں نامعلوم رہ جائیں، اگر ناقصین نہ ہوتوں کاملین کے کمالات کے پہلو سامنے نہیں آسکتے۔

اس حقیقت کے پیش نظر میں سمجھتا ہوں کہ اس ضعیف و ناکارہ کا انتخاب بہت ہی موزوں و مناسب ہوا اور جیسے انتخاب شدہ کو یہ بلا چون و چرا قبول کرلینا چاہئے تھا اسی طرح انتخاب فرمانے والے بزرگ بھی میرے ہی نہیں بلکہ پورے اجتماع کے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے حقیقت شناسی کا پورا ثبوت دیا ہے لیکن اس شکریہ سے بڑھ کر اور سب سے پہلے ہم سب کو اس خداوند بزرگ و برتر کا شکریہ ادا کرنا چاہئے جس کی عطا کردہ توفیق سے ہم سب یہاں ایک جگہ جمع ہیں اور کندھے سے کندھا ملائے بیٹھے ہیں، نہ صرف ہمارے اجسام ہی ایک دوسرے سے قریب ہوگئے ہیں بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے دل بھی ایک دوسرے سے قریب اور اخوت اسلامیہ کے جذبہ کے تحت قریب سے قریب تر ہوجانے کے آرزومند ہیں۔

بزرگانِ محترم! ہمیں ملانے والی چیز صرف اللہ کا نام اور اس کا مستند کلام ہے اور ہمارے دین کی واحد اساس کلمہ طیبہ **لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰه** ہی ہمیشہ کی طرح آج بھی ہمارے اس ملّی اتحاد کا سرچشمہ ہے۔ہم اللہ کے نام سے زندگی حاصل کرتے ہیں اور اسی کلام کو اپنی زندگی کا قانون سمجھتے ہیں اور اللہ کے سچے رسول خاتم النبیین حضرت محمد مصطفی ﷺ کی ذاتِ قدسی صفات کو کمالاتِ خداوندی کا نمونہ اور اپنی دنیا و آخرت کا کامل و مکمل رہنما اور مربی یقین کرتے ہوئے ان ہی کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کو اپنی زندگی کا آخری مقصد سمجھے ہیں۔

اسی پاک اسوہ سے ہماری زندگی بنی ہے اور اسی سے آئندہ بنے گی اور اسی پر خاتمہ سے ہماری آخرت

کی فلاح و بہبود وابستہ ہے۔

امام مالکؒ کا ارشاد ہے: **لا یصلح آخر هذه الامة الا بما صلح به اولها.**

(اس امت کا آخری حصہ بھی اسی سے صلاح و فلاح پا سکتا ہے، جس سے امت کے اول حصہ نے صلاح و فلاح پائی)

خلافِ پیمبرؐ کسے رہ گزید — کہ ہرگز بہ منزل نخواہد رسید

یہی وہ روشنی اور رہنمائی ہے جس نے صدیوں کے خلاء کو پُر کر کے ہمیں ایمانی عزیمت عطاء کی اور ہم لوگوں کو جو ٹکڑے ٹکڑے تھے، آج کے دن ایک جسم واحد کی طرح ایک جگہ جمع کر دیا اور ایک بار پھر اپنی شریعت اور اس کے مسائل کی حفاظت کے لئے اس مقام پر کھڑا ہونے کی ہمت بخشی۔ بلاشبہ جس طرح آج کا یہ اجتماع عظیم ہے اسی طرح یہ دن بھی ایک عظیم بلکہ عظیم تر دن ہے جس میں بظاہر ایک ناممکن سی بات نہ صرف ممکن بلکہ واقعہ بن کر سامنے آ گئی ہے اور وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا کا پاکیزہ منظر آنکھوں سے نظر آ رہا ہے۔

حضراتِ گرامی! ہر دور میں تاریخ کا ظہور کسی نہ کسی شکل میں ہوتا رہا ہے لیکن اس دور کا تاریخ ظہور یہ ہے کہ ملتِ اسلامیہ کے مختلف مکاتب فکر کے علماء و دانشور اور رہنما وحدتِ کلمہ کی بنیاد پر ایک نقطۂ وحدت پر جمع ہیں، اس کی روشنی میں اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق توحید و رسالت اور جذبۂ وحدت کی جو امانت امت کو سپرد کی گئی تھی ہم اس کی حفاظت کے فریضہ کو فرض کی طرح ادا کرنے کے لئے بیٹھے ہیں، بلاشبہ یہ امانت ہمیں جان و مال اور آبرو سے زیادہ عزیز ہے۔ ہم اپنی جانوں سے دستبردار ہو سکتے ہیں مگر اس ازلی اور ابدی امانت سے دست بردار نہیں ہو سکتے۔

بزرگانِ محترم! آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں کہ اسلام عام مذاہب کی طرح کوئی خاندانی، وطنی یا قومی قسم کی روایات کا مذہب نہیں ہے بلکہ روایت و درایت کے لحاظ سے اس کی ہمہ گیر فطرت کی خود اپنی ہی ایک مستقل اور امتیازی شان ہے۔ مذاہب کی دنیا دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اور مذاہب کی مثال ایک ایسی مملکت کی سی ہے جس کی سرحدیں نہیں، اگر ہیں تو وقت کی دھارے سے ادلتی بدلتی رہیں، لیکن اسلام ایک ایسی مملکت ہے کہ جس کی سرحدیں اٹل ہیں اور وہ سرحدیں خداوندی دستور سے بنی ہوئی ہیں، جو قلعہ بند شہر پناہ کی مانند ہیں۔ زمانہ کی کسی ضرب سے نہ وہ ٹوٹ سکتی ہیں اور نہ ہل سکتی ہیں، یہ ممکن ہے کہ کچھ لوگ ان سرحدات سے باہر نکل جائیں مگر یہ ان کی تعدی ہوگی، حدود اپنی ہی جگہ اٹل رہیں گی۔

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا وَ مَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ.

اسلام کا قالب جن قانونی دستاویزوں اور فطری اصول سے مشیت خداوندی نے تیار کیا ہے ان میں تمام ہنگامی اور دوامی اصلاحات اور ان کے اصول وقوانین جمع کر کے ان میں سے ان تمام سماجی برائیوں کو نکال دیا ہے جن کا نام جاہلیت تھا۔ اس میں کسی تغیر اور تبدیلی کے معنی اسی جاہلیت کو دوبارہ لے آنے کے سوا دوسرے نہیں ہوسکتے، جس سے مالکِ مطلق نے انسانیت کو پاک کر کے درجۂ کمال پر پہنچایا تھا۔

آج پرسنل لاء کے نام پر ان تبدیلیوں کا مواد بنام اصلاح وترمیم پیش کیا جارہا ہے۔ کیا حقیقتاً یہ اصلاح اور کوئی اصلاحی تحریک ہے؟ یہ اصلاح اسی قسم کی ہے، جسے قرنِ اوّل کے منافقین **اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ** کے نعرے کے ساتھ لے کر کھڑے ہوئے تھے، لیکن عالم الغیب والشہادۃ نے کھلا اعلان فرمادیا تھا **اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ.**

ہم اپنے دین و دانش کے لحاظ سے یہ تسلیم نہیں کرتے کہ مسلم پرسنل لاء میں تبدیلی کی تحریک کوئی اصلاحی تحریک ہے بلکہ دوربین سے دیکھئے یا خوردبین سے، صاف نظر آئے گا کہ یہ ایک سیاسی تحریک ہے جو ہندوکوڈ بل سے پیدا ہوئی ہے، سو یہ آپ کی سیاست ہے، آپ اسے اپنے پاس رکھئے۔

ہندوستان کا دستور، مذہب اور سیاست کو الگ الگ قرار دیتا ہے تو آپ ہمارے مذہب کے معاملہ میں اپنی سیاست ملا کر حکومت اور عوام کو ناراض کرنے کی کوشش کیوں کر رہے ہیں؟

آپ کا دعویٰ ہے کہ حکومت ریفارمس چاہتی ہے اور ہم مصلح ہیں، میں پوچھتا ہوں کہ ملک میں سماجی برائیوں، اخلاقی گراوٹوں اور غلاظتوں کے جو ڈھیر لگے ہوئے ہیں حکومت کے قانون، حکام کی طاقت اور نام نہاد مصلحین کی اصلاحی مہم کا رخ اس طرف کیوں نہیں؟

مجھے اس وقت ایک سخت لفظ کہنے پر معاف کیجئے کہ وہ سماج کتنا دیّوث ہے جو لاکھوں ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کو بازار میں بیٹھنے کی اجازت دیتا ہے اور چار شادیوں کی محض اجازت اور وہ بھی خاص شرائط عدل و دیانت سے مشروط اجازت پر اعتراض کرتا ہے اور اس غلاظت پر ان مظلوم قسمت کی ماری بازاری گناہگار عورتوں پر کتنے مرد ظلم توڑتے ہیں، نہ کوئی پابندی عائد کرتا ہے اور نہ کوئی دار و گیر کا روادار ہے۔ سماج نے گناہوں کے بازار لگا رکھے ہیں، آج بھی اس ملک میں ایسے فرقے ہیں جو اسّی اسّی بیویاں رکھتے ہیں اور سماج ان کے بارے میں چوں تک نہیں کرتا۔ بقول بابو ابھے چندر اور بابو گریندر ناتھ دت:

''اس ملک میں ایسے کامن برہمن بھی ہیں جن کی پچاس پچاس اور سوسو بیویاں ہیں، ان میں سے ہر شخص

کے پاس ایک نوٹ بک رہتی ہے جس میں وہ اپنی بیویوں کی ولدیت اور گاؤں کے نام لکھ لیتے ہیں اور (پھر بھی) انہیں پشیمانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ جسے وہ ایک اجنبی سمجھ کر ملتے ہیں وہ ان کی بیوی یا لڑکا ہوتا ہے۔''(۱)

لیکن اسلام نے سماج کے اس وحشی دستور کے خلاف سوسو بیویاں رکھنے کے قانون کو محدود کر کے اگر چار کی گنجائش دی اور وہ بھی کڑی شرائط کے ساتھ اور اسی بے قید غلاظت سے سماج کو پاک رکھنے کے لئے تو مصلحین کی ٹولیاں قانون کے پشتارے لے کر دوڑ پڑیں، جس سے ملک میں راتوں رات مادر وطن کی بیٹیوں کے بدن سے عصمت وعفت کا لباس رات بھر اتار کر تار تار کیا جاتا رہا ہو اور خدا کے غضب سے حکومت اور سماج بے نیاز ہو، ایسے ملک کے چند ایسے سر پھرے مصلحین کو مسلم پرسنل لاء کے بارے میں کچھ کہنے سے پہلے سو بار خود تو شرمانا چاہئے تھا، جنہیں بے شرم سماج کو ٹوکنے تک کی ہمت نہیں۔ ان میں اسلام کی فطری اور اعلیٰ وارفع قانونِ عصمت پر حرف زنی کرنے کی ہمت آخر کہاں سے پیدا ہوئی؟ بے شمار بچوں کی تعداد پر تو پابندیاں عائد کی جائیں مگر بے شمار غلیظ گناہوں پر پابندیاں عائد کرنے کا کوئی جذبہ نہ ابھرے، خواہ وہ کتنی ہی تعداد میں ہوں، کہیں بھی ہوں اور کتنے ہی شرمناک انداز میں ہوں۔ برائیوں کے بازار کھلے ہوئے ہیں، جن میں ہر برائی اور ہر اخلاقی گندگی بکری کے مال کی طرح بکتی ہے۔ تباہ حال اچھوتوں کا کیا حال ہے، غریب ہندو عورتوں کا کیا حال اور مآل ہے، جوان نسل کے لڑکے اور لڑکیاں کن کن سماجی مصیبتوں میں مبتلا ہیں، جھونپڑیوں میں عورتوں کی عزت وعصمت کیسے دردناک حالات سے دوچار ہے، وہاں کوئی مصلح، کوئی لیڈر اس اصلاحی مہم کو لے کر اٹھنے کی تکلیف گوارہ فرما کر نہیں پہنچتا، اگر وہ اس اصلاحی مہم کو لے کر اٹھیں تو میں اعلان کرتا ہوں کہ ہم سب اسی وقت ان مصلحین کے پروگراموں کا آخر تک ساتھ دینے کے لئے تیار ہیں۔

شاید ان ہی غلاظتوں کی پردہ پوشی کے لئے پرسنل لاء کے چند مسائل کو ہدف بنا کر ان میں ترمیمات اور اصلاحات کے نعرے لگائے جارہے ہیں، یا ممکن ہے کہ اقلیتوں کو جذباتی ہیجان میں مبتلا رکھنے کی یہ کوئی تدبیر ہو، بہر حال نعرہ زنوں کا انداز، قد ہر لباس میں عریاں ہیں، خواہ وہ آئین کا لباس پہن کر آئیں یا سماج اور معاشرہ کی اصلاح کا، لیکن اگر ان میں سے کوئی فرد، دین خداوندی میں ترمیم وتبدیلی کا نعرہ بزعم خود کوئی اصولی بات سمجھ کر لگا رہا ہے تو اس اجتماع کے موقع پر اپنے تمام علماء کرام اور دانشوران محترم کی طرف سے یہ اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ ہم اپنے اس عقیدے پر اٹل ہیں کہ جس طرح خدائے بزرگ وبرتر نے اپنے نظام خلق کو اپنی سچی فطرت پر قائم کیا ہے جس میں تبدیلی ناممکن ہے کہ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰہ اسی طرح اس نے اپنے نظام امر کو بھی جس کا نام دین ہے، اپنی اسی فطرت کے اساس پر قائم کیا ہے، اس لئے اس میں بھی

تبدیلی ممکن نہیں، لَاتَبْدِیْلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰہِ.

یہ قانونِ فطرت ہے اور فطرت تبدیل نہیں ہوسکتی، اگر کوئی زمین، آسمان، چاند، سورج اور کواکب و نجوم کو نہیں بدل سکتا، صرف اس سے فائدہ ہی اٹھا سکتا ہے تو دین کے کلیات و جزئیات، احکام و آداب، اخلاق وعقائد، معاملات و معاشرات اور اجتماعی قوانین سے لے کر عائلی قوانین تک کی فطری حدود کو بھی نہیں بدل سکتا، وہ صرف فائدہ اٹھانے کے لئے اتارے گئے ہیں، بدلنے کے لئے نہیں لائے گئے، بدلنے کی جب بھی سعی لاحاصل کی جائے گی تو خدائی حدود تو اپنی ہی جگہ قائم رہیں گی، لیکن بدلنے والوں کے حق میں سماج کا ڈھانچہ بکھر کر غلاظتوں اور گناہوں کا ڈھیر ہو جائے گا، جس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح خدا کی اس کائنات کا نظامِ خلق نہایت ہی مرتب اور فطرت کے اصول میں بندھا ہوا ہے، جس کی کوئی ایک جزئی بھی عرش سے لے کر فرش تک اور ثریا سے لے کر ثریٰ تک بے جوڑ نہیں، اسی طرح اسی خدائے برتر و توانا کا نظامِ امر یعنی شریعت بھی غیر مرتب یا بے جوڑ نہیں بلکہ اس کی بھی ایک جزئی اپنے ہی فطری اصولوں سے بندھی ہوئی، اپنی فطری تنظیم سے وابستہ ہے اور ایک ہی فطرتِ الٰہی ہے جو ان دونوں نظاموں کو تھامے ہوئے، جو فطرت اس کے کام میں کارفرما ہے، وہی اس کے کلام میں بھی کارفرما ہے۔ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تَبَارَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ.

جس طرح اس نظامِ خلق میں یہ اربوں، کھربوں انفرادی جزئیات، حیوانات کی ہوں یا نباتات کی، جمادات کی ہوں یا مجردات کی، اپنی اپنی انواع سے جڑی ہوئی ہیں، جیسے حیوانات میں مثلاً: شیر، بکری، اونٹ، گھوڑا، گدھا وغیرہ حیوان کی جنس سے وابستہ ہیں، نباتات کے بے شمار افراد، درخت، گھاس، جھاڑ، بیل وغیرہ اپنی اپنی انواع سے جڑے ہوئے ہیں اور جمادات کے اَن گنت افراد اینٹ، پتھر، ریت، چونا، سمینٹ، لوہا، سونا، چاندی، پہاڑ اور دریا وغیرہ اپنی اپنی جمادی انواع سے وابستہ ہیں، اسی طرح یہ ساری انواع، حیوان و نباتات و جماد مل کر ایک اوپر کی کلی جنس کے نیچے جمع ہو جاتی ہیں، جس کا نام جسم ہے، کہ یہ ساری کی ساری نوعیں جسمانی ہی ہیں۔ پھر جسم کے دوش بدوش کچھ غیر جسمانی یا بے حد لطیف الاجسام مفردات کی لطیف انواع ہیں، جو اپنی لطافت کے سبب ان نگاہوں سے دیکھی نہیں جاسکتیں، جیسے ارواح، ملائکہ، جنات وغیرہ۔ یہ سب مل کر ایک نہایت ہی وسیع اور عام تر جنس کے نیچے آجاتی ہیں، جس کا نام جوہر ہے، جو بلا کسی غیر کے سہارے خود سے قائم ہیں، بلکہ دوسرے کے سہارے قائم ہیں۔ جیسے ان جنسوں کے افعال وخواص، رنگ و بو، کیف و کم اور مقدار وغیرہ، پھر یہ سب جوہری اور عرضی موجودات مل کر ایک

نہایت ہی وسیع حاوی اور محیط کائنات جنس کے نیچے آجاتی ہیں، جس کا نام وجود ہے کہ ان کائناتوں میں اس سے بڑا احاطہ کسی کلی کا نہیں، جو ساری موجودات کو اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ہے اور ظاہر ہے کہ وجودِ عین ذاتِ حق سے (جل ذکرہ) اس کی ذات اور وجود الگ الگ نہیں ہیں، کہ وہ اس کا جدا ہوجانا ممکن ہو، اس لئے یہ ساری کائناتیں وجود کے واسطہ سے اس وجودِ مطلق اور موجودِ اصلی سے وابستہ ہوجاتی ہیں، جس سے ان سب کا ایک ہی سرچشمہ ثابت ہوتا ہے اور اسی پر ان کائناتوں کے وجود کی انتہا ہوجاتی ہے جسے قرآنِ کریم نے دولفظوں میں کھول دیا ہے ”وَ اَنَّ اِلٰی رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى“ (بلاشبہ تیرا رب ہی منتہی ہے) جس پر ہرموجودگی کی انتہاء ہوئی ہے، کہیں فرمایا ”اِنَّ اِلٰی رَبِّكَ الرُّجْعٰى“ (بلاشہ تیرے ہی پروردگار کی طرف ہر چیز کا رجوع ہے) کہ وہ اسے چھوڑ کر ادھر ادھر نہیں جاسکتی، لیکن ساتھ ہی ان موجودات پر کائناتوں کی انتہاء نہیں ہوجاتی، بلکہ موجودات سے کہیں زیادہ ان گنت معدومات بھی ہیں، جنہوں نے ابھی تک وجود کا جامہ نہیں پہنا، مگر ان کا موجود ہونا ممکن نہیں اور وہ کائنات خلق میں شامل ہوسکتی ہیں۔ اس لئے یہ ساری موجودات ومعدومات مل کر ایک اور انتہائی حاوی وشامل اور محیط الکل کلی کے نیچے آئی ہوئی ہیں، اس جنس کلی کا نام علم خداوندی ہے، جو موجود ومعدوم سب پر حاوی ہے، پس موجودات عینی شکلوں میں موجود ہیں اور معدومات علمی صورتوں میں علم الٰہی میں سمائی ہوئی ہیں۔ قرآن حکیم نے اس حقیقت کو ان دوکلموں میں ارشاد فرمایا ہے ”وَ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا“ (اور اللہ جل ذکرہ ہر چیز پر خواہ وہ موجود ہوچکی ہو یا نہ ہوئی ہو) اپنے علم سے محیط ہے۔ بہرحال اس مرتب نظام کائنات کی کائناتوں سے جس کی انتہاء علم الٰہی پر ہے، ہم فائدہ تو ضرور اٹھا سکتے ہیں اور ضرور اٹھانا چاہئے، جبکہ یہ ہمارے لئے بنائی گئی اور مسخر کی گئی ہیں، لیکن انہیں بدل ڈالنے کا تصور جنون اور حماقت سے کم نہیں جبکہ فطرت علمی ہو یا عملی، نہ بدلنے کی چیز ہے نہ بدلی جاسکی ہے ”لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰه ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ“ (اللہ کی خلقت میں تبدیلی ناممکن ہے، یہی اس کا طریقہ اور مستحکم دین ہے، لیکن انسانوں کی اکثریت جہالت میں پھنسی ہوئی ہے) ٹھیک اسی فطرت پر خدا کا نظام امر بھی ایک عجیب حکیمانہ ترکیب اور تنظیم کے ساتھ قائم ہے، جس میں مسائل جزیہ کے افراد بھی ہیں اور ان پر انواع بھی، پھر انواع کے اوپر اجناس اور اجناس پر جنس الاجناس کا احاطہ بھی، جس سے دینی مسائل کی کثرتیں سمٹ کر وحدتوں کی طرف اور وحدتیں سمٹ کر وحدت الوحدات کی طرف رجوع کئے ہوئے ہیں اور دین مثل حسّی کائنات کے ایک نہایت ہی منظّم اور مرتب روحانی کائنات کی شکل میں جلوہ گر ہے۔

دین کے لاکھوں افراد مسائل کو ان کی انواع سمیٹے ہوئے ہیں، مثلاً نماز ایک نوع ہے، جس کے ہزاروں مسائل ہیں اوران پر مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں، حج ایک نوع ہے، جس کے ہزاروں مسائل ہیں، جن پر سینکڑوں تصنیفیں ہیں، مالیات ونفقات ایک نوع ہے، جس کے نیچے ہزار ہا جزئی مسائل ہیں اوران پر سینکڑوں کتابیں لکھی گئی ہیں، زکوٰۃ، صدقات، خیرات، ہدایا اور قرض وامانت وغیرہ مستقل نوعیں ہیں جن کے نیچے ہزاروں مسائل آئے ہوئے ہیں، تدبیرِ منزل ایک مستقل نوع ہے، جس کے نیچے ولادت، رضاعت، تربیت اور روابط وعلائق کے ہزار ہا مسائل ہیں۔ نکاح، طلاق، خلع وغیرہ کی انواع کے نیچے ہزار ہا مسائل جمع ہیں، پھر شہری زندگی کے عمومی روابط اور علائق کی انواع ہیں جن کے نیچے طلاق، نکاح وغیرہ کے ہزاروں مسائل ہیں، پھر انتظام مملکت اور تعزیرات ایک نوع ہے، جس کے نیچے ہزاروں سیاسی اوراجتماعی مسائل آئے ہیں، پھر بین الاقوامی معاملات کے لئے خلافت ایک مسقل نوع ہے جس کے نیچے ہزاروں مسائل ہیں اور جن پر مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں اور پھر ان تمام انواع کے اوپر اجناس ہیں اوراجناس کو پھر ایک جنس کلی نے اپنے احاطہ میں لے رکھا ہے۔

بہرحال دینی انواع: نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، طلاق، مہر، خلع، ولادت، رضاعت، تربیت، لین دین، بیع وشراء، وقف وہبہ، قرض، امانت، اجارہ، حدود، قصاص، کفارات وغیرہ کے لاکھوں جزئیات مسائل اور ان کی بے شمار عملی صورتیں اور نمونے ہیں جن سے دینی کتابیں اور کتابوں سے دنیا کے لاکھوں کتب خانے بھرے ہوئے ہیں، جن سے امت کی خصوصیت ہی کثرت تصنیف قرار پا گئی، جیسا کہ بعض علماء امت نے دعویٰ کیا ہے۔

پھر ان انواع کے اوپر اجناس کلیہ ہیں، جن کے نیچے یہ تمام نوعیں آئی ہوئی ہیں، جیسے: اخلاق، اعتقادات، عبادات، منزلیات، معاملات، معاشرات، مدنیات، اجتماعیات اور آفاقیات وغیرہ، پھر ان ساری مصالح کلیہ کا تعلق صفاتِ خداوندی سے ہے، جن کے تقاضوں سے یہ علل واسرار اوران سے یہ احکام نمایاں ہوئے اور پھر ان تمام صفات الٰہی کا تعلق ایک ہی کلی الکلیات ''علم الٰہی'' سے ہے، جس کے واسطہ سے یہ سارا نظام ذاتِ بابرکات الٰہی سے جڑ جاتا ہے اور خلق وامر دونوں میں توحید الٰہی کا عقیدہ فطری طور پر خود بخود ثابت ہوجاتا ہے، جو انبیاء علیہم السلام کا موضوعِ بعثت ہے۔ ''**كَانَ دِيْنُ الْاَنْبِيَاءِ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه**'' (سارے انبیاء کا دین لا الٰہ الا اللہ ہے) ہی رہا ہے۔

اس لئے اسلام نے توحید کو محض شرعیات ہی کی حد تک محدود نہیں رکھا، بلکہ عالم خلق میں بھی ایک فعل،

ایک ایک قول اور ایک ایک نیت اور ایک ایک ظاہری ہیئت تک وسیع کر کے توحید عملی کا ایک مستقل نظام قائم کیا ہے تا کہ زندگی کے ہر موڑ پر اور اس کی ایک ایک نقل وحرکت پر بندہ اپنے خدائے واحد کی طرف رجوع رکھے اور شرک کی آلائشوں سے ملوث نہ ہو۔

بہر حال عرض یہ کرنا ہے کہ جیسے کائنات خلق اس کے فطری نظام میں دخل اندازی انسانیت کی تباہی ہے اور جس طرح کائنات خلق اور اس کی اشیاء میں ترمیم وتنسیخ کا تصور، یا عمل شرک اور خلافِ توحید ہے، اسی طرح اس کائنات روحانی اور اس کے کسی جزوی مسئلہ میں بھی انسانی ترمیم وتبدیلی ایک کھلا شرک ہے، جسے مٹانے کے لئے انبیاء معصومین مبعوث ہوئے۔

اس لئے جیسے کائنات خلق سے ہم فائدہ ہی اٹھا سکتے ہیں، اسے بدل نہیں سکتے۔ اسی طرح کائنات امر یعنی شرائع سے بھی، فائدہ ہی اٹھا سکتے ہیں اور اٹھانا چاہئے، اسے بدل نہیں سکتے۔ اگر کسی ایک جزئی میں تغیر وتبدل کا تصور باندھا جائے گا، تو یہ جزوی ترمیم نہ ہوگی، جس کا ایک چھوٹا سا جزو یہ جزئی ہے، بلکہ شریعت کے نظام عمومی کا رشتہ، جبکہ ساری انواع وجزئیات میں پرویا ہوا ہے تو جس دانہ کو بھی اپنی جگہ سے نکال دیا جائے گا، تو صرف وہ جزئی خرابی نہ ہوگی، بلکہ پوری مالا اور ہار کی بدزیبی اور بدنمائی ہوگی، جس سے ہار کی اصلی حسین شکل وصورت باقی نہیں رہ سکتی اور اسی درجہ میں روحانیت کی تباہی سامنے آجائے گی، جس کی صلاح وفلاح کے لئے یہ دین اتارا گیا ہے بلکہ تغیر وتبدل کر ڈالنے کے ناپاک عمل کے مرادف ہوگا، جو ناممکن ہونے کے علاوہ انتہائی خباثت اور خیانت ہوگی کہ آدمی بندگی کی حدود سے نکل کر خدائی حدود میں مداخلت کرنے کی شرارت کا مرتکب ہو، جبکہ پورے نظام دین ودیانت کا خاکہ، بحیثیت مجموعی ایک متصل واحد شئے ہے، اس کے کسی جزو کو چھیڑنا پورے نظام کو چھیڑنا ہوگا۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک حوض کے متصل واحد پانی کی سطح پر اگر ایک سمت میں بھی، ایک ڈھیلا پھینک کر اسے ہلا دیا جائے تو ناممکن ہے کہ یہ ایک سمت کی حرکت لہر بن کر درجہ بدرجہ دوسری طرف نہ پہنچے، اسی طرح یہ تمام اسلامی شعبے اپنے اپنے اصول وکلیات کے تحت اور پھر یہ تمام اصول کلیات اپنے باہمی ربط سے جڑ کر، ایک ہی کلی الکلیات کے تحت، باہم ایک دوسرے سے اس طرح جڑے ہوئے اور گتھے ہوئے اور متصل واحد ہیں کہ دین کے کسی ایک چھوٹے سے گوشے کے حقیر سے حقیر تغیر کا اثر بھی پورے نظام کے ڈھانچہ پر پڑے بغیر نہیں رہ سکتا۔ (۲)

اس خطاب میں حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ نے ملّی اتحاد کی اہمیت کلمۂ طیبہ کی روشنی میں واضح کرتے ہوئے دین اسلام کی حقانیت پر بحث کی، نیز اسے دین فطرت قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ یہ مذہب

خالق کائنات کی مشیت سے تیار ہوا ہے، جس میں ہر زمانے کی تبدیلیوں کا لحاظ رکھتے ہوئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے وہ شان ودیعت کردی ہے کہ اس میں کسی ترمیم واضافے یا تبدیلی کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی، اس کے باوجود جو طبقہ اس میں اصلاح یا تبدیلی کی آواز بلند کرتا ہے، اس کے بارے میں حضرتؒ نے ارشاد فرمایا:

''ہم اپنے دین و دانش کے لحاظ سے یہ تسلیم نہیں کرتے کہ مسلم پرسنل لاء میں تبدیلی کی تحریک کوئی اصلاحی تحریک ہے بلکہ دوربین سے دیکھئے یا خوردبین سے صاف نظر آئے گا کہ یہ ایک سیاسی تحریک ہے جو ہندو کوڈ بل سے پیدا ہوئی ہے''۔

پھر حضرت حکیم الاسلامؒ نے اپنے خطبہ میں مذاہب عالم میں وضعی قوانین میں خرابیوں اور ان کی ناکامیوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ''**لاتبدیل لکلمات اللّٰہ**'' کہ یہ قانون فطرت ہے اور فطرت میں تبدیلی نہیں ہوسکتی۔

اس طرح دین اسلام میں عبادات، معاملات، معاشرت اور دیگر موضوعات پر جو جامع احکام اور مضامین ہیں ان کی تشریح بھی فرمادی اور مسلم پرسنل لاء کی حیثیت اور اہمیت کے تمام پہلو روشن کردیئے۔

اس خطبۂ صدارت میں حضرت حکیم الاسلامؒ کی عبقری صلاحیتوں کے نمونے موجود ہیں۔

............❖............

(۱) پروفیسر کے، ایم کپڑیا، میرج اینڈ فیملی اِن انڈیا، ص: ۱۵، بحوالہ اخبار عزائم لکھنؤ، ۱۴رنومبر ۱۹۷۲ء

(۲) آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کا قیام، ص: ۲۴

............❖............

مہتمم کیسا ہو؟

مولانا قاری ابوالحسن صاحب اعظمی
سابق شیخ القراء، دارالعلوم دیوبند

ہم نے جب سے ہوش سنبھالا اس وقت سے مدارس کی دیکھ بھال اوران کے نظم وانتظام سے متعلق حضرات کے لیے گوش آشنا لفظ ''ناظم'' تھا۔ لفظ اہتمام کا معنی پیش آمدہ امور کی انجام دہی کے لیے ارادہ اور فکر کرنا، مدرسہ کے ناظم کی جگہ ''مہتمم'' کے بھاری بھرکم لفظ سے ۱۹۵۲ء کے قریب آشنائی ہوئی جب مدرسہ بیت العلوم سرائے میر اعظم گڑھ کے جلسہ سالانہ کے اشتہار میں حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کا اسم گرامی نظر نواز ہوا۔

اللہ اللہ اسم با مسمی ذات ایسی کب آئی ہوگی، جسم وجسامت ہو یا صوت وصورت، لب ولہجہ ہو یا حرکات وسکنات، نام کی پاکیزگی اور طہارت ہر وصف کا جزو اعظم۔

لفظِ اہتمام، کوئی معمولی لفظ نہیں ہے کہ کسی بھی مکتب اور مدرسہ کے ساتھ اسے چسپاں کر دیا جائے، اس کے لیے تو کوئی جامعہ اور کوئی عظیم ادارہ ضروری ہے۔ کسی ابتدائی مدرسہ اور معمولی تعلیم گاہ کے ناظم کو ''مہتمم'' کا لفظ دے دینا خود اس لفظ کی تخفیف ہے۔

کسی مرکزی ادارہ کے مہتمم کے لیے کچھ ضروری اوصاف ہوتے ہیں، اگر مہتمم ان اوصاف سے متصف نہ ہوگا تو ادارہ کی عظمت اور مرکزیت کو خاک میں ملائے گا، اور لفظ مہتمم کی عزت کو بھی داغ لگائے گا۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اختصار کے ساتھ چند ضروری اوصاف کی جانب اشارہ کر دیا جائے۔

(۱) مہتمم کے لیے صرف عالم اور کسی درسگاہ کا فاضل ہونا کافی نہیں ہے، بلکہ نہایت جید الاستعداد اور بھرپور ہمہ جہتی صلاحیتوں کا حامل ہونا ضروری ہے، ایسا کہ میزان سے بخاری تک تمام علوم کی جامع تدریسی

صلاحیت رکھتا ہو، تا کہ بوقت ضرورت اگر کسی بھی جماعت کا استاذ غیر حاضر ہو تو مہتمم اس کی کتاب باسلوب احسن پڑھا سکے، اور استاذ کی غیر حاضری سے تعلیم متاثر نہ ہو، نظم و اہتمام کی یہ بھی ایک اہم ضرورت ہے۔ خوب واضح رہے کہ مدرسہ دراصل نام ہے تعلیم و تعلّم اور درس و تدریس کا، تدریسی نظام میں اختلال کے بعد کیا باقی رہ جاتا ہے۔

(۲) اگر طلبہ میں کوئی غلط رَویا نازیبا رجحان پیدا ہو رہا ہو تو مہتمم اپنے مؤثر خطاب عالمانہ اور حکیمانہ اندازِ بیان کے ذریعے اس غلط رُخ سے انھیں پھیر سکے۔

(۳) ایسی عمدہ فہم و فراست کا مالک ہو کہ بوقتِ ضرورت اساتذہ اور تعلیمی و تدریسی عملہ کو افہام و تفہیم کے ذریعے انتشار وافتراق سے روک کر انھیں باہم متحد رکھ سکے، اپنی اس بدرجۂ اتم صلاحیت کے ذریعہ مدرسہ میں اتفاق واتحاد کی فضا قائم رکھ سکے، ایسی پرسکون فضا تعلیم و تدریس کے لیے ازبس ضروری ہے۔

(۴) واردین وصادرین جو مدرسہ کی زیارت کے لیے باہر سے آتے جاتے ہوں ان کے سامنے مدرسہ کا ایسا جامع اور دلکش تعارف پیش کر سکے جس سے خارجی دنیا سے ربط وارتباط مضبوط رہے۔

(۵) وعظ و نصیحت اور تقریر و خطابت کی بھرپور صلاحیت و قابلیت رکھتا ہو تا کہ وقتاً فوقتاً باہر سے آنے والی دعوت کو قبول کر کے اسفار کر سکے اور اپنے اس وصف کے ذریعہ مدرسہ کا کاز اور حلقۂ تعارف وسیع تر ہو سکے۔

(۶) مہتمم کے لیے وصفِ مضمون نگاری اور تصنیف و تالیف کی صلاحیت کا حامل ہونا بھی ضروری ہے، تا کہ بوقتِ ضرورت اس رُخ سے بھی مدرسہ کا تعارف قوم و ملت کے سامنے پیش کر سکے اور اس سے ملت کو فائدہ بھی پہنچے۔

(۷) مہتمم کے لیے وصفِ تدبر سے موصوف ہونا ضروری ہے، تا کہ پیش آمدہ مسائل کا جذبات سے بالاتر ہو کر صحیح رُخ سے جائزہ لے سکے اور مدبرانہ فیصلہ کر سکے۔

(۸) مہتمم کے اندر وصف رافت اور مروّت بھی بے حد ضروری ہے تا کہ تدبر اور تفکر کے ساتھ کئے گئے حاکمانہ فیصلے حکیمانہ انداز میں نافذ کئے جاسکیں جو ظلم و زیادتی سے پاک ہوں۔

(۹) مہتمم کو وصفِ جرأت سے موصوف ہونا بھی ضروری ہے تا کہ اپنے مدبرانہ فیصلہ، بے لاگ اور بے خوف ہو کر نافذ کر سکے، جرأت نہ ہوگی تو بہتر سے بہتر فیصلے فقدانِ ہمت کے باعث ٹھنڈے بستے میں پڑے رہ جائیں گے۔

(۱۰) دورِ حاضر میں ''سیاست'' جس چیز کا نام ہے وہ بے حد گندی چیز ہے، مدرسہ کے مہتمم کے لیے تمام تر سوجھ بوجھ اور علم وفضل کے ساتھ دورِ حاضر کی بدنام زمانہ سیاست کی گندگی سے خود کو پاک وصاف اور اس سے دور رکھنا بے حد ضروری ہے، ورنہ تحزّب اور گروہ بندی (جو سیاست کا مزاج ہے) سے مدرسہ کو محفوظ نہ رکھ سکے گا۔

خوب سمجھ لینا چاہیے کہ مدرسہ اور تعلیم گاہ کا ماحول کامل طور پر یکسوئی کا طالب ہوتا ہے جب کہ سیاسی زندگی یکسر شورش اور ہلچل کا نام ہے۔ ''علمی زندگی کی جمعیتیں اور سیاسی زندگی کی شورشیں ایک ساتھ جمع نہیں ہوسکتیں، پنبہ وآتش میں آشتی محال ہے''۔

علمی زندگی اور عالمانہ ماحول میں سیاست کی آمیزش گویا متاعِ علم وفکر کو برقِ خرمن سوز کے حوالہ کرنا ہے۔ علمی مزاج کے حامل بابائے سیاست مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے مذکورہ بالا الفاظ میں خود اپنا ماتم کیا ہے۔

(۱۱) ایک دینی مدرسہ اور مرکزی ادارہ کے منصب اہتمام پر فائز شخص کے لیے نہایت ضروری ہے کہ وہ نسبتِ احسانی کا حامل ہو۔ یعنی ایک عرصہ دراز تک کسی شیخ باطن کی صحبت میں رہ کر رذائل کے ازالے پر سخت محنت کے ذریعے اپنے باطن کو مزکی اور خصائل حمیدہ سے مجلّی کیے ہوئے ہو، خوب واضح رہے کہ مدارس کے اس نظام اور ساری تعلیم وتعلّم کا مقصد ہی حقیقتاً تربیت کے ذریعے تزکیہ اور نسبتِ احسانی کا حصول ہے، یہ نہیں تو کچھ نہیں، سارا نظامِ تعلیم محض لغو اور بیکار ہے۔

اوپر قدرے اختصار کے ساتھ منصبِ اہتمام کی اہمیت کے پیش نظر گیارہ اوصاف ذکر کئے گئے، اب ہم ذیل میں ان گیارہ اوصاف کے حوالے سے حکیم الاسلامؒ کی شخصیت کی طرف مختصر اشارات کی کوشش کریں گے۔

جن مدارس کو خاص طور پر مرکزی اداروں کو ایسے اوصاف کی حامل شخصیات دستیاب ہوں گی، حقیقتاً وہی ادارے ترقی کرسکیں گے اور خاطر خواہ بہتر نتائج کے حامل ہوں گے۔

ہم جب ان اوصاف کو دیکھتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ کس طرح یہ ساری چیزیں حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند کے مزاج وطبیعت اور سرشت وجبلت میں داخل اور رچی بسی تھیں۔

دارالعلوم دیوبند جسے الہامی مدرسہ کہا جاتا ہے، خاص طور پر ملتِ ہندیہ پر اللہ رب العزت کا فضل وانعام ہے۔ اس مرکزی ادارہ کے انتظام وانصرام کے لیے ایسی ہی ہمہ صفت موصوف شخصیات میسر رہیں۔

حکیم الاسلام حضرت مہتمم صاحبؒ صحیح معنی میں نمونۂ اسلاف اور یادگار اکابر تھے، حجۃ الاسلام حضرت نانوتویؒ کے علوم نقلیہ وعقلیہ کے حقیقی جامع اور وارث اور حکمتِ قاسمی کے کامل امین تھے۔

(۱) علمی جامعیت

چناں چہ آپ نے علمی جامعیت میں کمال کے ساتھ درس وتدریس سے رابطہ رکھتے ہوئے دارالعلوم دیوبند میں حدیث کی تدریس اور ''حجۃ اللہ البالغہ'' کے کراماتی درس کو جاری رکھا، اور یہ وہ خصوصی کتاب تھی جس میں آپ کے حکیمانہ ذوق کے اسرار اور جواہر خوب خوب نمایاں ہوئے اور پڑھنے والوں کو بیک درس ایسے ایسے یواقیت اور لآلی ہاتھ آجاتے جن کا میسر آنا مدتوں کی محنتوں کے بعد بھی مشکل ہوتا۔ ابتداء سے انتہاء تک ساری ہی کتابوں کی تدریس کا سلسلہ رہا، دارالعلوم میں ''حجۃ اللہ البالغہ'' کا درس تو بہت ہی مشہور اور مقبول تھا۔

۱۳۹۷ھ کے درمیانِ سال میں جب شیخ الحدیث حضرت مولانا شریف الحسن صاحب دیوبندیؒ کا وصال ہوا تو فوری طور پر بخاری شریف جلد اوّل اور ترمذی شریف جلد اوّل کا درس حضرت مہتمم صاحبؒ نے شروع کر کے سلسلۂ درس کی برکات کو موقوف ہونے سے بچالیا اور جب تک متبادل انتظام نہ ہوا آپ نے ان دونوں اہم ترین کتابوں کا درس دیا۔ آپ کے درس حدیث کے نکات اور علمی حقائق اور معارف اس وقت ایک کتاب کی شکل میں طبع بھی کردیے گئے تھے۔

(۲) مؤثر اور حکیمانہ انداز

آپ کے طویل ترین دورِ اہتمام میں دارالعلوم متعدد بار بڑی ہلچل اور شورش سے گذرا مگر اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی صفات وصلاحیتوں سے نہایت ہی مدبرانہ اور حکیمانہ انداز پر ان سب ناپسندیدہ حالات کو بطریق احسن نمٹایا اور دارالعلوم کو زبردست بھونچالوں سے باہر نکالا۔ (دارالعلوم کی تفصیلی تاریخ اس کی گواہی دے گی)

(۳) فہم وفراست

آپ کی فہم وفراست سے دارالعلوم کے مختلف اور متنوع عقدۂ لاینحل بڑی خیر وخوبی سے حل ہوئے اور باوجود مختلف طبائع اور مزاج کے اساتذہ اور کارکنان میں ایک ایسا اتحاد اور ایسی باہمی یگانگت کا نظارہ دیکھنے میں آیا اب جن کے دیکھنے کو نگاہیں ترستی ہیں۔

(۴) دل کش اندازِ بیان وتعارف

حضرت مہتممؒ کے دورِ مسعود میں اہل علم وفضل واردین وصادرین کا جو سلسلہ نظر آتا ہے اور آپ کے دلکش

تعارف کی بدولت ادارہ کی علمی حلقہ میں جو وسعت نظر آتی ہے وہ بس آپ کے دور کی خصوصیت ہو کر رہ گئی۔

۱۳۵۵ھ میں جامعہ از ہر مصر کے مخصوص اساتذہ پر مشتمل وفد کی حاضری ہو، اور امیر وفد شیخ ابراہیم الجبالی کا آپ کے اہتمام میں دار العلوم کی علمی حیثیت اور کوائف پر مسلسل اظہار تعجب ہو، یا ۱۳۵۸ھ میں سلطان ابن سعود کی حکومت کی جانب سے مطبوعہ اہم کتابوں کا گراں قدر ہدیہ ہو، یا اسی سال حضرت مہتمم صاحبؒ کے یادگار سفرِ افغانستان کی برکات بشکل ''باب الظاہر'' ہو۔ یا ۱۳۷۱ھ میں ایک مصری فاضل شیخ محمد ارشاد بن عبدالمطلب کی دار العلوم میں تشریف آوری اور زیارتِ دار العلوم کو اپنے لیے باعثِ فخر شمار کرنا ہو۔ یا ۱۳۷۳ھ میں شاہ سعود کا وارد ہند ہو کر دار العلوم دیوبند کے ساتھ اظہار عقیدت ومحبت کرتے ہوئے پچیس ہزار روپے کا عطیہ ہو، یا اسی سال انور السادات مرحوم صدر متحدہ عرب جمہوریہ مصر کا دار العلوم میں ورود اور حضرت مہتمم صاحبؒ کی شیریں زبانی سے دار العلوم کے تعارف پر متاثر ہو کر صمیم قلب سے مبارک باد ہو، یا ۱۳۷۷ھ میں محمد ظاہر شاہ افغانستان کا دار العلوم میں ورود مسعود ہو، یا ۱۳۸۲ھ میں جلیل القدر شامی عالم اور مشہور محقق، استاذ ''جامعہ حلب'' شام۔ شیخ عبدالفتاح ابوغدہ کی آمد اور دار العلوم کے بارے میں عظیم تاثرات ہوں، یا ۱۳۹۳ھ میں سعودی عرب سے آئے ہوئے دو وفود کا خراج تحسین ہو، یا ۱۳۹۵ھ میں شیخ الازہر عبدالحلیم محمود کی تشریف آوری اور دار العلوم دیوبند کے عظیم کارناموں اور ہمہ جہتی خدمات کی مدحت سرائی ہو، یا ۱۴۰۰ھ میں دار العلوم کے ''عالمی اجلاس صد سالہ میں عالمی پیمانہ پر حضرت حکیم الاسلامؒ کا اس انداز پر دار العلوم دیوبند کو متعارف کرانے کا عالمی اعتراف وتصدیق کا بین الاقوامی مظاہرہ، اور جن کے ایک اعلان پر عالم اسلام کے گوشے گوشے سے پچاس لاکھ سے زائد افراد کا بے مثال مجمع، اور اس میں نہ صرف برصغیر بلکہ دنیائے اسلام کے اساطین واراکین سلطنت، علماء، مشاہیر اور عامۃ الناس کا دار العلوم دیوبند کے وقار وجلال اور اس کی عظمت وسطوت اور عروج وکمالؒ کا کھلی آنکھوں سے مشاہدہ'' ہو۔ وغیرہ وغیرہ یہ سب آپ کے اسی حکیمانہ اور پرتاثیر اندازِ تعارف کے عظیم الشان، بے مثال اور تاریخی نتائج ہیں۔

(۵) وعظ ونصیحت اور تقریر وخطابت

حضرت حکیم الاسلامؒ کی حیات کے اہم ترین عناصر میں نہایت پرکشش پہلو یہ بھی ہے کہ آپ ایک بے مثال واعظ اور خطیب تھے، حقیقت یہ ہے کہ وعظ وتقریر میں علماء اور واعظین کی صف میں آپ کا کوئی مثیل اور ثانی نہ تھا، آپ بلاشبہ امتیازی مقام کے حامل تھے۔ اس میں آپ کو ایسا ملکہ راسخہ حاصل تھا جسے موہبت الٰہی کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

دورانِ تقریر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ایک چشمہ رواں ہے، اور ایک ایسا آبشار ہے جو اوپر سے نیچے نہایت یکسانیت اور سکون کے ساتھ اپنے جلو میں علوم و معارف اور اسرار و حکم کو لیے بہہ رہا ہے۔

(۶) تصنیف و تالیف

مضمون نگاری اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ آپ نے زمانۂ طالب علمی سے ہی شروع کر دیا تھا اور یہ مبارک سلسلہ وفات کے قریب تک دراز رہا، آپ کی تصانیف علمی، دینی، تاریخی ادبی، معاشرتی اور تمدنی موضوعات پر ہیں جو سو کے قریب ہیں۔

اس رُخ سے آپ کی خصوصیت یہ تھی کہ موضوع خواہ کیسا ہی خشک ہو علمی وقار، عالمانہ انداز، اسرار و حکم اور عارفانہ نکتوں سے خالی نہیں رہ سکتا تھا۔

دارالعلوم دیوبند کے منصبِ اہتمام پر فائز رہتے ہوئے، آپ ملک اور ملک سے باہر دور دراز کے دعوتی اور تبلیغی اسفار بھی کرتے، آپ کے اسفار کا دائرہ ایشیا سے گذر کر امریکہ، افریقہ اور یوروپ کے ممالک تک وسیع تھا۔ دارالعلوم دیوبند اور جماعتِ دیوبند کا عالمی پیمانہ پر اتنا عظیم الشان تعارف آپ ہی کے دورِ مسعود میں ہوا۔

(۷) تدبر اور مدبرانہ فیصلہ

دارالعلوم دیوبند ایک بین الاقوامی ادارہ ہے، آئے دن یہاں مختلف النوع مسائل کا انبار رہتا ہے جن سے مہتمم کو براہِ راست سروکار رہتا ہے، اگر مہتمم تدبر و تفکر کے وصف سے خالی رہے گا تو کبھی مسائل کا صحیح تجزیہ اور اس پر مناسب فیصلہ نہیں کر سکے گا۔

حضرت مہتمم صاحبؒ نے مسائل پر کھل کر تجزیہ اور ان پر واضح رائے و مشورہ کے لیے ایک مشاورتی کمیٹی بنائی تھی، پیش آمدہ مسائل تعلیمی و انتظامی ہوں، یا داخلی اور خارجی ہوں سب پر کھلے طور سے مشورہ فرماتے تھے۔

یہاں اختصاراً دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

ایک بار درجۂ علیا کے اساتذہ کی مجلس بلائی، مسئلہ یہ تھا کہ دارالعلوم میں ایک قدیم دور کی خراب پڑی ہوئی کار تھی اور روز بروز زنگ آلود ہو کر مسخ ہوتی جا رہی تھی، حضرت مہتمم صاحبؒ نے اس کے بارے میں مشورہ طلب فرمایا، ایک بڑے استاذ کی زبان سے یہ نکلا کہ ''حضرت میری حقیر رائے تو یہ ہے کہ یہ اکابر کے زمانے کی یادگار رہے، اسے یونہی (بطورِ تبرک) رہنے دیا جائے''۔

بس پھر کیا تھا یکے بعد دیگرے سارے ہی حضرات نے اسی کو دہرایا اور تائید کردی، حضرت مہتمم صاحبؒ اپنے خاص انداز میں بیٹھے ہوئے خاموشی کے ساتھ سنتے رہے۔ آخر میں حضرت مولانا وحید الزماں صاحب کیرانویؒ (م ۱۹۹۵ء) آپ اسی سال درجۂ علیا پر فائز ہوئے تھے اور شاید مجلس میں یہ آپ کی پہلی شرکت تھی) سے استفسار فرمایا، مولانا موصوف نے اوّلاً نہایت تیکھے تیور کے ساتھ عرض کیا:

''جی ہاں! حضرت بالکل بلکہ میری رائے تو یہ بھی ہے کہ اس کار کو ایک موٹے سے رسے سے باندھ کر دارالتفسیر پر لٹکا دیا جائے اور اس پر موٹے حروف میں لکھ دیا جائے ''یادگارِ اکابر'' پھر پہلو بدل کر عرض کیا ''حضرت! اکابر کی یادگار تو یہ دارالعلوم ہے اس کی تعلیمی وتربیتی پہلو کی جانب زیادہ سے زیادہ توجہ درکار ہے، میری مؤدبانہ گذارش ہے کہ اگر کل اسے یہاں سے ہٹانا ہو تو آج ہی اسے کباڑی کے پاس پہنچا دیا جائے شاید کچھ پیسے مل جائیں''۔

یہ سن کر مجلس پر سناٹا طاری ہوگیا، مگر حضرت مہتمم صاحبؒ کے چہرے پر ایک مسرت آمیز کیفیت نظر آئی اور فرمایا:

''مولانا وحید الزماں صاحب جو فرما رہے ہیں اسے نوٹ کرلیا جائے'' اور اسی کے مطابق فیصلہ صادر فرمادیا، حضرت مہتمم صاحبؒ کا یہ فیصلہ بلاشبہ ساری مجلس کے علی الرغم تنہا فردِ واحد کی رائے پر ہوا، مگر چوں کہ صائب تھا اس لیے بغیر کسی توقف کے نافذ فرمادیا۔

ایک مثال انھیں صاحب سے متعلق ۱۴۰۰ھ میں دارالعلوم دیوبند کے عالمی اجلاس صد سالہ کے موقع پر مدرسہ کی تعمیراتی اصلاح کے لیے تمام اراکین کے مشوروں کے علی الرغم مولانا کیرانوی مرحوم کو، پورے اختیارات کے ساتھ تعمیرات کا نگراں مقرر کردینا اور قدم قدم پر رکاوٹوں کے دوران مولانا کی مکمل حمایت وتائید جسے دنیا نے دیکھا یہ سب اسی تدبر اور مدبرانہ فیصلوں کے نتائج تھے۔

(۸) مروّت ورافت کا مجسمہ

حضرت حکیم الاسلامؒ شرافت اور مروّت کا مجسمہ تھے، اس سلسلے میں آپ کی حیات کے متعدد واقعات میں سے صرف ایک واقعہ پیش کیا جاتا ہے۔

حضرت مہتمم صاحبؒ کے دفترِ اہتمام میں تشریف لانے کا ایک مخصوص راستہ تھا، مسجد دارالعلوم سے ہوکر ذیلی راستے سے دفترِ اہتمام میں تشریف لاتے تھے، ایک روز مسجد کا دربان اسٹول پر بیٹھا، پاؤں اس طرح پھیلائے ہوئے کہ راستہ بالکل بند۔ حضرت مہتمم صاحبؒ اپنے وقت پر مکان سے تشریف لائے اور

راستہ بند دیکھ کر بغیر کوئی آہٹ پیدا کئے راستہ بدل کر دفتر اہتمام آ گئے، حضرت کو اس کا کوئی بھی خیال نہ آیا۔ لیکن ذمہ دار اور نگراں کو معلوم ہوگیا اور پھر اس غفلت کی دربان کو سزا ملی، دربان معافی کی ایک درخواست کے ساتھ حضرت مہتمم صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔ پھر حضرت نے کیا کیا؟ ملاحظہ فرمایئے:

حضرت اس کی درخواست پر کچھ اس طرح ارقام فرماتے ہیں:

''مدرسہ کے یہ کارکن یقیناً شب بیدار ہوں گے، اسی شب بیداری کی وجہ سے اس وقت اتفاقاً ان کی آنکھ لگ گئی ہوگی اس لیے درگذر کیا جانا چاہیے۔'' (ہٰکذا)

اور پھر حضرت کی اس مروّت کے نتیجے میں وہ دربان بحال ہوگیا۔

(۹) جرأت اور قوتِ فیصلہ

کہا جاتا ہے کہ حضرت مہتمم صاحبؒ میں جرأت کی کمی تھی، راقم الحروف کے نزدیک یہ آپ پر ایک اتہام ہے، اگر جرأت اس کا نام ہے کہ بے موقع اور اپنے بڑے اور بزرگ کے فرق مراتب اور ان کا پاس ولحاظ کئے بغیر بلند آواز سے زبان سے اُول فول نکال دیا جائے، تو اس معنی میں یقیناً آپ جری نہیں تھے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ایسی بے جا جرأت بلکہ ایسی گستاخی اور بے ادبی سے آپ کو اللہ رب العزت نے محفوظ رکھا تھا۔

یہاں جرأت اپنے حقیقی معنی میں تھی یعنی کسی کا حق سلب کئے اور معمولی طور پر بھی کسی کے ساتھ زیادتی کئے بغیر قوت وہمت اور سلیقہ کے ساتھ حق دار کو اس کا حق پہنچانا۔ حضرت مہتمم صاحبؒ کی اس معنی میں جرأت مندی کی صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔

دارالعلوم دیوبند میں آج سے پچیس چھبیس سال پہلے اساتذہ اور کارکنان کی تنخواہیں بے حد قلیل تھیں اور گرانی روز افزوں۔ اساتذہ وکارکنان کی درخواست پر آپ کا دردمند دل متوجہ ہوا، آپ نے ان سب درخواست دہندگان کی درخواست پر کس قدر مناسب انداز میں ایک نہایت ضروری اور صحیح فیصلہ صادر کرتے ہوئے سب کی تنخواہیں دوچند کردیں اور سلیقہ ملاحظہ فرمایئے۔

ارقام فرماتے ہیں: ''بامید منظوری شوریٰ''

حضرت حکیم الاسلامؒ شب وروز دارالعلوم کے تمام اُمور سے نمٹتے تھے، سب کچھ آپ ہی کو دیکھنا ہوتا تھا، ادارہ کی نشیب وفراز اور اس کی دقتوں، نزاکتوں اور ضرورتوں کو آپ کے سوا کون سمجھ سکتا تھا۔ اس وقت کے بعض اراکینِ شوریٰ نے اعتراض کرنے کی جرأت کی تو حضرت نے یہ ارشاد فرما کر ٹھنڈا کردیا۔

''میں نے اس میں یہ بھی تو لکھا ہے ''بامیدِ منظوری شوریٰ'' آپ کو ناپسند ہو تو اسے رد کردیں، مگر

بہر حال اس زمانے کے سارے ہی حضرات اراکین حضرت حکیم الاسلامؒ کے مقام ومرتبہ اور آپ کے عظیم الشان اور بے مثال کارناموں کو بچشمِ خود دیکھنے والے تھے، بالآخر منظور کرلیا۔

کوئی ''ضابطہ اور قانون'' کی دہائی دے سکتا ہے، بے شک مدارس اور اداروں کے لیے ضابطے اور قوانین ہوتے ہیں اور ان کی پابندی اور بجا آوری بھی ضروری ہوتی ہے، مگر خوب سمجھ لینا چاہیے کہ ضابطہ سے بالاتر نہ سہی مگر حالات اور زمانہ کے تقاضے کے پیشِ نظر کبھی کبھی رابطہ بھی ایک لابدی شے بن جاتی ہے، البتہ وہ موقع اور محل کے مطابق ہو، حضرت حکیم الاسلامؒ سے زیادہ موقع ومحل اور وقت کا تقاضا اور ضرورت کو کون سمجھنے والا ہوسکتا تھا، ایسے طویل ترین اور عظیم ترین تجربات کس کی حیات کا سرنامہ تھے؟

یہ تو صرف ایک مثال تھی، ایسی جرأت مندانہ اور مدبرانہ تجاویز اور فیصلے نہ جانے کتنے تھے۔

(۱۰) دورِ حاضر کی سیاست سے پاک

جیسا کہ آغاز میں عرض کیا گیا، دورِ حاضر کی بدنام سیاست، محض ایک شورش اور ہلچل کا نام ہے دورِ حاضر کی سیاست کے بارے میں ہوئے ''صاحبانِ فکر ونظر'' کے سیاسی فکر اور فیصلے سے دنیائے علم وفضل کو کیسے کیسے زخم ملے ہیں، ان زخموں کی ٹیس سے ایک دنیا کراہ رہی ہے۔

حضرت حکیم الاسلامؒ حضرت حکیم الامتؒ کی بزمِ خیر وبرکت کے ایک درخشندہ ستارے تھے، حضرت حکیم الامتؒ ہی کی طرح، آپ نے بھی علم وفضل کی پرسکون اور سیدھی راہ کو سیاست کی پرشور اور پرپیچ وادیوں کے ساتھ خلط ملط نہ ہونے دیا۔

دارالعلوم دیوبند کوئی علاقائی، کوئی صوبہ جاتی اور کوئی یک ملکی مدرسہ نہیں ہے اور یہ صرف برصغیر کے مسلمانوں کی تعلیم گاہ بھی نہیں ہے بلکہ یہ عالمِ اسلام کا بین الاقوامی ادارہ ہے۔ اس کی بین الاقوامیت کا تقاضا یہی ہے کہ اس ادارے کا سربراہ اور مہتمم موجودہ دور کی گھٹیا اور گھناؤنی سیاست کی تنگنائیوں سے بالاتر ہو، ایسے عالمی ادارے کا مہتمم کوئی ایسا ہی عظیم شخص ہو جو مذکورہ بالا اوصاف میں منفرد مقام رکھتے ہوئے ملتِ مسلمہ میں ہمہ جہت ہو اور ہمہ گیر مقبولیت کا حامل ہو، بلاشبہ حضرت حکیم الاسلامؒ نے اپنے اسلاف کی طرح خود کو کسی سیاست کا اسیر نہ رکھتے ہوئے دارالعلوم کو اسی شانِ عظمت اور تاریخی کردار کے ساتھ ساٹھ سال کے طویل اور تاریخی عرصہ تک ہمہ جہتی ترقیات کی روشن شاہراہوں پر قائم رکھا، جس کا واضح اعتراف واقرار آپ کے مخالفین نے بھی کیا۔

دارالعلوم کی بے پناہ مقبولیت اور محبوبیت اور اس کی عالمگیریت کا محور اگر حکیم الاسلامؒ کا کمالِ علمی، اوصافِ ظاہری و باطنی، زہد وتقویٰ، دیانت و امانت، فہم و فراست میں منفرد مقام کا مالک ہونا تھا تو ٹھیک اسی طرح آپ کا دارالعلوم دیوبند کو ہر طرح کی سیاستوں سے بچا کر اس کو ہمہ جہت اور ہمہ گیر بنانا بھی تھا۔

دارالعلوم دیوبند جیسے عالمی اور بین الاقوامی ادارہ کے منصبِ اہتمام کے لیے جیسے ہمہ صفت موصوف اور جامع کمالات شخصیت کی ضرورت تھی حضرت حکیم الاسلامؒ ایسے ہی جامع کمالات تھے۔

اس عظیم ادارہ کے اس اہم منصب کی بلاشبہ آپ زینت تھے، یوں تو ؎

ہر بوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی!

لیکن حقیقت یہ ہے "مہتمم دارالعلوم دیوبند" کہلانے کی مستحق صرف آپ کی ذاتِ بابرکات تھی۔

فرحمه الله تعالیٰ رحمة واسعة ومغفرة كاملة

و اٰخر دعوانا ان الحمد لله رب العلمين

والصلوة والسلام على خاتم النبيين

............❖............

مقاماتِ مقدسہ اور حکیم الاسلام

ایک حکیمانہ انفرادی اسلوب

مولانا ڈاکٹر عبدالرحمٰن ساجد اعظمی

تین مختلف جغرافیائی خطوں کے مسلمانوں کا دھڑکتا دل، دارالعلوم دیوبند۔ اسی دیوبند کی سرزمین پر دارالعلوم دیوبند کے معمار ثالث حکیم الاسلام محمد طیب صاحب (رحمه الله رحمةً واسعةً) نے دارالعلوم کے جشن صد سالہ میں تقریباً تین ملین فرزندان توحید کو علم کے نورانی سائبان کی فرحت بخش ہواؤں میں جمع فرمایا تھا۔

وہ ذات جو اپنی شیریں گفتگو، ادبی ذوق، علوم وافکار کے تنوع، خوبیٔ تعبیر، پاکیزگی نفس، حلم وتواضع، اخلاق ورواداری اور بے شمار محاسن ومکارم کا مجموعہ تھی، جس کے سامنے اہل علم کی گردنیں ادب سے جھک جاتیں اور زبان بے ساختہ پکار اٹھتی ع

اے تماشا گاہ عالم بس تجھے آداب ہے

جس کی زبان وزندگی جعلها کلمةً باقيةً في عقبه کی صورت میں آج آشکارا ہے۔ اس کی تصنیفات وتالیفات میں حل افکار کی بلند پروازی، اسرار وحکم کی فراوانی، اعجاز بیان کی نقش آرائی اور جمالیاتی ادب کا اس قدر ظہور ہے کہ بس! پڑھیے، دیکھئے اور سوچتے رہئے کہ کس طرح ایک مرکزی نقطہ سے اسرار وحکم اور فکر وفلسفہ کے چشمے پھوٹ کر سیل رواں بن جاتے ہیں۔ ع

چلا تو چلتا رہا وہ کسی ندی کی طرح

آیئے! چند لمحے کے لئے حکیم الاسلامؒ کی فکر ونظر اور اسلوب کی انفرادیت پر نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ

''تجلّی'' کے ایک مرکزی نقطہ سے جو ظہور میں نہیں۔ (گویا یہ ایک سسپنس ہے) اس کی عکس ریزی سے مقاماتِ مقدسہ کی تقدیس کا حیران کن فلسفہ جو حکیم الاسلامؒ کی کتاب دل سے ''مقاماتِ مقدّسہ'' کی شکل میں منصۂ شہود پر آیا ہے اس میں انداز بیان کی اس ندرت پر غور کیجئے۔

گفتگو ایک مرکزی نقطہ متوازی زاویۂ خطوط پر شروع ہو کر ایک سے تین، تین سے تین، تین سے ایک، تین میں ایک اور پھر ایک سے انفسی، آفاقی، عقلی، حسی، فکری، جدلی، عدلی دلائل اور حقائق و معارف سے گہربار ہو کر پھی تین کے ہندسے کی طرف لوٹ آتی ہے۔ اس طرح پوری کتاب ''تین'' کے عجیب و غریب فلسفہ کے درمیان دائر رہتی ہے۔ یہ گفتگو ہے ''مقاماتِ مقدسہ'' کی جو ۶۰۷ صفحات پر مشتمل ہے۔

گفتگو کا مرکزی سفر

انجیر و زیتون کی چھاؤں، قدس شریف، مرکز انوارِ موسوی، طور سیناء کے پہاڑ، مرکز انوار محمدیؐ 'بلد امین' سے شروع ہوتا ہے۔ بلحاظ عظمت اور فضیلت و وقعت، انھیں تین کو کیوں منتخب کیا گیا؟ اور پھر انھیں تینوں مقاموں کو انسانی حسن و جمال، فضیلت و برتری اور سیرت کے کمال پر گواہ کیوں بنایا گیا؟ یا یوں کہئے کہ انسانی ہیکل کا حسن و جمال، کمال و اعتدال اور جامعیت کا ادعاء ان تینوں مقامات کی گواہی سے کیسے ثابت ہوتا ہے۔

اس بات کو سمجھنے کے لئے یہ حقیقت سامنے رکھئے کہ ان ہی تین مقامات سے تین مقدس ترین شخصیتیں ابھریں۔ تین و زیتون کی چھاؤں میں آئے ہوئے قدس شریف سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات بابرکات نمایاں ہوئی۔ طور سیناء سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تقدس کا درس دیا۔ بلد امین سے خاتم النبیّینؐ کی ذات اقدس کا آفتاب عالم تاب طلوع ہوا۔ مکان سے مکیں اور مکیں سے مکان مراد لیا جانا بقول ابن قیم فصحاء کے کلام میں مروج ہے اور بلاغت کا تسلیم شدہ اصول ہے۔ اس اصول کے مطابق تینوں مقامات سے مراد تینوں مقدس اشخاص ہیں، جو لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ کے دعویٰ کی دلیل ہیں۔ یعنی اگر کوئی انسان کے احسن تقویم کے دعویٰ کی دلیل چاہے تو وہ ان تینوں ہستیوں کی ذات بابرکات کو دیکھ لے۔

تین مقامات مقدسہ کی تین شخصیات مقدسہ کے تاثیر و تصرف سے انھیں تین مقامات سے تین بڑی بڑی قومیں ابھریں، یہود و نصاریٰ اور مسلمین جو تین آسمانی ملتوں کی پابند اور ملت ابراہیمی کی شارح قومیں ہیں۔ اور انھیں تینوں کے عروج و زوال سے دنیا کے اس آخری حصہ کی تاریخ وابستہ ہے۔ انھیں اس دنیا میں وقت کتنا دیا گیا۔ اگر ان قوموں کے ظہور سے تا قیام قیامت ایک دن فرض کر لیا جائے تو بصراحتِ حدیث نبوی صحیح سے زوال تک کا وقت یہود کو دیا گیا۔ جس میں دینی اعتبار سے وہ برسر اقتدار رہے۔ زوال سے عصر

تک نصاریٰ کو ملا۔ اور عصر سے مغرب تک امت مسلمہ کے حق میں آیا گویا دنیا کی یہی تین قومیں آخری ہیں اور انھیں سے دنیا کی آخری تاریخ وابستہ ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ کسی دائرے کا خاتم ہی اس دائرے کی اصل بھی ہوتا ہے۔ اس لئے حق تعالیٰ نے انہی مقامات کو اصل کی حیثیت سے چنا اور ان کی قسم کھا کر انسان کی جامعیت وفضیلت پر استدلال فرمایا۔

رہا یہ کی دنیا کے آخری حصہ کو تین عالمی مرکزوں کی ضرورت کیوں تھی؟ دنیا کی آخری قوموں کو انھیں تین مقامات سے نشو ونما دینے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اور پھر ان تینوں میں امت محمدیہؐ کو فوقیت وفضیلت کیوں دی گئی اس پر مبسوط گفتگو کچھ اس طرح رقم ہوئی۔

تین فرق ہیں بنی اسرائیل اور اہل اسلام میں (۱) بنی اسرائیل میں نبوت وملوکیت عالمی انداز کی نہ تھی۔ (۲) دونوں کے حلقے اور دائرے عام حالات میں الگ الگ تھے۔ (۳) اسلام میں منصبِ اقتدار کو بنی اسرائیل کی طرح کسی خاص خاندان کی وراثت قرار نہیں دیا گیا بلکہ انتخاب اصلح کا اصول رکھا گیا۔ اور اس کی جھلک ''خلافت راشدہ'' کی شکل میں سامنے ہے۔

عالمی دین کے تین بنیادی عناصر

(۱) عبادت ودیانت (۲) سیاست ونظام اجتماعیت (۳) عسکریت وفوجی قوت، عبادت کو مقصد حیات بنا دیا گیا، سیاست وحکومت کو نظام عبادت کے لئے وسیلہ کی حیثیت دی گئی، تاکہ دین داخلی فتنہ پردازوں سے محفوظ رہے، عسکریت وفوجی قوت کو سرحدات کی حفاظت کے لئے رکھا گیا، تاکہ بیرونی دشمن اور دین کے مخالف نظام میں خلل نہ ڈال سکیں۔

ان تینوں عناصر کے لئے تین مراکز کی ضرورت: (۱) عنصر عبادت، امن وسکون، ذہنی یکسوئی خلوت پسندی وغیرہ چاہتی ہے۔ (۲) عنصر سیاست، سیاست وحکمرانی، ہمہ وقت جوڑ توڑ، دار وگر، سزا وتعزیر، جنگ پسندی، ہنگامہ آرائی، وغیرہ چاہتی ہے (۳) عنصر عسکریت، فوج کشی، نقل وحرکت، رعب نمائی، دہشت انگیزی، سرحدات پر نظر، آمادگیٔ جنگ وپیکار وغیرہ چاہتی ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ تینوں متضاد عناصر ایک مرکز میں جمع نہیں رہ سکتے تھے۔ اس لئے حق تعالیٰ نے ان کے تین ہی مرکزی مقامات عالمگیر انداز سے حسب مناسبتِ مقام پوری دنیا کے لئے وضع فرمائے۔

مرکز دین وعبادت مکہ کو بنایا۔ مرکز سیاست وشوکت، قدس شریف کو قرار دیا، مرکز تحفظ وعسکریت طور سیناء کو رکھا۔ ان تینوں عناصر کی اجتماعیت کے بغیر نظام دنیا کی ویرانی لاریب یقینی ہے۔ اس لئے حق تعالیٰ کی

حکمت ومشیت کا تقاضا ہوا کہ دنیا کی تین بڑی قوموں، یہود ونصاریٰ اور مسلمین کی آثار کو جو انوار موسویؑ، انوارِ عیسویؑ، انوارِ محمدیؐ کے فیضان سے وجود یافتہ ہیں۔ان کے ذریعہ ایسی جامع امت کی بنیاد ڈالی جائے جو پوری دنیا کی واحد امت ہو۔اس لئے ان تینوں مرکزی مقامات مرکز موسویت، طور سینا، مرکز عیسویت، قدس شریف، اور مرکز محمدیت مکہ مکرمہ کی خصوصیات کا تجزیہ کر کے انھیں ایک ہی مرکزی نظام پر لا جوڑا۔اور ان تینوں خاص خاص مرکزیتوں کو الگ الگ باقی رکھتے ہوئے بھی ایک ہمہ گیر مرکزی نظام خلافت سے وابستہ کر دیا۔اور ان تینوں مرکزوں کی خصوصیات، ہمہ گیر تقدس وروحانیت پر رکھی۔

ہر سہ مقامات مقدسہ کی تقدیس کی تاریخی حیثیت، شرعی نقشہ، انقلاب احوال۔

بلد امین کی تاریخی حیثیت

حضرت ابراہیمؑ ہاجرہؑ اور اسماعیلؑ تینوں کا سفر حجاز، مقام آب زمزم پر تینوں کا ورود، ہاجرہ اور اسماعیل کی سکونت اور حضرت ابراہیم کا عراق وفلسطین کا سفر، فلسطین سے حجاز کے تیسرے سفر میں بیت اللہ کی تعمیر کا حکم۔

طور سینین کی تاریخی حیثیت

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا طور پر چالیس روز قیام، کلام ربانی کی گونج، موسیٰ کو شرف کلیمی، قانون الٰہی (تورات) کے الواح کی حوالگی، جنت کے ایک پہاڑ کا نام (طور) قومِ موسیٰ کا طور کی جانب قدرتی رجوع۔

قدس کی تاریخی حیثیت

حضرت عیسیٰؑ جیسے الوالعزم پیغمبر کی دعوت وتبلیغ کا مرکز۔ ہر سہ مقامات مقدسہ کی تقدیس کا شرعی نقشہ

مکۃ المکرّمہ

بلد امین کا تذکرہ زبانِ رسالت مآبؐ پر "إن احب البلاد الی اللّٰہ مکۃ" (کنز العمال) اور "واللّٰہ إنك لخیر ارض اللّٰہ (کنز العمال) کے الفاظ میں آیا۔اللہ کے لئے مکمل تواضع اور نیازمندی کے ساتھ مکہ کی حاضری اعلان مغفرت کا سبب فرمایا گیا۔پورے رمضان مکہ میں قیام وصیام کا بدلہ غیر مکہ کے ایک لاکھ رمضان کے برابر ہے، ہر دن اور ہر رات میں ایک مغفرت اور ایک شفاعت کا اعلان اور ہر دن میں گھوڑے کے دوہرے بوجھ کے برابر صدقہ کرنے کا ثواب، اور ہر دن میں ایک دعاء کی قبولیت (کنز العمال) مکہ میں انتقال سماء دنیا میں انتقال کے ہم معنی اور مکہ میں مرجانے والوں کو حق تعالیٰ کی طرف سے قیامت کے دن امن والوں میں اٹھائے جانے کی خوش خبری (تفسیر عزیزی) دی گئی ہے۔

قدسِ شریف

بیت المقدس کے نام سے مشہور ہے جو بے شمار تقدیسی خصوصیات کا حامل ہے۔ مکہ میں مرجانے کا جو ثواب احادیث میں مذکور ہے وہی بیت المقدس کے بارے میں بھی مذکور ہے۔ کلی طور پر الحادو دہریت کے برپا ہونے کی اس مقام سے نفی کی گئی ہے۔ وہاں کے باشندوں میں دینی حرارت اور ملّی غیرت کے ہمیشہ مشتعل رہنے کا اظہار فرمایا گیا۔ مزید برآں قرآن نے اس کی تقدیس پر ارض مقدس کہہ کر اپنی مہر لگا دی۔

طورِ سینین

احادیث میں اس کو جنت کا پہاڑ کہا گیا، روایت گو سنداً ضعیف ہے مگر تین وجہ سے اس میں قوّت ہے۔ (۱) فضائل میں توسّع کی گنجائش ہے۔ (۲) ضعیف حدیث بھی مستند تاریخی روایت سے کم نہیں۔ (۳) طورِ سیناء کی فضیلت پر قرآن کی شہادت موجود ہے۔

طور کی فضیلت یہ بھی ہے کہ وہ محلِّ نداءِ الٰہی، مقامِ کلامِ خداوندی، جلوہ گاہِ تجلّی ربانی کے شرف سے مشرف ہے۔ ہر سہ مقامات مقدسہ کا یہ تھا عقلی، تاریخی اور شرعی نقشہ یا طبعی، تاریخی، تاثیری نقشہ، جن کے تقدس کے اثرات، یقیناً انسانوں کی پاکیزہ سیرت وصورت پر پڑیں گے۔ شمع اگر روشن ہے تو صرف خود ہی روشن نہیں بلکہ اپنے ماحول کے لئے روشنی بخش ہوتی ہے۔ اس لئے ہر سہ مقاماتِ مقدسہ کے لئے تین مقدّس ماحول بھی ناگزیر ہوئے۔ مکہ کے ماحول کا وَمَنْ حَوْلَهَا کے کلمہ سے قدس کے کلمہ کا بَارَكْنَا حَوْلَهٗ کے کلمہ سے اور طور کے ماحول کا مَنْ فِی النَّارِ وَ مَنْ حَوْلَهَا کے کلمہ سے تعارف کرایا گیا۔ جن سے ان مقدس مقامات کے تین ماحول بھی ثابت ہوئے۔

تینوں مقامات کے تین ماحول:

مکہ کا ماحول

علمی اور شرعی آیات کی تبلیغ، انذار اور دعوت الی اللہ سے بنا۔ قدس کا ماحول، تکوینی آیات سے بنا۔ طور سیناء کا ماحول، شئونِ الٰہی کی جلوہ افروزی اور خدائی ندا کی برکات سے بنا۔

اِن تینوں ماحول کی جداگانہ برکتیں: (۱) مکہ کے ماحول کو عالمِ امر کی برکتیں دی گئیں، جن کا تعلق منشاء حق اور قانونِ خداوندی سے ہے۔ (۲) قدس کے ماحول کو عالم خلق کی برکتیں دی گئیں جن کا تعلق فعل حق

سے ہے۔(۳) طور سیناء کے ماحول کو آثار وشئونِ حق کی برکتیں ملیں، جن کا تعلق احوال وکوائف کی نوع کا ہوتا ہے۔ ان تینوں ماحول کے لئے تین ماحول قریب اور تین ماحول بعید۔

مکہ کا ماحول قریب

حدودِ حرم کی سرزمین، جو امنِ عام اور عبادت کی سرزمین ہے، میقاتوں کی سرزمین کو بھی ماحول قریب کہا جاسکتا ہے۔

قدس کا ماحول قریب

بیت المقدس سے لے کر ہر چہار جانب بارہ بارہ میل تک ہے جو اس کے اندر مر جائے وہ بمنزلہ اس کے ہے کہ اُسے آسمانِ دنیا میں موت دی گئی ہو۔

طور کا ماحول قریب

وادیٔ طویٰ سے طور سیناء تک ہے، جس کا رقبہ ۲۵ ہزار میل ہے۔

قبول تقدیس کے لحاظ سے یہ تینوں ماحول خطوطِ متوازیہ کے مانند ہیں، یعنی محض تجلّی کی عکس ریزی کی بنیاد پر ان کی تقدیس کو مثلث متساوی کی حیثیت دی جاسکتی ہے۔ مگر تجلّی کے ایک زاویۂ قائمہ کی تقسیم کی بنیاد پر یا نقطۂ فیض کے فیضان کے لحاظ سے مراتب اور نوعیت برکات کا فرق ہے۔

تینوں مقامات مقدسہ کے لئے تین ماحول بعید: (۱) دارالسکینۃ (۲) دارالرحمت (۳) دارالخیر

جغرافیائی حیثیت سے، ماحول بعید، تین ملک ٹھہرتے ہیں۔ مکۃ المکرّمہ، قدس شریف، طور سیناء یعنی حجاز، شام اور مصر۔ جو برکتیں قریبی ماحول کعبہ، اقصیٰ، طور کو ملیں وہی درجہ بدرجہ تینوں ملک حجاز، شام اور مصر کے حصہ میں آئیں۔

حدیث نبوی ہے اَلْاِیْمَانُ وَالسَّکِیْنَۃُ فِیْ اَھْلِ الْحِجَازِ

ایمان اور دلوں کا سکینت ووقار اہلِ حجاز میں ہے، اس سے حجاز کا ماحول بعید ''دارالسکینۃ'' نکلتا ہے۔

اَلْاَرْضَ الْمُقَدَّسَۃَ الَّتِیْ کَتَبَ اللّٰہُ لَکُمْ کا پورا علاقہ جس کے بارے میں فرمایا گیا اِنَّ الرَّحْمٰنَ لَبَاسِطٌ رَحْمَۃً فِی الشام اس لحاظ سے شام کا ماحول بعید (شرعی لقب) دار الرحمۃ نکلتا ہے۔

اِنَّ مِصْرَ سَتُفْتَحُ فَانتجعوا الخ مصر عنقریب فتح ہوگا۔ سو اس کی خیر و برکت کو ڈھونڈتے رہو، فَانْتَجِعُوْا خَیْرَھَا سے مصر کا ماحول بعید (شرعی لقب) دارالخیر نکلتا ہے۔

اِن تینوں مقامات کے لئے تین نقطۂ فیض

کعبۂ معظّمہ، اقصائے مقدسہ، بقعۂ مبارکہ، مکۃ المکرّمہ کا نقطۂ فیض مسجد اقصیٰ، طور سیناء کا نقطۂ فیض محلِ شجرہ ان تینوں مقامات سے نقاط فیض کا جو سیلِ رواں ماحولِ بعید کے توسط سے دور دراز علاقوں تک پہونچا تو خود اس کی بنیاد کیا ہے؟ یعنی یہ مقامات مقدس کیوں ہیں؟ تو اس کی وجہ تینوں میں ایک ہے۔ یعنی ان تینوں مقامات مقدسہ کی تقدیس کی بنیاد ''تجلیات الٰہیہ'' ہیں۔ تجلیات کی نوعیتیں اور مراتب مقامات کے لحاظ سے گو مختلف ہیں مگر ان تینوں میں روح ایک ہے یعنی تجلیات خداوندی اور یہ خود وضعی، طبعی اور فطری لحاظ سے تقدیس و مرکزیت کی مقتضی ہیں۔

ان ہر سہ نقطہائے فیض کی وضع ، وضع خداوندی ہے، حسی، وجودی، تعمیری اور تشکیلی نہیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ سے دریافت فرمایا **اَیُّ مَسْجِدٍ وُضِعَ اَوَّلاً قَالَ الْمَسْجِدِ الحرام الخ قَال ثُمَّ اَیُّ قَال المسجد الاقصیٰ**۔ معلوم ہوا کہ اَوّل بیت سے عمارت کعبہ مراد نہیں، بلکہ وضع بیت اللہ مراد ہے، اسی طرح وضع اقصیٰ سے بھی عمارت نہیں بلکہ بطنی وضع اقصیٰ مراد ہے۔ وضع طور کے سلسلے میں کوئی خبر معصوم یا اثر محفوظ تو نہیں لیکن طور کے دسیوں فضائل و مناقب دیکھ کر وضعِ طور کو بھی وضعِ خداوندی کہنے کی گنجائش ہے۔

اب یہ مقامات مقدسہ مقدس اور مقدس ساز کیسے بنے؟ تو اس کے لئے ایک اصول سامنے رکھئے۔ عالم کی ہر شئے کی موجودگی اولاً باطن میں ہوتی ہے۔ پھر اسی کے مطابق اپنی نوعی شکل پا کر خارج میں اُن کا ظہور ہوتا ہے۔ یہ باطن و ظاہر کے رابطہ کا ایک فطری اصول ہے، جب ان مقامات مقدسہ کی وضع علمِ الٰہی میں وضعِ تقدیس کے ساتھ ہے اور اسی باطنی وضع کے ساتھ ان کا خارجی ظہور اور ان کے مراحل کا تدریجاً ارتقاء ہے تو انہیں مقدس اور مقدس ساز ہی ہونا ہے۔ کیوں کہ جب ان کی وضع مقدس ہے تو ظہور کے بعد ان کی تقدیس کا اثر ضرور پھیلے گا۔

وضع کے معنی

وضع کے معنی تخلیق کے نہیں بلکہ عملی تعیین و تشخیص کے ہیں کہ کسی مقام کو علمی طور پر ذہن میں مشخص کر لیا جائے۔ اس لئے وضع کعبہ سے مراد تعیین مقام اور وہ فضائی جہت ہے جو زمین بننے سے ہزاروں برس پہلے متعین ہو کر بیت اللہ کا لقب پا چکی تھی۔ نہ یہ کہ بعد کے علامتی نشانات کہ وہ صرف نشانِ کعبہ ہیں، کعبہ نہیں۔ پس حقیقی کعبہ وہ صنعی کعبہ ہے جو فضا کی ایک منتخب جہت ہے اور وہی حقیقی کعبہ ہے جو ان علامتی صورت میں چھپا ہوا ہے۔

ظہور کعبہ کی تین صورتیں

(۱) صورت کعبہ برنگ گہرائی آب

سب سے اول اس کا ظہور اس اتھاہ سمندر میں ہوا جس کے اوپر عرش عظیم قائم ہے، آثار صحابہ کی روشنی میں کعبہ بصورت جہت اولاً تو اس پانی میں نمایاں کیا گیا، جس کی موجیں بہ نصِ حدیث نبوی آسمان وزمین کے برابر تھیں، ابن عباسؓ کے ارشاد کے مطابق کعبہ کی جہت مشخص ہوکر اولاً پانی میں ظاہر ہوئی فَاَبْرَزَتْ عَنْ خَسَفَةٍ فِیْ مَوْضِعِ الْبَیْتِ موضع بیت پانی میں ایک گہرے غار کی طرح ظاہر ہوئی۔

(۲) صورت کعبہ برنگ ابھاری آب

پانی کی گہری جگہوں میں پانی شدت سے ٹکراتا ہے، جس کی وجہ سے موجیں اونچی اٹھتی ہیں اور پانی میں ابھار پیدا ہوتا ہے تو موضع بیت اللہ بھی اس اونچائی کی شکل میں نمودار ہوا جو جھاگ کی صورت تھی اور اس اونچائی نے ایک قبّہ کی صورت اختیار کر لی۔

(۳) صورت کعبہ برنگ سمندر جھاگ

حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے هُوَ اَوَّلُ بَیْتٍ ظَهَرَ عَلَی الْمَاءِ عِنْدَ خَلْقِ السَّمَاءِ وَ الْاَرْضِ خَلَقَهٗ قَبْلَ الْاَرْضِ بِاَلْفَیْ عَامٍ وَ کَانَ زَبَدَةً بَیْضَاء فَدُحِیَتِ الْاَرْضُ مِنْ تَحْتِهٖ یہ پہلا (عبادت) کا گھر ہے جو پانی پر ظاہر ہوا، جب کہ زمین وآسمان پیدا ہونے والے تھے، اُسے اللہ نے زمین بنانے سے دو ہزار سال قبل ظاہر فرمایا، وہ پانی پر سفید مکھن کی طرح جھاگ کی صورت سے ظاہر ہوا اور اس کے نیچے سے زمین بنی شروع ہوئی۔

کعبہ کے ظہور کی تین نوعیں:

(۱) کعبہ مقدسہ کا جہتی ظہور

جس کو حق تعالیٰ نے زمین بنانے سے دو ہزار سال قبل ظاہر فرمایا اور یہ مسلمہ ہے کہ جہت نہ بدلتی ہے اور نہ ہی ختم ہوتی ہے، اس لئے کعبہ کا وجود دوامی ہے جو ہمیشہ اپنی اسی جگہ پر قائم رہے گا۔

(۲) کعبہ کا اولین حسی ظہور

جہت کعبہ اولاً پانی پر نمودار ہوئی جو زمین کی اصل واساس بنی۔ چوں کہ اس جہت کو مادی نگاہیں نہ دیکھ

سکتی تھیں نہ پہچان سکتی تھیں تو حق تعالیٰ نے اس جہت کے دائرے میں ملائکہ کے ذریعہ اس کی بنیادیں کھدوائیں جو ساتوں زمین کی تہوں تک کھود کر بھری گئیں، پھر اس پر کسی عمارت کی تعمیر سے پہلے سرخ یاقوت کا ایک خیمہ آسمان سے لا کر تان دیا گیا۔ یہ کعبہ کا اولین حسی ظہور تھا۔

(۳) تعمیری ظہور

پھر انہیں قواعد یا حدودِ اربعہ پر آدم علیہ السلام نے کرسی بنائی جو بعد میں عمارت بیت اللہ کی بنیاد ثابت ہوئی اور اسی پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کی تعمیر فرمائی۔

تعمیر کعبہ کے تین بانی

فضائے بیت اللہ غیر متبدل جہت جو ازلی اور قدیم ہے اور ابد تک رہے گی۔ اس کے اول بانی حق تعالیٰ ہیں۔ (۲) اس کی زمینی کرسی بنانے کے اول بانی آدم علیہ السلام ہیں۔ (۳) اسے عمارت کی صورت دینے کے اول بانی حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔

ظہور اقصیٰ وظہور طور کی وہ صورت نہیں ہوئی جو بیت اللہ کے لئے کی گئی کہ اس کے وضعی یا علمی وجود کا ظہور، وجود کے مختلف تنوعات ومراحل کے ساتھ ہوا۔ مثلاً کعبہ کا حسی وجود، آبی وجود، حجری وجود، سطحی وجود، اساسی وجود، تحدیدی وجود، علامتی وجود، ارضی وجود، پھر تعمیری وجود۔ اس آخری وجود پر جو چوکور عمارت کی شکل میں تعمیر ہوئی اس مرحلہ پر پہونچ کر دنیا والوں نے کعبہ مقدسہ دیکھا۔ اس طرح کی صورت اقصیٰ اور طور کی اس لئے نہ ہوئی کہ وہ دونوں وسط کائنات کا مرکزی نقطہ نہ تھے۔

وسطِ کائنات کا مرکزی نقطہ، کعبہ جو مکہ میں ہے، مکہ جو حجاز کی سرزمین میں ہے یہ جغرافیائی لحاظ سے بھی وسط میں ہے۔ تفصیل کے لئے مقامات مقدس ص ۶۲، ملاحظہ فرمائیں۔

ریاضی کے دائرہ اور مرکز کے اصول میں یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ دائروں میں گردش اور حرکت دَوری اصل ہے اور مرکز میں سکون وقرار اور ثبات وتمکین اصل ہے۔ اگر مرکز اپنی جگہ سے ہٹ جائے تو دائروں کی حرکت یا تو باقی نہ رہے یا ناہموار ہو جائے۔ اس لئے مرکز کا اپنی جگہ پر ثابت وبرقرار اور ساکن رہنا ہی اس کی زندگی ہے اور دائروں کا اس سے وابستہ رہ کر گردش کرتے رہنا ہی اس نظامِ دَوری کی زندگی کا ضامن ہے۔

لہٰذا کعبہ جو مرکز عالم ہے اور جغرافیائی لحاظ سے وسط میں واقع ہے۔ ریاضی کی بدیہیات کے مطابق بھی اس عالمی مرکز کے لئے امن وسکون کا گہوارہ ہونا ہی فطری امر ہے کیوں کہ وسط میں سکون ہوتا ہے۔ اس طرح تکوینی، شرعی، جغرافیائی لحاظ سے کعبہ اول کائنات، وسط کائنات، اصل کائنات، مرجع کائنات، مفیض کائنات اور امن کائنات ہے۔ گویا کعبہ کا وجود امن کائنات کے لئے ہے جو اسلام کا بنیادی مقصد ہے۔

بندوں کے لئے اسلام کے تین مقاصد

(۱) عالمی عبادت (۲) عالمی سیاست (۲) عالمی مدافعت۔ ان تینوں سے انسان کی صلاح وفلاح اور سعادتِ دارین وابستہ ہے۔ ان تینوں کو تین مقامات مقدسہ مکہ، قدس، طور سے متعلق کیا گیا۔

مکہ کو اصلِ عالم، مرکزِ عالم، وسط عالم بنایا گیا **یَااَھْلَ مکّة انکم فِي وَسط مِنَ الاَرض بِحِذاء وسط السَّماءِ** (۱)

مكة ام للقرىٰ و مرو ام خراسان۔(۲)

قرآن کا ارشاد **لِتُنْذِرَ امّ الْقُرٰی** تا کہ آپ ڈرائیں اُمّ القریٰ (مکہ) کو اوراس کے ماحول کو، ماحول میں ماحول قریب اور ماحول بعید دونوں شامل ہیں۔ ماحول بعید پورا ملک حجاز نکلتا ہے جو دار السکینۃ والا یمان ہے۔ قدس کا ماحول بعید ارض مقدسہ شام وفلسطین ہے۔ طور کا ماحول بعید مصر تک کا علاقہ ہے۔ ان مرکزی مقامات کی تینوں قوتوں کو باہم ایک دوسرے کے قریب ہونا چاہئے جب کہ بظاہر ایسا نہیں ہے۔ مکہ سے قدس کا فاصلہ ۸۰۰ میل۔ قدس سے طور کا مزید فاصلہ ۴۲۵ میل۔ اس طرح سے مکہ سے طور کا فاصلہ بارہ سو میل ہے لیکن جغرافیائی اصول سے یہ تینوں مقامات قرب میں ہیں۔ دنیا میں آباد حصۂ زمین کو ایک کروڑ نوے لاکھ مربع میل بتایا گیا ہے۔ پیدل ایک انسان ۱۲ گھنٹے میں طبعی رفتار ۳۶ میل طے کرسکتا ہے۔ اس رفتار سے زمین کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پہونچنے میں ۲۹ برس لگیں گے اور مکہ مکرمہ جو وسط عالم مرکز عالم ہے وہاں سے قدس تک پہونچنے میں ساڑھے ۲۲ دن لگیں گے۔ اس طرح جغرافیائی اصول کے مطابق سوچیں تو ۲۹ برس کے مقابلہ میں ساڑھے ۲۲ دن کو قرب ہی شمار کیا جائے گا۔

مکۃ المکرّمہ جب مرکز عالم، مرکز عبادت اور مرکز امن وسلامتی ہے تو پھر ضروری تھا کہ یہاں بدامنی، قتل وقتال اور جنگ وجدال وغیرہ ممنوع کردیے جائیں تا کہ اس کی تینوں طرح کی مرکزیت، مرکز عالمیت، مرکز عبادت اور مرکز امنیت کبھی فتنۂ وفساد سے دوچار نہ ہو اور اس کی تقدیسی عظمت پر کبھی کوئی حرف نہ آنے پائے۔

اس لئے اس مرکز کی سلامتی اور امن کے لئے قدرتی اور غیبی سامان بھی فرمائے گئے، مذہبی تعصّبات سے بدامنی کے سدباب کا ظاہری انتظام یہ کیا گیا کہ تینوں قومیں (مشرکین اور یہود ونصاریٰ) جو حجاز مقدس کے امن کو زیروزبر کرسکتی تھیں ان کے لئے اپنے نبی کی زبان سے اس طرح اعلان کرایا گیا **لاَیَجْتَمِعَانِ دِیْنَانِ فِيْ جزِیْرَةِالْعَرَب** (۳)

دو دین جزیرۃ العرب میں جمع نہیں ہوسکتے۔ اسی طرح آپ نے یہ بھی فرمایا کہ **اِنَّ الشَّیْطَانَ قَدْ**

اَئِسَ اَنْ یَّعْبُدَہُ الْمُصَلُّوْنَ فِیْ جَزِیْرَۃِ الْعَرَب وَلٰکن فِی التَّحریش بَیْنَہُمْ الخ(۴)

بلا شبہ اب شیطان اس سے مایوس ہو چکا کہ جزیرۃ العرب میں مسلمان اس کی پوجا کریں اور بت پرستی کی نجاست سے آلودہ ہوں اِلَّا یہ کہ کبھی کبھار آپس میں کچھ باہمی چھیڑ چھاڑ ہو جائے۔

اس لئے حجاز کو پہلے شرک و مشرکین سے پاک کیا گیا۔ پھر اس کے بعد یہود و نصاریٰ جو ہمہ گیر بدامنی اور شر انگیزی کی علامت تھے، ان کے فتنے سے تحفظ کے لئے حدیث عمرؓ میں لسان نبوت سے یہ واضح اعلان موجود ہے لَاُخْرِجَنَّ الْیَھُوْدَ وَالنَّصَاریٰ مِنْ جَزِیْرَۃِ الْعَرَبِ حَتّٰی لَا ادعَ فِیھا اِلَّا فیھا مسلمًا وفی روایۃٍ ’’لَئِنْ عِشْتُ اِنْشَاءَ اللّٰہ لَاُخْرِجَنَّ الخ ضرور نکالے جائیں گے یہود و نصاریٰ جزیرۂ عرب سے تا آں کہ یہاں مسلمانوں کے سوا کوئی دوسری قوم باقی نہ رہے اور ایک روایت میں ہے کہ میں اگر زندہ رہا تو جزیرۂ عرب سے انشاءاللہ اُن کو ضرور نکال کر رہوں گا۔‘‘

یہ فرمان اس لئے جاری کرایا گیا تا کہ تعصّباتی لڑائیوں سے اس مرکز امن کا امن خطرہ میں نہ پڑے۔ اس کے علاوہ بھی غیبی طاقتوں سے جس کو حزب اللہ بھی کہہ سکتے ہیں حرم کی حفاظت کے انتظام فرمائے گئے۔

مرکز امن و عبادت کی حفاظت کے ظاہری انتظام کے بعد اسلام کے اجتماعی نظام اور ہمہ گیر دین کی حفاظت کے لئے ضروری تھا کہ ہمہ گیر نظامِ سیاست بھی قائم ہو، تا کہ مادی قوت و طاقت، جنگ و جہاد اور سطوت و شوکتِ دین کی رعب انگیزی ہو۔ اس محکم عمل کا مرکز شام کو بنایا گیا۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے شام کو خطاب کر کے فرمایا یاشام انت سَیْف نقمَتِی وَ سَوْطَ عَذَابِیْ اَنْت الاَنْدَرُ وَاِلَیْکَ الْمَحْشَرُ (۵)

اے شام! تو میرے غصہ کی تلوار ہے، تو میرے عذاب کا کوڑا ہے، تو ہی سب سے بڑا دفاعی محاذ ہے اور تیری ہی طرف محشر اور اجتماعِ کُل ہوگا۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا اَھْلُ الشام سَوْط اللّٰہِ فِی الْاَرْضِ ینتقِم بِہٖ مِمَّنْ یَّشَاءُ مِنْ عِبَادِہٖ وَ حَرَام عَلیٰ مُنَافِقِیْھِمْ اَنْ یَّظْھَرُوْا عَلٰی مومنیھِمْ الخ (۶)

اہل شام اللہ کا کوڑا ہیں، جن کے ذریعہ اللہ جس سے چاہے انتقام لے گا اور شام کے منافقوں پر حرام ہے کہ وہ اس کے مخلصین پر غالب آئیں۔

اس کے علاوہ شام اور اہل شام کے بارے میں بہت سی روایتیں مقامات مقدسہ میں مذکور ہیں، من شاء فلیطالع، اس کے علاوہ مرکز امن و سلامتی مکہ اور مرکز قوت و سیاست مرکز شام، ان دونوں مرکزوں کی حفاظت کے لئے ناگزیر تھا کہ عالمی دفاعی نظام بھی قائم اور مستحکم ہو۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے مصر کو اسلامی عسکریت کی چھاؤنی اور لشکر گاہ بنایا گیا، تا کہ وہ اسلامی سرحدوں کے لئے محافظ بھی ہو اور رباط اسلام بھی۔

چنانچہ حدیث پاک سے مصر کی اس خاص مرکزیت پر روشنی پڑتی ہے کہ وہ رُباط اسلام اور سرحدوں کا محافظ ہے۔ عَنْ عُمر بن الخطابؓ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يقولُ اِذَا فَتَحَ اللّٰهُ عَليكم مِصْرًا فَاتَّخِذُوْا فِيْهَا جُنْدًا كَثِيْرًا فذالك الْجُنْدُ خَيْرُ اَجْنَاد الْاَرْضِ فقَالَ لَهٗ اَبُوْبَكرؓ وَلِمَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ لِاَنَّهُمْ وَ اَزْوَاجَهُمْ فِيْ رِبَاطٍ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ (۷)

عمر بن خطابؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، فرماتے تھے کہ جب اللہ تعالیٰ تم پر مصر کو فتح فرمائے تو اس میں بھاری لشکر رکھنا۔ یہ لشکر روئے زمین کے تمام لشکروں سے زیادہ باخبر اور بہتر ہوگا۔ ابو بکرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ اس کی وجہ کیا ہے؟ فرمایا اس لئے کہ مصر والے اور ان کی عورتیں قیامت تک سرحدِ اسلام پر رہیں گی۔ اس لئے ہر وقت انہیں دشمنانِ اسلام کا سامنا رہنے کی وجہ سے سرحد کی حفاظت میں سرگرم و مستعد رہنا پڑے گا۔

حدیث نبوی میں مسلمانوں بلکہ عربوں کو زور دے کر توجہ دلائی گئی کہ وہ کسی وقت بھی مصر کو اپنی غیر معمولی عسکری قوت سے خالی نہ چھوڑیں بلکہ فوجی حیثیت سے اس ملک کو خوب مضبوط رکھیں، ورنہ پورا عالم اسلام خطرہ میں پڑ جائے گا۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ مصر یورپ کے لئے ایشیا کا دہانہ اور ایشیا کے لئے یورپ کا دروازہ ہے اور جب اس دروازہ پر مضبوط عسکری قوت نہ ہوگی تو پورا عالم عرب خطرہ میں پڑ جائے گا۔ چنانچہ جب سے مصر اسلامی شوکت سے الگ ہوا، اغیار مطمئن ہوگئے اور اب پورا ایشیا اُن کا ہے۔ یہ صورت آج مشاہد اور سب کے سامنے ہے۔

یہ اس بات کا نتیجہ ہے کہ ہم نے ان مقامات مقدسہ کو منشاء نبوت کے مطابق نہ سمجھنے کی کوشش کی اور نہ ہی اپنے دینی مرکز سے رشتہ استوار رکھا۔ جب تک ہمارے پیش نظر یہ حقیقتیں رہیں کہ حجاز مَعْقَل الدّین، دین کا ٹھکانہ ہے اور شام عُقْرُ دار الاسلام، دارالاسلام کی عمدہ جگہ (اور جنگی مراکز) ہے اور مصر رِباط الاسلام، اسلامی سرحد ہے اور انہی وجوہات کی بنیاد پر حجاز قبلۂ امن کا محل ہونے کی وجہ سے مرکز دین وعبادت بنا۔ شام دار جنگ ہونے کی وجہ سے مرکز حفظ و عسکریت قرار پایا۔

مقامات مقدسہ کی شرعی حیثیت، اہمیت اور فضیلت کا اظہار زبان فیض سے جس طرح ہوا صحابہؓ نے اس کی روح اور منشاء کو سمجھ کر اس پر عمل فرمایا اور جب تک اس رہنما خطوط پر عمل ہوتا رہا، اسلامی شوکت اور قوت و سطوط سب کچھ ہمارے پاس رہی۔ ع

گنوادی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی

تو اس کی بدولت آج صرف عالمِ اسلام ہی نہیں بلکہ پوری دنیا فتنہ وفساد کی آماجگاہ بن چکی ہے۔

مقامات مقدسہ کی اہمیت وفضیلت، ان کے کوائف وحالات اور شرعی، سیاسی اور جغرافیائی حیثیت پر بسط وتفصیل کے ساتھ حکیم الاسلامؒ کی حکیمانہ گفتگو کا مقصد۔ مسلمانوں اور ہر سہ مقدس ممالک کے باشندوں، عرب قوموں، بالخصوص عرب سربراہوں کو اس بات کا احساس دلانا ہے کہ آپ اپنی اور اپنے خطے کی غیر معمولی اہمیت کو سمجھیں اور عرب قوم ہونے کی حیثیت سے اپنے اس فریضہ کو بھی جانیں کہ ان مقدس ممالک کی تقدیسی حفاظت وصیانت کا اولین شرعی فریضہ آپ پر عائد ہوتا ہے پھر دنیا کے مسلمانوں پر۔

اس حقیقت کو ذہن میں رکھئے کہ دنیا کے مسلمانوں کا عالمی اتحاد ان ہی تین مراکز سے وابستہ ہے اور انہی تین مقامات سے دنیائے اسلام میں عالمی وحدت اور آفاقی اتحاد کی صحیح اسپرٹ دوڑائی جاسکتی ہے۔ اگر عرب ان مقدس مرکزوں کو جغرافیائی وطن کی حیثیت سے دیکھتے رہے تو وہ نہ ان مقامات کی تقدیس کا حق ادا کرسکیں گے اور نہ ہی ملی انتشار کا مداوا کرسکیں گے۔ اس لئے عرب بھائیوں کی خدمت میں اخوت کی بنیاد پر میں نے یہ شکایت بصد نیاز مندی پیش کردی ہے کہ وہ جغرافیائی، وطنی، معاشرتی، لسانی، سیاسی حد بندیوں کو توڑ کر باہر آئیں اور تینوں مراکز حجاز وشام اور مصر کی مرکزیت کو سمجھیں اور مغربی شاطروں کے دجل وفریب اور ان کی چال بازیوں اور گیدڑ بھبکیوں کو پہچانیں اور آزادیٔ رائے اور اصلاحِ قومیت کے ڈھنگ اور ڈھونگ کی حقیقت کو سامنے رکھیں۔ ورنہ خود ان کی زندگی لاعلاج خطروں میں گھر جائے گی اور پہلے سے کہیں زیادہ بھیانک صورت حال سامنے آسکتی ہے جو عالم عرب اور پوری ملت اسلامیہ کے لئے ناقابل تلافی نقصان کا باعث بھی بن سکتا ہے۔ اللہ ہر طرح سے حفاظت فرمائے۔

اس تناظر میں مقامات مقدسہ صرف ایک کتاب ہی نہیں بلکہ پوری امت مسلمہ کے لئے خصوصاً عرب اقوام اور سربراہوں کے لئے فکری دعوت اور عظیم پیغام ہے۔

............❖............

(۱) شیخ ہندیؒ، کنز العمال، ج۶،ص:۴۴۲

(۲) ایضاً، ج۶،ص:۲۳۹

(۳) ایضاً، ج۶ص:۲۶۵

(۴) خطیب التبریزیؒ، مشکوۃ شریف، ص:۱۹

(۵) شیخ ہندیؒ، کنز العمال، ج۷،ص:۱۵۹

(۶) ایضاً، ج۶،ص:۲۵۷

(۷) ایضاً، ج۷،ص:۱۶۳

............❖............

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ

مولانا خورشید انور صاحب
جامعہ مظہر العلوم، بنارس

ہر دور کا اپنا ایک مزاج ہوتا ہے، جس سے اس دور کا تقریباً ہر فرد کم وبیش ضرور متاثر ہوتا ہے، انسان کے افکار، نظریات پر اس کی گہری چھاپ ہوتی ہے اور شعوری یا غیر شعوری طور پر اس کے احساسات کی دنیا اپنے گرد وپیش کی فضا کے زیر اثر آباد ہوتی ہے، اس لئے اس دور کو مخاطب بنانے، اپنی جانب متوجہ کرنے اور اس کے افکار وخیالات پر اثر انداز ہونے کے لئے اس مزاج کا بھر پور لحاظ کرنا ازبس ضروری ہوتا ہے، اس کے بغیر اس دور کے ذہن وفکر کے رخ کا موڑنا اور اسے صحیح سمت عطا کرنا محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ ''اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ'' کی تشریح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''اگر بنی آدم کے مزاجوں اور ذہنیتوں کی رعایت ملحوظ خاطر نہ ہوتی تو صرف احکام الٰہی کا پہنچا دیا جانا کافی سمجھا جاتا، استدلال کی راہ اختیار کرنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی، چہ جائے کہ استدلال کی انواع واقسام پر روشنی ڈالی جاتی، پس جب کہ انسانوں کے داعی اول حق جل مجدہٗ نے اپنے مخاطبوں کی رعایت فرمائی تو اس آیت کا منشاء صاف واضح ہوا کہ تمام مدعیان دین کا فرض ہے کہ وہ رعایت طبائع کے ماتحت مخاطب کی ذہنیتوں کا اندازہ کر کے تبلیغ کا آغاز کریں ورنہ بلا رعایت طبائع ان کی دعوت وتبلیغ مؤثر نہیں ہوگی۔''(۱)

یہی وجہ ہے کہ جب حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنے ماحول کا جائزہ لیا اور دیکھا کہ آج لوگوں میں عقلیت کا رجحان بہت تیزی سے بڑھ رہا ہے اور عمومی طور پر ہر شخص نقل وعقل کے آئینے میں دیکھنے کے خواہاں ہے تو انہیں اس سیلاب بلاخیز کے سد باب کی فکر دامن گیر ہوئی اور ضروری سمجھا گیا کہ

لوگوں کے سامنے شریعت مطہرہ کے اسرار و حکم واضح ہوجائیں اور ایسے قواعد مرتب کئے جائیں جس سے اس طرح کے ذہن و مزاج کا بروقت علاج ممکن ہو سکے اور تعقل پسند طبیعتوں کو مطمئن کیا جاسکے، چنانچہ حضرت شاہ صاحبؒ اپنی شہرہ آفاق کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں تحریر فرماتے ہیں:

لاسبیل ای دفع هذه المفسدة ای بأن تبین المصالح و تؤسس لها القواعد كما فعل نحو من ذلك فی مخاصمات الیهود والنصاریٰ والدهرية و أمثالهم(۲)

اس مفسدہ کے دفعیہ کی بس ایک صورت ہے کہ مصالح شریعت بتائی جائیں اور ان کے لئے قواعد وضع کئے جائیں جیسا کہ یہود و نصاریٰ اور دہریہ وغیرہ کے مقابلہ میں ایسا کیا جاتا ہے۔

حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ کے الفاظ میں اس امر کی تفصیل کچھ اس طرح ہے، لکھتے ہیں:

''حضرت شاہ صاحبؒ نے بالہام خداوندی بھانپ لیا تھا کہ اب دین کو محض نقل و روایت سے عقیدت مندانہ سمجھنے کا زمانہ نہیں رہا، عقلی مطالبوں اور حجت طلبیوں کا دور شروع ہوگیا ہے، حقیقت شناسی، حق طلبی اور اعتقادی روایات پر ایمانی پختگی سست پڑگئی ہے اور عقل پرستی غالب آتی جارہی ہے، تا آں کہ لوگ مغیبات کو عقل کی ترازو میں تولنے کی فکر میں لگ گئے ہیں، اس لئے جب تک منقول دین کو معقول لباس پہنا کر پیش نہیں کیا جائے گا، اس وقت تک اس دور کی عقل پرست طبیعتیں مطمئن نہ ہوں گی اور اسے اِنْ هٰذَا اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ کہہ کرنا قابل التفات ٹھہرادیں گی اور دین سے محروم ہوجائیں گی، اس لئے شاہ صاحب نے بالہام خداوندی اس جامع منقول و معقول مکتب فکر کے ذریعے دین پہنچانے کا فیصلہ فرمایا تاکہ پورا دین جیسے نقل و روایت کے لحاظ سے کامل ہے اسی طرح عقل و روایت کی رو سے بھی کامل ہی نمایاں ہو اور کسی بھی عقل پرست یا درایت درست انسان کے لئے نا قابل التفات نہ ہونے پائے اس لئے یہ نادر روزگار کتاب حجۃ اللہ البالغہ خاص اس موضوع پر تصنیف فرمائی۔''(۳)

اس کے بعد جب حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کا زمانہ آیا تو اس وقت معیار غور و فکر میں تبدیلی آچکی تھی اور تعقل پسند طبیعتیں مسائل کے سمجھنے میں صرف عقلی دلائل پر اکتفا نہ کریں بلکہ مشاہدات و حسیات کی روشنی میں کسی بھی مسئلے کے سمجھنے کا مزاج پیدا ہو چلا تھا، اس صورت حال کے پیش نظر حضرت نانوتویؒ نے اسلامی افکار و نظریات کو پیش کرنے کے لئے عقلی دلائل کے ساتھ مشاہداتی اسلوب اختیار کیا، جس سے عقل و خرد کے پرستاروں کو خاموش کرنے، مطمئن کرنے اور حقیقت مسئلہ سے روشناس کرانے میں بھرپور مدد ملی۔ حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:

''حکمت قاسمیہ کے تمام اجزاء نے (جو حضرت والا کی تصانیف میں موتیوں کی طرح بکھرے ہوئے ہیں) جہاں اسلامی حقائق پر گہری ملّیاتی اور خالص عقلی دلائل کی روشنی ڈالی وہیں پورے زور اور قوت کے ساتھ ان حقائق کو آج کے محسوسات اور دور حاضر کے حسی شواہد و نظائر سے بھی مدلل کر کے اس طرح پیش کیا کہ اسلام کے غیبی امور، شریعت کے بنیادی مقاصد اور دین فطرت کے مبانی و اصول اس حسیاتی رنگ استدلال سے بالکل طبعی اور محسوس و مشاہد نظر آنے لگے۔(۴)

حضرت حکیم الاسلامؒ نے ایک دوسری جگہ اس بات کی مزید وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے:

''اس ولی اللّٰہی خاندان کی پانچویں علمی پشت میں ایک فرد اٹھا جس نے اس مذکورہ نہج پر دین و مذہب، دینی عقائد اور دینی اصول و کلیات کو اسی الہام ربانی کی تحریک سے ابتداءً ہی قرآن وحدیث یا مذہب وملت کا نام لئے بغیر حقائق قرآن وحدیث کو ایسے استدلالی اور منطقی طرز بیان سے زمانہ کے سامنے پیش کیا، جیسے وہ اس زمانہ کے حسب حال ایک مضبوط اور مستحکم ازم پیش کر رہا ہے۔جس کا ظاہری عنوان ابتداءً نہ اعلانِ مذہب سے نہ اطلاع غیب مگر انتہاءً وہی مذہب اور عقیدۂ غیب ہے، مگر اس ڈھنگ سے کہ جیسے وہ خالص ایک فلسفیانہ ازم کی تلقین ہے کہ اس کے مانے بغیر نہ اس دور کی معاشرت صحیح اسلوب سے چل سکتی ہے نہ سیاست و مدنیت اور نہ ہی مابعد الموت کی زندگی استوار اور کامیاب ہوسکتی ہے، اس لئے اس نے ایک حسیاتی فلسفہ وحکمت کی بنیاد ڈالی ہم اسی شخصیت کو حضرت قاسم العلوم مولانا محمد قاسم نانوتوی صاحبؒ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔(۵)

حضرت نانوتویؒ کے بعد آپ کے تلامذہ نے اس حکمت قاسمی کو فروغ بخشا، بالخصوص شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ نے حضرت نانوتویؒ کی مشکل ترین کتابوں کو خود انہی سے سبقاً سبقاً پڑھ کر خوب سمجھا اور ان علوم و معارف کو اپنے تلامذہ تک منتقل کیا، پھر آپ کے مخصوص تلامذہ حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ، حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ، حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ اور حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے اس حکمت قاسمی کو تحریر و تقریر، درس و تصنیف کے ذریعہ عام کیا، حضرت مولانا سندھیؒ نے تو حکمت ولی اللّٰہی اور حکمت قاسمی کو اپنا موضع زندگی ٹھہرالیا تھا، ان کا نظریہ یہ تھا کہ شاہ ولی اللہؒ کی کتابوں کا کماحقہٗ فہم و شعور تصانیف قاسمیہ کے مطالعہ کے بغیر میسر ہی نہیں آسکتا۔(۶)

حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کو علم ومعرفت اور حکمت قاسمی کے انہیں سرچشموں سے فیضیاب ہونے کا سنہرا موقع ملا، جن سے انہوں نے خوب خوب اپنی علمی پیاس بجھائی اور شریعت کے اسرار و رموز سیکھے، بطور

خاص اپنے والد محترم حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ سے بھرپور استفادہ کیا، حضرت حکیم الاسلامؒ نے خود ایک جگہ اس کی وضاحت فرمائی ہے:

''راقم الحروف کو جو تھوڑی بہت مناسبت حکمت قاسمیہ سے پیدا ہوئی وہ انہیں کے درس کا طفیل ہے جب کہ مشکوٰۃ شریف و مسلم شریف احقر نے انہی سے پڑھی ہیں اور ان میں حضرت مرحوم آیات و حدیث کے مضامین کے اثبات میں اسی حکمت کے اجزاء سے کام لیتے تھے جس کا اثر شرح صدر کی صورت سے سینوں پر پڑتا ہے۔(۷)

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کو اسرار وشریعت کے موضوع سے فطری مناسبت تھی اس لئے انہوں نے اس فن میں مزید استحکام کے لئے حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ سے بطور خاص حجۃ اللہ البالغہ پڑھی اور ان سے حکمت ولی اللہی اور حکمت قاسمی کے رموز ونکات کو بہت ہی اہتمام سے سمجھا۔

حضرت حکیم الاسلامؒ رقم طراز ہیں:

''مولانا ممدوح نے احقر کی اس عرض داشت پر دارالعلوم میں اس نا کارہ کو حجۃ اللہ البالغہ پڑھانی شروع کی اور مختلف اوقات میں احقر کے سوالات پر حکمت قاسمی اور حکمت ولی اللہی کے اصول وحقائق تشریح کے ساتھ نقل فرماتے۔''(۸)

مذکورہ تفصیل سے اس ماحول پر بخوبی روشنی پڑتی ہے جس میں حضرت حکیم الاسلامؒ کی علمی نشو ونما ہوئی اور اس کے زیر اثر آپ کے اندر ایسا ذوق پیدا ہوا کہ اسرار شریعت سے واقفیت کی راہیں ہموار ہوتی چلی گئیں اور رفتہ رفتہ یہی چیز آپ کی طبیعت ثانیہ بن گئی۔ جس کے اثرات آپ کی تصانیف ومقالات اور خطبات و مجالس میں پورے طور پر نمایاں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے جس موضوع پر بھی زبان کھولی یا قلم اٹھایا، اس کے تمام گوشوں پر بھرپور روشنی ڈالی اور اس کے اسرار وحکم کو اس موثر اور دلچسپ انداز سے بیان فرمایا کہ بالغ نظر قارئین وسامعین اس سے محظوظ ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کی کتابوں سے چند اقتباسات ہدیہ ناظرین ہیں جن سے مذکورہ بالا باتوں کا ثبوت فراہم ہوتا ہے، مثلاً نماز کے اسرار وحکم واضح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''سب سے پہلے نماز نے جو اسوہ پیش کیا ہے وہ ہے کہ فرض نماز گھر میں ادا نہ کی جائیں بلکہ مساجد میں حاضر ہو کر یعنی ادائیگی نماز کے لئے سب سے پہلی چیز گھروں کی چہار دیواری سے باہر ہو جانا ہے، گویا نماز نے سب سے پہلے خانگی خلوت توڑ کر ایک انسان کو میدان میں نکالا اور جلوتوں کے ہجوموں میں دیکھنا

چاہا، جس کا راز یہ ہے کہ گھر کی چہار دیواری میں محدود رہ کر انسان کی نگاہ اس کا تخیل، اس کی سعی اور اس کا علم سب محدود اور تنگ رہتے ہیں، ان کی نگاہ گھر میں رہ کر خانگی امور تک محدود رہ سکتی ہے، اسے تمام شہر یا قوم سے کوئی واسطہ نہیں ہوسکتا اس لئے نماز نے گھروں سے مساجد کی طرف سفر کرایا تا کہ انسان کے باطن وظاہر میں وسعتیں نمایاں ہوں اور کوئی ایک مسلم بھی تنگ دل، تنگ ظرف اور تنگ حوصلہ باقی نہ رہے کہ جس کے سامنے صرف اس کا نفس اور اس کا گھر ہو بلکہ اس کے ظرف میں گھر سے باہر نکل کر مسلمانوں کے پورے جتھوں اور جمگھٹوں کی گنجائش ہو۔'' (۹)

اسی طرح اوقات نماز کی تعیین کے فوائد پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''نماز وقت کی عبادت ہے جس کے لئے زمانہ بھی متعین ہے اور مکان بھی یعنی مسجد جب ایک شخص کے مہم اوقات جو درحقیقت رات دن میں صرف اوقات نماز ہی ہیں جیسا کہ واضح ہو چکا ہے، نماز میں مصروف ہوگئے تو علاوہ اس کے کہ اسے پابندی اوقات کی عادت پڑے گی قدرتی طور پر نمازوں کے درمیانی اوقات کے کام بھی خود بخود متعین اور منضبط ہو جائیں گے اور ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ یہ درمیانی کام نیکیوں ہی کے متعین ہوں گے، بدیوں کے نہیں کیوں کہ دو نمازیں نمازی کے قلب کو اس درمیانی فاصلہ کے لئے اتنا منور اور متاثر کر دیتی ہیں کہ اس کی اندرونی رہنمائی عموماً نیک ہی کام کر سکتی ہے، اس سے واضح ہوا کہ توقیت نماز سے عین نمازوں ہی کے اوقات نہیں بلکہ نمازوں کے درمیانی اوقات میں بھی انضباط پیدا ہو جانا ضروری ہے۔'' (۱۰)

حضرت حکیم الاسلامؒ نے ایک جگہ معجزہ پر سیر حاصل بحث کرتے ہوئے اس سے متعلق اعتراضات کا آج کی نو بہ نو ایجادات اور اکتشافات کی روشنی میں کافی وشافی جواب دیا ہے، اس ضمن میں منکرین معراج کو لاجواب کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

'' آج کم سے کم معراج سے انکار کرنے کا کوئی حق باقی نہیں رہا، کیوں کہ چاند میں جانے کا جب ارادہ کرلیا تو پہنچنا نہ پہنچنا تو بعد کی بات ہے صرف ارادہ کرنے ہی سے امکان تو ثابت ہو گیا، وقوع جب بھی ہو وہ ہوتا رہے گا تو کل تک جو لوگ معراج کے سفر کو ناممکن کہتے تھے کم سے کم ان کے منہ پر مہر لگ گئی اور وہ اب نہیں بول سکتے۔ اس واسطے کہ وہ امکان کے قائل ہو گئے کیوں کہ سب سے بڑی چیز تو امکان ہی ہے واقعہ ہونا تو امکان کے آثار میں ہے وہ جب بھی ہو جائے۔'' (۱۱)

اس سلسلے کا ایک اور اقتباس بھی ملاحظہ فرمائیں اور حضرت حکیم الاسلامؒ کی نکتہ سنجیوں سے محظوظ ہوں، تحریر فرماتے ہیں:

''اگر آپ کہتے تھے کہ نبی اکرم ﷺ کے معراج پر جانے کے وقت اللہ تعالیٰ نے شق صدر فرمایا یعنی سینہ کھول کر آپ کے قلب مبارک کو چاک کیا گیا اور اس میں حکمت و ایمان زیادہ سے زیادہ بھر دیا گیا، جتنا پہلے تھا اس سے بھی زیادہ اور پھر فرشتے نے برابر کر دیا، تو لوگ ہنستے تھے کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے، دل کے اوپر زندگی کا مدار ہے، جب دل کھل گیا تو آدمی زندہ لاش نہیں رہ سکتا، لیکن آج کی ایجادات میں ایسے ایسے نازک آپریشن ہوتے ہیں کہ دل کو کھول کر اس میں کچھ بھر دیتے ہیں اور پھر سی دیتے ہیں لیکن انسان زندہ رہتا ہے، اس کی حرکت کو مشینوں کے ذریعہ قائم رکھ کر آپریشن کر دیا جاتا ہے تو جب مادی اسباب سے قلب کو شق کرنا ممکن ہے تو روحانی قوتیں مادی قوتوں سے زیادہ ہیں۔ (۱۲)

حضرت حکیم الاسلامؒ کی مجالس کا رنگ بھی خالص حکیمانہ ہوا کرتا تھا، ایک مجلس میں عصمت انبیاء اور عصمت اطفال کے درمیان فرق واضح کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

''بچوں میں جو معصومیت ہے وہ اس لئے ہے کہ ان میں گناہ کرنے کی قوت بیدار نہیں ہوتی، صرف مادہ موجود ہوتا ہے اور انبیاء میں وہ ساری قوتیں موجود ہیں پھر بھی وہ معصوم ہیں، ارادے، اختیار سے تو عصمت دونوں میں موجود ہے، مگر فرق اتنا ہے کہ انبیاء اختیاری معصوم ہیں اور بچوں میں غیر اختیاری عصمت ہے۔ یہ علم کے ساتھ معصوم اور بچے لاعلمی کے ساتھ معصوم، ایک کی عصمت کمال میں داخل ہے، ایک کمال میں داخل نہیں، اگر دو برس کا بچہ گناہ نہ کرے تو اسے کامل نہیں کہتے، اس لئے کہ نہ اس میں ارادہ ہے اور نہ قوت ہے۔ لہٰذا اس کے معصوم ہونے کے معنی یہ ہیں کہ خدا نے اسے مجبوراً گناہ کرنے سے روک دیا ہے، وہ طاقت اس میں خدا نے ابھاری نہیں اس لئے وہ بے چارا اپنے ارادہ سے کچھ نہیں کرسکتا اور انبیاء میں ساری قوتیں موجود ہیں اور پھر بھی بچتے ہیں، یہ ہے کمال اور اصول بھی یہی ہے کہ رکاوٹیں اور مواقع بہت ہوں اور پھر نیکی کرے تو وہ زیادہ قابل قدر ہے اور ایک یہ ہے کہ کوئی رکاوٹ موجود نہیں ہے اور نیکی کرنے کے لئے دواعی ہی دواعی موجود ہیں تو ہے تو وہ بھی نیکی ہی مگر زیادہ عجیب و غریب نہیں زیادہ قابل قدر نہیں۔'' (۱۳)

حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کی یہ اور اس طرح کی جملہ تحریروں کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ

آپ کے ذہن ومزاج میں حکمت قاسمی پورے طور پر رچی بسی تھی، جو زبان وقلم سے حسب موقع بلا تکلف ظاہر ہوا کرتی اوراس جامعیت اور باریک بینی کے ساتھ کہ کوئی پہلو تشنہ نہ رہنے پاتا، غرض کہ حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ حکمت قاسمی کے وارث وامین تھے، جنہوں نے تاحیات اس کی تشریح و ترجمانی اوراس کی روشنی کو عام کیا۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ

............❖............

(۱) حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ، اصول دعوت اسلام، ص:۴۶

(۲) حضرت شاہ ولی اللہؒ، حجۃ اللہ البالغہ، ص:۷

(۳) سید محبوب رضوی، تاریخ دارالعلوم دیوبند، ج۱، ص:۱۴

(۴) حضرت مولانا محمد طیب قاسیؒ، حکمت قاسمیہ، ص:۱۸

(۵) تاریخ دارالعلوم دیوبند، سید محبوب رضوی، تاریخ دارالعلوم دیوبند، ج۱، ص:۱۰۷

(۶) حضرت مولانا محمد طیب قاسیؒ، حکمت قاسمیہ، ص:۳۱

(۷) ایضاً

(۸) ایضاً، ص:۳۲

(۹) حضرت مولانا محمد طیب قاسیؒ، فلسفۂ نماز، ص:۴۷

(۱۰) ایضاً، ص:۱۱۸

(۱۱) حضرت مولانا محمد طیب قاسیؒ، معجزہ کیا ہے؟ ص:۴۵

(۱۲) حضرت مولانا محمد طیب قاسیؒ، معجزہ کیا ہے؟ ص:۸۲

(۱۳) مولانا حبیب اللہ قاسمی، مجالس حکیم الاسلام، ص:۵۴۸

............❖............

حضرت حکیم الاسلامؒ

ایک عہد آفریں شخصیت

مولانا غلام قادر صاحب
جامعہ ضیاء العلوم، پونچھ، کشمیر

حضرات گرامی قدر! حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب قدس سرہٗ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند ان رجال علم، اصحاب فضل اور ارباب کمال اکابر میں سے تھے جو برصغیر کی اسلامی تاریخ کا ایک روشن وتابناک باب کہلاتے ہیں جن کے مبارک تذکروں سے آج بھی ایمان کو تازگی اور روح کو سکون میسر آتا ہے۔ جن کے ذکر خیر سے نیکیوں کے چمن میں بہار اور قلب وروح کی گہرائیوں میں شرافت وکرامت کے آبشار پھوٹتے ہیں جن کی قابل قدر دینی وعلمی خدمات ملت اسلامیہ کی متاع گراں مایہ اور جن کے زندہ وتابندہ کارنامے ہمارے لئے نشانِ راہ اور چراغِ منزل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ اپنے دور کی ایک قابل قدر شخصیت تھے۔ انہوں نے دارالعلوم دیوبند کی عظمت وشہرت کی کلاہِ زریں پر علم وفن کے جوہر ٹانکے اور مسلک دیوبند کی نمائندگی اور موقف دارالعلوم کی ترجمانی کا حق ادا کیا ہے۔ ان کا لب ولہجہ ابریشم سے نرم، زبانِ حقیقت ترجمان حکمت سے لبریز، بیان شہد سے زیادہ پُر حلاوت، گفتگو سحر انگیز، مزاج میں لینت، طبیعت میں بردباری، علم میں گہرائی وگیرائی، قلم میں جان، تحریر اثر آفریں، چال ڈھال متواضعانہ، کردار قابل تقلید، عمل لائق تأسی، سیرت سنت نبوی کا عکس جمیل، صورت نورانی، شخصیت پُر وقار، ذہن علوم معارف کا بحر ذخار، دماغ حکمت وروشن کا شجر پُر بہار، اہتمام وانصرام ہو کہ تدریس وتعلیم، تصنیف وتالیف ہو کہ وعظ وتقریر، روحانیت وخانقاہیت ہو کہ ملی قیادت، دینی سیادت ہو کہ عوامی روابط ہر میدان میں یکساں صلاحیت کے مالک اور یکساں کمالات کے حامل تھے۔

زمانہ طالب علمی میں راقم الحروف کے ساتھ حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی جو شفقتیں اور محبتیں

رہیں سچ یہ ہے کہ بیگانگی کے اس دور میں نگاہیں ان کو ڈھونڈتی ہیں مگر دور دور تک کہیں نظر نہیں آتیں۔طلبہ کے ساتھ ہمدردانہ برتاؤ اور اپنے ملنے جلنے اور جاننے پہچاننے والوں کے ساتھ ان کا سلوک آج کے دور میں ایک خواب و خیال نظر آتا ہے۔

۱۹۷۴ء کی بات ہے۔راقم الحروف نے اپنے ادارہ جامعہ ضیاء العلوم پونچھ میں حضرت حکیم الاسلامؒ کو تشریف آوری کی دعوت دی۔ادارہ کا ابتدائی دور تھا۔علاقہ انتہائی پس ماندہ، جہالت عروج پر اور شرک، بدعات کا شباب۔خیال یہ تھا کہ ایسی بے سروسامانی اور ایسے نامساعد احوال وظروف میں تشریف آوری کی دعوت شرف قبولیت سے باریاب نہ ہوگی۔مگر حکیم الاسلامؒ کی شفقتیں اور محبتیں کہ بلا تامل دعوت منظور فرمالی گئی۔مگر ادھر حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کے شایانِ شان پذیرائی نہ ہوسکنے کا اندیشہ دامن گیر، مستزاد برآں جموں سے پونچھ تک راستے کی ناہمواریاں اور کٹھنائیاں، مسافت طویل، پُر صعوبت اور پُر پیچ، کڑکتی ہوئی سردی کا موسم، دھول اور دھند سے آسمان ڈھکا ہوا، گردوغبار کی دبیز چادر، فضا کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے اور کار کا سفر، اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ حضرت حکیم الاسلامؒ کو اس سفر میں کس قدر دشواریوں کا سامنا ہوا ہوگا مگر بایں ہمہ پوری بشاشت کے ساتھ پونچھ تک کی یہ طویل مسافت طے فرمائی اور ایک جملہ بھی زبان مبارک سے دریافت کرنے کے باوجود شکوہ یا شکایت کا نہیں آیا۔ پونچھ پہنچنے پر عوام الناس نے جس ایمانی جوش و جذبہ کے ساتھ آپ کا استقبال کیا وہ پونچھ کی تاریخ کا ایک بے مثال واقعہ ہے۔بعدِ عشاء آپ کا خطاب شروع ہوا۔عالم یہ تھا کہ جیسے ساون کی رم جھم بارش ہورہی ہو اور خشک کھیتیاں لہلہا اٹھی ہوں۔ رات گئے تک نہایت اطمینان کے ساتھ خطاب کا سلسلہ جاری رہا۔اس دوران نہ پہلو بدلا، نہ لب ولہجہ میں کوئی تبدیلی آئی۔مجمع کیا تھا۔ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر، مختلف المسالک، مختلف الخیال، مسلم، غیر مسلم سبھی ہمہ تن گوش برآواز، نہ نیند کا احساس، نہ تکان، گویا آب حیات کا بند ٹوٹ گیا اور ہر شخص بقدر ظرف جام کے جام اتار رہا ہے۔اس سفر میں حضرت حکیم الاسلامؒ نے ایک منظوم سفرنامہ بھی تحریر فرمایا جس کو جامعہ ضیاء العلوم ''سفرنامہ پونچھ'' کے نام سے باضابطہ کتابچہ کی صورت میں شائع کرچکا ہے۔حضرت حکیم الاسلامؒ پر جو کچھ کہنا اور لکھنا چاہئے تھا ہمارے قابل قدر قلم کار اور فاضل مقالہ نگار کافی حد تک کہہ بھی چکے ہیں اور انشاء اللہ آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

حق تعالیٰ شانہٗ حضرت حکیم الاسلامؒ کے درجات کو بلند فرمائے اور ان کی خدمات و کارناموں کو اسلام کی اشاعت اور مسلکِ دیوبند کے استحکام کا ذریعہ بنائے۔آمین یارب العالمین

............❖............

حکیم الاسلامؒ اور نصابِ تعلیم

مولانا مفتی جمیل احمد نذیری، اعظم گڑھ

نصابِ تعلیم کیا ہے؟

کسی بھی ادارہ کے لئے، خواہ دینی ہو یا دنیاوی، نصاب تعلیم بنیادی حیثیت رکھتا ہے، نصاب تعلیم کے ذریعے ہم ادارے کے مقاصد کو متعین کر سکتے ہیں کیوں کہ ادارہ کے مقاصد، نصاب تعلیم کے گرد گھومتے ہیں اور اسی کی فکر کی غمازی کرتے ہیں، نصابِ تعلیم، تعلیم کے اصل مقاصد کے حصول کا سب سے اہم ذریعہ ہوتا ہے۔

نصاب تعلیم، مختلف فنون کی چند مخصوص کتابوں، ان کے نوٹس، لیکچر اور معلومات کو مناسب درجہ بندی اور منظّم طریقہ سے طلبہ کو فراہم کر دینے کا نام ہے یا بقول بعض مفکرین نصاب تعلیم، تعلیمی اداروں کے ذریعہ متعین تجربوں کے توسط سے طلبہ کی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کا نام ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ نصابِ تعلیم صرف کتابوں کا نام نہیں بلکہ طلبہ کی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کے لئے اداروں میں جو جو چیزیں بروئے کار لائی جاتی ہیں وہ سب نصاب تعلیم کا حصہ ہیں۔

نصاب تعلیم دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک لازمی، دوسرا اختیاری۔ مدارس کا عام ماحول اور مزاج یہ ہے کہ جو چیزیں باقاعدہ گھنٹوں میں تقسیم ہوتی ہیں یا جن کے اوقات مقرر ہوتے ہیں، خواہ تعلیمی اوقات میں یا خارج اوقات میں وہی چیزیں نصابی کہلاتی ہیں اور اختیاری مضامین وموضوعات، نصابِ تعلیم کا حصہ نہیں ہوتے۔

دینی مدارس کا نصابِ تعلیم

دینی مدارس کا نصاب تعلیم کیا ہو؟ کیسا ہو؟ یہ عنوان ہمیشہ ہی مفکرین اور اہل نظر کی بحث و گفتگو کا

موضوع رہا ہے۔ اس عنوان پر مختلف انداز میں دادِ تحقیق دی جاتی رہی ہے۔ مختلف نظریات، مختلف جہتیں پیش کی جاتی رہیں اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔

نصاب تعلیم سے متعلق حضرت حکیم الاسلامؒ کا نقطۂ نظر

ایک جلیل القدر عالمِ دین، بلند پایہ خطیب و انشاء پرداز و مفکر، دینی مصالح و حکمتوں کے رمز شناس اور ایک طویل عرصہ تک ازہرِ ہند دارالعلوم دیوبند کے فعال مہتمم کی حیثیت سے حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس اہم اور حساس موضوع سے الگ کیسے رہ سکتے تھے جب کہ ام المدارس دارالعلوم دیوبند سمیت سارے مدارس دینیہ کے لئے یہی چیز جڑ، بنیاد اور ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے اور اسی سے مدارس کے اُن مقاصد کا حصول ہوتا ہے جو ۱۸۵۷ء کے بعد تحفظ ایمان و عقیدہ کی صورتیں پیدا ہوئیں۔

حضرت علیہ الرحمہ نے دارالعلوم دیوبند اور دیگر مدارس دینیہ کے نصاب تعلیم کے تعلق سے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ بھی کسی ماہر تعلیم سے گفتگو کے ضمن میں ہے، کبھی کسی تعلیمی کانفرنس کے اندر ہے، کبھی کسی تعلیمی ادارہ کا جائزہ لیتے اور معائنہ کرتے ہوئے بیان ہوئے ہیں۔

نصابِ تعلیم سے متعلق حکیم الاسلامؒ کی گفتگو یا خیالات صرف عربی مدارس تک محدود نہیں بلکہ عصری درسگاہوں، جامعات اور یونیورسٹیوں کو بھی اس دائرے میں رکھا گیا ہے۔ یہاں تک کہ مکاتب کے نصاب میں اظہار خیال ہوا ہے۔

ہماری آئندہ کی سطور سبھی سے متعلق اس اجمال کی تفصیل ہے۔

قوم کی برتری اور بقاء، صرف صحیح تعلیم کے ذریعے

حضرت حکیم الاسلامؒ فرماتے ہیں کہ کسی قوم کی ترقی، برتری بلکہ بقاء صرف صحیح تعلیم پر منحصر ہے لیکن تعلیم صحیح کب ہوگی، اس کے عناصر اور اسباب و عوامل کیا ہیں، انہیں جاننے اور ان پر عمل پیرا ہونے کی ضرورت ہے۔

یہ باتیں حضرت حکیم الاسلامؒ نے اس موقع پر فرمائیں۔ جب ۲۲؍فروری ۱۹۴۷ء کو مولانا ابوالکلام آزادؒ نے اسمبلی ہال لکھنؤ میں ایک ''تعلیمی کانفرنس'' بلائی تھی جس کا موضوع ہی عربی و فارسی کا نصاب تعلیم تھا۔ اس کانفرنس میں ملک کی نامور علمی شخصیات شریک ہوئیں اور حاصل کانفرنس جو تقریر مقرر پائی وہ حضرت حکیم الاسلامؒ کی تقریر تھی، خود داعی کانفرنس حضرت مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حکیم الاسلامؒ کی تقریر کے جملہ جملہ کو لے کر اپنے الفاظ و انداز میں نہایت شاندار اور وقیع شرح فرمائی۔ یہ تقریر ''خطبات حکیم الاسلامؒ''

جلد۸ میں ''نصاب تعلیم کی تدوین'' کے عنوان سے مع مذکورہ بالا تفصیلات کے موجود ہے۔

حکیم الاسلامؒ اپنی تقریر میں ''صحیح تعلیم'' کی تشریح یوں فرماتے ہیں۔

''صحیح تعلیم سے میری غرض یہ ہے کہ نصابِ تعلیم موزوں ہو، طریقِ تعلیم مؤثر ہو، ذریعۂ تعلیم فطری ہو، اساتذہ کا انتخاب صحیح ہو، نظامِ تعلیم درست ہو۔ اگر کسی قوم میں تعلیم ہی نہ ہو تو ایک بنیادی روگ ہے جس سے کوئی قوم پنپ نہیں سکتی۔ نصاب تعلیم اگر غلط ہو تو ذہن کا سانچہ درست نہیں ہوسکتا، طریقۂ تعلیم اگر غلط ہو تو تعلیم کا پورا اثر ظاہر نہیں ہوسکتا۔''

''استاذ قابل نہ ہو تو قابلیت کا دروازہ ہی نہیں کھل سکتا، سب کچھ ہو اور نظم تعلیم درست نہ ہو تو نتائج متوقع نہیں نکل سکتے۔ غرض تعلیم کی صحت کے لئے ان اجزا کا ہونا ازبس ضروری اور یہ امور تعلیم کے حق میں بنیادی ہیں۔''

صحیح تعلیم کی بنیاد، نصب العین کا تعین

صحیح تعلیم کے یہ عناصر ترکیبی، اسی وقت نتیجہ خیز ہوسکتے ہیں جب اس کی اصل بنیاد صحیح ہو، تعلیمی عمارت کی صحت واستواری؛ بنیاد کی صحت واستواری، درستگی و مستقیمی پر منحصر ہے۔

حضرت حکیم الاسلامؒ فرماتے ہیں:

''لیکن اگر آپ غور فرمائیں تو ان سب بنیادوں کی ایک اور گہری بنیاد ہے کہ اس کی صحت وسقم پر ان سب امور کی صحت وسقم موقوف ہے اور وہ ہے ''تعلیم کا نصب العین اور مقصد'' اِس نصب العین کی خوبی و خرابی سے اُن بنیادوں میں خوبی وخرابی پیدا ہوتی ہے بلکہ یہ نصب العین تعلیمی اداروں اور اداروں سے فیض حاصل کرنے والوں کی کامیابی اور ناکامی کی کسوٹی ہے، اسی نصب العین کے لحاظ سے اس ادارہ کے کمال و نقصان کا فیصلہ کیا جائے گا۔''

نصاب تعلیم کا نصب العین سے تعلق

جس ادارہ کا جیسا نصب العین معین ہوگا اس کا نصاب بھی، اُسی کے مطابق ہوگا کیوں کہ نصب العین اور مقصد کو سامنے رکھا جائے گا تو سرکاری اداروں اور دینی مدارس کے درمیان فرق خود بخود ظاہر ہوجائے گا۔ سرکاری تعلیم گاہوں کا مقصد، عام طور پر ملازمت کا حصول ہے تاکہ اس تعلیم کے ذریعہ کلرک، محرر، دفتری کارکن یا سرکاری محکموں کے کل پرزے تیار ہوجائیں۔

اس کے بالمقابل دینی درسگاہوں کا مقصد، دینی اداروں کا نصب العین نہ روٹی ہے نہ کرسی بلکہ نفوسِ انسانی کی تہذیب وتربیت ہے۔

حکیم الاسلامؒ فرماتے ہیں:

''دینی درسگاہوں کا نصب العین اس دینی تعلیم سے نہ روٹی نہ کرسی، بلکہ تہذیب نفس ہے کہ اس تعلیم سے ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو انسانیت کے سچے خدمت گذار ہوں اور عالم بشریت کی بہی خواہی میں اپنی جان، مال اور آبرو کی کوئی پرواہ نہ کریں۔''

پھر حکیم الاسلامؒ بہت ہی نکتہ کی بات کہتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ دینی اداروں کی کامیابی اور ناکامی جانچنے کا معیار کیا ہے؟

''ظاہر ہے کہ ہمیں اُن افراد کی کامیابی اور ناکامی اور اُن اداروں کے کمال ونقصان کو اسی معیار اور نصب العین سے جانچنا ہوگا جس کو لے کر یہ ادارے کھڑے ہوئے ہیں، بلاشبہ وہ اس مقصد میں کامیاب ہیں، ہمیں کوئی حق نہیں کہ ہم ان کو سرکاری معیار سے جانچیں اور پھر ان کی تنقیص کریں۔''

آخر میں پھر فرماتے ہیں:

''بنیادی چیز نصب العین ہے، اس سے ادارے پنپتے ہیں اور اس کے بگڑ جانے سے بگڑ جاتے ہیں۔''

اسی ضمن میں حضرت حکیم الاسلامؒ نے ایک حکیمانہ بات یہ فرمائی ہے:

''میرے خیال میں دینی، عربی مدارس کے رویہ میں تبدیلی پیدا کرنے سے زیادہ ضروری اور اہم یہ ہے کہ سرکاری اداروں میں نصب العین کی تبدیلی کی جائے۔''

نصابِ تعلیم میں کوئی مرکز علوم ہونا چاہئے

''حکیم الاسلامؒ فرماتے ہیں کہ آپ علم کوئی حاصل کریں، کسی فن کی تحصیل میں لگیں خواہ مدارس میں پڑھتے ہوئے یا کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھتے ہوئے، ہر علم وفن کا ایک مرکز ہونا چاہئے جو سارے علوم وفنون کا محور ہو، سارے علوم وفنون اسی کے گرد گھومیں اور اپنے مرکز سے لاتعلق نہ رہیں، علوم وفنون کے نصاب میں اِس مرکز علوم کو ہمیشہ مقدم رکھنا چاہئے۔

''میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ دوسرے علوم وفنون کی تعلیم چھوڑ دیں، تمام علوم وفنون آپ حاصل کریں۔ آپ سائنس، فلسفہ، ہندسہ، ریاضی اور علوم طبعیہ وعقلیہ بھی حاصل کریں لیکن ہر علم کا کوئی معیار اور مرکز بھی ہونا چاہئے جس کے اردگرد وہ علوم گھومیں۔

سارے علوم کا اگر مرکز آپ دین کو بنالیں گے کہ ہم اس کی ترویج وتبلیغ اور فروغ کے لئے یہ تمام چیزیں حاصل کررہے ہیں، یہ سب چیزیں آپ کے حق میں دین بنتی چلی جائیں گی، دنیا ہی کارآمد نہیں ہوگی بلکہ دنیا کے ساتھ آخرت کا اجروثواب مرتب ہونا شروع ہوجائے گا۔

اگر دین اور کتاب وسنت کو مرکز بنایا جائے اور تمام علوم وفنون اس کے اردگرد گھمائے جائیں جن کا مقصد یہ ہو کہ اس علم کو آگے بڑھانا ہے، اس کے ذریعہ سے لوگوں کی اصلاح کرنی ہے اور اس کے ذریعہ سے لوگوں کو صالح بنانا ہے تو ہر علم وفن کام دے گا اور ہر علم وفن باعث اجر اور باعث صلاح وتقویٰ بنے گا۔

مدارسِ دینیہ کے نصاب میں تبدیلی کا معاملہ

مدارسِ دینیہ کے نصاب میں تبدیلی کی آوازیں، دانشورانِ ملت اور خود مدارس کے فیض یافتگان کی طرف سے بھی بارہا اٹھتی رہتی ہیں، مولانا ابوالکلام آزادؒ کی جس تعلیمی کانفرنس کا ذکر پچھلے اوراق میں آچکا ہے، اس میں بھی صدر کانفرنس کی حیثیت سے مولانا آزادؒ نے اپنی صدارتی تقریر میں مدارس عربیہ کے نصاب تعلیم اور طریقۂ تعلیم پر سخت تنقید فرمائی تھی اور کہا تھا کہ اِس طریقۂ تعلیم اور نصاب تعلیم کے بہت سے گوشے وقت کے تقاضوں اور ضرورت کو پورا کرنے سے عاری اور یکسر خالی ہیں جنہیں بہت جلد پورا کردینے کی ضرورت ہے۔

۱۳۵۸ھ میں حضرت حکیم الاسلام علیہ الرحمہ نے افغانستان کا جو سفر کیا تھا، اس میں یہ ساری باتیں زیرِغور تھیں، سفر افغانستان کی روداد کا یہ حصہ خود حکیم الاسلامؒ کی زبانی سنئے۔ افغانستان کے وزیر تعلیم سے ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''پہلی ملاقات میں وزیر صاحب معارف نے جو ایک نوجوان قابل اور پیرس کے تعلیم یافتہ ہیں، مذہبی طبقہ کی روش پر مخلصانہ تنقید اور مذہبی مدارس کے نصاب پر چند برمحل شکوک کا اظہار فرمایا اور اس کا شکوہ شدومد سے کیا تھا کہ علماء اسلام دولتی اور سلطنتی امور پر دسترس نہیں رکھتے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی تربیت ایسے انداز پر مبنی ہوتی ہے کہ وہ ملکی ادارہ میں حصہ لے سکیں۔

اس سلسلے میں ان شکوک کے جوابات عرض کئے گئے نیز موجودہ اور نصابِ دینیات کو ایک بنیادی نصاب ثابت کرتے ہوئے اس سے بھی انکار نہیں کیا گیا کہ ضروریات زمانہ کی رعایت کے ماتحت اس نصاب میں کمی بیشی کا امکان ہے اور دارالعلوم نے اس طرح کے وقتی مقتضیات اور ان کے ماتحت نصابی

تفرادت سے کبھی گریز نہیں کیا ہے اور نہ اب کرنا چاہتا ہے۔

چنانچہ اسی سلسلے میں وزیر صاحب معارف کے سامنے میں نے ایک تحریری پیش کی جس کا عنوان ''معارف امروز وفکر فردا'' تھا۔ جس میں تعلیم وتربیت سے متعلق دارالعلوم کے آئندہ تصورات کا کچھ تذکرہ کیا گیا تھا تا کہ ایک ضرورت واقعی کے اظہار کے ساتھ ہم حکومتِ کامل کی توجہات کو ادھر ملتفت کرسکیں کہ دارالعلوم قومی ضروریات سے نہ کبھی غافل رہا ہے اور نہ اب ہے اور اس طرح ایک عرفانی رابطہ کی بسہولت بنیاد پڑ سکے جو سفر کا حقیقی مقصد تھا۔ یہ تحریر درج سفر نامہ ہے جس کا اس روداد کے صفحات میں لایا جانا طول سے بھی خالی نہ تھا اور ساتھ ہی اس سے پہلے اسی کا اعلان موزوں بھی نہ تھا کہ دارالعلوم کی مجلس شوریٰ اس کے متعلق اظہارِ رائے کردے۔ اس تحریر کو پڑھتے ہی وزیر صاحب معارف کا رویہ ایک دم بدلا اور شکوہ سے شکریہ کی صورت میں تبدیل ہوگیا۔ بسیار مبارک، بسیار اعلیٰ، بسیار بلند وغیرہ کے کلمات سے جناب ممدوح نے بندہ کی حوصلہ افزائی فرمائی اور فرمایا کہ اگر یہ پروگرام دارالعلوم میں عملاً شروع ہوجائے تو پھر افغانستان کا بھی ایک اہم مقصد ہے۔''

حضرت حکیم الاسلامؒ نے مولانا آزادؒ کی تعلیمی کانفرنس میں اپنے سفر افغانستان اور نصاب تعلیم میں تبدیلی سے متعلق اپنی تحریر کا تذکرہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

''میں نے خود ۱۳۵۸ھ میں سفر افغانستان سے واپسی میں دارالعلوم کی مجلس شوریٰ میں اس سلسلے میں ایک مفصل رپورٹ پیش کی تھی جس میں تبدیلیٔ نصاب کے متعلق اپنے خیالات، تفصیلات کے ساتھ ظاہر کئے تھے۔''

راقم سطور نے یہ رپورٹ دفتر اہتمام دارالعلوم دیوبند سے حاصل کرنے کی کوشش کی اور حضرت مہتمم صاحب دامت برکاتہم العالیہ کے پاس خط بھیجا، جس کا جواب حضرت مولانا قاری محمد عثمان صاحب مدظلہ العالی نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے بڑی شفقت ومحبت سے روانہ فرمایا، اس میں انہوں نے لکھا کہ:

''آپ نے گرامی نامہ میں ''سفر کابل'' کی رپورٹ سن ۵۸ء کی طلب فرمائی ہے۔ یہ قدیم ریکارڈ نکلوا کر دیکھا گیا، کاغذات بڑے بوسیدہ ہوگئے ہیں، ان کے ساتھ زیادہ چھیڑ چھاڑ نقصان کا سبب ہوسکتا ہے۔ البتہ مکمل روداد سفر کابل طبع شدہ نسخہ کی فوٹو کرا کر بھیجی جارہی ہے، امید کہ اس سے ضرورت پوری ہوجائے گی، اگرچہ فوٹو کرانے میں یہ نسخہ بھی خراب ہونے جارہا ہے، اسی لئے دو کاپی کرالی گئی ہیں تاکہ ایک کو مجلد کرا کے محفوظ کرلیا جائے۔''

طبع شدہ نسخہ میں ''تبدیلیٔ نصاب'' سے متعلق حضرت مہتمم صاحب علیہ الرحمہ کی تحریر پہلے نقل کی جاچکی ہے۔ مزید اس نسخہ میں اس طرح کی کوئی بات نہیں ہے۔ البتہ حضرتؒ نے جس مفصل رپورٹ کے مجلس شوریٰ میں پیش کرنے کا تذکرہ کیا ہے وہ ضرور اس سلسلے میں بے حد اہم تھی اور حکیم الاسلامؒ کے خیالات

حکیم الاسلامؒ کی تحریر سامنے آئے، اب اس کے بارے میں جانکاری کا احقر کی معلومات میں ایک ہی ذریعہ رہ گیا ہے اور وہ ہے حضرتؒ کی وہ تقریر جو آپ نے مولانا آزاد کی بلائی ہوئی تعلیمی کانفرنس میں فرمائی تھی۔ لہٰذا اس تقریر کی روشنی میں تبدیلیٔ نصاب کے متعلق حضرت حکیم الاسلامؒ کا نقطۂ نظر پیش کیا جاتا ہے۔

تبدیلی کا تعلق کن امور سے ہے اور کن امور سے نہیں؟

حکیم الاسلامؒ فرماتے ہیں کہ:

''اب رہا مدارس عربیہ کے نصاب تعلیم میں تبدیلی کا قضیہ سو مجھے اس اصول سے انکار نہیں اور نہ کسی کو ہوسکتا ہے، جن تعلیمات کا وحیِ الٰہی سے تعلق ہے اس کی تبدیلی پر نہ ہم قادر ہیں نہ ہمیں حق ہے، باقی جو فنون یا کتابیں، قرآن کے خادم کی حیثیت سے زیر تعلیم آتی ہیں وہ زمانہ اور احوال کے لحاظ سے بدل سکتی ہیں۔

قرآن ہر زمانہ میں ایک رہا لیکن اس کی تفہیمات کا انداز بدلتا رہا، جس دور میں مثلاً فلسفہ کا زور ہوا تو قرآن کو فلسفیانہ رنگ میں سمجھایا گیا، جس دور میں تصوف کا زور ہوا تو قرآن کو صوفیانہ رنگ میں سمجھایا گیا، آج سائنس کا دور ہے تو وہ سائنسی رنگ میں تجلی کرے گا۔ اس ساری حقیقت کو میں بطور خلاصہ اِن الفاظ میں لاسکتا ہوں کہ مسائل پرانے ہوں اور دلائل نئے ہوں۔''

ہم ان ہی ٹھیٹ فطری مسائل کو جدید آلات سے مسلح کر کے میدان میں لائیں گے، بس تبدیلیٔ نصاب کا حاصل اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم اپنے مخاطبوں کی زبان میں اپنے گھر کی چیز ان کے سامنے پیش کردیں۔ نہ وحی کی کتابیں اور مسائل بدلے جاسکتے ہیں اور نہ ہمیں اس کا حق ہے۔ اس لئے وقت کے تقاضوں کے ماتحت یہ تعبیراتی فنون اور کتب بدلتی سدلتی رہی ہیں اور برابر بدلتی رہیں گی کہ خود درس نظامی کی تدوین میں تبدیلیٔ نصاب کی سب سے بڑی دلیل ہے کیوں کہ بہر حال یہ نصاب قرنِ اول کا نہیں ہے، وقت کے تقاضوں سے بنایا گیا ہے جب اس کے آغاز کے وقت تغیر وتبدل ممکن تھا تو آج بھی ممکن ہے مگر ان ہی حدود کے ماتحت جو عرض کی گئیں۔ نصاب کا مسئلہ بہر حال علماء میں زیر غور ہے اور وقتاً فوقتاً اس نصاب میں بہت سے تغیرات ہوچکے ہیں اور ہورہے ہیں۔

بہر حال نصاب تعلیم میں یہ تغیر ہوتا رہا ہے اور ہوگا لیکن یہ ضرور ہے کہ ذمہ دار علماء اسے از خود ہی کریں گے جیسا کہ اب تک کرتے چلے آئے ہیں، ہاں جو کچھ بھی ہو وہ اپنی بصیرت سے تغیر کریں۔

حضرت حکیم الاسلامؒ نے اپنی اس تقریر میں ''نصاب تعلیم'' کی جن چیزوں کو قابل تبدیل قرار دیا اُن کے متعلق درج ذیل جملے نہایت ہی اہم اور قابل غور ہیں۔

۱-مسائل پرانے ہوں اور دلائل نئے ہوں۔
۲-تبدیلیٔ نصاب کا حاصل اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم اپنے مخاطبوں کی زبان میں اپنے گھر کی چیز اُن کے سامنے پیش کر دیں۔
۳-وقت کے تقاضوں کے تحت تعبیراتی فنون اور کتب بدلتی رہی ہیں اور بدلتی رہیں گی۔

ان میں اول الذکر جملہ اتنا جامع ہے کانفرنس مذکور کے ہر آنے والے مقرر نے اسی کی جامعیت اور معقولیت کو سراہا، علامہ سید سلیمان ندویؒ نے فرمایا کہ ''اس سے زیادہ جامع جملہ کوئی نہیں ہے جو تغیر نصاب پر جامع روشنی ڈال سکے۔''

مولانا ابوالکلام آزادؒ نے فرمایا:

''مسائل قدیم ہوں اور دلائل جدید ہوں'' ہمارے اُن تمام تعلیمی مقاصد کا آئینہ دار اور لب لباب ہے جو ہمارے پیش نظر ہیں، یہ اس قدر جامع تعبیر ہے کہ آپ کتنی شرحیں کرتے چلے جائیں تفاصیل کے دفتر تیار کر دیں لیکن کوئی مقصد بھی اس جملہ سے باہر نہ ہوگا۔''

اس جملہ کا تحلیل و تجزیہ کرنے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ہمارے پرانے مسائل کیا ہیں؟ وہ تو ہمیں معلوم ہی نہیں، اُن مسائل کے نئے دلائل کیا ہیں اور کس زبان میں ہیں، انہیں معلوم کرنے کی ضرورت ہے۔

آج ہر صاحب علم اس بات سے واقف ہے کہ آج کے علمی میدان کے دلائل یا آلات جنگ سائنس، ریاضی، جدید علم ہیئت وغیرہ ہیں، انہیں سیکھنے کی ضرورت ہے اور مدارس دینیہ کے نصاب اور مدارس دینیہ کے طریقِ تعلیم میں کچھ تبدیلی کر کے ان علوم کے لئے کسی نہ کسی درجہ میں گنجائش پیدا کرنے کی ضرورت ہے اور اسی کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ اگر اس طرح کی کتابیں جو مدارس میں چل سکیں دستیاب نہ ہوں تو دیندار ماہرین فن سے تیار کرانے کی ضرورت ہے۔

اس کا ایک لازمی تقاضا یہ بھی ہے کہ جو دلائل پرانے ہیں، جن کی اب کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی اور زمانہ کے تغیر و تبدل سے از کار رفتہ ہو چکے ہیں انہیں چھوڑ دینے کی ضرورت ہے مثلاً فلسفۂ قدیم۔

اسی طرح ہر کوئی جانتا ہے کہ مذکورہ نئے دلائل کی ایک زبان ہے اور وہ ہے انگریزی، لہٰذا نئے دلائل کو اصل ماخذ سے سیکھنے اور سمجھنے کے لئے ہمارے مدارس دینیہ کے طلبہ کو انگریزی جاننا اور سیکھنا بھی ضروری ہے اور اس حد تک ضروری ہے جس سے وہ نئے دلائل کو اصل ماخذ سے لے سکیں یعنی صرف اتنی انگریزی جاننے

سے کام چلنے والا نہیں ہے کہ تار پڑھ لیں، منی آرڈر فارم بھر لیں، ریز رویشن کرالیں اور خطوط پر پتہ لکھ لیں۔
اگر تم اپنے گھر کی چیز اپنے مخاطبوں کی زبان میں، مخاطبوں کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے مخاطبوں کی زبان بھی سیکھنی پڑے گی۔ اس لحاظ سے مدارس دینیہ کے طلبہ کو ملکی سطح پر ہندی اور بین الاقوامی سطح پر انگریزی سے بھی واقف کرایا جانا ضروری ہے۔
پھر یہ کہ آج کے دور میں کسی کو مخاطب کرنے اور کسی کے سامنے اپنی بات پیش کرنے کا ایک مخصوص انداز ہے جو پچھلے انداز سے کافی بدل چکا ہے، لہٰذا ہم صحافت اور تصنیف و تالیف سے بھی دامن کش نہیں ہو سکتے۔
اسی کے ساتھ ہمیں وہ اصطلاحات اور وہ چیزیں بھی معلوم ہونی چاہئیں جن کی راہ سے ہمارے مسائل پر رد و قدح ہوتی ہے، اشکالات و اعتراضات پیش کئے جاتے ہیں، تاکہ ہم صحیح تجزیہ کر کے اپنے پرانے مسائل، نئے دلائل کے ساتھ پیش کر سکیں، اس اعتبار سے ہمیں کمیونزم، سوشلزم، صہونیت، عیسائیت، ہندوتو سے بھی واقف ہونا چاہئے۔
مدارسِ دینیہ کے طریقِ تعلیم پر غور کر کے مذکورہ بالا ساری چیزیں نصاب تعلیم میں لائی جانی چاہئیں۔
نئے دلائل کا چوں کہ طریقۂ تعلیم بدلا ہوا ہے، اس لئے ہمیں اس پہلو پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔
احقر کے خیال میں حضرت حکیم الاسلامؒ کے جملے "مسائل پرانے ہوں اور دلائل نئے ہوں۔" اور اپنے گھر کی چیز مخاطبوں کی زبان میں پیش کرنے" میں وہ ساری باتیں شامل و داخل ہیں جن کا اوپر تذکرہ کیا گیا۔

عصری تعلیم گاہوں کا نصاب تعلیم

عام طور پر دیکھا یہ گیا ہے کہ ہماری عصری درس گاہوں کے تعلیم یافتہ حضرات مدارسِ دینیہ کے نصاب تعلیم کے متعلق، خواہی نخواہی، ہدایات و مشورے برابر دیتے رہتے ہیں لیکن خود مسلمانوں کی قائم کردہ، مسلمانوں کی شناخت و پہچان رکھنے والی عصری درس گاہوں، اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں دینی تعلیم اور ملّی تشخصات کی پابندی کا کیا حال ہے، اس کی طرف توجہ نہیں دیتے جب کہ بہت سی عصری درس گاہوں میں دینیات، اسلامیات، شخصیات کی طرف ذرا بھی دھیان نہیں، ان کا نصاب تعلیم، طریقِ تعلیم اور نظامِ تعلیم اِس فکر سے بے نیازی اختیار کئے ہوئے ہے جب کہ مسلمانوں کی گاڑھی کمائی، مسلمانوں کے خون و پسینہ اور مسلمانوں کی محنت و کوشش سے وہ وجود میں آئیں اور فخر کے ساتھ انہیں مسلمانوں کی قائم کردہ درس گاہ کہا جاتا ہے۔
حکیم الاسلامؒ نے ان عصری درس گاہوں کے ذمے داروں کو بھی ان کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا ہے،

روداد سفر افغانستان میں لکھتے ہیں:

''اس دوران وزارتِ معارف نے کابل کے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے معائنہ کے لئے مجھ سے فرمایا اور پروگرام بنا کر باصرار کہا گیا کہ میں اِن حکومتی اداروں اور مدارس کا معائنہ کر کے اپنی مفصل رائے بھی حکومت کے سامنے پیش کروں۔ چنانچہ سرکاری طور پر پروگرام تیار ہوا اور ادارت کے معائنوں کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ حبیبیہ کالج سے ابتداء کی جو کہ انگریزی کا کالج ہے، پھر استقلال کالج جو فرانسیسی کا ہے، پھر نجات کالج جو جرمنی کا ہے اور ناکوئشہ کالج طب برائے بنات۔ اس کے بعد ناکلوتہ حقوق یعنی لا کالج جس میں قانون پڑھایا جاتا ہے اور مکتب صنائع اور میخانے کی جس میں صنعت وحرفت کی تعلیم دی جاتی ہے پھر مطبع حکومی جو سیکڑوں اعلیٰ اور ترقی یافتہ مشینوں پر مشتمل ہے جس میں حروف کی ڈھلائی، ٹائپ، عکاسی اور نقاشی وغیرہ کا کام موجودہ دور کی اعلیٰ ترقی یافتہ صورتوں میں ہوتا ہے۔ معائنہ کے بعد احقر نے ان کالجوں پر ایک تفصیلی تبصرہ لکھ کر وزارت معارف کے سپرد کیا جس میں روادوں کی واقعی خوبیوں کا اعتراف کرتے ہوئے بعض ضروری تنقیدات واصلاحات اور بعض مفید تجاویزیں پیش کی تھیں۔

معائنہ کی تنقیدات کا خیر مقدم کیا

اس معائنہ میں عمود بحث یہ تھا کہ عصری تعلیم کسی ایسے مستقل اور متوازی عنوان سے نہ دی جائے جو دینیات کے ساتھ ٹکرا جائے اور قوم ہی مختلف المذاق جیسے پیدا ہو کر قومی تشتت کا باعث بن جائیں بلکہ دینی ودنیوی تعلیم مشترک طریق پر ہونی چاہئے تا کہ پیدا شدہ تفریق بھی مٹ جائے۔ نیز دینیات کے سلسلے میں دارالعلوم کا نصاب پیش کیا گیا جس کو حکومت نے قبول فرمالیا جیسا کہ بعد کے اخبارات کی خبروں سے معلوم ہوا۔''

مکاتب کا نصاب تعلیم

حضرت حکیم الاسلامؒ کا خیال تھا کہ مکاتب دینیہ میں اردو نصاب کے ساتھ مختصر عربی نصاب بھی داخل درس ہونا چاہئے۔ چنانچہ جمعیۃ علماء ہند کے جاری کردہ نصاب تعلیم پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''ضرورت ہے کہ اردو نصاب اور اردو لٹریچر کے ساتھ اب مختصر عربی نصاب بھی مسلمانوں میں رائج کیا جائے جو انہیں عربیت سے بیگانہ نہ رکھے۔''

اس سلسلے میں حکیم الاسلامؒ کا مشورہ یہ تھا کہ مولانا محفوظ الرحمٰن نامیؒ کی مفتاح العربیہ (پانچ حصے) کو جمعیۃ علماء ہند کے تیار کردہ اردو نصاب کا جزء بتا دیا جائے۔ اس کتاب کے ذریعے بچوں میں بہت آسانی

کے ساتھ قلیل مدت میں قرآنی محاورات سے لگاؤ پیدا ہو کر عربیت کا ذوق پیدا ہو جائے گا۔

اردو ذریعۂ تعلیم، اردو کی اشاعت کا ذریعہ

تقریباً سبھی مدارس دینیہ نے عربی نصاب تعلیم ہونے کے باوجود، ذریعۂ تعلیم اردو زبان کو بنایا ہے، اس سے اردو زبان کو پھلنے پھولنے کا زیادہ موقع ملا اور مدارس دینیہ کی بدولت ہندوستان ہی نہیں دنیا کا ایک بڑا علاقہ اردو داں بن گیا اردو بولنے اور سمجھنے والا بن گیا۔

حضرت حکیم الاسلامؒ مکاتب دینیہ پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اس ابتدائی اور بنیادی تعلیم کے لئے ذریعہ تعلیم اردو کے اور دوسرا نہیں ہونا چاہئے جیسا کہ اس کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔

قدیم مدارس دینیہ نے بھی اس ضرورت کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ انہوں نے تعلیم عربی رکھی اور تفہیم اردو کی۔ اس سے اردو زبان صرف ہندوستان میں ہی نہیں پھلی پھولی بلکہ دنیائے اسلام کے ہزار ہا افراد اِن مدارس کی بدولت اردو داں ہو گئے اور آج افغانستان، ایران، چین، ترکستان، روسی ترکستان، حجاز، افریقہ، عراق، جاوا، سماٹرا وغیرہ دور دراز ممالک میں اردو زبان سے بیگانے اور بے تعلق نہیں۔''

............❖............

حکیم الاسلامؒ اور ان کی شانِ تواضع

مولانا ارشد اعظمی قاسمی، بنارس

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کی ذات اقدس ایک بین الاقوامی معروف ومقبول شخصیت ہے۔ اللہ رب العزت نے حضرت حکیم الاسلامؒ کو گونا گوں کمالات سے نوازا تھا، ساتھ ہی جاذبیت اور کشش کی دولت سے بھی مالا مال فرمایا تھا، اور واقعتاً ''حکیم الاسلام'' کا خطاب جس نے بھی آپ کو دیا ہے۔ بجا طور پر صحیح دیا ہے اور ''حق بحق دار رسید'' کا علی وجہ البصیرت ثبوت دیا ہے، کیونکہ ''خطبات حکیم الاسلام'' کا مطالعہ اور اس کا فیض، عنداللہ اس کی مقبولیت برملا اعتراف کرنے پر مجبور کرتی ہے، حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ اپنے اعتبار سے علوم ومعارف، اسرار وحکم کے ایک بحر بیکراں تھے، رشد وہدایت اور علمی فیضان کے جو عظیم الشان نقوش عالم اسلام کو موصوفؒ عطا کر گئے ہیں۔ وہ بے مثال اور لازوال تحفہ وعطیہ ہے، اور ایسی شخصیتیں بعد مدت دراز کہیں پیدا ہوتی ہیں۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے، چمن میں دیدہ ور پیدا

حضرت حکیم الاسلامؒ کی پہلی زیارت آج سے تقریباً چالیس سال قبل مدرسہ دارالعلوم مئو میں ہوئی تھی اور جلسہ میں موصوف نے سورۃ الرحمٰن کی تلاوت فرمائی تھی، میرا بالکل بچپن کا زمانہ تھا۔ لیکن وہ انداز، جمال، آواز، ابھی تک بحمداللہ ذہن میں مرتسم ہے، اس وقت کے حضرت عارف باللہ مصلح الامت مرشدنا مولانا شاہ وصی اللہ صاحب نوراللہ مرقدہٗ کی خانقاہ میں جو میری تعلیم وتربیت کا زمانہ تھا۔ حضرت حکیم الاسلامؒ حضرت مصلح الامتؒ سے متعدد بار ملاقات کے لئے تشریف لائے، تو وہاں زیارت سے مشرف ہونے کی توفیق

میسّر ہوئی، حضرت مصلح الامتؒ اوران کے در سے وابستہ ہونے کے طفیل دارالعلوم دیو بند اور ہندوستان کے دیگر علماء کرام کو قریب سے دیکھنے اور ملاقات کرنے کے مواقع نصیب ہوئے، یہ حضرت مصلح الامتؒ کی برکت تھی جسے اللہ رب العزت نے اپنے اس بندے کو عطا فرمائی، ایک بہت خاص بات یہاں ناظرین و قارئین کے توجہ فرمانے کی ہے کہ الہ آباد نوراللہ روڈ پر ایک عظیم الشان سیرت کا جلسہ تھا۔ جس میں حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ خصوصی مقرر کی حیثیت سے یاد فرمائے گئے تھے، راقم کو اچھی طرح یاد ہے کہ سیکڑوں کا مجمع تھا اور الہ آباد و اطراف کے علماء کرام بھی جلسہ گاہ میں حاضر تھے۔ مولانا قاری فیاض احمد صاحب دلدارنگری نے آپ کا تعارف کرایا تھا، تو اس تعارف میں حقیقت کے اعتبار سے احترام و آداب اور تعظیم کا پورا لحاظ رکھتے ہوئے حکیم الاسلامؒ کی شخصیت کو اُجاگر کیا تھا، لیکن حضرت حکیم الاسلام نے بعد خطبہ اس طویل تعارف پر نکیر فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا کہ مولانا موصوف نے جو کچھ بتلایا وہ ان کے حسن عقیدت وسعادت مندی کا ثبوت ہے مگر اس سے زیادہ بہتر یہ تھا کہ وہ یہ فرماتے کہ دارالعلوم دیو بند کا ایک طالب علم حاضر خدمت ہے، اس متواضعانہ انداز پر مجمع پر ایک خاص تأثر پیدا ہو گیا تھا۔

راقم نے حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کی زندگی کا مطالعہ کیا تو بایں کمالات و بلندئ درجات ان کی ''تواضع'' بہت ہی نمایاں نظر آتی ہے اور حقیقتاً اسی تواضع نے آپ کو بڑی بلندی عطا کر دی تھی۔ اسی سلسلہ میں ایک واقعہ زینت قرطاس کرنے کا شرف حاصل ہو رہا ہے، جسے پڑھ کر مجھ جیسے ادنیٰ طالب علم کو حضرت حکیم الاسلامؒ کے مقام بلند کا تصور نہیں ہو سکا۔ اللہ تعالیٰ ان کے مزار کو پُرانوار بنائے۔

حضرت مولانا شاہ محمد احمد صاحب پرتاپ گڈھیؒ جو ابھی قریبی دور کے بلند پایہ بزرگ گذرے ہیں۔ انھوں نے اس واقعہ کو بڑے تأثر کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ اور اس میں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہٗ کے سفر بیت المقدس کا واقعہ مربوط ہے لہٰذا مضمون نگار اپنے الفاظ میں نہیں بلکہ حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاپ گڈھی کے ہی انداز بیان کو نقل کرے گا اور پورا بیان پڑھنے کے بعد ہی صحیح طور پر اندازہ لگ سکے گا۔ لہٰذا حضرت مولاناؒ کے الفاظ میں پہلے حضرت عمر فاروق اعظمؓ کا واقعہ ملاحظہ کیجئے اس کے بعد حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کا۔

چنانچہ مولانا پرتاپ گڈھیؒ فرماتے ہیں کہ:

''حضرت عمرؓ کا ایک مشہور واقعہ ہے کہ آپ کے دور خلافت میں، مسلمانوں کے لشکر نے جب بیت المقدس کا محاصرہ کیا تو اہل شہر نے کہا کہ تم اپنے خلیفہ کو بلاؤ، ہماری کتاب میں ان کا حلیہ لکھا ہوا ہے، اگر

مطابق ہو جائے گا تو ہم بغیر جنگ کئے ہی قلعہ کا دروازہ کھول دیں گے، چنانچہ مسلمانوں کے سپہ سالار حضرت عبیدہ ابن الجراح نے خلیفۃ المسلمین حضرت عمر ابن خطابؓ کے پاس یہ اطلاع بھیجی، تو آپ بیت المقدس کے لئے روانہ ہو گئے، بوقت روانگی آپ کا یہ حال تھا کہ پیوند لگے ہوئے معمولی کپڑے زیب تن فرمائے ہوئے اور اونٹ پر سوار تھے، یہ دیکھ کر اسلامی سپہ سالاروں نے آپ سے درخواست کی اور عرض کیا کہ آپ مسلمانوں کے خلیفہ ہیں۔ لہٰذا اچھے اور صاف کپڑے پہن لیں۔ اور گھوڑے پر سوار ہو کر تشریف لے چلیں۔ حضرت عمرؓ نے لوگوں کی اس درخواست پر کپڑے بدل لئے اور اونٹ سے اتر کر گھوڑے پر سوار ہو گئے۔ مگر ابھی چند قدم ہی چلے تھے کہ فرمانے لگے کہ: میرا نفس ان چیزوں کی وجہ سے متغیر ہو رہا ہے۔ لاؤ میرے پرانے کپڑے اور میرا اونٹ میں اسی پر چلوں گا۔ اور یہ فرمایا کہ: نَحْنُ قَوْمٌ اَعَزَّنَا اللّٰہ بِالْاِسْلَام. یعنی ہم وہ قوم ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اسلام کے ذریعہ عزت دی ہے۔ وہی ہمارے لئے کافی ہے۔ یہ فرمایا اور پھر وہی پیوند دار کپڑے پہن لئے اور اونٹ پر سوار ہو کر تشریف لے گئے، آپ کے ہمراہ ایک غلام تھا، اس سے یہ طے فرمایا کہ ایک منزل تک میں سوار ہو کر چلوں گا اور تم اونٹ کی نکیل پکڑ کے چلو گے، اور ایک منزل تم سوار ہو کر چلو گے اور میں نکیل پکڑ کر چلوں گا۔ چنانچہ اسی کے مطابق منزل بہ منزل سفر طے ہوتا رہا، جب آخری منزل آئی تو اس وقت غلام کے اونٹ پر بیٹھنے اور حضرت عمرؓ کے پیدل چلنے کی باری تھی، غلام نے عرض کیا کہ حضرت اب مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ سوار ہو جائیں اور میں پیدل چلوں مگر آپ نے فرمایا کہ نہیں، ایسا نہ کرونگا، کیوں کہ یہ خلاف عدل ہے۔ الخ''

الغرض اسی طرح سے آپ قلعہ کے سامنے پہنچے کہ غلام اونٹ پر سوار تھا اور آپ اس اونٹ کی نکیل پکڑے پیدل چل رہے تھے۔

مخالفین نے قلعہ کے اوپر سے آپ کا حلیہ کتاب سے منطبق کرنا شروع کیا چنانچہ طابق النعل بالنعل یہی حلیہ ان کی کتابوں میں لکھا تھا کہ ایسے ایسے کپڑے ہونگے اور ان کا غلام اونٹ پر سوار ہوگا اور خود اس کی نکیل پکڑے ہوئے پیدل چل رہے ہونگے، بس اہل شہر نے اس کو دیکھتے ہی قلعہ کا دروازہ کھول دیا۔ اور شہر مسلمانوں کے سپرد کر دیا۔ الخ

یہ واقعہ سیرت اور تاریخ اسلام کی کتابوں میں مذکور ہے۔ اور تمام مشائخ اور علماء حضرات اس کو بیان فرماتے ہیں۔ اور وہ یہاں بھی بقول حضرت مولانا پرتا پگڈھیؒ کے حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ نے یہی بیان فرمایا ہے اور یہی واقعہ اگلے واقعہ کی اساس ہے جو ایک عارف باللہ نے دوسرے

عارف باللہ کے بارے میں سنایا ہے۔ لہٰذا لیجئے سنئے اور پڑھئے اور ضرور پڑھئے، سنئے اور اس بے مثال تواضع پر سر دھنئے اور آخر میں بیان کا حوالہ بھی دیکھ لیجئے گا تا کہ ناظرین میں سے جس کا جی چاہے مراجعت کر سکے!

ہاں تو کیا فرماتے ہیں حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتا پگڈھی:

اب سے تقریباً چالیس سال (بلکہ پچاس سال) قبل کا واقعہ ہے۔ کہ قصبہ مئو آئمہ ضلع الہ آباد میں ایک بہت بڑا جلسہ ''احناف کانفرنس'' کے نام سے منعقد ہوا تھا، جس میں ہندوستان کے مشہور چوٹی کے علماء تشریف لائے تھے۔ مولانا عبدالشکور صاحب لکھنویؒ، مولانا ابوالوفاء صاحب شاہجہانپوریؒ، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمیؒ، اور دوسرے بہت سے علماء تشریف لائے تھے۔ جمعہ کا دن تھا۔ نماز جمعہ کی امامت حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ نے فرمائی اور جلسہ کا صدر بھی انہی کو مقرر کیا گیا۔ پہلے معذرت فرمائی اس کے بعد تشریف لائے اور کرسئ صدارت پر بیٹھنے کے بعد ارشاد فرمایا کہ اس وقت اکابر کی موجودگی میں کرسئ صدارت پر بیٹھنے کی ہمت نہ ہوتی تھی مگر امتثالاً للامر بیٹھ گیا اور پھر ایک واقعہ یاد آیا جس سے مجھے تسلی ہوگئی۔

حضرت مولانا پرتا پگڈھیؒ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ:

اس کے بعد حضرت مہتمم صاحبؒ نے حضرت عمرؓ کا مندرجہ بالا واقعہ ذکر فرمایا، پھر ارشاد فرمایا کہ آپ انصاف سے بتلائیں؟

جس وقت ان کا غلام اونٹ پر سوار ہوتا اور خود وہ نکیل پکڑ کر پیدل چلتے تھے اس وقت کیا اس غلام کے دل میں اس کا وسوسہ بھی آتا ہوگا کہ میں حضرت عمرؓ سے افضل ہوں؟ ہرگز نہیں۔ اسی طرح یہاں سمجھ لیجئے کہ میری مثال اس وقت بالکل اسی غلام جیسی ہے اور جن اکابر نے مجھے یہاں بیٹھنے کا حکم فرمایا ان کی حیثیت فاروق اعظمؓ جیسی ہے۔

اللہ اکبر! کس عظمت کی حامل تھی وہ شخصیت! اور اس گہری تواضع میں اللہ تعالیٰ نے حکیم الاسلامؒ کی ذاتِ والا کو کتنی بلندی اور رفعت بخشی تھی کہ ان کی نورانی ذات اور جگمگاتی زندگی عظمت کردار کا مظہر بن گئی تھی، تذکرہ نگار کو یاد ہے کہ حضرت حکیم الاسلامؒ ایک مرتبہ دورانِ سفر مغل سرائے (بنارس) میں مختصر وقفے کے لئے پلیٹ فارم پر جلوہ افروز ہوئے اور اہل محبت نے پروانوں کی طرح شمع فروزاں کو گھیر رکھا تھا تو ابرار و اخیار نہیں بلکہ ''اغیار'' کی زبانوں پر بے ساختہ یہ جملہ آیا کہ: ''ارے ای دیوتا ہیں'' بہرحال بات کہاں پہنچ گئی؟ وہ واقعہ تو ضرور پورا ہوا مگر بات نہیں پوری ہوئی کیوں کہ حضرت مولانا پرتا پگڈھیؒ کا بیان ہنوز باقی ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ:

سبحان اللہ! کیسی عمدہ تمثیل پیش فرمائی، اس کو سن کر تمام علماء عش عش کرنے لگے، مجھے بھی بہت پسند آئی اور اس کو برابر بیان کرتا ہوں، ان حضرات کی عجب شان تھی ان کو دیکھ کر اسلاف کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ واقعی ان حضرات کے پیش نظر محض اللہ و رسول کی رضا و خوشنودی ہوتی تھی اور ان کو آخرت کا ایسا یقین حاصل تھا کہ کسی وقت ان سے غفلت اور ذہول نہ ہوتا تھا۔(۱)

بدست خود و بقلم خود اپنے ہی کو حقیر و فقیر و ناکارہ لکھنا و کہنا ایک دوسری بات ہے لیکن علماء حقانی و مشائخ ربانی کے مجمع میں اور پھر کسی جامع کمالات ہستی کا اور وہ بھی حضرات صحابۂ کرامؓ کے حالات زندگی سے اس طرح استشہاد اور پورا پورا انطباق اور اعتراف یقیناً بے مثال ہے۔ اسی اسوۂ حسنہ کی وجہ سے حضرت حکیم الاسلامؒ کو اللہ تعالیٰ نے مقبولیت عامہ عطا فرمائی تھی، بین الاقوامی شہرت عامہ بخشی تھی اور طبقۂ خواص میں پذیرائی کا خاص امتیاز حاصل تھا۔ یہی نہیں بلکہ جس خصوصیت و خوبی کی طرف نگاہ اٹھایئے تو ''دامن دل می کشد کہ جا اینجاست'' کا مصداق ہے۔

تذکرہ نگار نے یہ بھی دیکھا ہے کہ قصبہ مئو کی عظیم درسگاہ ''دارالعلوم'' میں طلبہ کی ایک کثیر تعداد کو بخاری شریف ختم کرائی، اس میں علوم و معارف کے بیان کے ساتھ اپنا سلسلۂ سند مختلف جہات سے بیان فرمایا تو عجیب شان نمایاں تھی اور یہ درس بعد ظہر شروع فرمایا تو اذان عصر تک جاری رہا اور پوری تقریر ایک ہیئت و نشست پر پوری فرمائی۔ اللہ اکبر! اللہ رب العزت نے کتنا افاضہ فرمایا تھا اور کتنا پر انوار بنایا تھا کہ جس سے ایک عالم مستنیر تھا کہ جس کی ذات والا تبار میں علمی وقار بھی تھا اور اسلاف کے علوم و معارف کا تذکار بھی، اکابر دارالعلوم کی وراثت کا امانت دار بھی۔ حضرات صحابۂ کرامؓ کی یادگار بھی۔ اقوال زریں کا گلشن سدا بہار بھی تھا اور انوار معرفت الٰہی سے ضیاء بار بھی، شاہ ولی اللہؒ کے پیغام کا علمبردار بھی تھا۔ اور از ہر ایشیا دارالعلوم دیوبند کا تاجدار بھی، تھانویؒ رشد و ہدایت کا راز دار بھی، اور علوم کے سمندر کو ایسا سمویا و سمیٹا تھا کہ اس سے جو نکھار آیا تو سب ہی نے دیدہ و دل فرش راہ کر دیا تھا۔ ایسی ہستی کو یاد کرتے ہیں تو ماضی کے زندہ جاوید نقوش ابھر آتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی آپ پر رحمتیں ہوں اور لازوال انعامات کی بارش ہو۔

............❖............

(۱) حضرت مولانا احمد صاحب پرتاپ گڈھیؒ، روح البیان، ج ۳، ص: ۶۱ تا ۶۴

............❖............

حکیم الاسلامؒ کے معصوم سراپا کے دل آویز خطوط!

مولانا محفوظ الرحمٰن شاہین جمالی صاحبؒ
مدرسہ امداد الاسلام، میرٹھ

بیس برس پہلے مظفر نگر میں میں نے ایک ایسے بزرگ کا جلوہ دیکھا تھا جو اخلاق و کردار سے لیکر رفتار وگفتار تک ''فرشتوں کی دنیا کا انساں یا انسانوں کی دنیا کا فرشتہ'' معلوم ہوتا تھا، حضرت اقدس مولانا مفتی عبد الرحیم صاحبؒ تلمیذ رشید حضرت شیخ الہندؒ کے پاس مہنے دو مہینے میں وہ ضرور رونق افروز ہوتے تھے اور جب بھی تشریف لاتے انجانے طور پر دل مسرتوں سے لبریز ہو جاتا، آنکھوں میں جیسے کچھ چمک سی آجاتی اور طالب علمانہ حرکات وسکنات میں شوخی وشرارت کی جگہ متانت وسنجیدگی پیدا ہو جاتی اور دل چاہنے لگتا کہ انھیں چپکے چپکے پہروں دیکھتا رہوں اور حقیقت یہ ہے کہ گھنٹوں ان کا شرف دیدار حاصل رہتا پھر بھی دل و نظر کے سیر ہونے کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا، یہاں تک کہ وہ واپس تشریف لے جاتے اور میں جگر کے اس شعر کی صداقت آزمانے کے لئے تنہا رہ جاتا۔

وہ کب کے آئے اور گئے بھی نظر میں اب تک سما رہے ہیں
یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں یہ آ رہے ہیں وہ جا رہے ہیں

ملکوتی جمال کا یہ پیکر اتنا دلکش اتنا پاکیزہ اور اتنا زیب نظر تھا کہ بعد وصال بھی اس کے بزرگانہ خدوخال کا قلمی خاکہ اور اس معصوم سراپا کا عکس جمیل کاغذ کے صفحہ پر نکہت ونور اور قوس قزح بن کر بکھر جانا چاہتا ہے۔

گداز دودھیا بدن، حسنِ یوسفؑ کی طرح جلوہ فگن، متوسط قد وقامت جسمانی وروحانی ودانش کی دو گہری جھلیں آنکھوں کے حلقوں پر سیاہ سفید بھووں کی کمان، تیرگی شام میں نمود وسحر کا اعلان، چوڑی تابناک پیشانی، خدا کے حضور سربسجود رہنے کی نشانی، روشن چہرہ بدر و ہلال نہیں آفتاب و ماہتاب، چہرے کے دائرے

پر مشرع سفید داڑھی، آئینۂ جمال پر بزرگانہ جلال کی مینا کاری، سر پر عالمانہ ہیئت کے کٹے ہوئے سفید بال اور اس پر اونچی دیوار کی دوپلّی طیب کیپ گویا: وَلَهُ الْجَوَارِ الْمُنْشَئٰتُ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ: بدن پر موسم کے مطابق سرد و گرم فسٹ کلر کی شیروانی، نزاکت و نفاست کی کہانی، بیش قیمت کپڑے کا لمبا کرتہ اور گول موری کا پاجامہ، تراش و خراش اور لباس میں بزرگی کا خبر نامہ، اس قلمی خاکے کی عظیم شخصیت کو دیوبند کے عوام و خواص مہتمم صاحب اور باہر کی دنیا میں لوگ ''حکیم الاسلام'' کے بلند لقب سے پکارتے تھے وہ منھ کھولے تو لب گل سے پھول جھڑتے اور جب وہ نہیں بولتے تو صدف میں موتی پلتے تھے، ان کے لہجے کا ترنم، شملہ کی پہاڑی ندیوں کا جلترنگ اور کشمیر کے آبشاروں کی موسیقی تھی، اور بول بول کی مٹھاس قند و شکر جیسی تھی، ان کی تقریر علم و فن کی خشک زمین کے لئے برسات اور تحریر قاری کے دل پژمردہ کے واسطے آب حیات تھی، لفظ لفظ میں علم و حکمت کا گہر اور جملے جملے میں معرفت کا سمندر پوشیدہ ہوتا تھا، دو تین گھنٹے کی تقریر دلپذیر اسرار شریعت کی حکیمانہ تعبیر و تفسیر اور کمال یہ کہ ہر ایک کے لئے پر اثر و بے نظیر ہوتی تھی، ہر بات میں حکمت اور ہر حکمت میں کوئی بات پیدا کر لینے کی گرانمایہ دولت وحست ہے، پنڈت دیانند سرسوتی نے حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند کی تقریر سنکر کہا تھا کہ ان کی زبان پر سرسوتی (علم کی دیوی) بولتی ہے اور اگر وہ ان کے پوتے حکیم الاسلام کی بات سنتے تو ضرور یہ کہتے کہ ان کے شبد شبد میں سرسوتی رس گھولتی ہے۔

حکیم الاسلامؒ جسمانی روگ کے طبیب نہیں بلکہ لاعلاج روحانی مرضوں کے خاندانی حکیم تھے، آپ کے حکیمانہ کلمات نے سینکڑوں دلوں میں ایمان و یقین کا بیج بویا اور ایمان و اسلام کے ہزاروں نازک پودوں کو آب حکمت سے سیراب کر کے آپ نے تناور درخت بنایا، عقلی و نقلی شکوک و شبہات کی ہزاروں گرہیں آپ کے ناخن علم و حکمت نے آن کی آن میں کھول دی تھیں، حکمت قاسمی کی بلندیوں تک آپ کی رسائی اور ان کے علوم و معارف پر آپ کو عبور اور دسترس حاصل تھی، سننے والے جب آپ کی بات سنتے تو سر دھنتے اور مجلس سے اپنی تنگ دامانی کا گلہ لے کر اٹھتے تھے اس لئے کہ:

دامانِ نگہ تنگ و گل، حسنِ تو بسیار		گل چیں بہار تو ز داماں گلہ دارد

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ماڈرن ماحول میں آپ کی ''سائنس اور اسلام'' اور ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کی جگہ انسانی عظمت کا مسئلہ اور نئی تہذیب و تمدن کی چکا چوند میں ''آفتاب اسلام'' کا جلوہ بالکل ہمیشہ نمایاں دکھائی دیتا رہے گا۔

مجھے کچھ معتمد اہلِ علم نے بتلایا کہ ۲۵/۳۰ برس پہلے میرٹھ شہر کے اندر حکیم الاسلامؒ کی ایک ہفتے کی تقریر سے

عوام میں اتنا شدید اسلامی تاثر پیدا ہو گیا کہ ان کی تقریر پر امتناعی حکم لاگو کرنا پڑا۔

حکیم الاسلامؒ کے اندازِ خطاب، ان کے اسلوب بیان، اور تقریر کے لب ولہجہ کو نہ الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے، نہ دوسرے کی زبان میں نقل کیا جاسکتا ہے، وہ تمام عالم میں اپنے طرز کے منفرد خطیب اور شرعی اسرار و حکم بیان کرنے میں حکیم لبیب تھے۔

مذہبی گروپ اور جماعتی عصبیت سے ان کا مزاج بالکل جوڑ نہیں کھاتا تھا، وہ سیاسی پلیٹ فارم پر کسی زمانے میں مسلم لیگ کے حامی ضرور رہے، لیکن اس میدان میں بھی تعصب سے دامن بچالینا ان کی زندہ کرامت ہے، اسلامی فرقوں کے درمیان ان کی ذات اتنی معتدل، اتنی متوازن اور اتنی غیر جانب دار رہی کہ دوست دشمن سب ان کی عظمت و بلندی کے معترف تھے۔ جماعت اسلامی پر علماء دیوبند کی نکیر بلکہ سیاسی محاذ آرائی کی وجہ سے شدید تنقید وتحریر کے طویل دور میں حضرت مہتمم صاحبؒ کی شخصیت افراط وتفریط سے کبھی آلودہ نہیں رہی اور یکساں طور پر ہر حلقے میں قابل احترام بزرگ کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے رہے۔

سیاسی ذہن وشعور کو خدا ہدایت دے کہ اس نے انسانوں کو اتنے مختلف خانوں میں بانٹ دیا ہے کہ ان کا ایک انسانی شرافت اور صالح قدروں کے پیکر میں سمٹ آنا ایک مشکل اور دشوار کام بن گیا ہے، تاہم حضرت مہتمم صاحبؒ کی شخصیت مستثنیات میں سے ہے کہ سیاسی دائرہ بندیوں میں بھی آپ اپنی علیحدہ شان اپنا منفرد وقار قائم رکھنے میں کامیاب رہے اور کسی سیاسی جماعت کو آپ کے قول وفعل سے کبھی کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی۔

جون ۱۹۷۵ء تا ۱۹۷۷ء ایمر جنسی کے تاریک دور میں فیملی پلاننگ کے مسئلے نے جہاں عوام کو جھنجھوڑ رکھا تھا، وہیں علماء اس کے جواز وعدم جواز میں دو انتہائی رخ پہ جا رہے تھے، عین اس وقت آپ نے اس مسئلہ کو اجتہادی مسئلہ قرار دیکر اہل علم ودانش کے لئے غور وفکر کی راہ کھول دی تھی، اور اب آئندہ جب بھی اس مسئلہ پر قطعی فیصلہ ہوگا اس میں مہتمم صاحبؒ کے فکر وخیال کی روشنی ضرور پائی جائیگی۔

حضرت مہتمم صاحبؒ کے گنگا جمنی مزاج نے دارالعلوم دیوبند کے مسلک اعتدال اور ساری دنیا میں اسکے بزرگوں کی قابل تقلید مثال کو استحکام بخشا ہے اور دلوں کی گہرائیوں میں اسکے واسطے جگہ بنائی ہے اب آپ ہی کی شخصیت پندرہویں صدی کے آغاز اور چودھویں صدی کے خاتمہ پر عالمِ اسلام کے لئے فکری قیادت فراہم کر رہی تھی، کاش اس تاریخ ساز شخصیت کو سارے عالمِ انسانی کی عمریں لگ جاتیں، اور وہ صدی درصدی رہنمائی کے ہر موڑ پر روشنی بکھیرنے کے لئے موجود رہتے۔

حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ دارالعلوم دیوبند کے صرف مہتمم ہی نہیں بلکہ فتنوں کے سیلاب میں

ایک ایسی مضبوط چٹان تھے جس سے ٹکرا کر تمام دھارے خود ہی اپنا رخ پھیر لینے پر مجبور تھے لیکن جس دن سے یہ پہاڑ ہل گیا ہے سیلاب کا زور تصورات کے بہت سے محلوں کو تنکوں کی طرح بہائے لئے جا رہا ہے۔

ہمیں اردو ادب کی تاریخ سے شکایت ہے کہ کم وبیش ڈیڑھ سو کتابوں کا یہ عظیم مصنف آج بھی ادب کی دنیا میں غیر معروف اور تاریخ ادب کے صفحات میں گمنام ہے، حالانکہ اس عظیم صاحب قلم اور صاحب طرز ادیب کو اس کی خدمات پر اردو ادب کا بلند مقام ملنا چاہئے تھا، ہم یہ تو مان سکتے ہیں کہ حضرت حکیم الاسلامؒ کے قلم میں شبلی کا زور بیان اور ابوالکلام آزاد کی شوکت الفاظ یا عبدالماجد دریا آبادی کی زبان نہیں مگر ہم یہ تسلیم نہیں کر سکتے کہ اردو ادب کے لئے ان کی خدمات کسی دوسرے مصنف سے کسی درجہ میں کم ہیں ان کی آنکھ کی کہانی خود ان کی زبانی اردو شعر وادب کا نقش لا ثانی ہے۔

میرے نزدیک دارالعلوم دیوبند اور حضرت مہتمم صاحبؒ ایک دوسرے کا صحیح تعارف ہیں، اگر کوئی مہتمم صاحبؒ کو جاننا چاہے تو بس اس کے سامنے دارالعلوم کا آئینہ رکھ دیجئے، مہتمم صاحبؒ کی علمی، سیاسی، فکری اور اخلاقی زندگی کا ہر ہر گوشہ چمک اٹھے گا اور اگر کسی کو دارالعلوم کے بارے میں معلومات حاصل کرنی ہوں تو اسے مہتمم صاحب کا آئینہ دکھایئے کہ اس میں دارالعلوم کے علوم وفن کی پوری کائنات تابناک نظر آئے گی۔

مہتمم صاحبؒ اپنی نرم پالیسی اور شان صدیقی کی بناء پر دارالعلوم کے دل کی دھڑکن تھے، عام طور پر کہا جاتا ہے کہ انھوں نے آج تک اپنے قلم سے کسی ادنیٰ ملازم کو بھی برخاست نہیں کیا، ان کی اسی ادا پر طلبہ، اساتذہ اور عملہ سب فریفتہ وگرویدہ تھے، اور یہی چیز پوری دنیا میں دارالعلوم کو بحیثیت ادارہ ایک مثالی مہتمم کی ناقابل فراموش خدمات سے ممتاز کرتی ہے جس کی دوسری کوئی مثال مشکل ہی سے کہیں مل پائے گی۔

میں نے حضرت مہتمم صاحبؒ سے مشکوٰۃ شریف پڑھی ہے اور مجھے ذاتی طور پر تجربہ ہے کہ مہتمم صاحبؒ چھوٹوں پر شفقت اور ہر ایک کے لئے رافت ورحمت کا مجسمہ تھے، ابھی کوئی چار سال پہلے کی بات ہے کہ میں نے اپنے لڑکے محمود الرحمٰن سلمہٗ کی پیدائش کی ایک تقریب میں حضرت کی شرکت کو ضروری سمجھ کر خدمت میں حاضری دی، مدعا عرض کیا منظور ری عطا ہوگئی، پھر کسی ضروری سفر کی مجبوری سے شرکت غیر یقینی ہوگئی تو آپ نے مدرسہ اصغریہ میں مجھے اس کی اطلاع کرائی پھر سفر سے واپسی پر مجھے طلب فرمایا اور خود ایک تاریخ دے کر پچھلے وعدے کی مکمل تلافی فرمادی۔

حضرت مولانا عبدالرحیمؒ کے ساتھ میں دارالعلوم میں داخل ہونے سے پہلے بارہا حاضر ہوا، اور طیب منزل

کے ملاقاتی کمرے میں جس کی چاروں دیواروں پر آویزاں ملکی وغیر ملکی سیکڑوں سپاس ناموں کے فریم حضرت مہتمم صاحبؒ کی عالمی مقبولیت کا پتہ دیتے تھے۔ گھنٹوں ان سے شرف ملاقات حاصل رہا، پھر بھی نگاہ کبھی آسودہ نہیں ہوئی اور دل اندر سے یہی کہتا رہا یہ حضرت مہتمم صاحبؒ کی شخصیت سپاس ناموں کے فریم میں نہیں دل کے آئینہ خانے میں سجانے کے لائق ہے۔

حضرت مہتمم صاحبؒ حیات کی ۸۸؍منزلیں طے کر چکے تھے، لیکن ضعف پیری اور نقاہت جسمانی کے باوجودِ تسلسل سفر کا یہ عالم تھا کہ دیوبند میں قیام کا وقفہ ہمیشہ سفر سے مختصر ہی رہتا تھا۔

زندگی خود ایک سفر ہے لیکن ان کی منزل اسلام اور دارالعلوم کے عشق کی معراج تھی اور یقین ہے کہ اس کے صلے میں ان کو جو زندگی ملی ہے وہ موت کے ہاتھوں محفوظ ہے، عارف شیرازی نے سچ کہا ہے:

ہرگز نہ میرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

............❖............

حکیم الاسلامؒ کا سلسلۂ بیعت وارشاد

مولانا عبدالرؤف صاحب عالیؒ
سابق پیشکار دارالعلوم وقف دیوبند

حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحب کی شخصیت برصغیر میں ملت اسلامیہ کی کم از کم چھ دہائیوں پر محیط ہے اس لیے بیسویں صدی میں دنیائے اسلام کی نامور شخصیتوں کی فہرست حکیم الاسلامؒ کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی لیکن ایک اور ہی زاویئے سے دیکھئے تو اتنی متنوع، ہمہ جہت، اعلیٰ اخلاق اور جامع صفات شخصیت کی مثال ماضیٔ قریب میں دور دور تک نہیں پیش کی جاسکتی۔

رفتید و لے نہ از دل ما

حضرت حکیم الاسلامؒ کی ذات والا صفات کو دنیا نے پہلے پہل نبیرۂ قاسم علیہ الرحمہ کی حیثیت سے جانا۔ پھر وہ اک فاضل دیوبند اور اک عالم کی حیثیت میں سامنے آئے، پھر وہ اک مدرس کے منصب پر فائز ہوئے پھر انھیں مہتمم کا اعزاز ملا۔ اسی کے ساتھ ساتھ وہ اک مقرر اور اک خطیب کی شخصیت کی حیثیت سے ملک بھر میں علمی اور دینی حلقوں میں ابھرے، اس طرح اک عالم، اک معلم، اک مقرر، اک خطیب، اک ادیب، اک مصنف، اک منتظم، اک مدبر، اک مصلح، اک صوفی اور اک مرشد کی شان اس اک ذات میں اکٹھی ہوگئیں، غرض علم وفضل اور دین وملت کا کونسا افق ایسا باقی رہ گیا تھا جہاں وہ سدا بہار شخصیت موجود نہ رہی ہو، بلاشبہ وہ اک دبستان علم، اک بزم ہدایت، اک چشمۂ اخلاق، اک گلدستۂ فضائل سبھی کچھ تھے، تاریخ کے جس سنگِ میل پر ان کی ذات کھڑی تھی اس لحاظ سے وہ خود اک عہد بھی تھے اور اک عہد کا آخری دروازہ بھی، وہ خود اک تاریخ تھے اور اک تاریخ کا آخری باب بھی، وہ خود اک انجمن بھی تھے اور اک انجمن کی آخری یادگار بھی، وہ نقوش اسلاف کے نقیب، پچھلی اک صدی کی زندہ جاوید اسلامی شخصیتوں کا عکس جمیل اور امت اسلامیہ

کے اک فرد فرید تھے۔اس ایک صدی میں برصغیر میں دینی، علمی اور ملی خدمات کے اعتبار سے جو قد آور شخصیتیں گذری ہیں حکیم الاسلامؒ اسی صفت کی عظیم شخصیت تھی اور وہ جتنی عظیم تھی اتنی منکسر المزاج اور حلیم الطبع تھی۔

حسب ونسب، علم وفضل اور خدمت دین کے اعتبار سے حکیم الاسلامؒ کا مقام جماعت دیوبند کی اس تیسری پشت میں سب سے اونچا تھا وہ ان ساری تابناک روایات کے امین تھے جو دیوبندی مکتبِ فکر کے مؤسس حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم النانوتویؒ قدس سرہ العزیز نے قائم کی تھیں، وہ ان تمام اقدار کے پاسبان اور محافظ تھے جو دیوبندیت سے وابستہ ہیں ''سخن دلنواز اور جاں پُرسوز'' کاروانِ دیوبند کے اس امیر کا طرۂ امتیاز تھے،اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ قافلۂ دیوبند کی سربراہی کے منصب پر ایک سے ایک بے بدل شخصیت فائز رہی ہے لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ حکیم الاسلامؒ کی ذات جن گونا گوں صفات کی حامل اور مختلف خوبیوں کی جامع تھی اس کی مثال تاریخ دیوبند کے نہ ماضی میں موجود ہے نہ مستقبل میں متوقع۔

ان کی تعلیم وتربیت اسی بزرگانہ ماحول اور قدیم فضا میں ہوئی تھی جو بزرگان دیوبند کی پروردہ تھی۔علوم عصری کے کسی استاد کے سامنے انھوں نے زانوئے تلمذ تہہ نہیں کیا تھا۔ان کی ساخت وپرداخت میں جدید تعلیم وتربیت کا کوئی ادنیٰ دخل نہ تھا لیکن اپنی فکری پختگی، علمی برتری اور ذہنی بلندی کے دوش بدوش قلبی وسعت، قاسمی نسبت اور شخصی عظمت کی بناپر وہ ہر حلقے میں مقبول ومحبوب تھے۔خواہ وہ علماءِ قدیم کی انجمن ہو یا دانشوران وقت کا اجتماع ہو،خصوصی مسائل پر کوئی مجلس ہو یا عوامی انداز کا کوئی جلسہ ہو، خالص دینی اور دعوتی موضوع پر کوئی اجلاس ہو یا معاشرتی اور ملّی مسائل پر کوئی سیمینار ہو۔

ان کی خوش گفتاری اور شیریں بیانی، لہجے کی دلربائی اور نکتہ آفرینی، مضمون کی فراوانی اور موضوع کی رعنائی مجمع کو لوٹ لیتی تھی، ان کا اپنا حلقہ سچ پوچھئے تو وادیٔ گنگا وجمنا اور کاویری سے برہمپتر کے ڈیلٹا تک یا پنجاب وسندھ کے میدانوں سے کابل وکاشغر تک محدود نہ تھا۔جماعت دیوبند کے وہ پہلے صدر نشیں تھے جس کی زلفوں کے اسیر دنیا کے ہر براعظم میں موجود ہیں، دنیا کے جس قابل ذکر حصّے میں بھی اردو داں مسلم آبادی موجود ہے وہاں انھوں نے مؤثر اور دل نشیں مواعظ سے بے شمار دلوں کی روحانی بستیاں آباد کیں۔ ہر اہم ملک میں انھوں نے جا جا کر خطاب فرمایا وہاں ان کے دلآویز خطابات کے ٹیپ لوگوں کے پاس موجود ہیں جو انھیں جان ودل کی طرح عزیز ہیں۔

برصغیر کا شاید ہی کوئی گوشہ ایسا باقی رہ گیا ہو جہاں حضرت حکیم الاسلامؒ کے قدم نہ پہنچے ہوں، وہ ہر مجلس کے چراغ اور ہر انجمن کے صدر تھے۔لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کی ہمہ جہت شخصیت ان کی شیوہ بیانی اور منصبی

ذمے داریوں کے پردے میں چھپی ہوئی تھی، بالخصوص ان کی شخصیت کا باطنی اور عرفانی رخ ان کے دوسرے اوصاف میں مستور ہو کر رہ گیا تھا۔

جب کہ حقیقت یہ ہے کہ علم ظاہر و باطن کی یک رنگی اور شریعت و طریقت کی ہم آہنگی ہی علماء دیوبند کا خاص وصف ہے اور دیوبند کے ہر فرد میں اس خوشگوار امتزاج کا اثر موجود ہے، البتہ ذوقی اور طبعی فرق کے لحاظ سے کسی فرد پر طریقت کا رنگ غالب ہوجاتا ہے اور کسی پر شریعت کی چھاپ نمایاں ہوتی ہے۔ چناں چہ حضرت حکیم الاسلامؒ نے دوآبہ کے جس خاندان میں آنکھ کھولی وہ کئی پشت سے علم و حکمت اور معرفت و سلوک کا شہسوار تھا، اس کے گردوپیش کی فضا علم ظاہر سے مزین اور سوز باطن سے روشن تھی، یہ ہی وہ ماحول تھا جہاں حضرت سید احمد شہیدؒ کو مریدان با صفا اور مجاہدین جانفروش کی کھیپ کی کھیپ ملی تھی، اسی علاقے میں ان بزرگانِ وقت کی خانقاہیں قائم تھیں جن کے نفس گرم کی تائید سے جماعت دیوبند وجود پذیر ہوئی جو علوم ظاہر و باطن کے لیے آراستہ ہونے کے ساتھ ساتھ اصلاح و تبلیغ کے تقاضوں کی تکمیل اور ملکی و ملی حقوق کی ادائیگی میں ہمیشہ پیش پیش رہی۔

حضرت حکیم الاسلامؒ پر اپنے بچپن سے بزرگوں اور اکابر کی خصوصی توجہات تھیں۔ ان کے اساتذہ شروع سے اہل دل اور صاحب باطن حضرات رہے، نسبتِ قاسمی کی رعایت سے ان بزرگوں نے موصوف کی علمی اور ظاہری تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ تزکیہ و اصلاح قلب کا بھی پورا پورا خیال رکھا۔

دیوبندیت کی عملی تشکیل کے بانی اعظم مولانا قاسم نانوتویؒ کے نسبی تعلق نے حضرت حکیم الاسلامؒ کو تمام اکابرِ دیوبند اور فیض یافتگان قاسمی کا مطمح نظر اور مرجع محبت بنادیا تھا، ان کی تعلیم و تربیت کا نظم مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانیؒ مہتمم سادس دارالعلوم دیوبند نے جس شفقت و اہتمام کے ساتھ کیا وہ بزرگانہ تربیت کی بہترین مثال ہے اور اس کے طبعی اور لازمی نتیجے کے طور پر نبیرۂ حضرت حکیم الاسلامؒ کو تاریخ دیوبند میں وہ مقام ملا جو منصب اہتمام دارالعلوم پر فائز ہونے والی کسی دوسری شخصیت کو نہ میسر آیا اور نہ آئے گا۔

تدریس، تالیف، تقریر اور منصبی ذمے داریوں کے ساتھ ساتھ حضرت حکیم الاسلامؒ کا اصلاحی تعلق حضرت شیخ الہندؒ سے قائم ہوا جو آپ کے استاد بھی تھے۔ تربیتِ سلوک کے ابتدائی منازل اپنے مشفق استاذ اور مرشد اول کے زیر سایہ طے کئے۔ حضرت شیخ الہندؒ کی رحلت کے بعد مجدد ملت حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی طرف رجوع کیا جو درحقیقت دیوبند کے سرخیل بھی تھے اور اپنے مخصوص انداز تربیت کے لحاظ سے شریعت و طریقت کے بہترین جامع بھی۔

تھانہ بھون کی خانقاہ ظاہر و باطن کے معقول امتزاج اور علم و عمل کے دلآویز سنگم کا بہترین نمونہ

تھی، مرشد تھانوی حکیم الامت کا سر مدرسہ کی دستار فضیلت اور جسم خانقاہ کے خرقہ مشیخیت سے اس طرح آراستہ تھا کہ خرقہ ودستار ایک دوسرے کا جز محسوس ہوتے تھے، غالبًا انہی دونوں کی وابستگی اور لزوم نے مرشد تھانوی کو صحیح معنی میں حکیم الامت بنایا تھا۔

شریعت وطریقت کی جامعیت کے جس دیوبندی طرز فکر کو مرشد تھانوی نے اپنے مخصوص و مستحکم پیمانے میں ڈھالا تھا۔ اور تربیت سلوک کا جو منفرد انداز اپنایا تھا، حضرت حکیم الاسلامؒ کو اس سے طبعی مناسبت تھی۔ وہ سیاست کے خارزار ہنگاموں کی دنیا سے طبعًا بیزار تھے۔ اور یہ ہی تھانوی طریق تربیت کا بنیادی جز تھا۔ استفاضہ اور استفادہ کا یہ سفر انھوں نے اپنے ہم درس وہم جماعت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ مفتی اعظم پاکستان کی معیت ورفاقت میں شروع کیا، یہ انہی دونوں حضرات کی خصوصیت ہے کہ یہ مکتب سے لیکر مرشد کے آستانہ تک ایک دوسرے کے شریک ورفیق رہے، دونوں ہی نے یکے بعد دیگرے سلوک کی منزلیں طے کرنی شروع کیں تو باہم ایک دوسرے کے لیے باعث رشک بنے، حتیٰ کہ دونوں کو مرشد تھانوی نے خلافت سے سرفراز کیا۔ اور دونوں ہی علم وہدایت کے آفتاب وماہتاب بن کر چمکے، ایک کی تابانی سے مطلع پاکستان چمکا اور دوسرے کے انوارِ قلب ونظر سے برصغیر افق تا افق جگمگایا۔

رشد وہدایت کا یہ سلسلہ ۱۹۴۷ء کے بعد زیادہ فروغ پذیر ہوا۔ منصب اہتمام کی گوناگوں مصروفیتوں کی بنا پر مستقل خانقاہی نظم قائم نہ ہونے کے باوجود حضرت حکیم الاسلامؒ کی طرف لوگوں کا رجوع ہوا۔

چہرہ کی دل کشی، نگاہوں کی پاکیزگی اور پیشانی کا نور دیکھنے والے کو پہلی ہی نظر میں عقیدت واحترام کی آنکھیں بچھانے پر مجبور کر دیتا تھا، ان کی مجلس ولیوں کی مجلس کا اعلیٰ ترین نمونہ تھی، اس میں کسی کی غیبت والزام تراشی کا گذر نہ تھا، علم کے نادر نکات بیان ہوتے، شریعت کے لطیف دقائق اور تصوف کے دلپذیر حقائق کی تشریح ہوتی۔ سلف کے مؤثر اور عبرت انگیز تذکرے چھڑتے اور بصائر ومعارف کا اک دریا موجزن ہوتا۔

حکیم الاسلامؒ کی زبان سے موتی جھڑتے، یوں معلوم ہوتا کہ ایک آبشار علم ہے جو فکر ونظر کو سیراب اور قلب وذہن کو شاداب کر رہا ہے۔ حضرت حکیم الاسلامؒ کے متوسلین میں دیہات کے سیدھے سادھے کسانوں سے لیکر یونیورسٹیوں کے لیکچرار اور وزراء حکومت تک شامل ہیں۔

بیعت کرنے والوں کو نہایت خاموشی اور سادگی سے اپنے مرشد کے طریق پر بیعت فرماتے اس کے بعد دوازدہ تسبیحات کی تلقین، فرائض کی پابندی، اوامر پر لزوم اور نواہی سے احتراز کی تاکید فرماتے، اختلافات سے بچنے، ہر معاملے میں اعتدال برتنے، متعلقہ ذمہ داریوں کو حتی الامکان ادا کرنے کی ہدایت فرماتے، دوسروں کے ساتھ حسن ظن سے کام لینے، طبقاتی اور مسلکی نزاعات سے بچنے، امت مسلمہ کے

اتحاد واتفاق کو ترجیح اور امت کی فلاح و بہبودی میں دلچسپی لینے کی ترغیب دیتے۔ بیعت وارشاد کے رسمی طریق کو بھی لازمی قرار نہیں دیتے تھے، بیشمار لوگ جو بیعت کے لیے زیارت کی خواہش اور بالمشافہ ملاقات کی آرزو رکھنے کے باوجود حاضری کی سکت اور وقت کی گنجائش نہیں رکھتے تھے، ان کو بذریعہ مراسلت بیعت فرمالیتے، مریدین اپنے احوال بذریعہ مکاتبت پیش کر کے اصلاح سے مستفیض ہوتے۔

نرم خوئی اور نرم گوئی ایک وصف تھا جو حضرت حکیم الاسلامؒ کی رفتار گفتار اور کردار کا جز ولاینفک تھا۔ گھر سے لے کر باہر تک اور نظم وانصرام سے لے کر بیعت وارشاد تک اس وصف کی چھاپ ہر چیز میں نمایاں تھی۔

حلم وبردباری اور اکرام مسلم واحترام آدمیت کے وعظ بہت کہے سنے جارہے ہیں اور ''اکرام مسلم'' کی اصطلاح تو اس دور کی اک مسلمہ دینی اصطلاح قرار پاگئی ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اسی اصطلاح کا انطباق بھی اک خاص دائرہ کی حد تک ہی کیا جاسکتا ہے۔ اکرام مسلم پر عمل کی صحیح مثال حضرت حکیم الاسلامؒ کے زبان وقلم کے سوا کسی بڑے سے بڑی دینی شخصیت کے یہاں بھی دیکھنے میں نہیں آئی۔

ماضی قریب کے گزشتہ چند سال جو دیوبند اور شاید برصغیر کے علماء کی تاریخ کا سب سے المناک باب کہے جاسکتے ہیں اس بات کا زندہ ثبوت ہیں کہ اس جاں گسل اور صبر آزما دور میں بھی آپؒ ہی علمائے دیوبند کے ''منصور وقت'' نکلے، زندگی کے اس آخری دور میں جب خانقاہوں نے دہشت زدگی کے عالم میں ہونٹ سی لیے تھے اور علمائے روزگار عاجزی، خاکساری، اور خدا ترسی کی قبائیں پہن کر اپنے زبان وقلم سے آپؒ کے بے داغ سینے پر پتھر برسا رہے تھے اس وقت بھی آپؒ نے کوئی سقیم لفظ قلم سے لکھا نہ زبان سے نکالا۔ اور ارادتمندوں کے اس اصرار بے حد پر کہ ''کچھ تو کہئے کہ لوگ کہتے ہیں'' زبان سے صرف یہ فقرہ ادا کیا جسے تصوف کا مغز، ولایت کا حاصل اور انسانیت کا جوہر کہا جاسکتا ہے کہ:

''میں نے اپنے لیے صبر، سکوت اور استغناء کو پسند کرلیا ہے۔''

بلاشبہ یہ جملہ آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے اور اسے قطبیت کا سرمایہ کہا جاسکتا ہے۔

آپ کا حلقۂ ارشاد وبیعت ہند وپاک، بنگلہ دیش، ایران، برما، ممالک عربیہ، یورپ، افریقہ اور امریکہ تک پھیلا ہوا ہے۔

یہ تأثرات محبّ مکرم جناب سید ازہر شاہ قیصر کی فرمائش پر سپرد قلم ہیں، ورنہ حضرت حکیم الاسلامؒ کے روحانی اور عرفانی مقام کی تشریح اور اس کا تعارف کسی صاحبِ دل اور معارف آگاہ اہل قلم ہی کا حق ہے جو امید ہے کہ کسی وقت کسی باتوفیق قلم سے ضرور منصۂ شہود پر آئے گا۔ وباللہ التوفیق۔

............❖............

دینی دعوت کے قرآنی اصول

ایک شاہکار تصنیف

مولانا محمد طاہر مدنی

جامعۃ الفلاح، اعظم گڑھ

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب علیہ الرحمہ کی شخصیت جامع کمالات تھی۔ علم و فضل، زہد و تقویٰ، تحقیق و تصنیف، نظم و انتظام، تدریس و تربیت اور دعوت و ارشاد، گوناں گو خصوصیات آپ کی ذات گرامی میں مجتمع تھیں۔ دار العلوم جیسے عالمگیر شہرت کے حامل ادارہ اہتمام کی ذمہ داری اور کثرت اسفار کے باوجود دلائل کی قوت، استدلال کی باریکی، اسلوب کی دلکشی اور مربوط انداز بیان آپ کی تصنیفات کا امتیازی وصف ہے۔

اس مقالہ میں آپ کی کتاب ''دینی دعوت کے قرآنی اصول'' کا تعارف پیش نظر ہے۔ یہ کتاب دعوت اسلامی کی اہمیت اور اس کے اصول و آداب پر ایک بے نظیر اور شاہکار تصنیف ہے جس میں صحیح معنوں میں سمندر کو کوزے میں سمیٹ دیا گیا ہے۔ یہ کتاب ابتداء میں ایک مقالہ کی شکل میں تھی اور بعد میں مصنف نے نظر ثانی کے بعد کافی اضافہ کر دیا۔

ایڈیشن

میرے پیش نظر جو ایڈیشن ہے اسے ''کتب خانہ رحیمیہ، دیوبند'' نے ۲۰۰۴ء میں بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے۔ ۱۳۶ صفحات پر یہ ایڈیشن مشتمل ہے۔ آغاز میں حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی دامت برکاتہم، مہتمم دار العلوم وقف دیوبند کی تقریظ ہے جس میں بجا طور پر انہوں نے اس کتاب کے بارے میں یہ لکھا ہے:

''یہ کتاب ایسا متن ہے جو حسب ظروف و احوال دنیا کے تمام ملکوں، تمام قوموں اور تمام ادیان و ملل

کے سامنے مؤثر ترین اسالیب پر مشتمل ابلاغ دین کی انشاءاللہ ایک مکمل راہ ثابت ہوگی۔

مباحث

تمہید کے علاوہ کتاب میں نظام دعوت کے چار ارکان: دعوت، داعی، مدعو اور مدعوالیہ پر مبسوط گفتگو ہے۔مصنف علیہ الرحمہ نے آیت کریمہ اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَ جَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ کوکتاب کی بنیاد بنایا ہے اوراس آیت کریمہ سے اپنی دقت استدلال، ژرف نگاہی اور علوم شریعت پر دسترس کی بدولت دعوت وتبلیغ کا ایک مکمل پروگرام اور بنیادی دستور العمل مرتب فرمادیا ہے جو ہر دور میں داعیان اسلام کے لئے راہ نمائی کرتا رہے گا۔حکیم الاسلامؒ کی علمی بصیرت کا اندازہ اس امر سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اس آیت کریمہ کی روشنی میں ۲۷/اصول وضوابط دعوت کا استنباط کیا ہے۔

تصنیف کا محرک

مصنف علیہ الرحمہ نے اپنا مقصد تصنیف ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ:''اس تصنیف یا دعوتی فکر کے خاکہ کا مقصد محض علمی حد تک ہی نظام دعوت پیش کر دینا نہیں جو کاغذ اور قلم یا زبان ذہنی سطح سے آگے نہ بڑھ سکے بلکہ حقیقی جذبہ یہ ہے کہ ان اصول پر داعیوں کی ایک جماعت تیار ہو جو قرن اول کے اندر سے غیروں کو اسلام کی دعوت دی اور علمی بصیرت کے ساتھ اقوام عالم کو قرآنی مقاصد سے روشناس کرائے جسے افسوس ہے کہ امت نے تقریباً اس طرح بھلا دیا ہے کہ گویا وہ اسلامی زندگی کا کوئی موضوع ہی نہیں ہے اور اس طرح آج اسلامی امت اپنے فکر وعمل میں بجائے اقدام وہجوم کے محض دفاعی قوم بن کر رہ گئی ہے۔دراں حالیکہ اس امت کا تمام تر آغاز وانجام اقدامی دعوت اور ہجوم کے ساتھ آگے بڑھ کر دنیا کو اسلام سے روشناس کرانا تھا، تاکہ اسلامی برادری ہر دور اور ہر قرن میں وسیع سے وسیع تر ہوتی رہے اور امر بالمعروف کا نظام عالمگیر ہوجائے۔(۱)

تبلیغ اسلام کا مفہوم

تبلیغ اسلام کا مفہوم مصنف علیہ الرحمہ نے بہت واضح الفاظ میں یہ بیان فرمایا ہے کہ اقوام عالم تک اسلام کا پیغام پہونچانا اور غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دینا تبلیغ اسلام ہے۔امت کی اندرونی اصلاح کی

کوشش تذکیر و اصلاح ہے۔ چنانچہ رقم طراز ہیں:

''تبلیغ اسلام کے معنی پشتینی مسلمانوں کو عباداتی رنگ کے کچھ احکام پہنچا دینے اور انہیں وابستہ کر لینے کے نہیں ہیں کہ جس کے بعد یہ سمجھ لیا جائے کہ فریضۂ تبلیغ ادا ہو گیا یا ارباب تبلیغ فرائض دعوت سے سبکدوش ہو گئے۔ مجھے اس انداز کی کسی دعوت خاص کی ضرورت سے اگر چہ انکار نہیں لیکن اسے فریضہ تبلیغ سے سبکدوشی سمجھ لیا جانا قرآن کے اصول و تبلیغ کی روشنی میں یقیناً صحیح نہیں قرار دیا جا سکتا۔ یہ جزوی تبلیغ، تذکیر و اصلاح وغیرہ کے عنوانات سے یاد کی جا سکتی ہے مگر عرف شریعت کے لحاظ سے اسے تبلیغ نہیں کہا جا سکتا اور توسعاً اگر کہا بھی جائے تو زیادہ سے زیادہ تبلیغ احکام کہا جا سکتا ہے (بشرطیکہ احکام و مسائل پہنچائے جائیں) تبلیغ اسلام نہیں کہا جا سکتا کیوں کہ عرفِ شریعت میں تبلیغ درحقیقت اسلام پہونچانے اور اسلامی برادری کے وسیع کرنے کو کہا گیا ہے۔ اس لئے تبلیغ اپنے حقیقی معنی کے لحاظ سے اسلام کا پیغام پہونچانے کا نام ہے۔(۲)

انسانی سعادت کی بنیاد

قرآن و احادیث کی روشنی میں مصنف علیہ الرحمہ سے انسانی سعادت و کامیابی کی بنیاد دو چیزوں، صلاح و اصلاح کو قرار دیا ہے یعنی انسان خود صالح بنے اور دوسروں کو صالح بنانے کی سعی و جہد کرے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے انسانی سعادت کا دارومدار دو چیزوں پر ہے۔ صلاح اور اصلاح یعنی خود صالح بننا اور دوسروں کو صالح بنانا یا خود کمال پیدا کر کے دوسروں کو باکمال کر دینا جس کا حاصل یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات میں محض لازمی اور ذاتی نفع پر قناعت نہیں کی گئی ہے بلکہ ان کو متعدی بنایا گیا ہے کہ ایک سے دوسرے تک پہونچے۔(۳)

دعوتی پروگرام کی اجمالی تعیین قرآن سے

دعوت کی اہمیت اور آداب اور اس کے مقامات کی تعیین مصنف نے آیت کریمہ اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ (النحل) سے کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اس آیت میں دعوتی پروگرام پھر دعوت الی اللہ کے انواع و اقسام اور ان کے رنگ ڈھنگ اور پھر دعوت دہندوں کے مخصوص احوال اور اوصاف پر خصوصی اور گہری روشنی ڈالی ہے اور ضمنی طور پر مدعوین کے خاص اوصاف کی طرف بھی کچھ ارشاد فرمایا ہے جس کا اجمالی خاکہ یہ ہے کہ:

۱- دعوتی پروگرام کی خوبی یہ ہے کہ اس میں مدعوین تک پہونچنے کی صلاحیت ہو۔

۲- دعوت کی خوبی یہ ہے کہ وہ مدعو اور مخاطب کے مناسب حال ہو۔
۳- داعی کی خوبی یہ ہے کہ اس کا علمی اور اخلاقی معیار بلند ہو۔
۴- مدعو کی خوبی یہ ہے کہ اس میں قبول کا جذبہ موج زن ہو۔
انہی چہار گانہ مقاصد کی تفصیلات پورے مالہٗ و ماعلیہ کے ساتھ اس آیت دعوت میں بیان فرمائی گئی۔''(۴)

مدعوالیہ یعنی دعوتی پروگرام

مدعوالیہ کی وضاحت کرتے ہوئے مصنف نے یہ ثابت کیا کہ قابل تبلیغ چیز صرف علمِ شرعی ہے جو اللہ کی جانب سے نازل کردہ ہے اور جسے آیت کریمہ میں ''سبیل رب'' سے تعبیر کیا ہے۔ اسے خالص شکل میں پیش کرنا لازم ہے۔ اختراعات و محدثات اور بدعات کی تبلیغ جائز نہیں ہے۔ اسی طرح تبلیغ میں یک گونہ سادگی اور بے تکلفی ہونی چاہئے اور تکلف کی کوئی حاجت نہیں ہے۔

قُلْ مَا اَسْئَلُكُمْ عَلَيهِ مِنْ اَجْرٍ وَّ مَا اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْن اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِيْنَ.

ترجمہ: اے رسول آپ کہہ دیجئے کہ میں تم سے اس قرآن کی تبلیغ پر نہ کچھ معاوضہ چاہتا ہوں اور نہ بناوٹ کرنے والوں میں سے ہوں۔ یہ (قرآن) تو سارے عالم کے لئے ایک ذکر ہے۔

مصنف نے دعوتی نقطۂ نظر سے دیگر مذاہب کا جائزہ لیا اور یہ ثابت کیا ہے کہ وہ تبلیغی مذاہب نہیں ہو سکتے۔ صرف اسلام ہی تبلیغی مذہب ہے کیوں کہ وہ محفوظ ہے اور آقا کی تعلیمات پر مشتمل ہے۔ اسلامی دعوت عالمیت کی شان رکھتی ہے۔

انواع دعوت

آیت دعوت کی روشنی میں مصنف نے انواع دعوت کی تعیین کی ہے اور حکمت، موعظت اور مجادلت پر بڑی عالمانہ گفتگو فرمائی ہے پھر حکمت علمی و حکمت عملی، موعظت علمی و موعظت عملی اور مجادلت علمی و مجادلت عملی کی تشریح مثالوں کے ساتھ کی ہے پھر دعوت میں مخاطب کے مزاج و ذہنیت کی رعایت کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

''حق تعالیٰ کو محض تبلیغ ہی مطلوب نہیں بلکہ اس کے ساتھ مخاطبوں کے احوال اور طبائع کی رعایت بھی منظور ہے جس کا منشا شفقت ہے۔''(۵)

اس کے بعد متنوع مضامین دعوت، تجدد دعوت، ترک غلظت وشدت، تاخیر دعوت، اغماض ومسامحت اورمخاطبوں کے ساتھ شفقت ورحمت کے متنوع عناوین کے تحت دعوتی کلام کی فصاحت و بلاغت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اوران کی اہمیت واضح کی ہے۔

دعوت کومؤثر بنانے کی تدابیر

دعوت کومؤثر بنانے کے لئے کارگر تدابیر کواختیار کرنے کی بڑی اہمیت ہے اس لئے مصنف علیہ الرحمہ نے ان تمام مؤثر تدابیر کواختیار کرنے کی تاکید کی ہے جن سے تبلیغ کا عمل موثر تدابیر کواختیار کرنے کی تاکید کی ہے جن سے تبلیغ کا عمل موثر ہواور مخاطبین کے دل کھنچ جائیں۔ مثلاً فراہمی قوت وشوکت جامعیت و اجتماعیت اور تنظیم ومرکزیت۔

مدعوین اوران کی قسمیں

اس عنوان کے تحت مدعوین کی تین اقسام کا تذکرہ ہے۔ اذکیاء (حمیت پسند) اغبیاء، (منازعت پسند) اورصلحاء (یعنی سلامت پسند) ان کے لئے آیت کریمہ میں حکمت، موعظت اور مجادلت کا طریقہ اختیار کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ حکمت عقلاء کو چاہتی ہے۔ مجادلت اغبیاء کو کھینچتی ہے اور موعظت صلحاء کا تقاضہ کرتی ہے۔ مصنف نے سماع دعوت کے مختلف انداز کا تذکرہ بھی فرمایا ہے اور سماع قبول، سوءِ سماع اور قلب اعراض، شغب اوراستہزاء کا ذکر کیا۔

داعی اوراس کے اوصاف

دعوتی کام میں داعی کی بڑی اہمیت ہے کیوں کہ دعوت کی کامیابی اوراس کی اثر پذیری بڑی حد تک داعی کی ذات پر منحصر ہے اس لئے ان اوصاف کا بیان ضروری ہے جن سے داعی کو متصف ہونا چاہئے۔ مصنف علیہ الرحمہ نے ان اوصاف کو دو قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک کا تعلق مبلغ کی ذات سے اور دوسرے کا تعلق فعل تبلیغ سے ہے۔

ذاتی اوصاف میں علم وبصیرت

فہم وفراست، دانش وخلق، سیرت وکردار، خوف وخشیت، غنا واستغناء، صبر وتحمل، عفو ودرگذر، رحمت و رافت اوراغماض ومسامحت کا ذکر فرمایا ہے۔

اضافی اوصاف کے سلسلے میں شان تربیت، ترک شدت، عزم واستقلال، رعایت طبائع اور انمول صحت ومعیت وغیرہ کا بیان ہے۔

دستور العمل

کتاب کے آخر میں حضرت حکیم الاسلامؒ نے تبلیغ کے لئے ایک پروگرام اور دستور العمل بھی مرتب فرمادیا ہے جو انتہائی جامع ہے اور دس نکات پر مشتمل ہے۔

۱-مبلغین اسلام اپنا ایک امیر اور مرکز بنائیں جس کی ہدایت پر کام انجام دیں۔

۲-حسب ضرورت ذیلی مراکز کا قیام ہو۔ان مراکز کے ذریعہ رہنمائی اور جائزہ کا کام ہوتا رہے۔

۳-اس دعوت کے مدعو غیر مسلم ہوں جن کے سامنے دین رکھا جائے۔داخلی صلاح کے لئے دوسری جماعتیں ہوں جو مسلمانوں کی اصلاح وارشاد کو اپنا نصب العین بنائیں۔

۴-ان داعیوں کے پاس ایک مختصر کتب خانہ اور دارالمطالعہ ہو جس میں اسلامی کتب کے علاوہ ان مذاہب کی کتابیں ہوں جن کے ماننے والوں کے درمیان کام کرنا ہے تاکہ ان کی نفسیات کو سامنے رکھا جاسکے۔

۵-تبلیغی دورے جماعتی طور پر ہوں اور جماعتیں اہل علم کی قیادت میں نکلیں۔پروپیگنڈہ اور تشہیر کرنے سے گریز ہو۔

۶-جماعتوں میں بااثر افراد کو شامل کیا جائے تاکہ دعوت کے اثرات وسیع اور پائیدار ہوں۔

۷-مقام دعوت کے بااثر اور سرآوردلوگوں سے پہلے رابطہ قائم کیا جائے اور ان کو ہم چناں بنانے کی کوشش ہو۔

۸-کلمہ حق قبول کرنے والوں کی خصوصی تربیت کا نظم ہو۔

۹-وقفہ وقفہ سے تبلیغی مقامات کا بار بار دورہ ہو اور اثرات کا جائزہ لیا جاتا رہے۔

۱۰-اصحاب تبلیغ یادداشتیں مرکز بھیجتے رہیں۔

اس دستور العمل کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں کتنی جامعیت ہے اور اگر اسے ٹھیک طور سے اپنایا جائے تو امت کو شاہراہ ترقی پر گامزن کرنے کے لئے یہ کافی ہے۔

حالات حاضرہ کے پیش نظر جب کہ امت داخلی افتراق وانتشار اور اغیار کی سازشوں کی وجہ سے کمزوری کی شکار ہے، اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ امت کے سامنے دعوت کے کام کی اہمیت کو اجاگر کیا جائے اور قرآن وسنت کی روشنی میں اجتماعی طور پر اس مشن پر امت کو لگا دیا جائے کہ یہی ہماری قوت کا

سرچشمہ اور اسلام کی نشأۃ ثانیہ کی راہ ہے۔اس سے امت کے اندر مضبوط اجتماعیت پیدا ہوگی اور اس کا دائرہ کار وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جائے گا۔اس جذبے کی آبیاری اور امت کے اندر دعوتی سیرت پیدا کرنے کے لئے حضرت حکیم الاسلامؒ کی یہ تصنیف ایک مؤثر ذریعہ ہے۔اس کو زیادہ سے زیادہ عام کرنے اور مختلف زبانوں میں اس کی اشاعت وقت کا اہم ترین تقاضہ ہے۔

''صد حیف! آج یہ منصوبہ مسلمانوں سے تقریباً ختم ہو چکا ہے اور اسی لئے اقوام غیر کی نسبت سے ان کی برتری اور تولیت جس نے انہیں خیر امت بنایا تھا افسانۂ ماضی ہو کر رہ گئی ہے نیز اسی لئے یہ امت اقدامی امت ہونے کے بجائے جو اس کی اصلی شان تھی محض دفاعی بن کر رہ گئی ہے اور ظاہر ہے کہ دفاع محض نہ صرف یہ کہ ارتقاء کا راستہ بند کر دیتا ہے بلکہ زوال وخفا کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے۔''(۶)

............❖............

(۱) حضرت مولانا محمد طیب قاسمی، دینی دعوت کے قرآنی اصول، ص:۱۰-۱۱

(۲) ایضاً، ص:۱۱-۱۲

(۳) ایضاً، ص:۲۰

(۴) ایضاً، ص:۲۸

(۵) ایضاً، ص:۶۷

(۶) ایضاً، ص:۱۲

............❖............

حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ

اکابر دیوبند کی آخری یادگار

مولانا شمس تبریز ندوی

عالم اسلام خصوصاً ہندوستانی مسلمان ایک عرصے سے قحط الرجال کی ایسی آزمائش سے دوچار ہیں کہ ہر سال ان کے دینی وثقافتی، علمی وسیاسی صفوں میں کوئی نہ کوئی کمی محسوس ہوتی ہے اور نمایاں خلا پیدا ہوجاتا ہے جو عرصے تک پُر ہوتا نظر نہیں آتا۔ خصوصاً کسی ممتاز عالم اور ربانی شخصیت کا اٹھ جانا ہماری ملت کو داغِ یتیمی ومحرومی دے جاتا ہے۔ رسولِ اعظم ﷺ نے علماء کو انبیاء علیہم السلام کا وارث وجانشین بتایا ہے اور ان کی موت کو علمِ دین کا ناقابلِ تلافی نقصان قرار دیا ہے۔

عن عبداللّٰہ بن عمر بن العاص رضی اللّٰہ عنهم قال سمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم یقول انّ اللّٰہ لایقبض العلم انتزاعا ینتزعهٗ من العباد ولکن یقبض العلم یقبض العلماء حتّٰی اذا لم یبق عالماً اتخذ الناس رؤساء جهالاً فافتوا بغیر علم فضلّو و اضلّو. (صحیح بخاری کتاب العلم)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا کہ اللہ تعالیٰ علم کو یک بارگی نہیں اٹھالے گا کہ اسے لوگوں کے دلوں سے نکال لے بلکہ علم کو علماء کی موت کے ذریعے اٹھائے گا یہاں تک کہ جب کوئی عالم نہیں رہ جائے گا تو لوگ جاہلوں کو سردار بنالیں گے۔ چنانچہ ان سے سوال کئے جائیں گے تو وہ بغیر علم کے فتویٰ دیں گے اس طرح خود بھی گمراہ ہوں گے اور لوگوں کو بھی گمراہ کریں گے۔

گذشتہ شوال ۱۴۰۳ھ (جولائی ۱۹۸۳ء) کو بھی ایک ایسا ہی حادثہ پیش آیا جب اکابرِ دیوبند کی آخری یادگار حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب قاسمیؒ نے اس دارِفانی کو الوداع کہی رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

حضرت مولانا مرحوم کی ہشت پہلو شخصیت کا نمایاں وصف ان کی جامعیت و ہمہ گیری، علم و ثقافت کے مختلف پہلوؤں میں ان کی عالمانہ نظر کی گہرائی اور فکر کی وسعت و گیرائی تھی جو دارالعلوم دیو بند کے اکابر کا فیضان تھی۔

علومِ اسلامیہ کی تقریباً تمام ہی شاخوں پر ان کی نظر تھی، منقولات کے ساتھ معقولات، بنیادی اسلامی علوم (فقہ و حدیث و تفسیر) کے پہلو بہ پہلو تصوف و کلام و مناظرہ اور ان کے ساتھ شعر و ادب بھی آپ کے گلشنِ فضل و کمال کے غنچہ و گل تھے جن کے رنگ و بو سے ان کی دل کش و دلنواز شخصیت عبارت تھی۔

بہارِ عالمِ حسنت، جہاں را تازہ می دارد
برنگ اصحاب صورت را بہ بوار باب معنی را

اسی جامعیت کے ساتھ انہوں نے علومِ اسلامیہ کی دیرینہ روایت کا تسلسل قائم رکھا اور اس ثقافتی امانت و سرمایہ کو جو حضرت شاہ ولی اللہ تک پہنچی تھی اسے اپنے اکابر کے ہاتھوں سے لے کر نئی نسلوں کے حوالے کیا اور عصرِ حاضر میں اس کی معنویت و اہمیت کو مزید اجاگر کیا اور نئے مسائل و حالات کے پیش نظر اسلامی تعلیمات کے استحکام و بقاء اور نشو و نما کا ماحول پیدا کرنے والے اور اسلام اور مسلمانوں کے حق میں علمی و معاشرتی فضا کو ساز گار بنانے اور عوام و خواص کو اسلامی پیغام و احکام کی حکمت و مصلحت سے آگاہ کرنے کا فرض بخوبی انجام دیا۔

اپنی اسی جامعیت کے سبب انہوں نے اسلاف و اکابرِ دیو بند کے طرز پر تمام علومِ اسلامیہ کی طرف توجہ مرکوز رکھی اور برصغیر کے مسلمانوں اور ان کے علمی و ثقافتی مرکزوں کو اپنی تقریر دل پذیر اور عالمانہ تحریر سے فیضیاب کیا۔ آپؒ کی تقریروں میں شاید اللہ تعالیٰ نے وہی تاثیر و دل کشی رکھ دی تھی جو کبھی ان کے نامور دادا حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی تقریروں میں ہوتی تھی جس کے ذریعہ انہوں نے مباحثۂ شاہ جہاں پور اور میلہ خدا شناسی کے معرکے سر کئے اور آریہ سماجی پنڈتوں کا ناطقہ بند کر دیا تھا۔

عالمانہ، حکیمانہ اور متکلمانہ تقریروں میں شاید ان کا کوئی دوسرا معاصر ان کا ہم سر و ہم چشم نہ تھا، کتاب و سنت اور علماء امت کے علمی ذخیرے سے برجستہ و برمحل استفادہ، منطقی استدلال، داعیانہ جذبہ، مجاہدانہ نظر، حکیمانہ اُسلوب اور خطیبانہ حاضر دماغی، نفسیات شناسی اور شستہ زبانی و شگفتہ بیانی نے مل جل کر ان کی تقریروں کو ایسا حسنِ قبول بخشا تھا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسی توفیق و مقبولیت سے نوازا تھا کہ وہ موافق و مخالف سب کے دل موہ لیتے اور اپنا گرویدہ بنا لیتے تھے، ان کی تقریروں کی یہی کشش تھی جس کے سبب وہ

ہمیشہ ہندو بیرونِ ہند کے سفر پر رہتے تھے اور وہ ہندوستان کا شاید ہی کوئی شہر ان کی تقریر سے محروم رہا ہو۔

تقریروں کی طرح ان کی تحریریں اور کتابیں بھی (جن کی تعداد قریب ڈیڑھ سو ہے) ان کے رنگ و تقریر کی حامل ہیں اور ان کے اندر علمیت و روحانیت اور موادِ اسلوب کی بہت سی خوبیاں موجود ہیں اور ان میں اکثر کتابیں بہت اہم موضوعات پر ہیں اور انہوں نے عصرِ حاضر میں اسلام کی تفہیم و ترجمانی میں اپنا خاص کردار ادا کیا ہے اور عوام و خواص کی دینی تربیت و رہنمائی میں بڑا اہم حصہ لیا ہے۔ ادارہ (تاج المعارف) دیوبند کے ذریعہ ان کی بہت سی کتابیں پابندی کے ساتھ شائع ہوئیں اور انہوں نے اسلامیات کے اردو ذخیرے میں مقدار و معیار کے لحاظ سے بیش قیمت اضافہ کیا۔

ان کی سب سے بڑی قابلِ قدر اور لائقِ تقلید خصوصیات میں مسلک اہل سنت والجماعت میں ان کی وفاداری و وابستگی، علماءِ سلف میں قدردانی اور ان کے لئے عذرخواہی، اکابرِ امت سے استناد اور ان پر اعتماد اور مشاہیرِ اسلام کے علمی و عملی کارناموں کی روشنی میں اجتہاد اور ان کے علمی و ثقافتی ورثہ سے فراخ دلی اور وسیع النظری کے ساتھ استفادہ، اسلام کے ماضی سے خوش گمانی اور حال و مستقبل کی طرف سے امید پروری کے ساتھ فکرمندی، فکرِ ولی اللہی اور اس کے حامل و امین اکابرِ دیوبند خصوصاً حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے گہرے اسلامی افکار پر عبور اور ان سے عقیدت کو بنیادی اہمیت حاصل ہے، اس دور میں (مولانا سندھیؒ کے بعد) وہ مسلک دیوبند اور مولانا نانوتویؒ کے متکلمانہ و مجتہدانہ سلسلے کے سب سے بڑے مفکر حکیم اور شارح و ترجمان اور اپنے طرز پر حکمت قاسمیہ کے آخری حامل و امین اور علمِ کلام کے دیوبندی دبستان کے عقائد و مقاصد کے سب سے بڑے نمائندہ تھے۔

میں کہ میری نوا میں ہے آتشِ رفتاں کا سراغ
میری تمام زندگی کھوئے ہوؤں کی جستجو

اپنے مسلک پر قائم رہتے ہوئے دوسرے مکاتبِ خیال کی خدمات کی قدر و تحسین اور ان کے بارے میں ہمدردانہ رویہ اور معتدل و متوازن رائے رکھنا، تلخ کلامی، بہتان طرازی اور افترا پردازی و عدم رواداری سے اجتناب، اپنے مخالفوں کے ساتھ عفو و تحمل، نرم و خوش مزاجی کا برتاؤ، ان کی فکر و شخصیت دونوں کا امتیاز خاص تھا اور وہ حافظ کے اس شعر کے بہترین مصداق تھے۔

آسائشِ دوگیتی تفسیرِ ایں دو حرف است
بادوستاں تلطف با دشمناں مدارا

ان کی یہی وسیع النظری، بلند نظری اور خوش اخلاقی تھی جس کے سبب سے دیوبندی مسلک کے مخالفین

یا غیر جانبدار حلقے بھی ان پر اعتماد کرتے تھے اور ان کی رائے اور مشورہ سے مستفید ہوتے تھے اس طرح وہ ہندوستانی مسلمانوں کے ان چند اکابر کی صف میں شامل تھے جن پر مسلمانوں کی اکثریت کو اعتماد واطمینان تھا اور ان کو وہ اپنا متفق علیہ عالم سمجھتے تھے، اسی وجہ سے جب ان کی ایماء پر ''مسلم پرسنل لاء بورڈ'' کا قیام عمل میں آیا اور دیوبند میں اس کا اجتماع ہوا تو علمائے ہند کی اس اہم مجلس کے وہ صدر بنائے گئے اور اس معزز عہدے پر تاحیات فائز رہے، ہندوستانی مسلمانوں کے اہم علمی وثقافتی اداروں ندوۃ العلماء، مظاہر علوم، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ میں بھی وہ یکساں احترام کے ساتھ مدعو کئے جاتے تھے۔

وہ ایک بلند پایہ عالم اور ممتاز خطیب اور فاضل اہل قلم ہی نہ تھے بلکہ اسلافِ دیوبند کے طرز پر احسان و عرفان اور اخلاص وایقان کی دولت سے بھی مالا مال تھے، وہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے خلیفہ تھے اور ہندو پاک میں ان کے مریدوں کی تعداد سیکڑوں سے متجاوز ہے، یہی گہری روحانیت ان کی زندگی کے ہر دور میں نمایاں رہی۔

اخیر میں چند ذاتی تاثرات و واقعات کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ۱۹۵۵ء کے بعد اپنے وطن بھوج پور کے مدرسہ اشرفیہ کے سالانہ جلسوں میں آپ کی زیارت کا شرف اور آپؒ کے وعظِ حسنہ کی سماعت کی سعادت حاصل ہوئی۔ ۱۹۶۱ء میں دارالعلوم دیوبند میں اپنی طالب علمی کے بعد سے ان کی مجلسوں میں اکثر حاضری کی عزت حاصل ہوئی، بہت سے ملفوظات میرے پاس قلم بند ہیں، ان مجلسوں میں سوالات کی پرچی بڑھا دیتا اور حضرت مولاناؒ ان کے شافی جواب عنایت کرتے۔

رئیس احمد جعفری ندویؒ کی فرمائش پر میں نے مولانا مرحوم سے مولانا محمد علی جوہرؒ اور علماء دیوبند کے تعلق پر کچھ لکھنے کی درخواست کی تو مولانا مرحوم نے ایک مختصر مضمون سپردِ قلم کر کے میرے سپرد کیا، وہ مضمون جعفری صاحب کی مرتبہ ''علی برادران'' میں لاہور سے اور ماہنامہ دارالعلوم دیوبند کے ۱۹۶۴ء کے کسی شمارہ میں شائع ہوا، دیوبند کے ایام طالب علمی کی ایک خوش قسمتی حضرت حکیم الاسلامؒ کے ہفتہ وار درس ''حجۃ اللہ البالغہ'' میں شرکت بھی ہے جس کا سلسلہ حضرت کے اسفار کے سبب قائم نہیں رہا، انہیں ایام طلب میں مولانا مفتی ظفیر الدین صاحبؒ (مرتب فتاویٰ دارالعلوم دیوبند) کے ساتھ حضرت مولانا کے قیمتی کتب خانہ کی ترتیب جدید میں شرکت کا موقع بھی ملا جس میں مولانا گیلانیؒ کے ذاتی ذخیرے سے بہت اضافہ ہو گیا تھا۔

۱۹۶۴ء ہی کے آس پاس محدث جلیل شیخ عبدالفتاح ابو غدہؒ اپنے تبلیغی دورے میں دیوبند بھی تشریف لائے اور دارالعلوم کی زیارت سے بہت مسرور ہوئے۔ دارالحدیث کی تقریر میں انہوں نے فرمایا کہ

ہندوستانی اہل علم اور علماء دیوبند کی اہم تصنیفات کا عربی میں ترجمہ ہوتو بڑی علمی خدمت ہوگی اور اس سے عالمِ اسلام میں استفادے کی راہ کھلے گی اس سلسلہ میں انہوں نے مولانا گیلانی کی ''تدوینِ حدیث'' وغیرہ کا خصوصی تذکرہ کیا تھا، طلبۂ دارالعلوم سے شیخ ابوغدہ کے خطاب کے اکثر جملے مرصع ومقفٰے تھے۔ ان کا ایک جملہ اب تک کانوں میں گونج رہا ہے ''**نقد الجاهل فی الکیس و نقد العالم فی الکراریس**''

دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد ندوۃ العلماء کے جشنِ تعلیمی ۱۹۷۵ء میں آپ کی زیارت ہوئی اور تقریر بھی سنی، پھر مسلم پرسنل لا بورڈ کے اجلاس رانچی ۷۸ یا ۷۹ء میں پھر آپ کی زیارت ہوئی اور یک جائی کا موقع ملا، رانچی ہوائی اڈہ پر حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ اور حضرت حکیم الاسلامؒ کو رخصت کرنے حاضر ہوا تو اس موقع پر مولانا علی میاں صاحبؒ نے حضرت حکیم الاسلامؒ سے میری طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ ''یہ آپ کے مولوی شمس صاحب عرصہ سے میرے ساتھ ہیں'' اس میں اس طرف اشارہ تھا کہ سبھی اکابرِ دیوبند ''حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک سے وابستہ یا اس کے ہوا خوار ہیں''۔

اس کے بعد مارچ ۱۹۸۰ء میں اجلاسِ صد سالہ کے موقع پر دیوبند کے اس عظیم یادگار اجتماع میں آپ کی زیارت اور خطاب سے مشرف ہونے کا موقع ملا اور آپ کی اقتدا میں اس نمازِ جمعہ میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی جس کے نمازیوں کی تعداد میدانِ عرفات کے حاضرین کے غالباً برابر تھی۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کی یادگار شخصیت اور فقید المثال ہستی پر یہ مختصر مضمون لکھ کر اس کا حق ادا نہیں کیا جاسکتا، اس کے لئے ان کی مفصل سوانح عمری کی ضرورت ہے، خصوصاً ان کی علمی خدمات پر مفصل تبصرے کی بھی ضرورت ہے کیوں کہ وہ اپنے طور پر اکابرِ دیوبند کی آخری یادگار اور اپنی مثال آپ تھے، ان کے دم سے حکمتِ قاسمیہ اور دبستانِ دیوبند کی دیرینہ روایت قائم تھی اور تسلسل کسی نہ کسی طرح برقرار تھا، اس دورِ قحط الرجال میں دور دور تک آپ کا ثانی تو درکنار آپ کا بدل بھی نظر نہیں آتا جس کی شخصیت کے آئینہ میں اکابر واسلاف کی کچھ جھلکیاں دیکھی جاسکیں۔ افسوس صد افسوس کہ

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

............❖............

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ
اور
مسلم پرسنل لاء بورڈ

مولانا شمس الدین آفریدی
دارالعلوم زکریا، بھوپال

نمونۂ اسلاف، پاکیزہ صفات، طیب اخلاق سے بھرپور شخصیت کے حامل انسان تھے، حضرت مولانا محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔ نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک دارالعلوم دیوبند کے مسند اہتمام پر فائز رہے اور مسلک دیوبند کی ترجمانی کرتے رہے، دارالعلوم کا تعارف ایک چھوٹے سے قصبے سے نکل کر پورے عالم میں کرایا۔ اللہ تعالیٰ نے ظاہری خوبصورتی کے ساتھ باطنی خوبیوں سے بھی آراستہ فرمایا تھا۔ خوش نما صورت، پاکیزہ سیرت، نرم گفتار، تحریر وتقریر میں روانی کے ساتھ علم وحکمت کے دریا بہاتے تھے، بدعات کے خلاف مناظرانہ انداز کے بجائے مشفقانہ وہمدردانہ طریقہ اختیار فرماتے تھے، تقریر میں اتنی سادگی وشگفتگی ہوتی تھی کہ سامعین مسحور ہوجاتے تھے۔ پچاس سال قبل ممبئی جیسے شہر میں علماء دیوبند کے لئے مساجد کا داخلہ ممنوع تھا۔ وہاں حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کے بیانات کا سلسلہ شروع ہوا۔ حضرت حکیم الاسلامؒ کے مواعظ حسنہ نے مخالفین پر ایسا اثر پیدا کیا کہ جو مساجد میں علماء دیوبند کو داخل نہیں ہونے دیتے تھے وہی حضرات حکیم الاسلامؒ کو مساجد میں لے کر گئے اور محراب ومنبر پر بٹھایا اور بیانات سننے کے لئے بڑی تعداد میں جمع ہونے لگے۔

اسی زمانہ میں مولانا محمد پالن حقانی صاحبؒ کے بیانات بھی ممبئی میں زور وشور کے ساتھ جاری تھے، حقانی صاحب حضرت حکیم الاسلامؒ کے ایک جملہ کو بڑے مزے لے کر ذکر فرمایا کرتے تھے۔

کہ ایک دفعہ بریلوی علماء کے بعض حضرات نے شکایتاً حضرت محمد مولانا محمد طیب صاحبؒ سے عرض کیا

کہ حضرت آپ کے اس جاہل مولوی (حقانی صاحب) پر روک لگادو یہ ہمارے علماء کو برا بھلا کہتا ہے۔ جواباً حضرت حکیم الاسلامؒ نے فرمایا بھائی ہم تمہارے بے شمار جاہلوں کو برداشت کرتے رہتے ہیں تم بھی ہمارے ایک جاہل کو برداشت کرلو۔

ایک مرتبہ ایک میزبان صاحب نے مزید کھانا کھانے پر اصرار کیا تو حضرت نے جواب دیا بھائی کھانے کا تعلق رغبت سے ہے ترغیب سے نہیں۔ اس طرح حضرت حکیم الاسلامؒ بڑے جچے تلے الفاظ کا استعمال کرتے تھے۔ حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ اپنے زمانہ کے تمام اکابر علماء کرام کی نظروں میں منظور نظر اور ہردلعزیز تھے، حضرت تھانوی علیہ الرحمہ نے خلافت سے نوازا تھا۔ حضرت شیخ زکریا صاحبؒ کے یہاں خاص مقام تھا۔ حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحبؒ کے یہاں جلال آباد پہنچے تو مسجد نئی تعمیر ہوئی تھی دیکھ کر فرمایا مسجد بہت وسیع ہے، بانی مسجد بھی مسیح ہے۔

اس طرح ملی جماعتوں اور تنظیموں میں بھی بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ ان جماعتوں کو اپنے اکابر کا ورثہ شمار کرتے تھے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، ندوۃ العلماء لکھنؤ، مظاہر علوم سہارنپور سے خصوصی لگاؤ تھا۔ وہاں کے پروگرام میں شرکت فرماتے اور اپنے حکیمانہ خطبات سے فیضیاب کرتے تھے۔

ہندوستان میں مغلیہ حکومت کے دور میں اسلامی قوانین کے مطابق فیصلے ہوا کرتے تھے۔ غیر مسلموں کو ان کے مذہبی طور وطریق کے مطابق عمل کرنے کی پوری آزادی حاصل تھی۔ ہندوستان پر مغلیہ سلطنت کے خاتمے کے بعد جب انگریزوں کا تسلط قائم ہوا تو انہوں نے مسلمانوں کے لئے مسلم پرسنل لاء کے عنوان پر ایک محدود قانونی حیثیت دے کر مسلمانوں کے پرسنل قانون کا درجہ دے دیا۔ جواَب مسلم پرسنل لاء کہلاتا ہے۔ مسلم پرسنل لاء کا اِطلاق نکاح، وراثت، حضانت، وصیت، ہبہ وغیرہ معاملات تک محدود ہے۔ عدالتیں مسلمانوں کے عائلی معاملات میں اسی قانون کے مطابق فیصلہ کرتی ہیں۔ لیکن بعض مرتبہ ان عائلی مسائل سے ناواقفیت کی وجہ سے جج صاحبان غیر شرعی فیصلہ صادر کردیتے ہیں اور بعض وقت اسلامی قانون کی بے جا تشریح کردیتے ہیں۔ جس سے مسلمانوں میں بے چینی پیدا ہوجاتی ہے۔ غیر شرعی فیصلہ مسلمان قبول کرنے کو تیار نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا اس کا لازماً نتیجہ احتجاج کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

جیسا کہ ماضی میں شاہ بانو کیس کی غلط تشریح، یکساں سول کوڈ نافذ کرنے کی کوشش، تعدد ازدواج کا شوشہ، متبنّی (لے پالک بل) وغیرہ، غرضیکہ مختلف موضوع پر مسلم پرسنل لا میں تبدیلی لانے اور اسلامی قانون میں مداخلت کی کوشش کی گئی۔ مسلم پرسنل لاء میں بیجا مداخلت کو دیکھتے ہوئے ہندوستانی علماء کرام و دانشوران نے محسوس کیا کہ اگر ان حساس مسائل و واقعات پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا گیا تو یہ واقعات ایک

دن نہایت خطرناک صورت اختیار کر سکتے ہیں۔

چنانچہ ان حساس مسائل پر غور وفکر کے لئے مسلمانانِ ہند کی دینی ودنیوی رہنمائی کا فریضہ انجام دینے والی درس گاہ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کی صدارت میں دارالعلوم دیوبند میں ایک نمائندہ اجتماع طلب کیا گیا۔ اجلاس میں شرکت کرنے والے حضرات میں سے قابل ذکر تھے مولانا محمد سالم قاسمی صاحب، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی، حضرت مولانا سید اسعد مدنی صاحبؒ، حضرت مولانا منت اللہ رحمانی صاحب، جناب ڈاکٹر طاہر محمود صاحب، جناب قاضی مجاہد الاسلام صاحب، حضرت مولانا منظور نعمانی صاحب، مولانا سعید احمد اکبرآبادی صاحب، مولانا عامر عثمانی صاحب ایڈیٹر ماہنامہ تجلّی، دیوبند وغیرہ۔

اس نمائندہ اجتماع میں فیصلہ کیا گیا چوں کہ مسلم پرسنل لا کا معاملہ پوری امت کا مسئلہ ہے۔ خصوصاً متبنیٰ بل لایا جارہا ہے جو اسلامی قانون میں صریح مداخلت ہے۔ اس لئے ملکی سطح پر پوری ملت کے مختلف مکاتب فکر کے حضرات کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا جائے اس کے لئے ایک بڑا اجلاس بلایا جائے۔ فیصلہ کے مطابق ایک اجلاس تیاری کمیٹی تشکیل دی گئی جس کے کنوینر حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی بنائے گئے۔ دیوبند میں یہ اجتماع حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کی زیر صدارت بتاریخ ۱۳؍۱۴؍مارچ ۱۹۷۲ء کو منعقد کیا گیا تھا۔

اجلاس کی تیاری کمیٹی نے طے کیا متبنیٰ بل کا قضیہ چوں کہ مہاراشٹر اسمبلی سے اٹھایا جارہا ہے اس لئے فتنے کے سد باب کے لئے مہاراشٹر کی راجدھانی عروس البلاد ممبئی سے زیادہ موضوع اور کون سا مقام مناسب ہوسکتا ہے اس لئے اجلاس عام اسی شہر میں بلایا جائے۔

چنانچہ مسلم پرسنل لا بورڈ کا پہلا تاسیسی اجلاس عام ۲۷؍۲۸؍۳؍۱۹۷ء دسمبر کو زیر صدارت حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ ممبئی شہر میں منعقد کیا گیا۔ جس میں شریک ہونے والے مسلم عوام الناس کے علاوہ تمام ہندوستانی مسلم تنظیموں کے ذمہ دار شریک اجلاس تھے، مختلف مکاتب فکر کے نمائندہ حضرات پر مشتمل یہ عظیم الشان اجلاس اپنی نوعیت کا مثالی اجلاس تھا، جس میں آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کی تشکیل ہوئی اور صدارت کے عہدہ جلیلہ کے لئے بالاتفاق رائے حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کا انتخاب کیا گیا۔ جنرل سکریٹری کی حیثیت سے حضرت مولانا منت اللہ رحمانی صاحب منتخب کئے گئے۔ آپ کے صدر منتخب ہونے کی وجہ سے مسلم پرسنل لاء بورڈ بھی ایک باوقار ادارہ کی حیثیت سے متعارف ہوا۔ ۱۷؍جولائی ۱۹۸۳ء کو علم وحکمت کا یہ باوقار تاجدار، شیریں گفتار، نرم رو، گرم جستجو اور اسلام کا آخری نمونہ اٹھاسی سالہ دنیوی زندگی پا کر دائمی حیات کی طرف منتقل ہوگیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے۔

............❖............

حکیم الاسلامؒ کے علم وفضل کو خراجِ عقیدت

مولانا عبدالقدوس حماد قاسمی

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ ظاہری طور پر عالم اسباب سے ۶ رشوال ۱۴۰۲ھ کو عالم برزخ کی جانب منتقل ہوگئے، لیکن آپ کی حیات طیبہ کا اثاثہ اور باقیات صالحات کا جو سرمایہ ہے وہ انشاء اللہ بطور صدقہ جاریہ قائم و دائم رہ کر آپ کی روح گرامی کو نفع دیتا رہے گا۔ آپ کے دینی لٹریچر سے مختلف اسلامی ادارے اور علمی سلسلے سے امت مسلمہ مستفیض ہوتی رہے گی۔

دارالعلوم دیوبند کے مہتمم واستاذ اوراس کی دینی تحریک ودعوت کے سربراہ کے منصب پر سرفراز ہوکر آپ نے اسلامی تاریخ وثقافت کے اقدار وقیم کی مبسوط اور حکیمانہ ترجمانی کی اور اسلام کے بین الاقوامی نظام اور آفاقی طرز حیات کی تفہیم وتشریح کے فرائض کو سرانجام دیا۔

نسبی خصوصیت

شرافت ونجابت کا اصل معیار تو علم وتقویٰ ہے جس کے اندر علم ودین کا جس قدر کامل رسوخ ہوگا اسی قدر خشیت الٰہی کا رنگ غالب ہوگا۔ یہ صفت وخصوصیت حضرت مرحوم کے اندر بدرجہ کمال موجود تھی، ارشاد قرآنی ہے:

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَايَعْلَمُوْنَ. یعنی اے نبیؐ آپ اعلان کردیجئے کہ کیا عالم اور غیر عالم برابر ہیں۔ آیت مذکورہ میں علم سے مراد علم دین ہے کیوں کہ اس کی تفسیر دوسری آیت یوں کر رہی ہے **يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ غَافِلُوْنَ**، یعنی دنیا کا ظاہر تو جانتے ہیں مگر زندگی کے مغز وروح سے بے خبر ہیں۔ تو دنیا کے علم کو علم نہیں کہا جا سکتا پھر ظاہری علم کے باوجود خدا نے **لایعلمون** کہہ کر بتلا دیا کہ اللہ کی نظر میں علم کا مفہوم متعین ہے کہ دین ہی کی حقیقت کا علم اللہ کی نظر میں علم ہے

حضرت مرحوم کے اندر علم دین کے رسوخ کی جو کیفیت تھی وہ اس مقام تک پہنچ چکی تھی جسے احسان کہتے ہیں۔ یہی فضیلت کیا کم ہے اگر اسکے ساتھ نسبی عزت وکرامت بھی حاصل ہو جائے تو سبحان اللہ سونے پر سہاگہ ہے۔ چنانچہ آپ کریم ابن کریم ابن کریم کے طغرائے امتیاز کے حامل تھے، یعنی بقیۃ السلف حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کے فرزند گرامی تھے، جنھوں نے چالیس برس تک دارالعلوم دیوبند کے منصب اہتمام پر فائز ہوکر دین وملت کی خدمت سرانجام دی ہے اور حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانیٔ دارالعلوم دیوبند کے نبیرہ تھے، جو دارالعلوم کے بانی اور اس کے نظام تعلیم وتربیت اور اصول ہشتگانہ کے مؤسس تھے۔ اور ملی اتحاد ویک جہتی اور اسلامی اجتماعیت وتنظیم کی تشکیل اور شرعی نظام کی تنفیذ اور حریت وطن کے نصب العین کی حامل تحریک جہاد کے روح رواں تھے۔ ۱۸۵۷ھ کے جہاد آزادی کے میر کارواں آپ ہی تھے، اس نسبی خصوصیت سے آپ کے تعارف میں چار چاند لگ گئے۔ یوں آپ کی بلند پایہ علمی وروحانی شخصیت تعارف وتعریف سے بے نیاز ہے، دنیا کے گوشے گوشے میں آپ کی دینی قیادت اور علمی سیادت کے کارناموں کا چرچا ہے۔

اکابر دارالعلوم کے رنگوں کی جامعیت

حضرت مرحوم کے شمائل وخصائص کا نمایاں پہلو یہ ہے کہ آپ کی ذات گرامی اکابر دارالعلوم کے تمام متوارث ذوق اور جملہ رنگوں کی جامع تھی، یہ صفت اسلاف میں کمیاب اور اخلاف میں نایاب ہے۔ بقیۃ السلف مولانا محمد احمد صاحبؒ کے واسطہ سے آپ کے اندر حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانیٔ دارالعلوم دیوبند کی فکر وحکمت اور بالواسطہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ، فقیہ النفس حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی دعوت وارشاد کا رنگ غالب تھا۔ یعنی حضرت گنگوہی نے سنت وبدعت کے درمیان جو حد فاصل کھینچ کر ان کے امتیازات کو نمایاں کیا ہے ان کی تشریح وتوضیح آپ نے حضرت نانوتوی کی فکر وحکمت کے اصول پر فرمائی اور اس دین حنیف کی دعوت اس کی اصل فطرت کے مطابق دی جو قرون اولیٰ یعنی عہد نبوت وزمانہ خلافت راشدہ اور قرن صحابہ وتابعین سے تاریخی تواتر اور صحیح سندوں کے ساتھ اخذ وانتقال کے مراحل طے کرتا چلا آرہا ہے۔ تجدیدات واصلاحات کے فرائض کو امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی نے انجام دیا اور ان تجدیدات واصلاحات کو علمی وتحقیقی اور فنی اعتبار سے امام انقلاب حضرت مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے مرتب ومنظم کیا اور ان کی تالیف وتدوین میں بے حد دماغ سوزی کی، چنانچہ اسلامی نظام کی تنقید کے سلسلے میں حضرت شاہ ولی اللہ کا لٹریچر مشعل راہ بن سکتا ہے۔ جس نے

اسلامی تاریخ و ثقافت اور نظام خیر القرون کی تفصیلات و حقائق کو مدلل اور مستند طریقہ سے واضح کیا ہے، یہی مدلل اور مستند طریقہ فکر ولی اللّٰہی ہے جس کے ترجمان حضرت حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ تھے، یہی ترجمانی جملہ اکابر دارالعلوم کا شعار تھا، جس کے رنگ و انداز الگ الگ تھے اور حضرت تمام رنگوں کے جامع تھے، شیخ الہند مولانا محمود حسن کے مرید باصفا اور حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے خلیفہ ارشد تھے، اسی طرح آپ حضرت مولانا الحافظ محمد احمدؒ کے بھی خلیفہ تھے، جو قطب الارشاد امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے خلیفہ ارشد تھے، پس آپ کی خلافت دوآتشہ تھی، ایک میں بالواسطہ حضرت امام الطائفہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی نسبت خاصہ اور معرفت کاملہ منتقل ہوئی اور دوسری خلافت بالواسطہ حضرت قطب الارشاد مولانا گنگوہیؒ کے مقام احسان واستقامت سے مستنیر تھی۔

علوم و تحقیقات میں امام العصر حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ کے تلمیذِ رشید اور درسیات میں امام المنطق والحدیث حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ کے مایہ ناز شاگرد تھے، دارالعلوم کے نظم ونسق اور اہتمام کی ذمہ داریوں میں فخر الاسلام حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ کی تربیت وسرپرستی اور رہنمائی حاصل تھی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آپؒ کے والد نے چالیس برس تک اہتمام کی خدمت انجام دی، تو آپؒ نے تقریباً چھپن برس تک مسلسل اپنے فرائض منصبی کو انجام دیا۔ اور تقریر و خطابت میں شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی رہنمائی کا شرف حاصل تھا، اکابر دارالعلوم میں حضرت علامہ عثمانیؒ کے طرز و انداز میں آپ ہی کو خطابت و تقریر کا شرف حاصل تھا اور یہ طرز و انداز بالکل منفرد اور مجتہدانہ تھا، سامعین پر سکوت طاری ہو جاتا اور قلوب کے اندر سمع و طاعت کا جذبہ بیدار ہوتا، کڑے کڑے مخالفین اور اکابر دارالعلوم کے اعداء و منکرین بھی آپؒ کے خطاب سے محظوظ ہوتے۔ آپ کے خطاب میں شیخ جیلانیؒ کے ناصحانہ وقار اور ابن جوزی کے خطیبانہ کردار کی جواہر ریزی ہوتی اور مجدد سرہندی کی تجدید و اصلاح اور ان کی دعوت و عزیمت کی چاشنی ہوتی اور شاہ ولی اللہ کے افکار واقدار کی روشنی ہوتی۔

آپ کے اندر سب سے بڑا وصف تواضع و انکسار تھا جو حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کی رفاقت صادقہ کے اثرات تھے اکابر کا احترام اور اصاغر سے محبت اور ان کی حوصلہ افزائی پر آپ کا خصوصی رنگ تھا۔

حضرت حکیم الاسلامؒ اسلاف کی آخری نشانی

حضرت حکیم الاسلامؒ کی تعلیم و تربیت اور ذہنی و فکری نشو و نما ایسی مقدس ہستیوں کے زیر سایہ ہوئیں جو اخیار امت اور شریعت و طریقت کے حقیقی جامع اور سلف صالحین کے سچے پیرو تھے اور علم و عمل میں

اصول صحابہ کے پابند تھے، زہد وتقویٰ اور اتباع احکام میں ان کے قدم بقدم تھے، اسی بابرکت صحبت و تربیت کا اثر تھا کہ حضرت حکیم الاسلامؒ کی مقدس ہستی تواضع وانکسار کی پیکر تھی اور اخلاق حسنہ علوم الٰہیہ کی خزینہ تھی، مصائب پر صبر وسماحت اور انعامات پر شکر وامتنان کا جذبہ آپ کی فطرت میں داخل تھا اور آپ کے اندر فکر وعقیدہ اور اسلامیت کی روح پورے طور پر حلول کر گئی تھی اور ایمان وعمل میں کیفیت احسان درجہ مقام تک پہونچ گئی جو سلوک ومعرفت کا آخری مقام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ اسلاف کی آخری نشانی تھے اور اسلاف کے علوم ومعارف کے امین تھے۔

حضرت حکیم الاسلامؒ کی جبین سعادت عہد طالب علمی ہی سے چمک دمک رہی تھی، اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شیخ الادب والفقہ حضرت مولانا اعزاز علی صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا ایک قلمی تبرک بطور شہادت کے شریک مضمون کر دیا جائے، جس میں خاندان قاسمی کا مختصر تذکرہ بھی ہے اور حکیم الاسلامؒ کے متعلق شہادت بھی مل جائے گی کہ وہ صغرسنی ہی میں علم وفضل کی سندیں حاصل کر چکے تھے۔

جس کا منظر یہ ہے کہ بقیۃ السلف حضرت مولانا محمد احمدؒ کی اولاد باحیات نہ ہونے سے اکابر دارالعلوم کو بڑی فکر دامن گیر ہوگئی تھی کہ نسل قاسمی منقطع نہ ہو جائے لیکن الہامی طور پر حضرت شیخ الہند نے ایک مستجاب الدعوات بزرگ سے دعا کرانے کے لئے نمائندہ ارسال فرمایا تھا، اسی طرح حکیم الاسلامؒ کی کوئی نرینہ اولاد ابھی نہیں ہوئی تھی، آپ کی صرف دو لڑکیاں تھیں، اکابر دارالعلوم کی دیرینہ خواہش تھی کہ حضرت حکیم الاسلامؒ کو بھی فرزند پیدا ہو، چنانچہ حضرت الاستاذ مولانا محمد سالم صاحب مدظلہٗ العالی کی پیدائش ہوئی تو اکابر دارالعلوم کے حلقہ میں زبردست خوشی محسوس کی گئی اور ہدیہ تبریک پیش کرنے کے لئے ایک وفد حضرت مولانا محمد احمدؒ کی خدمت میں حاضر ہوا جسے القاسم میں حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ نے مژدۂ جانفزا کے عنوان سے تحریر فرمایا، جواب ایک یادگار ہوگئی جو مندرجہ ذیل پیش ہے:

مژدۂ جانفزا!

''ہندوستان میں اہل سنت والجماعت کا بڑا طبقہ جس کو صحیح معنی میں شریعت مصطفویہ علی صاحبہا الف الف صلوٰۃ وتحیہ کا حامی اور ہادی کہا جا سکتا ہے، دیوبندی جماعت ہے اس جماعت کے قائد رئیس الاتقیاء حجۃ الاسلام حضرت مولانا الحاج المولوی محمد قاسم صاحب نانوتوی نور اللہ مرقدہٗ بانیٔ دارالعلوم دیوبند تھے۔ اس فقیرانہ زندگی بسر کرنے والے نے اگر ایک طرف جنید وشبلی (ادخلہما فی الرحمۃ الواسعۃ) کے تصوف کی طرف رہنمائی کی

تو دوسری طرف ابوحنیفہؒ کی فقہ کو فرمان الٰہی وارشادات نبویہ کا مظہر بتایا۔ اپنے بندوں کے حالات، ان کی فقیری، ان کے قلوب سے علامۃ الغیوب ہی خوب واقف ہے۔ وہی جانتا ہے کہ اس کے مخلص قلب پر صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اخلاص کا اثر کس طرح پڑ گیا کہ دارالعلوم نے جو کہ اس کے ہاتھوں قائم کیا گیا تھا، تھوڑے عرصہ میں اپنے فیض یافتہ حضرات سے مشارق ومغارب کو بھر دیا، فی الحقیقت اس میں بہت کم مبالغہ ہے کہ منتسبین دارالعلوم دنیا کے ہر ہر گوشہ میں موجود ہیں۔

مجھ کو اس وقت شمس وارض کے صفات ومناقب بیان کرنے مقصود نہیں ہیں اور فی الحقیقت میری وسعت وہمت سے خارج ہیں، مجھ کو صرف ایک خبر سنا کر ان صاحبوں کو مسرور کرنا ہے جو دیوبند اور دارالعلوم دیوبند کی مسرت افزا خبر کو سنکر خوش ہوتے ہیں۔ بانئ دارالعلوم دیوبند کے صاحب زادے اور میرے محسن و شفیق استاد حضرت مولانا محمد احمد صاحب حال مہتمم دارالعلوم دیوبند۔ سابق مفتی عدالتِ عالیہ عثمانیہ اپنے والد (قدس سرہٗ) کی اس دینی ودیعت کی حفاظت فرما رہے ہیں۔ آپ کے دو صاجزادے اور ایک صاحب زادی ہیں۔ بڑے صاجزادے حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحب اور چھوٹے صاجزادے مولانا قاری محمد طاہر صاحب ہیں۔ اگر کوئی شخص ان دونوں کو اس وقت دیکھتا جب کہ یہ دونوں اپنی صغرسنی کی حالت میں دارالعلوم سے اپنے فضل وکمال کی سند حاصل کر چکے تھے تو یقیناً متعجب ہوتا لیکن جن لوگوں نے ان کے علمی شغف کو دیکھا ہے یا اس سے واقف ہیں کہ یہ قاسم الخیرات کے جگر گوشہ ہیں ان کے نزدیک ان کا اس قدر جلد ترقی پر پہنچ جانا نہ لائق تعجب نہ لائق حیرت۔

ان دونوں نونہالوں کی شادیاں ہو چکی ہیں۔ بڑے صاجزادے کی دولڑکیاں ہیں۔ منتسبین دارالعلوم دیوبند عموماً اور خدام دارالعلوم خصوصاً اور اکابرِ دارالعلوم فطری طور پر متمنی تھے کہ اس نونہال کو خداوند عالم فرزند عطا فرمائے۔

خدا کا شکر ہے کہ بتاریخ ۲۳؍ جمادی الثانی ۱۳۴۴ھ صبح صادق یہ تمنا پوری ہوئی۔ جمعہ کا دن تھا۔ یہ خبر دارالعلوم میں پہنچی اسی وقت ملازمین و مدرسین کا ایک وفد حضرت مہتمم صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ کاتب سطور بھی اس وفد میں شریک تھا۔

حضرت ممدوح عرصہ سے علیل ہیں اور حد سے زیادہ ضعیف ہو گئے ہیں، جب آپ کو اطلاع پہنچی کہ وفد بغرض مبارکباد حاضر ہوا ہے تو آپ بنفس نفیس خود تشریف لائے، آپ کے چہرہ پر آثار خوشی ظاہر تھے، آپ نے اپنی اسی موروثی خندہ پیشانی اور انبساط کے ساتھ کلمات مسرت سے وفد کو مشرف فرمایا جو آپ کو

حضرت قاسم الخیرات قدس سرہٗ سے بطور ارث ملی ہے۔ دارالعلوم کے تمام طلبہ اور مدرسین وملازمین میں اس خبر سے چہل پہل رہی اور ہر شخص کی زبان سے دعائے درازعمری اور حصول شرفِ دارین نکل رہی تھی۔

کاتب سطور اپنی اور تمام خدامِ دارالعلوم کی طرف سے حضرت استاد مولانا محمد احمد صاحب کی مبارکباد اور منتسبان دارالعلوم کی خدمت میں بشارت مسرت افزا پیش کرتا ہے۔

فقط (محمد اعزاز علی) منتقل از القاسم رجب ۱۳۴۴ھ

متذکرہ بالا نقل کردہ مضمون سے خاندانِ قاسمی کی عظمت واہمیت کے نقوش وآثار کی ترجمانی ہورہی ہے اور تاریخی تسلسل کا ثبوت بھی فراہم ہورہا ہے وہ یہ کہ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ بانئ دارالعلوم دیوبند کے علمی وروحانی جانشین آپ کے صاحبزادے بقیۃ السلف مولانا محمد احمدؒ تھے، اور آپ کے صاحب زادے حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کے بعد آپ کے صاحبزادہ مفکر اسلام حضرت مولانا محمد سالم صاحب مدظلہٗ علمی وروحانی نیابت کے منصب پر فائز المرام ہوئے، حکیم الاسلامؒ ہی سے بیعت ہیں اور قدوۃ الصلحاء حضرت مولانا عبدالقادر نوراللہ مرقدہٗ کے الہامی اشارے سے حضرت حکیم الاسلامؒ نے آپ کو بیعت وارشاد کا مجاز کیا۔ اللہ عزوجل آپ کو حضرت حکیم الاسلامؒ کے علوم ومعارف اور سلوک وتصوف کے نشر واشاعت اور تعمیر وتربیت کے مستند ذریعہ کے طور پر قبول فرمائے۔ آمین۔

............❖............

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ

حیات وخدمات کا ایک جائزہ

مولانا شیر محمد امینی

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ ہندوستان کے مشہور ومعروف عالمِ دین، حکیم الاسلام، شیخ العرب والعجم، عظیم خطیب، اکابر دیوبند کے علوم اور خاص طور سے علوم قاسمی، علوم شیخ الہند، علوم تھانوی، علوم عثمانی کے ایک عظیم شارح، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کے پوتے، حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ مہتمم خامس دارالعلوم دیوبند کے صاحب زادے، مسلم پرسنل لاء بورڈ کے صدر، دارالعلوم دیوبند کے مہتمم اور حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے خلیفہ تھے۔

آپ کی ولادت باسعادت محرم الحرام ۱۳۱۵ھ مطابق جون ۱۸۹۷ء بروز اتوار دیوبند میں ہوئی، آپ کا نام نامی محمد طیب تجویز کیا گیا اور تاریخی نام مظفر الدین رکھا گیا، پہلے نام سے آپ نے شہرت پائی۔

سات سال کی عمر میں آپ دارالعلوم دیوبند میں داخل کئے گئے جہاں آپ نے دو سال کی قلیل مدت میں پورا قرآن مجید مع صحت وتجوید مکمل فرمایا، حفظ قرآن سے فراغت کے بعد درجہ فارسی میں آپ کو داخل کیا گیا اور وہاں سے پانچ سال میں پورا نصاب مکمل کرکے ۱۳۳۷ھ میں آپ فارغ ہوئے، آپ کے اساتذہ میں علامہ انور شاہ کشمیریؒ، شیخ الہندؒ، حکیم الامت حضرت تھانویؒ، مفتی اعظم مولانا عزیز الرحمٰن عثمانیؒ، حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ، حضرت مولانا سید اصغر حسینؒ جیسے نامور علماء شامل ہیں۔

فراغت کے بعد دارالعلوم دیوبند ہی میں درس وتدریس کا آغاز کیا اور درس نظامی کی مختلف علوم وفنون کی کتابیں پڑھائیں، تدریسی زمانہ ۱۳۳۷ھ سے ۱۳۴۳ھ تک رہا، ۱۳۴۳ھ میں اکابر ومشائخ کے مشورہ پر نائب مہتمم کا عہدہ سنبھالا اور ۱۳۴۸ھ میں مستقل مہتمم بنادئے گئے اور ۱۴۰۱ھ تک مسند اہتمام پر فائز رہے۔

۱۳۳۹ھ میں حضرت شیخ الہندؒ سے بیعت ہوئے، شیخ الہندؒ کی وفات کے بعد ۱۳۵۰ھ میں حضرت تھانویؒ سے اجازت وخلافت سے سرفراز فرمائے گئے۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کی شخصیت زمانی رقبہ کے لحاظ سے بھی بہت وسیع اور جامع تھی اور معنوی لحاظ سے بھی، زمانی رقبہ تو ۸۸ سال کا ہے جس میں ابتدائی زمانہ نکال دیا جائے تو بھی ستر سال کے قریب ہوتے ہیں، معنوی رقبہ اس لئے وسیع ہے کہ علم وفضیلت، بصیرت، وسعت علم اور علم کی پختگی اور رسوخ، خدمت دین اور اس کے ساتھ اصلاح و وعظ اور شاد، عوام سے رابطہ، تربیت و دعوت، بیعت وارشاد، ان سب پہلوؤں اور گوشوں پر ان کی زندگی محیط تھی، واقعہ یہ ہے کہ شاید کم سے کم ہندوستان میں کسی علمی و دینی شخصیت کو کم ایسی ہر دلعزیزی، عام شہرت ومقبولیت اور مختلف دینی اداروں اور جماعتوں کا اعتماد حاصل ہوا ہوگا، جو ان کو حاصل تھا۔ اس کے ساتھ ان کو طویل عرصہ تک دارالعلوم دیوبند جیسے عظیم وجلیل اور بین الاقوامی شہرت کے ادارہ کی خدمت اور ترقی کا موقع ملا، ان کی اس عام مقبولیت اور جامعیت اور ان کی ذات کا اختلافات سے بالاتر ہونے ہی کا نتیجہ تھا کہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی صدارت کے لئے روز اول سے ان کی وفات کے دن تک ان سے زیادہ موزوں اور متفق علیہ صدر نظر نہیں آیا اور وہ اس عہدہ پر باتفاق آراء اس کی تاسیس اور قیام کے پہلے دن سے وفات کے دن تک رہے۔

حکیم الاسلامؒ کی ذات گرامی دارالعلوم دیوبند کی اس بابرکت دور کی دل کش یادگار تھی جس نے حضرت شیخ الہندؒ، حضرت تھانویؒ، حضرت علامہ انور شاہ کشمیری اور شیخ الاسلام حضرت مولانا علامہ شبیر احمد عثمانی کا جلوہ جہاں آراء دیکھا تھا، جس ہستی کی تعلیم میں علم وعمل کے ان مجسم پیکروں نے حصہ لیا ہو، ان کے اوصاف وکمالات کا ٹھیک ٹھیک ادارک بھی ہم جیسوں کے لئے مشکل ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ حضرت حکیم الاسلامؒ کے پیکر میں معصومیت، حسن اخلاق اور علم وعمل کے جو نمونے ان آنکھوں نے دیکھے ہیں ان کے نقوش دل ودماغ سے محو نہیں ہو سکتے۔

حکمت دین کی جو معرفت اللہ تعالیٰ نے حضرت اقدس مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کو عطا فرمائی تھی، حضرت حکیم الاسلامؒ اس کے تنہا وارث تھے، اہل علم اس وقت بھی تھے اور اب بھی ہیں لیکن یہ امتیاز جو حضرتؒ کو حاصل تھا، وہ ان کے دور میں دوسرے علماء کو حاصل نہیں تھا، انہوں نے علوم قاسمی کو اپنے انداز میں اتنا آسان بنا کر پیش کیا کہ ان کی تحریر وتقریر اور ان کی زندگی حکمت قاسمیہ کی تفسیر بن گئی۔

خطابت وتقریر کی صلاحیت حضرت مولانا میں بدرجۂ کمال موجود تھی۔ ہر موضوع پر ہر طرح کے مجمع میں اس طرح خطاب کرنا کہ ان کی بات دلوں کو چھوتی ہوئی چلی جائے، ان کی تقریر کی قوت تاثیر، مخالف

سے مخالف کو بھی سر تسلیم خم کرنے پر مجبور کر دیتی تھی۔

لاہور کا ایک واقعہ ہے کہ ایک صاحب علماء دیوبند کے خلاف پروپیگنڈے سے بڑے متاثر تھے، علماء دیوبند سے برگشتہ اور طرح طرح کی بدعتوں میں مبتلا تھے، اتفاق سے مولانا لاہور گئے اور وہاں ایک اہم مقام پر آپ کے وعظ کا اعلان ہوا، یہ صاحب خود سناتے ہیں کہ میں اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ ان کے وعظ میں اس نیت سے پہنچا کہ انہیں اعتراضات کا نشانہ بناؤں گا اور موقع ملا تو اس مجلس کو خراب کرنے کی کوشش کروں گا، ابھی تقریر شروع بھی نہیں ہوئی تھی کہ اول تو حضرت حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ کا معصوم اور پُر نور چہرہ دیکھ کر ان کے ارادوں میں زلزلہ سا آ گیا، دل نے گواہی دی کہ یہ چہرہ کسی گمراہ کا نہیں ہو سکتا، پھر جب وعظ شروع ہوا اور اس میں دین کے حقائق و معارف سامنے آئے تو پہلی بار اندازہ ہوا کہ علم دین کسے کہتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ تقریر کے ختم ہونے تک میں حضرت مولانا کے آگے موم ہو چکا تھا۔ اپنے پچھلے خیالات سے توبہ کی اور اللہ تعالیٰ نے بزرگان دین کے بارے میں بدگمانیوں سے نجات عطا فرمادی۔(۱)

برصغیر کا تو شاید ہی کوئی ایسا گوشہ ہو، جہاں حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کی آواز نہ پہنچی ہو، اس کے علاوہ افریقہ، یوروپ اور امریکہ تک آپ کے وعظ و ارشاد کے فیوض پھیلے اور ان سے نہ جانے کتنی زندگیوں میں انقلاب آیا۔

حضرت مولانا ابوالحسن علی حسنی ندویؒ، حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کے سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ "ان کو نبیرۂ بانی دارالعلوم دیوبند، حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کی نسبت گرامی کا شرف حاصل تھا اور وہ نصف صدی تک مسلسل اس مؤقر اور عظیم ادارہ دارالعلوم دیوبند کے منصب اہتمام پر رہے، ان کے اہتمام میں اس ادارہ نے ایسی ترقی کی جو اس کے ابتدائی دور دیکھنے والوں کے خواب و خیال میں بھی نہ تھی، انہوں نے بڑے بحرانی موقعوں پر اس ادارہ کی حفاظت اور رہنمائی کی، انہوں نے اپنا نام اور زندگی اس ادارہ کے نام اور زندگی سے وابستہ کر دی تھ کہ ان میں ایک کا تصور دوسرے کے ساتھ آتا تھا۔

انسان کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے خلاف سننے کی صلاحیت رکھتا ہو اور سخت سے سخت بات برداشت کرے، راقم نے حضرت مولانا صاحب کو اس معاملہ میں بہت عالی ظرف اور قوی الارادہ پایا، واقفیت رکھنے والے پورے حلقہ میں یہ بات مسلّمات میں سے ہے کہ حکیم الاسلامؒ نہایت کریم النفس، بڑے شیریں اخلاق، نرم خو، نرم رو اور نرم گفتگو تھے۔ اقبال نے جو کہا ہے:

نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو

یہ تعریف حکیم الاسلامؒ پر صادق آتی ہے۔

حضرت حکیم الاسلامؒ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے دارالعلوم دیوبند کو ایک ہر دل عزیز ادارہ بنایا اور دارالعلوم کو بغیر کسی اختلاف کے عوام سے متعارف کرایا اور اس کا اس سے تعلق پیدا کیا، تقسیم سے پہلے کئی براعظم کے دورے کئے، تقسیم کے بعد پاکستان بار بار گئے، جنوبی افریقہ کا دورہ کیا، انگلستان گئے اور آخر میں امریکہ گئے۔

حضرت مولانا عوام کی اصلاح و وعظ وارشاد میں شیخ وقت حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے متبع تھے، حسن تقریر اور دعوتی و اصلاحی رنگ ان کا امتیاز تھا، جس سے ہزاروں انسانوں کو فائدہ پہنچا، ہزاروں دلوں میں دین کے احترام کا جذبہ اور علماء کے متعلق حسن ظن پیدا ہوا، ایسا خوش بیان مقرر اور واعظ، وسیع المعلومات اور نورانی شکل کا عالم مشکل سے دیکھنے کو ملتا ہے جس پر پہلی نظر پڑتے ہی قلب شہادت دیتا کہ یہ فطرتاً معصوم ہیں۔(پرانے چراغ)

حضرت مولانا صاحبؒ نے انتظامی مصروفیات کے باوجود مختلف موضوعات پر کتابیں تصنیف فرمائی ہیں۔ بعض کتابیں مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتی ہیں اور بعض کتابیں ایسی ہیں جو ان کی تقریر کو مرتب کر کے کتاب کی صورت میں چھاپی گئی ہیں، ذیل میں ان کی تصانیف کی ایک فہرست پیش کی جارہی ہے جس سے معلوم ہوگا کہ آپ کی تصانیف کا اچھا خاصا ذخیرہ مطبوعہ کتابوں کی صورت میں موجود ہے۔

(۱) تعلیمات اسلام اور مسیحی اقوام	(۲) اسلام کا اخلاقی نظام
(۳) التشبہ فی الاسلام	(۴) اسرائیل کتاب وسنت کی روشنی میں
(۵) اصول دعوت اسلام	(۶) انسانیت کا امتیاز
(۷) ایک قرآن	(۸) حدیث رسول کا قرآنی معیار
(۹) خاتم النبیین	(۱۰) روایات الطیب
(۱۱) سائنس اور اسلام	(۱۲) شان رسالت
(۱۳) شہید کربلا و یزید	(۱۴) علم غیب
(۱۵) علماء دیوبند کا دینی رخ اور مسلکی مزاج	(۱۶) مسلک علمائے دیوبند
(۱۷) فلسفہ نماز	(۱۸) کلمہ طیبہ
(۱۹) مقالات طیبہ	(۲۰) اسلامی آزادی

(۲۱) عالمی مذہب
(۲۲) مقامات مقدسہ
(۲۳) خطبات حکیم الاسلام
(۲۴) نونیۃ الآحاد
(۲۵) فلسفہ نعمت و مصیبت
(۲۶) دار العلوم کا فتویٰ اور اس کی حقیقت
(۲۷) اسلام اور فرقہ واریت
(۲۸) سفر نامہ افغانستان
(۲۹) عرفان عارف (شعری مجموعہ)

ان میں سے ہر کتاب علم و حکمت سے لبریز ہے۔

غرض حضرتؒ کی زندگی اپنے کمالات معنوی و ظاہری کے ساتھ بے حد وسیع اور ہمہ گیر ہے، ان کے اخلاق و اعمال، ان کی تدریس، ان کی مطبوعہ وغیر مطبوعہ تصانیف، افریقہ، امریکہ، لندن اور غیر ممالک عرب تک ان کے اصلاحی مواعظ، دار العلوم میں ان کی ساٹھ سالہ خدمات، دار العلوم کی علمی اور عملی زندگی کو منظّم کرنے کے لئے ان کی خصوصیات، ان کی دیانت، حلم و بردباری، شرافت طبعی اور شرافت نسبی، جمعیۃ العلماء ہند کے تعمیری دور سے ان کی وابستگی اور اس کے بہت سے اجتماعات میں ان کے معرکۃ الاراء خطبات، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں مذہبی شعور کے احیا کے لئے ان کی خدمات، مسلم پرسنل لاء بورڈ کے پلیٹ فارم پر مسلمانوں کے شخصی اور قومی حقوق کے تحفظ کے لئے ان کے قائدانہ کردار، دار العلوم کا بے مثال صد سالہ اجتماع، جو اس کا نقطہ عروج تھا اور جسے دیکھ کر مسلمانوں کے شاندار مستقبل کا اندازہ کر کے مخالفین نے وہیں سے دار العلوم کے زوال کے لئے حالات پیدا کئے۔ اپنے اساتذہ کا احترام اور ان کی اولاد سے ان کا مشفقانہ طرز عمل، طلبہ علوم دینیہ پر ان کی لگاتار شفقت، اپنے مخالفین و معاندین سے چشم پوشی کی عادت، ان کے لاتعداد ملکی وغیر ملکی سفر، مسلم لیگ اور کانگریس کے سیاسی نزاعات کے تحریکی دور میں دار العلوم کے مفاد کی خاطر ان کا محتاط طرز عمل، دار العلوم کے معاملات میں ان کے بے نظیر تدبر اور مدبرانہ حکمت عملی کے صدہا واقعات، نرمی اور شفقت کے ساتھ دار العلوم کے سینکڑوں افراد پر مشتمل عملہ سے ان کی درسی اور انتظامی خدمات کی تکمیل کرا لینے کا مخصوص طریقہ، یہ سب عنوانات حضرت والا کی سدا بہار زندگی کے پھیلے ہوئے گوشے ہیں، جن میں سے ہر ایک پر تفصیلی مضمون لکھا جا سکتا ہے۔

لاکھ ستارے ہر طرف، ظلمت شب جہاں جہاں — ایک طلوع آفتاب، دشت و چمن سحر سحر

رحمه الله رحمة واسعة واسكنه فسيح جناته

............❖............

(۱) مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی، حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ، ص:۴۱

............❖............

حکیم الاسلامؒ کی سیرت طیبہ کے چند نقوش

مولانا مفتی محمد فاروق صاحب
جامعہ محمودیہ، میرٹھ

نحمدہٗ و نصلی علی رسولہ الکریم، امابعد

ولادت

آپ کی ولادت باسعادت محرم الحرام ۱۳۱۵ھ مطابق جون ۱۸۹۷ء بروز اتوار دیوبند میں ہوئی۔ آپ کا نام محمد طیب تجویز کیا گیا اور تاریخی نام مظفر الدین رکھا گیا، اول نام سے آپ کی شہرت ہوئی۔

تعلیم وتربیت

حضرت حکیم الاسلامؒ جب اس عمر کو پہونچے جس میں عموماً بچوں کو بسم اللہ کرائی جاتی ہے، تو اکابر کے مجمع میں آپ کی بسم اللہ حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ والد ماجد حضرت شیخ الہندؒ کے ہاتھ پر ہوئی جو اس وقت دیوبند ہی نہیں بلکہ پورے ہندوستان میں علم وفضل، دین وتقویٰ کے اعتبار سے ممتاز تھے، بسم اللہ کی اس مجلس میں حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ کے علاوہ حضرت شیخ الہندؒ، حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحبؒ، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ، مولانا محمد احمد صاحبؒ اور مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ جیسے پائے کے بزرگ اور عالم تھے، بسم اللہ کے بعد اکابر نے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی، بزرگوں کے اٹھے ہوئے ہاتھوں کی اللہ نے لاج رکھی اور حضرت حکیم الاسلامؒ علم وفضل اور کمال شہرت کے اس مقام پر پہونچے کہ ہندوستان کی بہت کم علمی، دینی شخصیتوں کو یہ مقام نصیب ہوا۔

حضرت حکیم الاسلامؒ کو قرآن حفظ کے لئے حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کے مشورہ سے قاری عبدالوحید

صاحبؒ الٰہ آبادی کو الٰہ آباد سے بلوایا گیا، جب وہ دیوبند آ گئے تو حضرت شیخ الہندؒ نے حضرت مولانا احمد صاحبؒ سے گزارش کی کہ ان کو دارالعلوم میں رکھ لیا جائے تا کہ حضرت حکیم الاسلامؒ کے ساتھ دوسرے طلبہ بھی مستفید ہوسکیں، اس طرح دارالعلوم میں شعبۂ تجوید کا اجراء ہوا گویا یہ حضرت حکیم الاسلامؒ کی برکت کا پہلا ظہور رہوا۔

حضرت حکیم الاسلامؒ فرماتے تھے کہ دارالعلوم میں شعبۂ تجوید قائم ہونے کا سبب میں ہی ہوں اور میں ہی اس شعبہ کا پہلا شاگرد ہوں، ۱۳۲۶ھ میں جب آپ کی عمر ۱۱؍سال ہوئی آپ نے حفظ قرآن تجوید کے ساتھ مکمل فرمالیا، اللہ تعالیٰ نے آپ کو جہاں جمال صورت وسیرت سے نوازا تھا وہیں آپ کی آواز بلند تھی اور اس میں لحن داؤدی بھی تھا، جس مجلس میں آپ قرآن کی تلاوت فرماتے، ایک سماں بندھ جاتا، اکابر آپ سے قرآن سنتے، حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی خدمت میں تھانہ بھون حاضر ہوتے تو حضرت جہری نماز کے لئے آپ ہی کو آگے بڑھاتے، یہ صرف حضرت حکیم الاسلامؒ کی خصوصیت تھی، ورنہ خانقاہ تھانہ بھون کی مسجد میں حضرت تھانویؒ کی موجودگی میں دوسرا امام نہیں ہوتا تھا۔

حفظ قرآن کی تکمیل کے بعد آپ نے فارسی، ریاضی وغیرہ کی تکمیل کی، ۱۳۳۰ھ میں عربی میں داخل ہوئے اور آپ کی ابتدائی کتابیں بھی انہیں کے پاس ہوئیں جو علوم اسلامیہ میں امامت کا درجہ رکھتے تھے، جیسے حضرت شیخ الہندؒ، حکیم الامت حضرت تھانویؒ، علامہ انور شاہ کشمیریؒ، مفتی اعظم مولانا عزیز الرحمٰن صاحبؒ، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ وغیرہم انہیں حضرات اساتذہ سے علوم عقلیہ ونقلیہ کی تکمیل کی اور ۱۳۳۷ھ میں آپ فارغ ہوئے۔

جامع الصفات ہستی

آپ کو اللہ تعالیٰ نے تمام تر خوبیوں سے نوازا تھا اور مجمع کمالات بنایا تھا، اسلاف صالحین کی تمام خصوصیات وکمالات آپ میں موجود تھیں، حضرت مولانا اشرف علی سعودی صاحب دامت برکاتہم مدیر مدرسہ ماہی سبیل بنگلور رقم طراز ہیں:

’’حکیم الاسلامؒ! آپ علم وحکمت کا چمکتا ہوا چاند تھے جس کی خنک اور ٹھنڈی چاندنی ہزاروں کے لئے وجہ سکون اور سامان قرار تھی کسی بھی محفل میں آپ قدم رنجہ فرماتے تو واقعی محسوس ہوتا کہ ماہتاب علم وحکمت طلوع ہورہا ہے، چادر مہتاب پھیلتی جارہی ہے اور وہ دماغ سکون وطمانینت کی ایسی لطیف کیفیات سے

آسودہ ہوتے چلے جاتے ہیں جن کو بیان نہیں کیا جاسکتا، اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ آپ حکیم الاسلام تھے، خطیب الاسلام تھے، فخر الاماثل تھے، زبدۃ الافاضل تھے، عظیم المرتبت تھے، رفیع المرتبت تھے، رفیع المنزلت تھے، رئیس المتکلمین تھے، سلطان الواعظین تھے، پیر رہرواں تھے، سالار قافلہ تھے، سرخیل طائفہ تھے، یادگار اسلاف تھے، تاج دار خلف تھے، بزروں کی آبرو تھے، خردوں کی آرزو تھے، چشم و چراغ تھے، گل سرسبد چمنستان قاسمی تھے، ملت اسلامیہ کی شان تھے، جماعت علماء کی آن تھے''۔

اللہ رب العزت نے آپ کو اتنے اوصاف عالیہ سے نوازا تھا اور آپ کی ذات بابرکات میں اتنے کمالات ودیعت فرمادیئے تھے کہ ہر خطاب آپ پر جچتا تھا اور ہر لقب آپ کی کلاہ افتخار میں نگینے کی طرح جڑتا تھا۔

کہتے تھے:

بخت اگر رسا شود دست دہد سبوئے خوش — از نگہ سمن بری لالہ رخ، نکوئے خوش
باغ و بہار ماندید یعنی کہ جنت النعیم — روئے خوش است وخوئے خوش وبوئے خوش وگلوئے خوش

درس وتدریس

فراغت کے بعد دارالعلوم دیوبند میں درس و تدریس کا آغاز کیا اور درس نظامی کی مختلف کتابیں پڑھائیں، تدریسی زمانہ ۱۳۳۷ھ سے ۱۳۴۳ھ تک رہا، مشکوٰۃ شریف عرصہ تک پڑھائی، اس کے علاوہ احادیث کی دوسری کتابیں بھی گاہے بگاہے آپ کے ذمہ رہیں، حضرت مولانا فخر الدین صاحبؒ کے انتقال کے بعد کچھ دنوں تک آپ نے بخاری شریف کا درس دیا مگر ضعف و پیری، کثرت مشاغل اور کثرت اسفار کی وجہ سے مستقل اس کا درس دینا آپ کے لئے دشوار تھا، جس کی وجہ سے آپ نے بخاری شریف کی تدریس سے سبک دوشی کرلی، حجۃ اللہ البالغہ سے آپ کو خصوصی شغف تھا، اس کتاب کو آپ نے ہمیشہ پڑھایا اور اخیر میں بھی اس کا درس دیتے رہے۔

بیعت وخلافت

۱۳۳۹ھ میں حضرت شیخ الہندؒ سے بیعت ہوئے، شیخ الہندؒ کی وفات کے بعد حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی طرف رجوع کیا اور تربیت حاصل کی اور ۱۳۵۰ھ میں حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے اجازت وخلافت سے سرفراز کئے گئے، تاریخ سلوک وتصوف میں یہ منفرد سعادت کبریٰ حضرت حکیم الاسلامؒ کو مشیت ربانی نے عطا فرمائی کہ ان کے مرشد حضرت حکیم الامتؒ نے مرض

وفات میں ایک مرتبہ حاضری کے موقعہ پر آپ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بوسہ دیا اور اپنے قلب مبارک پر رکھ کر فرمایا کہ: ''اس ہاتھ سے ایک عجیب وغریب سکون وسکینت اپنے قلب میں محسوس کرتا ہوں'' اور اس کے بعد حضرت حکیم الاسلامؒ کے علمی وروحانی فیضان اور عمر وصحت وسلامتی میں برکت کے لئے مستجاب دعائیں دے کر رخصت فرمایا۔

شعروشاعری

بلند پایہ مصنف اور خطیب ہونے کے ساتھ آپ قادر الکلام شاعر بھی تھے اور جب کبھی کہنے پر آتے تو چار چار پانچ پانچ سو اشعار پر مشتمل نظمیں کہہ ڈالتے تھے، جس پر آپ کے شعری مجموعے (۱) جنون شباب (۲) عرفان عارف (۳) آنکھ کی کہانی (۴) ارمغان دارالعلوم شاہد ہیں۔

اہتمام دارالعلوم دیوبند

دارالعلوم کا منصب اہتمام ہمیشہ بڑا باوقار رہا ہے، اس منصب پر جو حضرات رہے ہیں، وہ اپنے وقت کی یادگار ونابغہ روزگار شخصیتوں میں سے تھے، دارالعلوم کے مہتممین کی فہرست میں حضرت حاجی عابد حسین صاحبؒ، حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانیؒ رحمہم اللہ جیسے لوگ ہیں۔ ان میں حضرت حکیم الاسلامؒ کے والد ماجد حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ دارالعلوم کے مہتمم رہے اور نائب مہتمم حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانیؒ تھے۔ ۱۳۴۳ھ میں حضرت حکیم الاسلامؒ کو آپ کے والد ماجد صاحب کا قائم مقام کر دیا گیا۔ حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کے انتقال کے بعد حضرت عثمانیؒ مہتمم ہو گئے اور آپ نیابت اہتمام پر رہے، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ کے انتقال کے بعد ۱۳۴۸ھ میں آپ نے منصب اہتمام کو سنبھالا اور تاحیات اس عہدہ کو زینت بخشی۔

اس طرح دارالعلوم دیوبند کے ابتدائی انسٹھ سال میں پانچ مہتممین نے اپنی مخلصانہ عظیم خدمات کے ذریعہ اس مدرسہ عربی کو ملک گیر دارالعلوم کے مقام رفیع تک پہونچایا اور اس کی عمر کے مابعد ساٹھ سال میں تن تنہا حضرت حکیم الاسلامؒ نے بلاشرکت غیرے اس دارالعلوم کو ''عالمی مرکزی اسلامی یونیورسٹی'' کے بام عروج تک پہونچایا۔

آپ کے دور میں دارالعلوم میں ہر اعتبار سے ترقی ہوئی، عمارات کا طویل سلسلہ قائم ہوا، طبیہ کالج کا قیام عمل میں آیا، مدرسین کا اضافہ ہوا۔

حضرت حکیم الاسلامؒ کا مفتاح العلوم جلال آباد سے تعلق

حضرت حکیم الاسلامؒ کو مفتاح العلوم سے خاص تعلق تھا، بعض دفعہ بلا دعوت اور بلا اطلاع بھی اچانک تشریف آوری ہوجایا کرتی تھی۔

ایک دفعہ اچانک تشریف آوری ہوئی، تمام طلبہ واساتذہ دارالحدیث میں جمع ہوگئے، حضرت حکیم الاسلامؒ کے ہمراہ باہر کے (غیر ملکی) مہمان بھی تھے، حضرت حکیم الاسلامؒ نے اپنی تشریف آوری کی وجہ بتاتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ ان مہمانوں کو، دارالعلوم دکھانے کے لئے آیا ہوں کہ یہ بھی دارالعلوم ہے، جہاں جہاں دارالعلوم کے فضلاء کام کررہے ہیں، وہ سب دارالعلوم ہی ہے کہ وہ دارالعلوم کا ہی فیض ہے۔

بے نفسی وتواضع کا عجیب واقعہ

ایک واقعہ حضرت علامہ رفیق احمد صاحب قدس سرہٗ نے مفتاح العلوم کے ابتدائی ایام کا سنایا جس سے حضرت حکیم الاسلامؒ کے بہت سے کمالات پر روشنی پڑتی ہے۔

فرمایا: مفتاح العلوم جلال آباد کے سالانہ جلسہ میں حضرت مدنی قدس سرہٗ کی تشریف آوری تجویز تھی، حضرت مدنی قدس سرہٗ کو لینے کے لئے میں دارالعلوم دیوبند حاضر ہوا، وہاں دیکھا کہ حضرت مدنی قدس سرہٗ سخت علیل ہیں، سفر دشوار ہے جس کی بنا پر حضرت مدنی نے معذرت فرمادی، حضرت مدنی قدس سرہٗ کے معذرت فرمانے کے بعد میں حضرت حکیم الاسلامؒ کی خدمت میں حاضر ہوا، حضرت حکیم الاسلامؒ دارالاہتمام میں کام میں مشغول تھے، ان کے سامنے صورت حال رکھی کہ اس طرح جلال آباد میں جلسہ ہے، حضرت مدنی قدس سرہٗ کی تاریخ ہے مگر حضرت مدنیؒ شدت علالت کی بنا پر تشریف لے جانے سے معذور ہیں اس لئے آپ تشریف لے چلیں، حضرت حکیم الاسلامؒ نے یہ سن کر قلم جس سے لکھ رہے تھے، اٹھا کر رکھ دیا اور فرمایا: ذرا اتنی مہلت دیجئے کہ میں گھر تک ہو آؤں، گھر تشریف لے گئے اور ایک جوڑا کپڑے لنگی میں لپیٹ کر ہاتھ میں لئے ہوئے تشریف لائے کہ چلئے، اس وقت نہ موٹر کی سہولت تھی نہ بسوں کا انتظام صحیح تھا، جلال آباد جانے کے لئے دیوبند سے پہلے سہارنپور جانا ہوتا تھا اور وہاں سے بذریعہ ٹرین جلال آباد پہنچتے تھے۔ چنانچہ دیوبند سے سہارنپور پہونچے، ٹرین صبح کے وقت تھی، شام کو سہارنپور پہونچے، شب میں ایک چھوٹی سی مسجد میں قیام فرمایا اس وقت نہ بجلی تھی نہ پنکھوں کا دور شروع ہوا تھا، مچھروں کی خوب کثرت تھی، اس حالت میں مسجد میں قیام کیا اور صبح ٹرین میں سوار ہوکر جلال آباد پہونچے۔ جلال آباد اسٹیشن پر مفتاح العلوم کے اساتذہ

اور طلبہ حضرت مدنی قدس سرہٗ کے استقبال کے لئے کھڑے ہوئے تھے، انہیں حضرت مدنیؒ کی علالت اور معذوری کا علم نہیں تھا، سب نے یہی سمجھا کہ حضرت مدنیؒ قدس سرہٗ تشریف لے آئے ہیں، سب نے حضرت مدنی زندہ آباد، شیخ الاسلام زندہ باد کے نعرے لگانے شروع کر دیے اور مدرسہ تک اسی طرح نعرے لگاتے رہے اور حضرت حکیم الاسلامؒ پر اس کا کوئی اثر نہیں تھا، بخوشی سفر پورا کیا اور جلسہ سے فارغ ہو کر پھر سہارنپور کے راستہ سے ہی واپسی ہوئی، اس واقعہ سے حضرت حکیم الاسلامؒ کی خورد نوازی، رواداری، تواضع و انکساری، صبر و تحمل، دینی خدمت کا جذبہ اور اس کے لئے قربانی و مجاہدہ جیسی متعدد صفات کا علم ہو جاتا ہے۔

دوسرا واقعہ

حضرت حکیم الاسلامؒ کے تحمل و بردباری کا ایک عجیب واقعہ بندہ کے علم میں بھی ہے، بڑوت کے قریب ایک بستی (کشن پور برال) میں جلسہ کی تاریخ حضرت حکیم الاسلامؒ نے طے فرمائی تھی، حضرت کو اس بستی کا نام یاد نہیں رہا، بڑوت تشریف لائے اور وہاں پھونس والی مسجد میں دریافت فرمایا کہ یہاں قریب میں کسی بستی میں جلسہ ہے، بتایا گیا کشن پور برال میں آج جلسہ ہے، کشن پور برال پہونچے معلوم ہوا کہ شام سے جلسہ شروع ہوگا، حضرت حکیم الاسلامؒ دو پہر کو ہی پہنچ گئے تھے، استنجے کا تقاضہ ہوا، کسی نے پیشاب خانہ کی طرف رہنمائی کی، دیکھا کہ اینٹیں اوپر نیچے کر کے رکھ دی گئی ہیں اور اینٹیں جمی ہوئی بھی نہیں ہیں، قدم رکھنے سے ان کے گر جانے کا خطرہ ہے اور پیشاب خانہ سے نکلنے کی نالی بھی صاف نہیں جس کی وجہ سے پیشاب اور پانی وغیرہ جمع ہو رہا ہے، انتہائی ضعف و نقاہت کی حالت میں بمشکل پیشاب سے فراغت ہو سکی مگر زبان سے صرف اتنا فرمایا:

یہاں پیشاب کرنا بھی بڑا مجاہدہ ہے: اس کے علاوہ نہ ڈانٹ نہ ڈپٹ، نہ اظہار ناراضگی، البتہ شام کو کھانا تناول نہیں فرمایا کہ یہاں بڑے استنجے کا تقاضہ ہوا تو کیا ہوگا اور چائے وغیرہ بھی بہت معمولی برائے نام ہی لی، اصرار کرنے پر فرمایا، خواہش نہیں۔

ہنسی خوشی رہے، ادنیٰ درجہ ناراضگی کا بھی اظہار نہیں ہوا، اہل مدرسہ نے مزید مہربانی یہ فرمائی کہ شام کی نشست میں تقریر نہیں کرائی، حضرت حکیم الاسلامؒ نے تقاضہ بھی فرمایا تو مدرسہ والوں نے کہا کہ حضرت کا بیان تو صبح کی نشست میں تجویز ہے، لوگوں کو اسی کی اطلاع کی گئی ہے، حضرت حکیم الاسلامؒ نے اس کو بھی منظور فرما لیا اور رات بھر اسی طرح بلا کچھ کھائے پیئے قیام فرمایا۔

صبح کی نشست میں نو بجے حضرت حکیم الاسلامؒ کا بیان کرایا، انتہائی بشاشت اور خوش دلی اور انتہائی اطمینان کے ساتھ بیان فرمایا، بیان سے فارغ ہوکر انتہائی بشاشت کے ساتھ واپسی ہوئی، حضرت حکیم الاسلامؒ کا تحمل دیکھنے کے قابل تھا، وہاں سے واپس ہوکر ہی کسی جگہ استنجے وغیرہ سے فراغت فرمائی ہوگی اور کمال یہ کہ مدرسہ والوں پر یہ ظاہر بھی نہیں ہونے دیا کہ اس وجہ سے کھانا نہیں کھایا، یا یہ پریشانی ہے۔

یہ تو کئی دفعہ دیہات کے جلسوں میں دیکھنے کا اتفاق ہوا کہ دیہاتیوں کو موٹا جھوٹا کھانا، بھینس کا گوشت، مرچیں زیادہ، سالن ٹھنڈا، روٹی سخت اور حضرت قدس سرہٗ نے انتہائی رغبت کے ساتھ اس کو تناول فرمایا، چھوٹے چھوٹے لقمے بہت آہستہ آہستہ (چوں کہ دانت بنے ہوئے تھے اس وقت بہت آہستہ کھایا جاتا تھا) کھانے کے دوران لطائف بھی ہوتے رہے۔

تواضع وعبدیت کا تیسرا واقعہ

ایک دفعہ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند میں حضرت حکیم الاسلامؒ تشریف لائے اور حضرت اقدس مفتی محمود حسن صاحب نوراللہ مرقدہٗ کے سامنے دوزانو بیٹھ گئے، حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ کسی فتوے کے لکھنے میں مشغول تھے، جب حضرت مفتی صاحبؒ نے دیکھا تو فوراً کھڑے ہوگئے اور حضرت حکیم الاسلامؒ سے درخواست کی اوپر مسند پر تشریف رکھیں، حضرت حکیم الاسلامؒ سے عرض کیا اس وقت آپ مہمان ہیں اور مہمان کو میزبان جس جگہ بٹھائے اس کو اس جگہ بیٹھنا چاہیے، جب سائل بن کر تشریف لائیں گے اس وقت آپ وہیں بیٹھیں گے چنانچہ حضرت مفتی صاحبؒ کے اصرار پر حضرت حکیم الاسلامؒ مسند پر تشریف فرما ہوئے، ایک ایسی عظیم شخصیت مہتمم صاحبؒ کی کہ اپنے ماتحت ملازم کے ساتھ یہ معاملہ کس درجہ تواضع و عبدیت کو ظاہر کررہا ہے، اس لئے کہ فقیہ الامت حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ باوجود عظیم شخصیت ہونے کے حضرت مہتمم صاحب قدس سرہٗ کے ماتحت اور ملازم تھے۔

کمالِ احتیاط

دارالعلوم دیوبند میں شوریٰ واہتمام کا ہنگامہ شباب پر تھا اسی موقعہ پر میرٹھ میں تشریف آوری ہوئی، شہر والوں کو خیال تھا کہ حضرت مہتمم صاحب قدس سرہٗ وعظ میں دارالعلوم کے اس اختلاف سے متعلق تفصیلات بیان فرمائیں گے، اہل شہر نے بڑی تعداد میں بیان میں شرکت کی اور بہت سے حضرات اسی نیت سے حاضر ہوئے کہ دارالعلوم کے اختلاف کے متعلق تفصیلات سنیں گے مگر سب حاضرین کو انتہائی تعجب ہوا کہ دوڈھائی

گھنٹہ تفصیلی بیان میں دارالعلوم کے اختلاف سے متعلق ایک لفظ بھی بیان نہیں فرمایا، گویا کہ کچھ ہوا ہی نہیں اس سے زیادہ کمال احتیاط اور کیا ہوگی۔

دارالعلوم سے عشق

حضرت حکیم الاسلامؒ کو دارالعلوم سے عشق کے درجہ کا تعلق تھا، رات دن دارالعلوم کی ہی فکر میں رہتے حتی کہ کوئی بھی وعظ اور کوئی بھی بیان ہوتا، کسی بھی موضوع پر ہوتا مگر عموماً بیان میں کسی بھی ادنیٰ مناسبت سے دارالعلوم کی خدمات کا تذکرہ آ ہی جاتا اور دارالعلوم کا تذکرہ فرماتے ہوئے دارالعلوم کے ساتھ غیر معمولی تعلق کا اندازہ ہوتا جس کو تمام سامعین محسوس فرماتے۔

ایک دفعہ شہر میرٹھ میں حضرت حکیم الاسلامؒ کی تشریف آوری ہوئی، مرکز تبلیغ خیر المساجد، خیر نگر میں ہفتہ واری تبلیغی اجتماع میں حضرت حکیم الاسلامؒ کا بیان شروع ہوا، شروع میں دعوت وتبلیغ کی اہمیت وضرورت سے متعلق بیان فرمایا، پھر اس دعوت وتبلیغ کی مناسبت سے دارالعلوم کی خدمات کا تذکرہ شروع فرمایا اور پورا بیان اسی پر ختم فرمایا۔

ایک عجیب خواب

اسی دوران ایک دوسرے نیک صالح شخص نے خواب دیکھا کہ ایک مکان میں چند بزرگ حضرات تشریف فرما ہیں، ایک حضرت گنگوہی علیہ الرحمہ ہیں اور ایک حضرت مولانا مدنی نوراللہ مرقدہٗ اور تیسرے بزرگ حضرت شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب قدس سرہٗ ہیں۔ یہ تینوں اکابر تشریف فرما ہیں، اتنے میں باہر سے حضرت حکیم الاسلامؒ دروازے سے اندر داخل ہوئے اور ان حضرات کے قریب جا کر بیٹھ گئے۔

حضرت گنگوہی قدس سرہٗ نے وعظ فرمایا جس میں خطبہ کے بعد تین آیات تلاوت فرمائیں اور انہیں آیات سے متعلق بیان شروع فرمایا، وہ تین آیات یہ ہیں۔

”وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ. فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَ كُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ. وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ.

اہل علم حضرات جانتے ہیں کہ یہ آیات آنحضرت ﷺ کی تسلی کے لئے نازل ہوئی ہیں، یہود اور کفار آنحضرت ﷺ برا کہتے تھے جس سے آنحضرت ﷺ کو تکلیف ہوتی تھی، اس موقع پر آنحضرت ﷺ کی تسلی کے لئے یہ آیات نازل ہوئیں۔

وعظ کی مقبولیت

حق تعالیٰ شانہٗ حضرت حکیم الاسلامؒ کو شان مقبولیت عطا فرمائی تھی، آپ کی ایک ایک ادا سے مقبولیت کی شان ٹپکتی محسوس ہوتی تھی، آپ کا وعظ بھی انتہائی مقبول ہوتا تھا جس بستی یا جس شہر میں وعظ تجویز ہوتا لوگ اطراف و جوانب سے کھنچ کھنچ کر چلے آتے تھے اور وعظ حالاں کہ انتہائی سادگی کے ساتھ ہوتا تھا مگر انتہائی پُر مغز اور پُر حکمت ہوتا تھا اور بیان میں انتہائی کشش ہوتی تھی اور سامعین پر ایک محویت طاری ہوجاتی تھی کہ وعظ ختم ہونے سے پہلے کوئی اٹھنے کا نام نہیں لیتا تھا۔

بندہ کو سب سے پہلے حضرت قدس سرہٗ کا وعظ میرٹھ میں سننے کی سعادت میسر آئی، محلّہ لال کرتی، شہر میرٹھ میں وعظ کا اعلان تھا، بندہ کا بچپن تھا، آٹھ دس سال کی عمر ہوگی، وعظ میں شرکت کے لئے ہمارے یہاں زین پور سے بس بھر کر آئی تھی جس میں بندہ بھی شریک تھا "اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِہٖ وَ یَدِہٖ" اور "اَلْمُؤْمِنُ منْ امنه النَّاس علی دِمائِهِمْ وَ اَمْوَالِهِمْ" یہ دو حدیثیں پڑھیں اور انہیں دو حدیثوں پر مفصل بیان ہوا، سامعین کا بہت بڑا مجمع تھا اور سب انتہائی ساکت وصامت اہل محلّہ کی اکثریت اگرچہ فرقہ بریلویت سے تعلق رکھتی ہے مگر سب انتہائی متأثر تھے۔

حکمت وبصیرت

حکمت وبصیرت کا حق تعالیٰ شانہٗ نے وافر حصہ آپ کو عطا فرمایا تھا، جہاں تشریف لے جاتے اس حکمت و بصیرت کا معاملہ فرماتے اس وجہ سے ہر طبقہ اور مکتب فکر کے لوگ آپ سے خاص عقیدت رکھتے تھے۔

گردوارہ میں بیان

سکھوں نے اپنے خاص گردوارہ میں مدعو کر کے بیان کرایا، حضرت قدس سرہٗ نے گرونانک کی سیرت پر مبسوط بیان فرمایا جس سے سکھ لوگ بہت متاثر ہوئے اور ان کے بڑے لوگوں نے بیان کیا کہ گرونانک سے متعلق اتنی معلومات تو ہم کو بھی نہیں تھی۔

ایک مناظرہ میں شرکت

حضرت والا قدس سرہٗ کا مزاج مناظرانہ نہیں تھا، مگر ایک جگہ مناظرہ تجویز تھا اور اس میں حضرت حکیم الاسلامؒ کو مدعو کیا تھا، فریق مخالف نے نقض امن کا اندیشہ ظاہر کر کے وہاں کے تھانہ والوں سے یہ طے کرالیا کہ کوئی

فریق دوسرے فریق کے بانی یا ذمہ دار کا نام لے کر کچھ بیان نہیں کرے گا، حضرت حکیم الاسلامؒ نے مبسوط بیان فرمایا اور فریق مخالف کے تمام عقائد باطلہ کا رد انتہائی خوبصورتی کے ساتھ فرما دیا کہ حکام کو یا فریق مخالف کے ذمہ داروں کو کچھ کہنے کی گنجائش نہیں مل سکی۔

حضرت حکیم الاسلامؒ کا انداز یہ تھا کہ چوں کہ قانونی طور پر یہ پابندی لگا دی گئی ہے کہ کوئی کسی قائد یا شخصیت کا نام لے کر بیان نہیں کرے گا اس لئے ہم کسی کا نام نہیں لیتے قانون کا احترام کرتے ہیں۔ اگر قانونی پابندی نہ ہوتی میں یہ کہتا کہ فلاں صاحب نے یہ لکھا ہے یہ لکھا ہے اور فلاں جگہ یہ بیان کیا ہے جس کا حکم یہ ہے لیکن چوں کہ قانونی پابندی ہے اس لئے میں یہ نہیں کہتا، اسی طرح فریق مخالف کی ایک ایک چیز بیان فرما کر پوری تردید فرما دی۔

حکیم الاسلام کا لقب

اسی حکمت و دانائی کی وجہ سے امت نے آپ کو حکیم الاسلام کا لقب دیا تھا جس کے آپ بجا طور پر مستحق تھے۔

مجمع الکمالات والمحاسن

غرض کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے حضرت حکیم الاسلامؒ کو ان اوصاف و کمالات سے نوازا تھا کہ حضرت والا قدس سرہٗ بجا طور پر مجمع الکمالات والمحاسن تھے اور آپ کی ذات ستودہ صفات گلدستۂ محاسن و کمالات تھی، جس کی تصویر کشی بھی مشکل بلکہ ناممکن ہے ؎

گر مصور صورت آن دل ستاں خواہد کشید — لیک حیرانم کہ نازش را چساں خواہد کشید

............❖............

حکیم الاسلامؒ بحیثیت شاگرد
امام العصر حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ

مولانا نسیم اختر شاہ قیصر
استاذ دارالعلوم وقف دیوبند

انسانی زندگی رشتوں کے درمیان بٹی ہوئی ہے، ماں باپ اور اولاد کا رشتہ، بھائی بہن کا رشتہ، شوہر بیوی کا رشتہ یہ تمام رشتے محترم بھی ہیں اور قابل عزت بھی ان رشتوں کے سرے انسان کو ڈھونڈنے اور تلاش کرنے سے مل جاتے ہیں، مگر دنیا کا ایک رشتہ ایسا بھی ہے جس کا چلن عام ہے اور جس کو استاد اور شاگردوں کا رشتہ کہا جاتا ہے، لیکن تلاش بسیار کے بعد بھی اس کا سرا ہاتھ نہیں آتا، دنیا کے اس کونے سے لیکر اس کونے تک زندگی کے ہر شعبے اور ہر میدان میں استاد اور شاگرد کا یہ تعلق قائم ہے اور جب سے انسان نے اس دنیا میں قدم رکھا اسی وقت سے اس رشتے کی ابتدا ہوئی اور دنیا کے اختتام تک اسی کا سلسلہ چلتا رہے گا، ہم بہت تلاش کرنے اور تحقیق کی وادیوں میں کچھ حاصل کرنے کے لئے نکلتے ہیں، تو کتاب برحق قرآن کریم میں انسان کے اول استاد کی حیثیت سے ہمیں یہ نام ملتا ہے، قرآن کا ارشاد ہے کہ:

وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا. اور سکھلا دیئے اللہ نے آدم کو نام سب چیزوں کے۔

قرآن کے اس اعلان کے بعد خالق کائنات کی ذات اقدس انسان کے اول استاد کی حیثیت سے سامنے آتی ہے، تخلیق آدم کے مرحلے سے فارغ ہونے کے بعد رب العالمین نے فرشتوں کی موجودگی میں آدم کی خلافت کو صحیح ثابت کرنے کے لئے ان سب کو ایک امتحان سے گذارا اور اسی کے درمیان آدم کو نام سکھلانے کا اعلان فرمایا، اس طرح حضرت حق جل مجدہٗ کی ذات اقدس کے ذریعہ یہ مرحلہ تکمیل کو پہنچا، پھر خلافت انسانی کا دور شروع ہوا تو استادی اور شاگردی کا یہ تعلق اس قدر مضبوط و مستحکم

اور وسیع ہوتا چلا گیا کہ آج زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جہاں یہ عمل کارفرما نہ ہو، ایک ڈاکٹر ایک وکیل ایک جج ایک آفیسر سے لیکر ایک چپراسی ایک بڑھئی ایک معمار تک سب اس رشتے کی مضبوط زنجیروں میں بندھے ہوئے ہیں، ایسا نہیں ہوا کہ کوئی آدمی ماں کے پیٹ سے تعمیر کا فن سیکھا سکھایا ہوا ہو یا کوئی بچہ وکالت پر مکمل عبور کے ساتھ اس دنیا میں آیا ہو بلکہ ایک ماہر معمار کی سرپرستی سے ہی اس بچے کی تعمیری صلاحیتیں کھل کر سامنے آئیں اور وہ کچھ سیکھ سکا، ایک ماہر اور کامیاب وکیل کی نگرانی اور توجہ سے ہی ایک کم عقل اور کم فہم بچہ وکالت کی باریکیوں اور نزاکتوں کو مرحلہ وار سمجھنے کے قابل ہوسکا، اگر خود کسی شخص کو آپ کسی میدان اور کسی فن پر خود بخود دکچھ کرتے اور بناتے دیکھتے ہیں تو لازمی طور پر اس شخص کی کاوشوں میں کوئی نقص، کوئی جھول ضرور ہوگا، جس پر ممکن ہے اس کے ہمعصروں کی نظر نہ پڑے لیکن اس کے بعد آنے والی نسلیں اس کی خرابیوں اور نقائص پر ضرور مطلع ہوجائیں گی، ثابت ہوا کہ صدیوں سے انسانی سانسوں کے ساتھ ساتھ قدم سے قدم ملا کر استاد اور شاگرد کا یہ سلسلہ چل رہا ہے۔

اب آیئے ایک دوسری دنیا کی طرف نظر ڈالیں جسے علم کی دنیا کہا جاتا ہے اس دنیا میں استاد اور شاگرد کا جو رشتہ ہے اس کی اپنی ایک شان ہے، ایک عظمت ہے اور اپنا جداگانہ انداز ہے، دنیا کے کسی فن کو سیکھنے یا جاننے کے لئے رات دن شدید محنت، خلوص، استاد کا احترام اور دشواریاں اور پیچیدگیاں اس راہ کا اصل سامان ہیں، جوان پر قابو پالیتا ہے، کامیاب ہوجاتا ہے، علم دین کی طلب اور اس کے حصول کی خواہش جن دلوں میں پیدا ہوتی ہے، ان کے جذبات دوسرے ہوتے ہیں، ان کے خیالات میں فرق ہوتا ہے، اور ان کے فرائض کا دائرہ یکسر مختلف ہوجاتا ہے، اس میدان میں عقیدت ومحبت، احترام وادب اور تقدس وپاکیزگی کا وہ شدید جذبہ درکار ہوتا ہے، جس سے واقعی کچھ پایا اور حاصل کیا جاسکے، یہاں لاپرواہی سے اجتناب اور استاد کی عظمت کو ہر وقت سامنے رکھنا ضروری ہوتا ہے، اگر ایسا نہیں ہوتا یا کچھ لوگ اپنے آپ کو اس قابل نہیں بناپاتے تو وہ علم سے یکسر محروم رہ جاتے ہیں، اور ہمارے اور آپ کے درمیان پھیلے ہوئے ہزاروں انسانوں میں ایسے لوگوں کا مل جانا مشکل نہیں ہے۔

علم کی عظمت کا اندازہ آپ حضرت امام اعظمؒ کے اس مشہور واقعہ سے لگاسکتے ہیں کہ ایک بار کسی مسئلہ کے سلسلہ میں آپ نے کسی بھنگی سے کچھ دریافت فرمایا، بھنگی کے جواب پر آپ ہمیشہ اس کی عزت کرتے رہے، وہ اس لئے کہ ایک مسئلہ کو حل کرنے اور سلجھانے میں آپ کو اس کا تعاون حاصل ہوا تھا۔

پھر تاریخ انسانی میں ایسے شاگردوں کی بھی کمی نہیں، جنھوں نے عمر بھر اس جانب اپنے پاؤں نہیں

کئے جدھران کے استاد کا مکان یا رہائش گاہ تھی۔ عقیدت واحترام کے ان ہی پاکیزہ جذبات کی بنا پر اسلامی تاریخ میں ایسی نادرہ روزگار شخصیتیں ملتی ہیں جن کا بدل یہ دنیا پیش کرنے سے عاجز ہے۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد حضرت امام محمدؒ اور حضرت امام یوسفؒ کا جواب کون پیش کرسکتا ہے یا ابن تیمیہؒ کے شاگرد ابن قیم کا بدل کون لاسکتا ہے، خود ہندوستان میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے شاگرد مولانا عاشق علی شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی مثال کہاں مل سکتی ہے یا ماضی قریب میں بانی دارالعلوم دیوبند حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے شاگرد مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ، شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، مولانا عبدالرب صاحبؒ بانی مدرسہ عبدالرب، کشمیری گیٹ، دہلی کے علوم وکمالات کو چیلنج کرنے کی ہمت کس میں ہے، غرض کہ ہر دور اور ہر زمانے میں ایسی صاحب کمال اور صاحب علم ہستیاں موجود ہیں جو خود بھی بلند مراتب پر فائز تھیں اور جن کے شاگردوں نے بھی علم کے میدان میں نمایاں اور گرانقدر خدمات انجام دیں۔

دارالعلوم دیوبند ہندوستان میں گذشتہ ایک صدی زائد سے اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا فریضہ انجام دے رہا ہے، اس ادارے نے اپنی زندگی میں جو عظیم افراد پیدا کئے ہندوستان کی تاریخ میں اس کی مثال کسی دور میں نہیں ملتی، ایک سے ایک بڑھ کر عظیم ہستی اور صاحب علم یہاں ملتا اور نظر آتا ہے، لیکن اس عظیم علمی مجلس میں مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ دارالعلوم دیوبند نے اپنے دور کی ایک ایسی شخصیت کو جنم دیا کہ جس پر وہ اپنی زندگی کے آخری سانسوں تک بجا طور پر فخر کرسکتا ہے، امام العصر حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ کی شخصیت، کمالات علمی اور خدمات کا ہر طبقہ معترف ہے، آپ اپنی علمی عظمت کی بناء پر جو مقام رکھتے ہیں وہ تو ظاہر ہے مگر ایک وصف آپ کو اکابر دارالعلوم دیوبند میں بہت ممتاز اور نمایاں کرتا ہے کہ آپ کے حلقۂ درس اور آغوش علم سے ایسے افراد اور شاگرد سامنے آئے جنھوں نے دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچ کر علم کے چھوٹے بڑے ہزاروں چراغ روشن کئے، بلاشبہ گذشتہ ۴۰/۳۵ سال کے عرصہ میں علماء کا جو طبقہ ہندوستان اور دیگر ممالک میں نمایاں اور ممتاز رہا اس کو حضرت کشمیریؒ کی شاگردی کا فخر حاصل ہے، حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ، مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ، رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ، مفکر ملت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ، مولانا محمد یوسف بنوریؒ، مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ، مولانا محمد شفیع دیوبندیؒ، مولانا حامد الانصاری غازی، مولانا بدر عالم میرٹھیؒ، مولانا منظور نعمانی، مولانا محمد میاں دیوبندیؒ، مولانا محمد ادریس کاندھلوی، مولانا سید احمد رضا بجنوری، مولانا محمد انوری فیصل آباد، مولانا غلام اللہ خانؒ، مفسر القرآن مولانا محمد چراغ گوجرانوالہ، مولانا قاضی شمس الدین، مولانا قاضی زین العابدین، مولانا شمس الحق افغانی،

علامہ محمد شریف کشمیری اور حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد محمد طیب صاحب قاسمیؒ وغیرہم ایسے آفتاب و ماہتاب ہیں، جن کو حضرت امام العصرؒ کے شاگرد ہونے کا فخر حاصل ہے۔

حکیم الاسلام مولانا محمد طیب نور اللہ مرقدہٗ مہتمم دارالعلوم دیوبند بلاشبہ ان عرفانی اور آفاقی شخصیات میں سے تھے، جو چرخ کی ہزاروں گردشوں کے بعد جنم لیتی ہیں اور چشم فلک جن کا صدیوں اور سالوں انتظار کرتی ہے، وقت قدم قدم پر رک کر اور سنبھل کر ایسے افراد کو بناتا ہے، سنوارتا ہے اور تراشتا ہے، تب کہیں جا کر ایک گوہر نایاب، ایک ولی کامل ایک مرد باصفا کا جنم ہو پاتا ہے۔

حضرت حکیم الاسلامؒ کی شخصیت کے گومختلف پہلو ہیں اور ہر پہلو کا تقاضا ہے کہ اس پر لکھا جائے ارباب علم کا یہ مجمع یقینی طور پر اچھے انداز میں روشنی ڈال سکے گا۔

حضرت علامہ کشمیریؒ اور حضرت حکیم الاسلامؒ کے ایک استاد اور ایک شاگرد کی حیثیت سے تعلقات کو جاننے کے لئے ہمیں بہت دور تک جانا ہوگا۔

حضرت کشمیریؒ اپنے بچپن میں دیوبند آئے تو سب سے پہلا واسطہ ان کا خاندان قاسمی سے پڑا، خاندان قاسمی کے سربراہ مولانا محمد احمد صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند اور ان کی والدہ ماجدہ یعنی حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند کی اہلیہ محترمہ نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور ان کی تعلیم و تربیت اور پرورش کا بہتر سے بہتر انتظام کیا۔

اس پرمسرت ماحول میں حضرت علامہؒ کو اپنی ذہانت و ذکاوت کے جوہر دکھانے اور مختلف علوم و فنون پر کامل دسترس حاصل کرنے کا موقع ملا۔ اس وقت مشاہیر علم و ادب کا ایک گروہ تھا، جس میں مولانا حافظ محمد احمدؒ، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ، مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ، مولانا عبید اللہ سندھیؒ، مولانا محمد میاں منصور انصاریؒ، مولانا مرتضٰی حسن چاند پوریؒ یہ سب اہل علم ایک جگہ جمع تھے، اپنے فکر ونظر سے قومی اور علمی مسائل کی گتھیاں سلجھا رہے تھے، یہ حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیبؒ کی تعلیم کا زمانہ تھا، انھوں نے حضرت علامہ کشمیریؒ سے بیحد علمی استفادہ کیا، ان کی رہنمائی میں بڑے بڑے علمی مسائل کی تہہ تک پہنچے۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب قاسمیؒ نے نہ صرف خارج میں حضرت کشمیریؒ سے علوم و فنون کی کتابیں پڑھیں، بلکہ دو سال ان کے سامنے دورۂ حدیث کی سماعت کی، سفر وحضر میں حضرت کشمیریؒ کے ساتھ رہے، اپنی تحریر وتقریر پر حضرت علامہ کشمیریؒ سے اصلاح لیتے رہے چنانچہ حضرت علامہؒ کی سوانح عمری ''حیات انور'' میں جا بجا حکیم الاسلامؒ نے اپنے استفادات کا ذکر کیا ہے، حضرت علامہ کشمیریؒ بلا مبالغہ دس سال

حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کے مکان پر مقیم رہے۔ ان کے دسترخوان پر کھانا کھایا اور علمی منزلیں طے کیں۔

علامہ کشمیریؒ کے حکیم الاسلامؒ کے بزرگوں اور بڑوں سے جو تعلقات رہے اور جس محبت و خلوص کا خاندان قاسمی کے سرپرستوں نے آپ کے ساتھ معاملہ فرمایا اس کا اثر فطری طور پر حضرت حکیم الاسلامؒ اور حضرت کشمیریؒ کے دلوں پر بھی پڑا اور استاد و شاگرد کا رشتہ جو آگے چل کر قائم ہوا، اس میں ایک خلوص اور قدیم تعلق بھی شامل ہو گیا اور اس طرح حضرت حکیم الاسلامؒ حضرت علامہ کشمیریؒ کے قابل فخر شاگرد بنے اور آپ نے علمی مسائل اور علمی گتھیوں کو سمجھنے اور سلجھانے میں علامہ کشمیریؒ سے کافی رہنمائی حاصل کی، حضرت حکیم الاسلامؒ نے دورانِ تعلیم علامہ کشمیریؒ کی تقریر و درس کو ضبط قلم کرنے کا بھی اہتمام فرمایا اور اس پر کافی محنت کی خود تحریر فرماتے ہیں کہ:

میں نے ان مختلف الانواع کو دیکھ کر ایک املا کی کاپی تیار کی جس کے لمبے چوڑے اوراق میں چھ سات کالم بنائے اور ہر کالم کے اوپر والے سرے پر فنون کے عنوان ڈال دیئے یعنی مباحث حدیث، مباحث تفسیر، مباحث عربیت (نحو و صرف) مباحث فلسفہ و منطق، مباحث ادبیات، مباحث تاریخ وغیرہ۔

پھر علوم عصریہ کے لئے ایک کالم رکھا کیوں کہ موجودہ دور کے فنون جیسے سائنس، فلسفہ، جدید، ہیئت، جدید وغیرہ کے مباحث بھی بذیل بحث حدیث درس میں آتے تھے، میں کالم وار ان مباحث کو املا کرتا جاتا تھا۔

ان فنی مباحث کے کالموں کے بعد کاپی کے کنارے کالم پر حضرت ممدوح کی رائے اور محاکمہ کا تھا جس کے سرنامہ پر عنوان تھا، ''مآل الاستاذ'' اس میں وہ فیصلے درج کر لیا کرتا تھا، جو مسائل کی تدقیق و تنقیح کے بعد بطور آخر نتیجہ کے حضرتؒ یہ کہہ کر ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ میں کہتا ہوں۔

افسوس یہ بیاض جو تقریباً چار پانچ صد صفحات پر مشتمل تھی ایک کرم فرما طالب علم نے مستعار مانگی اور میں نے اپنی طالب علمانہ ناتجربہ کاری سے چند روز کے لئے ان کے حوالے کر دی انھوں نے وہی کیا جو کتاب کو عاریۃً مانگنے والے طلباء کرتے ہیں، چند دن بعد میرے مطالبہ پر فرمایا کہ میں تو دے چکا ہوں آپ کو یاد نہیں رہا، نتیجہ یہ ہوا کہ ان مغالطوں سے عاجز آ کر میں نے اس ذخیرے سے صبر کر لیا۔ جس کو کافی عرق ریزی اور محنت سے تیار کیا تھا۔(۱)

حضرت علامہ کشمیریؒ کا یہ علمی ذخیرہ جو حضرت حکیم الاسلامؒ نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے جمع کیا تھا اگر محفوظ رہ جاتا اور چھپ کر سامنے آ جاتا تو اندازہ ہوتا کہ حضرت حکیم الاسلامؒ نے کس جانفشانی کا مظاہرہ کیا تھا اور ان کو اپنے استاذ کے علوم سے کس درجہ مناسبت تھی، حضرت حکیم الاسلامؒ نے بحیثیت شاگرد علامہ کشمیریؒ

دورانِ درس علمی مجلسوں نجی ملاقاتوں سے بہت کچھ حاصل کیا، جہاں کہیں الجھے شبہ ہوا یا مسائل کی گہرائی تک نہیں پہنچ پائے وہاں حضرت علامہؒ سے رجوع کیا۔ جس زمانے میں حضرت حکیم الاسلامؒ نے ''نونیۃ الآحاد'' نامی تصنیف فرمائی اس زمانے میں آپ کو اپنی کتاب کے سلسلہ میں ابوالحسن کذّاب کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی ضرورت پیش آئی تو آپ علامہ کشمیریؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اپنی اس ملاقات کا ذکر اس طرح کرتے ہیں۔

میں نے عرض کیا حضرت! ابوالحسن کذّاب کا ترجمہ نہیں ملتا، اس کے بارے میں نشان معلوم کرنے حاضر ہوا ہوں؟ فرمایا ادب و تاریخ کی کتابوں میں فلاں فلاں مواقع کا مطالعہ کیجئے، تقریباً آٹھ دس کتابوں کے نام دے دیئے، میں نے عرض کیا حضرت مجھے اس شخص کی پوری تاریخ نہیں معلوم کرنی صرف اس کی صفت کذب و دروغ گوئی کے حالات معلوم کرنے ہیں مگر ان کا کوئی عنوان کسی کتاب میں نہیں ملتا کہ اس کے نیچے ان خاص واقعات کا مطالعہ کرلوں، فرمایا مولوی صاحب آپ نے بھی کمال کیا صفت کذب کون سی روح ہے کہ لوگ اس پر عنوانات قائم کرکے اس کے واقعات دکھلائیں، کسی مذموم صفات وافعال کا تذکرہ ضمناً اور اضطراراً آجاتا ہے، عنوانات ہمیشہ کمالات پر قائم کئے جاتے ہیں، نہ کہ نقائص وعیوب پر، ان کتابوں میں فلاں فلاں مقام دیکھ لیجئے ضمناً اس کیفیت کذب کا بھی تذکرہ کہیں نہ کہیں مل جائے گا۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت مجھے تو کتابوں کے اتنے اسماء بھی یاد نہ رہیں گے چہ جائیکہ ان کے یہ مضامین اور مواقع محفوظ رہیں، نیز انتظامی مہمات کے بکھیڑوں میں اتنی فرصت بھی نہیں کہ چند جزوی مثالوں کے لئے اتنا طویل وعریض مطالعہ کروں، بس آپ ہی اس شخص کے کذبات اور دروغ گوئی سے متعلق واقعات کی دو چار مثالیں بیان فرمادیں، میں ان ہی کو آپ کے حوالے سے جزو کتاب بنادوں گا۔ اس پر مسکرا کر ابوالحسن کذاب کی تاریخ، اس کی سن ولادت سے بیان فرمانی شروع کردی جس میں اس کے جھوٹ کے عجیب وغریب واقعات بیان فرماتے رہے، آخر میں سن وفات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ شخص مرتے مرتے بھی جھوٹ بول گیا اور پھر اس جھوٹ کی تفصیل بتائی۔

حیرانی یہ تھی کہ یہ بیان ایسے طرز سے ہورہا تھا کہ گویا حضرت ممدوح نے آج کی شب میں مستقلاً اس کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے جو اس بسط سے سن وار واقعات بیان فرمارہے ہیں۔ (۲)

غرض کہ حضرت حکیم الاسلامؒ نے اپنے استاذ حضرت علامہ کشمیریؒ سے کافی علمی استفادہ کیا، وہ صحیح معنی میں حضرت کشمیریؒ کے قابل فخر شاگرد تھے، حضرت حکیم الاسلامؒ کو اپنے استاد سے بے پناہ محبت وتعلق رہا، جس کا بارہا

اظہار بھی ہوا، اور ہزار ہا تقریروں اور تحریروں میں آپ نے اپنے استاذ کے تذکرے سے اپنے اس تعلق کو مضبوط اور مستحکم بنایا، جہاں کہیں تذکرہ آتا جب کبھی دارالعلوم کی بات چلتی، اکابر کی یادیں تازہ کی جاتیں تو کیا مجال کہ حضرت حکیم الاسلامؒ حضرت کشمیریؒ کے طویل تذکرے کے بغیر بات مکمل کردیتے، اپنے استاد کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے آپ ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:

اگر کسی شخص نے کسی کی برائی یا فضول بات شروع کی تو معاً فرماتے کہ بھائی ہمیں اس کی فرصت نہیں ہے، کوئی مسئلہ ہو تو پوچھو ہمارا وقت ایسی باتوں کے لئے فارغ نہیں۔ (۳)

اور علامہ کشمیریؒ کی اس حد درجہ احتیاط اور عادت کریمہ کا مشاہدہ خود ہم نے اپنی آنکھوں سے حضرت حکیم الاسلامؒ کی مجلسوں اور نشستوں میں دیکھا جب کبھی حضرتؒ کی مجلس میں اس قسم کی بات کی جاتی جس سے کسی کی تحقیر یا جھوٹا ظاہر کرنا مقصود ہوتا تو حضرتؒ ایسی بات کے لئے منع فرمادیتے، زندگی کے آخری دو تین سال جو شدید ابتلا و آزمائش کے تھے، ان میں بھی حضرتؒ نے جھوٹی باتوں سے اپنی مجلس کو پاک رکھا جو اس بات کی علامت ہے کہ حکیم الاسلامؒ حضرت کشمیریؒ کے نہ صرف علمی جانشین اور قابل فخر شاگرد ہی تھے، بلکہ ان کی اداؤں اور عادات کو بھی اپنے اندر سمولیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ علامہ کشمیریؒ جیسی نادرۂ روزگار شخصیت روز جنم نہیں لیتی اور نہ حضرت حکیم الاسلامؒ جیسا شاگرد روز پیدا ہوتا ہے، اب تو ان نورانی شخصیتوں کے واقعات ہی ہیں، جن میں ہمارے لئے ایک سبق عمل موجود ہے، خدا ان دونوں عظیم ہستیوں کو اپنی رحمتوں سے نوازے۔ آمین!

............❖............

(۱) حیات انور ص ۲۱۵

(۲) مولانا ازہر شاہ قیصر، حیات انور، ص: ۲۲۷، ۲۲۸

(۳) ایضاً، ص: ۲۲۳

............❖............

حکیم الاسلامؒ

کا

اسلوبِ بیان اور بلندیٔ فکر

مولانا غلام نبی قاسمیؒ

استاذ حدیث دارالعلوم وقف دیوبند

حکیم الاسلامؒ کو اللہ تعالیٰ نے جن علمی کمالات سے نوازا تھا ان میں زبان و بیان اور تحریر و تقریر کا ایک خاص ملکہ عطا فرمایا تھا، جس موضوع پر لکھتے یا بولتے اس کے بنیادی عناصر کا اہتمام سیاق و سباق کی رعایت، موضوع کے قریب و بعید کے مناسبات اور لوازمات کی پابندی، قصص و امثال سے وضاحت، خوبصورت محاورات کا استعمال، الفاظ کے انتخاب اور مناسب تعبیرات کی رعایت، جب بات شروع کرتے تو دھیمی رفتار سے کچھ آگے بڑھتے تو میدانی دریاؤں کی طرح سے مست خرام، جوں جوں دور ہوتے چلے جاتے رفتار بڑھتی چلی جاتی جس میں جھرنوں کا حسن، قوس وقزح کا جمال، بجلی کی چمک، موسم بہاراں کی دلکشی، مرغ زاروں کی دلفریبی، شبنم کی ٹھنڈک اور نسیم سحری کی جاں نوازی، سب کچھ ہوتا۔ موضوع کے ہر پہلو کو اپنے انداز میں سوچتے اپنے انداز میں برتتے، ایک خاص ترتیب سے ہر ہر جزء کا احاطہ کرتے، مدعا کو ثابت کرنے کے لئے عقلی، نقلی، لمی، فلسفی، سائنسی ہر قسم کے دلائل، ہر قسم کے نظائر اور ہر قسم کے شواہد، بات سے بات، نکتہ سے نکتہ، تسلسل جیسے مرارید کی لڑی، زبان سے الفاظ کیا موتی جھڑتے، فقرے کیا نکلتے جیسے شاخوں سے کلیاں ٹوٹ رہی ہوں، مطالعہ وسیع، معلومات بے انتہاء، حافظہ بے پناہ، جیسے شخص واحد کئی زرخیز دماغوں کا مجموعہ، کئی شخصیتوں کا جامع، کئی کئی کتب خانوں کا مجمع اور علم و آگہی کی ایک چلتی پھرتی کائنات۔

انداز مثبت اور تعمیری، جس میں تحقیق بھی، تدقیق بھی، تنقید بھی، تنقیح بھی، تفسیر بھی، تشریح بھی، تحلیل بھی، تجزیہ بھی، ارشاد و اصلاح بھی، افہام و تفہیم بھی، تنبیہ و نصیحت بھی، اور جدید سائنسی انکشافات بھی، زبان کی حلاوت، بیان کی ملاحت، لب و لہجہ کی جاذبیت، حکمت آفرینیوں کی طراوش اور دقیقہ سنجیوں کی بارش مزید برآں! گویا شاعر مشرق کی اس آرزو اور دعا کا حرف بہ حرف مصداق۔

دیکھے تو زمانے کو اپنی نظر سے — افلاک منور ہوں ترے نور سحر سے
خورشید کرے کسب ضیاء تیرے شرر سے — ظاہر تری تقدیر ہو سیمائے قمر سے
دریا متلاطم ہوں تری موج گہر سے — شرمندہ ہو فطرت ترے اعجاز ہنر سے

جن موضوعات کو آپ کے خامہ عنبر شمامہ نے چھولیا علم و تحقیق سے مالا مال اور فکر و بصیرت سے نہال کر دیا، پاکیزہ تشریحات، نفیس تنبیہات، لطیف توجیہات، اور عمیق اشارات۔ سچ ہے کہ جو پاکیزگی، نفاست، لطافت آپ کے نام میں تھی وہ آپ کے کام میں بھی تھی، جو سنجیدگی، متانت اور شرافت، مزاج میں تھی، وہ تحریر و تقریر، اور ہر جنبش قلم میں بھی تھی، جو حکمت، بصیرت اور دقیقہ آفرینی ذہن میں تھی وہ ایک ایک لفظ میں بھی جو ذخیرہ معلومات اور علوم و فنون کا خزانہ دماغ میں تھا وہ تحریر خطاب اور تصنیف و کتاب میں بھی، جو سوز و گداز دل میں تھا وہ الفاظ میں بھی، ایمان و یقین کی جو حرارت سینۂ بے کینہ میں تھی وہ اظہار و بیان میں بھی، جو خلوص، للٰہیت اور خاکساری طبیعت میں تھی اس کا عکس اظہار خیال میں بھی۔

یہ آبجو کی روانی یہ ہمکنارئ خاک — مری نگاہ میں ناخوب ہے یہ نظارہ
اُدھر نہ دیکھ ادھر دیکھ اے جوان عزیز — کہ بلند زورِ دروں سے ہوا ہے فوّارہ

اس دیدہ ور شخصیت جس کی آنکھوں میں صدیوں کے علوم و کمال ایک چمن، صدرنگ، دانش و آگہی کی ایک کائنات، اور تجربات و مشاہدات کی ایک دنیا آباد تھی۔

ہم لئے پھرتے ہیں آنکھوں میں چمن اے باغباں
جس طرف اٹھی نگاہِ شوق گلشن ہوگیا

بالفاظ دیگر یوں بھی۔

نہ بصحرا سرے دارم نہ باگلزار سودائے
نہ ہرجا می روم از خویش می جوشد تماشائے

کبھی سپاٹ و سنگلاخ موضوعات کی زمین سے موتی برآمد کیے اور کبھی کانٹوں ہی سے گلدستے تیار

کیے، بچوں کی معصوم مسکراہٹ کی طرح بناوٹ، تصنع، ٹھونس ٹھانس اور اغلاق سے خالی۔

جو کچھ آپ سن چکے اس سے کہیں زیادہ وہ ہے جو حکیم الاسلامؒ کی بہار آفریں تحریر کی زبانی آپ سنیں گے، سو لیجئے سنیئے آپ کی نگاہ کے علاوہ تحریر اور آپ کے درمیان اب کوئی حائل نہیں۔

وا کر دیئے ہیں شوق نے بندِ نقاب حسن
غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

''انسان حقیقت جامعہ ہے''اس میں ساری کائنات کے نمونے بھی جمع ہیں اور ساری کائنات کے ذرہ ذرہ کے احوال وافعال بھی جمع ہیں، یہ جامع العناصر بھی ہے جامع الموالید بھی ہے، جامع المجر دات بھی ہے، جامع الارواح بھی ہے، جامع الاجسام بھی ہے، جامع الاغذیہ بھی ہے، جامع الامراض بھی ہے، جامع الانواع الحوت بھی ہے اور جامع انواع الحیات بھی ہے، مادیات میں دیکھو تو ہر جانور کی غذاء مخصوص ہے، چرندے گھاس کھاتے ہیں، درندے گوشت کھاتے ہیں، بعض جانور ہوا کھاتے ہیں، لیکن انسان سب غذائیں کھاتا ہے اور اگر شرائع نہ روکیں تو یہ حرام وحلال میں تمیز نہ کرے اور ظاہر ہے کہ ہر چیز منفعت کے ساتھ مضرت کا پہلو بھی رکھتی ہے، اس لیے اس پر امراض بھی انواع واقسام کے آتے ہیں جو کسی جانور پر نہیں آتے، جانور طبعی انداز میں موت کے وقت مرجاتے ہیں پھر موت بھی اس کی جامع، یہ گرمی سردی خشکی تری سب سے مرتا ہے یہ جامع انواع موت ہے، لباس اس کے متنوع غرض جو احوال الگ الگ سارے عالم پر تن پوشی کے بارے میں آسکتے ہیں وہ سب اس پر آتے ہیں، پھر غذاؤں کے معنوی اثرات جو اخلاق پر پڑتے ہیں اور مختلف جانداروں میں ہیں وہ سب اس پر آتے ہیں، غرض غذاء دواء شراب لباس وغیرہ میں یہ جامع ہے، مکان کے لحاظ سے دیکھو تو جامع الامکنہ بھی ہے، غرض جس لحاظ سے نگاہ ڈالو یہ جامع ہی جامع ہے، غرض جامع الغذاء غرض جامع اشراب، جامع انواع امراض، جامع انواع صحت، جامع انواع موت، جامع انواع احوال مادی، صرف یہ انسان ہے پھر مادیات لطیفہ میں جنات ان عرضی احوال سے بری ہیں، ملائکہ ان سب احوال سے بری ہیں، یہ انسان اتنا لطیف ہو جاتا ہے کہ کوئی برائی اس تک نہیں پہنچتی کیوں کہ نفس ہی بوجہ ریاضت برائی سے بری ہو جاتا ہے تو جیسے نور نجاست پر گرے یا نجاست دھوپ پر ڈالی جائے، دھوپ تک وہ پہنچ ہی نہیں سکتی، اسی طرح انسان بھی جب انواع عبادت سے ملکیت پر آجاتا ہے تو ہر برائی سے بری ہو جاتا ہے نہ اس میں خود میں برائی آتی ہے نہ دوسروں کی برائی اس تک آتی ہے اور جب فساد آتا ہے تو جامع الفساد بھی ہے کہ اس سے زیادہ مفسد کوئی شیطان اور جن بھی نہیں ہوسکتا، فساد کی عقلی صورتیں وہ نکالتا ہے کہ شیاطین کو

بھی نہیں معلوم، اس لیے عالم میں گمراہیاں صرف اس کی لائی ہوئی ہیں اللہ و رسول سے ہٹنے سیدھے راستہ سے بھٹکنے کے نئے نئے طریقے سوچ کر نکالتا ہے، فساد اور خوں ریزی کے نئی نئی تدبیریں نکالتا ہے جس سے زمانہ میں انقلابات رونما ہوتے ہیں لیکن جس طرح تمدن میں ارتقاء اور قاعدہ سے آخری قوم کا تمدن جامع اور کامل ہوسکتا ہے کہ پچھلوں کے تجربات اور علوم طبعیہ سب اس کے سامنے ہوتے ہیں ایسے ہی ادیان میں بھی ارتقاء ہے جو آخری امت ہوگی وہی جامع الدین ہوگی کیوں کہ اگلوں کے تمام علوم و معارف اس کے دماغ میں ہوں گے اور اس کی استعداد کی تشریعی جامعیت بھی ملی ہوئی ہے، اب اسی نوع میں امت مرحومہ کو دین بھی جامع دے دیا گیا تو یہ امت نہ صرف جامع احوال عالم ہوئی بلکہ جامع اقوام عالم بھی ہوئی یعنی اس نے ہدایت پائی تو جامع الہدایہ ہوگئی اور فساد اٹھائے گی تو جامع المفاسد کی بھی انتہائی ہوگئی، اسلام جامع دین ہے ''اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ'' چناں چہ اس امت کو نبی بھی جامع کمالات دیا گیا جو علوم اولین اور آخرین کے جامع اعمال و اخلاق ہیں اور اخلاق انبیاء کا جامع بلکہ سرچشمۂ جامعیت اس لیے دین بھی جامع ہونا چاہیے تھا، کیوں کہ نبی کی طبیعت پر شریعت اترتی ہے سو وہ جامع ترین ہے، ایسے ہی فرمایا: '' وَجَعَلْنٰکُمْ اُمَّۃً وَّسَطًا'' چناں چہ اس امت کے ہر دور میں جس نوع کے طبقات آئے اسی نوع کی قرآن کی تجلی نمایاں ہوئی یعنی کتاب کے بھی جامع دین و ملک دونوں میں حاوی، دیانت و سیادت دونوں کی جامع ہوتی، پھر احکام کی جامع ،شقوق و جوانب و حکم کی جامع تو امت بھی جامع ہوئی تو اس امت کو امت وسط کہتے ہیں اس لیے کہ یہ جانبین کی خوبیوں کی جامع ہے چناں چہ جمال و جلال دونوں کو جمع کرنا کمال ہے اس لیے اس امت کو قیراطین عطا ہوئے، دوسری امتوں کو قیراط واحد دیا گیا اس امت کو ہر عمل پر دوگنا اجر دیا گیا کہ یہ جامع الہدایۃ بن کر عمل پیرا ہوتی ہے تو ثواب بھی جامع الثوابات ملنا چاہیے تھا اور ایک طرف اس امت کو ''لتتبعن سنن من قبلکم شبرا بشبر'' بھی فرمایا گیا کہ یہی امت جامع الضلالات بھی بن گئی جو ان میں سے مہدی بنے گا اس کی ہدایت بھی اعلیٰ ترین ہوگی اور جو ضال بنے گا تو اس کی ضلالت بھی اکمل ترین ہوگی۔(۱)

دلچسپ پیرائے میں کیسی کیسی حکمت آفرینیاں اور دقیقہ سنجیاں! خوش دماغ ہونے کے ساتھ خوش فکر بھی کمال کے۔

اب اسی مضمون کا ایک دوسرا رخ یوں سامنے آتا ہے:

''انسان محاسن جمال کا جامع ہے، صورت زیبا کسی حیوان کی وہ نہیں جو اس میں ہے، بدن میں نمونہ

خالق کے کمالات کا موجود ہے، باطن روح میں چار عالم جمع ہیں: عالم خیال، عالم وہم، عالم شہوت، عالم غضب۔ ان پر حکمراں عالم عقل، اس کا رہنما عالم شرع و وحی، خیال و وہم کی صلاح ایمان سے ہے، اور شہوت وغضب کی اصلاح عمل صالح سے ہے، یہی ہے احسن تقویم، یہ اشارہ ہے جامعیت کی طرف اس لیے سورۂ تین میں قسم کھائی گئی جامع اشیاء کی اور ہر اگلے مقسم بہ میں جامعیت کی ترقی ہے ماقبل سے، تین جامع و نافع نباتات ہے، زیتون میں جامعیت نباتیت کے ساتھ نورانیت عنصری بھی ہے، طور سیناء میں جامعیت کے ساتھ مہبط نور ربانی ہونے کی شان بھی ہے جو نور عنصری سے کہیں بالاتر ہے، بلد امین میں جامعیت ولایت ونبوت کے ساتھ نورانیت خاتمیت بھی ہے، چوں کہ یہ چاروں مقامات محل ہیں، چار نوع کے انوارات کے اس لیے ان سے اشارہ ان قدسی صفات ذوات کی طرف ہوتا ہے جو ان انوار کی جامع ہیں، یعنی اصحاب کہف، عیسیٰ، موسیٰ، محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ (۲)

جس طرح انسانی جسم عناصر اربعہ سے مرکب ہے، اسی طرح انسانی روح کی ترکیب بھی عناصر اربعہ سے ہوئی ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ روح کے وہ عناصر اربعہ کون کون ہیں: حکیم الاسلامؒ اس کی وضاحت کچھ اس طرح فرماتے ہیں:

''علم، عمل، اخلاص، فکر، فیہ حدیث: ''**الناس کلھم ھالکون**''، علم کا اثر خشیت اللہ ہے'' **اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہُ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمَاء**''، عمل کا اثر تہذیب نفس ہے، اخلاص کا اثر تنویر قلب ہے، فکر کا اثر ضیاء عقول ہے اور مجموعہ کا اثر اخلاق فاضلہ ہیں جیسا کہ مادیت کے عناصر اربعہ کا اثر اخلاق ذمیمہ ہیں، نتیجہ یہ نکلا کہ مادی اخلاق مہلک ہیں اور روحانی اخلاق منجی ہیں کیوں کہ مادی اخلاق سے عالم میں بدامنی پھیلتی ہے اور روحانی اخلاق سے امن اور جب کہ روحانی اخلاق کی تکمیل مذہب کرتا ہے تو مذہب ہی ان کا ضامن ٹھہرا، اب آگے مذہب کے اخلاق کے درجات ہیں، مذہب توراۃ نے اخلاق حسنہ سکھلائے جن کا حاصل عدل و وفاء ہے، انجیلی مذہب نے اخلاق کریمانہ سکھلائے جن کا اثر ایثار اور ترجیح ہے، اسلام نے اخلاق عظیمانہ سکھلائے جن کا اثر احسان واکرام ہے اس لیے سب سے زیادہ اس کا ضامن اسلام نکلتا ہے۔ (۳)

''ادب'' کسے کہتے ہیں؟ مختلف حضرات مختلف تعریفیں کرتے ہیں، ذیل کے اقتباس پر نگاہ ڈالئے اور پھر انصاف سے بتایئے کہ اس سے لطیف تعریف اور تشریح کبھی سننے یا پڑھنے میں آئی ہے؟

''ادب نام ہے نشست و برخاست حرکت وسکون وغیرہ میں بہترین احوال کو اختیار کرنے اور بہترین اخلاق پر عمل کرنے کا نہ کہ خود نشست و برخاست کا اس لیے کہ نشست و برخاست افعال میں سے ہیں، احوال

میں سے نہیں ہیں تو حال شریعت کے تقاضوں کے مطابق اخلاق سے متعلق ہوتا ہے، جیسے ایک آدمی کو اگر پانی لانے کا حکم دیا جائے تو اگر وہ ہتھیلی میں پانی لائے اور اپنے ہاتھ کو آمر کے منھ سے لگا دے تو اس کو بے ادب کہا جائے گا اس لیے کہ اس قسم کا فعل براحال قرار دیا جاتا ہے اور اگر ایک پاک صاف ظرف میں پانی لائے اور اس کو دوسرے ظرف میں رکھ دے پھر تواضع کے ساتھ وہ پانی آمر کو پیش کرے تو اسے باادب کہا جائے گا تو پانی پیش کرنا ایک فعل ہے اور اس کو پیش کرنے کا طریقہ اگر اچھا ہے تو وہ ادب ہے اور اگر برا ہے تو بے ادبی ہے، تو ادب حال سے متعلق ہوتا ہے افعال سے متعلق نہیں ہوتا۔ (۴)

''طالب علم یا معلم کے اوصاف'' اس عنوان کے مالہٗ وماعلیہ، سیاق وسباق اور مناسبات کا اہتمام تو معنون میں آپ دیکھ ہی لیں گے، خاصہ کی چیز وہی حکمت آفرینی ہے جس کے لئے ذیل کا اقتباس آپ کے سامنے رکھا جارہا ہے، تحریر حکیم الاسلام کی ہے، اس لئے معنون کی طوالت، ایک لذت اور لطف ہی محسوس کریں گے، اور ہر پہلا فقرہ دوسرے فقرے کے لئے ''ھل من مزید'' کا سامان ہی بنے گا، چناں چہ فرماتے ہیں:

''نٓ وَالْقَلَم'' ان سے مراد دوات بھی ہوسکتی ہے جو کہ قلم کے مناسب ہے، حق تعالیٰ نے دوات کو شاہد اور گواہ اور برہان بنا کر حضور کی نفی جنون پر حجت قائم فرمائی ہے، قلم کی متعلقہ صفات وافعال پر غور کیا جائے تو نہ صرف اس سے نفی جنون ہی کا اثبات ہوتا ہے بلکہ مقامات نبوت کی افادی حیثیت اور اس کے مبادی واسباب پر بھی روشنی پڑتی ہے، سب سے پہلے قلم کی یہ صفت سامنے رکھی جائے کہ وہ اپنی ذات میں علم سے خالی ہے، محض واسطہ ظہور علم ہے یعنی قلم واسطہ اظہار علم ہے اور واسطہ افادۂ علم ہے، خود قلم کی ذات کوری ہے، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قلم سے تشبیہ دی گئی کہ آپ خود کچھ نہیں فرماتے وحی الٰہی سے بولتے ہیں سب سے اونچا مقام علم کا ہے کہ اس کے بغیر نہ عبادت ممکن ہے، علم معبود علم صفات معبود علم افعال معبود علم حق ذاتی ہے بقیہ سب کا عطائی ہے یعنی ذات کوری رکھی گئی ہے پس جو بھی عالم ہے وہ ناقل علم ہے۔

قلم سے افادہ کی شرط یہ ہے کہ قلم کو پہلے اس ہیئت پر لایا جائے کہ وہ محض لکڑی نہ رہے اس کی صورت افادہ کی بن جائے، سو قلم کی لکڑی کو سب سے پہلے چھیل کر صاف کرتے ہیں اور اوپر کا سرا کاٹتے ہیں جو اوپر گرہ وغیرہ کی شکل میں ہوتا ہے تا کہ وہ صاف ہو کر لاقلمی سے قلم بننے کے مقام پر آجائے اور اسے قلم کی صورت دی جا سکے، یہ گویا ابتدائی مجاہدہ ہے قلم کے لیے، اس کی مثال انبیاء میں ابتدائی خلوت گزینی اور علائق سے بے تعلقی ہے جیسے غار حراء کے مجاہدات، گو نبوت کسبی نہیں کہ کسب پر نبوت مرتب ہو بلکہ نبوت کے آثار میں سے ہے جو نبوت کی استعداد پر مرتب ہوتے ہیں، یہ مثال اس کی ہے کہ جب تک استفادہ کنندہ

میں سے خودسری نکال کر اس میں رغبت علم اور طلب علم کی شان نہ پیدا کی جائے یعنی لہو ولعب اور علم بیزاری نہ نکال دی جائے وہ طلب علم کے مقام پر ہی نہیں ہوتا، اس سے اصول نکلا کہ ہر دائرہ اور بالخصوص دینی تربیت کے دائرہ میں متعلم ابتدائی کیفیت علم بیزاری اور لہو دوستی اور اس سے خودسری نہ نکال دی جائے، وہ طالب علمی کا نام ہی نہیں پا سکتا ہے جیسے بغیر سر تراشے لاقلمی سے نہیں نکل سکتی سر ترشوانے میں اب اس کا نام نہیں رہتا، گویا انتساب قلم کی طرف ہو گیا اور مادۂ قلمیت اس میں آ گیا تو طالب علم کو غرور ختم کر دینا چاہیے کیوں کہ سر اور دماغ محل فکر ہے، اس لیے دوسرے لفظوں میں اولا اس کے فہم وشعور اور فکر وتفکر کا رخ صحیح کر دیتے ہیں تا کہ بے فکری اور بے توجہی یا علم سے لاتعلقی نکل جائے اور طالب علمی کا ذوق پیدا ہو جائے یہ تخلیہ ہے، قلم تراشی کا مقصد ہوتا کہ قلم کا رخ صحیح ہو جائے اور وہ قلم ہونے کی طلب پر آ جائے یہ مثال ہے اس شخص کی جو علم سے اور طلب سے دور طلب علم سے بیزار ہو تو اسے ابتداء جاہلیت اور جہالت کی رسموں سے بیزار بناتے ہیں اور طلب علم کی طرف مائل کرتے ہیں تا کہ اس کے سر میں جہالت کا جو سودا سمایا ہوا اس سے وہ نکل کر طلب علم پیدا ہو جائے اور وہ طالب علمی کے مقام پر آ جائے یہ اس کے رخ کو صحیح کرتا ہے وہاں چاقو سے سر قلم کرتے ہیں یہاں نصیحت وعظ یا بچہ ہو تو سرزنش کی چھری سے لہو ولعب آوارگی اور رسوم دوستی کا سر قلم کر کے اسے طلب علم کے مقام پر آنے کی رغبت پیدا کر دیتے ہیں جو طلب علم کا ابتدائی مقام ہے یا طالب علمی کا ابتدائی نام ہے، اس پر اگر کجی یا زیغ ہو گیا تو طلب علم کی شان نہیں آ سکتی، خواہ مخواہ لائی جائے گی تو کج اور معکوس ہوگی جس سے نتیجہ بھی معکوس نکلے گا تو سر پھیرنے کی اصلاح حقیقتاً فہم وفکر کے رخ پھیرنے کا عمل ہے جو قلم کا ہی ابتدائی مقام ہے اس سے نکل آیا کہ طالب علم کا سر جب خودی اور ہوائے غرور سے پاک نہ کیا جائے وہ افادہ کے قابل نہیں ہوتا۔ تیسرا درجہ قلم کے سر اور چہرہ بنانے کا ہے کہ قلم کی صورت بن جائے محض صاف شدہ لکڑی نہ رہ جائے ورنہ کتابت کیسے ہو جو صورت افادہ ہے، گویا اس کا خط بنایا جائے، اس کی صورت ڈھالی جائے اس سے واضح ہے کہ مربی کے لیے وضع بھی مربیوں جیسی ہی ہونی چاہیے جو اس دائرہ کی معروف ہو وضع قطع درست نہ ہوگی تو اس کا اثر مربیوں پر نہیں پڑے گا اس سے شائستگئ ظاہر کا حکم نکلا، تو قلم کو شگاف دینا جسے قط لگانا کہتے ہیں کہ اس کے بغیر دو حروف نہیں لکھ سکتا جو ذریعۂ افادۂ علوم ہے یہ در حقیقت قلم کے قلب کی اصلاح ہے جو محل علم ہے اور شائستگئ ظواہر بدنی ہیئت لباس ہیئت حتی کہ معاشرتی ہیئت جیسے رہن سہن پر حاوی ہے۔

بہر حال لکڑی کی استقامت اس کی تراشی اور پھر نب بنانے سے قامت طرازی اور پھر قط زنی سے

ذہن سازی یعنی قلب و دماغ اور ظواہر کی شائستگی ناگزیر ہے، اس سے طالب علم کے بارے میں دماغ اور قلب کی اصلاح اور وضع ظاہر کی طرف اشارہ ہے، فرق اتنا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے تربیتی مقامات براہِ راست حق تعالیٰ شانہ کی طرف سے ہوتے ہیں جن میں اسباب عادیہ کو دخل نہیں ہوتا، اس لیے سارے امور بحق انبیاء وہبی ہوتے ہیں نہ کہ کسبی، اور غیر نبی میں یہی امور کسبی اور اکتسابی ہوتے ہیں جن میں ظاہری اسباب اور اپنی محبت کا دخل ہوتا ہے جس سے وہ نبوت کے کمالات سے مستفید ہوتے ہیں لیکن نبوت کسی درجہ میں بھی کسبی نہیں ہے وہ موہبت الٰہی ہے اور اس کے لیے انتخاب افراد بھی من اللہ ہے "**اَللّٰه اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ**" اور اب وہ ختم نبوت کے بعد ختم بھی ہے کہ نہ انتخاب ہوگا اور نہ کوئی نیا نبی آئے گا، تو اب چوتھا مقام یہ ہے کہ قلم کو دوات میں ڈالا جائے اور وہ روشنائی حاصل کرے جس سے بالآخر حروف بننے کا مقام آجائے اور علم کی صورت کے لیے راہ ہموار ہو، اس سے واضح ہے کہ افادۂ علم میں قلم کی محض صورت قلم کافی نہیں ہے جب وہ دریائے روشنائی میں سر ڈوب نہ جائے اس لیے روشنائی اس کے حق میں بمنزلہ دریائے علم کے ہے یعنی جب تک اس میں انغماس بلکہ استغراق نہیں ہوگا اور قلم بھرپور روشنائی نہ لے گا صاف اور روشن حروف اس سے نکل کر مرتسم نہ ہوں گے اور افادہ مشکوک ہو جائے گا، اس سے واضح ہے کہ طالب علم اگر محض اپنی ذاتی رائے یا عقل دور اندیش سے یا مصلحت بینی سے از خود کچھ کہے گا تو محض قلم کی آواز اور صریف اقلام ہوگی جو بے معنی ہے، اس لیے طالب علم کو علم میں ہمہ وقت استغراق رکھا جائے گا کہ "**العلم لا يعطيك بعضه حتى تعطيه كلك**" پھر اس سے آگے کا مقام یہ ہے کہ وہ سرنگوں ہو کر روشنائی میں غوطہ لگائے، ورنہ وہ افادہ نہیں کر سکتا یعنی اگر قلم کا منہ اوپر ہو جائے اور نیچے نہ جھکے تو وہ بھر بھی نہیں سکتا کیوں کہ بھراؤ جب ہی ہوتا ہے جب اس میں جھکاؤ ہو اور وہ ڈوب کر اس سے نکلے تو طالب علم بھی جب تک سرنگوں نہ ہو یعنی "**تواضع للعلم و لاهل العلم و لمكان العلم و بقراطيس العلم**" نہ ہو وہ علم کا وعاء نہیں بھر سکتا، کبر و نخوت اور ترفع و تعالیٰ سے علم کبھی نہیں آسکتا، بے ادبی اور جسارت کے ساتھ علوم نبوت کبھی حاصل نہیں ہو سکتے جس سے "**لَا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ**" کا مقام پیدا ہوتا ہے جب انبیاء علیہم السلام بھی بحر علم میں مستغرق ہوتے ہیں اور اس کی طرف جھک کر اپنے کو علم سے بھرتے ہیں جن میں ادب و تواضع کی انتہا ہوتی ہے تو دوسروں کی تو حقیقت ہی کیا ہے، بہر حال اس سے قلم کے دو مقام ثابت ہوئے ایک روشنائی میں مستغرق ہو اور ایک سرنگونی کے ساتھ مستغرق ہونا یعنی ایک علم کی دھن اور ایک تأدب بالعلم جو تحصیل علم کے موقوف علیہ مقامات ہیں، پھر جب قلم روشنائی سے بھر جانے کے بعد جب کاغذ پر نقوش بناتا

ہے یعنی افادہ کرتا ہے تو ضروری ہے کہ کاتب کے ہاتھ میں ہوا زخود حرکت نہیں کرسکتا، بلکہ اس کی حرکت کے تابع ہو کر اس کی حرکت سے حرکت میں آتا ہے، اس سے اشارہ اس طرف ہے کہ جب تک طالب علم اپنے مربی اور معلم کے ہاتھ میں ہو کر اس کے تابع محض نہ بن جائے اور علم میں اگلوں کی نقل نہ کرے ان سے استغنا نہ کرے تب تک اس کی افادی حیثیت کھل ہی نہیں سکتی، پس جو طبقہ آزاد محض ہو کر اور اپنے مربیوں سے مستغنی بن کر یا ان کے مقابل آ کر یا بے سند و استناد چاہتے ہیں کہ علم کی دولت کا افادہ کریں تو یہ ناممکن ہے اگر آزاد ہو کر کریں گے تو وہ ان کے اوہام کا افادہ ہوگا علم کا نہ ہوگا، علم تو وہی ہے جو مستند اور منقول ہو انبیاء کی شان یہ ہے کہ ''وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى''، پس جیسے نبی قلم کی طرح حق تعالیٰ کے ید قدرت میں ہوتا ہے کہ جو وہ کہیں وہی کہتا ہے خود اپنی بات نہیں کہتا، بلکہ اپنے خدا کی بات کہتا ہے اور اسی کی سند لاتا ہے بے سند نہیں کہتا، اسی طرح طالب علم بھی جب تک اپنے سکھلانے والے کے تابع ہو کر سند سے اس کی بات نقل نہ کرے علم کی حلاوت اس تک نہیں پہنچ سکتی، اس اتباع کے ساتھ استناد نکلا اس لیے سند کی طلبہ کو ضرورت پڑتی ہے، پھر قلم جب حروف بناتا ہے تو اسے کاغذ پر سرنگوں ہونا پڑتا ہے، کاغذ پر اس کا سر ہوتا ہے روشنائی گرتی رہتی ہے حروف بنتے رہتے ہیں، اس میں پہلا اشارہ تو اس طرف ہے کہ جس کاغذ پر حرف بنائے جائیں اس پر پوری توجہ معطوف کی جائے یعنی معلم میں لاپرواہی یا سفلی اغراض نہ ہوں بلکہ ہمہ تن تعلیم ہو اور ساتھ ہی متعلم پر انتہائی توجہ ہو، گویا اس پر اوندھا ہو جائے کہ اس کے بغیر فیضان نہیں ہوتا اس سے تیسرا اشارہ اس طرف ہے کہ قلم افادہ کے وقت جب تک کاغذ کی زمین پر سر نہ ٹیک دے گویا سر بسجود ہو جائے اور روئے یعنی بصورت روشنائی اس کے آنسو ٹپکیں گویا سجدے کرتا جاتا ہے اور روتا جاتا ہے تب علم اس سے نکلتا ہے اور افادی شان اس سے کھلتی ہے اور دوسرے کو فائدہ پہنچتا ہے، اگر معلم ہی سر پھرا ہو نہ وہ علم کی طرف شوق سے متوجہ ہے نہ طالب علم کی طرف بلکہ بندۂ اغراض ہے استغراق سے خالی ہے تو اس سے افادہ کیا ہو سکتا ہے تو اس سے نکل آیا کہ افادہ کنندہ کا عبادت گذار ہونا ضروری ہے جو اس سے قلب کے رقت اور لین کی علامت ہے کہ اس کے بغیر افادہ نہیں ہوتا، ساتھ ہی اس سے یہ بھی واشگاف ہوا کہ قلم کا کاغذ پر جھکنا اور سر رکھ دینا گویا افادہ میں ہمہ تن لگ جانا ہے پھر قلم جس چیز پر سر ٹیکے اس میں ارتسام حروف کی قابلیت ہونی چاہیے اگر قلم زمین پر سر رگڑے جائے یا سیاہ لوہے پر حرکت کئے جائے تو ارتسام حروف نہ ہوگا اس سے واضح ہوا کہ قلم کی فاعلیت کے ساتھ محل ارتسام میں قابلیت انجذاب کی اہلیت نہیں رکھتے، غافل ہیں یا ان کی سطح قلب درست نہیں ہے تو ان پر محنت رائیگاں چلی جاتی ہے، ان کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ دین کی

ضروری معلومات لے کر دیندار بن جائیں، عالم ہونا ان کے بس کی بات نہیں، غرض مربی اور مربوب دونوں کی اصلاح ظاہر و باطن، استقامت قلب و دماغ، تسویہ فکر و اخلاق، انہماک فی العلم اور استغراق اور حرص علم، تواضع و فروتنی، اتباع و ادب، عدم انحراف، سرکشی سے بچاؤ، عبادت و طاعت، تقرب الٰہی اور پھر انتخاب قابل و منفعل وغیرہ امور رہیں جن کے بغیر نہ مربی تربیت کر سکتا ہے نہ مربوب تربیت پا سکتا ہے اور یہ سب اور قلم کی خصوصیات سے نمایاں ہیں، اس لیے حق تعالیٰ نے اپنے نبی پاک پر سے جنون کی تہمت اور نا فہمی کے الزام اٹھائے جن کے ہوتے ہوئے افادہ بھی ناممکن ہے، اس سے حضور کا افادہ کاملہ واضح فرمایا گیا ہے جس سے عقل و فہم علم و عشق اور تمام ستودہ اخلاق و مقامات کا اثبات خود بخود ہو جاتا ہے جس سے "مَا أَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْن" کا مقام واضح ہوتا ہے جو کمال دماغ و فکر کی علامت ہے اور "اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْم" کا مقام نمایاں ہو جاتا ہے جو کمال قلب کا مقام ہے، اور عقل و قلب اعلیٰ ہیں تو ہر چیز اعلیٰ ثابت ہوگی اس لیے یہاں قلم کو گواہ بنا کر یہ دو دعوے کئے گئے ایک نفیٔ جنون جو کمال عقل اور ایک اثبات اخلاق جو کمال عشق ہے، ایک سے قوت علمی کے پاک ہونے کی طرف اشارہ ہے اور ایک سے قوت علمی کے مضبوط تر ہونے کی طرف ایماء فرمایا گیا ہے اور یہی دو قوتیں ہیں: قوت علمی اور قوت عملی جو سارے کمالات کی اساس ہیں۔ (۵)

حکیمانہ طرز بیان کے ساتھ محققانہ و عارفانہ اسلوب کی بھی ایک جھلک دیکھ لی جائے:

"اخلاق کی بنیادیں تین ہیں: استیفاء حق بالمثل، ترک حق، احسان بالحق، یعنی اخلاق کی بنیاد ہے ضبط و تحمل اور صبر و برداشت جس درجہ میں یہ صبر و ضبط زیادہ ہے وہی درجہ اکمل و احسن ہے، مثلاً اگر کوئی بد اخلاقی سے پیش آئے تو ابتدائی درجہ اخلاق کا استیفاء حق بالعدل ہے یعنی معاملہ میں حدود کی رعایت اور وہ یہ کہ انتقام لینے میں مماثلت سے کام لیا جائے، تعدی نہ کی جائے، تورات کا حکم ہے وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَا اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ الى قوله وَالْجُرُوْحَ قِصَاص. یہ اخلاق فاضلہ کی بات ہے کہ تعدی نہ ہو، ظلم نہ ہو، عدل قائم رہے مگر یہ درجہ اولیٰ ہے، دوسرا درجہ اس سے اونچا ہے کہ قصاص نہ لے معاف کر دے "فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ. فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى الله" یہ خلق حسن ہے، تیسرا درجہ اس سے اونچا ہے کہ ایثار کرے اور نہ صرف اپنا حق ہی چھوڑ دے بلکہ اوپر سے احسان بھی کرے اور برائی کا بدلہ بھلائی سے دے یہ خلق عظیم ہے، موسوی شریعت میں اخلاق کا پہلا درجہ یہ ہے کہ انتقام لینا ضروری تھا مگر عدل کے ساتھ عیسوی شریعت میں خلق حسن تھا کہ معاف کرنا ضروری تھا جسے حق

چھوڑنا کہتے ہیں یہ خلق حسن ہے، محمدیؐ شریعت میں خلق عظیم ہے کہ اوپر سے احسان بھی کرو اور ایثار سے پیش آؤ''خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنْ. فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ الى قوله فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَ شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ، صل من قطعك و اعف عمن ظلمك و احسن الى من اساء اليك'' خلق حسن عدم تعدی ہے، خلق کریم صفح جمیل اور عفو ہے اور خلق عظیم احسان و ایثار ہے پس خلق عظیم میں خلق حسن اور کریم سب داخل ہیں اس لیے خلق حسن مراتب صلحاء میں سے ہے اور خلق کریم مراتب انبیاء میں سے ہے اور خلق عظیم مرتبہ ختم نبوت میں سے ہے، خلاصہ یہ ہے کہ خلق کے سلسلہ میں ابتدائی مرتبہ ہے حسن اخلاق کا جس کا سوال حدیث میں فرمایا گیا:''اللهم انی اسئلك الصحة و العفة و الانابة و حسن الخلق و الرضا بالقدر''اس سے اوپر کا مرتبہ ہے کرامت اخلاق کا جس کو حدیث میں فرمایا گیا: ''بعثت لاتمم مكارم الاخلاق'' اور تیسرا مرتبہ اس سے اوپر کا ہے خلق عظیم کا جو ایثار مطلق اور احسان کامل ہے وہ خلق نبوی ہے جس کی قرآن نے شہادت دی''وانك لعلى خلق عظيم''(۶)

اب قرآنی تفسیر کا ایک حکیمانہ اسلوب ملاحظہ کیجئے:

''علم یقین، اور حیاء، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''يٰبَنِيْ آدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَ رِيْشًا وَ لِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ. ذٰلِكَ مِنْ آيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنْ'' مفسرین نے فرمایا لباساً سے مراد علم ہے اور ریشاً سے مراد تقویٰ ہے اور لباس تقویٰ کے معنی حیاء ہیں تو حیاء عمل کا پہلا مبداء ہے اور علم خشیت کا پہلا مبداء ہے اور خشیت ایمان کا پہلا مبدا ہے اور ایمان وہ معرفت ہے اور میں نے نہیں پیدا کیا جن اور انسان کو مگر تا کہ وہ عبادت کریں میری یعنی تا کہ میری معرفت حاصل کریں۔(۷)

یہ اقتباس کچھ بغیر تمہید و تبصرہ کے بھی پڑھ ڈالیے، بقول مولانا عبدالماجد دریا آبادی: چمن کی سیر خود بھی تو ایک چیز ہے، یہ کیا کہ ہر جگہ مالی سے پوچھ تاچھ کی جائے:

''حق تعالیٰ نے دنیا کی ہر قوم کو تین مرکز عطا کئے اور ان تین مرکزوں کے بغیر کسی قوم کی قومیت قائم نہیں ہوسکتی، ایک علمی مرکز جس کی طرف علم صحیح کے لیے رجوع کیا جائے، ایک عملی مرکز جس کی طرف عمل کی ہیئت اور اسے درست رکھنے میں رجوع کیا جائے اور ایک اجتماعی مرکز جس کی طرف دینی جماعتی حیثیت برقرار رکھنے کے لیے رجوع کیا جائے، علمی مرکز خدا کی کتاب ہوتی ہے عملی مرکز رسول کی ذات ہوتی ہے اور اجتماعی مرکز قبلہ ہوتا ہے، یہود و نصاریٰ کے علمی مرکز تورات و انجیل ہیں عملی مرکز حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں اور اجتماعی مرکز بیت المقدس ہے، کتنی بڑی نعمت اور فضل کی بات ہے کہ حق تعالیٰ نے مسلمانوں کو ان تینوں مرکزوں میں امتیازی

شان کے مرکز دیے جو اپنی نوعیت میں دنیا کی تمام اقوام کے مراکز سے فائق تر ہیں۔ (۸)

سو انسان مجموعہ اضداد تھا، بہائم شہوت محض ہیں، ملائکہ عقل محض ہیں، شیطان شر محض ہے، اس لیے ان میں ترقی نہیں، لیکن انسان میں شہوت، عقل، طبع، بہیمیت، شیطنت، ملکیت سب جمع کر دی گئیں، اس میں سب سے زیادہ ترقی کے امکانات پیدا ہوئے۔ اگر بہیمیت کو عقل سامنے لائے گا تو عفت پیدا ہوگی اور تقویٰ کے شعبے پیدا ہوں گے جو بہیمیت کو اعتدال پر لائیں گے اور اگر عقل کو بہیمیت کے ساتھ جمع کرے گا تو انتہاء پسندی پیدا ہوگی، اگر عقل کو بہیمیت شیطنت سے ٹکرائے گا تو تدبر و فراست کے شعبے پیدا ہوں گے اور شیطانی اعمال تدبیر وخرد کا لقب پائیں گے جو فرشتہ کہ جو عقل محض تھا نہیں کر سکتا تھا غرض اس تصادم میں خیر کی ترقی بھی مضمر ہے اور شر کی بھی اور صلاحیت صرف انسان میں تھی اس لیے حق تعالیٰ نے اپنا خطاب تکلیفی براہ راست صرف اسی کو فرمایا اور مورد نبوت والہام صرف اسی کو بتایا ہے۔ (۹)

انسان باشعور ہو تو ممکن نہیں ہے کہ جذبات وتأثرات سے الگ رہ سکے، محبت بھی ایک جذبہ اور تأثر ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس جذبہ اور تأثر کا سبب کیا ہوتا ہے؟ اس سوال کا جواب حکیم الاسلامؒ کی زبان سے سنئے:

''جمال، کمال، نوال، اتصال، اطاعت کے چار اسباب کمال عقل، کمال علم، کمال اخلاق اور کمال عمل، حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں اسباب محبت سب کے سب جمع ہی نہیں بلکہ انتہائی کمال پر پہنچے ہوئے ہیں، اس لیے آپ سے قدرتاً محبت وہی ہونی چاہیے کہ کسی سے بھی نہ ہو، کیوں کہ یہ اسباب کسی بھی انتہائی کمال کے ساتھ جمع نہیں ہیں اور ایسے ہی اطاعت کاملہ بھی آپ کے سوال دوسرے کی نہیں ہونی چاہیے کہ اسباب اطاعت آپ سے زیادہ عالم میں کسی میں نہیں۔

کمال محبت کا ثمرہ کمال ذکر ہے اور کمال اطاعت کا ثمرہ کمال فکر ہے جب ذکر وفکر کامل ہو جاتا ہے تو محبت واطاعت بھی کامل ہو جاتی ہے اور اس کا ثمرہ یہ ہے کہ آدمی محبّ سے محبوب بن جاتا ہے ''**قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِىْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ**'' اور اطاعت سے پھر محل اطاعت بن جاتا ہے ''**دار الحق معه حيث دار**'' اور ''**ان ربك يسرعك فى هواك، لولايزال يتقرب عبدى بالنوافل حتى انت سمعه الذى يسمع بى وبصره الذى يبصر بى ويده التى يبطش بها**'' تو اس شان سے محبوب الٰہی اور مرجع نظر الٰہی ہو جاتا ہے، گویا مظہر کمالات ربانی بن جاتا ہے۔ (۱۰)

مثبت تعمیری فکر اور اصول کی روشنی میں گفتگو کرنا حکیم الاسلامؒ کی شخصیت کا سنگ بنیاد ہے، اس کا بھی ایک نمونہ دیکھئے:

''میرا اصول یہ ہے کہ لوگوں کو اصول سے پکڑا جائے جزئیات سے نہیں، جزئیات اختلاف کی جڑ ہیں اور اصول اتحاد وحدت کی بنیاد ہے اس کا قدرتی تقاضہ ہے کہ جب ہر جماعت کو اصول کی ترازو میں تولا جائے گا اور اصول قابل قبول ہوتے ہیں، خواہ کوئی جماعت پیش کرے تو ہر جماعت کی خوبیاں سامنے آئیں گی اور جب اصول کو سمجھایا جائے گا تو غیر معقول جزئیات کو خود آپ کو رد کرنا نہیں پڑے گا بلکہ یہ مبتلا خود ہی انہیں چھوڑنے پر مجبور ہو جائے گا، پس بجائے اس کے کہ آپ جزئیاتی رد وقدح اور بحث ومناظرہ میں پڑیں جس سے اختلافی صورت پیدا ہو اور جماعت ان ناکارہ جزئیات میں اور زیادہ مضبوط بنے یہ بہتر ہے کہ آپ کے کہنے کے بجائے وہ خود ہی اپنی برائیوں کو سمجھے اور ان کی ممنون ہو یہ کہ آپ نے اس کی بہت سی خرابیاں چھڑا دیں۔(۱۱)

حکیم الاسلامؒ کے اچھوتے اسلوب بیان اور فکری معنویت کے یہ چند گوشے بطور مثال آپ کے سامنے آئے ورنہ آپ کی گراں قدر تصنیفات اور خطبات کی ایک ایک سطر اس باب میں آپ کی انفرادیت کا ثبوت پیش کرتی ہے۔

بخشے ہے جلوۂ گل ذوق تماشا غالبؔ
چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہوجانا

(۱) مولانا فاروق قاسمی، معارف حکیم الاسلام، ص:۳۳۱-۳۳۳

(۲) ایضاً، ص:۴۵۶ | (۳) ایضاً، ص:۴۹۵

(۴) ایضاً، ص:۵۱۱ | (۵) ایضاً، ص:۸۶

(۶) ایضاً، ص:۳۲۹ | (۷) ایضاً، ص:۵۱۲

(۸) ایضاً، ص:۲۵۲ | (۹) ایضاً، ص:۳۰۵

(۱۰) ایضاً، ص:۵۲۳ | (۱۱) ایضاً، ص:۵۴۵

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ
اوران کی تصانیف کا عکس جمیل

مفتی محمد احسان قاسمی

استاذ حدیث دارالعلوم وقف دیوبند

دیوبند کا نام جب ذہن میں آتا ہے اور قلم کی نوک سے صفحۂ قرطاس پر مرقوم ہوتا ہے تو تاریخ کا ایک طویل ترین کہکشانی سلسلہ خود بخود ذہن کے زاویہ میں ابھرنے لگتا ہے۔ علم وعمل کے کوہِ گراں، رشد وہدایت کے روشن مینار، فکر وتدبر کی ہزارہا قندیلیں یہاں روشن ہیں۔ انہیں قدسی صفات شخصیات میں سے خانوادۂ قاسمی کا نیر تاباں، سحر البیان مقرر، حسن عمل، حسن کردار کی حامل ذاتِ بابرکات، زہد وتقویٰ کے امام کامل اور علم وفن کے صحیح العقیدہ وسلیم الفکر عالم عارف باللہ حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحب مظفر الدین قدس سرہٗ کی ذات والاصفات بھی ہے۔ جو نہ صرف اپنے ذاتی اوصاف جمیلہ، علم وفضل، زہد وتقویٰ، اخلاق ودیانت جیسی وقیع ترین صفات کی بنا پر آسٹریلیا سے لے کر امریکہ تک اور نیل سے لے کر تابہ خاک کاشغر، مثل آفتاب وماہتاب نمایاں تھے۔

بالفاظ دیگر حضرت حکیم الاسلامؒ اپنی اعلیٰ علمی وخوانگی نسبتوں کی وجہ سے نہ صرف دیوبند ہی کے قابل فخر سرمایہ تھے بلکہ آپ اپنی خوش طبعی اور فکر وبصیرت کے باعث ملک وبیرون ملک تقریباً تمام مکاتبِ فکر اسلامی کے حلقوں میں مقبول ومتعارف تھے۔

مخلوق خدا کی ظاہری وباطنی اصلاح کو مقصدِ حیات دے کر خالصۃً ولوجہ اللہ لوجہ الاسلام اخلاص نیت کے ساتھ دنیا کی ہر ضلالت وگمراہی میں ہدایت کے فانوس جلانا ایک مصلح ورہنما کی عنداللہ معراج ہوتی ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے اہل اللہ کے یہاں تین طریقے رائج ہیں، کوئی تصوف کی راہ سے گم کردہ

راہ کو حق کی ہدایت کے راستہ پر لاتا ہے، کوئی اپنے قلم کی سحر طرازیوں سے عوام کی اصلاح کرتا ہے اور کوئی دعوت وتبلیغ کے ذریعہ تقریر کا راستہ اختیار کرتا ہے لیکن اگر حق تعالیٰ کی جانب سے یہ تینوں ملکات کسی ایک شخصیت میں ودیعت کر دیئے جائیں تو اس کی جامعیت اور اکملیت تو مسلم ہے ہی، ساتھ ہی دعوت وتبلیغ جیسے عظیم ترین مقصد میں کامیابی اپنے عروج پر پہنچ جاتی ہے۔ لاریب کہ حضرت حکیم الاسلام نور اللہ مرقدہٗ مسندِ رشد و ہدایت کے اسی اعلیٰ ترین مقام پر فائز تھے۔ آپؒ پاک باطن، پاکیزہ روح، روشن ضمیر اور چودھویں صدی میں نقشبندیت کے بدرِ منیر تھے۔ ان کی شخصیت مختلف گوشوں اور مختلف علمی ودینی پہلوؤں پر محیط ہے۔ نیز شخصیت کا ہر پہلو قابل رشک اور قابل فخر ومباہات ہے، ہر جہت آپ کی فکری وعلمی صلاحیتوں کی روشنی کا نور دکھائی دیتا ہے۔ آپ چلتے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بشکل انسان کوئی قدسی زمین پر قدم رنجا ہے۔ قدموں کی چاپ اتنی دھیمی کہ احساس بھی نہیں ہوتا تھا۔

حکیم الاسلامؒ کے علمی رشتوں کا ایک سلسلہ اگر امام العصر سیدنا محمد انور شاہ کشمیریؒ سے جڑا ہوا تھا تو دوسرے کا تعلق مفسر قرآن اور شان قاسمیت کے عکس جمیل حضرت اقدس علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور علامہ ابراہیم بلیاویؒ اور مولانا حسین احمد مدنیؒ سے مربوط تھا۔

پہلے آپ کا سلسلۂ بیعت ۱۳۳۹ھ میں حضرت الامام شیخ الہندؒ سے قائم ہوا، ان کے بعد آپ نے اپنے زمانہ کے سب سے بڑے قطب العالم حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی طرف رجوع کیا اور ان کی نگرانی میں راہ معرفت وطریقت کے اعلیٰ مدارج طے کئے۔ آخر کار جب شیخ کی حقیقت آشنا نگاہوں نے مرید کے جواہر استعداد کا اعتراف کر لیا تو ۱۳۰۵ھ میں آپ کو اپنا مجاز بنا کر خلافت کے خلعت فاخرہ سے مشرف فرمایا۔

اس کے بعد حکیم الاسلامؒ اپنے چشمۂ ہدایت سے تشنگانِ قلب وروح کو سیراب فرمانے لگے اور راہ حق کے طلب گار اپنی آرزوؤں اور امیدوں کی جھولی اس خزینۂ معرفت سے بھرتے رہے اور فیض حاصل کرتے رہے۔ ملک و بیرون ملک حضرت حکیم الاسلامؒ کے مریدین ومسترشدین کی تعداد لاکھوں سے متجاوز تھی۔ جنہوں نے براہِ راست آپ کے دست حق پر بیعت ہو کر آپ کی روحانی تربیت اور ہدایت واصلاح سے اپنی زندگی کو منور کیا اس کے علاوہ ایک بڑا طبقہ ایسا رہتا تھا جو راہ حق کا طلب گار ہوتا اور بذریعۂ مراسلت آپ کی روحانی اور عرفانی تعلیمات سے ہدایت یاب ہوتا رہتا نیز رشد و ہدایت کے سلسلہ سے اللہ رب العزت نے خطابت کی خصوصی انفرادیت سے انہیں نوازا تھا۔ حضرت حکیم الاسلامؒ کی تبلیغی ودعوتی خطبات و

تقاریر آپ کی زندگی کا مابہ الامتیاز مقام تھا۔ وعظ و خطاب کا یہ ملکۂ راسخہ اور قوت بیان حضرت حق جل مجدہٗ کی عطا موہبت خاص تھی۔ جس سے آپ کو سرفراز فرمایا گیا تھا۔ آپ صرف شعلہ بیان مقرر اور پر جوش خطیب ہی نہ تھے بلکہ آپ کے لب ولہجہ میں شہد کا سا مٹھاس، شبنم کی سی نمی، پھولوں کی سی خوشبو کا حسین سنگم تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جسمانی اور روحانی نسبت قاسمی آپ کے اندر متصرف تھی۔ تقریر میں بے ساختگی اور روانی و بے تکلفی اور تسلسل انتہائی درجہ در آمد تھی۔ ایسا لگتا تھا گویا ایک رواں سیلاب ہے جو فراز سے نشیب کی طرف یکسانیت وسکون کے ساتھ بہہ رہا ہے اور مجمع پر سحر انگیزی کی یہ حالت کہ آواز تو کیا معمولی حرکت بھی نہیں ہوتی تھی۔ گویا سامنے کھلی ہوئی کتاب ہے اور آپ اس کو پڑھ رہے ہیں۔ چنانچہ ایک ایسا دلچسپ و دل آویز اور دلکش و روح پرور ماحول پیدا ہوجاتا تھا کہ پیچیدہ اور الجھے ہوئے مسائل بھی سامعین کے قلب و دماغ میں بآسانی موجزن ہوجایا کرتے۔ خداوند قدوس نے آپ کو اعلیٰ علمی و انتظامی اور فکری صلاحیتیں مرحمت فرمائی تھیں۔ علماء ہند کی امانت و وراثت ام المدارس دارالعلوم دیوبند کے مسند اہتمام پر ساٹھ سال کے عرصۂ دراز تک فائز رہ کر جس شان وشوکت وعزیمت کے ساتھ چلایا اور مقبولیت وشہرت کے جس مقام رفیع سے سرفراز فرمایا اس میں آپ کی انتظامی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ تحمل و تواضع اور تدبر کو بڑا دخل ہے، دارالعلوم کو اپنی معنوی اولاد کی طرح لے کر چلے تو اساتذہ و کارکنان کے عملہ کو انہوں نے اپنے خاندان کا فرد سمجھا، نہ کوئی ان سے دور تھا اور نہ کسی کو ان کی ذات سے کوئی خوف تھا۔ دیکھنے کو تو وہ ایک منحنی اور نحیف ونزار سے انسان تھے مگر عزم وحوصلہ اور ارادے وہمت کی ایک ایسی چٹان تھے جس سے سمندر کی بپھری اور بے قابو موجیں بار بار ٹکرائیں اور مایوس ہوکر لوٹ گئیں۔ الحاصل مفادات دارالعلوم کا تحفظ ان کی زندگی کا مقصد تھا۔ کوئی شخص ان کی زندگی کا کتنے ہی مخالفانہ ارادے سے مطالعہ کرے لیکن ان کی آپ بیتی کے چند لرزہ خیز واقعات اس درجہ واضح اور قطعی ہیں کہ ممکن نہیں ان سے انکار کیا جاسکے۔ ازاں جملہ یہ کہ جو جماعتیں ان کی مخالف تھیں حکیم الاسلامؒ نے ان کے ایک ایک فعل کا جواب صبر وتحمل، راستی و دیانت اور عفو و بخشش کے اعلیٰ نمونہ سے دیا۔

مظلومی میں صبر، مقابلے میں عزم، معاملہ میں راست بازی، طاقت واختیار میں درگذر، تاریخ انسانیت کے وہ نوادر ہیں جو کسی ایک زندگی کے اندر اس طرح عموماً جمع نہیں ہوتے۔

خیر! میری چند شکستہ سطور کا مقصود تو حضرت حکیم الاسلامؒ کی تصنیفی وتالیفی خدمات کا عکس کھینچنے کی کوشش کی اپنی سی کوشش ہے، حضرت کی زندگی کا یہ قابل رشک پہلو جس کی مختصر مگر جامع ترین اور مبسوط ترجمانی علمائے

دیوبند کے اویسی النسبت مسلم بزرگ حضرت اقدس مولانا سید اصغر حسین میاں صاحب علیہ الرحمۃ اور اکابر جماعت اہل حق کی تمام معنوی اور روحانی نسبتوں اور تمام علمی امتیازات وخصوصیات کو حق تعالیٰ شانہٗ نے ماشاءاللہ مولانا محمد طیب صاحبؒ کی ذات ستودہ صفات میں جمع فرما دیا ہے۔

چنانچہ اپنی تصانیف کے ذریعہ جزیرہ نمائے ہند میں بالخصوص اور کل عالم میں بالعموم جماعت اہل حق یعنی قدسی صفات علمائے دیوبند کی کی ترجمانی کرتے ہوئے وہ اپنی مشہور ترین کتاب ''مسلکِ علمائے دیوبند'' میں علمائے دیوبند کے مسلک کی تفصیل بیان کرتے ہوئے مسلکِ علمائے اہل سنت والجماعت کی پوری تاریخ بیان کرتے ہیں۔ نیز ثابت کرتے ہیں کہ یہی علمائے دیوبند کا معتصم مسلک ہے۔

اس کتاب کے افتتاحی صفحہ پر ہی وہ مسلک علمائے دیوبند کا تعارف کراتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''علمائے دیوبند اپنے مسلک اور دینی رخ کے لحاظ سے کلیۃً اہل سنت والجماعت ہیں اور اہل سنت کا بھی اصل حصہ ہیں (جس سے وقتاً فوقتاً مختلف شاخیں کٹ کٹ کرا لگ ہوتی رہی ہیں) ہندوستان میں یہ سلسلہ قوت کے ساتھ اجتماعی رنگ میں حضرت الامام شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ سے زیادہ پھیلا اور چمکا، اس سلسلہ کی وہ کڑی آج ہندوستان میں اہل سنت والجماعت کے مسلک کی ترجمان اور رواں دواں علمائے دیوبند ہیں جنہوں نے تعلیم وتربیت کے ذریعہ اس سلسلہ کو مشرق سے مغرب تک پہنچایا اور پھیلایا''۔

علمائے دیوبند صرف اہل سنت والجماعت کے اصول وقوانین ہی کے از اول تا آخر پابند رہے ہیں بلکہ ان کے متوارث ذوق کو بھی انہوں نے تھاما اور محفوظ رکھا ہے پھر وہ خود روقسم کے اہل سنت نہیں بلکہ ان کا استناد اور سندی سلسلہ ملا ہوا ہے۔ اس لئے مسلک کے لحاظ سے نہ وہ کوئی جدید فرقہ ہیں اور نہ بعد کی پیداوار ہیں بلکہ وہی قدیم اہل سنت والجماعت کا مسلسل سلسلہ ہے جو اوپر سے تسلسل اور استمرار وسند متصل کے ساتھ اکابراً عن کابرٍ چلا آ رہا ہے۔ وقت کے عوامل اور افراط وتفریط نے چوں کہ اہل سنت سے مختلف شاخیں پیدا کر دیں اور ہر نئی شاخ نے جو اصل ہونے کا دعویٰ کیا جو دعویٰ ہی کی حد تک نہیں رہا بلکہ اپنے وجود وبقاء کے لئے ہر شاخ نے اصل طبقہ کے خلاف محاذ بنا کر اسے غیر اصل اور اپنے کو اصل ثابت کرنے کی جدوجہد کا آغاز بھی کر دیا۔

اس افتتاحیہ کی تشریح وہ اس طرح فرماتے ہیں ''سو اہل سنت والجماعت کے اس اصل طبقہ یا علمائے دیوبند کے اس جامع اور معتدل ترین مسلک کو سمجھنے کے لئے جس میں افراط ہے نہ تفریط، نہ غلو ہے نہ مبالغہ بلکہ کمال اعتدال اور جامعیت کا جوہر پیوست ہے۔ سب سے پہلے اس کے لقب اور لقب کے مآخذ پر غور کر لیا جائے تو اسی سے اس کی بنیادیں واضح ہو جائیں گی اور معیار بھی مشخص ہو کر سامنے آ جائے گا اور وہ یہ کہ

اہل سنت والجماعت کا یہ مرکب اور مسلکی لقب دو اجزاء سے مرکب ہے ایک ''السنۃ'' اور ایک ''الجماعت'' ان دونوں کے مجموعے ہی سے علمائے دیوبند کا مسلک بنتا ہے تنہا ایک کلمہ سے نہیں۔ السنۃ کے لفظ سے اصول قانون اور طریق نمایاں ہیں اور الجماعت کے لفظ سے ذوات وشخصیات اور رفقائے طریق نمایاں ہیں۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ اس مسلک میں اصول وقوانین بغیر ذوات کے اور ذوات بغیر قوانین کے معتبر نہیں، جب کہ قوانین ان ذوات ہی کے راستہ سے آئے ہیں اور ذوات ان قوانین ہی سے پہچانی گئی ہیں۔ اس ماخوذ کو لے لیا جانا اور ماخذ کو چھوڑ دینا کوئی معقول مسلک نہیں ہوسکتا۔ جیسا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس امت کو قرآن کریم ہی نہیں دیا بلکہ پیغمبر ﷺ کی ذات بھی عطا فرمائی جنہوں نے قرآن کریم کو پڑھ کر سنایا، سمجھایا، اس کے عمل کا نمونہ دکھلایا اور اس کے لئے ذہنوں کو بنایا ایسے ہی نبی کریم ﷺ نے امت کو صرف قرآنی قوانین ہی نہیں بخشا بلکہ قانون داں، ذوات وشخصیات بھی دیں جنہوں نے اس سے متأثر ہوکر اپنے اپنے وقت میں دورِ نبوت کی طرح قانون دین سنایا، سمجھایا، عمل کر کے دکھلایا اور ذہنوں کو اپنی تربیت سے اس کے صحیح صحیح سمجھنے کے لئے مستعد کیا۔

اس سنت اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ سے واضح ہے کہ دین اور دینی ہدایت وتربیت کے لئے تنہا کتاب اور تنہا شخصیت ہی کافی نہیں بلکہ قانون کے ساتھ معلمین قانون اور لٹریچر کے ساتھ مربیان دستور کی معیت بھی ناگزیر ہے، تاکہ صرف قانون ہی علم میں نہ آئے جو کتاب اور نوشتوں سے بھی فی الجملہ آسکتا تھا بلکہ اس کا رنگ بھی دلوں پر چڑھ جائے اور اس کی حقیقی ومعنوی کیفیتیں بھی قلوب میں راسخ ہوں جو ذوات سے وابستگی کے بعد ہی ممکن تھا اس لئے مسلک علمائے دیوبند یا بالفاظ دیگر مسلک اہل سنت والجماعت حسب روش پیغمبری یہی دو بنیادی باتیں ذوات اور قانون بطور رکن اختیار کی گئیں حتی کہ اس فرقہ کا لقب وہ اختیار کیا گیا جس کے عنوان ہی سے یہ دونوں بنیادیں نمایاں نظر آئیں یعنی **اھل السنة و الجماعة**.

شاید اسی لئے حدیث میں **ماأنا علیه و اصحابی** میں بہتر (۷۲) فرقوں میں سے فرقہ حقہ کی نشان دہی فرماتے ہوئے نبی کریم ﷺ نے معیارِ حق ان دونوں چیزوں کے مجموعہ کو ظاہر فرمایا اور انہیں ما اور أنا سے تعبیر فرمایا۔ ما سے اشارہ ہی اسی السنۃ یعنی روش نبوی علیہ السلام یا قانون دین کی طرف ہے جس سے ملت حقہ پیدا ہوئی اور جس سے پھر مختلف دینی شعبے بنے اور أنا و **أصحابی** سے اشارہ **الجماعة** یعنی برگزیدہ شخصیتوں کی طرف ہے جو پیغمبر ﷺ سے شروع ہوئیں اور بعد میں کسی نہ کسی شعبہ میں حذاقت و مہارت سے بنتی رہیں جن سے فرقۂ حقہ پیدا ہوا، اس لئے اہل سنت والجماعت نے اپنے مسلک کی جامع

حقیقت جس جامع لقب سے ظاہر کی ہے وہ حقیقت اور یہ لقب غالباً اسی حدیث پاک سے اخذ کیا گیا ہے بلکہ امام احمد بن حنبلؒ اور ابوداؤد کی اسی مضمون کی روایت میں تو أنا و أصحابی کی جگہ **الجماعة** کا صریح لفظ موجود ہے جس سے أنا و أصحابی کی وہ مراد جو ہم نے بطور ماخوذ اور مستنبط ظاہر کی تھی اس حدیث سے صریح اور منصوص ہو جاتی ہے، اس میں حضور ﷺ نے بہتر (۷۲) فرقوں کو ناری اور ایک کو ناجی فرمایا تو خود ہی جنتی فرقے کو **ھی الجماعة** کے لفظ سے تعبیر فرمایا اس لئے اہل سنت والجماعت کے لقب کا ایک جزو تو منصوص بھی ہو گیا اور ما سے چوں کہ ہر وہ راہ مراد ہے جو اولاً حضور ﷺ کی راہ ہو اور پھر آپؐ کی تبعیت میں بعد والی جماعت کی راہ ہو اور ظاہر ہے کہ راہ نبوی ﷺ ہی کا نام سنت ہے جو لفظ **ما** کا مصداق ہے اور جب **ما** کا مدلول ہی یہاں سنت ہوا تو اس فرقہ کے لقب کا دوسرا جزو بھی تقریباً منصوص ہی نکلتا ہے اور اس طرح اس فرقہ کے حقانی ہونے کی یہ بھی ایک بڑی دلیل ہے کہ اس کا لقب حضور ﷺ نے تجویز فرمایا ہے **وکفی به فخراً** جس کا حاصل یہ نکلا کہ حق فرقہ وہی ہوگا جس میں یہ دونوں بنیادی اجزاء موجود ہوں۔ غور کیا جائے تو یہی لقب اس جامع حقیقت کو ظاہر بھی کر سکتا ہے جو اس فرقۂ حقہ میں **ما** اور **أنا** کے امتزاج سے نمایاں ہوئیں مثلاً اس فرقہ کا لقب اہل قرآن یا اہل حدیث یا اہل فقہ یا اہل تصوف یا اہل کلام یا اہل اصول ہوتا تو اس سے **ما** کا مصداق یعنی شخصیتوں کا تصور نہ آ سکتا اس لئے یہ لقب اکہرا اور نا تمام ہوتا اور اگر مثلاً اس کا لقب اہل جماعت یا متبعین صحابہؓ یا اصحاب محدثین و مجتہدین یا اتباع فقہا یا محبین اہل بیت وغیرہ رکھ لیا جاتا تو اس سے بلاشبہ **أنا** کے مفہوم پر تو روشنی پڑ جاتی لیکن **أنا** کے کلمہ کا حق نہ ادا ہو سکتا اور یہ سمجھ میں آتا کہ یہ فرقہ شخصیت پرست یا طبقہ پرست ہے جس کے پاس شخصیتوں کے سوا کوئی اصول نہیں ہے کہ جس کی یہ پیروی کر لے پس یہ لقب بھی نا تمام، اکہرا اور تقریباً خلاف واقعہ ہوتا اور بیک وقت اس کے ذوق اصول پسندی، نیازمندی کو ظاہر نہ کر سکتا۔ اس لئے لقب اہل سنت والجماعت رکھا گیا تا کہ اس کے مسلک کی یہ دونوں بنیادیں اصولیت اور شخصیت بااوّل وہلہ سے ہی ظاہر ہو جائیں۔ **لکل من اسم نصیبٌ.**

اندریں صورت جب کہ یہ مسلک کلام نبویؐ کی صریح عبارت ہے اور اس کے واضح منشاء سے ماخوذ ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ یہ مسلک اور اس کا یہ نام اور عنوان عین منشاء نبوت اور مرضئ خداوندی ہے جسے الحمدللہ اہل سنت والجماعت نے اپنایا اور اسے اپنا دستور حیات بنایا، اس لئے علمائے دیوبند کے مسلک کا خلاصہ حسب منشاء حدیث نبوی ﷺ مختصر الفاظ میں اتباع سنت بتوسط شخصیات نکل آتا ہے۔

اسی کتاب میں عارف باللہ حکیم الاسلام محمد طیب صاحب قدس سرہ العزیز نے مسلک علمائے دیوبند

کے مزاج کی ترجمانی سے صفحات کو یوں مزین فرمایا ہے ''پس مسلک علمائے دیوبند محض اصول پسندی کا نام ہے نہ شخصیت پرستی کا اور نہ ان کے یہاں دین اور دینی تربیت کے تنہا لٹریچر کافی ہے نہ تنہا شخصیتوں کے اقوال وافعال پر اتکال وبھروسہ ہے، بلکہ اصول وقانون اور ذوات وشخصیات اور بالفاظ دیگر مختصر لٹریچر بشرط معیت وملازمت صدیقین سے اس مسلک کا مزاج بنا جس میں کسی ایک کے احترام سے قطع نظر جائز نہیں اور جامعیت واعتدال اور احتیاط ومیانہ روی ہی مسلک کا جوہر ہے تو دین کے ان تمام شعبوں اور علمی اصول میں قرآن وحدیث سے لے کر فقہ وکلام اور تصوف واصول وغیرہ کی چھوٹی چھوٹی جزئی پر جمنا اور حکمت و اعتدال کے ساتھ اسے مشعل راہ بنانا ہی اس مسلک کا امتیاز ہے۔

اور ادھر ذوات اور شخصیات کی لائن میں حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام سے لے کر ائمہ، اولیاء، صلحاء وعلماء، مشائخ وصوفیہ اور حکماء کی ذوات قدسیہ تک کے بارے میں افراط وتفریط سے الگ رہ کر ان کی عظمت ومتابعت پر قائم رہنا ہی اس مسلک کی امتیازی شان ہے، پھر ان تمام دینی شعبوں کے اصول و قوانین اور علم وفن کا خلاصہ دو ہی چیزیں ہیں: عقیدہ اور عمل، جس کے لئے شریعت آئی اور ان شعبوں کو وضع کیا باقی امور یا تو ان کے مبادی ولوازم ہیں یا آثار ونتائج جس سے ان فنون میں بحث ہوتی ہے۔

نیز حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں علمائے دیوبند کے مسلک کی مختصر مگر جامع اور مبسوط ترجمانی حضرت علیہ الرحمۃ نے یوں رقم فرمائی ہے کہ اس سلسلہ میں اولاً ذوات ہی کا معاملہ لیجئے تو عالم کی ساری برگزیدگیوں اور برگزیدہ ہستیوں کا مخزن حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی ذوات قدسیہ ہیں جن کی عظمت اور محبت اور عقیدت ومتابعت ہی اصل ایمان ہے لیکن اس میں بھی علمائے دیوبند میں حسب طریقۂ اہل سنت والجماعت اپنے مسلک کی رو سے غلو اور افراط وتفریط سے بچ کر نقطۂ اعتدال کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں نہ تو ان کا مسلک غلو زدہ اور بے بصیرت طبقوں کی طرح ہے کہ خدا اور انبیاء میں کوئی فرق نہیں، صرف ذاتی اور عرضی کا فرق ہے، معاذ اللہ یا خدا ان میں حلول کئے ہوئے ہے اور وہ محض ایک پردۂ مجاز ہیں جن میں ربانی حقیقت سمائی ہوئی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ محض افراط وتفریط ہے جو محض جہالت کے شعبہ ہیں حالاں کہ دین و مذہب علم کا شعبہ ہے نہ کہ جہالت کا بلکہ علم وادراک کا بھی اصل ہے ادھر یہ غلو ظلم کا شعبہ ہے نہ کہ عدل کا اور مذہب کا بنیادی نقطۂ اعتدال ہے نہ کہ افراط وتفریط اور غلو ومبالغہ۔ بنا بریں حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں علماء دیوبند کا مسلک ان دونوں خلاؤں کے درمیان نقطۂ اعتدال ہے، یہ مقدسین جہاں پیغامِ الٰہی کے

امین ہیں جنہوں نے کمال دیانت اور جزم واحتیاط کے ساتھ پیغام الٰہی مخلوقِ خدا تک پہنچایا ہے جو کہ عالم بشریت کا سب سے بلند ترین مقام ہے وہیں وہ اس کے رمز شناس معلم اور اس کی روشنی میں مخلوق الٰہی کے مربی ومحسن ہیں۔ اس لئے جہاں وہ خدا کے سچے پیغامبر ہے جس سے ان کی امانت اور راست بازی کھلتی ہے وہیں وہ عالم کے مربی ومعلم بھی ہیں جن سے ان کا محبوب عالم ہونا بھی نمایاں ہوتا ہے اس لئے وہ ہر تعظیم وعظمت کے مستحق اور ہر ادب واحترام کے مستوجب ہیں مگر ساتھ ہی اس مسلک کا یہ بھی اہم جزو ہے کہ وہ بشر بھی ہیں نوع بشر سے الگ ان کی کوئی نوع نہیں، اس لئے جہاں ان کی بے ادبی کفر اور عظمت عین ایمان ہے، وہیں اس عظمت میں شرک کی آمیزش بھی کفر سے بڑھ کر کفر ہے۔

آنحضرت ﷺ کے بارے میں علمائے دیوبند کے مسلک کی ترجمانی انہوں نے یوں فرمائی:

پھر اس مقدس طبقہ کی آخری اور سب سے زیادہ برگزیدہ ہستی نبی کریم ﷺ کی ذات بابرکات ہے جن کی عظمت وسر بلندی وہر بلندی وبرتر ہستی سے بمراتب بے شمار زیادہ اور بڑھ کر ہے اس لئے ان کی تعظیم و توقیر کے درجات اور حقوق بھی اوروں سے زیادہ ہیں لیکن حضور ﷺ کے بارے میں بھی علمائے دیوبند کا مسلک وہی نقطۂ اعتدال ہے اور میانہ رویہ ہے جو خود حضور ﷺ کی پیدا کردہ ہے۔ چنانچہ علمائے دیوبند بصدق قلب سید الکونین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو افضل الکائنات، افضل البشر اور افضل الانبیاء یقین کرتے ہیں مگر ساتھ ہی آپ کی بشریت کا بھی اقرار کرتے ہیں، غلو عقیدت ومحبت میں نفیٔ بشریت یا ادعاء اوتاریت یا پردۂ مجاز وغیرہ کہنے کی جرأت نہیں کرتے، وہ آپ کی ذات بابرکات کو تمام انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی تمام کمالاتی خصوصیات، خلت، اصطفائیت، کلیمیت، روحیت، صادقیت، مخلصیت، صدیقیت وغیرہا کا جامع بلکہ مبدأ نبوت انبیاء پر اور منشاء ولایت اولیاء کو سمجھتے ہیں اور آپ ہی پر تمام مختارات خداوندی کی ریاست کی انتہا مانتے ہیں لیکن پھر بھی آپ کا سب سے بڑا کمال عبدیت یقین کرتے ہیں اور وہ کمالات نبوی وعلو درجات کو انتہائی ثابت کرنے کے لئے آپ کی حدود وعبدیت کو توڑ کر حدود معبودیت میں پہنچا دینے سے مدد نہیں لیتے اور نہ ہی اسے جائز سمجھتے ہیں۔ وہ آپ کی اطاعت مطلقہ کو فرض عین جانتے ہیں لیکن آپ کی عبادت کو جائز نہیں سمجھتے، وہ آپ کو ساری کائنات میں فرد اکمل اور بے نظیر جانتے ہیں لیکن خصوصیات الوہیت تسلیم نہیں کرتے اور اس میں ذاتی اور عرضی کا فرق بھی نہیں سمجھتے۔

وہ آپ کے ذکر مبارک اور مدح وثناء کو عین عبادت سمجھتے ہیں لیکن اس میں عیسائیوں کے سے مبالغہ کو جائز نہیں سمجھتے کہ حدود بشریت کو حدود الوہیت سے جا ملائیں، وہ برزخ میں آپ کی جسمانی حیات کے قائل

ہیں لیکن وہاں معاشرت دنیویہ کے قائل نہیں۔ وہ اس کے اقراری ہیں کہ آج بھی امت کے ایمان کا تحفظ گنبد خضرا ہی کے منبع یمانی سے ہو رہا ہے لیکن پھر بھی وہ آپ کو حاضر و ناظر نہیں جانتے جو کہ خصوصیت الوہیت میں سے ہے وہ آپ کے علم عظیم وساری کائنات کے علم سے خواہ ملائکہ ہوں یا انبیاء واولیاء بمراتب بے شمار زیادہ اور بڑھ کر جانتے ہیں لیکن پھر بھی اس کے ذاتی اور محیط ہونے کے قائل نہیں۔

غرض ساری کائنات میں تمام ظاہری و باطنی کمالات میں آپ کو ساری مخلوق میں بلحاظ کمال و جمال یکتا بے نظیر اور بے مثال یقین کرتے ہیں لیکن خالق کے کمالات سے ان کے کمالات کی وہی نسبت مانتے ہیں جو مخلوق کو خالق سے ہوسکتی ہے کہ خالق کی ذات وصفات سب لامحدود ہیں اور مخلوق کی محدود ذاتی ہیں یہ عرضی ہو کر بھی محدود، وہ خانہ زاد ہیں اور یہ عطا کا ثمرہ پس یہ حدود کی رعایت وہی نقطۂ اعتدال ہے جو اس مسلک اعتدال کی اساس ہے۔

اسی طرح اولیاء کرام وصوفیاء عظام کے طبقہ کے متعلق علمائے دیوبند کے نظریہ کو انہوں نے یوں قلم بند کیا کہ:

اولیاء صوفیاء عظام کا طبقہ مسلک علمائے دیوبند کی رو سے امت مسلمہ کے لئے روح رواں کی حیثیت رکھتا ہے جس سے اس امت کی باطنی حیات وابستہ ہے جو اصل حیات ہے، اس لئے علمائے دیوبند ان کی محبت وعظمت کو ایمان کے تحفظ کے لئے ضروری سمجھتے ہیں مگر غلو کے ساتھ محبت وعقیدت میں انہیں ربوبیت کا مقام نہیں دیتے ان کی تعظیم شرعاً ضروری سمجھتے ہیں لیکن اس کے معنی عبادت کے نہیں لیتے۔

الحاصل حضرت حکیم الاسلامؒ کی یہ تصنیف لطیف اگر چہ ایک مختصر سے رسالہ اور مضمون کی شکل میں ہے لیکن جامعیت کے لحاظ سے مسلک علماء دیوبند کی ترجمانی کرنے والا ایک کافی وشافی ومکمل دستاویز ہے۔

حکیم الاسلامؒ نے علم حدیث کی اہمیت وعظمت اور حدیث کی اقسام کا قرآن کریم سے محققانہ ثبوت پیش کیا چنانچہ پہلی کتاب ''حدیث رسول کا قرآنی معیار'' میں فہم حدیث کے بغیر فہم قرآنی کے غیر ممکن ہونے کو انہوں نے یوں واضح کیا کہ پیغمبر کی زبان سے ہر کلام کلام ہدایت کسی نہ کسی کیفیت سے صادر ہوتا ہے۔ یہ کیفیات ظاہر ہے کہ نفسانی نہیں ہوتیں جو ہر کس و ناکس پر طاری ہوسکتی ہیں بلکہ روحانی ورحمانی ہوتی ہیں، اس لئے وہ کلام درحقیقت اسی متعلقہ کیفیت میں ڈوب ہوا ہوتا ہے اور اسی سے سرزد ہوتا ہے اور اسی کا ہوتا ہے گویا وہ کیفیت ہی الفاظ میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ پھر اس کیفیت سے یہ کلام چل کر اسی کیفیت کی طرف لوٹتا ہے جس سے یہ کیفیت قلب میں اور زیادہ مستحکم ہو کر جڑیں پکڑتی ہے گویا اس کلام کے اول وآخر رحمانی و روحانی کیفیت چھائی رہتی ہے۔ غور کیا جائے تو اس کلام کی مراد درحقیقت اسی کیفیت میں چھپی رہتی ہے

کیوں کہ کلام کسی نہ کسی مقصد کے لئے کیا جاتا ہے اور مقصد کسی نہ کسی کیفیت کا مقتضاء ہوتا ہے اسی لئے قدرتی طور پر کلام کی صحیح مراد کو وہی پا سکتا ہے جو کسی نہ کسی حد تک انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی کیفیات اوران کے اسوۂ حسنہ سے آشنا اور ہم آہنگ ہو، عاشق کی مراد کو عشق آشنا ہی پوری طرح جان سکتا ہے، عالم کی مراد کو علم آشنا کسی نہ کسی حد تک پاسکتا ہے اس لئے کلام رب کو رب آشنا ہی کسی نہ کسی حد تک پا سکتا ہے اس لئے جو ربانی کیفیات سے کسی نہ کسی حد تک مانوس نہ ہو، ورنہ بے کیفیت اور نا آشنا ممکن ہے کہ کلام کے لغوی مفہوم اور معنی اول تک پہنچ جائے لیکن متکلم کے صحیح منشاء ومراد تک اس کیفیت سے مانوس اور ان میں غرق ہوں تو وہ عادۃً مراد کو سمجھانے سے بھی پوری طرح نہیں سمجھ سکتے ہیں جس سے ادراک مراد حق پوری طرح ادا و مطلع ہو جائے اور اگر اتفاقاً وہ الفاظ کی مدد سے کسی حد تک مراد حق پر مطلع بھی ہو جائیں تو اس کیفیت کے بغیر اس میں مبصر نہیں بن سکتے جس سے اس کی مخفی حقیقتیں ان پر کھل سکیں۔

اوران حقائق میں مضمر شدہ احوال ان پر طاری ہوسکیں جن سے حقیقی معرفت کا دروازہ کھل جاتا ہے اور آدمی مبصر بن جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کی صفات اور اس میں بھی بالخصوص صفت علم اور اخص خصوص صفت کلام جو اس کے علوم کی ترجمان اور معبر ہے اور اس کا مظہر اتم ہے قرآن کریم اپنی اصولیت، کلیت، کمال جامعیت اوران شئون الٰہیہ سے بھرپور ہونے کی وجہ سے جن سے یہ کلام سرزد ہوا ہے ذات ہی کی طرح لامحدود الحقائق، لامحدود المعارف اور لامحدود المطالب ہے جو یک نوع نہیں بلکہ ماضی اور مستقبل اور حال کی ہزار ہا انوار علوم پر حاوی وشامل ہے۔

فيه نبأ ما قبلكم و خبر ما بعدكم و كم مابينكم هو الفصل ليس بالهزل من تركه من جبار قصمه اللّٰه و من ابتغى الهدى فى غيره اضله اللّٰه و هو حبل اللّٰه المتين وهو الذكر الحكيم وهو الصراط المستقيم وهو الذى لا تزيغ به الأهواء ولا تلبس به الا السنة ولا تشبع به العلماء ولا تخلق عن كثرة الرد ولا تنقض عجائبه وهو الذى لم تنته الجن اذا سمعته حتى قالوا انا سمعنا قرآناً عجبا يهدى الى الرش فاٰمنا به. من قال به صدق و من عمل به أجر و هن حكم به عدل و من دعا اِلى هدى اِلى الصراط المستقيم خذها اِليك يا أعور.

ترجمہ: اس میں تم سے پہلوں کی باتیں ہیں اور پچھلوں کی خبریں ہیں اور حال کے احکام اور وہ یقینی چیز ہے مذاق نہیں جس متکبر نے اسے چھوڑا اس کی گردن خدا نے توڑ دی اور جس نے ہدایت اس کے سوا میں

ڈھونڈی اسے خدا نے گمراہ کر دیا وہ اللہ کی مضبوط رسی ہے، وہ حکیمانہ یادداشت ہے، وہ سیدھا راستہ ہے، وہ وہ چیز ہے جس سے دلوں کے میلانات ٹیڑھے نہیں ہوتے اور زبانیں مشتبہ نہیں ہوتیں اور اس سے علماء کبھی سیر نہیں ہوتے، وہ کثرت تلاوت سے پرانا نہیں ہوتا اس کے عجائبات کبھی ختم نہیں ہو سکتے۔ وہی ہے کہ جب جنات جیسی سرکش قوم نے جب اسے سنا تو سرکشی سے ایک دم رک گئے اور یہی کہتے جب ہم نے عجیب کلام کو سنا ہے جو بزرگی کی طرف لے جاتا ہے ہم تو اس پر ایمان لے آئے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو اسے زبان پر لائے اس نے سچ کہا جس نے اس پر عمل کیا اسے اجر ملا، جس نے اس کے ساتھ حکم کیا اسے انصاف کیا، جس نے اس کی طرف بلایا اسے سیدھے سچے راستے کی ہدایت ہوئی۔

حجیت حدیث کے مستقل اور معقول ہونے کو قطعیت کے ساتھ حضرت علیہ الرحمہ نے اس طرح قلم بند فرمایا کہ: بہر حال جس قدر بھی حدیثی احکام ہیں وہ درحقیقت قرآن ہی سے ماخوذ ہیں اور اسی کا بیان ہیں البتہ ان کی خاص نوعیت کی وجہ سے دو جہتیں ہیں۔ ایک جہت تابع قرآن ہونے کی ہے سو اس جہت سے اس کا نام بیان قرآن ہوگا، گو اس بیان اور قرآن کا درمیانی واسطہ دقیق ہو اور عمیق ہونے کی وجہ سے ہر ایک پر نہ کھلے، دوسری جہت اس کی تشریعی احکام کی ہے کہ اس کی رو سے حدیث ایک مستقل مصدر تشریع اور شریعت کی جہت مستقلہ ثابت ہوگی، اس لئے جن نصوص سے حدیث کا بیان ہونا واضح ہوتا ہے، ان سے تو حدیث کی تابعیت اور فرعیت کی شان نمایاں ہوتی ہیں اور جن نصوص سے حدیث مصدر تشریع ثابت ہوتی ہے، ان سے ان کے احکام کو مثل احکام قرآن بتلا کر حدیث کا قرآن کے مماثل حجت شرعیہ ہونا واضح کیا گیا ہے جیسے حدیث نبوی میں ارشاد فرمایا گیا ''الا انی اوتیت القرآن و مثلہ معہ'' خبردار ہو! مجھے قرآن کے ساتھ اس کا مثل بھی دیا گیا ہے اور فرمایا گیا و **انما حرم رسول اللّٰہ کما حرم اللّٰہ** اور تحقیق رسول اللہ نے بعض چیزیں حرام کی ہیں جیسے اللہ نے حرام کیں۔ اس سے تشریعی طور پر حدیث کی استقلالی شان واضح کی گئی ہیں۔ رہا یہ پہلو کہ بعضے وہ احکام جو احادیث میں ہیں اور قرآن میں نہیں جیسے مقدام بن معدیکرب کی حدیث میں آپ نے حجیت حدیث اور اس کی مستقل تشریعی شان کو نمایاں کرتے ہوئے فرمایا کہ حمار اہلی کی حرمت قرآن میں نہیں اسے رسول اللہ نے حرام کیا ہے یا درندوں کے گوشت کی حرمت کلام اللہ میں نہیں کلام رسول میں ہے وغیرہ وغیرہ جن سے حدیث کی نہ صرف شان تشریعی ہی قرآن سے الگ ہو کر ثابت ہوتی ہے بلکہ بظاہر بعض احکام کا قرآن سے علاقہ بھی ثابت نہیں ہوتا جو بظاہر حدیث کے بیان قرآن ہونے کے منافی اور سابقہ دعوے کے خلاف معلوم ہوتا ہے جس میں تمام احادیث کے بیان قرآن

ہونے کا ادعاء کیا گیا ہے تو جواب یہ ہے کہ یہ حدیث اور احکام حدیث بھی بیان قرآن ہونے سے نہیں نکل سکتے کیوں کہ اس قسم کی روایات کے احکام گو جزوی طور پر کسی خاص آیت پر نظر نہ پڑے مگر وہ کلی طور پر آیت کے ذیل کے بیان میں ثابت ہوں گے جسے قرآن نے ایک مستقل اصول کی حیثیت سے بیان فرما دیا ہے:

مَا اٰتَاکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَ مَانَهَاکُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا پس اس قسم کے تمام احکام جن کو اللہ کے رسولؐ نے مشروع فرمایا ہے۔ درحقیقت اس مذکورہ آیت کا بیان واقع ہو رہے ہیں جس میں رسول کو خود احکام دینے کی ہدایت دی گئی ہے اور تشریع رسول کو تشریع الٰہی کے متوازی قرار دیا گیا ہے۔ گویا اوپر کی دو ذکر کردہ حدیثیں اس آیت کا بیان واقع ہو رہی ہیں اور اس طرح حدیث نبویؐ کے دیے احکام سب اسی آیت کی رو سے قرآنی احکام اور بیان قرآن کہتے ہیں۔ سیدنا حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے ایک بڑھیا نے کہا کہ آپ گودھنے والی عورت پر لعنت کرتے ہیں حالاں کہ قرآن میں گودھنے کی ممانعت کہیں بھی نہیں ہے تو آپ نے فرمایا کاش تو قرآن پڑھی ہوئی ہوتی، کیا قرآن میں یہ آیت نہیں ہے کہ جو رسولؐ لا کر دیں اسے لے لو اور جس سے روکیں اس سے رک جاؤ؟ کہاں ہاں یہ تو ہے۔ فرمایا کہ بس اسی کی رو سے حضورؐ نے واشمہ یعنی گودھنے والی پر لعنت کی اور فعل قبیح سے روکا تو یہ حکم رسولؐ اس آیت کا بیان ہو کر قرآنی حکم ہو گیا یا جیسے امام شافعیؒ نے ایک بار حرم مکہ میں بیٹھ کر علمی جوش میں فرمایا کہ آج میں ہر سوال کا جواب قرآن سے دوں گا تو کسی نے حرم میں زنبور یعنی تتیہ مارنے کا حکم پوچھا کہ قرآن میں کہاں ہے؟ جو امام شافعیؒ کا مذہب ہے، فرمایا آیت **مَا اٰتَاکُمُ الرَّسُوْلُ** سے حکم رسول کا ماننا واجب نکلا اور حدیث **اقتداو بالذین من بعدی ابی بکر و عمر** سے سیدنا حضرت سیدنا ابوبکرؓ و عمرؓ کے حکم کا ماننا واجب نکلا اور سیدنا ابوبکرؓ و عمرؓ نے فرمایا **یقتل الزنبور فی الحرم** حرم میں تتیہ بھرنڈی ماری جاسکتی ہے، اس لئے یہ قتل زنبور کا حکم بیک واسطۂ آیت **مَا اٰتَاکُمُ الرَّسُوْلُ** کا بیان ثابت ہو کر قرآنی حکم ثابت ہوا۔

بہرحال حدیث کی دو جہتیں ثابت ہوتی ہیں۔ ایک بیان قرآن ہونے کی جو اس کے تفریعی ہونے کی دلیل ہے اور ایک اس کے مستقل حجت ہونے کی گو مخفی رشتہ سے وہ بیان قرآن بھی ہو مگر جلی طور پر وہ حکم رسول اور حکم حدیث ہے جو حجیت میں اس کے مماثل قرآن ہونے کی جہت ہے اس لئے حدیث میں ان دو پہلوؤں کے لحاظ سے دو شاخیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ایک اصل ہونے کی اور ایک فروع ہونے کی، سو وہ قرآن کے لحاظ سے تو فرع مانی جائے گی۔ فرع اس کا بیان ہے اور تابع اصل ہوتا ہے اور اجتہادی فقہوں کے لحاظ سے اصل مانی جاوے گی کہ احکام اس سے ماخوذ بھی ہیں اور اس سے شرح شدہ بھی ہیں۔ اس طرح حدیث

ایک برزخ کبریٰ ثابت ہوئی جو قرآن سے علم لیتی ہے اور فقہ کو دیتی ہے۔ اگر حدیث درمیان میں نہ ہو تو فقہ کا کوئی جوڑ براہِ راست قرآن سے نہیں لگ سکتا اور مفہوم بھی نہیں ہوسکتا۔

نیز اسی کتاب میں حضرت حکیم الاسلامؒ نے شریعت اسلامیہ میں نقب لگانے والے وضاعین حدیث سے متنبہ کرنے کی سعیٔ کامل کی ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں حدیث نبوی میں مختلف قسم کے منکرین حدیث کی خبر دی گئی ہے کہ وہ مختلف صورتوں اور مختلف اندازوں سے حدیث رسولؐ کا اعتبار ختم کرنے کی ناپاک سعی کریں گے۔ ایک طبقہ کے بارے میں فرمایا کہ وہ وضاعین حدیث کی صورت میں نمایاں ہوگا جو حدیث کے پیرائے میں حدیث کو بے اعتبار ثابت کر کے گویا اس سے انکار کی دعوت دے گا۔

عن ابی هریرةؓ قال قال رسول اللّٰه ﷺ یکون فی آخر الزمان دجالون کذابون یاتونکم من الاحادیث مالم تسمعوا انتم ولا آباؤکم فایاکم و ایاهم لایضلونکم ولا یفتنونکم.

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اخیر زمانہ میں جھوٹے دجال تمہارے پاس آئیں گے جو ایسی احادیث بیان کریں گے جس کو تم نے نہیں سنا ہوگا اور نہ ہی تمہارے آباء واجداد نے سنا ہوگا، خبردار ان سے بچ کر رہئے گا، وہ تمہیں گمراہ نہ کردیں اور نہ تمہیں کسی فتنہ میں مبتلا کر پائیں۔ پس یہ تو انہوں نے ان لوگوں کی اطلاع دی جنہوں نے حدیث اور بیان قرآن کو معتبر کہہ کر بلکہ اس سے عقیدت کا اظہار کر کے عیاری سے جعلی حدیثیں گھڑی اور اصلی حدیثوں میں رلا ملا کر بیان کیا۔ اسی طرح حضرت علیہ الرحمہ میں اپنی تصنیف لطیف میں منکرین حدیث سے بھی آگاہ کیا اور اسے مدلل کیا۔ چنانچہ وہ رقم طراز ہیں، پھر ایسے لوگوں کی وجود کی بھی حضور اقدس ﷺ نے خبر دی جو کھلے بندوں حدیث کا انکار کر کے اسے بے اعتبار بنانا اور اسے مٹا دینا چاہیں گے اور اس عیاری کے ساتھ کہ قرآن کا نام لے کر قرآن کی روش سے اس بیانِ قرآن کو ختم کردینا چاہیں گے۔

عن المقدام بن معدیکرب قال قال رسول اللّٰه ﷺ ألا انی اوتیت القرآن و مثله معه الا یوشك رجل شعبان علی أریکته یقول علیکم بهذا القرآن فما وجدتم فیه من حلال فاحلوه و ما وجدتم فیه من حرام فحرموه و ان حرم رسول اللّٰه کما حرم اللّٰه لا یحل لکم الحمارالاهلی ولا کل ذی ناب من السباع ولا لقطة معاهد الا ان یستغنی عنها صاحبهاالخ.

حضرت مقدام بن معدیکرب سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ خبردار میں قرآن دے کر بھیجا گیا ہوں اور قرآن کا مثل بھی دے کر بھیجا گیا ہوں۔ خبردار عنقریب شکم سیر جو اپنے تکیہ پر ٹیک لگائے ہوئے ہوگا وہ تمہارے اوپر قرآن کریم کو بیان کرے گا چنانچہ جو تم اس میں حلال پاؤ گے تو اس کو حلال رکھنا اور جو تم اس میں حرام پاؤ گے تو اس کو حرام رکھنا اور بے شک اللہ کے رسولؐ نے بھی ایسے ہی کچھ چیزوں کو حرام کیا ہے جیسے اللہ نے حرام کیا ہے، تمہارے لئے حمار اہلی حلال نہیں ہے اور نہ پنجوں سے پکڑ کر کھانے والے درندے اور نہ راستوں میں کسی کی پڑی ہوئی چیز مگر یہ کہ تمہارا رب المال سے معاہدہ ہو جائے جو تمہیں اس کے ضمان سے بری کر دے۔

اس حدیث کے ذریعہ مصنفؒ نے فتنۂ انکار حدیث کا منشاء بھی بتلا دیا کہ وہ منکروں کی شکم سیری اور پیٹ بھرے ہونے کا کرشمہ ہوگا، دنیا کی طرف سے بے فکری ہوگی تو دین پر ہاتھ صاف کرنے کی سوجھے گی۔

غرض یہ کہ یہ کتاب جہاں احادیث رسولؐ کا معیار بتلاتی ہے، وہیں اس کے محقق بالقرآن اور مؤید بالقرآن ہونے کو بھی ثابت کرتی ہے۔ چنانچہ مصنفؒ نے اس کتاب میں حدیث اور اقسام حدیث کو قرآنی معیار کے ترازو میں تولا ہے، وہیں اس کو ادلۂ قرآن سے بھی ثابت و محقق کر دیا ہے۔

حضرت حکیم الاسلامؒ کے تصنیفی سلسلہ کی ایک اہم ترین کڑی ان کی کتاب بشکل مضمون ''الکلم الطیب'' بھی تحقیق کا ایک شاہکار ہے۔ دراصل یہ مقالہ پرویز صاحب کی قرآنی تحریفات کی ایک کڑی یعنی ''سورۂ فیل میں پرویزی تحریف'' موصوف کی تحریف کا جواب ہے اور یہ اس وقت کے پرویز کی تحریف کا جواب ہے جب وہ تحریف کا قاعدہ بغدادی ختم کر کے پارۂ عم شروع کر چکے تھے لیکن مصنفؒ کا قلم اسلام کا حکیمانہ اور متکلمانہ ترجمان ہے، اس لئے اس مقالہ کی جامعیت اور پرویزی فکر و ذہن کا حقیقی تجزیہ آج سے برسہا برس پہلے جس گہرائی کے ساتھ کیا گیا ہے وہ اپنی جگہ بجائے خود ایک مستقل رہبر و رہنما کی حیثیت رکھتا ہے اور پرویز صاحب کی باطل پسندی اپنے آپ سامنے آجاتی ہے، تاہم یہ رسالہ بھی کسی حد تک اہم وضاحت ہے۔

نسب اور اسلام کے بارے میں اسلام نے اپنی اصل اور اساس کو برقرار رکھتے ہوئے اس کو انسانی فکر و ذہن کے سپرد نہیں کیا بلکہ اپنی ہمہ گیری کے تحت فکر و ذہن کو بھی ملحوظ رکھا ہے اور انسانی عظمتوں کی بھی پوری پوری پاس داری فرمائی ہے۔ مسئلہ کفائت میں معاشرے کی ستودہ روایات کو باقی رکھنے میں فکر و ذہن کو اگر اس کا حق دیا ہے تو انسانی تکریم و عظمت کی اصل بنیاد صالح کردار اور خوف خدا کو قرار دے کر پستی و بلندی کے انسانوں کے خودساختہ معیار کو بھی توڑا ہے۔ اسلام میں نسب کو تفاخر کا وسیلہ نہیں قرار دیا گیا بلکہ تعارف کا ذریعہ بنایا گیا ہے پھر

پیشوں کے ذریعہ نسبوں کا تعین نہ عربی مزاج ہے اور نہ اسلامی اساس، بلکہ یہ خصوصیات عجم میں سے ہے اور جیسا کہ مرز و بوم کی خصوصیات سے غیر شعوری تأثر پذیری کی وجہ سے عجمی مسلمانوں میں بہت سی چیزیں غیر اسلامی ہونے کے باوجود رواج پذیر ہوگئیں انہیں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ان میں بھی پیشوں کی وجہ سے نسب بننے لگے اور نہ صرف یہ بلکہ ان مفروضہ انساب میں برتری اور کمتری کے جراثیم بھی پرورش پانے لگے۔ ظاہر ہے کہ اس اندازِ فکر ونظر کو اسلام سے کوئی قرب نہیں ہوسکتا جو اپنے ماننے والے ہی کے درمیان نہیں بلکہ رشتۂ اخوت کے ذریعہ پورے عالم انسانی کے ایک ہوجانے کا داعی بن کر آیا ہے۔ حضرت حکیم الاسلامؒ نے اسی عنوان کی ترجمانی کے مقصد سے ایک بیش قیمتی مقالہ ''نسب اور اسلام'' تحریر کر چھوڑا ہے جو مسلمانان عجم کو بالخصوص اور عرب کو بالعموم اس سلسلہ کی اسلامی تعلیمات کی ہدایات عنایت کرتا ہے۔

چنانچہ مساوات اور فرق مراتب کے عنوان سے وہ رقم طراز ہیں کہ بہر حال اگر اسلامی مساوات کے یہ معنی ہیں کہ اسلامی قانون میں تمام انسانی طبقہ برابر سمجھے جائیں تو یہ مسئلہ اس وقت تک حل نہیں ہوسکتا بلکہ قابل ذکر شئے نہیں ہوسکتی جب تک انسانوں میں مشترکہ انسانیت کے ساتھ فرق مراتب اور درجات کا تفاوت، کمتر و برتر کا وجود، اعلیٰ و ادنیٰ کا تفاضل، امیر و غریب کی تفریق اور شریف و وضیع کی تخصیص نہ ہوں کیوں کہ مساوات کے معنی دو چیزوں کے ساتھ یکساں اور مساویانہ برتاؤ کرنے اور انہیں کسی خاص دائرے میں ایک درجہ پر لے آنے کے ہیں اور ظاہر ہے کہ ایک درجہ پر انہیں دو کو لانے کی سعی کی جاتی ہے جو ایک مرتبہ پر نہ ہوں اور اس لئے کی جاتی ہے کہ کمتروں کی دل شکنی و شکستگی نہ ہو اور برتروں کو ناز بیجا نہ ہو، کمتر تو یہ سمجھ کر مسرور و بشاش رہ سکیں کہ ان کی ہستی بھی اس دائرے میں بڑے حلقوں میں شمار ہوسکتی ہے اور برتر یہ سمجھ کر اترا نہ جائیں کہ وہ بہمہ وجوہ تحتانی طبقوں سے بالاتر اور فوق الفطرت ہیں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ فوقانی طبقات سے انحراف واعراض نہ لاحق ہوگا پس مساوات احکام کی رو سے ایک طبقہ کا غرور ٹوٹتا ہے اور ایک حلقہ کی شکستگی، ایک تکبر سے محفوظ رہتا ہے اور ایک تدبر سے۔

مگر یہ مساوات کا اجرا اور اس کا قابل مدح ہونا جب ہی پورا ہوسکتا ہے جب کہ کمتر و برتر اور فوق وتحت کے درجات انسانوں میں ہوں تاکہ اسلامی قانون کو اس دعوے کا موقع ہاتھ آسکے کہ اس نے اعلیٰ و ادنیٰ، امیر و غریب اور کمتر و برتر سب کو احکام کی ایک صف میں لا بٹھایا ہے۔

لیکن افسوس! کہ قوم نے اسلام کے اس خوبصورت و جامع ترین فلسفہ کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہ دیکھا اور نہ تقریباً دینی حلقوں نے اس طرف توجہ فرمائی، خیر حضرت حکیم الاسلامؒ تو اس فریضہ کو ادا کر گئے اور فلسفۂ کو

مکمل واضح اور ہدایات کا جامہ پہنا کر چلے گئے، اب ہماری باری ہے کہ ؎

ہواؤں میں سرگوشیاں ہو رہی ہیں
مرے دوستو دیپ بجھنے نہ پائے

جناب غلام جیلانی برقؔ نے اسلام کا منشاء تسخیر کائنات قرار دیا ہے چنانچہ موصوف نے ایک قرآن تو وحی متلو قرار دیا ہے جس کا نام علمی قرآن رکھا ہے اور دوسرا قرآن صحیفۂ کائنات کو قرار دیا ہے جسے عملی قرآن کے نام سے موسوم کیا ہے۔ حضرت مولانا محمد طیب صاحب قدس سرہٗ نے اپنی کتاب ''ایک قرآن'' میں برق صاحب کے نظریۂ اصولی پر تبصرہ فرمایا ہے چنانچہ مولانا موصوفؒ نے یہ ثابت کیا ہے کہ جزئیات کے حسن وقبح کا مدار ان کلیات پر ہوتا ہے جن کے ماتحت وہ جزئیات ہوتی ہیں اور ادراک کلیات تابع ہے ذوق اور ذہنیت کے، اس لئے اگر ذوق وذہنیت سلیم اور مستقیم ہے تو اس ذہنیت سے ابھرنے والے کلیات کے ادراک بھی صحیح ہوں گے اور ان کلیات سے نکلنے والی جزئیات بھی اور اگر ذوق کجی لئے ہوئے ہے تو اس سے نکلنے والے کلیات اور ان کلیات کے تحت میں آنے والی جزئیات دونوں کے ادراک میں غلطی ہوگی، یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے ذوق وذہنیت کی اصلاح وتقویم پر سب سے زیادہ زور دیا ہے اور اصلاح وتقویم کا نام تزکیہ رکھ کر اسے نبوت کے فرائض چارگانہ میں سے ایک اساسی فریضہ قرار دیا ہے جس کا ذکر قرآن پاک میں تعلیم سے پہلے بھی آیا ہے اور تعلیم کے بعد بھی **يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيَاتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ الآية.**

برق صاحب نے اسلام کا منشاء تسخیر کائنات قرار دیا تھا جس کے نتیجہ میں انسان مادیات کا محتاج بن کر رہ جاتا ہے اور نمونہ محمد رسول اللہ ﷺ کی پاک زندگی ہے ''**لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ**'' یہ عنوان عین قرآن کے مطابق ہے جو انسانوں کو سفلیات وفلکیات سے اٹھا کر الٰہیات کی لامحدود وسعتوں میں پہنچا دیتا ہے جہاں سے وہ تمام کائنات پر حکومت کرتا ہے اور کائنات کا ہر ہر جز اس کے اشارۂ ابرو کی تعمیر کرتا ہے۔ **''لَا يَزَالُ عبدی يتقرب الی بالنوافل حتی اجبته فاذا اجبته فكنت سمعه الذی يسمعه به و بصره الذی يبصر به و يده التی يبطش به و رجله التی يمشی بها''**

برق صاحب نے قرآن کی تقسیم ثنویت کی ذہنی ماتحت کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن دو ہو گئے مگر ان دونوں میں کوئی ربط باقی نہ رہا اور سب سے بڑی کوتاہی یہ ہوئی کہ اس تقسیم میں آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی کے لئے جو حسب تصریح اثر صحیح **كان خلقه القرآن** عملی قرآن ہے کہیں گنجائش نہیں رکھی گئی۔

اس کے مقابلہ میں حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ نے اول تو تعدد قرآن ہی کی مخالفت فرمائی پھر فرمایا

کہ اگر بطور تفنن طبع تعدد قرآن نظریہ کو مانا بھی جائے تو تین عنوان کے ساتھ تا کہ کتاب اللہ علمی قرآن، کائنات الٰہی برہانی اور تمثیلی قرآن اور رسول اللہ ﷺ کی ذات عملی قرآن قرار پائے اور اس طرح علمی قرآن احکام کا مجموعہ تمثیلی کائناتی قرآن دلائل وامارات کا مجموعہ اور عملی قرآن یعنی ذات محمد ﷺ نمونۂ عمل ہے۔ اس عنوان میں کسی قدم پر قرآن وسنت کی مخالفت بھی لازم نہیں آتی اور تینوں میں کمال ربط بھی قائم رہتا ہے۔ برق صاحب کے نظریہ کے مطابق کسی نبی کی بعثت کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی اور حضرت حکیم الاسلام محمد طیب صاحبؒ کے پیش کردہ نظریہ کے مطابق نبی کی بعثت ضروری ہوجاتی ہے تا کہ نمونۂ عمل انسانوں کے لئے ان کے سامنے آجائے۔ بہر حال حضرت مولانا محمد طیب صاحب قدس سرہ العزیز نے بہت مکمل اور مدلل بحث فرمائی ہے اور کسی گوشہ کو تشنہ نہیں چھوڑا۔

ڈاڑھی رکھنے نہ رکھنے کا مسئلہ اسلامی نقطۂ نظر سے جس قدر واضح اور بدیہی، سادہ اور سہل العمل تھا آج کے دور ہواؤ ہوس نے اسے اتنا ہی مشکل، پیچیدہ اور معرکۃ الاراء بنا دیا ہے، عقل سلیم اور نقل صحیح کی قوت اس کی پشت پر تھی، تعامل سلف کی طاقت اس کے دائیں بائیں تھی، ان قوتوں کی وجہ سے یہ مسئلہ ایک مضبوط اور محکم قانون اور مستند رواج یا سنت حسنہ کی صورت سے قرون امت پر چھایا ہوا تھا۔ اگر اس مسئلہ کو انہیں میزانوں میں تول تول کر رکھا جاتا رہتا تو اس میں کوئی پیچیدگی رونما نہ ہوتی لیکن جب کہ خارجی اثرات اور ایک فاسقانہ تمدن کے ماحول میں رائے خالص اور ہوائے نفس سے اس کا جائزہ لیا جانے لگا تو قدرۃً مسئلہ کی شرعی حیثیت مشتبہ اور بے بصیرت قلوب سے اوجھل ہوگئی جس کا طبعی نتیجہ وہی پیچیدگی تھی جو پیدا ہوئی اور لوگ جہل وحیرت اور کج راہی کا شکار ہو گئے۔

اسی عنوان وتمہید کی حکمت ریز کتاب ''ڈاڑھی کی شرعی حیثیت'' حضرت حکیم الاسلامؒ کے گوہر بار قلم سے منصۂ شہود پر آئی جس میں فاضل مصنفؒ نے ڈاڑھی کی اہمیت وفضیلت اور قطعیت وسنیت پر محققانہ بحث فرمائی ہے جو نیک بختوں کے لئے ایک مشعل راہ بھی ہے اور مغرب پسند نوجوانوں کے غفلت زدہ ذہن ودماغ کے لئے ضرب کاری بھی، نیز حضرتؒ نے اس کے نہ ہونے کے مفاسد بھی واضح کئے اور اس کے ہونے کی صورت میں سعادت دارین کی یقین دہانی بھی کرائی ہے۔

''**سبحان من زين الرجال باللحى**''۔

فنا کے بعد زندہ ہے شان رہبری تیری
ہزاروں رحمتیں ہوں اے میر کارواں تجھ پر

نیز عارف باللہ حضرت حکیم الاسلام محمد طیب علیہ الرحمۃ نے ''آفتاب نبوت'' ایک کتاب تحریر فرمائی جس میں قرآن کریم کی صرف ایک آیت ''وَ دَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَ سِرَاجًا مُّنِيْرًا'' کی قرآنی تمثیل سے نبوت محمدیہؐ کی تمام شانوں کا حکیمانہ استنباط کیا۔

اسی طرح اسلامی تہذیب وتمدن یعنی ''التشبه فی الاسلام'' اس کتاب میں غیر مسلم اقوام کے ساتھ مسلمانوں کی مشابہت کی اصل حیثیت اور اسلامی تہذیب وتمدن کی حفاظت اور اس کی بقاء قرآن، حدیث، آثار صحابہؓ اور فقہائے امت کے عقلی ونقلی دلائل کی روشنی میں بیان کی گئی ہے۔ نیز اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اس کی ابتداء میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی، حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا سید مرتضٰی حسن صاحبؒ، مولانا سید اصغر حسین صاحبؒ اور شیخ الادب مولانا اعزاز علی صاحبؒ جیسے اکابر علماء کی تقاریظ ثبت ہیں۔

اسی طرح ''شہید کربلا و یزید'' محمود احمد عباس کی کتاب ''خلافت معاویہ یزید'' کا مفصل مدلل اور مسکت جواب، حادثۂ کربلا کے اسباب ونتائج، سیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے موقف کی وضاحت، آپ کے موقف پر کئے گئے اعتراضات کا تحقیقی جواب، نیز افراط وتفریط سے ہٹ کر علمائے اہل سنت والجماعت کے مسلک اعتدال کی تشریح فرمائی ہے۔

''تاریخ دارالعلوم دیوبند'' دارالعلوم کی سو سالہ زندگی، اس کی تاسیس، وجہ تاسیس، تعلیمی، تبلیغی اور انتظامی اور عام افادی کوائف واحوال اور مشاہیر دارالعلوم کے حالات زندگی کا مختصر جامع ترین مرقع ہے۔

''خاتم النبیین'' اس کتاب میں سابقہ انبیاء کے مخصوص کمالات، حضور پاک ﷺ کی ذات میں جمع ہونے کی بے مثال تفصیلات حکیم الاسلامؒ نے پیش فرمائی ہیں۔

''اسلام کا اخلاقی نظام'' یہ کتاب اسلام کی بے مثال اخلاقی نظام کی ایک جھلک اور مسیحیت کی جانب سے اسلام پر کئے جانے والے اعتراضات کا حکیمانہ جواب ہے۔

''اصول دعوتِ اسلام'' قرآن پاک کی آیت ''اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ'' کی روشنی میں اسلام کے تبلیغی نظام کی وضاحت، نیز دعوت و مدعووین کی اقسام پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

''جذبات الم'' اہلیہ محترمہ کی وفات پر دکھ بھرے جذبات سے لبریز ازدواجی زندگی کی کہانی رقم فرمائی۔

''مسلک علمائے دیوبند'' ہی اصل اہل سنت والجماعت اور مسلک اعتدال پر قائم ہے۔

''کلمۂ طیبہ'' (مع رسالہ کلمات طیبات) پہلے رسالہ میں کلمہ طیبہ کا قرآن، حدیث اور اجماع سے ثبوت اور اس کے دلائل بیان کئے گئے ہیں۔ دوسرے رسالہ میں ذکر اللہ کے دس اسلامی کلمات کے فضائل اور ان کے پڑھنے کا طریقہ مع شجرۂ منظومہ ذکر فرمایا ہے۔

''مسئلہ تقدیر'' یہ کتاب حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے مقدمہ کے ساتھ تین محقق علمائے کرام مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ تعالیٰ، مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی رحمہ اللہ تعالیٰ اور مولانا محمد طیب صاحبؒ کے مقالات پر مشتمل ہیں۔

''مقالات طیبہ'' اس کتاب میں تین مقالات اور ایک تقریر شامل ہیں۔ (۱) اسلام عالمی مذہب ہے (۲) دارالعلوم دیوبند کے اساسی اصول اور جنگ آزادی میں اس کا کردار (۳) دو علمی سوال اور ان کے جواب (۴) تقریر علم وحکمت ''مشاہیر امت''

(نونیۃ الاحاد (عربی) مع ترجمہ وتشریح اردو) اس کتاب میں حکیم الاسلامؒ نے چند مشاہیر کو جو علوم و فنون میں یکتا اور فرد تسلیم کئے گئے ہیں عربی قصیدہ میں منظوم کیا ہے۔ ۶۸/اشعار پر یہ منظومہ مشتمل ہے۔

''علم غیب'' مع رسالہ مسئلہ علم غیب از مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، علم غیب کے مسئلہ پر بے مثل تحقیق۔

''عرفان عارف'' (اردو، فارسی اور عربی کا مجموعہ) مرتبہ حضرت مولانا محمد اسلم صاحب قاسمی مدظلہٗ صاحبزادہ حضرت حکیم الاسلامؒ استاذ حدیث دارالعلوم وقف دیوبند۔

''شرعی پردہ'' اسلام کے نظام عفت وعصمت کا حسین مرقع پردہ کی ضرورت واہمیت کا قرآن وحدیث سے ثبوت اور پردہ پر کئے جانے والے اعتراضات کا شافی جواب۔

درس وتدریس میں ان کا اپنا ایک مقام تھا، بخاری شریف، حجۃ اللہ البالغہ، مشکوٰۃ شریف، ترمذی کئی کتابیں مختلف اوقات میں ان کے زیر درس رہیں، مسند تدریس پر بھی ان کی انفرادیت مسلم ہے۔ ایک کامیاب اور اعلیٰ مدرس کی تمام صفات ان کے اندر موجود تھیں، کتاب کی اہمیت، مصنف کے حالات، موضوع کا احاطہ، افہام وتفہیم کا خصوصی ملکہ، لغات کی رعایت، حاشیہ ومتن پر غائر نظر، مسائل ومرادات کا کامل استحضار، بیان پر قدرت، طلبہ کی طلب اور درس کے تقاضوں کا بھرپور علم تھا ان کی انتظامی مصروفیات نے تدریس کے لئے زیادہ وقت تو انہیں نہیں دیا مگر جتنا وقت بھی انہوں نے اس کام پر لگایا وہ کارآمد، مفید اور نفع بخش وقت رہا، طلبہ نے ان سے خوب خوب استفادہ کیا۔

چاہا بھی اگر ہم نے تیری بزم سے اٹھنا
محسوس ہوا پاؤں میں زنجیر پڑی ہے

شعروادب سے بھی حضرتؒ کا گہرا تعلق تھا، خاص طور پر نعت اور حمد آپ کی محبوب صنف سخن تھیں، دیگر اصناف سخن پر بھی آپ نے طبع آزمائی کی، ان کے تمام تر شعری سرمایہ کی بنیاد اصلاح وتربیت پر ہے۔ اکابر کی طرح حمد ونعت کو ہی انہوں نے اپنی فکری پرواز کا محور بنایا، مرشدِ کامل حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ سے لے کر حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ تک اور اس کے بعد اکثر بزرگوں نے حمد ونعت کا سلسلہ جاری رکھا، شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ کی شاعری تو اپنا خاص رنگ اور کیفیت رکھتی ہے اور ان کے یہاں بعض ایسے اشعار بھی مل جاتے ہیں جو شعری وفکری دنیا سے تعلق رکھنے والے نامور افراد کے اشعار کے مقابلے میں بآسانی رکھے جا سکتے ہیں، حکیم الاسلامؒ کی شعری اور فکری صلاحیتوں کا ذکر وقت کی معروف صاحب قلم اور صاحب کمال شخصیت مولانا عبدالماجد دریابادی نے جس وقیع انداز میں کیا ہے اس سے حکیم الاسلامؒ کی پختہ گوئی، برجستگی، سلاست اور روانی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

الحاصل حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے دنیاوی دولت کی طرف کبھی توجہ نہیں فرمائی، سفر وحضر میں حضرت کا پورا وقت رضائے الٰہی واخروی تیاریوں یعنی تبلیغ وارشاد اور تالیف وتصنیف وغیرہ ہی میں صرف ہوتا رہا، زبان حال سے گویا یہ صدا تھی ؎

سیم وزر کیا شئے ہے یہ لعل وگہر کیا چیز ہیں
آنکھ بینا ہو تو علم وفن کا سرمایہ بہت

ان کی نورانی، پاکیزہ اور قابل تقلید زندگی کے بہت سے دیگر خوش نما اور حسین عنوانات ہیں جن کو ایک سوانحی مضمون میں سمیٹنا ناممکن ہے۔ حکیم الاسلامؒ کو اس دنیا سے رخصت ہوئے ۲۰؍سال ہو رہے ہیں، ۱۷؍جولائی ۱۹۸۳ء کو یہ صاحب علم وفضل انسان، جماعت شیخ الہند کا نورِ نظر، اکابر واسلاف کی نشانی، ہندوستانی مسلمانوں کی دینی اور مذہبی رہنمائی کا ایک نمونۂ کامل، تقریر وخطابت کا نام ور شہ سوار، تحریر وقلم کی باعظمت ہستی عالم فانی سے عالم باقی کی طرف کوچ کر گئی۔

برد اللّٰہ مضجعه و سقی اللّٰہ ثراہ

و جعل الجنة مثواہ.

............❖............

حکیم الاسلامؒ حکمت قاسمیہ کی نمائندہ شخصیت
ایک نادر تحریر کے تناظر میں

مولانا ڈاکٹر محمد شکیب قاسمی
نائب مہتمم و استاذ دارالعلوم وقف دیوبند

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ دارالعلوم دیوبند ہی کے نہیں ''فکر دیوبند'' کے بھی بانی ہیں اور ''فکرِ دیوبند'' دراصل عبارت ہے حجۃ الاسلام حضرت نانوتویؒ کی اس علمی عبقریت سے جو اسلامی عقائد و اعمال اور اخلاق و اقدار کی تفہیم و تشریح میں عقل و نقل کا ایک دلنشیں اسلوب اور دلکش فطری منہج اختیار کئے ہوئے ہے۔ تعریف و امتیاز کے لئے آپ اسے ''حکمت قاسمیہ'' کا نام دے سکتے ہیں۔

''حکمت قاسمیہ'' فکر دیوبند کا وہ امتیاز ہے جس کی وجہ سے دیوبندی مکتبہ فکر دیگر مکاتب فکر کے درمیان اپنی ایک خاص پہچان اور علمی دنیا میں اپنا ایک مقام رکھتا ہے۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند اپنے عہد میں ''حکمتِ قاسمیہ'' کے ترجمان اور شارح تھے، انہوں نے جدامجد حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے علوم و معارف کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا تھا، قدرت نے انہیں زبان و بیان اور تحریر کا جو سلیقہ عطا فرمایا تھا اس پر جب ''حکمت قاسمیہ'' شامل ہوگئی تو کتاب و سنت کی تفہیم و تشریح میں وہ حکیمانہ رنگ پیدا ہوگیا جو حجۃ الاسلام امام غزالیؒ اور حجۃ اللہ فی الارض شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے یہاں موجود تھا بلکہ اس سے بھی زیادہ موثر، جاذب نظر اور عقل و فہم کو اپیل کرنے والا۔ حکیم الاسلامؒ کی تحریر، تقریر، تصنیف، گفتگو، مجلس، مکاتبت اور منظوم کلام ہر جگہ حکمت قاسمیہ بولتی ہے اور مخاطب پوری طرح محظوظ ہوتا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ''حکمت قاسمیہ'' کے اس ترجمانِ عالی شان ہی کی زبان سے سنئے کہ ''حکمت قاسمیہ'' کے پس منظر اور ان احوال کو سمجھنے کی کوشش کریں

جو حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کے اس منفرد استدلالی اسلوب کے لئے محرک ثابت ہوئے۔

''بحر اور بر اور خلاء و فضاء سب ہی مشینوں کی زد میں آگئے پھر ساتھ ہی سائنس نے مادہ کے ہزار ہا سربستہ راز دنیا کے سامنے کھول کر رکھ دیئے جس سے دنیا مخفی اور پنہاں چیزوں کا مشاہدہ کرنے کی عادی ہوگئی، بالفاظِ دیگر فلسفۂ جدید اور سائنس کے نئے نئے انکشافات سے جن کی بنیاد مشاہدات پر تھی، دنیا عقلی نظریات اور معقولات سے گذر کر محسوسات کی گرفت میں آگئی تو قدرتی طور پر پرانے نظریات میں انقلاب رونما ہوا۔

اس لیے اب وہی عقل پرست طبقہ حس پرستی کا شکار ہوا اور اس دور کی دنیا نظریاتی استدلال سے زیادہ حسیاتی اور مشاہداتی استدلال کی لائنوں پر آگئی، اب اس کے یہاں کوئی شرعی دعویٰ اس وقت تک قابلِ سماعت نہیں رہا جب تک کہ وہ معقولات کے ساتھ محسوس شواہد سے محسوس کر کے نہ پیش کیا جائے اور روحانی معتقدات کی پشت پر مشاہداتی حجتیں نہ ہوں۔

بنا بریں اسی خوگر محسوس طبقہ نے اسلامی حصار پر عقلی نظریات کے بجائے حسی مشاہدات اور طبعیاتی افکار سے حملے کرنے شروع کر دیئے، اس لیے ضرورت تھی کہ اب اسلامی مسائل کو نظریاتی لباس سے ملبوس کرنے سے زیادہ طبعیاتی رنگ کی قمیصوں میں ملبوس کر کے پیش کیا جائے اور طبعیاتی شکوک وشبہات کا جواب انہی طبعیاتی انکشافات کے اصول سے دیا جائے۔''(۱)

عقلیاتی رنگ میں حقائق کو پیش کرنے کے احوال تھے، محض شرعیاتی نصوص سے استدلال پر اکتفاء وقت کے تقاضوں کو پورا نہیں کر رہا تھا، اسی طرح مغیبات کو محسوسات کے پیرائے میں سمجھنے کا مزاج بھی پیدا ہو چکا تھا، اس لئے ضرورت تھی کہ اس صورت حال کو سامنے رکھ کر ہی تفہیم دین اور عقلی رنگ میں پیش کئے جانے والے اعتراضات کا مسکت جواب دینے کے لئے کوئی موثر اسلوب اختیار کیا جاتا۔ آگے اس کی وضاحت فرماتے ہیں:

''اس صدی کے اوائل میں حق تعالیٰ کی فیاض قدرت نے شمس الاسلام حجۃ اللہ فی الارض حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ بانیٔ دارالعلوم دیوبند کو اس دور کے طبعیاتی رنگ کے امراض اور جراثیم کے معالجہ کے لیے بطور طبیب اور مصلح امۃ کے نمایاں فرمایا اور آپ نے اپنی تقریر اور تحریر کے ذریعہ ان بندگانِ سائنس ومشاہدات کے دماغوں کو انہی کے مسلمات سے جھنجھوڑا اور ان کے دماغوں کا تنقیہ شروع فرمایا۔

حکمتِ قاسمیہ کے تمام اجزاء نے (جو حضرتِ والا کی تصانیف میں موتیوں کی طرح بکھرے ہوئے ہیں) جہاں اسلامی حقائق پر گہری لِمّیاتی اور خالص عقلی دلائل کی روشنی ڈالی وہیں وہ پورے زور اور قوت کے

ساتھ ان حقائق کو آج کے محسوسات اور دور حاضر کے حسی شواہد و نظائر سے بھی مدلل کر کے اس طرح پیش کیا کہ اسلام کے غیبی امور، شریعت کے بنیادی مقاصد اور دینِ فطرت کے مبانی واصول اس حسّیاتی رنگِ استدلال سے بالکل طبعی اور محسوس و مشاہد نظر آنے لگے، ذات وصفاتِ خداوندی، مبداء و معاد، توحید و رسالت، عقائد و شرائع، برزخ اور قیامت، سزا و جزاء، حشر و نشر، وزن اعمال، میزانِ عمل، جنت و نار، ملائکہ و جنات، عرش و کرسی، لوح و قلم وغیرہ ان عقائد اور ان سے متعلقہ اعمال کا صفاتِ خداوندی سے ربط و علاقہ کلیاتِ دین کے ساتھ فرعیات کا ارتباط پھر شرائع وعقائد کی عقلی اور طبعی مصالح اس طبعیاتی طرزِ استدلال سے کچھ اس طرح واشگاف فرمائے کہ یہ سب امور فطرت اور طبیعت کا مقتضا محسوس ہونے لگ گئے جس سے اور اندازہ ہوتا ہے کہ حضرتِ والا ان حقائق کو محض نظری دلائل کے زور سے جبری طور پر دل میں ٹھوسنا نہیں چاہتے بل کہ یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ دین کے یہ تمام عقائد واحکام فطرت اور طبیعت کا تقاضا ہیں جن کا وجود اسی طرح قابلِ تسلیم ہے جیسے چمکتے ہوئے سورج کا وجود جس سے ایک فہیم انسان جبری انداز سے نہیں بل کہ طبعی تقاضوں سے انھیں ماننے اور تسلیم کرنے کے لیے بطوع ورغبت جھکنے کے لیے تیار ہو جائے، حضرتِ والا کے اس نئے طرز اثبات سے اس پورے دین کا محض دینِ عقلی ہونا ہی نہیں بل کہ دینِ فطرت ہونا نمایاں ہو جاتا ہے جیسا کہ حضرتِ والا کی کتابوں میں ان کی تقریراتِ استدلال سے واضح ہوگا۔'' (۲)

حجۃ الاسلام حضرت نانوتویؒ نے شرعی مستدلات کو عقلیات کے رنگ میں پیش کرنے کا جو طریقہ اپنایا وہ اپنے آپ میں اتنا منفرد اور بے نظیر تھا کہ سینکڑوں کتابیں پڑھ جایئے، علوم وفنون کے قدیم وجدید دفاتر کو کنگھال ڈالئے، اس کا کہیں سراغ نہیں ملتا، ایسی صورت میں اس اسلوب کے ماخذ کے بارے میں اس کے علاوہ اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ یہ بس آپ کا الہامی اور وجدانی اسلوب تھا، جو اللہ تعالیٰ نے خصوصیت سے آپ کے قلب پر القاء فرمایا تھا۔

حضرت حکیم الاسلامؒ فرماتے ہیں:

''ساتھ ہی حیرت ناک بات یہ ہے کہ حضرتِ والا کا یہ علم بلا شبہ لدنی ہے درسی یا کتابی نہیں، الہامی اور وجدانی ہے جس کا بظاہر دوسروں کے وجدان کے لیے حجۃ ہونا ضروری نہیں تھا، لیکن آپ کا طرزِ بیان خالص استدلالی اور منطقی ہوتا ہے جو مطیع و منکر دونوں کے لیے یکساں حجت ہو۔'' (۳)

حضرت حکیم الاسلامؒ کے بیان سے معلوم ہوا کہ حجۃ الاسلامؒ کا طرزِ بیان استدلالی اور منطقی ہوتا تھا مگر اپنے رنگ میں اور انداز میں خالص لدنی، وجدانی اور الہامی، شاید یہی وجہ ہے کہ آپ کی تحریرات میں

کتابوں کے حوالوں کا التزام نہیں، اس کی مزید وضاحت فرماتے ہیں کہ:

''حقائق سب کی سب منقول لیکن پیرایۂ بیان بلا حوالہ نقل خالص معقول اور اس کے ساتھ فلسفیانہ اور سائنٹفک گویا عقل وطبع دونوں کو صحیح معنی میں حضرت نے دین کا ایک خدمت گار بنا کر دکھلا دیا ہے کہ فلسفہ اور سائنس کا کان پکڑا اور دین کے جون سے گوشے کی چاہی ان سے خدمت لے لی، جس سے دین کی نسبت سے عقل وطبع دونوں کا موقف بھی خود بخود کھل کر سامنے آ جاتا ہے۔'' (۴)

یہاں قدرتی طور پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت نانوتویؒ کا یہ طرز عام ذہنوں کے لئے کچھ پیچیدہ اور مشکل معلوم ہوتا ہے اور بسا اوقات مخصوص اصطلاحات اور نادر علمی تعبیرات کے باعث طرز بیان کی چاشنی اور شگفتگی بھی ایسے احوال میں متاثر ہوجایا کرتی ہے۔ کہیں حجۃ الاسلامؒ کی عبارتوں میں یہ صورت حال تو نہیں؟ حکیم الاسلامؒ اس کی وضاحت فرماتے ہیں:

''اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ مضامین نہایت بلند پایہ، بہت گہرے اور علوم نہایت دقیق اور غامض ہیں لیکن طرزِ بیان نہایت شگفتہ اور سہل ہی نہیں بل کہ سہلِ ممتنع۔ مقدمات کی ترتیبِ طبع کہ اہم سے اہم نتائج گویا خود بخود نکلنے کے لیے ابھر رہے ہیں، تقریر استدلالی نہایت مرتب جو ذہن کو اپیل کرتی ہوئی اس کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے اور ساتھ ہی حضرتِ والا کا شاخ درشاخ بیان مسئلہ کے تمام شقوق وجوانب پر اتنا حاوی اور اس کے تمام گوشوں کا اس درجہ واشگاف کنندہ ہوتا ہے کہ اس سے صرف وہی ایک زیر بحث مسئلہ حل نہیں ہوتا بل کہ اس کے سیکڑوں امثال جو اس کی زد میں آ جائیں، خواہ وہ کسی دوسرے ہی باب کے ہوں اس اصولی طرزِ بیان سے حل ہوتے چلے جاتے ہیں بل کہ قلوب پر کتنے ہی علوم ومعارف کے دروازے کھلتے جاتے ہیں جن سے نئے نئے مسائل کا راستہ بھی ہموار ہوتا چلا جاتا ہے، اس صورتِ حال سے آدمی یہ ماننے پر مجبور ہوتا ہے کہ شریعت کے اس جزیہ کی پشت پر عقلی کلیات کی کس قدر کمک موجود ہے اور کتنے کلیئے اور عقلی اصول اس ایک جزیئے میں اپنا عمل کر رہے ہیں جس سے وہ عقلی ہی نہیں طبعی نظر آنے لگتا ہے، بقول حضرت عارف باللہ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ اولین صدر مدرس دارالعلوم دیوبند کہ:

''حضرتِ والا کے دماغ کی ساخت ہی خلقی طور پر حکیمانہ واقع ہوئی تھی، اس لیے بلا اختیار ان کے دماغ میں حکمت ہی کی باتیں آسکتی تھیں جس سے ان کے یہاں جزوی مسائل کا کلام بھی کلیاتی رنگ اختیار کر کے ایک کلیہ بن جاتا تھا اور اس سے وہی ایک جزیہ نہیں بل کہ اس جیسے سیکڑوں جزیئے حل ہوجاتے تھے اور اوپر سے ان کا وہ کلی اصول کھل جاتا تھا جس سے اس جزیہ کا نشو ونما ہوا ہے''۔

بعض ایسے جزوی مسائل جنھیں فقہاءِ امت خلافِ قیاس امرتعبدی کہہ کر گذر گئے ہیں حضرت والا کے یہاں وہ بھی قیاسِ جلی سے پیدا شدہ عقلیاتی ہیں چوں کہ آپ کے نزدیک شریعت کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا اور جزوی سے جزوی مسئلہ بھی غیر قیاسی یا مخالفِ عقل تسلیم نہیں کیا گیا ہے مثلاً قہقہہ کا ناقضِ وضوء ہونا تمام فقہاء کے نزدیک ایک خلافِ قیاس اور بالفاظِ دیگر غیر عقلی ہے، اس لیے وہ اس کی کوئی عقلی دلیل نہ پا کر اسے تعبدی کہتے گئے ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ عقل کے خلاف محض ایک امر شرعی ہے جسے صرف بوجہ ایمان تسلیم کیا جائے گا لیکن حضرت والا نے اسے بھی عقلی قرار دے کر اس پر عقلی دلائل پیش فرمائے ہیں اور بتلایا ہے کہ جس کلیہ سے یہ جزیہ پیدا ہوا ہے جب وہ عقلی ہے تو جزیہ کے غیر معقول ہونے کے کوئی معنیٰ نہیں ہوسکتے۔''(۵)

حجۃ الاسلامؒ کی ایک اور خصوصیت یہ سامنے آتی ہے کہ وہ نصوص کی طرح اخبار و واقعات سے بھی استنباط فرماتے ہیں اور ان کے نزدیک شرعی واقعات بھی اصولِ عقلیہ سے باہر نہیں ہے۔ یہ اپنے آپ میں ایک حیرت انگیز فکر اور بصیرت کی دلیل ہے جیسا کہ حکیم الاسلامؒ فرماتے ہیں:

''اس سے بھی زیادہ عجیب اور حیرت ناک یہ ہے کہ عامۃً قیاس واستنباط کا تعلق احکام سے ہوتا ہے نہ کہ اخبار اور واقعات سے، عقلی طور پر یہ تو کہا جاسکتا ہے کہ یہ حکم معقول ہے لیکن عقلی استدلال سے یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ واقعہ معقول اور عقلی ہے اور اسے عقلاً بھی یوں ہی ہونا چاہیے تھا، لیکن حضرت والا کے یہاں شرعی واقعات بھی اصول عقلیہ سے باہر نہیں ہیں اور آپ کا خداداد علم اور فراست اخبار اور واقعات کی عقلی لمیات میں بھی اسی طرح کام کرتا ہے جس طرح وہ احکام اور اوامر ونواہی کی حقائق بیانی میں کارفرما ہے۔

ظاہر ہے کہ واقعات اور حوادث کو کسی عقلی اصول سے جوڑ کر یہ دعویٰ کرنا کہ یہ واقعہ عقلاً بھی یوں ہی پیش آنا چاہیے تھا جس طرح کہ وہ واقعہ پیش آیا، بلاشبہ علم وفراست اور قلبی ذکاوت کی ایک نادر مثال ہے۔

دنیا میں کعبۂ معظّمہ (بیت اللہ) کا وجود ان کے یہاں محض تکوینی نہیں بل کہ عقلی بھی ہے یعنی بیت اللہ عقلاً بھی اسی محل میں ہونا چاہیے تھا جس میں وہ واقع ہے، پھر بیت اللہ کا اول بیت ہونا جو قرآنی دعویٰ ہے ان کے یہاں محض تاریخی نہیں بل کہ عقلی بھی ہے کہ اسے عقلاً بھی اول بیت ہی ہونا چاہیے تھا جیسا کہ وہ ہے حتی کہ بیت اللہ کے چالیس سال بعد مسجدِ اقصیٰ کی بنیاد رکھے جانے کی یہ اربعینی مدت بھی عقلی ہے کہ اقصیٰ تک کی تاسیس عقلاً بھی کعبہ کے چالیس ہی سال بعد ہونی چاہیے تھی۔

اس سے بھی عجیب تر یہ کہ کعبۂ محترمہ اور مسجدِ اقصیٰ کا درمیانی فاصلہ جو تقریباً ڈھائی تین سو میل ہے یہ بھی ان کے اصول پر عقلی ہے، محض تاریخی یا جغرافیائی نہیں، صرف اس لیے کہ وہ شرعی دعویٰ ہے اور ان کے

اصول حکمت میں شریعت کا کوئی دعویٰ مخالف عقل وقیاس نہیں ہوسکتا چناں چہ قبلہ نما میں اس کی تفاصیل دیکھی جاسکتی ہیں۔'' (۶)

حجۃ الاسلامؒ کے عقلیاتی ومشاہداتی طرزِ استدلال سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ محض سائنسی اور منطقی طرز ہے، جس کی شریعت مطہرہ میں کوئی نظیر نہیں یا اس طرز کے جواب کی سرے سے کوئی دلیل ہی نہیں بلکہ یہ طرز کائنات میں پھیلی ہوئی قدرت کی بے شمار نشانیوں اور آفاق وانفس کی بے شمار آیات بینات میں تدبر اور تفکر اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت وخالقیت پر استدلال ہی کا ایک اچھوتا طرز ہے۔ چنانچہ حکیم الاسلامؒ فرماتے ہیں کہ:

''قرآن حکیم نے کائنات کے مشاہدات زمین، آسمان، چاند، سورج، ستارے، دریا، پہاڑ، جمادات، نباتات اور ہواؤں کی شمالی، جنوبی رفتاروں سے بہت سے غیبی حقائق پر استدلال کیا ہے جو بلاشبہ فطری اور طبعی طرزِ استدلال ہے، حضرت نے ان مکونات کے اندرونی مکونات کی گہرائیاں طبعی انداز میں کھول کر ان استدلالات کو عقلی سے زیادہ طبعی بنادیا ہے، اس اصول پر کہ یہ خدا کے افعال ہیں اور اس کے افعال سے زیادہ اور کس کے افعال فطری ہوسکتے ہیں، آپ نے بدلائل واضح کیا ہے کہ قرآن کے یہ استدلالی مقدمات کن کن گہری اور فطری حقائق کو اپنے اندر لیے ہوئے ہیں جن سے یہ مسائل ثابت ہورہے ہیں، اس لیے قرآن کے یہ سب مسائل محض عقلی ہی نہیں بل کہ سائنٹفک بھی ہیں، مثلاً قرآن حکیم نے عالم کے جزئیاتی تغیرات سے قیامت کے ثبوت پر استدلال کیا ہے جو اس کا مخصوص شرعی انداز ہے، حضرت نے اسے کھولتے ہوئے کہا ہے کہ جب عالم کے یہ جزئیاتی تغیرات طبعی اور سائنٹفک ہیں جو سائنس کا دعویٰ ہے تو عالم کا کلی تغیر یعنی مجموعۂ عالم کی موت بھی طبعی ہے جسے قیامت کہتے ہیں پس قیامت کو عقلی دلائل سے الگ ثابت کیا ہے جو فلسفہ کا موضوع ہے اور طبعی اور مادی شواہد سے الگ نمایاں کردیا ہے جو سائنس کا موضوع ہے۔

اس طرزِ استدلال سے جہاں تکوین وتشریع کے مسائل طبعی انداز میں ثابت ہوتے ہیں وہیں ان حقائق اور دقائق سے قرآن حکیم کا معجزہ ہونا بھی نمایاں ہوتا ہے کہ خدا ہی کے کلام میں ایسی گہرائیاں ہوسکتی ہیں اور ظاہر ہے کہ اس سے بلاشبہ مؤمن کا قرآن حکیم پر ایمان نہ صرف تازہ بتازہ بل کہ علی وجہ البصیرت ہو جاتا ہے جو مقصودِ اصلی ہے، اور ان عقلی اور طبعی حقائق کے کھولنے سے ہی ممکن ہے۔

اس سے واضح ہے کہ قرآنی حقائق جب اس عقلی اور طبعی انداز سے سامنے آئیں اور جب کہ وہ کسی دور میں بھی خلافِ واقعہ نہیں ثابت ہوں گے اور نہ ہوسکتے ہیں، تو یہ محض اعجازِ قرآن ہی کی بین دلیل نہ ہوگی بلکہ اس پر لائے ہوئے ایمان کی مضبوطی کی بھی ایک مستقل حجت ہوگی جو حقائق بیانی کا ایک زبردست اور

عظیم مفاد ہے کہ ایمان علی وجہ البصیرۃ ہو جائے جو حقیقتاً ایمان کے تحقیقی ہو جانے کی صورت ہے، اب اگر یہی حقائق اغیار کے سامنے آجائیں تو عقلاً کوئی وجہ نہیں رہتی کہ وہ ایمان لانے کی طرف نہ جھکیں البتہ تعصب وعناد دوسری بات ہے جو زیر بحث نہیں ہے۔

بہر حال حکمتِ قاسمیہ میں بیک وقت عقلی اور طبعی دلائل ساتھ ساتھ چلتے ہیں تاکہ ایک طرف اگر دینی مقاصد کا اثبات فطری طور پر عقلی رنگ میں ہو تو دوسری طرف ان کا ثبوت حسی اور مشاہداتی طور پر طبعی رنگ میں بھی ہو اور اس طرح آپ نے دین کے اثبات میں نظریاتی اور حسیاتی دونوں طریقے اختیار فرمائے ہیں، بالفاظِ دیگر مبادیٔ فلسفہ اور مبادیٔ سائنس دونوں ہی سے خدمت لی ہے تاکہ ایک طرف تفلسف مزاج لوگوں کے شبہات اور اشکالات فلسفیانہ انداز سے حل ہوں اور دوسری طرف مادہ پرستوں کے سائنسی شکوک وشبہات حسیاتی انداز سے مرتفع ہوں کہ اس کے بغیر اس دور کے مادہ پرستوں اور عقل پرستوں کی اصلاح کا دوسرا راستہ نہیں تھا، اس لیے بے جھجک کہا جا سکتا ہے کہ اس قرن کے یہ عرفاء اور حکماء اور بالخصوص حضرتِ والا اس دور کے مجدد تھے جنھوں نے اپنے اپنے وقت پر اپنے اپنے دائروں میں وقت کے تقاضوں کے مطابق تجدید دین اور اصلاح امت کے فرائض انجام دیئے۔'' (۷)

حجۃ الاسلامؒ کی تحریریں زیادہ تر اردو میں ہیں اور اس دور کی اردو میں آج کی بہ نسبت یقیناً فرق ہے، خواہ اس طرح کہ زیادہ شگفتہ اور بلیغ نہیں ہوتی تھی یا اس معنی کر کہ ترقی یافتہ اردو کی طرح بامحاورہ سلیس نہیں تھی، مگر حکیم الاسلامؒ کے بیان کے مطابق حضرت نانوتویؒ کی تحریروں میں جو اردو استعمال ہوئی ہے وہ انتہائی فصیح وبلیغ اور معیاری ادب کا نمونہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم اور غیر مسلم سبھی حضرت نانوتویؒ کے بیانات اور استدلالات کو نہ صرف سمجھتے تھے بلکہ ان پر دادِ تحسین بھی دیتے تھے، اس سلسلہ میں حکیم الاسلامؒ کا یہ بیان ملاحظہ فرمائیے:

''اس پر بیان کی بلاغت وفصاحت کا یہ عالم ہے کہ آج سے سو برس پہلے کی اردو کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے حضرتِ والا کے حکیمانہ بیانات کی اردو آج سو برس بعد کی اردو سے دور نہیں محسوس ہوتی، محاورات کا فرق جداگانہ چیز ہے جو حسب تقاضائے وقت بدلتے رہتے ہیں لیکن طرزِ ادا اور اسلوب بیان آج کے معیار ادب کے لحاظ سے بھی اونچے درجہ کی فصاحت اور بلاغت سے گرا ہوا نہیں جس سے آج کا ادیب بھی نہیں اکتا سکتا۔

مضمون کی بلندی اور حقائق کی گہرائیوں کی وجہ سے اگر کسی قلیل المناسبت یا کم استعداد کو ان عالی مضامین کے سمجھنے میں دشواری پیش آئے تو وہ بیان حکمت کا قصور نہیں ہے بل کہ ناظر ومستمع کی علمی استعداد کا قصور ہو سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس دور کے مسلم اور غیر مسلم ادباء اور اردو داں حضرات کے سامنے حکمت قاسمیہ کے ادیبانہ اور بلیغ بیانات نفسِ بیان وتقریر کے لحاظ سے بھی اک مثالی درجہ رکھتے تھے، جس کا اپنوں

اور پرایوں بل کہ دشمنوں کو بھی اعتراف تھا۔

چناں چہ مباحثۂ شاہ جہاں پور میں جو عیسائی پادری عیسائیت کے عمومی فروغ کے منصوبے لے کر شریک مباحثہ ہوئے، یا جو ہندو اپنے مذہب کی ترویج عام کے جذبات لے کر مجلسِ بحث میں حاضر تھے انھیں حضرتِ والا کے یہ اعجازی بیانات اور فلسفیانہ اور حکیمانہ تقریرات استدلال سن کر سکوتِ عجز کے ساتھ ان بیانات کی تاثیر و تصرف کا لوہا بھی ماننا پڑا، انقیاد وطاعت جداگانہ بات ہے جو توفیق الٰہی پر موقوف ہے۔

پادری اینک نے کہا جو مباحثہ شاہ جہاں پور میں شریک اجلاس تھے:

''کیا پوچھتے ہو، ہم کو بہت سے اس قسم کے جلسوں میں شامل ہونے کا اتفاق ہوا اور بہت سے علماء اسلام سے اتفاق گفتگو ہوا، پر نہ یہ تقریریں سنیں، نہ ایسا عالم دیکھا، ایک دبلا پتلا سا آدمی، میلے سے کپڑے، یہ بھی نہیں معلوم ہوتا تھا کہ یہ کچھ عالم ہیں، ہم جی میں کہتے تھے کہ یہ کیا بیان کریں گے؟ یہ تو ہم نہیں کہتے کہ وہ حق کہتے تھے (گو اس حق کا جواب دینے اور اپنا مفروضہ حق واضح کرنے سے عاجز بھی رہے جیسا کہ انھیں خود بھی دوسرے مواقع پر اس کا اعتراف کرنا پڑا) پر اگر تقریر پر ایمان لایا کرتے تو اس شخص کی تقریر پر ایمان لے آتے۔'' (۸)

اسی پادری اینک نے مباحثہ کے آغاز میں علماء اسلام کو پہلو تہی کا طعنہ دیا تھا، لیکن حضرتِ والا کی تقریر سن کر اس طعنہ کے خلاف رطب اللسان تھے۔

مولوی عبدالوہاب صاحب بریلوی نے حضرتِ والا سے عرض کیا کہ یہ پادری (اینک) بعد اختتام مباحثہ ملنے آیا تھا اور حضرت کی تقریروں کی تعریفیں کرتا تھا جیسا کہ میلۂ خداشناسی، ص ۴۰ پر یہ تفصیل مرقوم ہے۔

ماسٹر جوئل نے (جو شاہ جہاں پور کالج میں مدرس (پروفیسر) تھے کہا:

''مسلمانوں میں ایک ہی عالم دیکھا۔'' (۹)

ایک اور پادری سے سید ظہور الدین صاحب شاہ جہاں پوری نے پوچھا، تم اس دن (یومِ مباحثہ) میں کچھ نہ بولے، انھوں نے کہا کہ:

''ہم کیا کہتے، مولوی صاحب (حضرت نانوتویؒ) نے کوئی بات چھوڑ دی تھی جو ہم بولتے، ہمارے پادری نولس (جو یوم مباحثہ میں پادریوں کے سربراہ اور قائد تھے) ہی کو جواب نہ آیا'' (۱۰)

جانکی داس جوگی نے (جو اس مباحثہ میں شریکِ جلسہ تھا) خود حضرتِ والا سے کہا:

''جب تم نے بولی ماری (تقریر کی) تو ہم نے دیکھا کہ اس کا (پادری نولس کا) اتنا شریر (جسم) سوکھ گیا تھا (یعنی روح ہوا ہوگئی تھی)'' (۱۱)

اسی طرح دوسرے ہندوؤں کے مقولے بھی اس کتاب میں اسی قسم کے نقل کیے گئے ہیں، کہا گیا کہ:

''جب میلہ برخاست ہونے لگا اور سب اہلِ اسلام وہاں سے روانہ ہوئے تو میلہ کے ہندو وغیرہ (ان) مناظرانِ اسلام (میں سے حضرتِ والا) کی طرف اشارہ کرکے اوروں کو بتلاتے تھے کہ یہ ہیں یعنی یہ (حضرت والا) ہیں جنھوں نے پادریوں کو عاجز کیا اور شکست دی''۔(۱۲)

جانکی داس جوگی نے کہا:

''جے ہی مولی (یہی حضرت والا) ہیں جنھوں نے آج سب سے اپنا لوہا منوالیا''۔(۱۳)

ختم مباحثہ پر حضرت والا نولس کے خیمہ میں خود ملنے تشریف لے گئے اور نصائح فرمائیں، فرمایا کہ دینِ عیسوی سے توبہ کیجیے اور دینِ محمدی اختیار کیجیے، دنیا چند روزہ، عذاب آخرت بہت سخت ہے، پادری صاحب نے کہا بے شک اور چپ ہو رہے اور آخر میں پادری نولس نے کہا کہ:

''میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے میرے حق میں اتنی فکر کی اور میں آپ کی اس بات کو یاد رکھوں گا''۔(۱۴)

بہرحال حضرتِ والا کی صداقت، کمال لیاقت اور بیان کی بلاغت غیر مسلموں پر بھی اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہتی تھی، حکیمانہ دلائل اور فلسفیانہ براہین جداگانہ چیز ہے، یہی تقریر و بیان کے تأثرات تھے کہ اگر یہ سننے والے غیر مسلم اگر اسلام نہیں بھی قبول کرتے تھے تو معترفِ حق ضرور ہو جاتے تھے اور اس طرح ان پر خدا کی حجت قائم ہو جاتی تھی۔

یہ تو اغیار کا قصہ ہے جو عرض کیا گیا، لیکن خود مسلمان کہلانے والے ایسے فضلاء بھی جن کی آنکھوں کو فلسفۂ جدید اور سائنس نے خیرہ کر دیا تھا، وہ بھی جب یہ بیانات سنتے تھے یا آج علماء دیوبند سے ان کی ترجمانی کو سنتے ہیں تو وہ نہ صرف مرعوب ہی ہوتے ہیں بل کہ ان کے خیالات کی دنیا میں انقلاب بپا ہو جاتا ہے اور وہ سوچ میں پڑ جاتے ہیں کہ ان دلائلِ قاہرہ کے بعد عقائد و افکارِ دین کے بارے میں آخر وہ کس طرح اپنے اس طبعیاتی یا سائنسی موقف کو قائم رکھیں؟ اور کیوں کر نہ اعترافِ حق کریں۔''(۱۵)

اس وضاحت کے بعد حکمت قاسمیہ کی خصوصیت کو خود اپنے تجربہ کی روشنی میں واضح فرماتے ہیں کہ:

''اس حقیر ناکارہ کو خود بھی بارہا اس کا تجربہ ہوا کہ اس قسم کی جس مجلس میں بھی قابل گریجویٹوں سے خطاب ہوا اور مناسبِ موقع حضرت والا کے علوم کی ترجمانی کی نوبت آئی تو بارہا یہی اعتراف و اقرار کا منظر دیکھنے میں آیا، اس سے ہم اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ آج کے دور کے انکار و الحاد اور دہریت و زندقہ کا قرار

واقعی استیصال یا دفاع اگر ممکن ہے تو اسی حکمت قاسمیہ کی علمی روشنی سے ممکن ہے جو آج کے فلسفۂ وسائنس کے مسلمات اور نئے نئے انکشافات ہی کے اصول سامنے لاکر اسلام کی صداقت کا لوہا منوا سکتی ہے اور جس میں حقیقی طور پر اتمامِ حجت کی شان موجود ہے۔'' (۱۶)

آگے نہایت وضاحت کے ساتھ چند ہی سطروں میں حکمت قاسمیہ کی خصوصیات اور امتیازات پر روشنی ڈالتے ہیں:

''یہ حکمت گو اپنی معقولیت اور شیوہ بیانی کے لحاظ سے واضح سلیس اور دلوں میں اتر جانے والی حقیقت ہے اور اس کی تاثیرات وتصرفات گو آفتاب سے زیادہ روشن اور اغیار اور اغیار نما اپنوں تک پر اثر انداز ثابت ہوئی لیکن پھر بھی مضامین کی دقت اور مستفیدین کی استعدادوں کی قلت کو اور زیادہ بڑھا دیا ہو کچھ علمی حلقے اس سے دہشت زدہ نظر آتے ہیں، بل کہ ان بلند پایہ اور گہری حقائق کی نسبت سے بعض قلیل المناسبت علماء بھی اس سے بھاگتے ہوئے محسوس ہوئے لیکن حکمت بہر حال حکمت ہے اور مسائل کی نسبت سے گو دلائل مشکل بھی ہوتے ہیں بالخصوص جب کہ وہ فلسفیانہ اور گہرے حقائق پر مشتمل ہوں لیکن سطح پسند لوگوں کی وحشت سے اہلِ فہم نہ کبھی متاثر ہوئے نہ ہوں گے اور نہ ہی ان کی طلب حکمت کی دوڑ کسی دور میں بھی ختم ہوگی، کلام کی دقت یا رفعت کا تقاضہ اسے حل کرنا ہے نہ کہ اس سے بھاگنا۔ دنیا جانتی ہے کہ اس دقت کے باوجود اس سے کامیاب ہونے والے کامیاب ہوئے اور انھوں نے ہزاروں کو کامیابی کی منزل تک پہونچایا۔'' (۱۷)

جیسا کہ ابتدائی سطور میں عرض کیا گیا کہ دیو بندی مکتبۂ فکر کا امتیاز یہی حکمت قاسمیہ ہے، اکابر دیو بند نے اسی سے کام لے کر کتاب وسنت کی تفہیم وتشریح کا کام لیا ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت حکیم الاسلامؒ فرماتے ہیں:

''جماعتِ دار العلوم اور علماء میں ہزاروں ہزار نکلیں گے جنھوں نے اس حکمت سے سبق لیا لیکن خصوصیت سے جن حضرات کو اس حکمت سے خاص مناسبت اور گرویدگی تھی ان میں پہلے طبقہ میں حضرت اقدس مرشدی ومرشد عالم شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ ہیں جن کے درسِ حدیث کا طغرائے امتیاز ہی یہ علومِ قاسمیہ تھے، آپ اس حکمت کا ایک نہایت گہرا ظرف اور اس کے اولین ترجمان تھے، انھیں ان علوم ومعارف کے لحاظ سے قاسمِ ثانی کہا جانا ایک واقعی حقیقت ہے، حسبِ روایت حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ آپ نے حضرتِ والا کی بعض ادق کتابیں جیسے آبِ حیات وغیرہ حضرت والا سے درساً درساً پڑھی تھیں، اس لیے ان بدیہیات قاسمیہ کی جو ترجمانی آپ فرما سکتے تھے وہ اوروں سے ممکن نہ تھی، دوسرے ترجمانِ حکمت اس طبقہ کے ایک فرد کامل حضرت اقدس مولانا سید احمد حسن امروہی رحمہ اللہ تھے جن کی درسی

اور غیر درسی تقریریں اسی حکمت سے مملو ہوتی تھیں، پھر اسی طبقہ میں تیسرے ترجمان میرے والد ماجد فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے جنھیں اس حکمت کے مضامین پر اس درجہ عبور حاصل تھا کہ وہ حضرتِ والا کی کتب کے صفحہ اور سطر تک کے حوالہ سے یہ مضامین ارشاد فرمایا کرتے تھے، جلالین شریف، مشکوٰۃ شریف اور مسلم شریف میں جو آخر میں ان کے درس کی خاص کتابیں تھیں اکثر و بیشتر موقعہ بموقعہ ان علوم کی ترجمانی فرماتے رہتے تھے، راقم الحروف کو جو تھوڑی بہت مناسبت حکمتِ قاسمیہ سے پیدا ہوئی وہ انھیں کے درس کا طفیل ہے جب کہ مشکوٰۃ و مسلم احقر نے انہی سے پڑھی ہیں اور ان میں حضرت مرحوم آیات و احادیث کے مضامین کے اثبات میں اسی حکمت کے اجزاء سے کام لیتے تھے جس کا اثر شرح صدر کی صورت سے سینوں پر پڑتا تھا، ان کے بعد دوسرے طبقہ میں حضرت علامہ مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ چوتھے ترجمان تھے جنھیں اس حکمت پر پورا عبور حاصل تھا اور انھوں نے یہ علم اول کے دو بزرگوں کے درس سے حاصل کر کے اپنے دل کی گہرائیوں تک پہونچایا اور پھر تصانیفِ قاسمیہ کا گہرا مطالعہ فرمایا، ان کا مقولہ تھا کہ جس کے سننے والوں میں یہ حقیر راقم الحروف بھی شامل ہے کہ اگر میری نظر ان کتابوں پر نہ ہوتی تو نہ معلوم میں اعتزال کے کس گڈھے میں پڑا ہوا ہوتا، حضرت ممدوح کے درسِ حدیث و تفسیر کا طغرائے امتیاز یہی علومِ قاسمیہ تھے جنھیں وہ احادیث کے سلسلہ سے درسی تقریروں، نیز اپنے مواعظ و خطبات میں بیان فرمایا کرتے تھے اور یہی ان کی تقریروں میں جاذبیت کا اِک بنیادی سبب تھا، آپ نے اپنی شرح مسلم فتح الملہم میں بالخصوص کتاب الایمان میں اپنی تقریراتِ استدلال کو انہی علوم سے آراستہ کیا اور ان علوم کو خاص طور پر اس کتاب میں سمویا ہے اور جگہ جگہ حضرتِ والا کے حوالے دیئے ہیں۔

آخر میں حضرت الاستاذ الاکبر حضرت علامہ انور شاہ قدس سرہ سابق صدر المدرسین دار العلوم دیوبند بھی اس حکمت کی طرف متوجہ ہوئے اور ان حقائق کی ترجمانی شروع فرمائی، حتیٰ کہ آپ نے طلبہ کی ایک مخصوص جماعت کو خارج اوقات میں شفاء شروع کرائی جس میں یہ ناکارہ بھی شامل تھا، اس میں جگہ جگہ کلامی مسائل کے ضمن میں حضرتِ والا کی تقریریں نقل فرماتے تھے اور انہی کے اصول سے فلاسفہ کا رد بھی کرتے جاتے تھے، اسی دوران میں حضرت ممدوح نے ایک کلامی قصیدہ بنام حزب الخاتم فی حدوث العالم بھی موزوں فرمایا جس کے حاشیہ میں جا بجا حضرتِ والا کی تصانیف کے حوالوں سے حضرت کے یہ کلامی علوم نقل فرمائے ہیں۔

اس طبقہ ثانی میں خصوصیت سے حضرت علامہ مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ نے تو حکمتِ ولی اللہی اور حکمتِ قاسمی کو اپنا موضوع زندگی ٹھہرا لیا تھا، ان کا نظریہ یہ تھا کہ شاہ ولی اللہ کی کتابوں کا کما حقہ فہم اور شعور

تصانیفِ قاسمیہ کے مطالعہ کے بغیر میسر ہی نہیں آ سکتا اور اسی بناء پر انھوں نے لاہور میں محمد قاسم ولی اللہ سوسائٹی کی بنیاد ڈالی جس کے ذریعہ انھوں نے ان علوم کی اشاعت وترویج میں پوری ہمت صرف فرمادی، مولانا ممدوح نے احقر کی عرضداشت پر دارالعلوم میں اس ناکارہ کو حجۃ اللہ البالغہ بھی پڑھانی شروع کی اور مختلف اوقات میں احقر کے سوالات پر حکمتِ قاسمی اور حکمت ولی اللہی کے اصول وحقائق تشریح کے ساتھ نقل فرماتے تھے۔

حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی دارالعلوم میں پہونچ کر اپنے اوائل ایام میں حضرت والا کی تصانیف میں سے تقریر دلپذیر کا درس شروع کرایا تھا لیکن سیاسی مشاغل کے غلبہ کے سبب وہ نبھ نہیں سکا اور چند ہی اسباق کے بعد ختم ہوگیا، آج دارالعلوم کے قدیم اساتذہ میں استاذ الاساتذہ حضرت علامہ مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاویؒ اس حکمت کے امین ہیں جو حکمتِ قاسمیہ پر کافی نظر رکھتے ہیں اور درسِ حدیث میں موقعہ بموقعہ ان علوم کو طلبہ کے ذہنوں تک پہونچاتے رہتے ہیں جس سے دارالعلوم کے علمی حلقہ میں اک حد تک یہ ذوق موجود ہے۔'' (۱۸)

بے شک حکمتِ قاسمیہ ایک تفہیمی اسلوب اور تشریحی منہج ہے، مگر اعتقادیات میں عام اسالیب اور مناہج سے کئی پہلوؤں میں یکسر مختلف ہے اور خالص علمی اور فکری ہے، جس کو سمجھنے اور برتنے کے لئے ایک خاص علمی مذاق مطلوب اور فکری صلاحیت درکار ہے۔ چنانچہ حکیم الاسلامؒ فرماتے ہیں کہ:

''حاصل یہ ہے کہ حکمتِ قاسمیہ کتنی ہی دقیق سہی مگر آج کے دورِ الحاد کے گہرے شبہات کا علمی حل بھی اس کے سوا دوسرا نہیں اس لیے اس کے دقیق ہونے کا ثمرہ یہ نہیں ہوسکتا کہ ان جواہر ریزوں سے روگردانی یا بے توجہی برتی جائے ورنہ یہ ذکر کردہ طبقہ جو اس حکمت کا حامل تھا پیدا ہی نہ ہوتا، بل کہ یہ ہے کہ ان غامض اور نادر علوم سے آج کے دور کی سطحیت اور سطح پسندی کا علاج کیا جائے جس کی وجہ سے ذہن اس غامض حکمت سے بعید ہوتے چلے جارہے ہیں۔'' (۱۹)

دین کی تفہیم وتشریح کے لئے حجۃ الاسلام حضرت نانوتویؒ جیسا حکیمانہ اسلوب اپنانے کی ضرورت کیوں ہے؟ اور کیا یہ کوئی نئی چیز ہے کہ جس کی علمائے متقدمین میں کوئی نظیر نہیں ملتی؟ اس سلسلہ میں حکیم الاسلامؒ وضاحت فرماتے ہیں:

''پس جس طرح علماء حق نے نقل وروایت کے میدان میں وضاعین حدیث تلبیس کنندگانِ روایات کی روایتی دسیسہ کاریوں کے پردے چاک کرکے رکھ دیئے تھے، اسی طرح اس درایتی میدان میں ان مدعیانِ عقل کی معنوی تحریفات جاہلانہ تاویلات اور دروغ بازیوں کی قلعی بھی کھول کر رکھ دی اور ان ناساز

عقلوں کے وہمیات کو عقل مصفا کی حقیقی روشنی سے شکست دی جس سے ایک طرف اگر یہ تخریبی جماعتیں تھک کر مایوس ہوگئیں تو دوسری طرف عقائد و مسائل کے ان حکیمانہ عقلی دلائل سے ایمان والوں کے ایمانوں کی بصیرت میں ترقی اور اضافہ ہوتا گیا لیکن فتنۂ شبہات کی جڑیں بہرحال قائم ہوچکی تھیں جو قائم رہیں، مختلف فرقوں اور پارٹیوں کی زیر سرپرستی ان فتنوں نے اصلیت کی صورت پیدا کرلی اور یہ مختلف مکاتیب خیال نئے روپ کے مکاتب و مدارس میں مستقلاً زیرِ بحث لائے جانے لگے، اس لیے فلسفہ مزاج پارٹیوں نے یہ سوچ کر کہ اب وہ اہلِ حق کے مقابلہ میں کون سا حربہ استعمال کریں خالص اصولی عقائد کا میدان چھوڑ کر اسلام کے عمومی مسائل میں ان فتنوں کا گدلا پانی پھیلانا شروع کردیا یعنی عام دینی مسائل میں اس عقلی تگ وتاز سے انکار وتشکیک کے فتنہ کا آغاز ہوگیا، تاکہ اہلِ حق کو نفسِ دین ہی سے بدظن بنادیا جائے اور وہ بالآخران ہی نوخیز پارٹیوں کے دامن میں پناہ لینے پر مجبور ہوجائیں تو اربابِ حکمت ومعرفت اور مفکر قسم کے اربابِ فضل وکمال آگے آئے اور انھوں نے اسلام کے تمام امہات مسائل پر حکیمانہ اسلوب اور عاقلانہ انداز سے کلام کیا، عام اسلامی مسائل کے اسرار ونکات پر عقلی دلائل سے بحث کی اور مسائل کی حقیقت کھول کر فلسفہ کا تاروپود بکھیر دیا۔ امام رازیؒ، امام غزالیؒ، امام خطابیؒ، ملک العلماء شیخ عزالدین ابن عبدالسلامؒ اور ابن عربیؒ جیسے عرفاء اور دانشورانِ حکمتِ دین کھڑے ہوئے اور انھوں نے دین کی حقائق و مصالح کو عقلی براہین سے پیش کرکے نہ صرف دین کی حدود ہی کو مضبوط کیا اور نہ صرف دین کے ہزار ہا مخفی اسرار اور مستور گوشے ہی اپنی دوربین عقلوں سے کھول کر دنیا کے سامنے رکھ دیئے، بل کہ عقلی مباحث کے لیے مستقل بنیادیں ہموار کردیں، امام رازیؒ نے اپنی مستقل تفسیر کا موضوع ہی تفسیر بالدرایۃ اور تفسیر بالمعقول رکھا اور قرآنی آیات کے عقلی پہلوؤں کو واشگاف کرنا قرار دیا، امام غزالیؒ نے تہافت الفلاسفہ لکھ کر اصولی طور پر سرے سے فلسفہ ہی کی بنیادوں کو کھوکھلا کرکے رکھ دیا جس سے شک اندازوں کے گروہ پر کاری ضرب پڑی اور اسے سوچ پیدا ہوئی کہ وہ اب اہل حق کے مقابلہ میں کون سا حربہ اختیار کرے، انھیں حیرانی تھی کہ امہات عقائد، مہمات مسائل، آیاتِ قرآن اور روایاتِ حدیث کے تمام دائروں میں تو عقل معاد عقل معاش کو شکستِ فاش دے چکی ہے تو آخر اب ان مایوسانِ عقل ودین کے بقاء کی کیا تدبیر ہے؟

اس لیے آخر کار انہوں نے امہات مسائل کا میدان چھوڑ کر فروعی مسائل میں اپنے وہم وشک کا گدلا پانی بہانا شروع کردیا جس سے مسائل فقہیہ میں انکار وتشکیک کے لیے فتنہ کا آغاز ہوگیا، مسائل فرعیہ کی غیر معقولیت، انفرادی استبداد یا ائمہ تفقہ کے فروعی اختلافات کے تخریب دین دکھلانے کے اتہامات سے

اسلامی فقہ کے بے اعتبار بنانے کی مہم شروع کر دی، تا کہ اہلِ حق اگر اصول سے نہیں ہٹے تو کم از کم اس حیلہ سے عملی فروعات ہی پر سے ہٹ جائیں، حتیٰ کہ فقہی مسالک کے اختلافات کو بصورتِ نزاعات اجاگر کر کے جدال وقتال کے فتنے کھڑے کیے تا کہ امت کمزور پڑ جائے اور اہل حق مغلوب ہو جائیں، بنیاد وہی ایک تھی کہ انھوں نے عقل کو نقل پر حاکم مان کر مسائل کا فیصلہ اپنی جزوی عقلوں کے تحت رکھا، تا کہ اگر اصول کو مضمحل کرنے میں وہ کامیاب نہیں ہوئے تو کم از کم فروعات فقہیہ ہی کو نا قابلِ التفات بنا دیں تا کہ اہلِ حق پر یہ الزام عائد کیا جا سکے کہ وہ خلافِ عقل اور خلافِ قیاس راہوں پر چل رہے ہیں اور ان کا پورا دین معاذ اللہ غیر معقول اور نا قابلِ قبول ہے لیکن انھیں اس کا پتہ نہیں تھا کہ اس پورے دین فطرت میں عقلِ کلی بطور روح کے دوڑی ہوئی ہے اور جیسے وہ بے ریب طریقہ پر نقلِ صحیح کے ساتھ دنیا میں آیا ہے، ایسے ہی عقلِ سلیم کی روشنی بھی ساتھ لے کر آیا ہے اور اس میں فہم وبصیرت اور عقل وفراست کے ایسے جوہر فرد موجود رہتے آرہے ہیں جو اس دین کی معقولیت سے نمائشی عقلوں اور فرضی دینوں کی قلعی کھول سکتے ہیں، چناں چہ فقہی مسائل پر زد پڑتے دیکھ کر ارباب فقہ آگے بڑھے اور انھوں نے فقہی فروعات اور استنباطی مسائل میں جہاں نقول کے مآخذ پیش کیے وہیں عقلی دلائل کو بھی ان کے دوش بدوش لا کر کھڑا کر دیا، ہدایہ اور بدائع الصنائع جیسی لطیف کتابیں معرض وجود میں آئیں جن میں ہر ہر فقہی مسئلہ کے لیے دلائل نقلیہ کے ساتھ دلائلِ عقلیہ کا عظیم ذخیرہ بھی فراہم کر دیا گیا جس سے فقہی فروعات اور استنباطی مسائل میں بھی نصوصِ فقہیہ کے ساتھ عقلی براہین کی تدوین کا آغاز ہو گیا اور بابِ دین میں علی الاطلاق نقول کے ساتھ عقلی استدلال کی راہیں ہموار ہو گئیں، حتیٰ کی رفتہ رفتہ دین میں عقلی مصالح اور اسرار دین نے ایک مستقل موضوع کی شکل اختیار کر لی، جس سے معاندین دین اور فرقِ باطلہ کا یہ خیال کلیۃً غلط ثابت ہو گیا کہ دین عقلی مصالح سے خالی یا عقلی استدلال سے عاری ہے، ساتھ ہی وہ اس سے بھی مایوس ہو گئے کہ محض اپنی عقلی وسوسہ اندازیوں سے وہ بابصیرت ایمان داروں کے ایمانوں پر کوئی ڈاکہ ڈال سکیں گے جس سے وہ تردد میں پڑ کر اپنے ایمانی موقف سے ہٹ جائیں، لیکن یہ تمام عقلی براہین ابھی تک اپنے اپنے مسائل کے ضمن میں منتشر تھے اور جس فن کا جو مسئلہ بھی مدعیانِ عقل کے یہاں ہدف بنا، اسی فن میں اربابِ فن نے اس مسئلہ کو دلائلِ عقلیہ کے ساتھ ثابت کرتے ہوئے مخالف اتہامات کو رد کر دیا جس سے یہ معقول دلائل مختلف فنون میں بذیل مسائل بکھرے ہوئے تھے اور اپنے اپنے متعلقہ مسائل کے سلسلہ سے مختلف فنون میں جمع ہوتے رہے، خود ان کا اپنا کوئی مستقل فن نہ تھا کہ اس میں اپنے اصول وقواعد کے ساتھ مرتب طریق پر جمع ہوں اور ایک منظّم فن کی صورت اختیار کر کے انضباط کے

ساتھ مدافعت یا حملہ کر سکیں، جس کی وجہ یہ تھی کہ وسوسہ اندازوں نے بھی وسوسہ اندازی کو کسی مستقل فن کی حیثیت نہیں دی تھی، وہ صرف اپنے مزعومات کے ضمن میں اپنے مفہوم کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے اہلِ حق کے مفہوم کو غیر معقول ثابت کرنے ہی پر اپنی ہمت صرف کرتے رہے جو مختلف فنون میں بذیل مسائل جمع ہوتے رہے اور انھوں نے اسرارِ دین یا حکمتِ اسلام کو کسی مستقل فن کی صورت میں لانے کی ضرورت محسوس نہیں کی، اس لیے اسرار دین موضوعِ دین تو بن گیا مگر فن نہیں بنا۔'' (۲۰)

مزید وضاحت فرماتے ہیں:

''آخر کار متأخر طبقہ میں حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہ کا ظہور ہوا جب کہ یورپ اپنے الحادی ہتھکنڈوں کے ساتھ ابھرنے کے مقام پر آ رہا تھا، ہندوستان کے لیل ونہار بدل رہے تھے، دینی لائنوں میں خود رائی اور عقل پرستی کی گھٹائیں دلوں پر چھا رہی تھیں اور وقت آ رہا تھا کہ یہ سیاہ بادل برس پڑیں اور دنیا کو سیلِ الحاد و دہریت میں بہالے جائیں تو آپ نے اپنی فراستِ باطنی سے ان مقدمات کو سامنے رکھ کر آخری نتیجہ سمجھ لیا اور دیکھا کہ فلسفیت کی داغ بیل پڑ چکی ہے، نہ صرف یہی کہ اس ملک کی دنیا دین کی استدلالی لائنوں میں نقلی دلائل پر قناعت کرنے کے لیے تیار نہیں بل کہ اسلام پر شکوک وشبہات کا وار کرنے کے لیے یہ عقلی سفسطے ایک مستقل فن کی صورت اختیار کرتے جا رہے ہیں جن کے آثار کم وبیش نمایاں بھی ہو چکے ہیں اس لیے انھوں نے اپنے قلب صافی کی مخفی آواز بلند کرتے ہوئے فرمایا کہ:

و إن الشريعة المصطفوية أشرقت في هذا الزمان على أن تبرز في قمص سابغة من البرهان. (۲۱)

اور شریعت مصطفوی اس زمانہ میں اس پر ابھر رہی ہے کہ وہ (عقلی) حجت و برہان کی مکمل اور مطابق بدن قمیصوں میں نمایاں ہو۔

آپ نے دیکھا کہ مسلمانوں میں ایک طبقہ معتزلہ کا خلف رشید بن کر سامنے آ رہا ہے جو وحی پر عقل کی حکمرانی کا قائل ہے اور نصوص شرعیہ کو عقل کی کسوٹی پر پرکھے بغیر ماننے کے لیے تیار نہیں اور نہ ان پر ایمان لانا ہی ضروری سمجھتا ہے بالخصوص دین کے ان غیبی حقائق پر جو عقول سے بالاتر اور مشاہدہ سے ماورا بھی ہیں اس لیے آپ نے اس فتنہ کے دفعیہ اور استیصال کے طریقوں پر غور کرتے ہوئے فرمایا:

ولا سبيل إلى دفع هذه المفسدة إلا بأن تبين المصالح و تؤسس لها القواعد كما فعل نحو من ذلك في مخاصمات اليهود والنصارىٰ والدهرية و أمثا لهم. (۲۲)

اور (اب) اس مفسدہ کے دفعیہ کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ دین کے (عقائد و اعمال) کی (عقلی) مصلحتیں بیان کی جائیں اور ان کے لیے (بطورفن کے) قواعد وضع کیے جائیں جیسا کہ یہود و نصاریٰ دہریت اور ان جیسے دوسرے فرقوں کے مقابلہ میں ایسا ہی کچھ کیا جا چکا ہے۔

اس لیے آپ نے دین کے سلسلہ میں عقلی دلائل و براہین کو ایک فن کی صورت سے مدون فرمایا، اس کے اصول و مقاصد وضع فرمائے اور اسے فن کی صورت دیتے ہوئے اس فن میں جلیل القدر کتاب ''حجۃ اللہ البالغۃ'' تصنیف فرمائی جس میں ابواب وفصول کے تحت فن اسرار کے قواعد وضوابط اور اصول وقوانین وضع فرما کر ہر باب میں اس کے مناسب عقلی دلائل و براہین کا ایک عظیم ذخیرہ مہیا فرمایا۔

اس مقدس کتاب نے حقیقت یہ ہے کہ بندگانِ عقل کی کمر توڑ دی اور ان کے لیے بندگانِ عقل بننے کے بجائے بندگانِ خدا بننے کا راستہ ایسے مؤثر انداز سے کھول دیا کہ یا وہ اس پر چلیں یا سکوتِ عجز کے ساتھ اپنے غم وغصہ کو دبائے بیٹھے رہیں اور ختم ہو جائیں، آپ نے فنی طور پر ابواب دین میں عقل ونقل کا صحیح مقام واضح فرماتے ہوئے ان دونوں کی باہمی نسبت اور حقیقی توازن کی صورت واضح فرمائی، آپ نے عقل سے کسی عقیدہ کا استفادہ کرنے کے بجائے اسے عقائد واحکام شرعیہ کے لیے مؤید مثبت اور دشمنانِ حق پر الزام قائم کرنے کا ایک وسیلہ قرار دیا جس سے نقل کی عظمت وحکومت اور عقل کی اس کے حق میں خدمت گاری پوری طرح واشگاف ہوگئی، انھوں نے مدعیان عقل کو یہ تاثر دیا کہ جو چیز ان کے یہاں خدائی کا درجہ رکھتی ہے یعنی عقل وہ ان کے یہاں بحق دین محض ایک خدمت گار اور چاکر کی حیثیت رکھتی ہے اور پھر اس کے تحت مسائل میں اس کے نمونے ظاہر فرمائے جس سے بہت سی جزوی عقلوں کو ندامت کے ساتھ پیچھے ہٹنا پڑا لیکن اس کے بعد تیرہویں صدی میں جب کہ یورپین قومیں ہندوستان میں برسرِ اقتدار آ گئیں اور اپنی ساتھ فلسفۂ جدید اور سائنس کی ترقیات لے کر نمایاں ہوئیں، مشینی دور کا آغاز ہوا، مشینری نے دنیا کے دل ودماغ پر قبضہ کر لیا، کھانا پینا، دینا، لینا، لباس اور وسائل معاش، سفر اور حضر، سواری اور مراکب، تجارت وزراعت صنعت وحرفت، جنگ وصلح حتی کہ مکانوں کی ہوا اور پانی، دوا اور غذا، آوازوں کا سننا اور سنانا، تقریر اور خطابت، غرض ساری زندگی اور وسائل زندگی مشینی لائنوں پر رواں دواں ہونے لگی، تار اور فون پر خبریں دوڑنے لگیں، ریل، موٹر اور اسٹیمر میں بحروبر کی مسافتیں طے ہونے لگیں، وسائل حیات فیکٹریوں اور ملوں میں ڈھلنے لگے، دور دراز کے انسان ٹیلی ویژن کے برقی پردوں پر نمایاں نظر آنے لگے، ہزارہا میل کی مسافت کے باوجود ایک ملک کے دوسرے ملک کے آمنے سامنے آ کھڑا ہوا۔'' (۲۳)

حکمت قاسمیہ کے عنوان سے اپنی گراں قدر تحریر کے آخر میں فرزندانِ دیوبند کو حکمتِ قاسمیہ کے

عصری اسلوب میں ڈھالنے اور اس کی ترویج و اشاعت کی جانب توجہ مبذول فرماتے ہوئے اپنی پوری گفتگو کا خلاصہ کچھ اس طرح فرماتے ہیں:

''آج اس کی ضرورت ہے کہ اس حکمت کو نہ صرف یہ کہ اچھے اسلوب سے مرتب اور منضبط کر کے محفوظ ہی کر دیا جائے، بل کہ ضروری حد تک تشریح و توضیح اور امکانی حد تک تسہیل و تیسیر سے اسے دنیا کے ذہنوں سے قریب کرنے کی بھی سعی کی جائے، تاکہ یہ دقت و غموض وغیرہ کے عذراتِ باردہ لوگوں کے لیے اس سے ترکِ استفادہ کا حیلہ نہ بن سکیں، پھر بھی اگر کوئی اس فطری دین سے اپنا یا دوسروں کا علاج نہ چاہے تو یہ اس کی قسمت کی بات ہوگی، قاسمی حکمت کی بات نہ ہوگی۔''(۲۴)

ضرورت ہے کہ اربابِ علم و فضل اور بالخصوص فرزندانِ دارالعلوم دیوبند ان جواہر ریزوں سے خود بھی فائدہ اٹھائیں اور اپنے اپنے حلقہ ہائے اثر میں ان نادر علوم کی اشاعت کریں کہ اس دور کے فلسفیانہ الحاد کا زہر اسی تریاق سے دفع ہو سکتا ہے۔

اس لیے ان علوم کی اشاعت نہ صرف ان کے لیے نافع ہی ہے بل کہ بتقاضائے وقت ان کا فریضہ بھی ہے کیوں کہ دارالعلوم دیوبند محض ایک درسگاہ ہی نہیں بل کہ ایک مستقل مکتبِ فکر بھی ہے اور وہ فکر یہی ہے جو ان سفینوں اور ساتھ ہی مستفیض سینوں میں متوارث طریق پر منتقل ہوتا چلا آرہا ہے۔''(۲۵)

حکیم الاسلامؒ نے حکمت قاسمیہ کی عصری اسلوب میں ترویج اور ان کے نادر علوم کی اشاعت کو طبقۂ دیوبند کا فریضہ قرار دیا ہے۔ دارالعلوم وقف دیوبند (جو عصرِ حاضر میں عالمی سطح پر حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے علوم و افکار کا امین اور حکیم الاسلامؒ کے خوابوں کی تعبیر ہے) نے اس ضرورت کو شدت سے محسوس کرتے ہوئے سالِ رواں حجۃ الاسلام اکیڈمی قائم کر کے حضرت نانوتویؒ کے علوم و افکار کی جدید اسلوب میں ترویج و تحقیق کا کام شروع کر دیا۔

چنانچہ حکیم الاسلامؒ کی یہ مفصل سوانح ''حیاتِ طیب'' کی اشاعت بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اس پیش رفت سے حکمتِ قاسمیہ کے بہت سے گوشے خود حضرت حکیم الاسلامؒ کے حالاتِ زندگی اور علوم و کمالات سے الم نشرح ہوں گے۔

حکمتِ قاسمیہ کیا ہے؟ اس کا تعارف و تعریف اور دلنشیں تشریح حکیم الاسلامؒ کی اس معرکۃ الآراء تحریر کی روشنی میں آپ کے سامنے آئی، جس سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حکیم الاسلامؒ کو اپنے جد امجد حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے علوم و افکار سے کیسی مناسبت اور حکمتِ قاسمیہ میں کتنی مہارت عطا کی تھی، آپ کی تحریرات، تصنیفات، خطبات میں نہ صرف اس کی مثالیں ملتی ہیں بلکہ سطر سطر سے

حکمتِ قاسمیہ مترشح ہوتی ہے اور پھر اتنے سہل اور سادہ انداز میں کہ بڑے سے بڑے علمی نکتہ کو ایک واجبی صلاحیت رکھنے والا بھی سمجھ سکتا ہے اور اس پر یہ شعر صادق آتا ہے ؎

شعر میرے ہیں سب خواص پسند ۔ پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

واللّٰہ الموفق و علیہ التکلان وھو نعم المولٰی و نعم النصیر

............❖............

(۱) حضرت مولانا محمد طیب قاسمیؒ، حکمت قاسمیہ، ص:۱۷
(۲) ایضاً، ص:۱۸
(۳) ایضاً، ص:۲۰
(۴) ایضاً
(۵) ایضاً، ص:۲۱
(۶) ایضاً، ص:۲۳
(۷) ایضاً، ص:۲۳ تا ۲۵
(۸) امام محمد قاسم النانوتویؒ، میلۂ خدا شناسی، ص:۴۰
(۹) ایضاً
(۱۰) ایضاً
(۱۱) ایضاً، ص:۳۹
(۱۲) ایضاً
(۱۳) ایضاً
(۱۴) ایضاً ۳۸ تا ۳۹
(۱۵) حضرت مولانا محمد طیب قاسمیؒ، حکمت قاسمیہ، ص:۲۸
(۱۶) ایضاً، ص:۲۹
(۱۷) ایضاً
(۱۸) ایضاً، ص:۳۰ تا ۳۳
(۱۹) ایضاً، ص:۳۳
(۲۰) ایضاً، ص:۱۱ تا ۱۴
(۲۱) حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ، حجۃ اللہ البالغہ، ص:۳۰
(۲۲) ایضاً، ص:۷
(۲۳) حضرت مولانا محمد طیب قاسمیؒ، حکمت قاسمیہ، ص:۱۵
(۲۴) ایضاً، ص:۲۷

............❖............

مقامات مقدسہ کا تجزیاتی مطالعہ

ڈاکٹر عبید اقبال عاصم
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

انجیر و زیتون کے اہم ترین ملک (شام) کا وہ حصہ جو موجودہ زمانے میں فلسطین کہلاتا ہے قبلۂ اول بیت المقدس ہونے کی وجہ سے یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کے لئے ہمیشہ اہمیت کا حامل رہا ہے۔ اسی طریقہ پر موجودہ مصر کا وہ علاقہ جسے طورِ سینا کہا جاتا ہے (جہاں حضرت موسیٰؑ کو اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہونے کا شرف حاصل رہا) انبیاء وارد ہوئے۔ ان انبیائے کرام کی بعثت کے پیش نظر مسلمانوں میں اہم ترین مقامات سمجھے گئے۔ بیت اللہ ہونے کے باعث مکہ مکرمہ مسلمانوں کا سب سے مقدس مقام ہے۔ ان تینوں ہی علاقوں سے مسلمانوں کو ہمیشہ جذباتی تعلق رہا ہے۔ قرآن مجید کی سورۂ تین کی ابتدائی آیات میں بہت خوبصورت پیرائے میں ان تینوں مقامات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مرحوم سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کا ۱۹۶۴ء میں ان تینوں مقامات کا اتفاقی سفر ہوا تو ان کے ذہن رساء نے سورۂ تین کی ابتدائی آیات کی تفسیر بڑے دل کش انداز میں تحریر کی اور یہ ثابت کیا کہ قرآن کی مقدس آیات اشارتاً دنیا کے تینوں مسلم ممالک کو اتحاد کا پیغام دے رہی ہے، اگر یہ تینوں ملک متحد ہو جائیں تو دنیا کا نقشہ تبدیل ہو سکتا ہے۔

اس وقت دنیا کی برسرِ اقتدار قوموں میں بیشتر قومیں اسلام کو اپنا ہدف مانتی ہیں۔ امن و سلامتی کے مذہب، اسلام کی تعلیمات سے انہیں للّٰہی بغض ہے۔ اس کی گہرائی میں جایا جائے تو اس کی وجہ عیسائیت و یہودیت کے اس بغض و عناد کو دیا جاسکتا ہے جو وہ اسلام سے ازل سے رکھتی ہیں۔ عیسائیت و یہودیت میں ہزار ہا اختلافات کے باوجود دونوں ہی قومیں اسلام کو اپنا مشترکہ دشمن قرار دیتی ہیں اور اسی پر اکتفا نہیں بلکہ

انہوں نے دوسری اسلام دشمن قوموں کو بھی اپنا ہم نوا بنا کر پوری دنیا میں اسلام کے خلاف محاذ تیار کرلیا اور ذرائع ابلاغ کی مدد سے پوری دنیا میں اسلام کو ہر ممکن طریقہ سے بدنام کرنے کی مہم چلائی۔ اسلام کے خلاف سازش کرنے والے یہود و نصاریٰ نے مسلمانوں کے شیزازہ کو منتشر کرنے کے لئے ان کے اتحاد و اتفاق کو پارہ پارہ کیا، اس کے لئے ہر جائز و ناجائز حربہ استعمال کرکے عرب کے تین اہم مرکز: مصر، شام و حجاز میں خلیج پیدا کی گئی۔ اس سے یہود و نصاریٰ تو اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئے لیکن دنیا بدامنی کا شکار ہوگئی۔ حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب مرحوم نے اپنی مایہ ناز تصنیف ''مقاماتِ مقدسہ اور اسلام کا اجتماعی نظام'' میں اپنے ان محسوسات و مشاہدات و تجربات کو قرآن و حدیث کے حوالوں سے بیان کیا ہے جو شہرِ امن (مکہ مکرمہ) اور علاماتِ امن، مسجدِ اقصیٰ (شام) و کوہِ طور (مصر) کے اتحاد کی صورت میں دنیا کو پائیدار امن اور مستحکم سکون فراہم کرنے کی بنیاد بن سکتا ہے۔

اس کتاب کا تجزیاتی مطالعہ قارئین کو معلومات بہم پہنچانے کی غرض سے پیش کیا جارہا ہے۔

نمونۂ اسلاف حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ (متوفی ۶؍شوال ۱۴۰۳ھ، ۱۷؍جولائی ۱۹۸۳ء) گذشتہ صدی کی ان عبقری شخصیات میں سے تھے جنہوں نے اپنی خطابت و صحافت، دلنشیں تحریر، دل پذیر تقریر، انتظامی صلاحیتوں اور خداداد ذہانت و فطانت سے اپنے اکابرین کو بھی متاثر کیا اور اپنے معاصرین کو بھی۔ ان کی ضعیف العمری کے چشم دید مشاہدین کے لئے یہ بات بے انتہا قابل فخر ہے کہ انہوں نے ایسی مقدس ہستی کو چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے، ہنستے بولتے دیکھا جس میں اتباعِ سنت رسولؐ کا جذبہ موجود ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے زمانے کے حالات کو سمجھنے، ان کا تجزیہ کرنے اور انہیں شریعت کے مطابق ڈھالنے کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود تھی۔ الحمد للہ راقم اور راقم کے معاصر دوست و احباب میں سے بیشتر ان خوش نصیبوں میں ہیں جنہوں نے حضرت کی زیارت بھی کی، انہیں قریب سے دیکھا، ان کے ساتھ سفر کی سعادت بھی نصیب ہوئی، ان کی مسحور کن تقریریں بھی سنیں، ان کی روحانی مجالس میں بیٹھنے کا موقع بھی ملا۔ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم کی حیثیت سے (جو ساٹھ سال سے زائد عرصہ تک ان کی ذات کا جزو بنا رہا) ان کے اہتمام و انتظام کے گونا گوں واقعات بھی دیکھنے و سننے کو ملے، غرض وہ زندگی کے مختلف میدانوں کے لائق و فائق شہسوار تھے، ان کی لیاقت و صلاحیت کا لوہا ان کے مخالفین و موافقین سبھی نے تسلیم کیا۔ انہوں نے اپنی تحریروں و تقریروں کے ذریعہ اپنی زندگی میں بلا تفریق مذہب و ملت و بلا تخصیص

مسلک سبھی کو شریعت کی راہ دکھلائی۔ ان کی وفات کے بعد ان کی تقریروں کے ٹیپ کانوں کو آشنا معلوم ہوتے ہیں تو ان کی تحریروں کے نمونے آنکھوں کو خوش نما لگتے ہیں اور یہ چیزیں دل ودماغ میں جاکر سرایت کرتی ہیں تب ان تقریروں وتحریروں کی اثر آفرینی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

حضرت حکیم الاسلامؒ کی تحریروں کی اصل کو جمع کیا جائے تو بلا مبالغہ وہ ان کے وزن سے کئی گنا زیادہ ہوں گے۔ ان کی جن کتب نے عالم گیر شہرت حاصل کی ان میں حضرتؒ کی زندگی کی آخری تصنیف ''مقاماتِ مقدسہ اور اسلام کا اجتماعی نظام'' کوکئی وجوہ سے سبقت حاصل ہے۔ اس اہم ترین علمی وعملی کتاب کو قرآن مجید کی سورہ تین کے نصف اول کی تفسیر بھی کہا جاسکتا ہے۔ اس مایہ ناز تصنیف کا داعیہ حضرت حکیم الاسلام کے دل میں ۱۹۶۴ء میں اس وقت آیا جب انہیں حکومت مصر کی دعوت پر ایک عالمی کانفرنس میں شرکت کا موقع ملا، دورانِ کانفرنس مصر کے مشہور مقامات بطور خاص وادئ سینا وطورِ سینا دیکھنے کا اتفاق ہوا، حسن اتفاق اسی سفر کے فوراً بعد شام کا سفر ہوا جس میں بیت المقدس کی زیارت اور وہاں نماز پڑھنے کے مواقع ملے اور واپسی میں عمرہ کی سعادت نصیب ہوئی تو بیت اللہ کی زیارت ہوئی۔ ایک سال میں تین مقدس مقامات کی زیارت نے حضرتؒ کے دل ودماغ پر اثر کیا اور انہوں نے اس موضوع پر قلم اٹھایا۔ کتاب کی وجہ تالیف مرحوم کے الفاظ میں اس طرح ہے:

> ''غرض سفر کا منظر، وادئ سینا کی گشت، طور سینین کا رہ گزر، مسجد اقصیٰ کی زیارت اور وہاں سے لوٹتے ہوئے بلد امین کی حاضری، اس موضوع پر قلم اٹھانے اور اس قلمسائی کی شگل سے اس کی گہرائیوں کے سامنے آجانے کا ذریعہ ثابت ہوئی۔''(۱)

بنیادی طور پر یہ موضوع قرآن مجید کی سورۂ تین کی ابتدائی آیات پر موقوف کیا ہے اس کے ضمن میں اہل کتاب بالخصوص مسلمانوں میں ان مقامات مقدسہ کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے ان میں بھی مرکزی نقطۂ نظر تین اسلامی ممالک یعنی مصر، شام وحجاز کے اتحاد وربط باہمی پر مرکوز کرتے ہوئے اسے وقت کی ایک اہم ضرورت قرار دیا گیا ہے۔ آپ کی نظر میں ان تینوں ممالک کا اتحاد ہی ملت اسلامیہ کے منتشر شیرازہ کو یکجا کر سکتا ہے۔ فرماتے ہیں:

> ''عالم اسلام کی اساسی وحدت اور عالمی تنظیم قطعی طور پر عرب ممالک اور ان میں بھی بالخصوص مصر وشام اور حجاز کے اتحاد اور ربط باہمی پر موقوف ہے کیوں کہ مسلمانوں کے حق میں اسلامی حیثیت سے عرب ہی ابتدا میں بھی امام تھا اور حسبِ روایات، مذہب عرب ہی آخری اور انتہائی دور

میں بھی امام ہوگا اور جب کہ امام ہی کی طہارت وعدالت اور ادائیگی فرائض و واجبات پر مقتدیوں کی طاعت وعبادت کی صحت موقوف ہے اس لئے جہاں پورے عالم اسلامی کا کلمہ متحد ہونے کی ضرورت ہے وہیں سب سے زیادہ ان ہی ممالک مصر و شام اور حجاز کی وحدت ناگزیر ہے کہ یہی تینوں ممالک مجموعی حیثیت سے امامت کے مقام پر ہیں۔‘‘

۱۹۶۴ء کے ممالک مذکورہ بالا کے سفر کے دوران جو منتشر خیالات صاحب کتاب کے ذہن میں آئے تھے وہ جب صفحۂ قرطاس پر پھیلے تو انہوں نے ایک وسیع کتاب کی شکل اختیار کر لی۔

’’مقاماتِ مقدسہ اور اسلام کا اجتماعی نظام‘‘ جس کا بنیادی محور قرآن مجید کی سورۂ تین کی اولین چار آیات ہیں۔ 23x36/16 کے 760 صفحات میں چھوٹے بڑے چار سو اکیس عنوانات پر مشتمل ہے جنہیں موضوعاتی اعتبار سے دس موضوعات پر تقسیم کیا جا سکتا ہے یہ بات بلا مبالغہ کہی جا سکتی ہے کہ اس گہرائی و گیرائی کو اگر کاغذی صفحوں پر تفصیل سے پھیلایا جائے تو اس کا حجم دو گنا تین گنا بلکہ اس سے بھی زائد ہو سکتا ہے۔ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ موضوعات عشرہ میں کئے جانے والے مباحث کو اولاً ذکر کر دیا جائے تا کہ کتاب کی افادیت و اہمیت واضح ہو سکے۔

پہلے موضوع کی بنیاد اس دعوے پر رکھی گئی ہے کہ ’’مقاماتِ مقدسہ ہی تقدس کی بنیاد اور اقوامِ عالم کا مولد و منشا ہیں۔ اس کے ضمن میں تقدس کے دلائل کی بنیاد حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی پیغمبرانہ علو شان کی مناسبت سے ہر سہ مقامات مقدسہ سے ان کے تعلق پر رکھی گئی ہے مثلاً آیت ’’اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا‘‘ پیش کرنے کے بعد اس سے مصنف مرحوم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ:

> ’’اس ملت میں عالمیت اور ہمہ گیری کی شان ابتداء ہی سے ودیعت کی گئی تھی جو دنیا کے سارے انسانوں اور ساری قوموں کے لئے پیغام تھی۔ اسی لئے حضرت ابرہیم علیہ السلام کو فرمانِ خداوندی میں امام الناس فرمایا گیا کہ ’’اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا‘‘ چنانچہ آپ کو عرب و عجم کی تمام اقوام اور تمام ملکوں کا امام مقرر فرما دیا گیا تا کہ دنیا اس ملت میں آپ کی مقتدی بنے اور زندگی کے تمام گوشے انہیں کی اقتداء میں حرکت کریں۔‘‘ (۲)

سورۂ تین میں مقامات مقدسہ کی قسم کھانے کی وجوہات، دنیا کی تین بڑی قومیں اور تینوں کے مراتب کو تفصیلی طور پر ذکر کرنے کے بعد مختلف آیات، ان کی مستند تفاسیر، احادیث صحیحہ اور کتب تواریخ سے استدلال کرتے ہوئے ان مقامات مقدسہ کے ماحول اور اس ماحول سے مرتب ہونے والے اثرات کا

خلاصہ صاحب کتاب نے اس طرح کیا ہے:

''خلاصہ یہ کہ قرآن نے تین مقامات مقدسہ مکہ، قدس اور طور سینا کی قسم کھا کر ان کی تقدیس بیان کی۔ پھر ان کے تقدس کے تین قریب و بعید ماحولوں کی نشان دہی کی جس سے ان میں آثار تقدیس نمایاں ہوئے۔ مکہ کا قریبی ماحول حرم محترم، قدس کا دروازہ فرسخ خطہ اور طور کا صحرائے سینا ہیں۔ پھر ان کے ماحول بعید کو واضح کیا کہ وہ حجاز، شام اور مصر ہیں جن میں ان کے مقدس آثار پھیلے اور دنیا کے لئے ان میں مرکزیت کی شان پیدا ہوئی یہاں تک کہ ان سے تین بڑی قوموں نے جنم لیا۔ اس لئے اگر شریعت اسلام حجاز، شام اور مصر کی مرکزیت پر زور دے تو یہ اس کا ایک تقاضہ ہوگا۔''(۳)

حضرت حکیم الاسلام علیہ الرحمہ نے ماحول کی کیفیت سے پیدا شدہ اثرات کو انسانی سعی و عمل پر منطبق کرنے کے بعد سعی و عمل کے دو میدان کی تفصیل خوب صورت پیرائے میں کرتے ہوئے انہیں ''دین اور ملک'' یا بالفاظ دیگر ''اخلاقیات اور سیاست'' سے تعبیر کیا ہے۔(۴)

پھر روحانیت کا سرچشمہ نبوت جس سے دین کا وجود ہوتا ہے اور ہادیت کا سرچشمہ سلطنت و اقتدار جس سے ملک اور تمدن قائم ہوتا ہے کو قرار دیتے ہوئے بنی اسرائیل کو حاصل شدہ ان دونوں نعمتوں کو قرآنی آیت ''وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْبِيَاءَ'' الیٰ آخرہ سے مستدل کیا ہے۔

اور پھر اسی پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ ان دونوں کی قرآنی اصطلاحات ''نعمت ملک'' کو ''تمکین فی الارض'' اور ''نعمت دین'' کو ''تمکین فی الدین'' یعنی دلوں میں دین کی جڑ پکڑ جانے کے اصطلاحی لقب ''استقامت فی القلب'' کی تعبیرات سے مزین کر کے ان کے لئے قرآنی آیات سورۂ حج آیت ۴۱، سورۂ نور آیت نمبر ۵۵، سورۂ حم السجدہ آیت نمبر ۱۳۰/ اور سورۂ شوریٰ آیت نمبر ۱۵ کے جزو ''وَاسْتَقِمْ كَمَا اُمِرْتَ'' جیسی آیات سے مدلل کرتے ہوئے یہ نتیجہ فراہم کیا ہے کہ:

''(ان آیات) سے صاف واضح ہے کہ بنی آدم کے لئے بنیادی طور پر نعمتیں دو ہی ہیں ''تمکین فی الارض'' یعنی زمین کی سلطنت اور ''تمکین فی الدین'' یعنی روحانی عظمت، قلوب کی دینی استقامت اور دلوں میں ایمان اور روحانیت کا رسوخ و استحکام، جس کا حاصل اصطلاحی الفاظ میں وہی استخلاف اور استقامت نکل آتا ہے۔''(۵)

اس کے بعد آپ نے امت مسلمہ پر عظیم انعام کی خبر کے لئے اخروی وحی ''اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ

دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ '' سے استشہاد کر کے جو نکتہ پیش کیا ہے وہ بہر طور قابل داد ہے۔ فرماتے ہیں کہ:

''اس آیت کریمہ میں دین کو کامل کر دینے اور نعمت کا تمام کر دینے کی اطلاع دی گئی ہے۔غور کیا جائے تو یہ وہی دین اور ملک کی دو نعمتوں کی تکمیل ہے اور ساتھ ہی مسلمانوں کو ان دونوں تکمیل شدہ نعمتوں کو عطا کر دیئے جانے کی اطلاع ہے کیوں کہ ''اکمال دین'' کے کلمہ سے تو نعمت دین کی تکمیل کھلے طور پر نمایاں کی گئی ہے اور ''اتمام نعمت'' کے کلمہ سے خصوصیت کے ساتھ تکمیل ملک کی نعمت کی طرف واضح اشارہ فرمادیا گیا ہے۔''(٦)

علاوہ ازیں اس موضوع کے اہم نکات میں بنی اسرائیل اور اہل اسلام کا فرق، عالمی دنیا کے تین بنیادی عناصر، ان عناصر کے تین مراکز، ان تینوں مقامات کے تقدیس کی تاریخی حقیقت، تینوں مقامات کی ظاہری و باطنی برکات، وضع کعبہ، وضع اقصیٰ و وضع طور وغیرہ کی بحثیں کی گئی ہیں جن کے بنیادی دلائل قرآن وحدیث اور تاریخی طور پر مستند اہم کتب سے فراہم کئے گئے ہیں۔

دوسرا موضوع ان مقامات مقدسہ کے مظاہر اور ظواہر نیز ان کی تشکیلات کے مراحل پر مشتمل ہے۔ اس کے ضمن میں ''مقاماتِ مقدسہ'' پر اصول فطرت کا نفاذ، مختلف آبی وارضی شکلوں میں صورتِ کعبہ کو بیان کرتے ہوئے کعبہ مقدسہ کی آبی شکل اس طرح ذکر فرمائی ہے:

''سب سے اول اس کا ظہور اس اتھاہ سمندر میں ہوا ہے جس کے اوپر عرش عظیم قائم ہے، چنانچہ آثار صحابہ سے یہ عقدہ حل ہو کر سامنے آتا ہے کہ کعبۂ مقدسہ کو بصورت جہت اولاً اس پانی میں نمایاں کیا گیا جس کی موجیں نصِ حدیث نبوی ﷺ کے مطابق آسمان و زمین کے برابر تھیں۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ کعبہ کی جہت متشخص ہو کر اولاً پانی میں ہی ظاہر ہوئی''(۷)

مزید فرماتے ہیں کہ:

''قدرتی بات ہے کہ پانی کی گہری جگہوں میں پانی بشدت ٹکراتا ہے جس کی ٹکروں سے موجیں اونچی اٹھتی ہیں اور پانی میں ابھار پیدا ہوتا ہے تو موضع بیت اللہ بھی اس گہرائی کی صورت سے نکل کر ابھار اور اونچائی کی شکل میں نمودار ہوا جو جھاگ کی صورت تھی اور اس اونچائی نے ایک قبّہ کی سی صورت اختیار کر لی۔ چنانچہ ابن عباسؓ کی روایت میں یہ الفاظ بھی موجود ہیں:

هو اول بیت ظهر علی الماء عند خلق السماء والارض خلقه قبل الارض بألفی عام و کان زبدة بیضاء قد حبت الارض من تحته.

یہ پہلا (عبادت کا) گھر ہے جو پانی پر ظاہر ہوا جب کہ زمین و آسمان پیدا ہونے والے تھے اسے اللہ نے زمین بنانے سے دو ہزار سال پہلے ظاہر فرمایا اور وہ پانی پر سفید مسکہ مکھن کی طرح جھاگ کی صورت سے ظاہر ہوا، اس کے نتیجے سے زمین بننی شروع ہوئی۔ (ص:۱۵۱) (بحوالہ تاریخ الکعبہ الشیخ باسلامہ مکی، ص:۱۱)

اس دعوے کی مزید پختگی نیز کعبہ کی آبی شکل کے ارضی شکل میں بدل جانے کی وضاحت اس طرح فرمائی ہے کہ:

> ''جب زمین بننے کا وقت آیا تو پانی کے اس جھاگ سے ابھرے ہوئے قبہ نما حصہ پر جو مقام بیت اللہ تھا، شدید ہوا چھوڑی گئی جس سے اس حصہ آب میں پانی کی موجیں اور بھی زیادہ شدت کے ساتھ ٹکرائیں اور پانی کے اس تصادم سے اور اس کے ٹکراؤ سے یہ جھاگ اور سخت ہوتے گئے۔ ان میں گاڑھا پن بڑھتا گیا اور انہوں نے پتھریلا پن اختیار کر لیا جیسا کہ عادتاً پانی کے ٹکراؤ سے سمندر میں جھاگ اٹھ اٹھ کر اور جم جم کر پتھریلی صورت اختیار کر لیتے ہیں جنہیں عرفاً بھی سمندر جھاگ ہی کہتے ہیں اور وہ پتھر ہی جیسے سخت ہو کر ٹھوس بن جاتے ہیں، اس طرح پانی کے اس حصۂ خاص میں انجماد پیدا ہوا اور زمین کی چھوٹی سی سطح نمودار ہوئی، جس سے زمین بننے کا آغاز ہوا۔'' (۸)

مصنف علیہ الرحمہ نے خلقت کعبہ کو زمین کی ابتدائی شکل نیز اس کی خلقت کو آسمانوں سے مقدم قرار دیتے ہوئے قرآنی دلائل سے ثابت کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے:

> ''غرض کعبۂ مقدسہ کی فضا کی وضع کا جو غیر جسمانی اور نادیدہ تھی اولاً پانی پر ظہور ہوا جو مختلف شکلیں اختیار کرتا رہا، پھر زمینی ظہور ہوا اور اس کے بھی مختلف اطوار ہوئے، بہر حال پانی کا یہ انجماد بالشت بھر سے بڑھتے بڑھتے اولاً اس لمبائی چوڑائی تک آیا جو بیت اللہ کا عمارتی رقبہ ہے اور رفتہ رفتہ پوری زمین کے رقبہ تک پہنچ کر ختم ہو گیا اور کرۂ زمین پر اپنی صورت سے نمایاں ہو گیا جس کی اصل کعبہ مقدسہ نکلی جس سے زمین کی خلقت کا آغاز ہوا اور کعبہ وسطِ زمین رہا۔'' (۹)

اس کے بعد آپ نے کعبہ کے علمی، حسی، آبی، سطحی، اساسی، حجری، تحدیدی، علامتی، ارضی و تعمیری وجود کو قرآن و حدیث سے ثابت کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ نے طہور اقصیٰ و طہور طور کو بھی ملحوظ رکھتے ہوئے اس پر بھی قرآن و احادیث مبارکہ سے دلائل فراہم کئے ہیں۔

تیسرے موضوع میں تینوں مقامات کی حقیقت میں تجلی کے فلسفیانہ نکات پیش کئے گئے ہیں۔ اسی ضمن میں تجلی کا مفہوم اس طرح پیش کیا ہے جس میں حقیقت کعبہ کے ادراک کے ساتھ ساتھ وحدت امت واسلامی اتحاد کا منشا بھی پورا ہو جاتا ہے اور مقصدِ عبادت بھی واضح ہو جاتا ہے، فرماتے ہیں کہ:

> ''عبادت کا مقصد قربِ معبود اور آخر کار دیدار معبود ہے پھر اسی کے ساتھ اس مرکز عبادت (کعبہ مقدسہ) سے سارے مراکز عبادت کو جوڑ کر اور سب کا رخ اسی طرح کر کے انسانوں میں وحدت واتحاد پیدا کرنا بھی مقصود ہے کہ سب کا رخ اجتماعی طور پر اسی کعبہ پاک کی طرف رہے کہ اس کے بغیر انسانوں میں یک جہتی، یک رخی، عالمی اتحاد اور عالمی امن وسکون کا قائم ہونا بھی ممکن نہ تھا۔ جسے آج کل کی اصطلاح میں بقائے باہم کا عنوان دیا گیا ہے شریعت نے اسی کا شرعی نام ''استقبالِ قبلہ'' رکھا ہے۔'' (۱۰)

تجلی کی دل چسپ تفصیلی بحث کا خلاصہ حکیم الاسلام علیہ الرحمہ نے درج ذیل الفاظ میں اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا ہے:

> ''خانۂ کعبہ میں خدا (کسی خاص شکل میں) تو نہیں مگر خدا کا جلوہ ضرور موجود ہے اور اس جلوہ نمائی یا عکس ریزی کا نام ہی شریعت کی زبان میں تجلی ہے۔ اس سے نمایاں ہو جاتا ہے کہ کعبہ کی حقیقت درحقیقت اس ملک قدوس کی تجلی ہے اور اس کا عکس پاک ہے جو اس فضائے خاص میں اترا ہوا ہے نہ کہ عین ذات اتری ہوئی ہے، جس سے عقل بھی منکر نہیں ہو سکتی۔ پس خانہ کعبہ میں خدا کے قیام کے معنی تجلی خداوندی کے قیام کے ہیں نہ کہ عین ذات کے قیام کے جس سے عقل نہ صرف یہ کہ انکار نہیں کرتی بلکہ اور اسے معقول کہتی ہے۔''

علاوہ ازیں اسی بحث میں آپ نے تجلی کا عرفانی، قرآنی، برہانی وعیانی ثبوت، عناصر اربعہ میں تجلیات کی کارفرمائی، تجلی خلقت، تجلی ہدایت کے ساتھ ساتھ تجلی کا وجدانی ثبوت، تجلیات کی رنگارنگی، عرش، کرسی، آسمان، زمین، لوح محفوظ، قمر، میزان، جنت، جہنم، یوم مزید، فلکی، انسانی، انبیائی، موسوی، عیسوی تجلیات، ساق، صورت، کوکھ وقدم کی تجلیات کے علاوہ نزول تجلی کی سورتیں اور ان کے نام جیسے وقوف ظہور، صدور، مرور، نور وغیرہ سے استدلال کر کے تینوں مقامات مقدسہ کی تجلیات خاصہ اور ان کی خصوصی نوعیتوں پر فلسفیانہ انداز سے تفصیلی کلام کیا ہے، جو بہر طور قابل ملاحظہ ہے۔

چوتھے موجوع میں تجلی کعبہ کے عقلی دلائل، اس کی جامعیت، صفات وجودی نیز اس کی دو شکلوں

انعامی وقہری پھران صفات کا اقتضاء بہ شکل حج بیت اللہ ونماز، قبلۂ حج وقبلۂ نماز، پھران عبادات کی کیفیات غلامانہ وعاشقانہ پھر عشق عاقلانہ وعشق والہانہ عاشقانہ کیفیت کا منتہا مسجود حقیقی ثابت کرنے کے بعد صفات جلالی وصفات جمالی کو بھی تفصیلی طور پر بیان کیا ہے اور پھران تمام مشمولات بحث سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ تجلی کعبہ ہی ایسی تجلی ہے جس سے ہر شرک کا علاج ہے۔ ملاحظہ ہو:

> ''اس (شرک) کے سدِّ باب کے لئے اسلام نے کعبۂ مقدسہ میں جامع شئون وجودی تجلی کا جلوہ بکھیر کر ہمہ نوع عبادتوں کا ایک ہی وحدانی مرکز اور نقطۂ توحید سامنے کر دیا ہے جس کے سامنے بیک دم شوق ورغبت، رعب وہیبت، ناز ونیاز اور خندہ وگریہ کی ساری کیفیات کی ملی جلی عبادات ادا کی جاتی ہے جو تخیل کی نہیں بلکہ حقیقی تجلی کی عبادت ہے جس کے بیت اللہ میں جلوہ گر ہونے کا عقل ودانش، فہم وفراست، فقہ ومعرفت، عقیدہ وجذبہ اور کشف وشہود کے ذریعہ یقین دلا کر قلوب کو مطمئن کر دیا گیا ہے جس میں نہ شرک ہے نہ تشتت، نہ پراگندگی ہے نہ تذبذب وتردد، اس لئے کعبۂ مقدسہ اور اس پر اتری ہوئی تجلی کی یہی جامعیت سب سے بڑی خصوصیت ہے جو زمان ومکان اور فضا وخلاء کے کسی مقام کو میسر نہیں اس لئے کعبۂ مقدسہ ہی صحیح معنی میں مرکز توحید اور مبدأ عبادت ہے۔''(۱۱)

پانچواں موضوع تجلی اقصیٰ کے ثبوت اور اس کی نوعیت کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں بھی قرآن وحدیث سے دلائل فراہم کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ قبلۂ اعزاز کا اول تجلی کا ہی مرہون منت ہے، اس کے ذیل میں اقصیٰ کا تقدس، اس کی نوعیت، تجلی کعبہ کا اقصیٰ پر ورود اور قدس وکعبہ میں ثواب کے فرق کو عقلی ونقلی دلائل سے مدلل کیا گیا ہے۔

چھٹے موضوع میں تجلی طور کا ثبوت اور اس کی نوعیت، شانِ جلالی وعظمت، تجلی طور کی دفاعی شان، شریعت موسوی کا قہری رنگ، دفاعی نوعیت کے آثار، اسلام کا مرکز دفاع، طور سینا کے ساتھ تینوں مقاماتِ مقدسہ کے نقطہ ہائے فیض کے فرق، حقیقت کے لحاظ سے ان کی تجلیات، باہمی تفاوت اور فرق مراتب میں موازنہ کرتے ہوئے کعبہ واقصیٰ کی طور پر فضیلت کے چودہ دلائل پیش کئے گئے ہیں جن کا خلاصہ درج ذیل ہے:

۱- کعبہ واقصیٰ کا قبلہ ہونے میں شریک رہنا۔
۲- کعبہ واقصیٰ کا وضعِ الٰہی ہونا۔
۳- کعبہ واقصیٰ دونوں کا عبادت گاہ ہونا۔

۴- دونوں کی بنیادوں کا ملائکہ علیہم السلام کے ذریعہ بھرا جانا۔

۵- دونوں کا سارے عالم کی عبادت گاہوں میں اولیت کا شرف رکھنا۔

۶- دونوں مقامات کا طوفانِ نوح میں ریت سے چھپ جانے کے بعد ملائکہ کی نشان دہی پر سطح زمین پر دوبارہ ابھرنا۔

۷- دونوں مقامات کے بانیوں کی نوعیت کا ایک ہونا، مثلاً خانہ کعبہ حضرت ابراہیم اوران کے بیٹے حضرت اسماعیل علیہما السلام کے ذریعہ اور مسجد اقصیٰ کو حضرت سلیمان اوران کے بیٹے حضرت داوٗد علیہما السلام کے ذریعہ بنایا جانا۔

۸- دونوں مقامات کی بنیاد پیغمبروں کی ذاتی رائے سے نہیں بلکہ امر خداوندی سے رکھا جانا۔

۹- کعبہ واقصیٰ کو ایک ہی انداز سے برکت وہدایت کا گھر بتایا جانا۔

۱۰- کعبہ واقصیٰ اوران کے شہروں کا اسلامی قلمرو میں ایک ہی انداز سے آنا۔

۱۱- دونوں مقامات کی فتح کے بعد دونوں کی تطہیر اور صفائی کے طریقہ میں یکسانیت۔

۱۲- دونوں مقامات کی تطہیر کے بعد دونوں مقدس گھروں کا جشن فتح میں یکساں ہونا۔

۱۳- کعبہ واقصیٰ کی حسی تعمیر کی تکمیل کے بعد حضرت ابراہیمؑ اور حضرت سلیمانؑ کا باذن اللہ دعائیں مانگنا اوران کی قبولیت۔

۱۴- کعبہ واقصیٰ دونوں کا معراجِ نبوی کی ابتدائی منزلیں بننا۔(۱۲)

الغرض مذکورہ بالا دلائل کی روشنی میں جہاں کعبہ واقصیٰ میں یکسانیت نظر آتی ہے وہیں یہ اس طرف بھی مشیر ہے کہ ان دونوں مقامات کو طور پر افضلیت حاصل ہے۔

ساتواں موضوع انسان میں فطرت اللہ کے آثار کے تعلق سے ہے، اس کے تعلقات میں حقیقت باری کے دلائل، فطرت کی یکسانیت، صورتِ انسانی کا صورتِ الٰہی سے عقلی رابطہ، مخلوق کے کلی اور نوعی نمونے، عقلِ کلی تجلی وشعوری، حیات کلی وتجلی الٰہی، موتِ کلی وتجلی المیت، صلہ رحمی وامانت جیسے انسان کے فطری اوصاف کو ذکر کرنے کے بعد ان سب کو اسی تجلی کو زمانی شکل میں دیکھا جائے تو ''یوم جمعہ'' کی صورت میں ہمارے سامنے ہے جو سید الایام ہے اور امت مسلمہ کا منتخبہ ہے۔ یوم جمعہ کو سید الامام اور اس میں رونما آثار تجلی کی زمانی کیفیات کو مصنف نے قدرے تفصیل سے بیان کیا ہے جس کا اختصار بایں طور ہے:

''یوم جمعہ کی شان بھی اسی کے تحت آتی ہے جسے قیامت کے دن ایک ممتاز نورانی اور چمک دار

صورت دی جائے گی اور وہ جمعہ کے پابند لوگوں کی شفاعت کرے گا۔ اس لئے اسے سیدالایام کہا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت حق تعالیٰ کے علم ازلی میں پہلے سے موجود تھی کیوں کہ امت مسلمہ سے ہزاروں سال پہلے اس کو معیار بنا کر حق تعالیٰ نے تین امتوں یہود، نصاریٰ اور امت مسلمہ کا امتحان لیا کہ وہ عبادت کے لئے یوم عید کی طرح ایک دن خود منتخب کریں جو ہمارے علم میں پہلے سے متعین ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ تم میں سے کون ہمارے انتخاب کردہ دن تک پہنچتا ہے اور اسے ہی یوم عبادت قرار دیتا ہے۔ یہود نے یوم سبت (شنبہ کا دن) منتخب کیا۔ نصاریٰ نے یوم الاحد (اتوار کا دن) منتخب کیا اور امت مسلمہ نے یوم جمعہ منتخب کیا جو حق تعالیٰ کا انتخاب فرمودہ دن تھا۔ جس سے امت مسلمہ اس انتخاب میں کامیاب ہوگئی اور اس کی رائے وحی الٰہی کے مطابق ہوگئی۔'' (۱۳)

اس موضوع کے دوسرے مباحث میں بطور خاص تجلی انسانیت تجلی کعبۂ مقدسہ تک اصل سے فرع کے رشتے کو لوازمات میں محبت وطن کو قدرتی مانتے ہوئے اس کا اس حصۂ زمین سے جذباتی و طبعی تعلق کا اظہار جو اس کا مولد ہے، حب الوطنی کی بنیاد ہے۔ اس صورت میں زمین کی کشش چوں کہ انسان کی فطرت میں داخل ہے اس لئے اس حصۂ زمین کی طرف جس میں کعبۂ مقدسہ قائم ہے انسان کا کھنچے چلے آنا اس کی فطرت کا حصہ ہے کیوں کہ وہ اس ساری زمینی مخلوق کی مادّی اصل ہے۔

خانۂ کعبہ کی دوسری امتیازی خصوصیات کے ساتھ ساتھ درج بالا امور پر بھی فقہی و شرعی اصولوں کی روشنی میں پیش کرنے کے بعد قارئین کی توجہ بطور خاص اس حقیقت پر مبذول کرائی ہے:

''خلاصہ یہ ہے کہ اس فضاء وخلاء میں سے کعبۂ مقدسہ کی فضاء خاص اور جہت مخصوصہ، اللہ نے خود ہی منتخب فرمائی اور پھر اس میں وضع خاص کو خود ہی کعبہ کا نام دیا، پر اس کی ساخت پرداخت کر کے خود ہی اس کی اطلاع فرمائی، پھر خود ہی اس پر اپنا جلوۂ تجلی اتارا اور اسے اپنے کمالات کی نمائش گاہ بنا کر خود ہی مخلوق کو اس کی خبر دی اور پھر خود ہی اس فضائے خاص پر بطور علامتی نشان کے عمارت کعبہ تعمیر کرنے کا ارادہ فرمایا۔ پھر تعمیر سے پہلے خود ہی اس کی بنیادیں اپنے ملائکہ سے بھروائیں، پھر آدم وابراہیم علیہما السلام کو انہیں بنیادوں پر تعمیر کا امر فرمایا کہ وہ نشان کعبہ تیار ہو جانے کا دنیا میں اعلان عام بھی کر دیں کہ لوگ اس میں حاضر ہو کر یا اس کی طرف رخ کر کے حج ونماز کے فرائض ادا کریں۔ غرض تعیین کعبہ، وضع کعبہ، صورت کعبہ، بنائے کعبہ اور حقیقت کعبہ میں سے کسی ایک چیز میں بھی انسانی اختراع یا ایجاد کا دخل نہیں رکھا۔'' (۱۴)

پیشِ نظر مضمون کے تعلق سے حضرت حکیم الاسلام علیہ الرحمہ کی علمی وفنی مہارت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ خلاصۂ بحث بذاتِ خود اتنے مباحث پر مشتمل ہے کہ اسے کتاب کا آٹھواں موضوع قرار دیا جائے تو بے جا نہیں ہوگا۔ اس موضوع میں تینوں مقامات مقدسہ میں ظاہر تجلیات کے مواقع ونزول کی تخصیص پر بحث کے علاوہ کعبۂ مقدسہ کو دنیا کا مرکز اور دنیا کو دائرہ کی شکل میں پیش کیا ہے۔ پھر دائرہ کی جو خصوصیات ہوتی ہیں وہ جس طرح وجود میں آتا ہے اس کے درج ذیل چھ دلائل پیش کرکے فی الحقیقت کعبۂ مقدسہ کو دنیا کا مرکز ثابت کیا ہے:

۱- دائرہ میں مرکز کا وجود سب سے پہلے ہونا۔

۲- مرکز کا دائرے کا وسطِ حقیقی ہونا۔

۳- مرکز کا دائرے کا اصل ہونا۔

۴- مرکز میں افادیت کا شان ہونا۔

۵- دائرے کی کسی بھی حرکت کا مرکز سے باہر ہونا۔

۶- فطری طور پر مرکز میں سکون ہونا۔ (۱۵)

مذکورہ بالا دلائل کی روشنی میں مصنف نے کعبۂ مقدسہ کی اولیت کے ساتھ ساتھ اس کو مرکز عالم، جمع کائنات، وسط عالم، مدار بناوفنا، زمینی مخلوقات کی اصل اور پھر مرجعیت کعبہ کو ثابت کیا ہے، اس سے بہ آسانی یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ کعبہ ہی قبلۂ عبادت ہوسکتا ہے اور بیت اللہ ہی عالمی قبلہ ہے۔

نواں موضوع کعبۂ مقدسہ کی افادیت پر مشتمل ہے۔ اس کے مشمولات میں کعبہ میں پایا جانے والا امن وسکون اور اس کے عقلی اصول فراہم کرکے اقصیٰ اور طور کو بھی وسطِ عالم میں شمار کیا ہے اور پھر ان تینوں مقامات کے حامل ممالک مصر، شام وحجاز کی جغرافیائی، تاریخی، تہذیبی، مذہبی وشرعی خصوصیات کی وضاحت کی گئی ہے۔

دسواں موضوع تینوں مراکز کی مرکزی نوعیتوں کے خلاصے اور مسلمانوں کے ان پر استحقاق کے تعلق سے ہے اس کے ضمن میں مصر کی ملکیت وقومیت، مقاماتِ مقدسہ کے حسب حال شرعی ہدایات، مقاماتِ مقدسہ کے سلسلے میں مسلمانوں کی فریب خوردگی نیز اس کے دوررس اور مہلک نتائج پر بحث کرتے ہوئے حجاز، شام، فلسطین ومصر کے تعلق سے مقاصد عشر کو گنا کر اپنی ذمہ داریوں کو بتایا گیا ہے، علاوہ ازیں ان مقدس مقامات کے تعلق سے خلاصۂ مقاصد میں اپنی تشویش کا اظہار اس طرح کیا ہے:

”تشویش یہ ہے کہ ان مخصوص مقدس خطوں کی آزادی اور ان کی حفاظت وصیانت کے بارے

میں اندازِ فکر کیا ہوگا اور وسائل کار کیا اختیار کئے جاتے ہیں؟ سو جہاں تک میری محدود معلومات کا تعلق ہے اب تک اس سلسلے میں جتنے بھی افکار اور جتنے بھی دعوے یا نعرے سامنے آئے ہیں وہ اکثر و بیشتر وطنی اور جغرافیائی یا رائج الوقت سیاسی انداز ہی کے محسوس ہوئے لیکن یہ حقیقت ہے کہ حقیقی نقطہ اس بارے میں آج کی مروجہ سیاست کا ہے نہ کہ آج کے وطنی ڈھنگ کا بلکہ خالص مذہبی اور شرعی انداز کا ہونا چاہئے۔ محض پارٹی سیاست یا وطنی حد بندیوں اور قومی اقتدار کے نام پر اگر یہ جذبات ابھریں گے تو ان سے ان مرکزیتوں کے تحفظ اور استحکام کا مقصد کبھی پورا نہیں ہوسکتا، جس سے یہ مقامات بالاتر ہیں۔ اسی لئے شرعی ہدایت کے تحت اس ناچیز نے ان مقاماتِ مقدسہ کی حفاظت وصیانت کو دینی نقطۂ نظر سے پیش کیا ہے کسی سیاسی منصوبے کے انداز سے نہیں۔ ممکن ہے کہ اس دورِ وطنیت پرستی میں اسے رجعت پسندی یا تنگ خیالی کا طعنہ دے کر اس کی اہمیت گھٹائی جائے لیکن میرے خیال میں اس سے بجائے مرعوب یا خجل ہونے کے ہمیں اس رجعت پسندی کا خیر مقدم کرنے کی ضرورت ہے کیوں کہ شرعیات کی بناء عقلی اختراعات پر نہیں بلکہ نقلی روایات پر ہے۔'' ......''اندریں صورت جب کہ ان مقاماتِ تقدیس کی بنیادی نقولِ مذہب پر ہے عقلی اختراعات پر نہیں تو ان کی حفاظت بھی علانیہ شرعی منصوبوں اور مذہبی دعووں کے ساتھ ہی ہوسکتی ہے۔''(۱۶)

درج بالا سطور میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے یہ انتہائی اختصار کے ساتھ اس کتاب کے موضوعات کے تجزیہ کی طالب علمانہ کوشش ہے۔ جہاں تک حضرت حکیم الاسلامؒ کی سخن در سخن نکتہ آفرینیوں کا تعلق ہے اس کی اہمیت بھی مسلمات میں سے ہے۔ سیکڑوں قرآنی آیات اور متعدد احادیث مبارکہ سے مستند اس کتاب کا اندازِ تحریر فلسفہ وجدید سائنسی توضیحات کی روشنی میں بات کرنے والے ترقی پذیر دانشوروں کے لئے بھی نسخۂ سعادت سے کم نہیں۔ حضرت والا نے حالات و واقعات سے جس طرح نتائج اخذ کئے ہیں وہ ان کے انتہائی عمیق و وسیع مطالعہ کی دلیل ہونے کے علاوہ اردو نثر کا بہترین شاہکار ہیں۔ بطور مثال درج ذیل عبارت ملاحظہ فرمایئے:

''کعبۂ مقدسہ کی مرکزیت کے سلسلے میں حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے دعوت ابراہیمی کو عالمی انداز میں پھیلانے کی جو توقعات وابستہ کی تھیں وہ مقدس اقصیٰ یعنی فلسطین اور شام سے نہ تھیں کیوں کہ مؤخر الذکر علاقہ زرخیز، باغ و راغ، میووں پھلوں کا مخزن، نہروں اور میٹھے پانیوں کا سرچشمہ تھا جب کہ ارضِ حجاز بے آب و گیاہ ملک تھا، جس میں نہ باغ و راغ تھا نہ گلشن و

چمن، نہ پھل پھول تھے اور نہ میوے اور نہریں، نہ ندیاں تھیں نہ کھیت باڑیاں، نہ صنعت وحرفت نہ دستکاری، اسی لئے سادگی و جفاکشی اور قناعت ان کا مستعار تھا۔ تصنع اور بناوٹ سے کوسوں دور ایسے مقام پر تھے کہ اگر ان کے نفوس کو صحیح تربیت سے درست کر دیا جائے تو آفاقی اور بیرونی کوئی سبب ایسا تھا ہی نہیں کہ ان کے ترقی پذیر عزائم میں حارج ہو۔'' (۱۷)

آگے فرماتے ہیں:

''حضرت ابراہیمؑ نے بیت اللہ کی تعمیر کرتے ہوئے بالہامِ خداوندی حق تعالیٰ سے جو دعا مانگی تھی اس میں پہلے التجا تو یہ تھی کہ اے پروردگار اولادِ ابراہیم و اسماعیلؑ میں ایک عظیم رسول مبعوث فرما اور اسے وہ قانون عطا فرما جس کے الفاظ بھی وحی ہوں کہ ان کی تلاوت کی جائے اور ان میں ایک امت مسلمہ برپا کر اور اسے اس عالمی مرکز کعبۂ مقدسہ کے حقوق ومناسک (حج بیت اللہ) عالمی انداز سے کرنے کی توفیق عطا فرما کہ لوگ اطرافِ عالم سے اس کی طرف رجوع کریں اور اس مرکز سے توحید واتحاد کا سبق لے کر اسے عالمی کر دکھلائیں۔ (۱۸)

اس کے بعد آپ نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ مومنانہ فراست کا حامل ہے۔ فرماتے ہیں:

''پس اس طرح دنیا کے انسان امام الناس خلیل رب العالمین کی امامت کے مقتدیٰ بن گئے اور جس مسجد مقدس سے اس امامت واقتداء کا ظہور ہوا وہ کعبۂ مقدس تھا جس سے اس بیت کریم کی عالمی مرکزیت باندازۂ خلیلی، بہ منشاء خداوندی روزِ روشن سے زیادہ واضح ہوگئی اور ساتھ ہی اس امتِ مسلمہ کی عالمیت اور اس کے مقاصد کی آفاقیت و ہمہ گیری کے اس عالمی مرکز سے وابستگی بھی نمایاں کر دی گئی۔''

اسی طریقہ پر مقاماتِ مقدسہ کے معیار سے عالمی تعمیر و دفاع کی شرعی صورتوں کو جس انداز سے بیان کیا ہے اس کا حق بھی حکیم الاسلامؒ کو ہی پہنچتا ہے۔ آپ نے اس موقع پر دین وسیاست کی تشریح وتعبیر جس انداز سے کی ہے وہ بھی قابل ملاحظہ ہے، فرماتے ہیں کہ:

''اسلام نے ''الملك والدين توأمان'' (ملک اور دین دو جڑواں بچوں کی طرح ہیں) کہہ کر دین وسیاست کو جمع ہی نہیں کیا بلکہ سیاست کو دین میں سمو کر ان میں سے ہر ایک مستقل ایک ایک بنیادی اور مرکزی حیثیت دی ہے، عبادت کو اہم اور اولین مقصد قرار دے کر حجازِ مقدس کو اس کا مرکز بتایا ہے۔ سیاست وشوکت کو دین میں بنیادی حیثیت دے کر اس کا مرکز شام کو بتلایا اور

عسکریت اور فوجی قوت کو اہم مقصد بتلا کر مصر کو اس کا مرکز قرار دیا اور پھر ان تینوں مرکزیتوں کو اپنی اپنی مرکزیتوں پر برقرار رکھنے کے لئے ایک مرکز المراکز عالمی نظام اجتماعیت قائم کر کے اس اس کا نام خلافت رکھا تا کہ اس بین الاقوامی و بین الاوطانی نظام سے جہاں ان تینوں مرکزوں کی مرکزی برکات عالم میں پھیلیں وہیں دنیا کی ساری طاقتیں اور ساری اقوام بھی ایک نظام میں منسلک ہو کر حقیقی انسانیت کو نمایاں کر سکیں۔'' (۱۹)

اسلام میں سیاست سے کیا مراد ہے؟ اس کی تشریح بھی آپ نے اس انداز سے فرمادی ہے:

''حقیقی سیاست وہی ہو سکتی ہے جس میں عقل و تدبر اور اخلاص کے ساتھ دنیا کو باہم ملانے اور خلوص کے ساتھ اقوام کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کی فطری صلاحیت موجود ہو اس لئے اگر بہ نظر انصاف دیکھا جائے تو وہ دینی اور دیانتی سیاست صرف اسلامی ہی ہے جس کا نمونہ اسلام نے دنیا کے سامنے نہ صرف نظری طور پر رکھا بلکہ اس دار دنیا کی کتنی ہی متضاد انواع کی قوموں کو نظام کی ایک لڑی میں پرو کر دکھلا دیا جس سے کسی قوم کو انحراف نہیں ہوا۔'' (۲۰)

اسلام کا مقصد مسلمانوں کو مصنوعی معیاروں خواہ وہ قوم و وطن کی شکل میں ہوں یا رنگ ونسل کی صورت میں، ان سب جھوٹے اور داغ دار معیاروں سے نکال کر انہیں عالمیت اور اجتماعیت کبریٰ کی طرف لے جانا ہے۔ ان کا داعیانہ کردار ہی انہیں عزت وشوکت اور آقائی عطا کرنے کا ذریعہ ہے اس لئے انہیں نہ صرف اس کردار کو ہمیشہ ملحوظ رکھنا ہے بلکہ انہیں ان طاغوتی اور صہیونی سازشوں سے بھی باخبر رہنا ہے جو ان کے خلاف عالمی پیمانے پر جاری ہیں۔ اس صہیونی سازشنوں سے کم وبیش نصف صدی پہلے حکیم الاسلامؒ نے عالم اسلام کو باخبر کیا تھا ان کی حیات کے آخری حصے میں یہود ونصاریٰ نے قبلۂ اول پر قبضہ کر کے عالم اسلام کی جس انداز میں دل آزاری کی اس نے حکیم الاسلامؒ کی بصیرت اور معاملہ فہمی کو پوری طرح ثابت کر دیا۔ حکیم الاسلامؒ نے صہیونی سازش سے عالمِ اسلام کو اس انداز سے خبردار کیا تھا:

''اندیشہ ہے کہ یہ تین وزیتون کا مقدس شہر خاکم بدہن صہیونیوں کے دست برد کے نیچے نہ آ جائے، جس کے لئے سازشوں کا جال بچھا ہوا ہے اور مسلمانوں کی عالمی سیاست ایک خواب و خیال ہو کر نہ رہ جائے اور پھر اس بے دست و پائی کے نتیجے میں طور سینا کی وادیاں بھی کہیں خطرہ میں نہ پڑ جائیں جن کا کچھ حصہ غزہ سے آگے کا ہاتھوں سے نکل بھی چکا ہے اور دشمن عین غزہ کے سر پر بیٹھا ہوا ہے اسے تاک رہا ہے۔ اگر مصر نے اس کی طرف دھیان نہیں دیا اور اس مقام کی دینی

نوعیت کو سامنے رکھ کر جو اسلام نے اسے بخشی ہے محفوظ نہ رکھا تو اندیشہ ہے کہ صہیونی دسترس اس پر رکی نہ رہے گی جس پر آج رکی ہوئی ہے۔'' (۲۱)

حکیم الاسلام علیہ الرحمہ نے یہ تحریری پیشین گوئی آج سے کم وبیش چالیس سال پہلے کی تھی جو عرب حکمرانوں کی بے بسی، امریکہ کے تسلط اور عرب ممالک کے عدم اتحاد کے سبب آج بہت حد تک پوری ہو چکی ہے۔ اس سے مصنف کی دور بینی، دور اندیشی کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے اور پھر اس پر بس نہیں بلکہ موجودہ حالات کے تناظر میں عالم اسلام ہی نہیں بلکہ پوری ملت اسلامیہ میں پائی جانے والی بے چینی و تشویش کو سامنے رکھ کر کتاب کا درج ذیل پارۂ عبارت بھی ملاحظہ فرمایئے:

''صہیونی جغرافیہ میں مدینہ اور خیبر کو بھی دشمن نے شامل کر رکھا ہے۔ گویا حجازِ مقدس پر بھی دشمنوں کی کڑی نظر ہے جس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ شام، اقصیٰ اور مصر، غزہ کے کنارے تک دشمن کے ہاتھ میں اور حجاز مدینہ وخیبر تک دشمن کی نظر میں ہے تو کیا یہ مسلمانوں کی غیرت ملی کے لئے مہمیز نہیں ہے اور کیا اس کے بعد اس مہلک بیماری کے علاج کی ضرورت نہیں ہے۔'' (۲۲)

حکیم الاسلام علیہ الرحمہ نے صرف اس مہلک بیماری کی ہی نشاندہی نہیں کی ہے بلکہ اس کا علاج بھی تجویز کیا ہے جو ایک ''معجون مرکب'' پر مشتمل ہے جس کے درج ذیل سات اجزاء ہیں:

۱- دین وسیاست کی وحدت

۲- عالمی سیاست بصورتِ خلافت

۳- عالمی دعوت

۴- عالمی اخوت

۵- عالمی مساوات

۶- عالمی امن واتحاد اور

۷- عالمی عبادت وشوکت اور عسکریت کی سہ مرکزی قوت۔'' (۲۳)

اس معجون کے طریقۂ استعمال سے جو فوائد ہونے کی امید ہے انہیں بھی ''حکیم'' نے پوری طرح بتا دیا ہے تا کہ ''مریض'' کو شفاء کاملہ حاصل ہو سکے۔ حکیم الاسلام کے الفاظ میں یہ ''مریض'' کے لئے ''نسخۂ شفا'' بھی ہے اور مرض کا مکمل خاتمہ بھی اس کے استعمال سے ہی ہو سکتا ہے۔

عالم عرب کا مرض اگر چہ انتہائی شدت اختیار کر چکا ہے اور اس نے پوری ملت اسلامیہ کو ''مریض'' بنا

دیا ہے تاہم آج بھی درج بالا ''معجون مرکب'' کا استعمال نہ صرف ''مریض'' کے لئے شافی ہوسکتا ہے بلکہ عالمِ انسانیت کو بھی قوت وتوانائی بہم پہنچا سکتا ہے۔علامہ اقبال کی زبان میں:

آج بھی ہو جو ابراہیم سا ایماں پیدا
آگ کرسکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

الغرض پیشِ نظر کتاب ''مقاماتِ مقدسہ اور اسلام کا اجتماعی نظام'' جہاں ایک طرف مصنف کی تبحر علمی، فکری وسعت اور گہرائی خیال کی عکاس ہے وہیں ملتِ اسلامیہ کے قلبی جذبات کی حقیقی ترجمان بھی۔ مجھے احساس ہے کہ صفحات کی محدودیت، اپنی کم علمی اور ہیچ مدانی کے باعث عنوان کے مطابق اس کے تجزیاتی مطالعہ کا حق کماحقہٗ ادا نہیں کرسکا، تاہم قارئین کے سامنے کچھ نمونے پیش کرکے یہ کوشش ضرور کی گئی ہے کہ وہ اس اہم کتاب کے مطالعہ کی طرف توجہ فرما کر اس میں غوطہ زن ہوں اور اس بحرِ ذخار سے بیش قیمت موتی نکال کر دنیا کی فیض رسانی کا باعث ہوں۔ راقم الحروف اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوسکا، اس کا فیصلہ قارئین ہی فرمائیں گے۔

............❖............

(۱) ص: ۱۷	(۲) ص: ۶۰
(۳) ص: ۱۱۵	(۴) ص: ۴۱
(۵) ص: ۴۳	(۶) ص: ۴۳
(۷) ص: ۱۵۱	(۸) ص: ۱۵۲
(۹) ص: ۱۵۵	(۱۰) ص: ۱۶۳
(۱۱) ص: ۲۹۷	(۱۲) ص: ۳۵۹ تا ۳۶۱
(۱۳) ص: ۴۰۰	(۱۴) ص: ۴۴۴-۴۴۳
(۱۵) ص: ۴۷۳-۴۷۶	(۱۶) ص: ۷۰۵ و ۷۰۶
(۱۷) ص: ۷۴-۷۵	(۱۸) ص: ۷۶
(۱۹) ص: ۷۲۰	(۲۰) ص: ۷۲۰
(۲۱) ص: ۷۲۱	(۲۲) ص: ۷۳۱
(۲۳) ص: ۷۳۲	

............❖............

حکیم الاسلامؒ کی حکیمانہ باتیں!

مولانا عبدالعزیز قاسمی

مدرسہ نورالاسلام، میرٹھ

ملت اسلام کا تھا تو درخشاں آفتاب
غیر ممکن ہے کہ اب پیدا ہو تیرا پھر جواب

فخر الاماثل، حکیم الاسلام، شیخ المشائخ حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ علم وعمل، اخلاق وصداقت کے ایک بہترین اور نادر نمونہ تھے۔ حضرت سلطا؟ن الاولیاء خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ سے لے کر قطب العالم حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی نور اللہ مرقدہ کی ذاتِ اقدس تک جو سلسلہ چلا آ رہا تھا جس کو فقیہ زماں، حکیم الامت مولانا تھانوی صاحب برد اللہ مضجعہ نے جوں کا توں لے کر کتاب وسنت کی روشنی میں منشاء الٰہی کے مطابق اس کو ایک حسین وجمیل صورت عطا فرمائی اور اس کا صحیح مجسمہ حضرت اقدس حکیم الاسلامؒ کی ذاتِ اقدس تھی۔

اس فقدان الرجال کے دور میں صبر وضبط اور علم وعمل کا یہ عالم تھا کہ اپنے تو اپنے اغیار بھی معاملہ پیش آنے کے بعد معترف ومعتقد ہوئے بغیر نہیں رہ سکے اور یہی وجہ تھی کہ صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ غیر مسلم بھی ان کی شرافت نفس کے قائل تھے۔

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا　　　ہر مدعی کے واسطے دار ورسن کہاں

استاذ المحترم حضرت حکیم الاسلامؒ نے شرافت ورافت قسام ازل سے غایت درجہ پائی تھی، نظریاتی اختلاف کو ہنسی خوشی برداشت کر لیتے۔ دل میں اپنے حریف کی جانب سے ذرا بھی میل نہ لاتے بلکہ اپنے معاند یا سب وشتم کرنے والوں کی طرف سے بھی کبھی دل تنگ نہ ہوتا اور موقعہ میسر آئے تو ہمدردی اور مروت، رواداری برابر اس کے ساتھ کرتے رہتے۔ اس قدر عالی ظرفی اور تحمل کا مادہ ہر ایک انسان کے بس کا

کام نہیں۔"ان ذلك لمن عزم الامور"۔

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ "دیوبند" کے ایک مقامی اخبار نے کچھ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف لکھ دیا اخبار کا ایڈیٹر اغیار کے ہاتھوں بری طرح بک گیا تھا اور کچھ وہ اپنی عادت سے بھی مجبور تھا "جبل گردد وجبلت نہ گردد" اس کا اثر یہ ہوا کہ دیوبند کی عوام بگڑ گئی اور عمائدین شہر اور علماء کی ایک خاص جماعت حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اجازت چاہی کہ اخبار کے ایڈیٹر کو کوئی ایذا پہنچائی جائے یا اس کے پریس کو خرد و برد کیا جائے تو حضرت نے بڑی سنجیدگی اور متانت کے لہجہ میں فرمایا "مجھے برا بھلا کہنے سے یا لکھ دینے سے اگر کسی کی روٹیاں سیدھی ہو رہی ہوں تو تمہارا کیا حرج ہے۔"

حاضرین آپ کا یہ جملہ سن کر انگشت بدنداں رہ گئے اور آگے کچھ کہنے کی جرأت بھی نہ ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کے یہاں غیبت اور بغض وعناد نام کا بھی نہیں تھا اور یہی وجہ ہے کہ ان کے متوسلین بھی صالح اور راسخ العقیدہ نظر آتے ہیں اور آپ کا یہ ولی اللٰہی رنگ آپ کے خلفاء اور معتقدین میں بھی ملتا ہے اور اس کی مثال میرے کرم فرما سیدی حضرت مولانا حکیم محمد اسلام صاحبؒ جو حضرت کے خلیفہ اور جامعہ عربیہ نور الاسلام میرٹھ کے سربراہ اور مہتمم تھے۔ ان کی عالی ظرفی اور حلم و بردباری سے کون انکار کرے گا جن لوگوں نے حکیم الاسلامؒ صاحب کو دیکھا ہے وہ میری اس بات کی تصدیق کریں گے کہ اس دور میں حکیم صاحب اسلاف کی نشانی، تواضع، عجز وانکساری اور رافتِ قلبی کا ایک بہترین نمونہ تھے کبھی کبھی اپنی مجالس میں فرماتے تھے:

"کہ اپنے پاس کچھ نہیں ہے جو کچھ ہے وہ حضرت مہتمم صاحبؒ کی جوتیوں کا صدقہ ہے"۔

کون نہیں جانتا کہ حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب نور اللہ مرقدہ کی علمی وروحانی شعاعیں عرب وعجم اور ہندو پاک کے علاوہ دیگر ممالک میں بھی پھیلی ہوئی ہیں اور آپ کے مستفیضین کی تعداد شمار وحساب سے خارج ہے، یہ اگر آپ کی زندہ کرامت نہیں تو اور کیا ہے؟

وہ جنیدِ دورِ حاضر وہ طریقت کا امام وہ زمانہ کا غزالی فخرِ رازی، نیک نام

آپ کے یہاں آیات کتاب اللہ واحادیث نبویہ کی تشریحات، دلائل اور دلنشیں انداز میں اور شرعی مسائل واحکام کی علّتیں بکثرت ملتی ہیں۔

ایک بار حضرتؒ میرٹھ تشریف لائے "خیر نگر" میں حکیم محمد ادریس صاحب کے یہاں قیام تھا، معلوم ہونے پر یہ راقم بھی حاضر خدمت ہوا۔ حضرت ایک رسالہ کے مطالعہ میں مشغول تھے۔ سلام ومصافحہ کے بعد برابر کی چارپائی پر بیٹھ گیا اور یہ فکر سوار ہوا کہ آغازِ سخن کس طرح کروں تاکہ کچھ استفادہ ہو سکے۔ تھوڑی

دیر کے وقفہ کے بعد میں نے حضرت کی جانب پان بڑھایا تو حضرت نے پان قبول کرتے ہوئے فرمایا:

''پان مفرح قلب ہے اور حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ نے تو اس کو کھانے کی مسواک کہا ہے۔ اور مجھے تو پان بھی کھانا نہیں آتا تھا حضرت مدنیؒ نے سکھا دیا''۔

اس پر سلسلۂ سخن دراز کرتے ہوئے میں نے دبے الفاظ میں عرض کیا کہ سنا گیا ہے کہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ تو آپ کا بیحد احترام فرماتے تھے۔ جواباً ارشاد فرمایا:

''جی ہاں بظاہر تو کوئی خوبی اس وقت نہ تھی اور نہ اب ہے، ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ علامہ انور شاہ کشمیری اور حضرت مولانا مدنیؒ کی تربیت میری والدہ نے کی ہے اور یہی وجہ تھی کہ یہ دونوں بزرگ میرے اہل خانہ کا بہت احترام کرتے اور حضرت مدنیؒ نے تو بارہا عجز وانکساری کے لہجہ میں ارشاد فرمایا کہ میں اس در کا کتّا ہوں اور وہ مجھ سے بہت محبت وشفقت کا معاملہ کرتے چناں چہ پاکستان سے جب میں دوبارہ دارالعلوم میں حاضر ہوا تو مولانا مدنیؒ نے بے ساختہ مجھ سے فرمایا'' کہ آپ دارالعلوم کے محتاج نہیں ہیں دارالعلوم آپ کا محتاج ہے۔''

تو ظاہر ہے یہ سب ان کی شفقت اور رحمت ہی تھیں۔

تبدیل موضوع اختیار کرتے ہوئے دوسرا میرا سوال یہ تھا کہ حضرت کافرین کو دنیا میں راحت وآرام اور مؤمنین کے لیے سوائے مصائب وآلام کے کچھ نہیں، اس کی کیا وجہ ہے؟

تو آپ مسکراتے ہوئے فرمانے لگے اس میں کیا حرج ہے۔ بظاہر تو اس میں کوئی نقصان ہے نہیں۔ حق تعالیٰ کی حکمت اسی میں ہے اور اسی میں بندہ کو راضی رہنا چاہئے۔ پھر اپنے مخصوص حکیمانہ انداز میں فرمایا۔

''کہ دراصل صورت ایسی ہے کہ انسان کو حق تعالیٰ نے دو قسموں میں بانٹ دیا ہے۔ ایک کافر، دوسرے مومن اور زندگی بھی حق تعالیٰ نے دو ہی رکھی ہیں ایک دنیا کی اور دوسرے آخرت کی۔ تو دنیا کی راحتیں کافر کو عطا کیں اور آخرت کی مومنین کو اگر کافر کو دنیا کی نعمتیں نہ دی جاتیں تو وہ بے چارہ محروم رہتا، آخر کار وہ بھی تو اللہ کی مخلوق ہے اور آخرت کی نعمتوں سے اس کو محروم رکھا جائے گا، بخلاف مومنین کے کہ ان کو آخرت سے سرفراز کیا جائے گا۔''

حضرت حکیم الاسلامؒ دہلی کے ''پنتھ ہسپتال'' میں زیر علاج تھے۔ میرٹھ سے ایک وفد حضرت حکیم محمد اسلام صاحبؒ کی قیادت میں دہلی پہنچا جس میں حکیم محمد الیاس صاحب کھوڑوی کے علاوہ مولانا

عبدالستار صاحب مدرس مدرسہ نورالاسلام اور دیگر احباب بھی شریک تھے اور یہ بندہ بھی۔ آپ کافی لاغر اور کمزور ہو چکے تھے۔ ڈاکٹروں نے بولنے پر پابندی عائد کر دی تھی۔ ڈاکٹروں کے حکم سے آپ کے کمرے کے دروازہ پر بھی ہسپتال کی جانب سے لکھ دیا گیا تھا ''گفتگو کرنا منع ہے''۔

بہرحال اس وفد نے حضرت کی عیادت فرمائی۔ حکیم صاحب سے کچھ مختصر گفتگو بھی ہوئی۔ اسی اثناء میں آپ کی پوتی اور حضرت مولانا محمد سالم صاحب مدظلہ آ گئے، تو حضرت ان سے گفتگو کرنے لگے کہ اتنے میں ایک ''نرس'' آئی اور اس کا منشا یہ تھا ''کہ آپ گفتگو نہ کریں'' اور حضرت کو مخاطب کر کے کہنے لگی:

''کہ آپ کے روم پر بھی لکھا ہوا ہے کہ بات کرنا منع ہے''۔

اس پر حضرت مہتمم صاحبؒ نے برجستہ کہا:

''کہ وہ میرے لیے نہیں بلکہ آنے والے کے لیے ہے''۔

آپ شادی میں ہوتے یا غمی میں، تکلیف میں ہوتے یا راحت میں، مگر زائرین کو کبھی احساس نہ ہونے دیتے بلکہ اپنی طویل گفتگو اور حکیمانہ باتوں سے ان کی دلجوئی فرماتے۔ تفکرات کا آپ پر کتنا ہی ہجوم ہوتا۔ ہموم و غموم کی کتنی ہی یورش ہوتی مگر عالم یہ تھا کہ تبسم زیرلب۔ غالباً اردو کے کسی شاعر نے آپ ہی کے بارے میں کہا تھا۔

کانٹوں میں ہے گھرا ہوا چاروں طرف سے پھول
پھر بھی کھلا ہی پڑتا ہے کیا خوش مزاج ہے

سَن تو مجھے یاد نہیں، ہاں البتہ مادرِ علمی دیوبند میں زمانہ طالب علمی تھا کہ حضرت حکیم الاسلامؒ حج بیت اللہ سے تشریف لائے۔ آپ کی زیر صدارت تحتانی دارالحدیث میں ''جمعیۃ الطلبہ'' کی جانب سے ایک جلسہ منعقد کیا گیا جس میں آپ نے تقریر فرمائی اور اپنے سفر حج کے حالات بتلائے۔ منجملہ ان واقعات کے آپ نے فرمایا:

''کہ ایک روز میں مسجد حرام میں بیٹھا ہوا اپنے معمولات میں مشغول تھا اور کثیر تعداد میں زائرین حج تشریف فرما تھے کہ اچانک ایک سائل آیا اور عاجزی و انکساری کے لہجہ میں سوال کرنے لگا اور پھر وہ غائب ہو گیا تو میں نے عرض کیا ہم سب کو اس سے عبرت حاصل کرنی چاہئے، حق تعالیٰ نے اس شخص کو بھیج کر ہم کو متنبہ کیا ہے کہ یہاں جس قدر بھی عاجزی و انکساری اختیار کرو گے اسی قدر ملے گا، خاموش رہنے سے کوئی اپنی مراد کو نہیں پہنچتا ہے، سائل جب تک سوال نہیں کرتا تو اس وقت تک اس کی جھولی میں بھیک نہیں ڈالی

جاتی تو ظاہر ہے ایسے ہی جب تک اللہ کے سامنے عاجزی وانکساری کا اظہار نہیں ہوگا اس سے مانگا نہ جائے گا تو عنایات ربانی کا نزول کیسے ہوگا۔

اللہ اکبر! کیا شان تھی اس ذات ستودہ کی جس کے قدم قدم میں عبرت، ہر لمحہ غور فکر سے معمور، ہر بات حکمت ومعرفت سے منور، ۱۴۰۲ھ اوائل شعبان میں حضرت حکیم محمد اسلام صاحبؒ مہتمم جامعہ عربیہ نور الاسلام میرٹھ کی دعوت پر ختم بخاری شریف کے جلسہ میں آپ تشریف لائے اور بخاری شریف کی آخری حدیث ''**کلمتان حبیبتان** ''پر محققانہ کلام فرمایا، ابتدا میں بیٹھتے ہی خطبہ مسنونہ کے بعد آپ نے ارشاد فرمایا:

''کہ آج تو میں ہی بخاری ہوں۔''

سامعین حیران کہ یہ جملہ کیسے استعمال فرمایا۔لیکن پھر ارشاد فرمایا کہ اس میں ''یا'' نسبتی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ میں دو تین یوم سے بخار میں مبتلا ہوں صرف وعدہ کی بنا پر حاضری ہوگئی ہے اور چوں کہ میں بخار میں ہوں۔

''لہٰذا بخاری آج میں ہی ہوں۔''

اس کے بعد **خفیفتان علی اللسان ثقیلتان فی المیزان** کو حسی مثال دے کر سمجھایا کہ دو کلمے زبان پر ہلکے پھلکے لیکن میزان عمل کے اندر وزنی اور بھاری ہوں گے جیسے ''ہاپوڑ کے پاپڑ'' یہ دیکھنے میں انتہائی درجہ کے خفیف اور ہلکے ہیں لیکن معدہ میں جا کر یہ ثقیل اور غیر معمولی وزنی اور بھاری ہو جاتے ہیں۔

آپ کی عارفانہ اور حکیمانہ باتوں میں آپ کے جد امجد حضرت نانوتویؒ وحکیم الامت حضرت تھانویؒ کا رنگ غالب تھا، یہ آپ کے اس خاص پہلو کی مختصر روئیدا تھی ؎

کہ نہ نتواں کرد کہ ایں قصہ دراز ست

کل تک ہم جس ذاتِ گرامی سے آیات قرآنی کی تفسیر واحادیث نبویہ کی تشریح حکیمانہ انداز میں سنتے تھے، افسوس کہ آج وہ زیر زمیں محو خواب ہے۔

حضرت شیخ الہندؒ نے جن بزرگان دین کی امانت کو اور حضرت علامہ کشمیریؒ نے جس خزانہ علم کو اور حضرت تھانویؒ جس مرشد کامل کو ہمارے سپرد کر گئے تھے ہم نے اپنے ہاتھوں اُسے زیر زمیں دفن کر دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

اللھم اغفرہ وارحمہ واسکنہ فی اعلی الجنان

آمین یا رب العٰلمین

............❖............

حضرت حکیم الاسلامؒ اور تحفظ ختم نبوت

مولانا شاہ عالم گورکھپوری

تحفظ ختم نبوت دارالعلوم دیوبند

اپنے قارئین کو یہ بات پہلے ہی بتا دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ راقم سطور نے حضرت حکیم الاسلام محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اپنی ان ظاہری آنکھوں سے تو نہیں لیکن خود ان کے کارناموں کی روشنی میں ضرور دیکھا اور خوب خوب دیکھا ہے۔ اس کے لئے ظاہر سی بات ہے کہ حضرت حکیم الاسلام نور اللہ مرقدہٗ کی سیرت وسوانح کے تعلق سے ہمیں جو کچھ لکھنا، کہنا ہوگا اس میں بھی مصدقہ تاریخی اوراق ہی کا سہارا لینا ہوگا۔ اسی لئے حضرت حکیم الاسلامؒ کو بندۂ ناچیز نے جن آنکھوں سے دیکھنے کا اعتراف کیا ہے۔ اس سے اگر کسی کو اختلاف ہو تو ہوا کرے لیکن تاریخ کے ان پوشیدہ اوراق سے امید ہے کہ کسی کو اختلاف نہ ہوگا۔

عقیدہ ختم نبوت اور اس کا تحفظ چوں کہ اسلام کے بنیادی عقائد میں سے ہے اس لئے بحیثیت مسلمان ہونے کے اس سے وابستگی ہر خاص وعوام کو ہوتی ہی ہے، لیکن تاریخ کے اوراق میں وہ لوگ انتہائی خوش بخت شمار ہوتے ہیں جن کا تعلق، تحفظ ختم نبوت اور اس کے مقتضیات سے وابستگی، وارفتگی کی حد تک ہوتی ہے۔ موجودہ صدی کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو فخر رسل سید الکونین حضرت محمد ﷺ کی ذات اقدس کے ساتھ آپ ﷺ کی تاج ختم نبوت سے عشق اور ہر جعل وتصرف اور عقیدۂ ختم نبوت سے محفوظ کرنے کا پاکیزہ جذبہ جن جن خوش نصیبوں کو ملا ان کی طویل فہرست میں حضرت حکیم الاسلامؒ محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت بھی نمایاں نظر آتی ہے اور تاریخ کے اوراق میں جابجا عاشقان تحفظ ختم نبوت کی پاکیزہ جماعت میں حضرت حکیم الاسلامؒ کو پڑھا اور دیکھا جا سکتا ہے۔ بطور دلیل اس دعویٰ پر حضرت حکیم الاسلام کی تصنیفات کا جائزہ لیا جائے تو تحفظ ختم نبوت کے موضوع پر آپ کی خدمات کا ایک

وسیع باب ملے گا۔ حضرت کے خطبات، مواعظ و مقالات کا ذخیرہ بھی یہ باور کرائے گا کہ عقیدۂ ختم نبوت کے خلاف اٹھنے والے مختلف طرح کے فتنوں کا مقابلہ کرنا حضرت حکیم الاسلام کے کارناموں میں سے ایک اہم کارنامہ ہے۔

قادیانی تحریک اور اس کے تعاقب کی تیاری

انیسویں صدی کے آغاز میں ضلع گورداسپور، پنجاب میں واقع ''قادیان'' نامی ایک گاؤں سے قادیانیت کا فتنہ رونما ہوا۔ چوں کہ اس فتنہ کو وقت کی انگریزی سرکار کی بھرپور پشت پناہی حاصل تھی اور شاید قدرت کو ہم جیسے کمزور ایمان والوں کے ایمان کی آزمائش بھی مقصود تھی کہ قادیانی تحریک کی فتنہ پروری میں روز بہ روز اضافہ ہی ہوتا رہا لیکن تاریخ شاہد ہے کہ علماء اسلام بالخصوص علماءِ دارالعلوم دیوبند نے قادیانیت کو اپنے زمانہ کا سب سے خطرناک فتنہ قرار دیتے ہوئے اس کے تردید و تعاقب میں نہ صرف علمی اور تصنیفی جدو جہد فرمائی بلکہ فتنہ کو کچلنے کے لئے سربکف میدان عمل میں اتر آئے۔

مدعی نبوت مرزا غلام احمد قادیانی کی پیدائش ۱۸۴۹ء میں ہوتی اور ۱۸۸۰ء سے اس نے بتدریج اپنے ہاتھ پاؤں پھیلانے شروع کئے اور تقریباً ایک دہائی گذرتے گذرتے بلّی تھیلے سے باہر آ گئی۔ ۱۸۹۰ء سے عوام وخواص سبھی نے قادیانیت کی زہرناکیوں اور خطرناکیوں کو خوب بھانپ لیا۔ یہ وہ دور ہے کہ ۱۸۷۹ء میں حضرت حکیم الاسلام کے جد امجد حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہوتا ہے لیکن مشیّت خداوندی دیکھئے کہ انتقال سے قبل تحفظ ختم نبوت اور آئندہ زمانہ میں پیدا ہونے والے جھوٹے مدعیان نبوت کا ہمہ جہت دروازہ بند کر کے تحفظ ختم نبوت کے میدان میں آپ نے وہ گراں قدر خدمات انجام دیں کہ آج بھی علم وفضل کی دنیا اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ شان ختم نبوت کو بلند و بالا مقام دینے کے لئے جگہ، زمانہ اور مقام و مرتبہ تینوں اعتبار سے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تصنیف ''تحذیر الناس'' میں عقیدہ ختم نبوت کی گرہ کشائی اور اس کی وہ توضیح وتشریح فرمائی ہے کہ جس نے عقیدہ ختم نبوت کو ہمہ جہت حصار اور مضبوط تحفظ فراہم کیا۔ اگر بصیرت کی نگاہ سے دیکھا جائے تو فتنۂ قادیانیت کے ظہور سے پہلے ہی حضرت نانوتویؒ کا تحفظ ختم نبوت کے میدان میں یہ پہلا اور سنہرے حرفوں سے لکھا جانے والا کارنامہ ہے۔

قادیانی فتنہ ۱۹۰۱ء میں جب اپنے شباب کو پہنچا تو یہ کیسے ممکن تھا کہ حضرت نانوتویؒ کی جسمانی یا روحانی اولادیں تحفظ ختم نبوت کے میدان میں کسی سے پیچھے رہتیں۔ چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ حضرات علماء دیوبند

اور منتسبینِ دیو بند کے ساتھ ساتھ حضرت نانوتویؒ کے خلف الصدق صاحب زادے حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیو بند نے بھی اپنے دورِ اہتمام میں خاندانی ورثہ کا حق ادا کرتے ہوئے قادیانی فتنہ کا حتی المقدور تعاقب فرمایا اور علماء کی کھیپ کی کھیپ کو اس میدان میں اتار کر قادیانیت کو قادیان میں شکست و ہزیمت سے دوچار کیا۔ حضرت مولانا صاحبؒ کا دورِ اہتمام چالیس سال کے عرصہ پر مشتمل ہے۔ اس دور میں تحفظ ختم نبوت کے سرخیل اور تکوینی طور پر خدا کی جانب سے منتخب تحفظ ختم نبوت کے انچارج حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم دیو بند کے صدر المدرسین تھے، اس دور کا ایک تاریخی اور دلچسپ واقعہ بطور ثبوت ملاحظہ فرمائیے:

قادیان میں علماء دارالعلوم دیو بند کی حق و صداقت کی آواز

انگریزوں نے بڑی چابک دستی سے قادیانی فتنہ کو جنم دے کر پورے ملک میں پھیلانے کی کوشش کی تھی۔ ان کا مقصد صرف اور صرف یہ تھا کہ مسلمانوں کے اندر سے جذبہ حریت سرد کر کے جلد سے جلد ملک پر قابو پایا جاسکے۔ مرزا قادیانی نے ۱۹۰۱ء میں جب کھل کر دعویٰ نبوت کر ڈالا تو اس جھوٹے مدعی نبوت کے تردید و تعاقب میں پنجاب اور لاہور وغیرہ میں مختلف انجمنیں اور کمیٹیاں قائم ہوئیں۔ انہیں میں سے ایک انجمن ''انجمن اسلامیہ قادیان'' کے نام سے قادیان کے مسلمانوں نے قائم کی تھی۔ ۱۹/ مارچ ۱۹۲۱ء میں اس انجمن کی جانب سے ایک بڑا اجلاس ہونا طے پایا جو انجمن کا سہ روزہ دوسرا اجلاس عام تھا۔ اس اجلاس عام میں علماء دارالعلوم دیو بند کو بطور خاص دعوت دی گئی اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نائب مہتمم دارالعلوم دیو بند کی زیر صدارت یہ تاریخ ساز اجلاس ہوا۔ اجلاس میں شرکت کرنے والے علماء کے نام حسب ذیل ہیں:

(۱) حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی، نائب مہتمم دارالعلوم دیو بند، برادرِ بزرگ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ۔

(۲) حضرت مولانا علامہ انور شاہ کشمیریؒ صدر المدرسین دارالعلوم دیو بند

(۳) حضرت مولانا سراج احمد صاحب مدرس دارالعلوم دیو بند

(۴) حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ فرزند حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیو بند

(۵) حضرت مولانا محمد طاہر صاحبؒ فرزند حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیو بند

(۶) حضرت مولانا حاجی نور احمد صاحب پسروری امرتسریؒ

(۷) حضرت مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسریؒ فاضل دیوبند (ایڈیٹر اخبار اہل حدیث)

(۸) حضرت مولانا مرتضیٰ حسن صاحب چاند پوری رحمۃ اللہ علیہ

(۹) امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ

(۱۰) حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب سیالکوٹی رحمۃ اللہ علیہ

ان اکابر کے علاوہ اور بھی علاقہ کے بڑے بڑے علماء اس تاریخی اجلاس میں شریک ہوئے۔ اجلاس سے قبل ۱۸/مارچ ۱۹۲۱ء میں قصبہ بٹالہ میں حضرت مولانا سراج احمد صاحب، حکیم مولوی ابوتراب عبدالحق صاحب اور حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحب رحمہم اللہ اجمعین کی عالمانہ اور محققانہ ایسی تقریریں ہوئیں کہ مرزائی اس کی تاب نہ لاسکے اور بوکھلا کر سطحی قسم کے اعتراضات کرنے لگے۔ اسی قسم کے ایک اعتراض کا جواب دیتے ہوئے حضرت حکیم الاسلام کی تقریر کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔ واضح رہے کہ تقریر کی اصل رپورٹ اسی زمانہ میں انجمن کی جانب سے شائع ہوئی تھی۔ اس کا اختصار کرتے ہوئے مولانا ازہر شاہ قیصر رحمۃ اللہ علیہ نے ماہنامہ دارالعلوم کے شمارہ نمبر (۴۸) ج ۴، جنوری ۱۹۷۵ء میں حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ اہتمام میں شائع فرمائی تھی چوں کہ یہ تحریر خود حضرت حکیم الاسلام کی نظر سے بھی گذر چکی ہے اس لئے اس کی معتربیت میں اور اضافہ ہوجاتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ کرنے سے پہلے یہ پس منظر ذہن میں رکھنا چاہئے کہ قادیانیوں نے چوں کہ تحریک خلافت میں انگریزوں اور غیر مسلموں کا ساتھ دے کر عملی طور پر یہ ثبوت دیا تھا کہ قادیانی نہ مسلمان ہیں اور نہ ہی وہ مسلمانوں کے ساتھ کسی اجتماعی و انفرادی معاملہ میں شریک رہنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ خلافت عثمانیہ کے سقوط پر انہوں نے قادیان میں گھی کا چراغ جلا کر انگریزوں کے ساتھ جشن منایا اور اپنے اسلام دشمنی کی خوب خوب داد انگریزوں سے وصول کی۔ اس اجلاس میں کسی مقرر نے ان کوان کے کردار کا عملی آئینہ دکھایا تو انہوں نے اعتراض کیا۔ ملاحظہ فرمائیے وہ اعتراض اور اس کا حکیمانہ و مسکت جواب: بقلم ازہر شاہ قیصر:

تاریخی اجلاس میں حضرت حکیم الاسلامؒ کا خطاب

''حضرت حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ نے اثنائے تقریر میں فرمایا'' یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اب جو خلافت کے متعلق رونا رویا جاتا ہے یہ پہلے کیوں نہ رویا جاتا تھا''۔

اس کے متعلق ایک مثال دیتا ہوں تاکہ جواب جلدی سمجھ میں آجائے مثلاً ایک شخص کے پاس چالیس

روپئے تھے اس نے دس روپئے کا تو بازار سے سودا خریدا اور تیس روپئے کسی چور نے چرا لئے۔ اب وہ اپنے نقصان پر روتا چلاتا ہے تو اسے یہ کہے جانا کہاں تک حق بجانب ہے کہ تیس روپیوں کے لئے پہلے تو نہ روتا تھا اب کیوں روتا ہے؟ ارے بھائی پہلے تو روپئے اس کے پاس تھے تو رونے چلانے کی ضرورت نہ تھی۔ اب جب غریب کی چوری ہوگئی تو رونے چلانے اور تلاش کی ضرورت لاحق ہوئی۔

فاضل مقرر نے ایسے ہی اور ایک مثال دی کہ کسی کا لڑکا مکان کی چھت سے گر کر بیہوش ہو گیا، تھوڑی دیر غش میں رہا، بولا نہیں، لیکن جب ذرا رویا تو اس کے والدین یہ معلوم کر کے خوش ہوئے کہ غنیمت ہے کہ مرا تو نہیں، اگرچہ اس کو چوٹیں آئی ہیں پر مرنے سے ہزار درجہ بہتر ہے کہ اس رونے سے اس کی زندگی کا تو ثبوت ملتا ہے۔

ہمارے رونے کا بھی یہی نتیجہ سمجھو اور غنیمت جانو کہ ہم رو چلا کر اپنی زندگی کا ثبوت دے رہے ہیں۔

علیٰ ہٰذا ایک تیسری مثال دیتے ہوئے فرمایا کہ: جھاڑو گھر صاف کرنے کو ہوتی ہے بشرطیکہ قوی رسی سے خوب باندھا گیا ہو، ورنہ کھلی تلّیاں چاہے کتنی زیادہ ہوں بے کار ہیں۔ لہٰذا خلیفہ بجائے رسی کے ہے جس سے مسلمان بندھے رہتے ہیں اور ان کی قوت یک جا ہو کر جھاڑو کی تلّیوں کی طرح مفید پڑتی ہے۔

اجلاس عام کی پہلی نشست ۱۹؍ مارچ میں بعد نماز ظہر منعقد ہوئی۔ اجلاس عام کا نقشہ اور مولانا محمد طاہر صاحبؒ فرزند اصغر حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کی تلاوت اور صدر جلسہ کی تقریر کا خلاصہ نقل کرتے ہوئے مولانا ازہر شاہ قیصر تحریر فرماتے ہیں: ''کھانا کھانے اور نماز ظہر سے فارغ ہونے کے بعد علماء کرام جلسہ گاہ میں تشریف لائے، ہزاروں کی تعداد میں لوگ جمع تھے بمشکل اسٹیج تک رسائی ہوئی۔ قاری عبدالکریم صاحب امرتسری نے قرآن کریم کا رکوع نہایت موزوں لہجے میں پڑھا اس کے بعد یہ تجویز قاضی ظفر الحق صاحب امام جامع مسجد بٹالہ اور بتائید جمیع حاضرین حضرت مولانا حبیب الرحمٰن نائب مہتمم مدرسہ دارالعلوم دیوبند صدر قرار پائے۔ بعد تقرر صدر جناب قاری محمد طاہر صاحب دیوبندی نے رکوع ''وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَ اُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ'' بہترین لہجہ میں پڑھا، ان کے بعد صدر نے حمد و صلوٰۃ پڑھ کر فرمایا: یہ پہلا موقع ہے کہ میں ان متبرک صورتوں کے سامنے اللہ اور رسول کے احکام سنانے کے لئے حاضر ہوا ہوں۔ لہٰذا اس نعمت خداوندی کا میں جس قدر بھی شکر یہ ادا کروں کم ہے۔ میں خود کچھ بھی نہیں مگر ایک ایسی جگہ ''دیوبند'' کی طرف منسوب ہوں جسے دنیا بھر کا مرکز علم تسلیم کیا گیا ہے، میں خود کوئی کمال نہیں رکھتا مگر اس جگہ سے آیا ہوں جس نے فیض علمی

کو دنیا میں پھیلا دیا ہے۔ اسی کے طفیل آپ نے مجھے صدر بنایا ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ان تین روز میں انشاء اللہ آپ بڑے بڑے وعظ سنیں گے، تعارف کے لئے اتنا ہی کہنا کافی ہے اور یہ کہنا بھی مناسب ہے کہ یہاں کسی پر حملہ نہیں کیا جائے گا۔ البتہ مخالفوں کی تردید کی جائے گی۔ امید ہے کہ تمام امور نیک نیتی پر محمول کئے جائیں گے۔ (ماہنامہ دارالعلوم دیوبند ص ۲۹، جنوری ۱۹۷۵ء)

اجلاس کی دوسری نشست میں بعد نماز مغرب حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب سیالکوٹی کا بیان تھا۔ اس اجلاس کا آغاز حضرت حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تلاوت قرآن مجید سے ہوا، اسی طرح ۲۰ مارچ کے اجلاس کی پہلی نشست میں بابو پیر بخش صاحب رحمۃ اللہ علیہ سکریٹری انجمن تائید الاسلام لاہور کا بیان پہلے سے طے تھا اور آپ کا خصوصی مضمون تھا ''اثبات حیات مسیح علیہ السلام'' اس نشست کا آغاز حضرت مولوی محمد طاہر صاحب دیوبندی کی تلاوت قرآن مجید سے ہوا۔ اس نشست میں بابو پیر بخش صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بیان کے بعد حضرت مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسریؒ کا بیان ہوا۔ اس کے بعد پھر حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ بحیثیت مقرر کرسی پر جلوہ افروز ہوتے ہیں۔ اس خطبہ کا اختصار ملاحظہ فرمایئے از ہر شاہ قیصرؒ کے قلم سے تا کہ اس تاریخی خطاب کی تاریخیت وافادیت و معتبریت قلم بدلنے سے مجروح نہ ہو۔

''آپ نے خطبہ متضمن برحمد و صلوٰۃ کے بعد یہ حدیث شریف باتمام پڑھی **بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ شَهَادَةُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الخ**۔ اور فرمایا حضرات! میں مقرر کی صورت میں نہیں بلکہ ایک معمار کی حیثیت سے کھڑا ہوا ہوں اور غالباً کہا جائے گا کہ اس جلسہ میں تو مرزا غلام احمد کے عقائد پر کھے جا رہے ہیں تو کوئی عمارتی جلسہ نہیں۔

ہاں، میں دین الٰہی (ایمان و اسلام) کا ایک زبردست قلعہ بناؤں گا جس کی پناہ میں قرآن وحدیث پر کوئی حملہ نہ کر سکے، نہ کہ مرزا جی کا منارۃ المسیح یا مسجدِ نور۔

جب کوئی عمارت بنائی جاتی ہے تو اس کی بنیادیں حتی الامکان مضبوط کی جاتی ہیں، اگر بنیادیں مضبوط نہ ہوں تو عمارت پائیدار نہیں ہوتی۔ ایسا ہی ایمان و اسلام کا ایک عظیم الشان محل ہے اور وہ یوں بنایا گیا ہے کہ **لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه** سے شروع کیا گیا ہے۔ یہ اس وقت بنایا گیا ہے جب کہ ظلمت و کفر کا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ کہا گیا ہے کہ **تَعَالَوْا اِلٰی كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ** اور وہ کلمہ کیا تھا **اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا**۔

جب حضورؐ کی ذات پاک مبعوث ہوئی تب خدا کو تو لوگ خالق مانتے ہی تھے، البتہ شرک فی العبادات

کرتے تھے کیوں کہ جب ان سے پوچھا جاتا کہ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَیَقُوْلُنَّ اللّٰہَ لہٰذا آپؐ نے سب سے اول جو دیوار اٹھائی وہ نماز ہے کہ اِیَّاکَ نَعْبُدُوَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ اور پھر شرک فی الاستعانت کو دور کرنے کی کوشش کی۔ اب چاہتے کہ ہم سب مل کر ستون دین کو استوار کریں۔ اَلصَّلٰوۃُ عِمَادُ الدِّیْنَ.

دوسری دیوار زکوٰۃ اور تیسری صوم اور چوتھی حج بیت اللہ شریف، گویا چاروں دیواریں قائم کردیں، ہاں وہ دن آنے والا ہے کہ ہم کو یہ قلعہ جس کی نہ اس وقت بنیاد نہ دیوار نظر آتی ہے سب کچھ نظر آنے لگے گا۔ اس کے بعد حدیث بیان فرمائی کہ قیامت میں کوئی محلات نہیں بلکہ جو کچھ خود کرو گے وہی تم کو ملے گا۔ آپ اپنے لئے خود محلات یہاں تعمیر کرسکتے ہیں میں یہ اپنی طرف سے نہیں بلکہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے نقل کرتا ہوں۔ شرح الصدور میں ہے اِنَّمَا النَّاسُ نَیَامٌ اِذَا مَاتُوْا اِنْتَبھُوْا یعنی لوگ سوئے پڑے ہیں جب مریں گے تو متنبہ ہوں گے۔ دنیا کے اموال، مکانات وغیرہ جو دکھائی دیتے ہیں سب خواب کی مثال ہیں، جیسے کوئی خواب دیکھتا ہے لیکن ایسے شخص کو اگر ہتھکڑی ڈال کر جیل بھیج دیا جائے تو اس خواب کا کیا اسے کچھ لطف آسکتا ہے؟ ہرگز نہیں! لہٰذا جس عمارت کا نقشہ میں آپ کے سامنے کھینچ رہا ہوں اس کا انتظام کرلیں اور حسنِ عمل سے مدد کریں، گو ایسا کرنے سے تکالیف اور مصائب کا آنا لازمی ہے مگر اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کہا جائے گا سَلَامٌ عَلَیْکُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْھَا خٰلِدِیْنَ سو یہ چند منٹ کی بات ہوتی ہے اس کے بعد سب کچھ نظر آجاتا ہے یعنی بعد موت کے۔

اس کے بعد آپؐ نے فرمایا کہ جنت کی بابت کہا جاتا ہے بہشت اتنا بڑا کیسے ہوسکتا ہے؟ اسے عام فہم بنانے کے لئے ایک بچے کی مثال بیان کی جو رحم مادر میں ہے اور اسی کی وسعت اور خوبی کی تعریف کرتا ہے، باوجودیکہ اس کی غذا خون ہے مگر جب دنیا میں آکر اپنے ہی مکانات کو دیکھ پاتا ہے تو ان سے زیادہ وسیع اور بہتر دوسری جگہ کو نہیں سمجھتا، فاضل مقرر نے اس وقت مولانا جامیؒ کا ایک شعر پڑھ کر بتایا کہ وہ اس شخص کو اپنے گھر سے باہر جانے کی ترغیب دیتے ہیں کہ قادیان، بٹالہ گورداس پور، لاہور، امرتسر وغیرہ وغیرہ شہروں میں جاکر دیکھیں کہ دنیا کی کیا حالت ہے؟ جب وہ گھر سے نکل کر دوسرے شہروں کی سیر کرتا ہے تب اس کی آنکھ کھلتی ہے اور معلوم کرتا ہے کہ دنیا اس سے بہت بڑی ہے جو کچھ میں سمجھا ہوا تھا، اس کے بعد اس سے کہا جاتا ہے کہ ایک عالم اس سے بھی بڑا ہے اور وہ مَالَا عَیْنٌ رَأَتْ وَ لَا اُذُنٌ سَمِعَتْ تب اس کو کہا جاتا ہے کہ پہلے تم ہمارا کہا نہ مانتے تھے جواب ماننا پڑا۔ لہٰذا اب تم کو حضرت رحمۃ للعالمین کا فرمان بھی ماننا چاہیے یعنی یہ کہ بہشت ایک بہت بڑا وسیع عالم ہے۔

۲۰ مارچ میں اجلاس کی دوسری نشست بعد نماز ظہر رکھی گئی تھی جس میں مناظر اسلام حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب چاند پوری رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہوا، پھر حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب سیالکوٹی کا بیان ہوا اور اخیر میں تحفظ ختم نبوت کے سرخیل سرتاج، ختم نبوت کے عاشق زار، استاذ العلماء، دارالعلوم کے صدرالمدرسین حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کا عالمانہ خطاب ہوا۔

۲۰ مارچ کی بعد نماز ظہر کی نشست میں حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی ثم مہاجر مدنی نوراللہ مرقدہٗ کا خطاب ہونا تھا۔ حضرت کے خطاب سے پہلے اس نشست میں پہلے حضرت حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ اور پھر اس کے بعد آپ کے برخوردار حضرت مولانا محمد طاہر صاحب، حضرت قاسم العلوم کے دونوں نبیروں نے یکے بعد دیگر تلاوت قرآن کریم فرمائی، اس کے بعد حضرت مولانا بدر عالمؒ کا تفصیلی خطاب ہوا، پھر تیسرے دن کے اختتامی اجلاس میں صدر جلسہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ کا صدارتی خطاب ہوا۔

قادیان میں بہت سے قادیانی تائب ہوئے

الحمدللہ اس اجلاس میں علماء دیوبند کے بیانات سے بہت سارے قادیانی قادیانیت سے تائب ہوکر حلقہ بگوش اسلام ہوئے جن میں چودھری سلطان علی صاحب گورداسپور، چودھری برکت علی صاحب داروغہ ضلع گورداسپور، چودھری برکت علی کے بھائی اور حکیم غلام محمد صاحب وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ یہ لوگ بڑے پرانے قادیانی تھے۔ عرصہ دراز سے مرزائی ہونے کی وجہ سے رشتے ناطے بھی قادیانیوں سے خوب تھے لیکن الحمدللہ حق وصداقت کی آواز سن کر بلاخوف لومۃ لائم علماء دارالعلوم دیوبند کے ہاتھوں مرزائیت سے تائب ہوکر دین اسلام میں داخل ہوگئے۔

ناظرین کرام! دارالعلوم دیوبند کے بانیین میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا نمایاں نام آتا ہے۔ یقیناً اس کی بنیاد میں اس کے بانیوں کا اثر ہمہ وقت کارفرما ہے، اس عظیم درس گاہ کی تربیت زندگی کو ایک ایسے رخ پر ڈالنے کی ضامن ہے کہ اس کا فاضل کبھی محدث، کبھی مفسر، کبھی مناظر، گاہے میر کارواں اور گاہے مبلغ دین۔ الغرض دینی خدمات کے لئے ہمہ جہت کوششوں کا امین ہوتا ہے۔ اس درس گاہ سے تربیت یافتہ کوسلیہ پنجاب اور اس کے ہمراہیوں کے مقابل میں فریضہ حق وصداقت ادا کرتے ہوئے میدان میں شمشیر بدست بھی دیکھا جاسکتا ہے اور خانقاہوں کے گوشوں میں بھی مصروف وہ تبلیغ دین کے لئے کمربستہ نظر آئے گا۔

ان روایات پارینہ کی امین حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی بھی تھی۔

اس تاریخی واقعہ سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ تحفظ ختم نبوت کی کوئی نشست حکیم الاسلامؒ اور ان کے برادر خوردار کی تلاوت یا تقریر سے خالی نہیں جاتی۔ ختم نبوت کے تحفظ کی ہمہ جہت خدمت میں دونوں برادران پیش پیش ہوتے ہیں۔ جو اس موضوع سے ان کی دلچسپی کی ایک بین دلیل ہے۔

تحفظ ختم نبوت کے میدان میں خاص اس نام سے تو نہیں لیکن دیگر موضوعات پر تصنیفات و مضامین کی شکل میں حضرت حکیم الاسلامؒ کی خدمات منظر عام پر داد و تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ آپ کی تحریر عشق نبویؐ سے سرشار اور طرز تحریر کس قدر دل کش ہوتی اور اپنے اندر جاذبیت و معنویت رکھتی ہے کہ فاتح رِبْوَہ، سفیر ختم نبوت، استاذ محترم حضرت مولانا منظور احمد صاحب چنیوٹی نوراللہ مرقدہٗ نے جب ''مرزائیت کے زریں اصول'' پر نظر ثانی فرمائی تو مسئلہ ختم نبوت کی وضاحت میں ایک موقع پر حضرت حکیم الاسلام کی ایک مقبول عام تصنیف ''آفتاب عالم'' کا ایک پورا اقتباس حضرت حکیم الاسلامؒ کے ہی حوالہ سے اپنی کتاب میں شامل فرما دیا جس کا ایک ایک لفظ اور ہر ہر جملہ کی ترتیب جہاں عشق نبوی ﷺ کی خوشبو ٹپکتی ہے وہیں عدم اجراء نبوت کی دلیل بن کر مرزائیوں کے سینہ پر برق تپاں کی طرح گرتی اور مرزائیوں کے مکر و فریب کے سارے تانے بانے خاکستر کرتی نظر آتی ہے۔ ایک طرح حضرت چنیوٹی نے اپنی مسلمہ تاریخی کتاب میں شامل کر کے اس اقتباس کو بھی تاریخی حیثیت کا حامل بنا دیا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے ''تشبیہ کی وجوہات'' عنوان کے تحت تحریر فرماتے ہیں:

''حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب قدس سرہٗ نے تشبیہ کی چند وجوہات ذکر کی ہیں۔ وہ ہدیۂ قارئین ہیں۔

(۱) جس طرح دنیا کی مادی زندگی، کون و مکان کی روشنی، حرارت، زندگی کے لوازمات، نباتات کی نشو و نما، سورج کے وجود کے ساتھ مشروط ہے اسی طرح روح کی نشو و نما، حرارت ایمانی، علم، اخلاق، معرفت الٰہی، قلبی واردات کی گرم بازاری بھی صرف آنحضرت ﷺ کی وجہ سے ہے۔

(۲) جس طرح مادی آفتاب کے لئے ایک محور کی ضرورت ہے جس پر وہ حرکت کرے اور وہ فلک ہے اسی طرح روحانی آفتاب کے لئے بھی نبوت کا آسمان مرکز اور محور ہے۔

(۳) جب سورج نہیں رہتا تو اندھیرا چھا جاتا ہے۔ مصنوعی روشنیاں اندھیرا دور نہیں کر سکتیں۔ جب تاریکی بہت ہو جائے تو ستارے نکلتے ہیں۔ پورا آسمان جگمگا اٹھتا ہے۔ پوری کائنات میں ہلکی روشنی آجاتی ہے پھر سورج نکلتا ہے تو اندھیرا مکمل طور پر بھاگ جاتا ہے۔ بعینہٖ اسی طرح جب کائنات میں ظلم، شرک،

جہالت، نفسانی خواہشات اور شبہات کے اندھیرے چھا گئے تھے تو حضرت آدم سے لے کر حضرت عیسیٰ تک لاکھوں پیغمبر آسمان نبوت پر ستاروں کی طرح طلوع ہوئے لیکن لاکھوں ستارے مل کر بھی رات کو دن نہیں بنا سکتے۔ رات کی تاریکی دور کرنے کے لئے آنحضرت ﷺ آسمان نبوت پر نمودار ہوئے۔ تاریکیاں چھٹ گئیں، خزاں بہار سے بدل گئی۔

(۴) جس طرح سورج طلوع ہونے کے بعد ستاروں کے ظلی اور فروعی نور کی کوئی حاجت نہیں رہتی، ایسے ہی خاتم النبیین ﷺ کے آجانے کے بعد کسی بھی نجم ہدایت (پیغمبر) کے نور کی حاجت نہیں رہتی۔

(۵) جس طرح سورج تمام ستاروں کے بعد آخر میں نکلتا ہے تا کہ نورانیت کی ہر پچھلی کمی پوری کردے ایسے ہی حضرت خاتم الانبیاء ﷺ کو آخر الانبیاء بھی بنایا گیا تا کہ آپ کا زمانہ بھی سب نبیوں کے آخر میں رہے تا کہ آخری عدالت کا فیصلہ، ہر ابتدائی عدالت کے فیصلوں کے لئے حرف آخر اور ان کے حق میں ناسخ ثابت ہو۔

............❖............

حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ اور مسئلہ اجتہاد

پروفیسر الطاف احمد اعظمی
ہمدرد یونیورسٹی، دھلی

اجتہاد کا مسئلہ تقریباً ہر دور میں امت کے اربابِ فکر ونظر کے درمیان بحث وتحقیق کا موضوع رہا ہے۔ اس باب میں اب دو مختلف مکتبِ فکر وجود میں آچکے ہیں۔ ایک مکتب فکر اس بات کا قائل ہے کہ اجتہاد ہر دور میں ضروری ہے۔ اجتہاد سے اس کی مراد اجتہادِ مطلق مستقل ہے۔ وہ اس بات کو تسلیم نہیں کرتا کہ چوتھی صدی ہجری کے بعد اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی زندگی اور اس کے مختلف ادارات کے احوال ومسائل برابر بدلتے رہے ہیں اور آئندہ بھی بدلتے رہیں گے، اس لئے کسی ایک دور کا اجتہاد اور اس پر اس دور کے علماء وفقہاء کا اجماع کافی نہیں ہے۔ اس مکتب فکر کے سب سے بڑے حامی علامہ ابن حزمؒ اور امام ابن تیمیہؒ تھے۔ موخر الذکر نے، جو حنبلی مسلک رکھتے تھے، تیرہویں صدی عیسوی کے اوائل میں اسلامی قانون سازی میں حرفِ آخر (Finalily) کے تصور کی مخالفت کی اور علامہ ابن حزمؒ کی طرح فقہ حنفی کے اصولِ قیاس واجماع (analogy and consensus) کو رد کردیا۔(۱)

اس کے برخلاف دوسرے مکتب فکر کا خیال ہے کہ چوتھی صدی یعنی فقہ کے دبستانِ اربعہ کی تشکیل و تدوین کے بعد اجتہادِ مطلق مستقل کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ ہاں، اگر اشد ضرورت داعی ہو تو اس سے کم تر درجے کے اجتہاد کو ائمۂ فقہ کے مقرر کردہ اصول وقواعد کی روشنی میں روبہ عمل لایا جاسکتا ہے۔ اس اجتہاد کا مطلب ائمہ فقہ کے مستخرجہ جزئیات میں ترجیح انتخاب ہے، نہ کہ ان جزئیات سے صرف نظر کرکے بالکل

نئے سرے سے نصوصِ قرآن وسنت کے مطابق نئے عملی جزئیات کا استخراج۔ اس نوع کے اجتہاد کا نام فقہ کی اصطلاح میں اجتہاد فی الفتویٰ ہے (۲)۔

یہ سوال بہت اہم ہے اور برابر اٹھایا گیا ہے کہ آخر چوتھی صدی کے بعد اجتہاد مطلق مستقل کی اجازت کیوں نہیں ہے؟ اس سوال کا جواب بالعموم یہ دیا جاتا ہے کہ بعد کے ادوار میں ایسے افراد اگر نایاب نہیں تو کم یاب ضرورت تھے جو ائمہ سلف کی سی دقّت نظر اور علمی رسوخ رکھتے ہوں۔ ان حالات میں اجتہادِ مطلق کی اجازت دینے کا مطلب دین میں بدعت وضلالت اور تحریف والحاد کا دروازہ کھولنا تھا۔ امت کی جماعتی اور مذہبی زندگی کی شیرازہ بندی اور اس کو مذہبی اختلاف وتشتّت سے محفوظ رکھنے کے لئے نہایت ضروری تھا کہ اجتہادِ مطلق پر روک لگائی جائے۔ عالمانِ کوتاہ نظر کے اجتہادات کی پیروی سے زیادہ اچھی بات یہ ہے کہ ائمہ سلف کے اجتہادات کی تقلید کی جائے، جن کے علم وعمل دونوں معتبر تھے۔ علامہ اقبال نے اپنی مشہور شعری تالیف ''جاوید نامہ'' میں اس طرزِ فکر کی حمایت کی ہے (۳)

چند اشعار ملاحظہ ہوں ؂

مضمحل گردد چو تقویمِ حیات — ملت از تقلید می گیرد ثبات
راہِ آبا رَو کہ ایں جمعیت است — معنیٔ تقلید ضبطِ ملّت است
درخزاں ای بے نصیب از برگ و بار — از شجر مگسل بامیدِ بہار
پیکرت دارد اگر جانِ بصیر — عبرت از احوالِ اسرائیل گیر
نقش بردل معنیٔ توحید کن — چارہ می کارِ خود از تقلید کن
اجتہاد اندر زمانِ انحطاط — قوم را برہم ہمی پیچد بساط
ز اجتہادِ عالمانِ کم نظر — اقتدا بر رفتگانِ محفوظ تر

اس اختلاف کے پس منظر میں دیکھنا ہے کہ اس مسئلے میں حکیم الاسلام کا نقطۂ نظر کیا تھا اور مذکورہ بالا مکاتبِ فکر میں سے کس مکتبِ فکر سے تعلق رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں راقم سطور نے ان کی متفرق تحریروں کو دیکھا تو جس تحریر نے دامنِ نظر کو شدت کے ساتھ اپنی طرف کھینچا وہ ان کا خطبۂ صدارت ہے جو انہوں نے ۲۶؍دسمبر ۱۹۷۶ء کو ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں منعقدہ سیمینار میں پیش فرمایا تھا۔ اس سیمینار کا موضوع تھا ''فکرِ اسلامی کی تشکیل جدید کا مسئلہ''۔ میری نظر میں اس خطبے کی بڑی اہمیت ہے۔ اس میں فکر ودانش کے موتی جابجا بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ اس کی ایک ایک سطر سے عیاں ہے کہ وہ مسئلہ

اجتہاد کے ہر پہلو سے کامل واقفیت رکھتے تھے۔ان کی نگاہ بڑی باریک بیں اور نکتہ رس تھی۔

اصولی طور پر حکیم الاسلامؒ عصر جدید کے پیچیدہ احوال ومسائل کے پیش نظر اجتہاد کے قائل تو تھے لیکن اس بارے میں بہت حساس اور محتاط واقع ہوئے تھے۔ان کے نزدیک اجتہاد کا تعلق عقائد وعبادات سے نہیں، صرف معاشرتی وسیاسی اور اجتماعی معاملات سے ہے۔فرماتے ہیں:

''قواعدِ کلیہ میں جو ضوابط عبادات اور عقائد کے بارے میں ہیں ان کی عملی جزئیات بھی شریعت نے خود متعین کردی ہیں، اس لئے اس میں تغیر، تبدل یا کسی جدید تشکیل کا سوال پیدا نہیں ہوسکتا۔البتہ معاملاتی، معاشرتی اور سیاسی واجتماعی امور میں چوں کہ زمانے کے تغیرات سے نقشے ادلتے بدلتے رہتے ہیں اس لئے شریعت نے ان کے بارے میں کلیات زیادہ بیان کی ہیں اور ان کی جزئیات کی تشخیص کو وقت کے تقاضوں پر چھوڑ دیا ہے، جن میں اصول وقواعد کے تحت توسّعات ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔'' (۴)

اس سلسلے میں انہوں نے دو بنیادی امور کی طرف اصحابِ تعلیم کی توجہ مبذول کرائی ہے۔ایک یہ کہ اللہ نے انسان کو فکر کی قوت عطا فرمائی ہے اور یہ اس کی ایک بڑی نعمت ہے۔یہی جوہرِ گراں مایہ انسان کو حیوانات سے ممتاز کرتا ہے اور اس کو ایجاد واختراع کی طرف مائل کرتا ہے۔مولانا کی یہ بحث بڑی جامع اور فکر انگیز ہے۔دوسرے یہ کہ اسلام نے اپنے ماننے والوں کو بعض پابندیوں کے ساتھ آزادئ ضمیر اور حریت رائے عطا کی ہے اس خصوصیت میں کوئی دوسرا مذہب اس کا حریف نہیں ہے۔

دین کے اس امتیازی وصف کے اثبات میں انہوں نے اقامتِ صلوٰۃ (امامتِ صغریٰ) اور قیامِ خلافت (امامتِ کبریٰ) کو پیش فرمایا ہے۔دین کے ان دو مختلف ادارات کے ترکیبی عناصر اور ان کی تنظیمی ہیئت سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اپنے پیروؤں کی جن میں ان کے حاکم بھی شامل ہیں، تعلیم و تربیت کس طرح کرتا ہے اور ان کو کس نوع کا دینی وملی مزاج عطا کرتا ہے اور کس درجہ حکیمانہ طریقے سے انہیں قید وآزادی کے حدود سے آشنا کرتا ہے۔اس دلچسپ بحث کو خود انہی کے لفظوں میں ملاحظہ کیجئے۔

''امامتِ صغریٰ (جماعت صلوٰۃ) کے جو طور طریقے رکھے گئے ہیں وہی نوعی طور پر امامت کبریٰ اور اسٹیٹ میں بھی ہیں۔اس میں صورت حال کے تحت دیکھا جائے تو نماز کے مقتدیوں کو امام کا بھی پابند انتہائی طور پر کیا گیا ہے، مقتدی اس سے ذرا بھی منحرف ہو تو اس کی نماز صحیح نہیں ہوسکتی۔چنانچہ اس مسجد کی امارت اور اسٹیٹ مقتدیوں پر فرض ہے کہ جب امام نیت باندھے تو مقتدی بھی ساتھ ساتھ نیت کرکے ہاتھ باندھیں، وہ قیام میں ہو تو یہ بھی قیام کریں، وہ رکوع کرے تو یہ بھی رکوع کریں، وہ قیام میں جائے تو یہ بھی

قیام کریں، سجدے میں جائے تو یہ بھی سربسجود ہو جائیں، وہ ''ولا الضالّین'' کہے تو یہ آمین کہیں، حتیٰ کہ اگر امام سے سہواً کوئی جزئی غلطی بھی سرزد ہو جائے اور وہ سجدۂ سہو کرے تو مقتدی بھی اس کی خطا میں ساتھ دیں اور سجدۂ سہو کریں۔ لیکن حریت و آزادی یہ ہے کہ اگر امام قرأت یا افعال صلوٰۃ میں کوئی ادنیٰ سی بھی غلطی کر جائے تو ہر مقتدی کو نہ صرف ٹوک دینے کا حق ہے بلکہ مقتدی اس وقت تک امام کو چلنے نہیں دے سکتے جب تک وہ اپنی غلطی کی اصلاح نہ کرے، بعینہٖ یہی صورت امامت کبریٰ یعنی اسٹیٹ اور ریاست کی بھی ہے کہ امیر المؤمنین کی سمع و طاعت تو ہر معاملے میں واجب ہے ورنہ تعزیر و سزا کا مستحق ہوگا۔ لیکن ساتھ ہی خود امیر کی کسی خطا و لغزش پر ایک عامی سے عامی آدمی بھی برملا روک ٹوک کرنے کا حق رکھتا ہے، جب تک کہ امیر اس فعل کی اصلاح نہ کرلے یا اس کا کوئی صحیح عذر سامنے نہ رکھے (۵)۔''

بطور مثال انہوں نے اس مشہور واقعے کا ذکر کیا جس کا تعلق خلیفۂ ثانی سے ہے کہ ایک بار وہ منبر پر کھڑے ہوئے اور کہا: اسمعوا و اطیعوا ''سنو اور اطاعت کرو'' یہ سن کر ایک بدّو کھڑا ہو گیا اور کہا ''ہرگز نہیں، پہلے یہ بتاؤ کہ یہ چادر جو تم نے اوڑھ رکھی ہے کس طرح تیار ہوئی؟ جب ان کے بیٹے (عبداللہ بن عمرؓ) نے معاملے کی وضاحت کی تو بدو مطمئن ہو گیا اور پھر بولا ''اب ہم سنیں گے بھی اور اطاعت بھی کریں گے''۔(۶)

اس بحث سے ان کا مقصود جیسا کہ راقم نے سمجھا ہے، یہ نکتہ ذہن نشین کرانا ہے کہ اسلام میں نہ مطلق پابندی ہے اور نہ ہی مطلق آزادی، یہ دونوں کا مرکب ہے۔ اس میں اگر تقلید ضروری ہے تو حریت رائے کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ جب دین اسلام کا یہ مزاج ہے کہ امام نماز اور خلیفۂ وقت کو کسی غلطی کے ارتکاب کی صورت میں ٹوکا جا سکتا ہے تو پھر کسی مجتہد سے، اگر وہ کسی فکری خطا کا مرتکب ہو یا اس کی فکر زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہ ہو، اختلاف بالکل جائز ہوگا لیکن جس طرح امام نماز اور خلیفہ کو ٹوکنے کا مجاز صرف وہ شخص ہے جو صلوٰۃ اور کارِ خلافت میں شریک ہو، اسی طرح کسی مجتہد عالم کی رائے اور فکر سے اختلاف اور اس کی اصلاح کا حق ہر کس و ناکس کو نہیں بلکہ صرف ان اشخاص کو حاصل ہے جو قرآن و سنت کے فہم و درک میں رسوخ رکھتے ہوں۔

حکیم الاسلامؒ نے مسئلہ اجتہاد کے جس دوسرے پہلو پر بتکرار روشنی ڈالی ہے وہ اسلامی شریعت کے اصول اور اس سے مستنبط جزئیات میں باعتبار تغیر فرق کی نوعیت ہے۔ اصول و کلیات ناقابل تغیر ہیں اور اس پر جملہ علماء و فقہاء کا اتفاق ہے لیکن کیا جزئیات بھی جن کا تعلق معاملات سے ہو، حالات و ظروف کی تبدیلی کے باوجود قابل تبدّل ہیں؟ حکیم الامتؒ کا رجحان نفی کی طرف ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''احوال ہمیشہ بدلتے رہے ہیں اور بدلتے رہیں گے۔ حال کے معنی ہی ماحال فقد زال کے ہیں (یعنی جو حال آیا وہ زائل بھی ہوگا) پس حال تو بدلنے ہی کے لئے بنایا گیا ہے۔ لیکن اصولِ فطرت بدلنے کے لئے نہیں لائے گئے ہیں، وہ اپنی جگہ اٹل ہی رہیں گے، البتہ ان شرعی اصولوں میں ایسی وسعتیں رکھی گئی ہیں کہ وہ ہر بدلتی ہوئی حالت میں وقت کے مناسب رہنمائی کرسکیں۔(۷)

ایک دوسری جگہ انہوں نے لکھا ہے کہ ''ان اصولوں کی وسعتوں میں ایسی گنجائش بھی رکھی گئی ہے کہ ان سے ہر دور کے مفکر اور اہل علم وفضل نے استخراجِ مسائل کی حد تک کام بھی لیا ہے اور آج بھی لے سکتے ہیں، جن میں ہر دور کے حوادث کے لئے سامان ہدایت موجود ہے۔ اس لئے تمدن و معاشرت کی مشخص عملی جزئیات اور سننِ زائدہ پر اس قانون فطرت نے زیادہ زور نہیں دیا بلکہ اسے وقت اور زمانے کے حوالے کر دیا ہے جو ہر زمانے میں نئی نئی صورتیں بدلتی رہتی ہیں، انہیں اہل علم ان کے اصولوں سے وابستہ کر کے ان کے احکام نکال سکتے ہیں۔''(۸)

لیکن اس عبارت سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ حکیم الاسلامؒ اجتہادِ مطلق کے حامی تھے۔ صحیح بات یہ ہے کہ وہ دیگر حنفی فقہاء وعلماء کی طرح اس نوع کے اجتہاد کے منکر تھے۔ انہوں نے جس طرح کے اجتہاد کی تائید کی ہے اس کا تعلق ائمہ فقہ کے مستخرجہ جزئیات میں ترجیح وانتخاب ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ائمہ سلف نے قرآن وسنت کے نصوص کی روشنی میں خوب غور وفکر کر کے عملی جزئیات مقرر کر دئے ہیں حتی کہ بعید سے بعید تر محتملات کے بھی جزئیات کا تعین کر دیا ہے اس لئے فکر ونظر کی سلامتی اس میں ہے کہ ان پر اعتماد کیا جائے۔ لکھتے ہیں:

''ہر دور کے حوادث میں نوعی طور پر یکسانی ہوتی ہے گو حادثوں کی شکلیں حسب زماں ومکاں کچھ جدا جدا بھی ہوں، اس لئے وہی جزئیات (جو پہلے نکالی جاچکی ہیں) آج کے حوادث میں بھی بے کار ثابت نہیں ہوسکتیں اور کچھ نہیں تو آج کی جزئیات کو کم ازکم ان پر قیاس تو ضرور ہی کیا جاسکتا ہے، بلکہ بہت ممکن ہے کہ فقہیات میں ایسی جزئیات بکثرت مل جائیں جو آج کے دور میں بھی سابق دور کی طرح کارآمد ثابت ہوں اور حالات کا مقابلہ کرسکیں۔ ضرورت اگر ہوگی تو باب وار تلاش وجستجو کی ہوگی۔ یہ جزئیات چوں کہ فقیہانہ ذہنوں سے نکلی ہوئی ہیں اس لئے بہ نسبت ہماری استخراج کردہ جزئیات کے منہاجِ نبوت سے زیادہ قریب ہوں گی۔ اس لئے بجائے اس کے کہ ہم ازسرِ نو قواعدِ کلیہ سے جزئیات کا استنباط کرنے کی مشقت میں پڑیں یہ زیادہ سہل ہوگا کہ استخراج شدہ جزئیات کی تلاش وترتیب میں وہ محنت ومشقت استعمال کریں۔''(۹)

یہ کام یقیناً بہت اہم ہے کہ اور اربابِ فقہ کو یہ کام کرنا چاہئے کہ جس کی طرف اب تک توجہ نہیں ہوئی ہے یا بہت کم ہوئی ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جدید تہذیب وتمدن نے بہت سے ایسے مسائل وحوادث جنم دیئے ہیں جن کا وجود ماضی میں نہیں ملتا۔ اس کے علاوہ کچھ ایسے سماجی واجتماعی مسائل سے بھی امت دوچار ہے جو نئے تو نہیں لیکن ان کی شکل وصورت کافی تبدیل ہوگئی ہے اور ان کے لئے ایک نیا اطلاقی قالب درکار ہے۔ ان مسائل سے پہلو تہی کرنے یا اجتہاد فی الفتویٰ میں ان کا حل ڈھونڈنے کے معنی یہ ہوں گے کہ اسلامی فکر جامد ہے اور اسلام کے قوانین میں حرکت پزیری کی صلاحیت کا فقدان ہے، جیسا کہ اس کے مخالفین کہتے ہیں۔

لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ بڑا کام کون کرے؟ علماءِ سلف نے ایک مجتہد کے لئے جو شرطیں رکھی ہیں جن کے بغیر اجتہاد کے کوچے میں قدم رکھنے سختی کے ساتھ ممانعت ہے، وہ بڑی کڑی شرطیں ہیں اور ان کا کسی ایک فرد میں جمع ہونا اگر محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ بعض علماء نے ان میں کچھ تخفیف بھی کی ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنی معروف کتاب ''عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید'' میں علامہ بغوی کے حوالے سے لکھا ہے:

''ولا بأس ان یورد کلام البغوی فی ھذا الموضع. قال البغوی والمجتھد من جمع خمسة انواع من العلم: علم کتاب اللّٰہ و علم سنة رسول اللّٰہ و علم اقاویل علماء السلف من اجماعھم واختلافھم وعلم اللغة وعلم القیاس وھو طریق استنباط الحکم عن الکتاب والسنّة إذا لم یَجِدْہ صریحا فی نصِّ کتاب أو سنة أو إجماع الخ.(۱۰)

'' کچھ مضائقہ نہیں کہ اس جگہ (شرط اجتہاد کے بیان میں) بغوی کا قول ذکر کیا جائے۔ بغوی نے کہا ہے کہ مجتہد وہ عالم ہے جو پانچ شرطوں کا جامع ہو۔ اول کتاب اللہ کا علم، دوم رسول اللہ کی سنت کا علم، سوم علماء سلف کے اقوال کا علم کہ ان کا اتفاق کس قول پر ہے اور کس قول میں اختلاف ہے، چہارم علم لغت، پنجم علمِ قیاس اور یہ ایک طریقہ ہے جب قرآن وسنت اور اجماع میں حکم مذکور صریحاً نہ پائے''۔ الخ

امت کی موجودہ ذہنی وفکری حالت کے پیش نظر اب ایک ہی صورت ہے کہ اجتہاد کا کام انفرادی کے بجائے اجتماعی طور پر انجام دیا جائے، یعنی علماء وفقہاء کی ایک ایسی جماعت یہ کام کرے جو مذکورہ شرطوں کو بدرجۂ اتم پورا کرتی ہو۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ضروی ہے کہ اس جماعت میں ایسے افراد شامل ہوں جو جدید علوم وفنون میں مہارت رکھتے ہوں کیوں کہ عصر جدید کے بعض مسائل کی تفہیم کے لئے جدید علوم کی طرف

مراجعت کے بغیر چارہ نہیں۔

حکیم الاسلامؒ اس عصری ضرورت سے پوری طرح آگاہ تھے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ ''اس سلسلے میں کٹھن مرحلہ ایسی جامع شخصیتوں کی فراہمی ہے جو شرعیات اور عصریات میں یکساں حذاقت و مہارت کی حامل ہوں۔ عموماً اور اکثر و بیشتر ماہرین شرعیات، عصریات سے کچھ نابلد اور موجودہ دنیا کی ذہنی رفتار اور اس کے گوناگوں نظریات سے بے خبر ہیں اور ماہرینِ عصریات اکثر و بیشتر شرعیات سے ناآشنا ہیں، ان حالات میں درمیانی صورت یہی ہوسکتی ہے کہ فکر اسلامی کی تشکیل کے لئے دونوں طبقوں کے مفکرین کی مختصر اور جامع کمیٹی بنائی جائے، جس میں یہ دونوں طبقے اسلام کے تمدّنی، معاشرتی اور سیاسی مسائل میں اپنے اپنے علوم کے دائروں میں غور و فکر اور باہمی بحث و تمحیص سے کسی فکرِ واحد پر پہنچنے کی سعی فرمائیں (۱۱)۔''

ان کا یہ بھی خیال ہے کہ جو جماعت یہ کام کرے اس کے تمام افراد ایسے ہوں جو علم و فنون میں جامعیت کے ساتھ ایمانی مزاجی اور اسلامی طرزِ فکر کے حامل ہوں ورنہ تشریع میں نفس غیر پاکیزہ کی فتنہ انگیزی سے مامون ہونا نہایت مشکل ہوگا۔ وہ خود بھی گم راہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی زیغ و ضلالت میں مبتلا کریں گے۔ انہوں نے کسی لاگ کے بغیر موجودہ صورتِ حال کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھا ہے:

''یہ ایک حقیقت ہے کہ مربی اور معلم یا مصلحِ فکر اگر خود صحیح المنہاج ہوگا تو وہی قلوب کی صحیح رہنمائی کر سکے گا ورنہ خود اگر اس منہاج کا فکر لئے ہوئے نہ ہو یا قلب کا کوئی زیغ اور کجی لئے ہوئے ہو تو کتاب و سنت سے بھی وہ اسی زیغ ہی کو سامنے لا کر دوسرے قلوب میں بھر دے گا۔ آخر مسلمانوں میں آج کتنے متضاد فرقے ہیں جو قرآن کو اپنا امام تسلیم کرتے ہیں اور اسی کا نام لے کر اپنی اپنی فکر دنیا کے سامنے رکھتے ہیں۔ در آں حالیکہ ان متضاد فرقوں میں کوئی ایک ہی حق و صواب پر ہوسکتا ہے، سب کے سب اس تضادِ فکر کے ساتھ محقق نہیں کہلائے جا سکتے (۱۲)''

متذکرہ بالا بنیادی امور کے ذکر کے بعد حکیم الاسلامؒ نے ان اساسی اصولوں کی ایک اجمالی فہرست پیش کی ہے جو اسلامی تشریع کا ماخذ و مصدر ہیں۔ انہی اصولوں کی رہنمائی میں علماء سلف اور مفکرینِ ملت نے ہر دور کے متفرق مسائل اور معاملات کا حل تلاش کیا اور شریعت کے عملی جزئیات مستنبط کئے۔ آئندہ بھی یہی اصول ہر طرح کے انفرادی و اجتماعی مسائل کی گرہ کشائی میں اطمینان بخش طور پر کلیدی کردار ادا کریں بشرطیکہ ان اصول و کلیات کی تفہیم میں کوئی غلطی واقع نہ ہو۔ اس مختصر مقالے میں اِن تمام اصولوں کا ذکر ممکن نہیں ہے۔ یہاں صرف ایک اصول کا ذکر کروں گا، جس سے اسلام میں تشریع کی روح اور اس کے کلّی

مزاج کا واضح طور پر اظہار ہوتا ہے۔ یہ اصول قرآن کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (سورہ حج: ۷۸)

''اس نے دین میں تمہارے لئے کوئی تنگی نہیں رکھی ہے۔''

مولاناؒ نے اس قرآنی اصول کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے: ''اسلام کا مزاج دین کے بارے میں ضیق اور تنگی کا نہیں بلکہ فراخی کا ہے۔ معذوروں کو مجبور نہیں کیا جاتا بلکہ اس کے مناسب حال راہ نکالی جاتی ہے۔'' (۱۳)

مذکورہ بالا اصول کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اصول و کلّیات سے مستخرجہ وہی جزئیات (ذیلی قوانین) معتبر ہوں گے جو مقاصدِ شریعت سے پوری طرح ہم آہنگ ہوں۔ ان میں رحمت ہو، زحمت نہ ہو، آسانی ہو، تنگی نہ ہو، نفع بخشی ہو، ضرر رسانی نہ ہو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ عقلِ سلیم اور فطرت کے موافق ہوں، مخالف نہ ہوں۔ اگر کسی اجتہاد میں خواہ وہ قدیم اجتہاد ہو یا جدید، یہ خصوصیت نہ ہو تو اس پر حقیقی معنی میں اسلامی قانون کا اطلاق نہ ہوگا۔

ہم نے گزشتہ صفحات میں اجتہاد کے بارے میں حکیم الاسلامؒ کے خیالات کا جو اجمالی جائزہ لیا ہے اس سے واضح ہو گیا کہ وہ اس باب میں بعض میں ذہنی تحفظات کے باوجود کھلا ہوا ذہن رکھتے تھے اور اس مسئلے کو وسیع تناظر میں دیکھنے کے قائل تھے۔ ان کے الفاظِ ذیل بڑے بصیرت افروز اور اس بحث کا خلاصہ ہیں:

''فکر ہی انسان کی امتیازی صفت ہے، فکر ہی انسانی حقیقت کی فصلِ ممیّز ہے، فکر ہی سے علم و معرفت کے دروازے کھلتے ہیں، فکر ہی انسان کی ظاہری اور باطنی قوتوں کا امام اور سربراہ ہے۔ اگر فکر اسلام میں مطلوب نہ ہوتا تو اجتہاد کا دروازہ کلّیۃً مسدود ہو جاتا اور شرائعِ فرعیہ امت کے سامنے نہ آسکتیں۔ یہ بحث الگ ہے کہ کس درجہ کا اجتہاد باقی ہے اور کس درجہ کا ختم ہو چکا ہے، مگر اجتہاد کی جنس بہرحال امت میں قائم رکھی گئی ہے جو برابر قائم رہے گی۔'' (۱۴)

............❖............

(1) The Reconstruction of Religious Thought in Islam, by Allama Iqbal P. 152

مزید دیکھیں: الطاف احمد اعظمی، اقبال کا تصوّرِ اجتہاد، سرسید فاؤنڈیشن، ۲۵، ص: ۱۲

(۲) شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، عقد الجیّد فی احکام الاجتہاد والتقلید، ص: ۶

(۳) اقبال نے اپنی نثری تصنیف The Reconstruction of Religious Thought in Islam میں اس

خیال سے رجوع کرلیا ہے۔ انہوں نے لکھا ''مزید سماجی انتشار کے خوف سے جو سیاسی زوال کے زمانے میں ایک فطری امر ہے، اسلام کے تقلید پرست علماء نے اپنی ساری توجہ صرف اس بات پر مرکوز کردی کہ کس طرح مسلمانوں کی سماجی زندگی کی وحدت کو انتشار سے محفوظ رکھا جائے۔ اس غرض کے لئے انہوں نے ضروری سمجھا کہ فقہاء سلف نے اسلامی شریعت کی جو تشریح کردی ہے اس سے سر مو انحراف نہ کیا جائے اور نئے خیالات سے پرہیز کیا جائے۔ لیکن وہ یہ بات نہ سمجھ سکے اور عہد حاضر کے علماء بھی اس کو نہیں سمجھتے کہ کسی قوم کی تقدیر کا فیصلہ سماج کی تنظیم سے کہیں زیادہ افراد کی لیاقت اور ان کی فکری قوت پر منحصر ہے۔ (دیکھیں کتاب مذکور، ص ۱۵۱، مزید دیکھیں، اقبال کا تصورِ اجتہاد، ص: ۴۴)

(۴) ضیاء الحسن فاروقی رمشیر الحق، فکر اسلامی کی تشکیل جدید (مجموعۂ مقالات) ص: ۴۳، ۴۴

(۵) ایضاً، ص: ۴۸، ۴۹

(۶) ایضاً، ص: ۹۴

(۷) ایضاً، ص: ۵۳

(۸) ایضاً، ص: ۵۰

(۹) ایضاً، ص: ۴۶

(۱۰) شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، عقد الجیّد فی احکام الاجتہاد والتقلید، ص: ۴، ۵

(۱۱) ضیاء الحسن فارقی رمشیر الحق، فکر اسلامی کی تشکیل جدید، ص: ۵۲

(۱۲) ایضاً ص: ۶۱

(۱۳) ایضاً، ص: ۵۷

(۱۴) ایضاً، ص: ۳۹

مقاماتِ مقدسہ
تصنیف حضرت حکیم الاسلامؒ: ایک تاریخی جائزہ

پروفیسر محمد عزیز الدین حسین
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دھلی

تمام مذاہب سے متعلق لوگوں کو اپنے مذہب کے مقامات مقدسہ سے دلچسپی ہوتی ہے۔ وہی دلچسپی مولانا محمد طیب صاحبؒ کو تھی جب کہ مولانا محمد اسلم صاحب کے بیان سے ظاہر ہے ''۱۷؍جولائی ۱۹۸۳ء کو صبح ساڑھے آٹھ بجے احقر کے ساتھ آخری کچھ مزید تفصیلات ذہن میں آرہی ہیں اس لئے وہ مسودہ ذرا مجھے لادو۔ مجھے تامل ہوا کیوں کہ ضعف ونقاہت اس حد تک پہنچ چکا تھا کہ خود سے لیٹنا بیٹھنا بھی ممکن نہیں رہا تھا۔ میں نے اپنے تامل کا اظہار بھی کر دیا مگر فرمایا نہیں ایسے کاموں سے کوئی تعب نہیں ہوگا، مسودہ اور قلم مجھے لادو مگر گیارہ بج کر دس منٹ پر حضرت حکیم الاسلامؒ جان، جان آفرین کے سپرد کر چکے تھے''۔(۱)

مقامات مقدسہ سے دلچسپی کا عالم یہ تھا کہ زندگی کے آخری لمحات میں مقامات مقدسہ ذہن وفکر کا حصہ تھے۔ تیرہویں صدی عیسوی میں ہندوستان میں مسلمانوں کے قیام کے بعد علماء ومشائخ کی دلچسپی کا مرکز مقامات مقدسہ رہے اور یہ روایت رہی کہ علماء ومشائخ مقامات مقدسہ کی زیارت کے لئے جاتے۔ بعض نے اپنے سفرنامے بھی لکھے۔ مشائخ ہند میں حضرت سید مخدوم جہانیانِ جہاں گشت سید جلال الدین کئی مرتبہ حج وزیارت مقامات مقدسہ کے لئے گئے اور اپنا ''سفرنامہ'' بھی لکھا جس میں مکہ، مدینہ، شام اور کربلا کا تذکرہ موجود ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں کے دل میں اسلام کے مقاماتِ مقدسہ کی عظمت تو تھی ہی لیکن انہوں نے ملتان کو ایک مرکز بنایا اور اس کا نام قبۃ الاسلام رکھا۔ دہلی کو انہوں نے حضرت دہلی کا نام دیا اور جو جامع مسجد مہرولی

میں تعمیر کی اس کا نام قوت الاسلام رکھا۔ اجمیر جو چشتی سلسلہ کا مرکز بنا اس کا نام دارالخیر رکھا۔ چودہویں اور پندرہویں صدی عیسوی میں تو مقامات مقدسہ کا ذکر ہندوستانی علماء ومشائخ کے تذکروں اور سفرناموں میں ملتا ہے۔ لیکن بعد میں اس طرف توجہ بہت کم ہوگئی۔ ہندوستان میں بھی مسلمانوں کا بڑا اہم کارنامہ مساجد، مدارس اور خانقاہوں کا قیام تھا جہاں سے انہوں نے اسلام کی تبلیغ کی اور اس لحاظ سے ہندوستان کے یہ اہم مقدس مقامات کہلائے۔ ہندوستان میں برٹش راج کے قیام کے بعد انگریزوں نے مسلمانوں کے ان آثار میں دلچسپی لینا شروع کی اور میجر ولیم فرینکلس کی خواہش پر شیام پرشاد نے کیفیات ومکانات گوڑ اور لکھنوتی ۱۸۱۰ میں قلم بند کیے (۲)۔ جس میں اسٹیفن لوشنگٹن نے ۱۸۲۵ میں کالج کے طلبہ سے دو کتابیں آثارِ آگرہ پر لکھوائیں۔ تاریخ آگرہ (۳) اور تفریح العمارات (۴) آگرہ کے آثار سے متعلق لکھوائیں پھر چارلس تھیوفلس مٹکاف اور ولیم فریزر نے مرزا سنگین بیگ کو مشورہ دیا کہ وہ دہلی کے آثار پر کتاب لکھیں جس کے نتیجے میں سنگین بیگ نے ۱۸۲۷ سیر المنازل (۵) لکھی پھر سرسید نے دہلی کے آثار قدیمہ پر آثار الصنادید ۱۸۴۷ میں لکھی، ان کو کسی انگریز نے مشورہ نہیں دیا بلکہ ان کا محرک یہ شعر تھا ؎

از نقش و نگار در دیوار شکستہ آثار پدیدست صنادید عجم را

اردو زبان میں تاریخ نگاری کی صحت مند روایت سرسید نے ڈالی اور آثار الصنادید لکھ کر ان مساجد، مدارس، خانقاہوں، درگاہوں کو محفوظ کر دیا۔ مولانا محمد طیب صاحبؒ کی ''مقاماتِ مقدسہ'' اردو زبان میں اسی روایت کی کڑی ہے کہ جس کی بنیاد سرسید احمد خاں نے ڈالی تھی۔ ''مقاماتِ مقدسہ'' کو میں مولانا محمد طیب صاحبؒ کا ایک اہم کارنامہ سمجھتا ہوں اس لئے کہ ہمارے علماء نے اس موضوع پر توجہ بہت کم دی ہے جب کہ ہر لحاظ سے یہ موضوع بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ میں محمد ہشام قاسمی کی رائے سے متفق ہوں۔ ''مضمون بے حد اہم وعلمی ہے۔'' (۷)

مولانا محمد اسلم صاحب قاسمی لکھتے ہیں ''**العلماء ورثة الانبیا**'' علماء انبیاء کے وارث ہوتے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کی میراث مال و دنیا نہیں علم ہوتا ہے (۸) لیکن صرف وہی علماء وارث ہوں گے جو آنے والی نسلوں کے لئے اپنے علمی کارنامے میراث میں چھوڑ کر اس دنیا سے جائیں گے۔ مقامات مقدسہ اسی میراث کی ایک کڑی ہے۔

مقدمہ میں لکھتے ہیں ''مقاماتِ مقدسہ'' کا لفظ آپ نے بارہا سنا ہوگا۔ بالخصوص ۱۹۲۰ء کے ہندوستان کی تحریکاتی زندگی نے تو مقاماتِ مقدسہ کے لفظ کو مسلمانوں کے لئے روزمرہ کا ایک محاورہ بنا دیا تھا جو آج تک

زبان زد ہے۔ اس سے پہلے بھی مسلمان جب حج کے لئے روانہ ہوتے تھے تو یہ کہہ کر جاتے تھے کہ ہم مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کے لئے جارہے ہیں (۹)۔۱۹۸۳ء تک مقامات مقدسہ کی اصطلاح عام فہم تھی اب نہ توجہ کرنے جانے والے استعمال کرتے ہیں اور نہ ہی عام مسلمانوں کی سمجھ کا حصہ رہی۔'' اب نئی نسل کو مقامات مقدسہ کو ڈکشنری سے حل کرنا ہوگا تو ۱۹۸۳ء سے ۲۰۰۶ء تک یہ فرق آ گیا۔ آپ لکھتے ہیں ''ترکی کی خلافت ختم ہوجانے کے بعد اسلامی ممالک میں انتشار پھیلا اور ان کی بقا خطرہ میں پڑ گئی تو ہندوستان کے مسلمانوں نے ''انجمن خدام کعبہ'' قائم کر کے اس کا نصب العین ہی مقامات مقدسہ کی حفاظت وصیانت قرار دیا۔ خلافت کمیٹی قائم ہوئی تو اس کا ابتدائی منصوبہ بھی مقامات مقدسہ کی حفاظت تھا (۱۰)۔ مسلمانوں میں انتشار تو خلافت کے خاتمہ اور ملوکیت کے ۶۶۱ء کے عروج سے ہی پھیلنا شروع ہو گیا تھا اور ترکی کی نام نہاد خلافت اسی ملوکیت کی نشانیوں میں سے ہی تھی۔ تحفظ مقامات مقدسہ کے لئے جو کام ہندوستانی مسلمانوں نے کیا وہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ آپ لکھتے ہیں کہ ''تقسیم فلسطین کی منحوس ساعتوں میں جب ہندوستان بھر میں اجتماعی جلسے ہوئے تو ان کی اساسی روح بھی مقامات مقدسہ کی حفاظت اور ان کے لئے آواز اٹھانا تھی'' (۱۱)۔ مغربی طاقتوں نے اس سلسلے میں جو کام کیا وہ تو ہے ہی لیکن تقسیم فلسطین کی بنیاد بھی مسلمانوں میں ملوکیت کا قیام ہی ہے۔ حضرت محمد ﷺ نے جس اسلامی ریاست کی بنیاد ڈالی تھی وہ اسلامی جمہوریہ کی بنیاد تھی، اگر مسلمان اس بات پر قائم رہتے تو کامیاب رہتے لیکن مسلمانوں نے ساتویں صدی عیسوی سے موروثی ملوکیت کو اپنا لیا اور وہی مسلمانوں کے زوال وتباہی و بربادی کا سبب بنی اور ہے۔ ایک موقعہ مسلمانوں کو ۱۹۷۹ء میں ملوکیت چھوڑ کر اسلامی جمہوری نظام کی طرف جانے کا ملا تھا۔ ایران میں تو موروثی آریا مہری شہنشاہیت کی روایت کافی قدیم تھی انہوں نے تو موروثی ملوکیت کو چھوڑ کر اسلامی جمہوری نظام اپنا لیا لیکن اس کے پڑوسی عرب ممالک جب کہ ان کے یہاں قبل از اسلام بھی جمہوری سیاسی نظام تھا اور عرب مسلمانوں نے تو ملوکیت کو ساتویں صدی عیسوی میں اختیار کیا تھا لیکن وہ آج تک موروثی ملوکیت اپنائے ہوئے ہیں۔ لیکن بجائے اس کے کہ اسلامی جمہوری نظام کو اپناتے، اس کی مخالفت کی جس کے نتیجے میں وہ ملک تباہ و برباد ہو گیا اور دوسرے ممالک کی آزادی سلب ہو کر رہ گئی اور اب اس حالت میں نہیں کہ مغربی طاقتوں کے سامنے مسجد اقصیٰ کی بات بھی کر سکیں۔ مسلمان ان حالات کے وجوہات دوسری جگہ تلاش کرتے ہیں اس کے وجوہات خود ان کے اندر ہیں۔ آج جو مسلمانوں کی حالت ہے تاریخ شاہد ہے کہ اتنی خراب حالت کبھی نہیں رہی۔

آپ لکھتے ہیں کہ ''مقاماتِ مقدسہ'' کا لفظ آپ کے کانوں میں بار ہا پڑتا رہا ہے جس سے آپ نا آشنا نہیں ہیں لیکن یہ مقامات کہاں ہیں؟ کون سے ہیں؟ کتنے ہیں؟ ان کی بنیادیں کیا ہیں؟ اور ان کی حفاظت و آزادی کے کیا معنی ہیں؟ اور ان میں سے کسی کی آزادی سلب ہو جانے کی صورت میں مسلمانوں کے فرائض کیا ہیں؟ شاید ان تفصیلات سے اکثر و بیشتر نعرہ زن حضرات بھی واقف نہیں (۱۲)۔ مقدمہ میں ان سوالات کو اٹھایا ہے اور آپ کی کتاب انہیں سوالات کا جواب ہے۔

آپ نے اپنے اس موضوع کا ماخذ قرآن مجید کی ''سورہ والتین والزیتون'' کی پہلی آیت کے الفاظ اور ان کے حسن سیاق وسباق کو قرار دیا ہے (۱۳)۔

ظاہر ہے کہ مورخ بغیر ماخذ کے بات نہیں کرتا۔ آپ لکھتے ہیں ''اس مسئلہ میں جس حد تک بھی شرعی اور عقلی مواد یکجا کیا جانا ممکن تھا اس سے دریغ نہیں کیا گیا۔'' (۱۴) ایک اور اچھے مورخ کی پہچان مولانا محمد طیب صاحبؒ کے اس جملے سے ہوتی ہے اس میں میرا مفہوم کس حد تک صحیح ہے اور کتنا غلط ہے (۱۵)۔

''حق تعالیٰ نے ان تین مقامات قدس کے شہر، طورِ سینا کے پہاڑ اور بلد امین یعنی مکہ مکرمہ کی قسم کھا کر بھی نوع انسان کی پاکیزہ صورت و سیرت پر استدلال فرمایا'' (۱۶)۔ آپ فرماتے ہیں ''ان ہی تین مقامات سے دنیا کی تین وہ بڑی بڑی قومیں ابھریں، یعنی یہود، نصاریٰ اور مسلمین (۱۷)''۔ اس کے بعد آپ رقم طراز ہیں کہ ''اسلام کے جامع دین کو تین مرکزوں کی عقلاً اور شرعاً ضرورت تھی اور وہ تین مرکز باشارہ قرآنی مکہ، قدس اور طور سینا ہیں۔ جب حضرت خلیل اللہ تیسری بار حجاز تشریف لے گئے تو حق تعالیٰ کی طرف سے بیت اللہ کی تعمیر کا حکم ملا اور دونوں مقدس باپ بیٹوں حضرت خلیل اللہ اور حضرت ذبیح اللہ نے مل کر مسجد حرام کی تعمیر فرمائی۔ اس سے فارغ ہو کر حضرت خلیل اللہ علیہ السلام نے پھر فلسطین ہی کا قصد فرمایا (۱۸) پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی درخواست پر انہیں کوہِ طور پر جانے کا حکم ہوا۔ وہاں کلامِ ربانی سنا اور شرف کلیمی سے مشرف ہوئے، تورات عطا ہوئی (۱۹)''۔ آپ فرماتے ہیں کہ ''ظاہر ہے کہ جس پہاڑ پر کلام ربانی کی آواز گونجی اور جس پہاڑ کے خطے پر جلیل القدر پیغمبر نے چلہ کشی کی اور جس کے ایک مبارک حصے میں قانونِ الٰہی کی الواح سپرد کی گئیں، اس پہاڑ کے مقدس بن جانے میں کلام ہی کیا ہو سکتا ہے'' (۲۰)۔ پھر فرماتے ہیں ''ان کے بعد بنی اسرائیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام جیسے اولوالعزم جلیل القدر پیغمبر حق تعالیٰ نے بھیجا (۲۱) مسجد اقصیٰ کی بنیاد ڈالی تا کہ بنی اسرائیل ملت ابراہیمی سے ہٹنے نہ پائیں (۲۲)۔ اس طرح سے یہ تین مراکز اہمیت کے حامل ہوئے اور یہی زندگی کا محور قرار پائے۔ یہی علم و یقین کا مرکز بن کر ابھرے۔''

پھر انقلاب احوال سے متعلق فرماتے ہیں کہ ''صد حیف و حسرت کہ وہ اس عالمی مرکز کے بارے میں

اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتی کہ وہ حج ونماز کا قبلہ ہے۔ نمازیں اس کی طرف رخ کر کے پڑھ لی جائیں اور حج اس میں حاضری دے کرادا کرلیا جائے (۲۳) اوراس کے آگے فرماتے ہیں کہ ''ان سے کیا کیا اسلامی مقاصد وابستہ ہیں؟ نہ ان کو اس کا علم رہ گیا ہے اور نہ اس علم کی طلب ہی ذہنوں میں کچھ باقی ہے۔ امت کی لاعلمی اپنے انتہا تک پہونچ چکی ہے لیکن آپ نے یہ نہیں بتایا کہ آخر یہ انقلاب کیسے آیا اور امت اس قدر غافل کیوں ہوگئی؟ میری اپنی رائے میں اس کی وجہ مسلمانوں میں موروثی ملوکیت کا قیام تھا۔ ملوکیت یا بادشاہت، چاہے اس کے سربراہ عیسائی، ہندو یا مسلمان ہوں ان کا بنیادی نظریہ عوام کو تقسیم کرنا اور علم سے دور کرنا ہوتا ہے۔ اسلام سماجی برابری میں یقین رکھتا ہے لیکن ساتویں صدی عیسوی کی دوسری دہائی میں ملوکیت کے قیام کے بعد مسلمانوں کو تقسیم کر دیا گیا۔ عرب، غیر عرب، موالی وغیرہ اور تاریخ کے ساتھ ساتھ اس تقسیم میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔ سید، شیخ پٹھان، بڑھئی، لوہار، جولاہا، نہ معلوم کس حد تک مسلمان تقسیم ہو گیا۔

ہندوستان میں تیرہویں صدی عیسوی کے مورخ اور سیاسی مفکر ضیاء الدین برنی صاحب تاریخ فیروز شاہی (۲۵) وفتاویٰ جہانداری (۲۶) علم کے سلسلے میں رائے رکھتے ہیں کہ عام مسلمانوں کو صرف نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کی تعلیم دینی چاہئے۔ اس سے زیادہ انہیں تعلیم دینے کا مطلب ہوگا کہ کل وہ حکومت میں عہدوں کے دعوی دار ہوں گے اور انہیں تعلیم دینا ایسا ہی ہوگا جیسے کتے کے گلے میں سونے کی زنجیر ڈالنا (۲۷) اوراسی بیان کے سلسلے میں ایک فارسی شعر لکھتے ہیں۔

بدست دوں مدہ خامہ کہ گردوں را مجال افتد　　سیہ سنگی کہ در کعبہ است ساز د سنگ استنجا

''عام لوگوں کو قلم مت دو اس لئے کہ اگر ان کے ہاتھ میں قلم آ گیا تو وہ سنگ اسود کو استنجا کے ڈھیلے کے طور پر استعمال کر لیں گے۔'' اور نہ صرف برنی بلکہ اسی صدی کے مسلم فرماں روا سلطان شمس الدین التمش اور سلطان غیاث الدین بلبن جن کو مسلم علماء ومورخین نے امیر المومنین اور ظل اللہ کے القاب سے نوازا ان کے دور میں اگر غلطی سے کسی چھوٹی ذات سے تعلق رکھنے والے مسلمان کو حکومت میں عہدہ مل بھی جاتا تو اس حقیقت کے آشکار ہونے پر کہ اس کا تعلق کسی چھوٹی ذات سے ہے۔ اس عہدے سے برطرف کر دیا جاتا۔ سلطان محمد بن تغلق جو مسلمانوں میں بہت بدنام ہے جب اس نے چھوٹی ذاتوں سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں کو حکومت میں عہدوں سے نوازا تو برنی اور دوسرے علماء اور امراء نے محمد بن تغلق کی اس پالیسی کی سخت مخالفت کی اور کہا کہ اس طرح کی پالیسی سے اشراف کے حقوق کی پامالی ہو رہی ہے۔ بیسویں اور اکیسویں صدی میں انہیں حالات کے تحت مسلمان تعلیم میں یوروپ، انگلینڈ اور امریکہ سے کافی پیچھے ہیں۔ خود ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیم کی شرح فی صد صرف بیس فی صد ہے جس کا مطلب ہوا کہ اسّی فی صد

ہندوستانی مسلمان علم سے دور ہیں۔ مولانا محمد طیب صاحبؒ کے اس سوال کہ ''اس عالمی مرکز کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتی کہ وہ حج ونماز کا قبلہ ہے'' (۲۸) وجہ مندرجہ بالا ہے۔ ہم کو سب سے زیادہ نقصان پہونچا ملوکانہ، جاگیردارانہ اور زمین دارانہ ذہنیت سے اور پہونچ رہا ہے۔ میں مولانا سے پورے طور پر متفق ہوں کہ جب آپ یہ فرماتے ہیں کہ ''اس لئے ضرورت تھی کہ اسلام کے اس اجتماعی مرکز (بیت اللہ) کو اس وضع اول سے لے کر اس کی صورت، اس کی خلقت، اس کی غرض وغایت، اس کی حقیقت اور اس سے پیدا شدہ دوسری مرکزیتوں اور ان کے تقاضوں سے امت عرب وعجم اور خصوصیت سے عرب کو تفصیل کے ساتھ ایک مہم کے طور پر آگاہ کیا جائے اور ان سے امت کے جو اجتماعی مقاصد متعلق کئے گئے تھے، یاد دلا کر انہیں پھر سے ذہنوں میں مستحضر کرایا جائے تاکہ امت کا یہ ذہنی اور خارجی جمود اور اس سے پیدا شدہ انتشار ختم یا کم ہو جس میں امت پھنس کر پھڑ پھڑا رہی ہے'' (۳۰) لیکن ایک درخواست کے ساتھ کہ اب ہمیں عرب وعجم کی اصطلاح کا استعمال کرنا بند کر دینا چاہئے اس لئے کہ سب مسلمان ہیں اور ہمیں کسی مسلمان کو عجمی کہنے کا حق نہیں ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ ''حق تعالیٰ نے اپنے عالمگیر قبلہ کے لئے اس مقدس شہر (مکہ) کا انتخاب کر کے اسے بلد امین قرار دیا، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب حضور ﷺ مکہ سے ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے تو آپ تشریف لے جاتے ہوئے مکہ کے شہر کو خطاب فرماتے ہوئے حسرت سے فرماتے جا رہے تھے کہ ''میں جانتا ہوں کہ خدا کا محبوب ترین شہر مکہ ہے اور اگر میری قوم مجھے مکہ سے نکال دیتی تو میں کبھی مکہ نہ چھوڑتا۔ اے اللہ ہمارے دلوں میں مکہ کی محبت پیدا فرمادے۔'' (۳۱) لیکن اسی کے ساتھ دوسری حقیقت یہ بھی ہے کہ ۶۲۸ء میں فتح مکہ کے بعد پھر رسول اللہ ﷺ نے مکہ کے اسلامی ریاست میں شامل ہونے کے باوجود نہ تو اپنے گھر یا اس شہر میں سکونت اختیار کی۔ پوپ بنی ڈکٹ کے یونیورسٹی آف رجنس برگ میں اپنے لیکچر میں منیول دوئم۔ چودھویں صدی عیسوی کے بائزین ٹائس کے بادشاہ کے بیان کو دیتے ہوئے کہا کہ ''محمد نے کون سے نئی چیز کی (۳۲) پوپ بنی ڈکٹ سولہویں حیات محمد کی تاریخ پڑھیں اور دنیا کی کوئی مثال ایسی پیش کریں کہ جہاں سے ایک شخص کو نکال دیا گیا ہو اور وہ پھر اس پر طاقت کے ذریعہ قبضہ کر لے اور پھر وہاں نہ رہے۔ کیا یوروپ، انگلینڈ اور امریکہ اپنی تاریخ میں ایسی مثال پیش کر سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ اگر مینول دوم ہوتا تو دیکھتا اور پوپ بنی ڈکٹ سولہویں صدی عیسوی کی انگلینڈ کی تاریخ پڑھیں کہ جب ہنری ہشتم نے اپنی بیوی کو طلاق دینے کے معاملے میں روم سے رشتہ توڑا جس سے پوپ کا تعلق ہے تو تمام انگلینڈ کے کیتھولک فرقہ کی تمام موناسٹریز کو مسمار کر کے زمین سے ملا دیا تھا۔ محمد نے مکہ فتح

کرلیا۔ جن لوگوں نے محمد کو مکہ سے نکالا تھا انہیں معاف کر دیا اور مکہ میں رہائش اختیار نہیں کی۔ پوپ کوئی ایسی مثال یوروپ، انگلینڈ اور امریکہ کی ایسے دے سکتے ہیں۔

آپ فرماتے ہیں کہ ''مکہ کے مقدس ہونے کے لئے آیات و روایات کی روشنی میں یہ خلاصہ کافی ہو گیا کہ وہ اللہ کا محبوب ترین شہر ہے۔'' (۳۳)

قدس کے بارے میں لکھتے ہیں ''اسی طرح قدس کا شہر جو بیت المقدس کے نام سے معروف ہے بے شمار تقدیسی خصوصیات کا حامل ہے جن سے احادیث نبوی بھری ہوئی ہیں (۳۴)۔ اسی طرح طور سینا بھی اپنی خصوصی برکات کے لحاظ سے ایک پُر عظمت مقدس مقام ہے (۳۵)۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں بھی عہد وسطیٰ میں جو مساجد تعمیر ہوئیں ان کی بھی تاریخ مندرجہ ذیل مصرعوں سے نکالی۔ اورنگ زیب کے امیر خلیل اللہ خاں نے ایک مسجد اجمیری گیٹ، دہلی کے نزدیک تعمیر کی اس کی تاریخ مندرجہ ذیل مصرعہ سے نکلتی ہے:

''کرد کعبہ بنا خلیل اللہ''

ایک مسجد شاہ جہاں آباد کے باہر تعمیر ہوئی وہ دائی والی مسجد کہلاتی ہے اس کا قطعہ تاریخ ہے:

''گشتہ آباد کعبہ دیگر''

شاہ جہاں آباد میں سہ راہہ بیرم خاں میں حکیم بوعلی خاں نے ایک مسجد تعمیر کرائی اس کا قطعہ تاریخ ہے:

''بنا شد مسجد اقصیٰ ثانی''

شاہ جہاں آباد میں سعید الدولہ نے ایک مسجد تعمیر کرائی اس کا قطعہ تاریخ ہے:

''مثنہ کعبہ عالی بنا شد''

نواب سعادت خاں جو نواب صفدر جنگ کے چچا تھے انہوں نے حویلی نواب وزیر احمد شاہ کے عقب میں ایک مسجد تعمیر کرائی اس کا مصرعہ تاریخ ہے:

''کعبہ ثانی بنامی بوسید بنا کرم''

متھرا روڈ پر ایک مسجد تعمیر ہوئی اس کا مصرعہ تاریخ ہے:

''خانہ کعبہ قبلۂ اقدس''

حضرت نظام الدین اولیاء کی درگاہ میں جو مسجد تعمیر ہوئی اس کے کتبہ پر یہ تحریر ہے:

سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلاً مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصٰی.

راہ سید حسن رسول نما پر ایک مسجد تعمیر ہوئی اس کا مصرعہ تاریخ ہے:

''مسجد اقصیٰ است ہا کعبہ کرم''

ہندوستان میں عہد وسطیٰ میں تعمیر شدہ مساجد کے یہ مصرعے ان حضرات کے کعبہ اور مسجد اقصیٰ سے قلبی لگاؤ کی نشانی ہیں اور دوسری طرف غیر رسمی طور پر دن میں پانچ مرتبہ جب نمازیوں کی نگاہ ان کتبات اور خاص کر ان مصرعوں پر پڑے گی تو یاددہانی کا ذریعہ ہے۔ مولانا محمد طیب صاحبؒ نے جن باتوں کی طرف مقدمہ میں اشارہ کیا ہے اور خاص کر ''شاید ان تفصیلات سے اکثر و بیشتر حضرات بھی واقف نہیں شاید عہد وسطیٰ میں لاعلمی کی یہ حد نہ رہی ہو اس لئے کہ یہ مصرعے ان کی اہمیت و مرکزیت کی یاددہانی کرا رہے تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ ہندوستان و پاکستان کا مسلمان اس زبان سے ناواقف ہوتا جا رہا ہے کہ جس زبان میں اسلامی تہذیب وثقافتی سرمایہ موجود ہے۔ مخطوطات، دستاویزات اور کتبات زیادہ تر فارسی وعربی زبان میں ہیں لیکن اب نئی نسل اس زبان سے واقف نہیں۔ مدارس میں عربی تو پڑھائی جاتی ہے لیکن فارسی نہیں پڑھائی جاتی جب کہ ہندوستان میں اسلام پر زیادہ تر سرمایہ فارسی زبان ہی میں کتابوں کی شکل میں موجود ہے۔''

خلاصہ مقالہ کے تحت مولانا فرماتے ہیں ''حجاز مرکز امن وعبادت ہے شام مرکز سیاست وشوکت ہے اور مصر مرکز عسکریت وقوت ہے اور پھر ان تینوں پر ایک عالمی اجتماعی نظام بنام ''خلافت'' قائم کر دیا ہے تا کہ ان سب کا اجتماعی نقطۂ فکر اور مرکز عمل ایک رہے (۳۶)۔'' لیکن ہم نے غلطی یہ کہ اس خلافت کو ملوکیت میں تبدیل کر دیا۔ لہٰذا ہماری پہلی کوشش یہ ہونی چاہئے کہ موروثی ملوکیت کو جن جن مسلم ممالک میں ہے اسلامی جمہوریہ میں تبدیل کیا جائے تب ہی ہم اپنے مقاصد میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔

میں مولانا کی اس رائے سے اتفاق کرتا ہوں کہ ''اگر مسلمانوں اور بالخصوص عربوں نے اب بھی حجاز و شام اور مصر کی دینی مرکزیت کو نہ سمجھا اور ان کی دینی حیثیت کو لے کر کھڑے نہ ہوئے بلکہ بدستور مغربی شاطروں کی سیاسی چالوں اور لفظی فریب بازیوں یا گیدڑ بھبکیوں میں آتے رہے تو ان مقامات کا انجام تو جو بھی کچھ ہوگا وہ ہو رہے گا لیکن خود عربوں کی پوری زندگی لاعلاج خطروں میں گھر جائے گی (۳۷)۔'' لیکن میری ناقص رائے میں پہلے ہمیں ملوکانہ، جاگیردارانہ اور زمین دارانہ نظام چھوڑنا ہوگا اور اس کی جگہ اسلامی جمہوری نظام کو اپنانا ہوگا تب ہی ہم اپنے سیاسی، سماجی، معاشی اور ثقافتی مقاصد کے حصول میں کامیاب ہو سکیں گے۔

............❖............

(۱) حضرت مولانا محمد طیب قاسمیؒ، مقامات مقدسہ، ص: ۷

(۲) کیفیات ومکافات گوڑ اور لکھنوتی، مخطوطہ خدا بخش لائبریری، پٹنہ

(۳) تاریخ آگرہ، مخطوطہ خدا بخش لائبریری، پٹنہ

(۴) تفریح العمارات، آگرہ۔ مخطوطہ خدا بخش لائبریری، پٹنہ

(۵) سیر المنازل مخطوطہ، نیشنل آرکاؤز آف انڈیا، نئی دہلی

(۶) آثار الصنادید، شعبہ مخطوطات، مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
(۷) حضرت مولانا محمد طیب قاسمیؒ، مقامات مقدسہ ص:۳
(۸) ایضاً ص:۵
(۹) ایضاً ص:۱
(۱۰) ایضاً ص:۱۰
(۱۱) ایضاً ص:۱۰
(۱۲) ایضاً ص:۱۰
(۱۳) ایضاً ص:۱۹
(۱۴) ایضاً ص:۲۰
(۱۵) ایضاً ص:۲۱
(۱۶) ایضاً ص:۲۵
(۱۷) ایضاً ص:۳۱
(۱۸) ایضاً ص:۶۷
(۱۹) ایضاً ص:۷۰
(۲۰) ایضاً
(۲۱) ایضاً ص:۷۱
(۲۲) ایضاً ص:۷۳
(۲۳) ایضاً ص:۸۳
(۲۴) ایضاً ص:۸۴
(۲۵) ضیاء الدین برنی، تاریخ فیروز شاہی، ص:۳۴
(۲۶) ایضاً فتاویٰ جہانداری
(۲۷) ضیاء الدین برنی، تاریخ فیروز شاہی، ص:۴۱
(۲۸) حضرت مولانا محمد طیب قاسمیؒ، مقامات مقدسہ ص:۸۴
(۲۹) ایضاً ص:۸۴
(۳۰) ایضاً ص:۸۵
(۳۱) ایضاً ص:۸۶
(۳۲) دی ٹائمس آف انڈیا، دہلی ۱۴ستمبر ۲۰۰۶ء، ص:۱
(۳۳) حضرت مولانا محمد طیب قاسمیؒ، مقامات مقدسہ ص:۸۹
(۳۴) ایضاً ص:۸۹-۹۰
(۳۵) ایضاً ص:۹۰
(۳۶) ایضاً ص:۱۰
(۳۷) ایضاً ص:۶۹۸

............❖............

حضرت حکیم الاسلامؒ، عہد ساز شخصیت
ایک تجزیاتی مطالعہ

ڈاکٹر افضل حسین قاسمی

بیسویں صدی کے اواخر تک برصغیر ہند و پاک کے افق پر علم و فضل کے بڑے بڑے آفتاب و ماہتاب رونما ہوئے اور انہوں نے اپنی شفاف علمی و عرفانی ضوفشانی سے ملک و بیرون ملک کے طول و عرض میں خوب خوب روشنی پھیلائی۔ آج اکیسویں صدی میں انہی اصحاب علم و فضل کے محمدی افکار و نظریات کا نور ہے جو برصغیر کی امت مسلمہ کے جبین و رخسار پہ ہویدا ہے۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ، حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن، حضرت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہم اللہ تعالیٰ، یہ وہ یکتائے روزگار شخصیات رہی ہیں جن کی دینی و ملی خدمات آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں تاہم ان میں حضرت حکیم الاسلام محمد طیب صاحبؒ گل سرسبد کی حیثیت رکھتے ہیں اور کیوں نہ رکھیں، کہ بقول حضرت مولانا سید اصغر حسین میاں صاحبؒ (سابق استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند) ''بانی دارالعلوم دیوبند حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی علیہ الرحمہ اور اکابر جماعت اہل حق کی تمام معنوی اور روحانی نسبتوں اور تمام اعلیٰ امتیازات و خصوصیات کو حق تعالیٰ شانہٗ نے ماشاء اللہ مولانا محمد طیب صاحبؒ کی ذات ستودہ صفات میں جمع فرمادیا''۔ چنانچہ آپ کی تحریر میں جہاں سوز و گداز ہے وہیں محبت و عقیدت میں ڈوبی ہوئی چاشنی بھی ملتی ہے اور آپ کی تقریر کے کیا کہنے، فن خطابت کے آپ شہنشاہ تھے، تقریر فرماتے تو ایسا محسوس ہوتا کہ نسیم صبح گاہی محوخرام ہو، انداز گفتگو میں آب رواں کی نغمگی تھی، لب و لہجہ میں حُدی خوانوں کا

سوز اور طرز تکلم میں نو دمیدہ غنچوں کی مہک جو دماغوں کو معطر کر دیتی تھی۔

کچھ تو بات تھی جو امیر شریعت پاکستان، سید عطاء اللہ بخاریؒ پر حضرت حکیم الاسلامؒ کے خطاب لاجواب سے وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی اور کبھی نعرۂ تکبیر بلند فرما دیتے۔ مولانا ابوالکلام آزاد جیسے عظیم خطیب جو اپنے وقت میں فن خطابت میں یکتائے زمانہ سمجھے جاتے تھے، حضرت حکیم الاسلامؒ کا خطاب سن کر جھوم اٹھتے۔ جدید تعلیم سے متاثر طبقہ آپ کے علم وحکمت سے بھرپور خطابات کو بڑی وقت واہمیت کے ساتھ سنتا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جو ہندوستان میں جدید علوم کا مرکز ہے اور دارالعلوم دیوبند سے اس کو نظریاتی تقابل بھی رہا، وہاں جب ''اسلام اور سائنس'' کے دقیق موضوع پر آپ نے خطاب فرمایا تو آپ کے اسلوبِ بیان اور تبحر علمی سے بڑے بڑے پروفیسر اور عصری علوم کے محققین انگشت بدنداں رہ گئے اور ان میں یہ احساس اجاگر ہوا کہ حقیقی علم کیا ہے اور جسے ہم علم کہتے ہیں اس کی حقیقت کیا ہے؟

اس سلسلہ میں میرا ذاتی نقطۂ نظر یہ ہے کہ حضرت حکیم الاسلامؒ، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے افکار ونظریات سے پوری طرح ہم آہنگ تھے اور اس کی بنیادی وجہ شاید یہ تھی کہ حضرت والا ایک عرصہ تک دارالعلوم دیوبند میں ''حجۃ اللہ البالغہ'' جیسی حکمت وافکار کی کتاب ولی اللّٰہی لب ولہجے میں پڑھاتے رہے۔ خطاب، بیان اور تدریس میں حضرت حکیم الاسلامؒ کی انفرادیت دراصل ان کے امتیازات کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ حضرت والا صفات انبیائی وراثت کا چلتا پھرتا نمونہ اور ہماری عظمت رفتہ کی حسین وجمیل یادگار تھے۔ فکر ونظر میں اعتدال، فکر ولی اللّٰہی کے امین، صوفی، عصری تعلیم میں رواداری کے قائل، متکلم اسلام، قرآن وحدیث نبویؐ کے خدمت گار، فقہی بصیرت کے حامل، اسرار شریعت سے باخبر، مسائل کی عقلی تفہیم میں یدطولیٰ کے حامل، نظام تعلیم وتربیت میں یکتائے زمانہ، قابل ومشفق مدرس، حجۃ اللہ البالغہ کی تدریس میں امتیازی شان رکھنے والے، اردو اور فارسی زبان میں نظم ونثر پر قادرالکلام، اسلوب تحریر میں سلامت، بے ساختگی وشگفتگی، طرز استدلال سادہ مگر مبرہن، اصلاح نفس اور اصلاح عقیدہ کے علم بردار، سیاسی بصیرت کے ساتھ جرأت مندی، تبلیغی جماعت کے بہی خواہ، علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے پسندیدہ اور آئیڈیل مقرر، اپنے عہد کے مردم ساز محقق عالم دین، دارالعلوم دیوبند کے لاجواب مہتمم، مسلک دارالعلوم کے ترجمان، کراماتی اجلاس صدسالہ کے روح رواں، مسلم پرسنل لاء بورڈ کے معمار، اتحاد ملت کے داعی اور خانوادۂ قاسمی کے ایسے سفیر کہ جن کی عظمتوں کے اعتراف میں تقریباً سارا عالم اسلام ہم آہنگ ہوا اور عرب وافغان سربراہان مملکت نے حضرت حکیم الاسلام کے لئے اپنی پلکوں کو فرش راہ کیا۔

یہ ہیں وہ خصوصیات و اوصاف جو حضرت حکیم الاسلامؒ کو ان کے دیگر ہم عصروں سے ممتاز بناتے ہوئے آپ کو ایک عہد ساز شخصیت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ میرا اپنا یقین یہ ہے کہ نصف صدی سے زیادہ مدت کو محیط، حضرت حکیم الاسلام محمد طیب صاحب علیہ الرحمہ کے منصب اہتمام کا اختتام، دارالعلوم دیوبند کے کار اہتمام کا اختتام ہرگز نہیں تھا بلکہ عہد سازی کی ایک خوش گوار میعاد کی تکمیل تھی۔ یہ الگ شئے ہے کہ بدقسمتی سے ناگفتہ بہ احوال وکوائف کے سائے میں یہ تکمیل امت مسلمہ کے سامنے آئی۔

اور جب حضرت حکیم الاسلامؒ مذکورہ اوصاف وامتیازات کے حامل تھے اور یقیناً تھے، اور آپ کا ساٹھ سالہ دور اہتمام جو بظاہر دارالعلوم دیوبند کے انتظام وانصرام کا زمانہ ہے، دراصل یہی دور بالخصوص براعظم ہندو پاک میں دینی شعور کے حوالے سے قوم وملت کی نشاۃ ثانیہ کا دور ہے جس کا معمار بجا طور پر مظفر الدین، خورشید قاسم، حضرت حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ کو قرار دیا جانا چاہئے۔

اس وقت جب کہ ہندوستان میں شخصی تقلید کے لئے ''گاندھی گری'' کے نام سے تشکیلی مہم زوروں پر ہے اور جس کو ہندوستانی قوم میں صلاح وفلاح کی خوشبو پیدا کرنے کی ایک کوشش کے طور پر دیکھا جارہا ہے۔ حضرت حکیم الاسلامؒ کی سیرت وسوانح کو سامنے رکھ کر برصغیر میں امت مسلمہ کی نئی نسل میں اصلاحی و ارتقائی انقلاب برپا کرنے کی سنجیدہ کوشش کی جانی چاہئے۔

حضرت حکیم الاسلامؒ کے حالاتِ زندگی میں نئی نسل حالات حاضرہ کے تناظر میں اتباع قرآن وسنت اور فکر ونظر میں اعتدال کی روشن قندیلیں ڈھونڈ کر ان قندیلوں سے قوم وملت کی پیشانی کو مزین کرنے کی کوشش کرے تاکہ اتحاد باہمی، امن وامان اور مطلوبہ رواداری کی فضا بنے اور پھر پورا براعظم ہندوپاک یہ پکار اٹھے کہ حضرت حکیم الاسلامؒ کے آفاقی کارناموں کے طفیل مردم سازی کا مشن آج بھی زندہ ہے۔

............❖............

حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ کا اسلوبِ نثر

جناب شریف مبارک پوری

حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ ایک عالم دین، مفکرِ اسلام، حافظِ قرآن، مصنف، شاعر، بلند پایہ خطیب اور اردو زبان و ادب کے رمز شناس تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مشکل اور پیچیدہ مسائل کو انتہائی آسان پیرایہ میں بیان کر دیتے ہیں۔ نمونہ کے طور پر ان کا ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے:

''آنحضرت ﷺ کا سیرت و اخلاق یہ قرآن ہے۔ جو اس میں لکھا ہوا ہے وہی آپ کی ذات میں عمل اور سیرت و کردار کی صورت میں موجود ہے۔ اس قرآن کی اور بالفاظ دیگر سیرت نبوی کی سند و روایت کا تو یہ مقام ہے کہ دو چار، دس پانچ راویوں کے واسطے سے نہیں بلکہ پیغمبر سے لے کر آج کے دور تک جنہیں ایک ایک زیر زبر تک محفوظ پھر اس کا ایک ایک کلمہ اور ایک ایک حرف گنا ہوا اور شمار میں آیا ہوا منضبط ہے۔ حتیٰ کہ اس کی روایت کے ساتھ اس کی درایت، طرز ادا، لب و لہجہ، طرز کتابت اور رسم الخط تک کے تحفظ کے لئے ہر دور میں ہزاروں ہزار مبصر افراد کی جماعتیں اور گروہ سرگرم عمل رہتے آرہے ہیں۔ پھر اس قول و فعل رسول کے لئے خود صاحبِ رسالت کا اپنا کلام جسے حدیث کہتے ہیں۔ اس حد تک منضبط محفوظ اور اس درجہ اس کی روایت مسلسل، بیچ میں انقطاع کا نشان تک نہیں بلکہ اس کے لاکھوں راویوں کی سوانح عمریاں محفوظ او راوراقِ تاریخ میں منضبط۔ حتیٰ کہ اس کے فن کی روایت کے وہ اصول تک بھی مرتب شدہ موجود کہ اس کی تاریخ ہی ایک مستقل فن بن گئی''۔(۱)

ان کی تحریروں میں ان کے اسلوب بیان کی جھلک اور ان کی شخصیت کا انعکاس صاف نظر آتا ہے جس پر فارسی کا یہ محاورہ موزوں معلوم ہوتا ہے کہ ''از کوزہ ہماں تراکہ درونی است'' اور مولانا نے بھی اپنے خطبات میں اس موضوع پر اظہار خیال کیا ہے۔ جس سے ان باتوں کی تائید ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ہماری زبان کا محاورہ ہے'' آنکھ سے آنکھ لڑ جانا'' یہ محبت ہو جانے کی طرف اشارہ ہوتا ہے، کسی کو کسی سے محبت ہو جائے تو کہتے ہیں کہ آنکھ سے آنکھ ٹکرائی، یعنی محبت قائم ہوگئی۔ تو استاذ ذوق نے جو مانا ہوا شاعر ہے اس نے اس محاورہ کو ایک شعر میں نظم کیا ہے۔ کہتا ہے کہ ؎

آنکھ سے آنکھ ہے لڑتی، مجھے ڈر ہے دل کا
کہیں یہ جائے نہ اس جنگ وجدل میں مارا

تو بڑی خوبصورتی سے آنکھ لڑنے کے محاورے کو اس نے نظم کر دیا اور اس شعر کو لوگ واقعی ضرب المثل کے طور پر بیان کرتے ہیں۔ اسی مضمون کو ایک ہندو شاعر نے ادا کیا ہے۔ مکند درم اس کا نام ہے۔ اس نے اس مضمون کو بڑھا دیا اور بہت نازک خیالی دکھلائی۔ وہ کہتا ہے کہ ؎

دل کی نہیں تقصیر مکند، آنکھیں ہیں ظالم
یہ جا کے نہ لڑتیں، وہ گرفتار نہ ہوتا(۲)

خیر القرون میں بھی زبان وادب کا پاس ولحاظ کیا گیا ہے۔ خود رسول اللہ ﷺ کی زبانِ مبارک بہت ہی فصیح و بلیغ تھی اور صحابہ کرام بھی آپ کے نقشِ قدم پر چل کر زبان و بیان کو سیکھتے تھے۔ مجلسیں منعقد ہوتیں اور اہل زبان فصیح و بلیغ انداز میں اپنی زبان دانی کا مظاہرہ کرتے۔ جس کی صدائے بازگشت آج بھی سنی جاسکتی ہے۔ مولانا قاضی اطہر مبارک پوریؒ اس بارے میں رقم طراز ہیں:

''مجلس نبوی میں زبان وادب کی مجلسیں بھی منعقد ہوتی تھیں اور شعراء، ادباء، فصحاء کے کلام سے اربابِ ذوق محظوظ ہوتے تھے۔ اس بارے میں آلِ زبیر مشہور تھے۔ ان میں حضرت ثابت بن عبداللہ بن زبیر سخاوت، شجاعت، خطابت، فصاحت و بلاغت میں گویا قریش کے ترجمان تھے اور مسجد نبوی میں بیٹھ کر فصاحت و بلاغت کے دریا بہاتے تھے۔ اہل مدینہ خاص طور سے ان کی مجلس میں ان کا کلام سننے کے لئے آتے تھے۔ مسور بن عبدالملک کا بیان ہے'' ہم لوگ مسجد نبوی میں حاضر ہوتے تھے۔ صرف حضرت ثابت بن عبداللہ کے کلمات والفاظ سننے کی کشش ہم کو وہاں لے جاتی تھی۔'' (۳)

یہی صحابہ کرام جب اشاعت دین کی خاطر اقصائے عالم میں پھیل گئے تو اپنی فصیح و بلیغ زبان میں دین اسلام کی تبلیغ کی جس کی اثر پذیری کا یہ عالم تھا کہ دنیا کی ظلمت وتاریکی کافور ہونے لگی اور اسلام مہر عالم تاب کی مانند درخشاں نظر آنے لگا، جس کی شعاعیں بلا امتیاز دنیا کے ہر گوشے میں پہنچیں۔ ہمارے ملک ہندوستان کو بھی اس سے وافر حصہ ملا۔ اسلامی اور عربی علوم کی بے شمار درس گاہیں وجود میں آئیں اور دارالعلوم دیوبند کے

درودیوار بھی علم وادب کی روشنی سے جگمگا اٹھے اوراس نورانی ماحول سے حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بھی وافر حصہ ملا۔ انہوں نے دینی احکام عوام الناس تک پہنچانے کے لئے تصنیف وتالیف اور خطابت کا سلسلہ شروع کیا ان کے قلم سے بہت سی کتابیں منظر عام پر آئیں ان میں خطبات کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان کا اسلوب وطرزِ نگارش اپنی تمام ترقیات کے درجۂ کمال اور نقطۂ عروج پر پہنچ جاتا ہے۔

عصری تناظر میں دیکھا جائے تو مسلمانوں کے اندر تعلیم وتربیت میں تغیر پیدا ہو رہا ہے۔ روحانیت کے بجائے مادیت پر نگاہیں مرکوز ہیں اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کی تعلیم کو فخر ومباہات کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ مولانا کو اس بات پر اصرار ہے کہ ”عصری تعلیم گاہوں کے ماحول میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔“ ان کا ایک اقتباس جس میں جدت وندرت، بلاغت ونفاست اور زبان نہایت شستہ اور رواں ہے۔ نمونہ کے طور پر ملاحظہ فرمائیں:

”آج دنیا میں اخلاقی قدریں اگر مفقود ہیں تو صرف اس لئے کہ وہ علم جس کا نام علمِ الٰہی ہے ختم کیا جا رہا ہے۔ جو اخلاقی قدروں کا سرچشمہ ہے اور اگر بداخلاقیاں دنیا میں وبا کی طرح پھیل رہی ہیں تو صرف اس لئے کہ ان رسمیات اور صورتوں کے علم کو باستقلال موضوع زندگی بنا کر فروغ دیا جارہا ہے جس میں سوائے ظاہر داری کے کسی قلبی حقیقت کی سمائی نہیں ہوتی۔ چنانچہ آج بہتات ہے تو کالجوں کی اور افراط ہے تو یونیورسٹیوں کی جن میں انہی مادی لذات ومنافع کے لئے حرام وحلال سے قطع نظر کر لینے کی تعلیم دی جارہی ہے۔ خدائی اخلاق اور خدائی احکام کو پس پشت ڈال دینے کے طریقے تعلیم کئے جارہے ہیں۔ جن سے آدمی حیوانیت کی طرف بڑھ رہا ہے اور انسانیت کا چولہ اتار پھینکنے ہی کو سب سے بڑی معراجِ ترقی سمجھ چکا ہے۔ پھر بھی اگر ان میں کچھ اخلاقی دوست اور دین پسند افراد نظر آئیں تو یہ ان کی اپنی سلامتی فطرت یا گھریلو ماحول یا دین داری ماں، باپ کی تربیت کا اثر ہو سکتا ہے۔ نہ کہ خالص اس مادّی تعلیم کا“۔ (۴)

جس طرح ہر بڑے ادیب کا ایک مطمحِ نظر ہوتا ہے اسی کے تحت اس کی تصنیف وتالیف عمل میں آتی ہے اور اپنے مقصد کی تکمیل کی خاطر شب وروز کوشاں رہتا ہے۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی زندگی کا مقصد متعین کر لیا تھا کہ اللہ کا دین ہر کس وناکس تک پہنچ جائے۔ اس میں اگر کوئی چیز بیچ میں حائل ہوجاتی تھی تو بڑی پامردی سے مقابلہ کرتے تھے۔ جب کبھی مغرب سے ابر سیہ اٹھ کر فضائے اسلام کو کثیف کرنا چاہتا تھا تو آپ کی جنبش قلم براہِ راست یا بالواسطہ اس کا سدِّ باب کرتی تھی۔ مثلاً مغرب کا مثالی مذہبی کردار حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذاتِ گرامی ہے۔ نتیجہ یہ کہ ان کے یہاں عظمتِ کردار، بے کسی، مسکنت، ترکِ دنیا، خود آزاری اور قربانی میں ہے۔ ٹوئن بی (Toynbee) ذہنی تیقن کے باعث کردارِ نبوی ﷺ کے بارے میں (نعوذ باللہ) تحریر کرتا ہے۔

Instead of seuling his prophetic message with his blood by becoming casar's victim It was Mohammed's ironic destiny to compromise and debase. His prophetic message be becoming on Arabian Caesar himself.

ترجمہ:''بجائے قیصر کا مقہور بن کر اپنی پیغمبرانہ تعلیمات پر اپنے خون سے مہر ثبت کرنے کے یہ محمد کی بدنصیبی ہی تھی کہ انہوں نے مفاہمت کی اور خود عرب کے قیصر بن کر اپنی تعلیمات کو گراوٹ سے ہمکنار کیا۔''(۵)

یہ ٹوئن بی (Toynbee) کی ہرزہ سرائی ہے کہ دیکھتا ہوں کہ سب کچھ لیکن سوجھتا کچھ بھی نہیں، ورنہ تاریخ گواہ ہے کہ محمد ﷺ کی ذاتِ گرامی دنیا کے لئے رحمۃ للعالمین بن کر آئی تھی اوران کی سیرتِ مبارکہ اب تک دنیا کی مختلف زبانوں میں دولاکھ سے زائد لکھی جا چکی ہیں اور ابھی یہ سلسلہ جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گا۔

حضرت مولانا حکیم الاسلامؒ نے بھی اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور اس کا اندازِ بیان بڑا اچھوتا ہے۔ استعارہ اور کنایہ کے پیرایہ میں باتیں کہی گئی ہیں جس کی وجہ سے عبارت میں سلاست پیدا ہوگئی ہے۔ ان کی تحریروں سے خود بخود ایسے لوگوں کا استیصال ہو جاتا ہے۔ جو اسلام کے دامن کو داغ دار کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اپنی مشہور و معروف کتاب ''مقاماتِ سیرت'' میں تحریر فرماتے ہیں۔

''جس طرح مادی سورج کا مطلع مشرقی افق کا بلندترین حصہ رکھا گیا ہے، تاکہ وہاں سے اس کی روشنی پورے عالم میں پھیل سکے۔ اسی طرح آفتاب نبوت کے لئے مرکزِ طلوع کعبۂ مقدسہ کو تجویز کیا گیا جو ناف عالم اور وسط زمین تھا اور اسے دنیا کی ہر چہار سمت نسبتِ مساوی تھی۔ جیسا کہ مرکز کو اپنے دائرہ سے ہوتی ہے، تاکہ اس کی کرنیں اگر ایک طرف بحیرۂ روم کے کناروں سے ٹکرائیں۔ جس سے اس کی روشنی مغرب کی وادیوں میں پھیلے تو دوسری طرف بحر ہند کی لہروں سے جا لڑیں جس سے مشرقی ممالک ہندوسندھ، ایران و خراسان اور چین و جاپان روشن ہو جائیں اور ایک سمت خلیج فارس کے ساحلوں پر اپنا نورانی سایہ ڈالیں جس سے شمال کے علاقے منور ہوں تو دوسری طرف خشکی میں براعظم مصر و سوڈان کے علاقے چمک اٹھیں۔ اس لئے اس آفتاب کو افق مکہ سے بلند کیا گیا اور آپ نے اس ناف عالم سے آواز دی تو آپ کی صدائے ایمان

جگہ جگہ پھیلی۔ سلاطینِ عالم اور اقوام وملل کو آوازۂ حق سے روشناس کیا۔"(۶)

مولانا حکیم الاسلامؒ قلم کے ساتھ ساتھ زبان کا بھی استعمال کرتے تھے اور اس کے لئے دور دراز کا سفر کر کے اپنا تقریری سلسلہ بھی جاری رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی انجمن اسلامی تاریخ وتمدن کی طرف سے اسٹریچی ہال میں "سائنس اور اسلام" کے موضوع پر تقریر فرمائی جو بہت مقبول ہوئی اور اپنی اہمیت وافادیت کی وجہ سے چھپ کر منظر عام پر آئی۔ پچھلے زمانہ میں مسلمانوں میں یہ غلط فہمی پیدا ہوگئی تھی کہ سائنس کی تعلیم سے مسلمان اپنے مذہب سے بیزار ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی ہستی سے انکار کر دیتا ہے۔ اس لئے مسلمانوں میں سائنسی علوم کا فقدان رہا لیکن ان کا یہ نظریہ درست نہیں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ سائنس کے مطالعے سے قرآنی آیات کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے اور مظاہر قدرت کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ کی صنّاعی کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لیکن پہلے قرآن وحدیث کی تعلیمات سے واقفیت حاصل کرے۔ سائنس اور اسلام کے تعلق سے مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی عالمانہ تقریر میں بڑے فصیح وبلیغ اور تمثیلی انداز میں کہا ہے:

"جس طرح جسم اور مادہ روح کے لئے وسیلۂ عمل ہیں۔ خود مقصود واصل نہیں۔ اسی طرح مادی تصرفات جن کا نام سائنس ہے، روحانی تصرفات کے لئے۔ جن کا نام اسلام ہے۔ اصولاً محض وسیلہ اور ذریعہ کا درجہ پیدا کر سکتے ہیں۔ خود مقصدیت کی شان کبھی نہیں پیدا کر سکیں گے اور ظاہر ہے کہ جب سائنس وسائل میں سے ہوئی تو پھر یہ ایک عقلی اصول ہے کہ وسیلہ مقصود کی ضرورت سے اختیار کیا جاتا ہے اور اسی حد تک مقصود میں معین ہو۔ یعنی بقدر ضرورت ورنہ بالا صالہ اس میں انہاک رکھنا اس میں مقصودیت کی شان قائم کرنا جو قلبِ موضوع اور خلاف عقل ہے۔ اس لئے عقلاً ہی یہ بھی واضح ہوا کہ مقصود اصلی یعنی دین سے جدا رہ کر سائنس محض میں انہاک پیدا کرنا کوئی عاقلانہ فعل نہیں قرار پا سکتا۔ بلکہ اسے وسیلہ کی حد تک اور بمقدار ضرورت ہی اختیار کرنا دانائی ہوگی"۔(۷)

اگرچہ مولانا کی کوئی ادبی تصنیف منصۂ شہود پر نہیں آئی لیکن ان کی ایک منظوم کتاب "آنکھ کی کہانی" کے نام سے دو حصوں میں چھپ کر علمی اور ادبی دنیا میں مقبول ہو چکی ہے۔ لیکن ان کی جتنی کتابیں میری نظروں سے گزری ہیں، ان میں استعارہ، کنایہ، تمثیل، جدت وندرت، سہل ممتنع کا اتنا برمحل استعمال ہے کہ ان کی تحریروں میں ادبی شان پیدا ہوگئی ہے جو ان کی خلّاقانہ ذہن کا پتہ دیتی ہیں اور ان کے طرزِ نگارش میں ادبی اور علمی آمیزش سے زبان میں نیا رنگ وآہنگ پیدا ہو گیا ہے جو اپنی معنویت اور افادیت کے لحاظ

سے ہر ادب شناس کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے جس پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ آنے والے وقتوں میں مصنفین اس گوشے کو بھی اجاگر کریں گے۔ انشاء اللہ جس سے ان کی شخصیت کا یہ گوشہ بھی منظرِ عام پر آ جائے گا۔

............❖............

(۱) مولانا محمد اسلم قاسمی، سیرت حلبیہ اردو، ص: ۳۷

(۲) خطبات حکیم الامت، ج ۱، ص: ۱۲۸

(۳) مولانا قاضی اطہر مبارک پوریؒ، خیر القرون کی درس گاہیں اور ان کا نظام تعلیم و تربیت، ص: ۳۷۵

(۴) خطبات حکیم الامت، ج ۳، ص: ۴۱۶

(۵) اسلام پیغمبرِ اسلام ﷺ اور مستشرقینِ مغرب کا اندازِ فکر، ص: ۲۶۵

(۶) حضرت تھانویؒ، مقامِ سیرت ص: ۶۶

(۷) حضرت مولانا محمد طیب قاسمیؒ، سائنس اور اسلام، ص: ۵۷۵

............❖............

حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ اور دعوتِ دین

ابوالبشر اصلاحی

سب ایڈیٹر روزنامہ "سازِ دکن" حیدرآباد

رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ وَ یَسِّرْلِیْ اَمْرِیْ
وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ.
نَحْمَدُهٗ وَ نُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْکَرِیْمِ.

حمد وستائش ہے اس ذات برتر کے لئے جس نے اس کائنات کی تخلیق کی۔ شکر وسپاس ہے اس ذاتِ بے ہمتا کے لئے جس نے ہمیں انسان بنایا، وصفِ انسانیت سے ہمکنار کر کے اشرف المخلوقات کا درجہ عطا کیا۔ بعدہٗ اس ذات اقدس نے ہمیں ایمان کی نعمت سے نوازا کے جس کے توسط سے ہمیں دنیا کی امامت و سیادت کی عظیم ذمے داری عطا کی گئی۔ مستحق حمد وستائش ہے وہ ذاتِ منعم جس نے ہمیں نطق کی نعمت سے نوازا، گویائی کی صلاحیت وقوت بہم پہنچائی۔ عقل وخرد اور علم و ہدایت سے روشناس کرایا، اسی نعمت نطق و معرفت کی بناء پر ہم اپنے مافی الضمیر کی ادائیگی کرتے ہیں۔ اسی بنیاد پر امت مسلمہ کو دعوتِ دین کا فریضہ سونپا گیا اور اعلاءِ کلمۃ اللہ اور غلبۂ دین اس امت کا فرضِ منصبی ٹھہرا۔

درود وسلام ہو نبی آخر رحمۃ للعالمین حضرت محمد ﷺ پر جنھوں نے بھٹکے ہوئے انسانوں کو انسانیت سے ہمکنار کیا۔ اللہ ارحم الراحمین نے رسول اکرمؐ کو دین حق اور راہِ ہدایت کے ساتھ اسی معمورۂ عالم میں مبعوث کیا۔ آپؐ کے ذریعہ دین اسلام تمام ادیان وملل پر غالب ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو دعوتِ دین اعلاء کلمۃ اللہ اور غلبۂ دین کے لئے علم (وحی) وقلم کی جامعیت عطا کی اور اسی راہ میں نصرت وتمکین کے لئے رعب اور تلوار

عطا کی۔اسی طرح اللہ پاک کی رحمتِ واسعہ اور رسول اللہؐ کی محنت شاقہ کا ثمرہ ہے کہ اللہ کا دین آج ہم تک پہنچ چکا ہے۔**فلھٰذا اشکروا اللّٰہ و صلّوا علیٰ رسولہ الکریم صلی اللّٰہ علیہ وسلم.**

حکیم الاسلامؒ کا اجمالی تعارف

چودھویں صدی ہجری میں عالم اسلام کے افق پر جو عظیم المرتبت شخصیات منصۂ شہود آئی ہیں انہیں میں سے ایک مایۂ ناز، موثر اور عہد آفریں شخصیت کا نام نامی مولانا محمد طیب صاحبؒ ہے جو خلقِ خدا میں حکیم الاسلام کے لقب سے ملقب ہوئے۔ یہ وہ عظیم شخصیت ہے جس کے تذکرہ کے بغیر چودھویں صدی کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔آپ علم وفضل کے بحر بیکراں تھے۔ بیانِ حق وصدق میں تیغ برّاں تھے۔آپ ورع وتقویٰ کے پیکر، امراض نفس کے حکیم حاذق، علوم جدید سے واقف، محی السنۃ اور ماحی ضلالت وبدعت تھے۔حکیم الاسلامؒ ان عظیم شخصیتوں میں سے ایک ہیں جو غلبۂ دین اور اشاعت اسلام کے لئے بے قرار رہتے ہیں۔آپ نے حریت افکار اور دمکتے ہوئے کردار کے ذریعہ علم وعمل کا ایسا حسین وجمیل عہد تعمیر کیا، جس کی تابندہ کرنیں آج بھی گمراہ دلوں میں اجالا کر دیتی ہیں۔آپ کا عظیم کردار اور عظیم خدمات اس کے حد درجہ لائق ستائش ہیں۔

آپ کی حیات وخدمات دراصل ان عظیم شخصیتوں کے سلسلۃ الذہب کی ایک سنہری کڑی ہے جو دعوت دین اور غلبۂ دین کے لئے اتباع سنت، جرأت مندی اور حق گوئی کا ایسا مرقع تھے جن کے سامنے باطل قوتیں حواس باختہ ہوگئیں۔دشمنانِ اسلام کی سطوت سرنگوں ہوکر رہی اور بدعت وخرافات اور گمراہی وباطل نظریات کا خرمن خاکستر ہوگیا۔نتیجتاً حق وصداقت کے گلشن پر بہاریں عود کرآئیں۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پر روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

حکیم الاسلام مولانا طیب صاحبؒ کے متعلق مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی نے بڑی مبنی برحقیقت بات بیان کی ہے۔مفتی صاحب رقم طراز ہیں:

’’یہ بات بلا خوف تردید لکھنے کے لائق ہے کہ اگر امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ سیاسی جھمیلوں اور بکھیڑوں میں نہ پڑتے اور حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ اہتمام دارالعلوم کی ذمے داریوں اور الجھنوں میں نہ الجھائے گئے ہوتے تو یہ دونوں فخر روزگار اور شانِ ہندوستان شخصیتیں اپنے اپنے وقت کے امام غزالی، علامہ ابن تیمیہؒ کی ہم رتبہ ہوتیں۔‘‘(۱)

نام نہاد سیاست سے اجتناب

حکیم الاسلامؒ کی خوبیوں میں سے ایک عظیم خوبی جو میرے لئے لائق اعتناء ٹھہری ہے وہ یہ کہ آپ نے نام نہاد سیاست اور باطل اقتدار سے بالکلیہ اجتناب کو اپنے لئے شانِ استغناء بنائے رکھا۔اس طرح آپ تاعمر حکم خداوندی ''فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ'' کی عملی تفسیر بنے رہے نیز ''اِنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَةُ الْاَنْبِيَاءَ'' کا حقیقی حق ادا کیا، بایں وجہ کہ انبیاء کرام کا عظیم ورثہ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ہی ہے۔مولانا محمد طیب صاحبؒ کے نام نہاد سیاست سے اجتناب پر محمد اکبر شاہ بخاری لکھتے ہیں ''کہ آپ سیاست سے الگ رہ کر علمی دنیا کے سیاح اور عمل کی وادیوں میں تھے۔''

مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی صاحب رقم طراز ہیں ''حکیم الاسلامؒ سیاسی ہنگاموں اور انتخابی نعرہ بازیوں کے لئے موزوں نہ تھے، جب کبھی حالات کے دباؤ یا کسی بزرگ کے سیاسی تصرف کی وجہ سے اس علمی دائرہ سے باہر قدم نکالنے کی کوشش کی تو فوراً ان کو محسوس ہوا کہ یہ ان کا میدان نہیں ہے۔''(۲)

حکیم الامت مولانا تھانویؒ کی اس تلقین کا آپ نے عمر بھر لحاظ رکھا۔تھانویؒ نے فرمایا تھا:''میں نے قرآن وسنت اور عمر بھر کے تجربہ سے مدرسہ کے بارے میں جو کچھ اصلح سمجھا وہ یہ کہ مدارس اور ان کے متعلقین کو سیاست حاضرہ سے بالکل مجتنب رہنا چاہئے۔''

حکیم الاسلامؒ کی شخصیت کا یہ پہلو دور حاضر کے علماء کرام اور اہلِ مدارس کے لئے ایک واضح آئینہ ہے جو اقتدار وقت کے کل پرزے بننے اور طاغوت کی کاسہ لیسی کرنے کے لئے سرگرم عمل رہتے ہیں۔حالاں کہ حکیم الاسلامؒ اپنی خداداد صلاحیت، زور آواز انداز، خطابت اور مثالی حسن انتظام کی صلاحیت کی بناء پر اگر چاہتے تو وقت کے عظیم سیاسی قائد اور ممبر پارلیمنٹ بہ آسانی بن سکتے تھے لیکن آپ کی فطری خداترسی اور بصیرت نے آپ کو سیاست حاضرہ کی گندگی سے بچالیا۔

مسلکی انتشار، مذہبی گروہ بندی اور عصبیت باطلہ سے مبرّا

حکیم الاسلامؒ کی عظیم شخصیت کا ایک عظیم پہلو یہ بھی ہے کہ مسلکی انتشار، مذہبی گروہ بندی اور ہر طرح کی عصبیت باطلہ سے اپنے کو پاک رکھا، آپ کی اس عظیم خوبی کا اعتراف مفتی فضیل الرحمٰن اس طرح کرتے ہیں ''حکیم الاسلامؒ مذہبی گروہ بندی اور جماعتی عصبیت کی مریضانہ ذہنیت سے بالکل پاک تھے، آپ کی مقناطیسی اور برگزیدہ شخصیت ۱۸ کروڑ مسلمانوں کے ان گنت فرقوں اور جماعتوں کے درمیان ایسی معتدل

اور متوازن اور غیر جانب دار رہی کہ ہر مکتب فکر کے افراد نے آپ کی بلند ظرفی وسیع القلبی کی وجہ سے آپ پر پورا بھروسہ اور اعتماد کیا اور اپنے لئے غیر مضر سمجھا۔ بایں وجہ ۲۷، ۲۸ دسمبر ۱۹۷۲ء کو بمبئی میں آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کا تاریخی اجلاس ہوا تو باتفاق آراء آپ ہی علماء اور دانشوران ہند کی اس عظیم تنظیم کے صدر اول بنائے گئے اور تاحیات اس منصب جلیل پر فائز رہے۔ (۳)

حکیم الاسلامؒ کا یہ عظیم اسوہ ہمارے لئے لائق اتباع ہے کہ ہم مذہبی گروہ بندی اور مسلکی تعصب سے اوپر اٹھ کر هٰذِهٖ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً کی عملی تفسیر بنیں۔ اسی دور میں جب کہ امت مسلمہ بحیثیت امت ہر جگہ دشمنانِ اسلام کے لئے ظلم وستم کا ہدف بنی ہوئی ہے۔ ضروری ہے کہ ہم متحد ہو کر دشمنانِ اسلام کی یلغار کا مقابلہ کریں اور اَنْ اَقِیْمُو الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا کے حکم آفریں کو اپنے لئے حرزِ جاں بنالیں اور دل کو بڑا کرلیں۔ ہر کلمہ گو بھائی کو اپنے دل میں جگہ دیں اور ان کی مخالفت میں زبان دراز نہ کریں۔ اس وقت جب کہ عالم کفر اسلام کے خلاف پوری طرح کمر بستہ ہے اور دشمنانِ اسلام اَلْكُفْرُ مِلَّةٌ وَّاحِدَةٌ کی عملی تفسیر بنے ہوئے ہیں۔ ضروری ہے کہ ہم وطنی سرحدوں، مسلکی حد بندیوں کو توڑ کر هٰذِهٖ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً کی عملی تفسیر بن جائیں۔

''دینی دعوت کے قرآنی اصول'' حکیم الاسلامؒ کی عظیم تصنیف

اصول دعوت کے عظیم فن پر حکیم الاسلام مولانا طیب صاحبؒ نے ایک عظیم کتاب تصنیف کی ہے جس کا نام ''دینی دعوت کے قرآنی اصول'' ہے۔ حکیم الاسلامؒ کی اس معرکۃ الآراء تصنیف میں سورۂ نحل کی آیت اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ سے دینی اصول پر بڑی سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ یہ عظیم کتاب اعلاء کلمۃ اللہ کے راہیوں اور داعیانِ اسلام کے لئے ایک بہترین گائیڈ کی حیثیت رکھتی ہے جو ان کے لئے دعوت دین کی راہ میں ہر جگہ ہادی ورہنما ثابت ہوگی۔ حضرت مولانا سالم صاحب قاسمی مدظلہٗ کے بقول یہ عظیم کتاب ایک ایسا متن ہے جو ابلاغ دین کے لئے مکمل رہنما کتاب ثابت ہوگی۔ مولانا محمد سالم صاحب قاسمی اس عظیم کتاب کے متعلق رقم طراز ہیں:

''پیش نظر کتاب ''دینی دعوت کے قرآنی اصول'' حکیم الاسلامؒ کی اسلام کے مزاجِ اجتماعیت ودعوت پر اس عمیق ترین نگاہِ بصیرت کی غماز ہے کہ جس نے ان کو جماعت علماء کرام میں ایک منفرد اور مسلم مقام عظمت پر فائز فرمایا۔ اس لئے دعوتِ دین کے لئے موفق علماء کام کے لئے یہ کتاب ایسا متن ہے کہ جو

حسب ظروف واحوال دنیا کے تمام ملکوں، تمام قوموں اور تمام ادیان وملل کے سامنے موثر ترین اسالیب پر مشتمل ابلاغ دین کی انشاء اللہ ایک مکمل راہنما کتاب ثابت ہوگی''۔(۴)

دعوت دین کی اہمیت وضرورت

امت محمدیہ نبی آخر حضرت محمدؐ کی جانشین ہے۔لہٰذا دعوت دین اور شہادت حق کا وہی فریضہ اس امت کو بھی انجام دینا ہے جو خدا کے انبیاء کرام انجام دیتے رہے ہیں۔ اللہ پاک نے دعوت دین کی اہمیت وفرضیت کے لئے قرآن مجید میں جگہ جگہ تلقین کی ہے اور دعوت دین وشہادت علی الناس کے لئے امت مسلمہ کو اللہ نے منتخب کرلیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (سورۂ بقرہ)

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں دعوت کی فضیلت اس طرح بیان کی ہے:

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا اِلَى اللّٰهِ وَ عَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ. (حم سجدہ)

آیت کریمہ میں دعوت دین کو عملِ دین پر بھی فضیلت دی گئی ہے اور استفہام بقصد نفی کی تعبیر نے دعوت دین کی اہمیت کو مزید آشکارا کردیا ہے۔

دعوتِ دین کی اہمیت کے متعلق مولانا محمد طیب صاحبؒ اپنی مایہ ناز تصنیف میں رقم طراز ہیں:

''اسلامی نقطۂ نظر سے انسانی سعادت کا دارومدار دو چیزوں پر ہے۔صلاح اور اصلاح یعنی خود صالح بننا اور دوسروں کو صالح بنانا یا خود کمال پیدا کر کے دوسروں کو باکمال کردینا، جس کا حاصل یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات میں محض لازمی اور ذاتی نفع پر قناعت نہیں کی گئی ہے بلکہ اس کو متعدی بنایا گیا ہے کہ ایک سے دوسرے تک پہونچے۔''(۵)

دعوت دین کی ضرورت

عالِم انسانیت کی شومئی قسمت رہی ہے کہ یہ عقل وادراک کی بے پناہ قوتوں کے باوجود تاریخ کے ہر دور میں کائنات کی دوسری مخلوقات کی بنسبت بے عقلی اور فریب کی زنجیروں میں افسوس ناک حد تک گرفتار رہا ہے۔مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ جس حقائق اور متعلقات سے اسی کا زیادہ واسطہ رہا اسی کو سمجھنے میں اس نے زیادہ غلطی کی ہے۔مثلاً خود انسان کا خالق اور خالق کائنات ''اللہ'' جس سے انسان کا تعلق ابتدائے آفرینش سے ہے۔اس کے متعلق ان لوگوں میں بھی جو اللہ کے عقل ونگاہ سے پرے ہونے کے باوجود اسے تسلیم

کرنے پر مجبور ہیں نہ یہ کہ اتفاق نہیں پایا جاتا بلکہ اس بارے میں کوئی معتدل اور متوسط نقطۂ نظر قائم کرنے میں بھی یہ لوگ ہمیشہ ناکام رہے ہیں۔ اللہ کو چھوڑ کر بے شمار قوتوں کو اپنا حکمراں بنائے ہوئے ہیں۔ اس طرح دوسرے مواقع جہاں انسانیت کی فلاح و بہبود اور اس کا مقصد وجود وابستہ ہے وہاں بھی انسان غچے کھاتا پھرتا ہے۔ روح، جزا و سزا وغیرہ ماورا موضوعات کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی سے وابستہ چیزوں کے معاملہ میں بھی انسان ہر دور میں فریب خوردہ دکھائی دیتا ہے۔ اس طرح عقل خود مطالبہ کرتی ہے کہ بھٹکی انسانیت کے لئے کوئی راہنما کوئی ایسا داعی ہونا چاہیئے جو راہ راست کی دعوت دے سکے۔ لہٰذا فریب خوردہ عقل وادراک کو دین کی دعوت دینا اور اسے قرآن وسنت کی میزان دے دینا عین انسانیت کی پکار ہے۔ اسی ضرورت کی برآوری کے لئے دین کی دعوت ہر دور میں ناگزیر رہی ہے۔

دعوت دین امت مسلمہ پر عائد ایک اہم ترین فریضہ ہے تاکہ جہالت، گمراہی، شرک اور باطل نظریات میں لت پت انسانیت کو ہدایت کی راہ پر لایا جاسکے۔ اسی فریضہ سے عدم توجہی نے ایک طرف کفر و شرک میں مبتلا عامۃ الناس کے لئے ہدایت کی راہیں مسدود کر کے انہیں خدا کے غضب کی طرف جانے کی خاموش اجازت دی جو فی الواقع کنبۂ آدم کے لئے انتہائی المناک ہے۔ دوسری طرف اس فریضہ سے غفلت نے کفر و شرک کے علم برداروں کو ہم پر اتنا جری کر دیا کہ خود مسلمانوں کو کفر و شرک کی طرف دعوت دی جانے لگی۔ نتیجتاً مسلمان دعوت واقدام کے بجائے مدعو بننے اور محض دفاع کرنے کے لئے مجبور ہو گئے۔ شدھی تحریک، بہائی دھرم، عیسائی مشنریوں کی سرگرمیاں اور کمیونزم سرمایہ داری ڈیموکریسی، سیکولرزم جیسے نظریات کے ذریعہ امت کے جدید ذہنوں پر حملے دراصل ہماری اسی غفلت کا آئینہ دار ہیں۔ اس فریضے سے غفلت اور عدم توجہی نے ہی عملاً مسلمانوں کو اقدار اور ارتقاء سے دفاع وتنزل کی طرف گامزن کر دیا ہے۔ اسی تعلق سے حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ لکھتے ہیں:

''صد حیف کہ آج یہ منصوبہ مسلمانوں سے تقریباً ختم ہو چکا ہے اور اسی لئے اقوام غیر کی نسبت سے ان کی برتری اور فوقیت جس نے انہیں خیر امت بنایا تھا۔ فسانۂ ماضی ہو کر رہ گئی ہے۔ نیز اسی لئے یہ امت اقدامی ہونے کے بجائے جو اس کی اصل شان تھی محض دفاعی بن کر رہ گئی ہے اور ظاہر ہے کہ دفاع محض نہ یہ کہ ارتقاء کا راستہ بند کر دیتا ہے بلکہ زوال وفنا کا پیش خیمہ بھی ثابت ہوتا ہے چنانچہ امت پر محض اقدامی صورت حال کے ختم ہو جانے سے اقوام کی یلغار ہے۔ امتیں اس پر ٹوٹی پڑ رہی ہیں اور امت مرحومہ ان یلغاروں کا دفاع کرتے کرتے نہ یہ کہ صرف تھک چکی ہے بلکہ تقریباً مایوسی کا شکار ہے۔''(۶)

حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ اوران سے قبل کے علماء کرام دعوت دین کی اہمیت اوراس سے غفلت کے نتائج سے واقف ہیں۔ بانی تبلیغی جماعت مولانا محمد الیاس صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ''اگر تم داعی نہیں بنو گے تو دوسروں کے مدعو بن جاؤ گے۔'' حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ آیت کریمہ کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَاءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَاءَ'' مسلمانوں کو تو ان سے ملتے ہوئے اسی کا خیال نہیں ہوتا کہ ان کو مسلمان بنائیں اور وہ ہر وقت دل میں یہی خیال رکھتے ہیں کہ مسلمانوں کو کافر بنائیں۔(۷)

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ رقم طراز ہیں:

''دعوت دین کی اہمیت کے باوجود امت مسلمہ کی اکثریت اس سے غافل نظر آتی ہے جس کی عدم ادائیگی کی وجہ سے متعدد ملکوں اور علاقوں سے اپنا وقار واعتماد، حکومت واقتدار کھونا پڑا اور جس کا خمیازہ وہ آج بھی بھگت رہی ہے۔ خصوصاً غیر مسلموں میں دعوتی کام نہ ہونے کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ غیر مسلم دولت اسلام سے بے بہرہ اور صحیح طرز زندگی سے ناآشنا ہیں بلکہ وہ اپنے اخلاق سوز وایمان دشمن نظریات وتحریکات اور باطل نظام حیات کو امت مسلمہ اور خیر امت کے سروں پر تھوپ رہے ہیں۔ مجموعی طور پر سارا عالم اسلام دین حق کا داعی بننے کے بجائے باطل افکار ونظریات کا مدعو بلکہ طفیلی بنا ہوا ہے۔''

دعوت دین کے متعلق غلط فہمیاں

دعوت دین ''تبلیغ اسلام اور To Preachs of Islam کے متعلق ایک عام غلط فہمی یہ پائی جاتی ہے کہ تبلیغ اسلام اور دعوت دین دراصل مسلمانوں کی اصلاح کر دینے، ان کو عبادت کے رنگ میں رنگ دینے کا نام ہے۔ دلیل یہ دی جاتی ہے کہ پہلے مسلمانوں پر تبلیغ کی جائے۔ غیر مسلم انہیں دیکھ کر مسلمان ہو جائیں گے۔'' دعوت وتبلیغ کا یہ غلط مفہوم اور اس کے لئے بھونڈی دلیل دراصل ایک خطرناک غلطی ہے۔

حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ اس غلط فہمی کی سخت مخالفت کرتے ہیں۔ آپ لکھتے ہیں:

''تبلیغ اسلام کے معنی پشتینی مسلمانوں کو عباداتی رنگ کے کچھ احکام پہنچا دینے اور انہیں وابستہ کر دینے کے لئے نہیں کہ جس کے بعد یہ سمجھ لیا جائے کہ فریضۂ تبلیغ ادا ہو گیا یا ارباب تبلیغ فرائضِ دعوت سے سبکدوش ہو گئے۔ مجھے اسی انداز کی کسی دعوت خاص کی ضرورت اور افادیت سے اگرچہ انکار نہیں لیکن اسے فریضۂ تبلیغ سے سبکدوشی سمجھ لیا جانا قرآن کے اصول تبلیغ کی روشنی میں یقیناً صحیح نہیں قرار دیا جا سکتا۔ یہ جزو تبلیغ

وتذکیر واصلاح وغیرہ کے عنوانات سے یاد کی جاسکتی ہے مگر عرف شریعت کے لحاظ سے اسے تبلیغ نہیں کہا جاسکتا کیوں کہ عرف شریعت میں تبلیغ درحقیقت اسلام پہنچانے اور اسلام برادری کے وسیع کرنے کو کہا گیا ہے۔اسی لئے تبلیغ اپنے حقیقی معنی میں (غیر مسلموں کو) اسلام کا پیغام پہنچانے کا نام ہے۔''(۸)

اسی طرح ایک اور غلط فہمی ذہنوں میں رچی بسی ہوئی ہے کہ کسی مسلمان یا کسی انسان کو نیکی کی کوئی بات ہدایت و خیر کا کوئی وظیفہ بتا دیا جائے یہ بھی تبلیغ دین اور دعوت دین ہے۔ چنانچہ اسی غلط فہمی کی بناء پر غیر مسلموں کو اصل دعوت نہ دے کر محض کچھ معروضات، خیر خوبی کی باتیں اور اصلاح معاشرہ کی نوعیت کی احادیث وآیات سنائی جاتی ہیں پھر اس کا موازنہ غیر مسلموں کی مذہبی کتابوں سے بھی کیا جاتا ہے، نتیجتاً ہر کوئی اپنے مذہب کو خیر وصلاح کا مذہب قرار دے کر مطمئن ہو جاتا ہے۔افسوس اس عجیب وغریب طریقہ کو بھی دعوت وتبلیغ کا نام دیا جاتا ہے۔

حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ اس سلسلے میں رقم طراز ہیں:

''پھر اسی سبیل رب کے کلمہ سے فعل دعوت کی نوعیت بھی خود ہی متعین اور مشخص ہو جاتی ہے کہ شریعت پہنچانے اور تبلیغ دین کرنے کا نام فعل دعوت ہے۔ مطلقاً کسی نہ کسی بات کے پہنچا دینے یا کسی نہ کسی معقول یا بھلی بات کے کہہ دینے کا نام دعوت نہیں ہے ورنہ اُدْعُ کے بعد سبیل رب کا کلمہ نہ لایا جاتا بلکہ اُدع پر قناعت کرلی جاتی تو اس میں عموم رہتا کہ جو چاہو پہنچا دو وہی فعل دعوت اور اُدْعُ کی تکمیل ہوگئی مگر جب اس فعل کو سَبِیْلِ رَبِّ سے مقید کر دیا گیا تو واضح ہو گیا کہ محض کسی نہ کسی چیز کے پہنچانے ہی کے فعل کو فعلِ دعوت کہا جائے گا۔''(۹)

حکیم الاسلامؒ کے مذکورہ بالا دو غلط فہمیوں کے ازالہ میں اجمالاً ایک اور حقیقت واضح ہوتی ہے کہ دینِ دعوت اور دین کی تبلیغ میں دعوت وتبلیغ دین کی ہونی چاہئے جس کو آپ نے شریعت اور سبیل رب کی معنویت سے واضح کیا ہے۔لہٰذا ان غلط فہمیوں کا ازالہ کے لئے دین کے مفہوم کو سمجھنے کی بھی ضرورت ہے۔

دین کا مفہوم

دین کے معنی عربی زبان میں اس طرح ہیں و **کلمة الدین معناها (۱)القهر والغلبة (۲)التعبد والطاعة (۳)الشریعة ای الحدود والقوانین التی تتبع (۴)المحاسبه والجزاء والاقارب**(۱۰)

اس دین کے معنی تسلط وغلبہ بندگی واطاعت شریعت اسلامی قوانین اسلامی اورمحاسبہ جزاء وسزا ہے۔

اس طرح دین کی دعوت کا مطلب یہ ہوا کہ اس بات کی دعوت دی جائے کہ اللہ کی زمین پر تسلط وغلبہ اللہ کی شرعی حاکمیت ہی کا ہو۔ ادیان باطلہ کو زیر نگیں ہوکر رہنا چاہئے۔ بندگی واطاعت صرف اللہ کی کی جائے۔ غیر اللہ کی بندگی سے باز آیا جائے اور شریعت مطہرہ ہی کی فرماں روائی ہو۔ اس سے روگردانی کی صورت میں محاسبہ وگرفت اور جزاء وسزاء کا نظم قائم ہوجائے۔ دعوت دین کا مفہوم ان سارے امور پر محیط ہے۔ لہٰذا مولانا محمد طیب صاحبؒ کا اشارہ اسی جانب ہے کہ فریضۂ دعوت وتبلیغ کو اسی کے تمام مطلوبات کے ساتھ ادا کیا جائے۔

دعوت دین واعلاء کلمۃ اللہ امت کی شوکت کا ضامن

غلبہ وحکمرانی امت مسلمہ کا وطیرہ ہے۔ عزت وسربلندی مسلمانوں کی میراث ہے لیکن مسلمانوں کی عظمت وسربلندی اس دین کی سربلندی سے وابستہ ہے۔ امت مسلمہ کو اسی وقت عزت و وقار کی زندگی حاصل ہوسکتی ہے جب دین تمام ادیان باطلہ پر غالب ہو۔ رسول اکرم ﷺ اسی مقصد عظیم کی خاطر مبعوث ہوئے تھے۔ هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی و دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ وَلَوْ کَرِهَ الْمُشْرِکُوْنَ اسلام آیا ہی غالب اور سربلند ہونے کے لئے الاسلام یعلو ولا یعلیٰ (حدیث) لہٰذا امت مسلمہ کو اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کرنے اور عظمت رفتہ کے حصول کے لئے ضروری ہے کہ وہ دعوت دین، اظہارِ دین اور غلبۂ اسلام کے لئے اٹھ کھڑی ہو، ورنہ غلط راہوں پر چل کر کبھی بھی اسے عزت وشوکت حاصل نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ دعوت دین اور غلبہ اسلام کا مقصود ومطلوب بھی غلط راہوں اور غلط طریقہ کار سے حاصل نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا دعوت دین اور غلبہ اسلام اور مسلمانوں کی عزت وسطوت یہ دونوں مطلوب ومقصو قرآن کی متعین کردہ راہ پر چل کر ہی حاصل کی جاسکتی ہے۔ مولانا محمد طیب صاحبؒ نے دونوں حقائق کو بڑے لطیف پیرایہ میں سمودیا ہے۔ آپ لکھتے ہے:

''اور یہ دینی وایمانی ملکات جن میں علم ومعرفت کی حدود اور عمل کی معتدل بنیادیں استوار ہوں وہی دین ہے جو مستند علم اور اخلاق کا مجموعہ ہے۔ اس لئے حدیث نبوی کا صاف مطلب ومنشاء یہ نکلا کہ تم اقوام پر دین سے غالب آسکتے ہو، دنیوی عہدوں، منصبوں، رسمی شوکتوں کے منصوبوں اور دولت کے ذخیروں سے غلبہ نہیں پاسکتے۔''(۱۱)

اس پیرایہ میں ایک واضح حقیقت یہ آشکارا ہوئی ہے کہ دعوت دین اور اعلاء کلمۃ اللہ ہی کے ذریعہ امت مسلمہ عزت وشوکت سے ہمکنار ہوسکتی ہے۔ دوسری ایک حقیقت بڑے لطیف اور مضمر انداز میں بیان کی گئی ہے کہ دعوت دین اور غلبۂ دین کی ذمے داری ادا کرنے کے لئے کسی غلط راہ اور خارجی شرائط کی قطعاً ضرورت نہیں ہے بلکہ دینی وایمانی ملکات اور علم ومعرفت کی حدود ہی داعی کے لئے اصل مشعل راہ ہیں۔ اس کے لئے شیروں کا دل اور چیتے کے جگر کی ضرورت ہے۔ عیش نہیں اور عافیت کوشی ترک کردینے اور دعوت کا انبیائی انداز اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ دعوت دین کی راہ میں بوڑھے ہوکر مرنے کے بجائے جوانی ہی میں شہید ہوجانے کی تمنا کی ضرورت ہے، تاکہ خون شہادت خود ایک دعوت بن جائے۔ افسوس ہم اس غلط گمانی میں خوش گمان ہیں کہ باطل کی راہ سے بھی حق غالب ہوگا۔ اخلاقیات کے نعرے، جمہوریت کی دل رُبا فریبی راہیں، حقوقِ انسانی کی چیخیں یہ سب شیطان کے وہ سنہرے جال ہیں جس میں وہ داعیانِ حق کو پھانسی دے کر انہیں ان کے فرضِ منصبی سے دور کرنا چاہتا ہے۔''

بدعات و باطل نظریات کی تبلیغ جائز نہیں

حکیم الاسلامؒ نے اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ کو اچھی طرح واضح کرتے ہوئے صاف طور پر وضاحت کردی ہے کہ تبلیغ اور دعوت صرف ''سبیل رب'' ہی کی ہونی چاہئے۔ تبلیغ و دعوت اللہ کا عطا کردہ فریضہ ہے اور اللہ نے خود حکم دیا ہے کہ صرف میرے راستے کی طرف لوگوں کو بلاؤ۔ اب اس حکم قطعی کے بعد کسی اور طرح کی دعوت کسی اور چیز کی تبلیغ بالکل جائز نہیں۔ بدعات وخرافات جو دین کے نام پر گڑھ لی گئی ہیں دین کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لہٰذا بدعات کی دعوت وتبلیغ بھی ناجائز ہوگی۔ اسی طرح نام نہاد حکمت کے تحت لوگ باطل نظریات کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے ہیں۔ مثلاً کمیونزم، سیکولرزم، ڈیموکریسی وغیرہ کی تبلیغ قرآن کی رو سے نہ یہ کہ صرف ناجائز ہے بلکہ لوگوں کو ظلم وعدوان کی تبلیغ کرنے کے مترادف ہے۔

حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ رقم طراز ہیں:

''نیز جب کہ عبارت آیت میں منطوقاً امر کیا گیا ہے کہ تبلیغ خدا کے راستہ کی گرد اور خدا کا راستہ وہی شریعت یا شریعاتی پروگرام ہے جو اخلاق ربانی اور علم الٰہی پر مشتمل ہے، اس سے واضح ہوا کہ دین کے نام پر اختراعات ومحدثات اور بدعات کی تبلیغ جائز نہیں کہ وہ خدا کے راستہ کا پروگرام ہی نہیں وہ سبیل رب ہونے کے بجائے سبیل نفس یا سبیل خلق ہے جو عموماً مذہبی لوگوں کے غلو، تعمقِ نظر اور تکلف سے پیدا ہوتا ہے۔'' (۱۲)

حکیم الاسلامؒ بالکل واضح طور پر فرماتے ہیں کہ دعوت کا مطلوب سبیل رب یعنی توحید وشریعت اسلامی ہے۔ یہ وہ واضح مطلب ہے جو ہر دور میں ایک رہی ہے۔ تمام انبیاء کرام کی دعوت کا ایک ہی موضوع رہا ہے۔ وہ یہ کہ انسانوں کو ان کے حقیقی پروردگار خدائے واحد سے آشنا کرایا جائے۔ انہیں عرفانِ الٰہی دے کر رب الٰہی کی غلامی میں داخل کیا جائے اور دنیا میں انسانوں کی حاکمیت وربوبیت کی بساط لپیٹ دی جائے۔ تاریخ انسانی کے ہر دور میں انسان حقیقی رب کی معرفت میں غلطاں و پیچاں رہا ہے۔ اللہ کے ساتھ الوہیت میں دوسروں کو شریک ٹھہراتا رہا ہے۔ کبھی عقیدہ وعبادت میں کبھی حاکمیت غیر اللہ کی اتباع کی صورت میں یہ دونوں صورتیں انسانوں کو اللہ کے دین سے دور لے جانے والی تھیں۔ چنانچہ انسانیت کی رہنمائی کے لئے ہر دور میں انبیاء کرام آتے رہے ہیں اور انسانوں کو عرفانِ الٰہی کے ذریعہ حاکمیت الٰہی میں داخل کرتے رہے ہیں۔ اسی طرح ہر نبی نے ایک ہی دعوت دی ہے کہ بالکلیہ اللہ کی بندگی کرو، طاغوت سے اجتناب کرو، انبیاء کرام کی دعوت کی یکسانیت کے لئے ملاحظہ ہو۔ (سورہ ہود، سورہ شعراء، ۱۰۵-۱۱۰، شعراء-۱۴۱، بقرہ ۲۵۶، نحل، اعراف، طٰہٰ-۵۰ مریم-۳۶)

دعوت دین جاہلی عصبیتوں اور حد بندیوں سے آزاد ہے۔ دین اسلام کسی شخصیت، جگہ، قبیلہ سے موسوم و منسوب نہیں ہے اور نہ ہی کسی عصبیت جاہلیہ کی مظہر ہے۔ لہٰذا دوسرے مذاہب کی طرح دین اسلام میں شخصیت پرستی، مقام وقبیلہ پر مفاخرت وغیرہ کا کوئی تصور پایا نہیں جاتا بلکہ اسلام دوسرے مذاہب کے برعکس اللہ واحد کی بندگی اور ہر طرح کے خیر کا نام ہے۔ اس طرح دین اسلام وطنیت، قومیت، شخصیت اور کمیونزم و رہبانیت جیسی عصبیتوں کی حد بندیوں سے بالکل آزاد و مبرا ہے۔ لہٰذا دعوت دین کا مطلب ان تمام حد بندیوں کو توڑنا ان عصبیتوں کا قطع کرنا ہے اور اللہ کے اس پسندیدہ دین کو پوری دنیا پر غالب کر دینا ہے۔

حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ اس حقیقت کو اجمالاً تحریر کرتے ہیں:

”بہرحال یہ رہبانیت خیز اور گوشہ گیر مذاہب عموماً یا وطنی حد بندیوں میں جکڑے ہوئے ہیں یا قومی بندھنوں میں بندھے ہوئے ہیں حتی کہ ان کے اسماء ہی سے یہ وطنی، قومی اور شخصیتوں کی حد بندیاں اور تنگیاں نمایاں ہیں۔ ہندو مذہب ملک کی طرف، یہودی مذہب قوم کی طرف اور بدھ مذہب یا عیسائیت شخصیتوں کی طرف منسوب ہے اس لئے ان کے اسماء ہی ان کی عمومیت اور ہمہ گیری سے انکاری ہیں۔

اسی حقیقت کو نبی کریمؐ نے اس حکیمانہ اور بلیغ انداز تعبیر سے ظاہر فرمایا ہے کہ:

”کان النبی یبعث الیٰ قومہٖ خاصۃً و بعثتُ الیٰ الناس کافۃ“

’’نبی اپنی ہی مخصوص قوم کی طرف مبعوث کیا جاتا تھا اور میں دنیا کے تمام انسانوں کی طرف بھیجا گیا ہوں۔‘‘ (۱۳)

دعوت دین اور نیشنلزم (وطنیت)

اسلام وطنیت کے بت کو پاش پاش کرتا ہے۔ یہ عالمگیر دین نیشنلزم کے تصور اور نظریہ کو ایک خطرناک جہالت متصور کرتا ہے۔ علامہ اقبال نے وطنیت کی باطل خدائی کو مذہب کا کفن قرار دیا ہے اور اس بت کو پیوند خاک کرنے کی تلقین کی ہے۔

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے　　جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھادے　　اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے

’’وطن کی محبت اسلام کا جز ہے‘‘ یہ ایک گڑھی ہوئی حدیث ہے۔ اس کی کوئی سند نہیں۔ عبداللہ عزام نے علامہ ابن حزم کے حوالہ سے اسے لغو اور گڑھی ہوئی حدیث قرار دیا ہے۔ (دیکھنا قافلہ چھوٹ نہ جائے)

اسلام کا نعرہ ہے **لاشرقية ولاغربية** اسی طرح دین کی دعوت وطنی سرحدوں اور حدبندیوں سے آزاد دنیا کے ہر خطے اور علاقے کے لئے ہے۔

حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ اس حقیقت کو بڑے مدلل انداز میں تحریر کرتے ہیں:

’’اسلام نے ان تعلیمات کا خاص اہتمام کیا ہے جو اسے پھیل جانے اور ہمہ گیر بن جانے میں خاص اثر رکھتی ہوں اور اس کی عالمگیر تبلیغ کے لئے متقاضی ثابت ہوں۔ مثلاً وہ وطن حدبندیوں سے آزاد ہو اور ساری دنیا اس کا وطن ہو تو حضرت داعی اسلام ﷺ نے فرمایا: **جُعِلتُ لِيَ الارض مسجداً و طهوراً** (ابن ماجہ) میرے لئے ساری زمین کو مسجد اور ذریعہ پاکی بنایا گیا ہے۔‘‘

دوسری جگہ حلقہ بگوشان اسلام کو سارے عالم کی فتوحات کی بشارت اور ترغیب دیتے ہوئے فرمایا جس کا مقصد ساری دنیا کو ان کا وطن باور کراتا ہے: **ستفتح عليكم ارضون و يكفيكم الله فلا يعجز أحدكم ان يلهو بأسهمه.**

عنقریب تم پر زمینیں فتح ہوں گی اور خدا تمہارے لئے کافی ہے مگر پھر بھی تم میں سے کوئی شخص تیر اندازی (فنونِ جنگ) سے عاجز نہ ہو جائے۔

ایک جگہ مغرب و مشرق کی فتوحات کی بشارت دیتے ہیں:

ستفتح مشارق الأرض و مغاربها علىٰ أمتى و عمّا لها فى النار إلاَ من اتقى اللّٰه و أدى أمانة (ابو نعيم فى حلية) ''عنقریب مشرق ومغرب میری امت پر فتح ہوں گے۔

ایک جگہ ساری زمین کے خزانوں پر اسلام کا قبضہ دکھاتے ہوئے فرمایا:

أوتيت بمفاتيح خزائن الأرض فؤضعت فى يدى.

مجھے زمین کے خزانوں کی کنجیاں عطا کی گئی ہیں اور خزانے میرے ہاتھ پر رکھ دیئے گئے ہیں۔'' (۱۴)

اسلام اور داعیان اسلام عالمی ہیں

جب اسلام عالمی مذہب ہے۔ اسلام کی دعوت عالمی ہے تو امت مسلمہ بھی عالمگیر امت ہے۔ اہل اسلام کو کسی خاص وطن میں مقید نہیں کیا جاسکتا۔ دشمنان اسلام کی بنائی ہوئی لائنیں انہیں پابند نہیں کرسکتی۔ پوری دنیا ان کا وطن ہے۔ اس لئے کہ مسلم قوم وہ قوم ہے جن کا مذہب عالمی ہے، جس کا خدا پوری دنیا، پوری کائنات کا خدا ہے۔ لہٰذا اللہ پاک نے پوری دنیا کو مسلمانوں کی میراث بنادیا ہے: **يَرِثُهَا عِبَادِىَ الصّٰلِحُوْن.**

لہٰذا دنیا کا ہر خطہ اور ہر ملک مسلمانوں کا ہے۔ ہندوستان، پاکستان، عرب، امریکہ، افریقہ سب مسلمانوں کی واجبی میراث ہیں۔

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا مسلم ہیں ہم وطن سارا جہاں ہمارا

اسی طرح مسلمانوں کی شناخت ان کی قومیت محض یہ ہے کہ وہ توحید کے علم بردار ہیں، مومن اور مصطفوی ہیں اور ان کا وطن ان کا دیس اسلام ہے۔

بازو تیرا توحید کی قوت ہے اسلام تیرا دیس ہے تو مصطفوی ہے

حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ اس حقیقت کو بڑے واضح طور پر تحریر کرتے ہیں۔ آپ رقم طراز ہیں:

''مسلم قوم جس کے ساتھ اسلام وابستہ ہے کسی خاص وطن کی پابند نہیں۔ ساری دنیا اس کا وطن ہے اور کوئی ایک وطن اسے دوسرے وطن سے روک نہیں سکتا۔ بلکہ سارے عالم میں مسلم قوم کے پھیل جانے اور آخر کار اس کے ہمہ گیر اقتدار اور عالمی قبضہ کی خبر دی گئی ہے۔ اس لئے دنیا میں اس کے پھیل جانے کی خبر دراصل اسلام کے پھیل جانے اور عالمی بن جانے کی اطلاع جو اس کی قوم کے راستہ سے واقعہ بنے گی۔ **هُوَ الَّذِىْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدىٰ وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ** پس اسلام کو عالمی بنا کر مسلم قوم کا عالی ہونا نمایاں ہوگیا اور مسلم قوم کی عالمیت ظاہر کر کے اسلام کی عالمیت واضح کی گئی ہے۔ (۱۵)

دعوت دین کا طریقۂ کار

حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ نے دعوت دین کے طریقۂ کار پر تقریباً ۳۵ صفحات پر مشتمل سیر حاصل بحث کی ہے اور قرآن سے اخذ کردہ اصول وضوابط مرتب کیے۔ ص ۵۸ سے ۸۷ تک آپ نے دعوت دین کے طریقہ کار کے ان پہلوؤں کا واضح طور پر جائزہ لیا ہے جو ہر داعی دین کے لئے مشعلِ راہ ہے۔ مثلاً آپ دعوت عملی کی تین صورتوں موعظتِ عمل، مجادلت عمل، اور حکمت عملی کی درجہ بندی کرتے ہیں۔ آپ طریقہ دعوت موعظت عملی کے متعلق تحریر کرتے ہیں:

آپؒ ایک حکایت لکھتے ہیں:

''عملی موعظت سے مدعو کے دل میں ایقان واطمینان پیدا ہوتا ہے۔''

''ایک داعی دین نے اپنے متوسل کے دل سے حسن صورت کی محبت مٹانے اور حسنِ سیرت کی محبت قائم کرنے کے لئے اپنی اس چھوری کو جواُن کے ایک متوسل کی منظورِ نظر ہوگئی تھی مسہلہ دوائیں کھلا کر زرد رنگ، بدہیئت اور بے انتہا لاغر بنا دیا۔ پھر اس متوسل کے پاس امتحاناً بھیجا۔ متوسل نے خلاف سابق بجائے میلان کے اعراض وتنفر کیا اور نگاہ بھر کر دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ (۱۶)

مجادلہ عملی کے متعلق ذکر کرتے ہوئے آپ نے بطور مثال علامہ شبلی کے دور کے اس واقعہ کو پیش کیا جس میں قُلِ الرُّوْحِ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ کا دہریوں نے انکار کیا ہے اور روح کو خون کی حرارت اور بخار لطیف کا نام دیا ہے اور عَنْ اَمْرِ رَبِّیْ کا منکر ہوگئے۔ حضرت نے اپنی شہ رگ کٹا کر سارا خون باہر نکلوا دیا اور ثابت کیا کہ زندگی محض امر الٰہی سے قائم ہے نہ کہ خون وحرارت سے۔

افسوس حکیم الاسلامؒ نے اس واقعہ کے لئے کوئی حوالہ پیش نہیں کیا، تا کہ یہ عجیب وغریب واقعہ مستند ہو کر اطمینانِ قلبی عطا کرتا۔

حکیم الاسلامؒ حجت بیانی کا طریقہ حکمت عملی کی مثال میں ایک واقعہ بیان کرتے ہیں، آپ لکھتے ہیں کہ:

''بعض مشائخ کے سامنے چند فلسفی مزاج کے لوگوں نے دعا کے موثر ہونے کا انکار کیا۔ شیخ نے بجائے قولی تفہیم کے انہیں تیز کلامی کے ساتھ چند تہذیب سے گرے ہوئے جملے کہہ ڈالے۔ جس سے یہ فلسفی نہایت غیض وغضب اور انتہائی جوش میں آگئے اور خون کھول جانے سے چہرے تمتما اٹھے۔ پھر شیخ کے کچھ توقف کے بعد ان کی تعریف میں کچھ غیر معمولی اور مبالغہ آمیز جملے کہہ دئے جن سے وہ پہلا اثر زائل ہو کر ایک نیا انبساط ونشاط پیدا

ہوگیا۔اس پر شیخ نے فرمایا کہ تم سمجھے میں نے کیا کہا؟ یہ میں نے تمہیں عملی جواب دیا ہے۔تم غور کرو کہ میرے چند کلمات نے جو درحقیقت واقعیت لئے ہوئے بھی نہ تھے تم میں اس قدر ہیجان اور انقلاب پیدا کر دیا کہ تمہارے چہرے سفید سے سرخ اور سرخ سے سفید ہوگئے۔تو کیا خدا کا پاک کلام جو حقیقتاً روح حیات ہے بدن اور روح میں کوئی انقلاب پیدا نہیں کرسکتا کہ آدمی صحت سے مرض اور مرض سے صحت کی طرف لوٹ جائے؟ پس یہ حکمت ہے مگر عملی جو حکمت فطری سے زیادہ موثر ہے''۔(۱۷)

دعوت کے لئے مخاطب کے ساتھ شفقت ورحمت کی ضرورت واہمیت ثابت کرتے ہوئے حکیم الاسلامؒ رقم طراز ہیں:

''واضح ہوگیا کہ جب تک مبلغ کو اپنے مخاطبوں کے ساتھ شفقت نہ ہواس کی تبلیغ دلوں میں گھر نہیں کر سکتی،اس کا مقتضا یہ ہے کہ مبلغ کی تمام تر ہمت صرف یہی نہیں ہونی چاہئے کہ وہ اپنا فریضہ تبلیغ ادا کر کے بری الذمہ ہوجائے۔ بلکہ اس کے دل میں باپ کی سی شفقت ہونی چاہئے۔آنحضرتؐ نے اس تبلیغی رحمت وشفقت کو انتہائی حدود تک پہونچا دیا تھا حتی کہ ذات ارحم الراحمین کو یہ کہہ کر روکنے کی نوبت آئی کہ **لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَنْ لَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ.**

شاید آپ اپنے نفس کو ہلاک کرڈالیں گے اس غم میں کہ یہ ایمان کیوں نہیں لائے۔

مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلَاغ.

رسول پر احکام ہدی دینے کے سوا اور کچھ واجب نہیں۔(۱۸)

اسی طرح حکیم الاسلامؒ دعوت دین کے لئے نرمی ورافت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شفقت لسانی میں قول کی نرمی آتی ہے جو درحقیقت مبلغ کی تبلیغ کا زیور ہے جس سے تبلیغ آراستہ ہوکر محبوب قلوب بن جاتی ہے اور قلوب کو اپنی طرف جذب کر لیتی ہے جیسا کہ اس کے بالمقابل آواز کی کرختگی زبان کی تیزی اور اخلاق کی شدت وغلاظت دلوں کو چھیل ڈالتی ہے اور تبلیغ ومبلغ سے بیگانہ ہی نہیں بلکہ متنفر کردیتی ہے۔اس پر رسول اکرمؐ کی رحمت وشفقت کے بارے میں خصوصی ارشاد تھا۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ.

اِذْهَبَا اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشٰى.

تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ اس نے سرکشی کی ہے اس سے نرم باتیں کہو شاید وہ یاد کرے اور اللہ سے ڈرے۔(۱۹)

حکیم الاسلامؒ تجدد دعوت کے عنوان سے تحریر فرماتے ہیں کہ دعوت مسلسل بلا ناغہ نہ دی جائے، بایں وجہ کہ مخاطب اکتا جائیں گے۔

آپؒ لکھتے ہیں:

''دعوت و تبلیغ ہر روز اور ہر وقت بلا ناغہ نہ کی جائے ورنہ مخاطب اکتا جائیں گے اور آثار باطل ہوجائیں گے بلکہ درمیان میں وقفے اور ناغے دے کر تبلیغ کی جائے تا کہ ان کا شوق ہر روز تازہ بتازہ باقی رہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہفتہ میں ہر جمعرات کو وعظ و تذکیر فرمایا کرتے تھے۔ ایک شخص نے عرض کیا اے ابوعبدالرحمٰن کاش آپ ہمیں ہر روز وعظ سنایا کرتے تو حضرت ابن مسعود نے فرمایا:

خبردار! مجھ کو ہر روز وعظ کہنے میں مانع یہ ہے کہ میں تم کو اکتا دینا نہیں چاہتا۔ میں اسی طرح وعظ میں وقفے کرتا ہوں جس طرح آں حضرت ﷺ ہمارے اکتانے کے ڈر سے وقفے فرمایا کرتے تھے۔

حکیم الاسلامؒ امر اُدع کی عربیت اور فعل کے خواص کا تذکرہ کرتے ہوئے بھی دعوت تجدد ثابت کرتے ہیں۔ آپ لکھتے ہیں ''دعوت و تذکیر کا امر اُدع کے صیغہ سے فرمایا گیا ہے جو فعل ہے اور عربیت کے قاعدہ سے فعل تجدد اور حدوث پر دلالت کرتا جو گہ و بے گہ ہو نہ کہ دوام واستمرار پر جو مسلسل اور ہمہ وقت ہو۔'' (۲۰)

اس طرح مختلف عنوانات قائم کر کے حکیم الاسلامؒ دعوت کے طریقۂ کار کے مختلف اصولوں کو بڑی تفصیل سے واضح کیا ہے جسے یہاں رقم کرنا کافی طول طویل کام ہے۔ البتہ حکیم الاسلامؒ نے ان اصول وضوابط کو بیان نہیں کیا جن کے تئیں اکثر داعیانِ کرام غلطیاں کرتے ہیں مثلاً حکمت کے نام پر بے حکمتی، دعوت کو مکمل نہ دے کر کانٹ چھانٹ کر دعوت دینا، غلط راہوں سے غلبہ اسلام اور دعوت دین کا کام کرنا، مداہنت، دعوت دین بن کر آزمائش کا تصور وغیرہ۔ یہ ایسے موضوعات ہیں جن کی وضاحت ناگزیر ہے۔ اس کمی کے باعث یہ کتاب کچھ نامکمل سی لگتی ہے، بایں وجہ یہ کتاب داعیان دین اور مبلغین کے لئے مکمل گائڈ کی حیثیت نہیں رکھتی۔ اگر یہ حقیقت ہے تو حضرت کے موضوع سے دلچسپی رکھنے والوں کو کام کرنا چاہئے بہت زیادہ ممکن ہے کہ حکیم الاسلامؒ کے نزدیک ایسا کوئی خاکہ رہا ہو لیکن اپنی مصروفیت کے باعث وہ یہ کام نہ کر سکے ہوں۔

البتہ آپ نے کہیں کہیں اجمالاً اشارہ ضرور کیا ہے مثلاً دعوت دین کی راہ میں حکمت اور حکمت کسی کے لئے کارگر ہوسکتی ہے۔

اسی طرح بیان کرتے ہیں۔

(ایک وہ کامل الاستعداد (طلب ہدایت کی استعداد) طبقہ ہے جن کے قلوب روشن ہوں، علم کی صادق طلب اور معرفتِ حق کی سچی تڑپ ان میں بدرجہ اتم موجود ہو اور وہ ہر مدعا میں ایسی پختہ دلیلوں اور حجتوں کے طلب گار رہے ہوں جو یقینی ہوں اور دلوں میں نور یقین پیدا کرسکیں۔ ظاہر ہے ایسے افراد سے خطاب کی صورت بجز دلائل قطعیہ کے دوسری نہیں ہوسکتی اور اسی کا نام قرآن کی زبان میں حکمت ہے جو آیت **ادع الیٰ سبیل ربك بالحکمة** میں مذکور ہے۔'' (۲۱)

حکیم الاسلامؒ نے یہاں دو باتیں واضح طور پر بیان کی ہیں اولاً حکمت دلائل قطعیہ اور حجۃ ایقانی کو کہتے ہیں جو دلوں میں نور یقین پیدا کرسکے اور مخاطب کو قلبی طور پر قائل کرسکے۔ دوم یہ کہ حکمت کا یہ طریقہ انہیں پر کارگر ہوسکتا ہے جن کے دلوں میں معرفت حق کی سچی تڑپ بدرجہ اتم پائی جائے اور جن کے قلوب روشن ہوں۔ واقعتاً حکمت کا طریقہ ایسے ہی لوگوں پر موثر ہوسکتا ہے یہ اور قرآن وسنت میں حکمت کا یہی مفہوم متعین کیا گیا ہے مگر افسوس مختلف حلقوں اور ارباب دانش کے یہاں حکمت کا الگ مفہوم متعین کرلیا گیا ہے، پھر اس پر ستم یہ کہ حکمت کا طریقہ ان دشمنانِ اسلام کے ساتھ اختیار کیا جاتا جو محض طاقت کی زبان سمجھتے ہیں جو **الناس علی دین ملوکھم** کے مصداق ہیں۔ آج دعوت دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کا کام کچھ اس طرح سے بھی کیا جارہا ہے کہ دین کے کچھ حصے کو پیش کیا جارہا ہے کچھ چھپا لیا جاتا ہے۔ وہ معروفات جو مخاطب کے مذہب میں بھی معروف ہو اس کو پیش کرکے دعوت کا حق ادا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ مشرکین کے سامنے ایسی باتیں کہنے سے اجتناب کیا جاتا ہے جس سے ان کے عقیدہ شرک پر ضرب پڑے۔ یہ کوشش کچھ زیادہ ہی کی جاتی ہے کہ کلمہ دعوت کچھ اس طرح سے کانٹ چھانٹ کر پیش کیا جائے جس سے امن و امان باقی رہے۔ آزمائشوں سے گذرنا نہ پڑے۔ دشمن کے مظالم کا سامنا نہ کرے۔ اس طرح کی مانیتا پراپت سیکولر دعوت کو افسوس صد افسوس حکمت کا نام دیا جاتا ہے۔ حالاں کہ ہمیں دین کی دعوت مکمل طور پر دینا چاہئے۔ داعی کو ہرگز یہ حق نہیں پہونچتا کہ وہ اپنی صواب دید کے مطابق کچھ اجزا پیش کرے اور کچھ چھپالے۔ حالات خواہ کیسے ناسازگار ہوں داعی کو اصل دین مکمل شکل میں پیش کرنا چاہئے۔ اللہ کے دین میں کمی بیشی حالات کے تقاضوں کے تحت اس میں تغیر وتبدل بہت بڑا ظلم ہے۔ ایسے لوگوں کی دنیا وآخرت دونوں تباہ ہوتی ہے۔

رسول اکرمؐ نے ارشاد فرمایا: **راس الحکمة مخافة الله.**

حکمت کی جڑ اللہ کا خوف ہے۔

لیکن ہم نے جو حکمت کا مطلب گھڑ لیا ہے۔ اس کی بنیاد کا منشا یہ ہے کہ پہلے اللہ کا خوف دل میں رکھ لیا

جائے پھر اس کے بعد حکمت کی راہیں متعین کی جائیں جب کہ ہم حکومت، دشمنان اسلام کی قوت اور آزمائشوں کے خوف کو دل میں پال پال کر پھر پالیسیاں طے کرتے ہیں کہ اسی طرح دعوت دی جائے اُس طرح دعوت اِلاّ اللّٰہ پیش کیا جائے، لا الہ غائب کر دیا جائے۔ دعوت اور تحریک ایسی ہو جس سے دشمنان کے مظالم اور راہ حق کی آزمائشوں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ بے جا رواداری کا نام لے کر حکمت کی پٹیاں پڑھا کر مصلحت کی لوریاں دے دے کر ارباب حل وعقد اور ارباب دانش ایک طویل عرصہ سے امت کو خواب غفلت میں ڈالے ہوئے ہیں اور انسانیت کو ضلالت و گمراہی میں بھٹکنے پر مجبور کر رہی ہے۔ ضرورت ہے کہ ہم خواب غفلت سے بیدار ہوں اور اقامت دین کی کماحقہٗ ادائیگی کریں۔

مداہنت

دعوت دین کی راہ میں ایک خطرناک مداہنت سے سابقہ پڑتا ہے۔ جب دعوت کی مقبولیت اور غلبہ دین کی سطوت کو روک نہیں پاتے تو وہ مداہنت کا شیطانی جال پھینکتے ہیں۔ کچھ دے دلا کر جاہ واقتدار، دولت وغیرہ دے کر داعی کا منہ بند کرنا اور مداہنت و مفاہمت کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بڑا کٹھن مرحلہ ہوتا ہے کہ رسول اکرمؐ کے قدموں میں سرداران قریش عرب کی بادشاہت، دولت اور ہستی کو لا کر ڈال دیا اور آپ سے مطالبہ کیا کہ صرف ہمارے بتوں کو برا بھلا نہ کہو۔ آپ نے پوری جرأت کے ساتھ اس مطالبہ کو ٹھکراتے ہوئے کہا کہ اگر میرے ایک ہاتھ میں چاند، دوسرے میں سورج دے دیا جائے تب بھی میں اس کام سے باز نہیں آؤں گا۔ رسول اللہؐ کے پاس اس اسوہ کو سامنے رکھ کر ہی داعیان کرام اپنا جائزہ لیں کہ کس طرح سے بغیر کسی پیشکش کے ہی ہم باطل اقتدار کی خوشنودی ان کی پارلیمنٹوں کے ممبر بننے کے لئے کتنا تگ و دو کرتے ہیں۔ طرہ یہ کہ اس طرح دعوت وتبلیغ کا کام آسان ہو جائے گا۔ یہ تو عقلی دیوالیہ پن کی علامت ہے اور غلامانہ ذہنیت کی عکاسی ہے۔ سچ کہا ہے علامہ اقبال نے ؎

کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

بے جا رواداری، مداہنت اور اصولوں کی قربانی، دعوت دین کے لئے سم قاتل ہے۔ دین کا مزاج کسی بھی طرح مداہنت اور مصلحت کوشی کو برداشت نہیں کرتا۔ اللہ نے تو حکم دیا ہے۔ **فَلِذٰلِكَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَا اُمِرْتَ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ هُمْ**.

پس آپ اس دین کی طرف دعوت دیجئے جس طرح آپ کو حکم دیا گیا ہے۔ اسی پر مضبوطی کے ساتھ

جمے رہئے اور لوگوں کی خواہشات پر نہ چلئے۔(الشوریٰ-۱۵)

دین کے معاملے میں مداہنت وہ خطرناک بیماری ہے جسے قرآن مجید کے مفاد پرست، دنیا پرست علماء کی صفت بنایا ہے۔

کچھ اہم نکات

کتاب ہٰذا ''دینی دعوت کے قرآنی اصول'' میں دعوت کے طریقۂ کار کے باب میں کچھ اہم موضوعات شامل ہونا ضروری ہیں جسے کہیں کہیں اجمالاً آپ نے ارشاد بھی فرمایا ہے پھر تفصیل طلب ہیں۔ وہ اہم نکات نہیں ہیں۔ دعوت دین کا انداز دوٹوک ہو جس سے حق و باطل واضح ہو جائے۔ مشرکین پر شرک کی شناعت ظاہر ہو جائے اور توحید کی دعوت مکمل طور پر پیش ہو جائے۔ اس طریقۂ انداز میں خواہ کتنی آزمائشیں آئیں یہ کام اور یہ انداز بہرحال برقرار رہنا چاہئے۔

جو لوگ اس کام کو لے کر اٹھیں انہیں بہرحال مصلحتوں کے دھوکہ سے بچنا چاہئے۔ مصلحتیں دین کے کام کو غلط سمت میں ڈال دیتی ہیں۔ اس لئے دعوت بھی پوری قوت کے ساتھ دی جائے۔ بلا سے داعی کی پوزیشن خراب ہو، اس کی شخصیت بے حیثیت ہو جائے۔ اسے ساحر و مجنوں کہا جائے۔

داعی دین کو اس یقین کے ساتھ اٹھنا چاہئے کہ حالات خواہ کیسے ہی خراب ہوں، باطل خواہ کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو۔ وسائل و افراد کی قلت ہو پھر بھی اللہ کی نصرت اہل حق کے شاملِ حال رہے گی۔

رواداری دعوت کے لئے زہر ہے۔ ایک فریب اور شیطان کی چال ہے ؎

آہ یہ روا داری یہ انداز تجدید
پھر نہیں کہلائی اب دعوتِ توحید

۞ دعوت دین اور غلبہ اسلام کے لئے صحیح راہ درست طریقہ پر اختیار کرنا چاہئے۔ غلط راہوں سے حق کو غالب کرنے کے فریب میں پڑنا گمراہی اور لاحاصل ہے۔ جمہوریت اور سیکولرزم کے راستے دین کی دعوت بے وقوفی ہے اور سنت نبوی کی خلاف ورزی ہے۔

۞ دین کی دعوت متضاد ادیان کے درمیان تصادم ہے۔ لہٰذا اسی راہ کو پرامن طریقے سے سر کر لینا ناممکن ہے۔ حق کی دعوت پر باطل کا بحیثیت مجموعی چڑنا لازمی ہے۔ واضح رہے کہ یہ راہ پھولوں کی راہ نہیں۔ یہ میدان کانٹوں بھرا ہے۔ یہ پھولوں کی سیج نہیں بلکہ کانٹوں کا بستر ہے۔

✪ کامیابی و ناکامی اللہ کے ہاتھ ہے، ہمارا کام صرف جدو جہد اور کوشش ہے۔ایک داعی کا کام یہ نہیں کہ وہ مایوس ہو کر بیٹھ رہے یا کامیابی کے لئے غلط راہوں پر چل پڑے۔کامیابی کے لئے جانفشانی صبر و ثبات اور تقویٰ کی ضرورت ہے۔

دعوت دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے جہاد کی ضرورت

حکیم الاسلامؒ نے دعوت دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے جہاد کی ضرورت کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ آپ رقم طراز ہیں:

''پھر اعلاء کلمۃ اللہ کی خاطر جنگی سفروں کا حکم دیا گیا اور کسی ایک خطبہ کا نہیں بلکہ جہاں بھی ضرورت محسوس ہوا اور ارباب مہیا ہو جائیں پھر جہاد میں مزید سہولت کرنے کے لئے نماز آدھی فرمادی گئی۔سفر جہاد کی ترغیب دی گئی ہے اور اس کے اختیار نہ کرنے پر ملامت فرمائی گئی ہے۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَالَكُمْ إِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ إِلَى الْاَرْضِ اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّاقَلِيْلٌ.

(اے ایمان والو! تم کو کیا ہوگیا جب تم سے کہا جاتا ہے کہ تم اللہ کے راستہ میں سفر کرو تو تم بھاری بھر کم بن جاتے ہو کیا تم دنیا کی زندگی سے راضی ہو گئے ہو تو یاد رکھو آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی زندگی کچھ بھی نہیں مگر کم)(۲۲)

اگر چہ مولانا محمد طیب صاحبؒ نے اسلام کی عالمیت کو واضح کرنے کے لئے اعلاء کلمۃ اللہ کی راہ میں جہاد کی ضرورت کو پیش کیا ہے لیکن محض یہی پیش کرنا ان کا مقصود نہیں ہے بلکہ آپ نے واضح طور پر اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے جہاد کی ضرورت کو بیان کیا ہے۔واقعہ یہ ہے کہ جہاد غلبہ اسلام اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے ناگزیر ہے۔دعوتِ دین کی پشت پر جہاد کی قوت دعوت کو موثر بناتی ہے، بایں سبب مکی دور کی نسبت مدنی دور میں اسلام کی خوب اشاعت ہوئی۔ جوق در جوق لوگ حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔محض اخلاق کی قوت، موعظۃ حسنہ اور حکمت عملی کی جہ سے دعوت دین اور اشاعت اسلام کا کام موثر نہیں ہوسکتا۔مکی دور میں ان تمام روحانی ہتھیاروں کے ساتھ آپ نے دعوت دین کا کام کیا لیکن دعوت اس قدر موثر نہ ہوسکی۔لیکن مدینہ میں اگر جنگ بدر کے بعد ہی سے دعوت پھلنے پھولنے لگی۔ پھر اس امت کو دعوت دین کے ساتھ ساتھ اقامت دین کا فریضہ ادا کرنے کا بھی حکم دیا گیا ہے۔رسول اکرمؐ اور انبیاء کرام کی بعثت اسی لئے ہوئی تھی کہ وہ اللہ

کے دین کو تمام ادیان باطلہ پر غالب کر دیں: **لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ** اسلام غالب ہونے کے لئے آیا ہے مغلوب ہونے کے لئے نہیں **الاسلام یعلو و لا یعلیٰ** اسلام کو غالب کرنے کا کام امت محمدیہؐ ہی کے سپرد ہے۔ پھر فتنہ کو ختم کرنے اور دعوت کے پھلنے پھولنے اور اسے انسانی قلوب کو بلا روک ٹوک قبول کرنے کے لئے ماحول ساز گار کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ اس کام کے لئے بھی جہاد کی ضرورت ہے۔ **وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰه.**

دعوت دین کے لئے تلوار کی اہمیت وضرورت کو بیان کرتے ہوئے علامہ ابن تیمیہؒ رقم طراز ہیں:

''پس دین کا قیام کتاب ہادی اور حدید ناصر یعنی تلوار کے بغیر ممکن نہیں جیسا کہ رب قدیر نے اپنے کلام پاک میں فرمایا ہے:

''پس ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ رب قدیر کی رضا جوئی کے لئے قرآن اور تلوار دونوں کو باہم مجتمع کرنے کی جدوجہد کرے اور اس جدوجہد میں اللہ سے مدد مانگے۔'' اس طرح قرآن اور تلوار کو باہم مجتمع کرنا دعوت دین کے لئے ضروری قرار پاتا ہے۔ (۲۳)

دعوت دین کی راہ میں آزمائش ناگزیر ہے

حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ دعوت دین کی راہ میں آزمائش کا اجمالی تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مکی زندگی میں ابتلاء وآزمائش بزدلی اور کم ہمتی نہ تھی بلکہ ایک بلند نصب العین اور اعلیٰ دین کا ثبوت اپنی ثابت قدمی سے پیش کرتا ہے۔

آپؒ لکھتے ہیں:

''اعلیٰ ترین نصب العین کی خاطر ماریں کھانا، پیٹا جانا، مصائب وآلام کا پہاڑ اسر پر لے کر اف نہ کرنا اور جان ومال کی قربانی دینا بلاشبہ ہجوم واقدام اور حملہ تھا جو تیغ وسناں کے حملوں سے کہیں زیادہ سخت اور شدید تھا۔ تیغ وتفنگ کے حملوں میں یا حملہ آور ایک دم ختم ہوجاتا ہے یا مد مقابل کو ختم کر ڈالتا ہے یا دونوں ختم ہوجاتے ہیں لیکن اس معنوی حملہ میں خون اور زخم کا سوال نہیں بلکہ روحوں اور دلوں کے انقلاب کا سوال ہے۔ جس میں بیک دفعہ کارحرب وضرب تمام نہیں ہوجاتا بلکہ حملہ آور کو ہمہ وقت اور مسلسل مقابل افراد کی سختیاں جھیلنی پڑتی ہیں جو روح اور بدن دونوں کو مسلسل گھائل بناتی رہتی ہیں۔ اسی دعوت الی اللہ کی روحانی جنگ ونتائج زمانی ہوتے ہیں جن کا تسلسل قائم رہتا ہے۔'' (۲۴)

حکیم الاسلامؒ مکہ کی ابتلاء و آزمائش کی زندگی اقدامی زندگی اور ''جہادِ کبیر'' بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''پس مکہ کی زندگی باوجود بے سروسامانی کی زندگی ہونے کے دفاعی یا مدافعت یا محض پٹتے رہنے اور ماریں کھانے کی زندگی نہ تھی بلکہ ''جہادِ کبیر'' اور حملہ آوری کی زندگی تھی جس میں ایک بلند اور مضبوط نصب العین کے لئے جان و مال کی قربانیاں پیش کی گئی تھیں۔'' (۲۵)

حکیم الاسلامؒ لطیف پیرایہ میں بڑے اچھے انداز میں ابتلاء و آزمائش کو مجبوری اور دفاع کا نام نہ دے کر اقدام و ثابت قدمی، جرأت و حوصلہ کا نام دیتے ہیں۔ یہ حقیقت واضح رہنے سے داعیانِ اسلام کے حوصلہ بلند ہوں گے وہ اپنے مشن میں پوری دل جمعی سے جمے رہیں گے۔

حکیم الاسلامؒ نے اپنی اس کتاب میں اجمالاً ہی مگر یہ واضح کر دیا ہے کہ دعوت دین کی راہ میں آزمائش ناگزیر ہے۔ ایسا کیوں نہ ہو جب کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مومنین کی آزمائش کو لازمی قرار دیا ہے۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ. الخ

اور اللہ پاک نے اسی وجہ اور مقصد کو بتایا ہے کہ وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ تا کہ اللہ اہل ایمان کو چھانٹ لے، راہ حق میں آزمائش و مشکلات ناگزیر ہیں۔ آزمائشی منزلوں سے گذر کر ہی اندرون میں قوت آتی ہے۔ اخلاق و کردار میں پختگی آتی ہے۔ آزمائش کی بھٹی میں تپ کر ہی مومن کندہ بنتا ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ضرور آزماتا ہے:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ.

رسول اکرم ﷺ نے فرمایا مجھے اللہ کی راہ میں اتنا ستایا گیا کہ کبھی کوئی انسان اس قدر نہ ستایا گیا۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص آزمائش پر ثابت قدم رہے گا اللہ اس کے قدموں کو جما دے گا۔

رسول اللہ ﷺ نے آگے فرمایا: من یرد اللّٰہ به خیراً یصب منه.

اللہ تعالیٰ جس کے لئے خیر کا ارادہ کرتا ہے اسے مصائب میں مبتلا کرتا ہے۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ان اللّٰہ عز و جل اذا احب قوماً ابتلاھم.

درحقیقت اللہ عز و جل جب کسی گروہ سے محبت کرتا ہے تو اسے آزمائش میں مبتلا کرتا ہے۔

داعیان دین اور علمبرداران اسلام کی آزمائش ہر دور میں ہوتی رہی ہے۔ جب مکہ میں دشمنانِ اسلام نے صحابہ کرام کا جینا دوبھر کر دیا تو ایک صحابی رسول آپؐ کے پاس شکایت لے کر آئے۔ ''اے اللہ کے رسولؐ! آپؐ ہمارے لئے خدا سے مدد کیوں نہیں طلب کرتے اور ظلم کے خاتمہ کے لئے دعا کیوں نہیں کرتے؟'' آپؐ یہ سن کر غصہ ہو گئے اور فرمایا: تم سے پہلے ایسے لوگ گذرے ہیں کہ ان میں بعض کے لئے

گڑھا کھودا جاتا تھا اور اس کے جسم کو چیرا جاتا یہاں تک کہ اس کے جسم کے دو ٹکڑے کر دیئے جاتے بعض کے جسم میں لوہے کے کنگھے چبھوئے جاتے جو گوشت سے گذر کر ہڈیوں اور پٹھوں تک پہنچ جاتا۔ مگر وہ خدا کا بندہ حق سے نہ پھرتا۔ واللہ یہ دین غالب ہو کر رہے گا۔

آزمائش داعیان دین کو مہمیز کرنے اور انہیں قوت بہم پہنچانے کے لئے لازمی ذریعہ ہیں۔ وہ دین جو عالم انسانی میں ہمہ گیر انقلاب کی دعوت دیتا ہے اور پوری انسانی زندگی کو نئی بنیادوں پر تعمیر کرنے کا منصوبہ رکھتا ہے اس دین کو علمبرداروں کے لئے ان آزمائشی مراحل سے گذرنا امر فطرت بھی ہے۔

کوئی بھی باطل نظام خواہ وہ سیکولر ہو یا غیر سیکولر اپنی ماتحتی میں رہنے والے مسلمانوں کو صرف اسی حد تک جینے کا حق دے سکتا ہے جب تک وہ خود ان کے وجود کے لئے خطرہ نہ بنیں۔ لیکن اگر حق نظام کے علمبردار غیر حق نظام کے لئے خطرہ نہیں ہیں تو انہیں اپنا الگ وجود رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ لہٰذا باطل اگر آج ہماری دعوت پر تلملا نہیں رہا ہے اور ہمیں دعوت دین کی کھلی اجازت دے رہا ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ہم اس کے بطلان کے خلاف دعوت نہیں دے رہے ہیں جس سے اس کے عقائد و نظریات پر چوٹ پڑے اور باطل اپنے وجود کے لئے دعوت حق کو خطرناک سمجھ سکے۔ لہٰذا ایسی دعوت میں کھوٹ ہے۔ انبیائی انداز نہیں اختیار کر رہے ہیں، بایں وجہ آج ہماری دعوت غیر موثر ہو رہی ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ دنیا کے کسی معمولی نام کے لئے بھی بڑی جاں فشانی اور بلاکشی کرنا پڑتی ہے تو کیا دین کی دعوت جیسا عظیم کام بغیر آزمائش و مصائب کو انگیز کئے پایۂ تکمیل کو پہنچے گا۔ انبیاء کرام اللہ کے سب سے زیادہ برگزیدہ بندے تھے۔ دین کی راہ میں ان کی سب سے زیادہ آزمائش ہوئی اور نبی آخر محمدؐ کی دعوت دین کی راہ میں سب سے زیادہ آزمائش ہوئی۔ لہٰذا ان کے نقش قدم پر چلنے والے داعیان کرام کو بھی آزمائشی مراحل سے گذرنا پڑے گا۔ اگر معاملہ خلاف واقعہ ہے تو وہ دین کی صحیح دعوت نہیں یا کم از کم انبیائی طریقہ کار اور قرآن کا مطلوبہ انداز نہیں۔

''ماننیتا پراپت دعوت'' جمہوری اور پرامن طریقۂ دعوت تعلیم کے فقدان کا شور، حقوق انسانی کی دعوت، اسلامی تشخص کے تحفظ کے نام پر غیر اللہ کی حاکمیت کی دعوت یہ تمام تر دعوت اور طریقۂ دعوت فتنوں اور گمراہیوں کے گرداب میں ہے اور شیطنت کا شکار ہو کر انبیائی نہج سے ہٹے ہوئے ہیں۔ نیز اللہ کی اس سنت متواترہ سے بچ نکلنے کی ناکام کوشش ہے کہ اللہ تعالیٰ اہل حق کی آزمائش ضرور کرتا ہے۔

داعی کے اوصاف

حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ اپنی اس تصنیف میں مبلغین کے چند اہم اوصاف کا تذکرہ کیا ہے جو

ہر داعی کی شان اور عادت ثانیہ ہونی چاہئے کیوں کہ داعی کے ذاتی اوصاف پر تبلیغ کے اثرات موقوف ہیں، آپ نے داعی کے لئے ایک اہم وصف خوف انہیں اور عدم خوف خلائق قرار دیا ہے۔ آپ اس تعلق سے لکھتے ہیں:

''مبلغ کے لئے سب سے اہم اور بڑا وصف مخلوق سے نڈر رہنا ہے اور اللہ سے ڈرنا ہے بعنوان دیگر حق کے معاملہ میں جرأت و بے باکی کا ہونا اور مرعوبیت و مداہنت کا نہ ہونا ہے۔ گویا مبلغ کے لئے ضروری ہے کہ حق اور احکام حق کی عظمت کے مقابلہ میں کسی کی عظمت کا خطرہ اس کے قلب میں نہ ہو جس کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ مخلوق کا کوئی خوف تو تبلیغ حق میں مانع نہ ہو اور خالق کا خوف تبلیغ حق کے لئے داعی ہو۔

ارشاد ربانی ہے:

اَلَّذِیْنَ یُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰہِ وَیَخْشَوْنَہٗ وَلَایَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰہ وَ کَفٰی بِاللّٰہِ حَسِیْباً.

ترجمہ: جو لوگ اللہ کے پیغامات پہنچاتے ہیں وہ اللہ ہی سے ڈرتے ہیں اور سوائے اللہ کے کسی اور سے خوف نہیں کرتے۔

ظاہر ہے جب داعی کے دل میں صرف اللہ کا خوف ہوگا اور غیر اللہ کا خوف نہ ہوگا تو وہ داعی اپنی دعوت کو بے لاگ و لپیٹ کے مدعو کے سامنے پیش کرے گا۔ حق کو پوری طرح واضح کرنے میں اسے یہ خوف لاحق نہیں رہے گا کہ مدعو اس سے غضبناک ہوگا۔ نتیجتاً حق کی پاداش میں ظلم وستم انگیز کرنا پڑے گا۔ اس خوف خدا کا دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ وہ اس اندیشہ میں مبتلا نہیں رہے گا کہ آیا ہماری دعوت موثر ہوتی ہے یا نہیں۔ کوئی اسے قبول کرے یا نہ کرے۔ یہ اللہ کا حکم تھا جو میں نے پہنچا دیا۔

استغناء

استغناء داعی دین کا اہم وطیرہ ہے۔ دعوت کے بدلہ میں کسی لالچ اور طمع کا نہ ہونا، دعوت کو موثر بناتا ہے۔ بایں وجہ اللہ پاک انبیاء کرام کے متعلق جگہ جگہ قرآن میں یہ بھی فرمایا ہے کہ وہ تو دعوت کے بدلے میں تم سے کچھ لیتے نہیں ہیں، لہٰذا یہ ایک ایسا وصف جوہری ہے جو داعی کو خوددار بناتا ہے اور مدعو کے طور پر یہ اثر چھوڑ جاتا ہے کہ یہ کتنا اچھا آدمی ہے جو بغیر کسی ذاتی مفاد کے دوسرں کے مفاد کے لئے کام کرتا ہے ؎

کہ پایا میں نے استغناء میں معراج مسلمانی

مولانا محمد طیب صاحبؒ رقم طراز ہیں:

''استغناء کے بغیر تبلیغ کا وقار اور احترام قائم نہیں ہوسکتا، لالچی اور خودغرض انسان کبھی میدانِ تبلیغ کا مرد نہیں بن سکتا اور نہ کبھی بے باکانہ تبلیغ کرسکتا ہے۔ مبلغ کے قلب میں جب اپنے مستفیدوں سے طمع پیدا

ہوگئی تو یقیناً وہ ان کا محتاج ہوگیا اور محتاج انسان کمزور ہوتا ہے اور جب معلم کمزور و ذلیل ہو اور متعلم قوی و حاوی ہو تو معلم و مبلغ میں تبلیغ حق کی حقیقی جرأت پیدا ہی نہیں ہوسکتی اور نہ وہ مخاطبوں پر اپنا اثر قائم کرسکتا ہے۔

آز بگذار و بادشاہی کن

چنانچہ حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت لوط، حضرت شعیب علیہم الصلوٰۃ والسلام کے تبلیغی مواعظ کے سلسلہ میں قرآن نے ایک ہی قول نقل کیا ہے:

وَمَا اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوْنْ. (۱۰۴)

استغناء کا ایک اور مقصد بتاتے ہوئے آپ لکھتے ہیں:

''مبلغ کو تبلیغ کے ثمرات سے بھی مستغنی رہنا چاہیئے۔ جب مبلغ اپنی مساعی کے معنوی ثمرات کا خطرہ بھی دل میں نہ لائے تو یہ کیسے ممکن تھا کہ اسی مبلغ کو کار تبلیغ کے کسی مادی ثمرہ کی فکر میں غلطاں و پیچاں چھوڑ دیا جاتا۔'' (۲۶)

غناء و استغناء کے قومی ثمرات اور عدم استغناء کی مذمت کرتے ہوئے آپ رقم طراز ہیں:

''جو قومیں کسی سے عزت و جاہ کی بھیک مانگ کر زندہ رہنا چاہتی ہیں وہ کبھی عزت سے ہمکنار نہیں ہوسکتیں اور جو غنا و استغناء اور غیرت مندی کے ساتھ اپنی اور اپنے ہی مزاج کی بنیادوں پر اٹھتی ہیں وہ کبھی ذلت کا منہ نہیں دیکھ سکتیں۔ حیرت اس پر ہے کہ غناء و استغناء کے خزانوں کے ہوتے ہوئے بھی مسلم قوم دریوزہ گری کو اپنا نشان بلکہ فخر بنائے ہوئے ہے اور اقوام کے آگے ہاتھ پھیلائے کھڑی ہے۔ (۲۷)

غلامی کی زندگی گذارہی امت مسلمہ کی ایک بہت بڑی خامی یہ بھی ہے کہ عزت و دولت کی بھیک اپنے ظالم حکمرانوں سے مانگنے پر مجبور ہوگئی ہے۔ ریزرویشن کی بھیک، ریکوگنائزیشن کی بھیک، روٹی کپڑا، گھر کی بھیک، باطل اقتدار کے دم چھلہ بننے کی بھیک، دشمنان اسلام کی خوشنودی کی بھیک۔ امت کی یہ صورت حال اسی حقیقت کی غماز ہے کہ جسے علامہ اقبال نے کہا تھا کہ:

سو غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

سیرت و کردار

مبلغ اور داعی دین کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کی سیرت و کردار، اس کے قول کا مظہر ہو لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالاَ تَفْعَلُوْنْ کے مصداق داعی دین کی تقریریں اور وعظ و نصیحت موثر نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا مبلغین کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے کردار کو بھی بنائیں اور اپنی سیرت کو بھی سنواریں۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا

ہے کہ مومن کا کردارِ غیبی دعوت بن جاتا ہے۔

آدمی نہیں سنتا آدمی کی باتوں کو — پیکرِ عمل بن کر غیب کی صدا ہو جا

مولانا محمد طیب صاحبؒ اس سلسلے میں رقم طراز ہیں:

عمل صالح اور تقویٰ وطہارت کے بغیر تبلیغ کا کوئی اثر نمایاں نہیں ہوسکتا۔ دلائل و براہین اور پر جوش تقریریں وہ اثر نہیں دکھلاسکتیں جو ان مبلغ کی ذاتی سیرت اور عملی زندگی ان کے سادہ کلام میں پیدا کر دیتی ہے۔ نیک عمل مبلغ حقیقتاً اللہ کی حجت اور اس کی آیات میں سے ایک آیت ہوتا ہے جسے دیکھ کر خود بخود ہزاروں دلائل سامنے آجاتے ہیں۔

اے لقائے تو جواب ہر سوال — مشکل از تو حل شود بے قیل و قال

ارشادِ حق اَتَأمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَکُمْ کیا تم لوگوں کو نیکی کا امر کرتے ہو اور خود اپنے آپ کو بھول جاتے ہو۔ (۲۸)

صبر وتحمل

دورانِ تبلیغ تبلیغ کو محکم و موثر بنانے اور داعی کی ذات میں جاذبیت پیدا کرنے کے لئے صبر وتحمل کی صفت کا ہونا کافی ضروری ہے۔ رسول اکرمؐ جب مکہ میں کوہ صفا پر چڑھ کر اول دین کی دعوت دیتے ہیں قُوْلُوْا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ تُفْلِحُوْا. فوراً آپؐ کو ابوجہل پتھر مارتا ہے۔ پھر وہیں سے تکالیف ومصائب کا ایک طوفان کھڑا ہو جاتا ہے حتی کہ آپؐ اور ان کے صحابہ کرام کی پوری زندگی ان مصائب اور ایذاء رسانیوں پر صبر وتحمل کی اعلیٰ شاہکار ہے۔ وادی طائف کی خشت باریاں، شعب ابی طالب کی سختیاں، راہوں میں کانٹے، طرح طرح سے رسول اللہ ﷺ کو ستایا گیا لیکن اس ذات کریم نے ہر مرحلہ میں تحمل و بردباری کا ثبوت دیا۔

حکیم الاسلامؒ لکھتے ہیں کہ:

''ظاہر ہے کہ سلسلۂ دعوت وتبلیغ میں مخلوق کی اڑی کڑی جھیلنا اور ان کے معاملات میں ایثار سے کام لینا یعنی صبر، حلم، ضبط اور تحمل وغیرہ جو سلسلۂ تبلیغ میں عموماً جاہلوں، ناعاقبت اندیشوں یا بدنیتوں کی طرف تلخیٔ حق کا جواب ایذا رسانی اور سخت کلامی سے دیا جاتا ہے۔ اگر مبلغ میں صبر وضبط نہ ہو تو اس کے لئے تبلیغ کا میدان کبھی بھی ہموار نہیں ہوسکتا۔ آنحضرتؐ کو صبر وتحمل کی ہدایت فرمائی گئی ہے۔

لَتُبْلَوُنَّ فِیْ اَمْوَالِکُمْ وَ اَنْفُسِکُمْ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوالْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِکُمْ وَ مِنَ

الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْا أَذًی کَثِیْرًا وَ اِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا فَإِنَّ ذٰلِکَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ. (۲۹)

اسی سلسلہ کی ایک کڑی عفو درگذر ہے یعنی دشمن کی ایذا رسانی کے باوجود ان کو معاف کر دینا یہ داعی کی بڑائی ہے۔

حکیم الاسلامؒ لکھتے ہیں:

''پھر اس راستہ میں ایک صبر ہی درکار نہیں کہ مبلغ ان ایذا رسانیوں کا تحمل کر کے چپکا رہے بلکہ اسے ایک قدم آگے بڑھ کر ان شرارتوں کو معاف بھی کر دینا چاہئے کہ اسی سے مخاطب انجام کار ہموار ہو جائیں گے اور انہیں کے آثار سے اس کی شفقت پہنچائی جائے گی۔ اسی لئے حضورؐ کو حکم دیا گیا تھا:

فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ– فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلْ.

آپ ان کو معاف کر دیجئے اور ان کے لئے استغفار کیجئے۔ آپؐ ان سے اچھے طریقہ پر درگذر فرمائیے۔

مبلغ کی خوبی یہ بھی ہے کہ وہ ان برائی کرنے والوں کے ساتھ بھلائی کرے اور احسان سے پیش آئے:

صل من قطعك واعف عمن ظلمك وأحسن الیٰ من اساء الیك.

جو لوگ تم سے بدمعاملگی کریں تم ان کے ساتھ بھی صلہ رحمی کا برتاؤ کرو اور جو تم سے برا سلوک کریں تم ان سے اچھا سلوک کرو۔ (۳۰)

معیت وملازمت

داعی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے مخاطبوں بطور خاص مستفیدوں کی تربیت بھی کرے، انہیں بتدریج دین سکھائے۔ احکام پر چلنا سکھائے نیز اس کام کے لئے ایک مدت درکار ہے۔ لہٰذا ناگزیر ہے کہ وہ اپنے مستفیدوں کو اپنی معیت میں رکھے۔ حکیم الاسلامؒ نے خاص طور پر معیت وملازمت کے طریقہ کو ان لوگوں کے لئے خاص کیا ہے۔ جو نومسلم ہوں جو مذہب اسلام میں نو وارد ہوں جب کہ آج صورت حال ایں جا رسید کہ غیر مسلموں کو دعوت دینے ،نومسلموں کی تربیت کے بجائے خود مسلمانوں پر یہ کوشش قدرے زیادہ کی جارہی ہے۔ دور حاضر میں خانقاہوں کا تقریباً ایسا ہی معاملہ ہے۔

حکیم الاسلامؒ رقم طراز ہیں:

''مبلغ مخاطبوں کو اپنے ساتھ زمانۂ طویل تک وابستہ اور کثیر الملازمت رکھے تا کہ ان میں تبلیغ وتربیت سے کوئی خاص رنگ قائم ہوجائے۔ جسے شرعی اصطلاح میں صحبت و معیت کہتے ہیں حق تعالیٰ نے

آنحضرت ﷺ کو حکم دیا کہ جو اصحابؓ آپ کے زیر تربیت ہیں اور بالخصوص فقراء، مسلمین آپ اُن کو صبح و شام اپنی صحبت میں رکھئے اور ان میں رہیئے۔

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ وَ كَانَ اَمْرُهٗ فُرُطاً.

اور آپ اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ جمائے رکھیں جو صبح و شام اپنے رب کو پکارتے ہیں اور وہ اس کی رضا کے طالب ہیں اور آپ بہرحال ان سے اپنی نگاہیں نہ ہٹائیں دراں حالیکہ آپ دنیوی زندگی کی زینت کے خواہاں ہیں اور آپ ان لوگوں کی اطاعت نہ کریں جن کے دل کو ہم نے اپنے ذکر سے غافل کر دیا ہے اور جو اپنی خواہشات کی اتباع کرتے ہیں اور جن کا معاملہ زیادتی کا ہے۔(۳۱)

قیام حکومت الٰہیہ اور دعوت و تبلیغ

حکیم الاسلامؒ قیام حکومت الٰہیہ کے لئے دعوت و ارشاد کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ یعنی جب دعوت و تبلیغ کے ذریعہ ماحول سازگار ہو جائے اور امت مسلمہ بالخصوص اور غیر مسلم بالعموم اس لائق ہو جائیں گے تو اسلامی نظام خود قائم ہو جائے گا۔

حکیم الاسلامؒ لکھتے ہیں:

''اسلامی قانون اور شرعی سیاست اپنی ذات سے معقول و دل پذیر امن خیز اور مظالم شکن سہی لیکن اس کے لئے اس کے مناسب فضا اور ماحول کی بھی تو ضرورت ہے جو اسے دلچسپ اور دل پذیر بنائے اور وہ ماحول بغیر اس حقانی تبلیغ اور دعوت و ارشاد کے پیدا نہیں ہو سکتا جو عرض کردہ قرآنی اصول پر مبنی ہے۔ اس لئے اسلامی فضا پیدا کرنے والے اس نظام تبلیغ کو چھوڑ کر اسلامی دیانت اور اسلامی سیاست دونوں کے لئے زمین ہموار کر لینا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ اگر بغیر اس ارشادی نظام کے اسلامی نظام کا کوئی ڈھانچہ قائم بھی کر لیا جائے تو وہ محض اسمی و رسمی ہوگا''۔(۳۲)

حکیم الاسلامؒ کی یہ بات اس حد تک درست ہے کہ حکومت الٰہیہ کے قیام کے لئے دعوت و ارشاد کے ذریعہ ماحول سازگار کرنا چاہئے۔ لیکن اس بات پر اس قدر زور دینا درست نہیں ہے کہ دعوت ارشاد کا فریضہ قیام خلافت کے فریضہ کی شرط محسوس ہونے لگے۔ خلافت کو قائم کرنے کی کوشش کرنا اور دعوت و تبلیغ کرنا دونوں الگ الگ فرائض ہیں جس طرح کسی بے نمازی کو رمضان کے روزے رکھنے سے منع نہیں کیا جا سکتا

کہ تو نماز پڑھتا نہیں تھا اب روزہ کیوں رکھے کیوں کہ نماز اور روزہ دونوں علیحدہ علیحدہ فرائض ہیں۔ کسی کی فرضیت کو کسی کی فرضیت کے ساتھ مشروط نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی اس میں تدریج اور فوقیت کی شرط ہے بلکہ خلافت کے قیام کی جدوجہد اور تبلیغ دین کی جدوجہد دونوں ہر وقت ہر مسلمان پر واجب ہے۔

حکیم الاسلامؒ نے کتاب ہٰذا کے شروع میں لکھا ہے کہ یہ دین، دعوتِ دین اور اہل دین سب عالمی ہیں۔ اس کا کوئی خاص وطن نہیں بلکہ پوری دنیا اس کا وطن ہے۔ اس حقیقت کے واضح ہونے کے بعد قیام حکومت الٰہیہ کی اہمیت وضرورت میں کمی کرنا یا اسے مشروط کرنا بالکل خلاف عقل بات ہے۔ عقل خود کہتی ہے کہ ایسا کوئی سیاسی نظام بھی ضرور ہونا چاہئے جو عالمی ہو۔ خلافت علی منہاج النبوۃ اسی سیاسی نظام کا نام ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اس وقت حکومت الٰہیہ کے قیام کی ضرورت دعوت دین سے زیادہ ہے بایں وجہ کہ ہم جس دین کی دعوت دیتے ہیں اس دین کے احکام پر مکمل طور پر ہم خود عمل نہ کر پانے کے لئے مجبور ہیں۔ غیر اسلامی حکومتوں میں اسلام کا نظام زکوٰۃ، نظام دیوانی، نظام فوج، حدود، انسداد ظلم و جرائم، نکاح وطلاق جیسے اجتماعی معاملات کے احکام کی تعمیل خلافت کے بغیر ناممکن ہے۔ پھر دعوت دین کے موثر ہونے کے لئے ماحول کی سازگاری بھی ضروری ہے۔ ایسا ماحول جس میں اسلام اپنی شکل وصورت کے ساتھ ہو، پھر قبول اسلام کی راہیں بھی مسدود نہ ہوں ایسا اسی وقت ہوسکتا ہے جب اسلام بحیثیت نظام کے غالب ہو۔ علاوہ ازیں یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ جو مسلمان ارتداد کا شکار ہو رہے ہیں ہندو دھرم، بہائی، قادیانیت وغیرہ کو قبول کر رہے ہیں ان کے لئے کی جانے والی کوششیں کارگر نہیں ہو پا رہی ہیں۔ لہٰذا دعوت دین کے ساتھ ساتھ قیام حکومت الٰہیہ کے لئے بھی ہماری جدو جہد ہونی چاہئے۔ یہ وہ اہم فریضہ ہے جس کے لئے انسانوں کو پیدا کیا گیا، انہیں اشرف المخلوقات کا درجہ دیا گیا۔ ساری دنیا اللہ پاک نے ان کی خدمت میں لگادی۔ اتنے اعزازات اور اتنی نوازشیں اسی لئے تو ہیں کہ اللہ نے انسانوں کو اور امت محمد یہ کو بالخصوص اس دنیا پر احکام الٰہی نافذ کرنے کی ذمے داری دی۔ **انی جاعلك فی الارض خلیفة** یہ اتنا مہتم بالشان اور اہم فریضہ ہے کہ صحابہ کرامؓ نے رسول اکرمؐ کی نعش مبارک کو دفن کرنے سے پہلے اپنے خلیفہ کا انتخاب کیا۔ لہٰذا اس فریضہ کی اہمیت کو کسی طرح کم نہیں سمجھا جا سکتا۔

سبق پھر پڑھ شجاعت کا صداقت کا عدالت کا لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

............❖............

(۱) مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی، قاری طیبؒ ایک شخصیت، ص:۵۸

(۲) ایضاً، ص:۶۲

(۳) ایضاً، ص: ۶۳
(۴) حضرت مولانا محمد طیب قاسمیؒ، دینی دعوت کے قرآنی اصول، ص: ۴
(۵) ایضاً، ص: ۲۰
(۶) ایضاً، ص: ۱۲
(۷) حضرت مولانا الیاس صاحبؒ، ضرورت تبلیغ ص: ۳۰۸
(۸) حضرت مولانا محمد طیب قاسمیؒ، دینی دعوت کے قرآنی اصول، ص: ۱۱۰
(۹) ایضاً، ص: ۲۶
(۱۰) حسن ہیضمی، دعاۃ للقضاء، ص: ۱۲
(۱۱) حضرت مولانا محمد طیب قاسمیؒ، دینی دعوت کے قرآنی اصول، ص: ۱۶
(۱۲) ایضاً، ص: ۳۴
(۱۳) ایضاً، ص: ۴۴
(۱۴) ایضاً، ص: ۴۶-۴۷
(۱۵) ایضاً، ص: ۴۸
(۱۶) ایضاً، ص: ۶۴
(۱۷) ایضاً، ص: ۶۶
(۱۸) ایضاً، ص: ۷۷
(۱۹) ایضاً، ص: ۷۸-۸۹
(۲۰) ایضاً، ص: ۷۲
(۲۱) ایضاً، ص: ۸۴
(۲۲) ایضاً: ص ۵۱
(۲۳) امام ابن تیمیہؒ، السیاسۃ الشریعۃ فی اصلاح الراعی والرعیۃ، ص: ۵
(۲۴) حضرت مولانا محمد طیب قاسمیؒ، دینی دعوت کے قرآنی اصول، ص: ۱۳
(۲۵) ایضا، ص: ۱۴
(۲۶) ایضاً، ص: ۱۰۵
(۲۷) ایضاً، ص: ۱۶
(۲۸) ایضاً، ص: ۹۸
(۲۹) ایضاً، ص: ۱۰۶
(۳۰) ایضاً، ص: ۱۰۷
(۳۱) ایضاً، ص: ۱۱۹
(۳۲) ایضاً، ص: ۱۲۶

............❖............

حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ

جناب عادل صدیقیؒ
شیخ الہند اکیڈمی، دارالعلوم دیوبند

اشاعت دین اور دعوت الی اللہ کے داعی، امت مسلمہ کے تمام طبقوں کے رہبر، دین اسلام کی دعوتی اور احتسابی تاریخ کو نئے سرے سے مرتب کرنے والے، پراگندہ قوم مسلم کو راستہ دکھانے والے، اخلاقی اور روحانی اعتبار سے اپنے زمانے کی ممتاز ترین شخصیت ہونے کے باوجود عجز وانکساری کا لباس پہننے والے، حفاظت دین کے خدائی اعلان کی تصدیق وتطبیق سے خود کو جوڑنے والے، اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے والے، فتنوں اور سازشوں سے دین کی حفاظت کرنے والے، باطل افکار وعقائد پھیلانے والے کی ملمع کاریوں سے مسلمانوں کو آگاہ کرنے والے، حق و باطل میں امتیاز کی روشن دلیلوں سے وضاحت کرنے والے، نعمت ایمان وقرآن سے لطف اندوز ہونے والے، پروردگار کی بزرگی اور کبریائی کا ہر لمحہ اعلان کرنے والے، رشدوہدایت کی کیفیات کو عام کرنے والے، عام مسلمانوں کی زندگی میں تغیر وانحطاط پر افسردہ رہنے والے، صراط مستقیم کو زندگی کا لائحہ عمل اور دستور العمل بنانے والے، علم وعمل کو ایک ہی رنگ دینے والے، مسائل زمانہ کے تقاضوں کو پہچاننے والے، مغربی دنیا کی متنوع معاشرتی اور ثقافتی پیچیدگیوں سے خبردار کرنے والے، خونی، خاندانی اور قریبی رشتوں کا احترام کرنے والے، مسلم معاشرہ کو درپیش سماجی، اقتصادی اور سیاسی مسائل کے حل کے سلسلے میں دانشورانہ رہنمائی کرنے والے، کتب فقہ اسلامی کی جانب مراجعت کی زندگی کو بیش قیمت اثاثہ سمجھنے والے، اکابر علماء کی نگرانی میں علوم دینیہ، تفسیر، حدیث اور فقہ میں مہارت تامہ پیدا کرنے والے، یگانۂ روزگار طلباء کی جماعت تیار کرنے والے، ہر قدم پھونک کر رکھنے والے، تدین، تفقہ اور شریعت کی پاسداری کو کمال عروج تک پہنچانے والے، قریب رہنے والوں کی پوشیدہ

اور مخفی حرکات وسکنات سے درگزر کرنے والے، ناگزیر رنجشوں پر حکمت عملی سے قابو پانے والے، غیر دانشمندانہ اقدامات اور انتہائی ناعاقبت اندیشانہ فکر سے دور رہنے کی تلقین فرمانے والے، مسلمانوں کے اجتماعی وجود کو نئی سمت دینے والے، صرف قرآن وحدیث پر مبنی اسلام کو رواج دینے والے کون؟ جنہیں مخلوق اور عوام الناس حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کے نام نامی اور اسم گرامی سے پکارتی آرہی ہے۔

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

عارف باللہ حکیم الاسلام حضرت اقدس، عزت مآب، مولانا محمد طیب صاحب قدس سرہٗ سابق مہتمم دارالعلوم کا اسم گرامی سامنے آتے ہی دل ودماغ پر کمالِ اخلاق، حکمت ومعرفت، فہم وفراست، لطافت ونفاست اور پاکیزگی وتقدس کا ایک جامع نقشہ آنکھوں میں تیرنے لگتا ہے۔ بلاشبہ آپ کی ذات اقدس مسلک دیوبند کی شارح، مکتب قاسمیہ کی ترجمان اور سلف صالحین کا نقش جمیل تھی، آپ نے ساٹھ سال سے بھی زیادہ مدت تک عالم اسلام کی شہرت یافتہ یونیورسٹی دارالعلوم دیوبند کو اپنی خدمات جلیلہ سے چار چاند لگائے۔ مشرق سے مغرب تک سفر کی صعوبتیں اٹھائیں، اہتمام کے عروج وزوال کی کہانی تحریر کی۔ تحریر وتقریر سے نوع انسانی کو بلالحاظ مذہب وملت فائدہ پہنچایا۔ اہم تحقیقی مسائل کو چٹکیوں میں حل کردیتے تھے۔ سمجھانے کا اسلوب عام فہم تھا۔ طالب علموں میں ان کی صلاحیت کے بموجب، عورتوں میں ان کی گھریلو زندگی اور محاوروں کے سہارے، سائنس دانوں میں ان کی علمیت کے مطابق اسلام کے اعلیٰ مقاصد اور اس کی بیش قیمت تعلیم کو ان کے ذہنوں میں اتارنے میں کمال حاصل تھا، آپ کی تقریر دل کش اور دل چسپ ہوتی تھی کہ سامعین بڑے شوق سے سنتے۔ خوردنوازی، مروت، شفقت آپ کی سرشت میں حد درجہ داخل تھی۔ محاسبہ، سرزنش، حاکمانہ طمطراقیت آپ کی ذات میں مطلق بھی شامل نہ تھی۔ انتقام، ایذارسانی، دل آزاری، طنز وتنقید سے آپ قطعی دور تھے۔ آپ مسلمانوں کو حقیقی آزادی اور اسلامی طرز حیات سے متصف دیکھنا چاہتے تھے۔ آپ اس بات کے حامی تھے کہ مسلمانوں کے لئے ایسی حکمت عملی تیار کی جائے جس کے ذریعہ وہ اپنے اپنے علاقہ میں اجتماعی وجود کی شناخت برقرار رکھ سکیں اور بدی کے عالمی محور یعنی امریکہ، برطانیہ اور اسرائیل کے احکامات کی پابندی اور ان کی روش پر چلنے کے لئے مجبور نہ ہوں۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ مسلمانوں کے درمیان مصنوعی دیواروں کو کھڑا کرنے کے خلاف تھے۔ وہ حجاز، یمن، وسط ایشیا کے مسلمانوں کو ہندوستانی مسلمانوں سے ہم آہنگ کرنا چاہتے

تھے، اس طرح ہم اگر آپ کو ایک عالمی شخصیت کہیں تو ہرگز مبالغہ نہ ہوگا۔ آپؒ نے ہمیشہ اس بات پر زور دیا کہ آزادی کی لڑائی سب کو مل جل کر لڑنی ہے، یہ لڑائی محض اسلام کی بنیاد پر نہیں ہونی چاہئے۔ آپ کو اس بات پر افسوس تھا کہ مسلمان اپنی ہی سرزمین پر بے تکے طور پر آپس میں بانٹ دئے گئے۔ آپ سیاسی اختلافات کو آپسی سماجی، معاشرتی، اقتصادی اور علمی رابطوں کی راہ میں حائل نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔ آپ نے ہمیشہ ہندوستان کی آزادی میں ہندو مسلم اتحاد کو ضروری سمجھا۔ ہندوستان آزاد ہونے کے بعد کن جہات میں ممتاز ہوگا؟ ہندوستان کے نظم ونسق میں مسلمانوں کا کردار کیا ہوگا؟ آئین ہند کیسا ہوگا؟ یہاں کے شہریوں کی فکر اور سوچ کیا ہوگی؟ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان اقتصادی، سائنسی اور ٹکنالوجی کے فرق سے پیدا ہونے والے خطرناک مسائل کیسے حل ہو جائیں گے؟ اس طرح کے متعدد سوالات آپ کے ذہن وفکر کو جھنجھوڑتے رہتے تھے، اس طرح کا واضح اظہار آپ کی تحریروں اور تقریروں میں بخوبی ہوتا ہے۔ عالم اسلام کے موجودہ حالات اور تقاضے، آزادی کی بازیافت کی کوشش، اسلامی نظام کے نفاذ کے طریقے جیسے سوالات آپ کے ذہن رسا میں گشت کرتے رہتے تھے۔ آپ نے بڑی دانشمندی اور گہرے مطالعے کے بعد مجتہدین اور ان کے اختیارات کو واضح فرمایا۔ آپ نے اپنی تحریروں سے مشائخ زمانہ اور صوفیہ عصر کو جگانے کی کوشش کی۔ آپ نے فروعی اختلافات کو کبھی اہمیت نہ دی، بلاشبہ علمائے دیوبند عشقِ رسول میں دیوانہ ہیں اور نبی اکرم ﷺ کے تذکرہ کی بزم سجانے کو دونوں حیات کی سعادت مانتے ہیں۔ اس ذیل میں نام گنوائے جائیں تو ایک دفتر درکار ہوگا، موٹے طور پر حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، مفتی محمد شفیع عثمانیؒ، مولانا محمد میاںؒ، قاضی زین العابدین میرٹھیؒ کے نوادرات کے ساتھ ساتھ خاتم النبیین از حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ اور آفتاب نبوت، یہ دو ایسی لاجواب کتابیں ہیں جو فی الواقعی نبی اکرم ﷺ سے محبت کرنے والوں اور عاشقانِ رسول کے لئے سکون قلب کا ذریعہ ہیں۔

دارالعلوم دیوبند کے نصاب تعلیم کو لے کر ایک عرصے سے سوالات اٹھائے جا رہے ہیں اور دور حاضر کے تقاضوں کا حوالہ دے کر اس میں تبدیلی کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ ۱۹۸۰ء میں جب دارالعلوم کا صد سالہ اجلاس منعقد کیا تو راقم الحروف وزارت اطلاعات ونشریات کی طرف سے اس کی خبروں کو حاصل کرنے کے لئے دہلی سے دیوبند حاضر ہوا تھا اور اس موقع پر حضرت حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ سے ایک انٹرویو لیا تھا، اس میں من جملہ دیگر سوالوں کے ایک سوال یہ تھا کہ کیا آپ نصاب تعلیم میں کوئی تبدیلی لانا چاہیں گے؟ آپ نے ایک مخصوص لہجے میں فرمایا کہ بھائی ہم تو قرآن اور حدیث پڑھاتے ہیں، تم کیا چاہو؟ کیا ہم

قرآن اور حدیث کو بدل دیں؟ احقر خاموش ہو گیا۔

بہرکیف! جب ہم مدارس کی تاریخ پر نظر دوڑاتے ہیں اور ان کے قیام کے پس منظر کو جاننے کی کوشش کرتے ہیں تو واضح طور پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان کے قیام کا بنیادی مقصد مسلمانوں کے ایمان و عقیدے کی حفاظت، اسلامی شعائر کا تحفظ، علوم اسلامیہ کی ترویج و اشاعت، اردو، فارسی اور عربی زبانوں کی بقا اور مادیت کی روح فرسا فضا میں روحانیت کے چراغ کو روشن کرنا، سادہ اور قناعت کی زندگی کو اپنا کر دین اسلام کی سربلندی کے لئے خود کو وقف کرنا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ روشن خیالی کے ساتھ طریق زندگی کو اپنانا بھی ضروری ہے۔ ان سب امور کو حکیم الاسلامؒ نے سامنے رکھ کر ان کی ترویج و اشاعت کے لئے ہر ممکن تدبیر اور کوشش کی۔ یہی کوشش دارالعلوم کی تاریخ بن گئی اور آج یہ ادارہ پوری دنیا میں اپنا نمایاں مقام رکھتا ہے۔

حکیم الاسلامؒ مولانا محمد طیب صاحبؒ کی رہنمائی کا دائرہ محض ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش تک ہی محدود نہ تھا بلکہ وسط ایشیا سے لے کر روس، افریقہ، شمالی امریکہ وغیرہ تک پھیلا ہوا تھا۔ تقسیم وطن کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادی تقریباً ۱۸ کروڑ تک ہے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کی معتدبہ تعداد یونان، تبت، نیپال، سری لنکا، برما، تھائی لینڈ، انڈونیشیا وغیرہ میں رہتی ہے جہاں کے طلباء دارالعلوم سے فارغ ہو کر اپنے اپنے وطن جا کر بالواسطہ طور پر حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ کی اسلامی خدمات کی ترویج و اشاعت میں مصروف ہیں۔ اس طرح آپ کی عنایت کردہ دینی تعلیم اور روشن خیالی کا ذکر پوری دنیا میں ہے۔ آپؒ نے قرآنی تعلیمات کے ذریعہ سے حقوق انسانی اور مردوں و عورتوں کی ذمہ داریوں پر بطور خاص توجہ دی اور آپ نے ان باتوں کا ذکر اپنی اکثر تقاریر میں کیا۔ آپ کی اکثر تقاریر دلپذیر میں اس بات پر زور ہوتا تھا کہ انسانوں کے اوپر خدائے بزرگ و برتر نے کچھ ذمہ داریاں عائد کی ہیں، تاہم ان کی ذمہ داریوں کو سمجھنے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ انسان ہونے سے کیا مراد ہے؟ آج کے دور میں ہر شخص حقوق کا مطالبہ کرتا ہے اور انسانی زندگی کو پاک و صاف دیکھنا چاہتا ہے۔ سیکولر بننے کے دعوے دار خود کو حقوق انسانی کا نقیب مانتے ہیں اور مذہبی اقدار کے محافظ دقیانوسی کہلاتے ہیں مگر یہی سیکولر بننے والے دانشور انسانوں کے بارے میں یہ سوچتے ہیں کہ یہ کسی زمانے میں بندر تھے۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ حقوق انسانی کا تصور ابھی حال میں پنپا ہے۔ حقوق انسانی کے حوالے سے اسلامی تعلیمات کو سمجھنے کے لئے قرآن کریم کی تعلیمات جس طرح ہماری رہنمائی کرتی ہیں، وہ بے حد اہمیت رکھتی ہیں۔ قرآنی تعلیمات بتاتی ہیں کہ اللہ بزرگ و برتر خالق ہے اور وہی کائنات کا مالک ہے۔ اس تصور کو عام کرنے سے ان لوگوں کا اقتدار

باطل ہو جاتا ہے جو اس نشے میں ڈوبے ہوئے ہیں اور ہر طرف ظلم وستم پھیلا رہے ہیں۔قرآن کریم میں بتایا گیا ہے کہ موت وحیات خدا کے ہاتھ میں ہے۔اس تصور کو عام کرنے سے انسان اپنے طور پر دوسرے کی جان لینے کے خیال سے باز آسکتا ہے۔قرآن کریم میں کہا گیا ہے کہ باری تعالیٰ دو جہاں کا مالک ہے۔اس تصور کو پھیلانے سے دنیا میں غلامی کا رواج ختم کیا جاسکتا ہے۔مختصراً یہ کہ حقوق انسانی جس طرح قانون کے تحت زندگی گزرنے پر زور دیتے ہیں اور انصاف ومساوات کا ڈنکا پیٹتے ہیں، وہ سب کا سب پہلے ہی قرآنی تعلیمات میں شامل ہے اور یہی وہ تعلیمات ہیں جنہیں مولانا محمد طیب صاحبؒ نے اپنی تحریر وتقاریر کے ذریعہ سے دن رات واضح کیا۔ضرورت اس بات کی ہے کہ اس طرح کے موضوعات کو لے کر تفصیل سے الگ الگ عنوانات کے تحت آپ کے افکار وخیالات کو قلم بند کیا جائے۔یہی صحیح معنوں میں آپ کو خراج عقیدت ہوگا۔حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ نے اپنے دور میں جو ماحول دیکھا وہ کچھ اس طرح تھا، علماء اس دور میں مذہبی اور تہذیبی اصلاح سے زیادہ سیاست پر نظریں جمائے ہوئے تھے۔عوام میں قومی آزادی کا جذبہ، فرقہ وارانہ مفاد کی کشش اور مذہبی مقصد کی لگن۔یہ وہ محرکات تھے جنہوں نے مسلمانوں کے جدید تعلیم یافتہ طبقے اور مذہبی طبقے کے ذہن میں ایک کشمکش پیدا کردی تھی۔عوام الناس مشہور شاعر اور مفکر اقبال اور سیاست داں محمد علی جناح سے متاثر نظر آتے تھے۔ان مشکل حالات میں حکیم الاسلامؒ کی اعتدال پسندانہ فکر اور مذہب کے تئیں خلوص نے آپ کی رہنمائی کی۔قومی آزادی کی جو لہر علمائے دیوبند اور ان کے ہم خیال مسلمانوں کے دلوں سے انگریزی حکومت اور مغربی تہذیب کے چیلنج کے جواب میں اٹھی، اس کا اصل محرک یہی مذہبی جذبہ تھا جو مذہبی قوم پروری کے نام سے ایک تحریک بن کر ابھرا۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کی چند خاص خاص کتابیں درج ذیل ہیں:

آفتاب نبوت، اسلامی آزادی کا مکمل پروگرام، جذبات الم، دارالعلوم دیوبند ایک نظر میں، سائنس اور مذہب کی حقیقت، ساڑھے چار کروڑ مسلمانوں کے نام، اسلام کا پیغام، اسرائیل کتاب وسنت کی روشنی میں، حکمت قاسمیہ، فلسفہ نعمت ومصیبت اول وثانی، عرفان عارف، معجزہ کیا ہے؟، دینی دعوت کے قرآنی اصول، دارالعلوم دیوبند کی صد سالہ زندگی، غلط فہمیوں کا ازالہ، دارالعلوم کی ۷۶ سالہ زندگی پر ایک اجمالی نظر، اسلام اور فرقہ واریت، دارالعلوم کا ایک فتویٰ اور اس کی حقیقت، تقریر علم وحکمت، عالم برزخ، آزاد ہندوستان کا خاموش رہنما دارالعلوم دیوبند، خاتم النبیین، وسیلہ تقریر، تعلیمات اسلام اور مسیحی اقوام، روداد سفر افغانستان۔ ان کے علاوہ بھی آپ کی متعدد تقاریر، خطبات اور فتاویٰ اور کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن کی تفصیل الگ سے

ایک مبسوط کتاب کی متقاضی ہے۔ مثال کے طور پر ۱۹۴۵ء میں جمعیۃ العلماء صوبہ بمبئی کے اجلاس میں 'اسلامی آزادی' کے عنوان سے اپنے خطبہ صدارت میں فرمایا کہ:

''ہندوستان کے مسلمانوں کی داخلی حالت تو علم دین، دیانت، منصب، دولت کے لحاظ سے اس طرح برباد کی گئی مگر خارجی پالیسی اس سے بھی زیادہ برباد کن رہی کیوں کہ یہ ممکن تھا کہ مسلمانوں کے بیرونی تعلقات اس داخلی پالیسی پر کسی وقت اثر انداز ہوتے کیوں کہ ہندوستانی مسلمانوں کا تعلق بیرونی دنیائے اسلام سے بھی تھا۔ افغانستان سے لے کر ترکی تک مسلمانوں کی حکومت کا ایک مستقل سلسلہ قائم تھا۔ احتمال تھا کہ وہ باہر ان کے لئے کئی وزن دار آواز اٹھاتے یا کسی قسم کی اخلاقی یا مادی مدد دیتے۔ اس لئے پوری دنیائے اسلام کو کمزور کرنے کے لئے تمام ممکن ذرائع استعمال کئے گئے اور ان کے لئے بہت سے ایسے تخم مہیا کئے گئے جن میں وہ مبتلا رہیں۔ چنانچہ اختلافات وغیرہ کی جو خلیج ملک میں حائل کی گئی وہی پوری دنیائے اسلام کے لئے بھی رائج کی گئی۔ کہیں ایران وافغانستان کا مسئلہ، کہیں ایران وترکی کا مسئلہ، کہیں ترکی اور عربستان کا مسئلہ، کہیں شام وفلسطین کا مسئلہ، کہیں خلافت اسلامیہ کا مسئلہ۔''

اس طرح حکیم الاسلامؒ حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کے ارشادات عالیہ آپ کی وسیع النظری اور اسلامی سیاست کی زبوں حالی سے واقفیت پر دلالت کرتے ہیں۔

حکیم الاسلامؒ کی ایک کتاب ''سائنس اور اسلام'' دور حاضر کے تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔ اس میں مادہ اور روح کی حقیقتوں سے پردہ اٹھایا گیا ہے اور دل نشیں پیرائے میں اسلام کی حقانیت کو جدید سائنسی ماحول میں ثابت کیا گیا ہے۔ اس طرح سے ہم دیکھتے ہیں کہ حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کی کتابیں جدید نسل کو اپیل کرتی ہیں۔

............❖............

علم کا بحرِ ذخّار

ناز انصاری

سابق ایڈیٹر روزنامہ الجمعیۃ، دھلی

ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے

آج حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ ہمارے درمیان نہیں ہیں کہ ہمیں حکمت و دانائی کی باتیں بتائیں لیکن ان کی خوبیاں ان کی سیرت و کردار اسلام اور امت مسلمہ کے لئے ان کی خدمات جلیلہ ہمارا سرمایہ اور ہماری ملی زندگی کا گراں قدر اثاثہ ہیں، ان کی زندگی ان اقدار سے عبارت تھی جو ان کے بعد حد نظر اور فکر و خیال کی پرواز و رسائی تک ہمیں کہیں نظر نہیں آتیں۔ یقیناً یہ ہماری ملی زندگی کا بہت بڑا المیہ ہوگا کہ ہم ان کے لئے رنج وافسوس تو کریں مگر ان کی زندگی کو آدرش مان کر ان سے کچھ سیکھنے کی کوشش اور عزم نہ کریں۔ حکیم الاسلامؒ حیات تھے تو ہم ان کی محافل وعظ و نصیحت میں شرکت تو کرتے مگر ہم نے یہ کبھی سوچنے کی زحمت نہیں کی کہ ان کی عظیم المرتبت شخصیت ہمارے لئے کس درجہ اہمیت کی حامل ہے، مگر آج جب کہ وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ یہ ہمارا ملی فریضہ ہے کہ انھوں نے زندگی کی جن شاہراہوں کی نشان دہی کی تھی ان پر چل کر ہم ان منازل کو طے کریں جو اسلام نے انسانی زندگی انسانی سماج، ملک وقوم کی عظمت و سربلندی حاصل کرنے کے لئے متعین کی ہیں۔ آج وہ بے شک نہیں ہیں لیکن ملک کا کون سا گوشہ کون سا قریہ ہوگا جہاں ان کی آوازیں، ان کے پند ونصائح کانوں میں نہ گونج رہے ہوں اور انسانی ضمیر پر دستک نہ دے رہے ہوں۔

حکیم الاسلامؒ علم کا سرچشمہ تھے جس سے ایک نہیں ہزاروں دریا بلکہ دریائے فیض رواں ہوئے ہیں۔ وہ دینی علمی دنیا کی ایک ایسی قد آور شخصیت تھے، جسکے سایہ میں سینکڑوں نہیں ہزاروں شخصیتیں دینی اور علمی مطلع پر ابھریں، وہ ایک ایسا چراغ تھے جس سے ہزاروں قندیلیں روشن ہوئیں۔ وہ علم کا ایک بحرِ ذخار تھے جس کے

سینے پر سے ہزاروں علمی قافلے گذرے اورانھوں نے جابجا علم کے سنگ میل قائم کیے۔ آہ اب ؎

ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے

وہ اٹھاون برس سے زیادہ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم رہے تھے اور انھوں نے اس دوران دارالعلوم کی جو خدمت کی، جو ترقی دارالعلوم نے ان کی رہنمائی میں کی، اس کی وجہ سے حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ اور دارالعلوم دیوبند ایک ہی چیز کے دو نام، دو روپ اور دو نشان بن گئے تھے۔ اوران کی شخصیت کو آج دارالعلوم سے الگ کر کے یا دارالعلوم کو ان کی شخصیت سے جدا کر کے دیکھنا اور جائزہ لینا مشکل ہوگا۔ انھوں نے دارالعلوم کو وہ سب کچھ دیا جو حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانیٔ دارالعلوم دیوبند کی اولاد اوران کی روایات اور سیرت کے وارث وامین سے توقع کی جاسکتی تھی، سچ اور صحیح بات یہ ہے کہ دونوں نے ایک دوسرے کی تعمیر کی، دونوں نے ایک دوسرے کو عزت وعظمت بخشی، دونوں نے اسلام اور ملت اسلامیہ کا نام روشن کیا ہے۔

حق تعالیٰ ان کو آخرت کی زندگی میں اس کا اجر وثواب دے اوراس چمنستان قاسمی کو سرسبز وشاداب رکھے، جس کی خدمت کو حکیم الاسلامؒ نے اپنا نصاب زندگی اور وظیفۂ حیات بنالیا تھا۔

حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ دارالعلوم دیوبند کے ساتویں مہتمم تھے، ۱۸۹۷ء میں پیدا ہوئے، تاریخی نام مظفرالدین تھا۔ وہ حافظ تھے، قاری تھے، عالم تھے، خطیب تھے، صاحب قلم اور صاحب کردار تھے، ان کا پرنور چہرہ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی عظمت وکردار کا آئینہ دار تھا۔ ان کی بڑی بڑی آنکھیں مہر ومحبت، اخوت ورواداری کی قندیلیں تھیں۔ ان میں وہ مقناطیسی قوتیں تھیں جس نے ہر مخاطب کو اپنا گرویدہ بنایا۔ ان کی کشادہ پیشانی اسلام کی چودہ سوسالہ عظمت کا روشن مطلع تھی، زبان میں حلاوت، گفتار میں شیرینی، رفتار میں عظمت وجلال، سر پر اونچی باڑھ کی دو پلی ٹوپی، لمبا کرتہ، مغلئی، پاجامہ، کبھی کبھی شیروانی، ہاتھ میں عصائے علم وعمل اس حلیۂ مبارک میں میں نے انھیں دیکھا ہے۔

آپ نے قرآن مجید حفظ کیا۔ تجوید کا فن حاصل کیا۔ پھر فارسی، ریاضی سے اور عربی علوم سے دارالعلوم سے فراغت پائی، علم حدیث میں حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے خلافت حاصل کی۔ اس کے بعد دارالعلوم میں استاد مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۴ء میں نائب مہتمم اور ۱۹۲۹ء میں حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ کے انتقال کے بعد مہتمم بنائے گئے۔ جب آپ مہتمم مقرر ہوئے تو دارالعلوم کے شعبۂ اہتمام میں آٹھ شعبے تھے۔ اب ان کی تعداد ۲۴ رہوگئی تھی۔ اور بجٹ

۵۰۲۶۲ر سے بڑھ کر ایک کروڑ سے اوپر پہنچ گیا تھا۔

دارالعلوم کا عملہ ۴۵ر سے بڑھ کر دوسو کے قریب ہو گیا۔ اساتذہ اور طلبہ میں دن بدن اضافہ ہوتا گیا۔ تعمیرات کا سلسلہ بھی برابر جاری رہا۔ دارالتفسیر، دارالافتاء، دارالقرآن، جامعہ طبیہ جدید، دو منزلہ دارالاقامہ، مہمان خانہ، کتب خانہ کا جدید ہال اور باب الظاہر وغیرہ کی تعمیر عمل میں آئی۔ دارالعلوم کے علاوہ آپ کا تعلق جمعیۃ علماء ہند سے بھی رہا۔ اور ان کی متعدد صوبائی اور ضلعی کانفرنسوں کی صدارت فرمائی۔ اس وقت آپ مسلم پرسنل لاء بورڈ کے چیرمین بھی تھے۔

خطابت کے ساتھ ساتھ تحریر و تصنیف کے میدان میں بھی آپ گامزن رہے۔ التشبہ فی الاسلام، مشاہیر امت، کلمات طیبات، سائنس اور اسلام، تعلیمات اسلام اور مسیحی اقوام، مسئلہ زبان اور ہندوستان، دین و سیاست، اسلامی آزادی کا مکمل پروگرام، اسباب عروج و زوال اقوام، اصول دعوت اسلام، اسلامی مساوات، تفسیر سورۂ فیل، فطری حکومت، الاجتہاد والتقلید آپ کی قابل ذکر تصانیف ہیں۔

اس صدی میں ہندوستان میں جن لوگوں نے خطابت میں نام پیدا کیا، حکیم الاسلامؒ ان میں سے ایک تھے، ان کی تقاریر نے نہ صرف اندرون ملک بلکہ بیرون دنیا میں بھی مسلمانوں کی نئی نسل کو بے حد متاثر کیا۔ اور بڑا نام پیدا کیا۔ ان کی تقریروں میں چٹکلے اور واعظانہ پھبتیاں نہیں ہوتی تھیں، علم کا دریا موجیں بھرتا نظر آتا تھا۔ ان کی زبان و دہن علم کا ایک جھرنا معلوم ہوتی تھی، جس سے ہزاروں کا مجمع ہو یا لاکھوں کا، سیراب و سرشار ہوتا تھا۔ ہر بار تقریر میں ایک نیا کیف، ایک نیا ولولہ اور ایک نیا پیغام ہوتا تھا۔ آج کی مسلمان نسل جس کے ارد گرد دہریت کے طوفان اٹھ رہے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ آج اس کو مخاطب کرنے والا اور اسلام سمجھانے والا کوئی دور دور تک نظر نہیں آتا۔

افسوس کہ حکیم الاسلامؒ کو زندگی کے آخری ایام میں اپنی زندگی کے سب سے بڑے المیہ سے دوچار ہونا پڑا۔ یہ بزرگوں کا اختلاف تھا۔ اس میں ہمارا کچھ نہ کہنا زیادہ مناسب ہے۔ اور پھر میں تو خود بھی اس میں فریق رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمائیں اور حکیم الاسلامؒ کی قبر پر تاقیامت رحمتوں کی بارش فرمائے اور آپ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ وارفع مقام عطا فرمائے۔

............❖............

حضرت حکیم الاسلامؒ اور اعتدال فکر ونظر

مولانا مفتی یاسر ندیم الواجدی
ناظم دارالعلوم آن لائن، امریکہ

وہ اقلیم خلوص کے شہر یار، کاروان خطاب وموعظت کے سالار، قلزم حکمت کے منارہ ضوبار اور علم وتقویٰ ورشد وہدایت کی سنہری لڑی کے ایسے گوہر آب دار تھے جو اس کرۂ ارض پر صدیوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں اور اپنی زندگی میں منارۂ نور بن جاتے ہیں؛ لیکن اپنے جانے کے بعد ایسا عمیق خلا چھوڑ جاتے ہیں کہ ان کے بعد کی نسلیں اس کو پُر کرنے سے قاصر رہتی ہیں۔ وہ اپنی تحریر کی شوکت، خاندان کی وجاہت، اپنے دل کی آفاقی وسعت، اپنے مزاج کی بے نظیر شرافت اور اپنی نظر وفکر کے بے مثال اعتدال کے حوالے سے ایک ایسی عظیم شخصیت تھے کہ جن کو بجا طور پر، مدینۂ علم دیوبند کی طاق زریں کے ہزاروں بجھے ہوئے چراغوں کی قطار میں ایک ایسا آخری اور تنہا چراغ کہا جاسکتا ہے کہ جس کے گل ہوجانے سے تمام وابستگان دیوبند کے دلوں پر مہیب اندھیرا محیط ہوکر رہ گیا تھا۔ حضرت حکیم الاسلام نور اللہ مرقدہٗ ہی کی ذات گرامی ہے کہ جس نے قرآن وسنت کی دلنشیں تفہیم کی، شریعت وطریقت کے حسین امتزاج سے پردہ کشائی کی، اسلام کی فکری تاریخ کے تسلسل سے امت کو روشناس کرایا، علوم ولی اللہی کی حسین تشریح کی، حکمت قاسمیہ کی ترجمانی کی کہ جس کے آپ واحد وارث وامین تھے اور ان سب پر مستزاد یہ کہ آپؒ نے علمائے دیوبند کے فکری ونظری اعتدال کو وہ عروج بخشا کہ تمام وابستگانِ ''قاسمیت ودیوبندیت'' کو اپنے اہل سنت والجماعت ہونے کا یقین محکم ہوگیا۔ آپ نے اپنی زبان وقلم سے مسلک دیوبند کے اعتدال اور جامعیت کو جس طرح واضح کیا وہ ہم پر ایک عظیم احسان ہے۔ کتنے ہی چلتے پھرتے ذی نفس ایسے ہیں جنہوں نے اپنے شوق کے کانوں سے اس موسیقی آمیز آواز کو سنا ہے جو اپنے اندر اسرار شریعت اور حکمت قاسمیہ کے بے پناہ لطائف لیے گھنٹوں گونجتی رہتی تھی اور اپنے سامعین کو سحر

میں جکڑ لیتی تھی۔ وہ اپنے کرب انگیز تکلّم سے اعتدال و جامعیت کا اس انداز سے درس دیتے کہ سامعین بے اختیار اپنے دلوں میں ایک عجیب تبدیلی محسوس کرتے اور حکیم الاسلام کی حکمت سے لبریز تقریر دِل پذیر سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ پاتے۔ انہوں نے اپنے رشحات قلم سے اعتدال نظر و فکر کی سنہری لڑی میں جس طرح موتی پروئے ہیں، ان کی چمک حکیم الاسلام کی تحریریں پڑھنے والے کے دل پر اثر انداز ہوتی ہے اور وہ افراط وتفریط اور غلو وتقصیر کے درمیان اعتدال ومیانہ روی کی حدّ فاصل کی نشاندہی کر دیتی ہے۔ غرض یہ کہ آپؒ نے علوم ولی اللہی جس کے آپ امین تھے حکمت قاسمیہ جس کے آپ وارث تھے، معارف انوریہ جس کے آپ حامل تھے اور طریقت تھانویہ جس کے آپ نائب تھے کے امتزاج سے ایک ایسا آمیختہ آنے والی نسلوں کو پیش کیا ہے کہ جس کو اعتدال فکر ونظر کے علاوہ کوئی دوسرا عنوان نہیں دیا جا سکتا۔

اعتدال قرآن وسنت کی نظر میں

اعتدال کے لفظی معنی ہیں برابر ہونا، متوازن ہونا اسی کے ہم معنی لفظ قرآن کریم میں استعمال ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطاً (اوراسی طرح ہم نے تم کو ایک معتدل امت بنایا) وَسَطْ کے معنی ائمہ لغت نے ''الخيار والاعتدال من كل شيء'' بیان کیے ہیں۔ علامہ زمخشریؒ نے بھی اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے "وَسَطاً" کے معنی یوں لکھے ہیں وسطاً أي أعدلها وأخيرها. اعتدال کے ایک معنی ہیں ''کسی چیز کا بہترین حصہ یا پہلو'' جیسا کہ بعض اصحاب معاجم نے اس کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: هو الخيار والأعلى من كل شئ وہیں اس کے ایک دوسرے مشہور معنی بھی ہیں کہ اعتدال اور وسطیت کہتے ہیں دو متضاد یا مقابل پہلوؤں اور نظریوں کے بیچ کا راستہ بایں طور کہ ایک پہلو دوسرے پر غالب نہ آئے، بلکہ دونوں پہلوؤں کے درمیان توازن قائم رکھتے ہوئے اس طرح عمل کیا جائے کہ نہ افراط کا احساس ہو اور نہ تفریط کا، نہ غلو کی آمیزش ہو اور نہ تقصیر کی۔

ربانیت وانسانیت، روحانیت ومادیت، اخرویت ودنیویت، انفرادیت واجتماعیت اور وحی وعقل کے درمیان انسان اس طرح توازن قائم کرے کہ نہ رہبانیت کا اس پر الزام آئے اور نہ مادہ پرستی کی بو۔ وصف اعتدال کی اسی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے اللہ عزوجل نے بہ طور انعام واحسان مذکورہ آیت میں امت مسلمہ کو معتدل امت کا لقب دیا اور اعتدال کو انسانی شرف وفضیلت کا معیار قرار دیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے مواقع پر اعتدال اور میانہ روی کی دعا مانگی ہے۔ ایک روایت میں آپؐ نے اعتدال کا حکم دیتے ہوئے فرمایا: القصدَ القصدَ تبلُغوا ''اعتدال اختیار کرو منزل مقصود پر پہنچ جاؤ گے۔'' ابن عباسؓ روایت

کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا إن الهدي والسمت والقصد جزء من ستة وعشرين جزءا من النبوة. رسول کا طریقہ وسیرت اور میانہ روی نبوت کا چھبیسواں جزء ہیں۔

غرض یہ کہ اعتدال ومیانہ روی اس امت کا امتیازی وصف ہے۔ اسلام کی فکری تاریخ میں جو نظریہ بھی وصف اعتدال سے محروم ہوا وہ جادۂ مستقیم سے منحرف کہلایا اور جس نظریہ نے اعتدال کا دامن تھاما وہ راہ حق پر گامزن نظر آیا۔

اعتدال فکر ونظر کا تسلسل

قرآن کریم کے مطابق ''اعتدال'' چوں کہ اس امت کا امتیازی وصف ہے، اس لیے ابتدا سے لے کر آج تک سطح زمین پر ایسے نفوس ہمیشہ اپنی موجودگی درج کراتے رہے ہیں کہ جن کی زندگی کے ہر ہر پہلو میں اعتدال کی واضح جھلک نظر آئی۔ ان کا پیش کردہ ہر ایک نظریہ اور ان کے ذریعہ متعارف شدہ ہر ایک موقف وصف اعتدال سے متصف رہا ہے اور اس طرح اسلام کی ان عظیم شخصیات نے امت مسلمہ کی فکری تاریخ میں اعتدال فکر ونظر کا ایسا تسلسل قائم رکھا ہے جو کبھی کسی بھی طرح کے خلا سے آشنا نہیں ہوا۔ بلکہ اعتدال فکر ونظر کا یہ تسلسل بھی اس امت کی ایک امتیازی صفت ہے کہ جس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں کچھ اس طرح بیان فرمایا: **يحمل هذا العلم من كل خلف عُدولُه ينفون عنه تحريف الغالين وانتحال المبطلين، وتأويل الجاهلين.** ''اس علم دین کو ہر آنے والی نسل میں سے ارباب عدل لیں گے جو اس سے، حد سے گذر جانے والوں کی تحریف، باطل پرست لوگوں کے کذب اور جاہلوں کی تاویل دور کریں گے۔''

خوارج نے جب افراط وتفریط سے کام لیا تو صحابہ وتابعین نے وصف اعتدال سے ان کا مقابلہ کیا۔ معتزلہ ومرجیۂ نے جب غلو وتقصیر کا دامن تھاما تو اشاعرہ وماتریدیہ نے اعتدال کی راہ اختیار کرتے ہوئے اہل سنت والجماعت کے موقف کو واضح کردیا، غرض یہ کہ خلفائے راشدین وصحابہ کرامؓ کے عہد سے لے کر دور حاضر تک کی تاریخ ہر زمانے میں ایک ایسے طبقے یا ایسی شخصیات کی موجودگی پر شاہد عدل رہی ہے جنھوں نے اپنے فکر ونظر کے اعتدال سے باطل نظریات کا مقابلہ کیا اور حق کو حق پرستوں کے سامنے عیاں کردیا۔ اتنا ضرور ہے کہ اعتدال کی صورت ہر دور میں کچھ مختلف رہی ہے؛ لیکن اس کے حقیقی معنی ''**الخيار والأعلى من كل شيء**'' ہمیشہ باقی رہے ہیں۔

دورِ صحابہ اور اعتدال نظر وفکر

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کبھی اعتدال ومیانہ روی سے روگردانی نہیں کی، انھوں نے ہمیشہ افراط وتفریط سے بچتے ہوئے درمیانی راہ پر چلنے کو ترجیح دی۔ انھوں نے فکری اعتدال کی ایسی ایسی مثالیں پیش کی ہیں، جو صحابۂ کرام کے مقدس نفوس کی طرح خود بھی قدٗ وہ اور لائق اتباع بن گئیں۔ کبھی وہ اعتدال وتوازن قائم رکھتے ہوئے اپنے ذاتی اجتہادات کو حدیث نبوی کے سامنے یکسر مسترد کردیتے تو کبھی کسی کی بیان کردہ روایت کو کسی علت کی بناء پر نا قابل عمل قرار دیتے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اپنی معرکۃ الآراء کتاب ''الانصاف في بیان أسباب الاختلاف'' میں حضرات صحابہؓ کے طرز عمل کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ: ''اگر ان کو کسی مسئلے کے بارے میں حکم شرعی معلوم نہ ہوتا تو دوسرے صحابہ سے دریافت فرماتے کہ تم میں سے کسی نے اس امر کے متعلق پیغمبرؐ کا کوئی فرمان سنا ہے؟ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے سامنے جب دادی کی وراثت کا مسئلہ پیش ہوا تو آپ نے فرمایا کہ ''میں نے اس کے حصے کے بارے میں رسول اللہؐ سے کوئی ارشاد نہیں سنا ہے اس لیے میں اس کے متعلق اوروں سے پوچھتا ہوں'' جب نماز ظہر آپؓ نے ادا کرلی تو لوگوں سے پوچھا کہ ''کیا تم میں سے کسی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دادی کے حق میں وراثت کے بارے میں کچھ فرماتے سنا ہے؟'' مغیرہ ابن شعبہؓ نے فرمایا کہ 'ہاں میں نے سنا ہے' رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دادی کو میت کے مال کا چھٹا حصہ دیا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے دریافت فرمایا کہ ''یہ بات تمہارے سوا کسی اور کو بھی معلوم ہے'' محمد بن مسلمہؓ نے جواب دیا کہ ''مغیرہ صحیح کہتے ہیں'' یہ سن کر حضرت ابوبکرؓ نے اس عورت کو چھٹا حصہ دینے کا فیصلہ فرمایا''۔

وہیں دوسری طرف ہمیں ایسی بھی مثال ملتی ہے کہ صحابہ نے روایت پر عمل کرنے کے بجائے اجتہاد کو ترجیح دی اور یوں منشائے نبوی کو پا گئے۔ حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ تحریر فرماتے ہیں: ''اس کی مثال فاطمہ بنت قیس کی اس حدیث سے ملتی ہے جس کو اصحاب اصول نے اپنی کتابوں میں درج کیا ہے کہ فاطمہؓ نے حضرت عمرؓ کے روبرو آکر عرض کیا کہ ''مجھ کو تین طلاقیں دی گئی تھیں، آپ ﷺ نے نہ تو مجھ کو زمانۂ عدت کا نفقہ دلایا اور نہ مکان'' حضرت عمرؓ نے ان کی گواہی ماننے سے انکار کردیا اور فرمایا کہ ہم ایک عورت کے قول کی بنا پر کتاب الٰہی کو نہیں چھوڑ سکتے، جس کے متعلق نہیں کہا جا سکتا کہ وہ صحیح کہہ رہی ہے یا غلط۔ فاطمہ بنت قیسؓ کے قول کو سن کر حضرت عائشہؓ نے بھی فرمایا کہ 'فاطمہ کو کیا ہوگیا کہ وہ اللہ کا خوف نہیں کرتی''۔

ایک مثال میں بیان کردہ روایت کوفوراً قبول کرلیا گیا اور فیصلے کی بنیاد بنا دیا گیا، وہیں دوسری مثال میں روایت کو ناقابل عمل سمجھا گیا۔ یہ دونوں مثالیں صحابہ کرامؓ کے فکری ونظری اعتدال کی واضح دلیلیں ہیں کہ انہوں نے افراط وتفریط کو چھوڑ کر مرادنبوی کو پانے کے لیے کبھی اپنے فیصلوں کی بنیاد بیان کردہ روایت پر رکھی تو کبھی اپنے اجتہاد پر۔

ائمہ فقہ اور اعتدال

اسلامی تاریخ میں ائمہ فقہ خصوصاً ائمہ اربعہ ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں، ان کی فقہی خدمات نے ہماری تاریخ کو ایک نیا رخ اور نئی جہت عطا کی ہے۔ ان کے اپنائے ہوئے طریقوں، بیان کردہ اصولوں اور ان صولوں سے اخذ کردہ فروعات نے امت مسلمہ کی فکری قوت کو جلا بخشی ہے اور اس کے بہتے ہوئے سوتوں میں مزید جوش پیدا کیا ہے۔ اسلام کی فکری تاریخ ان ائمہ کے تذکرے کے بغیر ادھوری ہے۔ لیکن ان عظیم ائمہ کی خدمات کو یہ اعلی مقام محض اس لیے ملا کیوں کہ ائمہ فقہ کا ہر ایک اجتہاد ''اعتدال اور وسطیّت'' کا حسین پر تو تھا۔ ان کی فکری عمارت میں ایک اینٹ بھی جان بوجھ کر بے موقع وضع نہیں کی گئی تھی، بلکہ ان کی تعمیر کردہ پوری عمارت ان ائمہ عظام کے مزاج میں ''اعتدال'' کا پتہ دیتی ہے۔

حنفی مذہب کی جامعیت اور اعتدال کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے اپنے مذہب کی بنیاد شورائی نظام پر رکھی۔ آپ کی فقہی کونسل میں ہر علم وفن کے ماہرین جمع تھے۔ ایسے فقہا بھی تھے جن کا طبعی رجحان علم حدیث کی طرف تھا۔ ایسے علماء بھی تھے جو علم لغت کی طرف طبعی میلان رکھتے تھے۔ اس طرح فقہ حنفی نے اجتماعی طور پر نظر وفکر کے اعتدال کا اعلی ترین نمونہ پیش کیا۔ انفرادی طور پر بھی علماء احناف نے نظریۂ ''اعتدال'' کی حفاظت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ: امام محمد بن حسن نے پہلے تو امام ابوحنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ سے فقہ کی تعلیم حاصل کی، پھر مدینہ جا کر امام مالکؒ کی موطاّ سے مقابلہ کر کے دیکھا۔ اگر حنفی نقطۂ نظر اس کے مطابق نظر آیا تو خیر، ورنہ اختلاف کی صورت میں صحابہ اور تابعین کے مختلف مذاہب واقوال جستجو کی، اگر کسی کے یہاں اپنے مذہب کے موافق قول مل گیا تو اس صورت میں بھی وہ اپنے مذہب حنفی پر قائم رہے؛ لیکن اگر کوئی مسئلہ ایسا نکلا جس کی بنیاد کسی کمزور قیاس یا بے جان استنباط پر تھی اور اکثر علما کے عمل سے یا کسی ایسی حدیث صحیح سے اس کی مخالفت ہو رہی تھی، جس پر فقہا نے عام طور سے عمل کیا ہے، تو ایسی حالت

میں انہوں نے اپنی رائے بدل دی اور امام ابوحنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے مذہب سے ہٹ کر مذاہب سلف میں سے کسی ایسے مذہب کو اختیار کرلیا، جو ان کی نگاہ میں سب سے زیادہ لائق اور راجح نظر آیا۔ اس طرح امام محمد بن حسنؒ نے ''اعتدال فکر'' کا ایسا اعلیٰ نمونہ پیش کیا جو آگے چل کر ارباب فقہ وفتاویٰ کے لیے مشعل راہ ثابت ہوا۔

امام دارالہجرۃ مالک بن انسؒ نے اسی فکری اعتدال کو ایک دوسرے انداز سے پیش فرمایا۔ خلیفہ منصور نے جب امام مالک سے یہ عرض کیا کہ میں آپ کی تصانیف کے متعدد نسخے نقل کرا کے ہر ہر شہر میں بھیجنا چاہتا ہوں تاکہ سب لوگ آپ ہی کی کتابوں کے مطابق عمل کریں تو امام مالکؒ نے جو جواب دیا وہ سنہرے حروف سے لکھے جانے کے لائق ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ ''ایسا نہ کیجئے۔ کیوں کہ لوگوں میں سلف کے مختلف اقوال پھیل چکے ہیں اور مختلف اقسام کی احادیث ان تک پہنچ چکی ہیں۔ اب ان مختلف اقوال واحادیث میں سے ہر گروہ ان چیزوں پر عمل پیرا ہے جو ان کے کانوں میں پہلے پڑ گئیں۔ لہٰذا لوگوں کو آزاد چھوڑ دیجئے اور ہر بستی کے مسلمانوں کو اسی مسلک پر عمل کرنے دیجئے جو انھوں نے احادیث رسول اور اقوال صحابہ کی روشنی میں اپنے لیے اختیار کیا ہے۔''

امام مالکؒ اگر اس وقت راہِ اعتدال سے انحراف کر لیتے، تو امت مسلمہ کم از کم خلافت عباسیہ کے خاتمے تک اعتدال پر قائم نہ رہتی اور نظریۂ تقلید کو لے کر افراط کا شکار ہو جاتی، احادیث کا بہت بڑا ذخیرہ اور صحابہ کرامؓ کے بے شمار فتاویٰ معطل ہو کر رہ جاتے اور یوں اس امت کی فکری ترقی فوراً زوال میں بدل جاتی۔

امام شافعیؒ بھی اس بزم فقہ واجتہاد میں تشریف لائے اور اسی اعتدال کے ساتھ جلوہ گر ہوئے جو انھیں اپنے پیش روؤں سے وراثت میں ملا تھا۔ انھوں نے متقدمین کے فکر واستنباط کا گہرائی سے جائزہ لیا اور ''اعتدال'' کی عمارت مزید مضبوط کرنے کی غرض سے طریقۂ فکر ونظر میں از سر نو غور کیا۔ انھوں نے مذہب کی اساس جن امور پر رکھی ہے، ان کا تذکرہ امام موصوف نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب '' الأم'' کے ابتدائی اوراق میں فرمایا ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

(۱) یہ لوگ مرسل اور منقطع احادیث کو بھی لے لیتے ہیں، جس کی وجہ سے ان کے اقوال میں لغزشیں راہ پا لیتیں ہیں۔ کیوں کہ جب حدیث کے تمام طریقوں کو جمع کیا جاتا ہے اور محدثانہ چھان بین کی جاتی ہے، تو معلوم ہوتا ہے کہ کتنی ہی مرسل حدیثیں ایسی ہیں جن کی کوئی اصل نہیں اور کتنی ہی ایسی ہیں جو مسند اور مرفوع احادیث کے خلاف پڑتی ہیں، اس لیے ہم مرسل روایات کو اس وقت تک قبول نہ کریں گے جب تک ان میں چند خاص شرطیں نہ پائی جائیں۔ (ان شرائط کی تفصیل کتب اصول میں موجود ہے۔)

حضرت شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ ''امام شافعیؒ سے پہلے مختلف نصوص میں مطابقت پیدا کرنے کے لیے قواعد منضبط نہیں تھے، جس کے باعث فقہا کے اجتہادات غلطیوں سے محفوظ نہ رہ سکتے تھے۔ اس لیے امام شافعیؒ نے پہلے یہ اصول وقواعد وضع کیے اور ان کو باقاعدہ ایک کتاب کی شکل میں مرتب کیا، اصول فقہ کی یہ پہلی کتاب ہے جو عالم وجود میں آئی۔''

امام شافعیؒ کے اس نظریے سے خواہ دیگر ائمہ فقہ نے اتفاق نہ کیا ہو، لیکن اس میں دو رائے نہیں ہوسکتیں کہ ان کا مقصد فقہ کے باب میں نظر وفکر کے اُس اعتدال کو مزید تقویت پہنچانا تھا جو کابراً عن کابرٍ ان تک پہنچا تھا۔ بہرحال ائمہ فقہ نے جہاں امت کی فکری تاریخ کو ایک نیا رخ عطا کیا وہیں اعتدال کا دامن بھی ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ اس طرح آیندہ نسلوں کو انھوں نے یہ پیغام دیا کہ کوئی بھی نظریہ وصف اعتدال کے بغیر بار آور نہیں ہوسکتا۔

شاہ ولی اللہؒ اور اعتدال

یقیناً تسلسل اعتدال کا یہ تذکرہ امام بخاریؒ، امام غزالیؒ اور امام رازیؒ جیسے مفکرین ومصلحین کے ذکر کے بغیر ادھورا ہے؛ لیکن اس حقیقت کے پیش نظر کہ پوری امت کی فکری تاریخ میں جو حیثیت ائمہ اربعہ کو حاصل ہے، وہی حیثیت برصغیر کی اسلامی تاریخ میں اپنے وقت کے مجدد اور عظیم مصلح، مسند الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کو حاصل ہے، ہم نے ائمہ فقہ کے تذکرے کے بعد شاہ صاحبؒ کا ذکر مناسب سمجھا۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے جو تجدیدی کارنامہ انجام دیا ہے اس کو ''فکر ونظر کے اعتدال'' کے علاوہ کوئی دوسرا عنوان نہیں دیا جاسکتا۔ آپ نے شریعت وطریقت، فقہ واجتہاد اور احسان وتصوف کے میدانوں میں اپنی بیش بہا تصانیف کے ذریعہ جو نقطۂ اعتدال پیش کیا، وہ ہمیشہ ہمیش کے لیے آنے والی نسلوں کے سامنے نقش راہ بن گیا۔

مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

''اس میں شک نہیں کہ پچھلی صدیوں میں بعض حالات ایسے پیش آئے خصوصاً اسلام کے اصل سرچشموں یعنی قرآن وحدیث کی تعلیم سے اسلامی مدارس بہت حد تک بیگانے ہوتے چلے گئے، بتدریج یہ اختلافات بہت غلط صورت اختیار کرتے چلے گئے خصوصاً ماوراء النہر (ترکستان وخراسان) کے حنفی فقہاء کا غلو اس باب میں آہستہ آہستہ بہت آگے بڑھ گیا تھا اور ہندوستان میں وطن بنانے کے لیے اسلام جس راستے

سے آیا، چوں کہ وہ انہی ممالک کا راستہ تھا اس لیے قدرتاً ہندوستانی مسلمانوں کی ذہنیت انہی ممالک کے علما کی ذہنیت سے متاثر تھی، پھر نادری اور ابدالی حملوں نے جب اس ملک میں روہیلو کے جدید عنصر کا اضافہ کر دیا تو تشدد و تصلب کی یہ شرارت دو آتشہ ہوگئی۔ شاہ صاحبؒ نے بڑی دانشمندی اور گہرے مطالعے کے بعد فقہ اور اصول فقہ کی بنیادوں سے پردہ ہٹایا، ائمہ مجتہدین اور ان کے اجتہادات کا جو صحیح مقام تھا اسے واضح فرمایا''۔

آپ ہی نے اُس جمود و تعطّل کے ماحول میں اپنے آپ کو ''**الحنفي عملاً، والحنفي والشافعي درساً**'' کہہ کر حنفیت اور شافعیت کے درمیان اس خلیج کو پاٹ دیا جو گہری ہوتی جارہی تھی۔ شاہ صاحبؒ نے ائمہ مجتہدین کے قیاسی نتائج کے متعلق بجائے اس نظریے کے کہ ''حق ان میں سے ایک ہی ہوسکتا ہے'' اس خیال کو ترجیح دی ہے کہ ''سب ہی حق پر ہیں'' اس طرح انہوں نے فروعی اختلافات کی اہمیت کے سارے قصے کو ہی ختم فرمادیا۔ اس طرح آپ نے تقلید اور مذاہب اربعہ کے بارے میں ایک نہایت معتدل نظریہ پیش کر کے ماوراء النہر کے راستے سے ہندوستان میں داخل ہونے والے منفی اثرات کا ازالہ کر دیا۔ اسی فکری اعتدال کی وجہ سے مولانا عبیداللہ سندھیؒ حضرت شاہ صاحبؒ کے بارے میں ایک نہایت اہم جملہ تحریر فرماتے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ: ''ہم شاہ ولی اللہ کو حنفی اور شافعی ہر دو فقہ میں مجتہد منتسب مانتے ہیں''۔ آپ نے ''**المسوی**''، ''**المصفی**''، ''**الانصاف في بيان أسباب الاختلاف**'' اور ''**عقد الجيد في أحكام الاجتهاد والتقليد**'' جیسی کتابیں تصنیف فرما کر مسلکی تعصب اور فقہی جمود کو دور کر کے ذہنوں میں وسعت پیدا کی اور علمائے دین کو اجتہاد و بصیرت سے کام لینے پر ابھارا۔ اس طرح شاہ صاحبؒ نے مسلکی تعصب اور افراط کے شکار ذہنوں اور عدم تقلید کا رجحان رکھنے والے تفریط زدہ خیالات کے بیچ کی راہ نکال کر، مسلمانانِ ہند کی فکری تاریخ کو ہمیشہ کے لیے ایک جہت عطا کر دی۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ فکری اعتدال کے باب میں آیندہ کی جانے والی تمام کوششیں، شاہ صاحبؒ کے پیش کردہ ''نظریہ اعتدال'' کو بنیاد بنائے بغیر کامیاب نہیں ہوسکتیں۔

حضرت نانوتویؒ اور اعتدال

فکرِ ولی اللّٰہی کے حقیقی وارث ''علمائے دیوبند'' نے اپنے افکار و نظریات میں اسی اعتدال کو باقی رکھا جو وراثتاً انہیں ولی اللّٰہی خانوادے سے ملا تھا۔ حضرت الامام النانوتویؒ کے علمی مقام کا اندازا حضرت حکیم الاسلامؒ کے

اس جملے سے لگایا جاسکتا ہے کہ ''علمائے دیوبند فروع میں حضرت گنگوہیؒ کے تابع ہیں اور اصول میں حضرت نانا نوتویؒ کے'' حضرت الامام النانوتویؒ جہاں دارالعلوم دیوبند، اور تحریک مدارس کے بانی ہیں وہیں علمائے دیوبند کے نظریاتی قائد بھی ہیں۔ آپ ہی کے فکر وفلسفے نے جس کو ''حکمت قاسمیہ'' سے اچھے اسلوب میں تعبیر نہیں کیا جاسکتا، دیوبندیت کو ایک مکتبۂ فکر بنایا۔ اسی ''حکمت قاسمیہ'' کا نتیجہ ہے کہ آج دیوبند محض ایک مدرسہ نہیں بلکہ ایک جامع تحریک کا نام ہے جس نے اپنے بانی اور قائد کے نظری وفکری اعتدال سے سرمو انحراف نہیں کیا۔ ''حکمت قاسمیہ'' نے فکرولی اللّٰہی سے جو وصف اعتدال اخذ کیا تھا حضرت الامام نانوتویؒ نے ہمیشہ اس کی آب یاری کی اور اعتدالِ فکرونظر کے تسلسل کی حسین لڑی میں اپنے نام نامی کا اضافہ کیا۔

حضرت نانوتویؒ کی تصانیف کو پڑھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے اپنی تحریروں میں خالص معروضی انداز اختیار کیا ہے، آپ کسی مسئلے میں اپنے جذبات ومحسوسات سے الگ رہ کر خالص عقلی وفکری اور منطقی انداز سے بحث کرتے ہیں اور غیر جانبدارانہ طور سے کسی نتیجے پر پہنچتے ہیں، اسی وجہ سے نفس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے وہ خالص منطقی اور عقلی مباحث سے استدلال کرنے لگتے ہیں اور حکمت وفلسفہ کی اصطلاحوں سے کام لینے لگتے ہیں۔ آپ کی وہ تصانیف جن میں آپ نے ہندوؤں اور عیسائیوں کے اعتراضات کا جواب دیا ہے، آپ کی غیر جانبداری پر شاہد عدل ہیں، مسلمانوں کے مختلف فرقوں: اہل بدعت، اہل حدیث اور اہل تشیع کے خلاف آپ مناظرانہ ومخاصمانہ طرز بحث کے بجائے روادارانہ ومصالحانہ طرز گفتگو اپناتے ہیں، جن سے ان کے اس رجحان کا پتہ چلتا ہے کہ وہ ملی وحدت اور اجتماعیت کو ترجیح دیتے ہیں اور امت کے شیرازہ کو حتی الامکان منتشر ہونے سے بچانا چاہتے ہیں۔ وہیں دوسری طرف وہ ''ملی اتحاد'' کا نام نہاد نعرہ لگا کر اعتقادی مسائل کو نظر انداز نہیں کرتے۔ اس طرح ''حکمت قاسمیہ'' بے جا مناظرانہ اسلوب سے مبرّا ہونے کی بنا پر جہاں افراط سے محفوظ ہے وہیں اعتقادی مسائل کو مصالحانہ انداز میں بیان کرنے کی بنا پر تفریط سے بھی پاک ہے۔ حضرت نانوتویؒ کے سوانح نگار مولانا مناظر احسن گیلانی، امام نانوتویؒ کی کتاب ہدیۃ الشیعۃ کے بارے میں لکھتے ہیں: ''تصنیفی سلسلے میں تو، میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ سید الامام الکبیر کی کتابوں میں سب سے زیادہ ضخیم کتاب آپ کی وہی ہے جس میں انتہائی دل سوزیوں کے ساتھ شیعوں کی غلط فہمیوں کو مٹانے کی کوشش کی گئی ہے۔''

اہل بدعت کے خلاف بھی آپ ''نقطۂ اعتدال'' سے تجاوز نہیں کرتے بلکہ نہایت معتدل رویہ اپناتے ہوئے ہر نئی بات کو بدعت اور ہر بدعتی کو کافر ومشرک قرار دینے کو صحیح نہیں سمجھتے۔ آپ فرماتے ہیں: ''عقائد کے تغیر

وتبدل کو ہم رأس البدعات کہتے ہیں اور قواعد کلیہ کے تغیر وتبدل کو ہم بدعت کبری قرار دیتے ہیں، اعمال جزئیہ کی کمی بیشی کو ہم بدعت صغری کہتے ہیں، بالجملہ ہم تغیر وتبدل عقائد کو جیسے شیعہ، خوارج ومعتزلہ نے کیا ''رأس البدعات'' اور قواعد کلیہ کو مثل ایجاد تعزیہ وماتم داری کو بدعت کبریٰ اور کمی بیشی جزئیات کو بدعت صغریٰ کہتے ہیں''۔

حکمت قاسمیہ کا یہی ''فکری اعتدال'' ہے جس نے امام نانوتویؒ کو علمائے دیوبند کا نظریاتی قائد بنایا ہے۔ اس طرح آپ نے ''فکر ولی اللہی'' کے سرچشمۂ اعتدال سے فیض یابی کے بعد ''اعتدالِ نظر وفکر'' کے تسلسل میں جو کردار ادا کیا ہے وہ ہماری تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔

علامہ انور شاہ کشمیریؒ اور اعتدال

امام العصر محدث جلیل علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ بھی ''سلسلہ اعتدال'' کی ایک اہم کڑی ہیں۔ آپ کی وسعتِ فکر ونظر اور عمیق مطالعہ بے نظیر ہے۔ آپ نے حنفیت اور شافعیت سے اوپر اٹھ کر حدیث کو سمجھا ہے اور اسی طرز پر حدیث فہمی کی اپنے تلامذہ کو تلقین کی ہے۔ آپ کے تلامذہ نے بھی آپ کے اس وصف اعتدال کو پوری مضبوطی سے تھاما اور اس کی ترویج واشاعت کی۔ چنانچہ علامہ کشمیریؒ کے تلمیذ رشید حضرت مولانا مفتی محمد شفیع عثمانیؒ اپنے طلبہ سے فرمایا کرتے تھے کہ ''تم خود حنفی بن جاؤ اس میں کوئی حرج نہیں، لیکن حدیث نبوی کو حنفی مت بنایا کرو''۔

علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے ''فکر ولی اللّٰہی'' کے طرز پر حدیث فہمی کا ایسا معیار قائم کیا جو مسلکی تعصب اور فقہی جمود سے مکمل طور پر مبرّا ہے۔ آپ عملاً یقیناً حنفی تھے، لیکن فقہی بحثوں میں اگر دیگر ائمہ کے نقطۂ نظر کو مضبوط دیکھتے تو اس کا برملا اعتراف کرتے اور اس کو ترجیح دیتے۔ آپ کے نابغہ روزگار شاگرد علامہ یوسف بنوریؒ اپنے استاذ امام کشمیریؒ کے حدیث فہمی میں وصف اعتدال کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ ''ایسی نصوص کے بارے میں کہ جن سے فقہائے مذاہب اربعہ اپنے اپنے مذہب کے حق میں استدلال کرتے ہیں، علامہ کشمیریؒ کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی کہ شارع کی مراد اور ان نصوص کا مقصد واضح ہو جائے۔ آپ ان نصوص میں مناط کی تحقیق، تنقیح اور تخریج کرتے اور اس بات کی قطعاً پرواہ نہ کرتے کہ نص حنفی مذہب کے موافق ہے یا مخالف۔ آپ کا طرز عمل عام علما کے طرز عمل سے یکسر مختلف تھا جو اپنی تمام تر کوششیں نص کو اپنے مذہب کے موافق بنانے میں صرف کر دیتے ہیں اور دور کی تأویل کرنے سے بھی پرہیز نہیں کرتے''۔ گزشتہ چند صدیوں میں، فقہ وحدیث کے حوالے سے یہ جرأتمندانہ اعتدال یا تو شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنایا

ہے یا پھر حضرت الامام کشمیریؒ نے۔ انھی حضرات کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ مسلکی تعصب اور فقہی جمود کو ہماری صفوں میں راہ نہیں مل سکی ہے۔

علامہ کشمیریؒ کے ''اعتدال فکر ونظر'' کی واضح مثال آپ کا یہ موقف ہے کہ اگر امام ومقتدی کے فقہی مذاہب مختلف ہوں تو نماز مطلقاً جائز ہے۔ ایک مقام پر اس مسئلے کے سلسلے میں فرماتے ہیں: ''**وَالذي تحقّق عندي أنّهُ صحيح مطلقاً، سواء كان الإمام محتاطاً أم لا. وسواء شاهد منه تلك الأمور أم لا، فإني لا أجد من السلف أحداً، إذا دخل فِي المسجد أنه تفقد أحوال الإمام أو تسائل عنه، بيد أنهم كانوا يقتدون وينصرفون إلى بيوتهم بلاسؤال ولا جواب**''. (میرے نزدیک تحقیقی بات یہ ہے کہ ایسی اقتداء مطلقاً صحیح ہے خواہ امام محتاط ہو یا غیر محتاط۔ پھر خواہ مقتدی نے امام کو (مقتدی کے مذہب کے مطابق نواقض وضوء کا ارتکاب کرتے ہوئے) دیکھا ہو یا نہیں۔ اس لیے کہ میں نے سلف میں کسی کو اس کے بارے میں نہیں سنا کہ وہ مسجد میں داخل ہونے کے بعد امام کے احوال جانچتے ہوں یا اس کے بارے میں دوسروں سے دریافت کرتے ہوں، بلکہ وہ امام کے پیچھے نماز پڑھ کر اپنے گھروں کو لوٹ جاتے، نہ کوئی سوال ہوتا نہ کوئی جواب۔)

علامہ کشمیریؒ کی وسعت نظر اور آپ کے وصف اعتدال کا اس سے بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اگر کسی مسئلے میں امام ابوحنیفہؒ کی دو روایتیں ہوں یا مشائخ حنفیہ کے ایک سے زائد اقوال ہوں تو آپؒ اس قول کو اختیار کرتے جو صریح وصحیح حدیث کے مطابق ہو، البتہ اگر اس مسئلے کے تعلق سے کوئی ایسی حدیث نہ ملتی، تو احناف کے اس قول کو ترجیح دیتے جو دیگر فقہی مذاہب سے قریب ہوتا۔ اس تقریب بین المذاہب میں بھی امام شافعیؒ کی رائے مقدم ہوتی پھر امام مالکؒ کی۔

غرض یہ کہ علامہ کشمیریؒ نے حدیث وفقہ کے باب میں جو تجدیدی کارنامے انجام دیے ہیں وہ آپ کے ''اعتدال فکر ونظر'' کا پتہ دیتے ہیں۔ یقیناً آپ ہی کے جرأت مندانہ اعتدال کا نتیجہ ہے کہ ''فکر ولی اللّٰہی اپنی اسی آب وتاب کے ساتھ باقی رہی اور فقہی جمود اور مسلکی تعصب ہماری صفوں سے دور رہے۔

حضرت تھانویؒ اور اعتدال

حکیم الامت حضرت تھانویؒ ''علمائے دیوبند'' میں ایک ممتاز حیثیت کے حامل ہیں۔ جہاں وہ علوم ظاہرہ میں امامت کے درجہ پر فائز ہیں، وہیں علوم باطنہ میں وہ قدوہ ہیں، آپ ایک طرف بے شمار علمی وعملی

کمالات کے جامع اور فقہ وفتاویٰ میں آپ کی آراء حجت ہیں، وہیں دوسری طرف تصنیف وتالیف اور تحریر وتقریر کی راہ سے ہدایت خلق، ردّ بدعات، دفع شبہات اور ابطال رسوم کے سلسلے میں آپ کی خدمات بے نظیر ہیں۔ آپ نے اپنے محبین ومعتقدین کے درمیان، اپنے انفاس قدسیہ سے باطنی فیوض کا ایسا سلسلہ جاری فرمایا جو آنے والی نسلوں کے لیے منارۂ نور ہے، آپ نے اسلامی عقائد اور اعمال کو زمانہ کی تہ بہ تہ ظلمات کے گرد وغبار سے پاک وصاف کیا اور یوں آپ وقت کے عظیم مجدد کہلائے۔ حضرت تھانویؒ کا ''اعتدال فکر ونظر'' بے نظیر ہے، آپ نے ہر ہر مسئلے میں امت کو افراط وتفریط سے بچنے کی تلقین فرمائی۔ آپ کا سب سے اہم تجدیدی کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے مروجہ تصوّف کی اصلاح فرمائی اور غلو وتقصیر سے بچاتے ہوئے ایک ایسی ''معتدل طریقت'' کو رواج بخشا کہ جس کے سوتے وہیں سے پھوٹتے ہیں جہاں سے شریعت کے چشمے ابل رہے ہیں۔

تصوّف کے بے شمار مسائل میں آپ نے میانہ روی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ''معتدل حل'' پیش فرمایا، کہیں آپ نے تصوف میں رائج تعبیرات کو بدل کر مسئلے کی ایسی قابل قبول صورت پیش فرمائی کہ نام نہاد ''توحید پرستوں'' کے لیے بھی دل سوزی کی کوئی گنجائش نہیں رہی، تو کہیں مسائل تصوف کی ایسی دلنشیں تشریح کی کہ ظاہر پرست بھی اگر انصاف کا دامن تھام لیں تو انہیں بدعت کی بو بھی محسوس نہ ہو۔

حضرت تھانویؒ نے مسئلہ وحدۃ الوجود کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے بنیادی طور پر ایک اہم بات کی طرف توجہ دلائی ہے۔ آپ تحریر فرماتے ہیں کہ: ''سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ مسئلہ چوں کہ بہرحال قطعیات میں نہیں، بلکہ کیفیت ثبوت الوجود للحوادث کے اعتبار سے سب کے نزدیک ظنی ہے، اس لیے بطلان مسئلے کا حکم جزئی یا ضلالِ اصحاب مسئلہ کا حکم قطعی یہ تو یقیناً غلو اور معاداۃ اولیاء ہوگا، جس میں '' **إيذان بحرب الله**'' کی وعید وارد ہے، اور فریقین کے محتاطین اس مسئلے پر عامل ہیں کہ ''**أبهموا ما أبهم الله**'' یعنی جس چیز میں اللہ تعالیٰ نے ابہام رکھا اس میں تم بھی ابہام ہی رہنے دو۔''

مسئلہ وحدت الوجود کے بارے میں حضرت حکیم الامت کے نقطۂ اعتدال کو واضح کرتے ہوئے، مولانا عبدالباری ندویؒ تحریر فرماتے ہیں کہ: حضرت تھانویؒ کا اس مسئلے میں اصل تجدیدی مسلک یہ ہے کہ نہ اس کا جزم وقطعیت کے ساتھ انکار ہو، نہ اثبات، دونوں کو احتمال کے درجے میں رکھا جائے۔ لیکن انتہا پسندوں نے جہاں ایک طرف اس کا قطعی انکار اور اس کے قائلین کی تکفیر وتضلیل تک میں تأمل نہیں کیا، وہاں دوسری طرف اپنوں اور پرایوں دونوں میں بہتوں نے بڑی غلطی یہ دکھائی کہ اس کو تصوف کا جزو لاینفک سمجھ لیا۔

حضرت تھانویؒ ہی کا یہ تجدیدی کارنامہ ہے آج تصوف محض رسوم ورواج کا نام نہیں ہے، بلکہ درجۂ ''احسان'' تک پہنچنے کا ایک ذریعہ ہے۔ آپ ہی کے ''اعتدال فکر ونظر'' کے نتیجے میں ایسے ایسے عقلیت پسند مرتبۂ احسان پر فائز ہوئے ہیں، کہ جن کو اعتدال کے علاوہ کوئی دوسری چیز متأثر نہیں کرسکتی تھی۔

حکیم الاسلام اور اعتدال

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اس عالم وجود میں آنے کے ساتھ ہی تسلسل اعتدال کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔ آپ جہاں علوم ظاہری وباطنی کے جامع تھے، وہیں ''فکر ولی اللّٰہی'' اور ''حکمت قاسمیہ'' کے امین بھی تھے، ایک طرف آپ علوم شریعت میں محدّث عصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے نابغۂ روزگار شاگرد تھے، تو دوسری طرف راہِ طریقت میں مجدد عصر حضرت تھانویؒ کے خلیفۂ مجاز۔ قرآن وسنت سے ابلنے والے چشموں نے ''فکر ولی اللّٰہی'' اور ''حکمت قاسمیہ'' کی آمیزش کے ساتھ جب اس شخصیت کو سیراب کیا، تو جامعیت واعتدال کا ایسا نمونہ امت کے سامنے آیا، جو آیت قرآنی ''**وكذلك جعلناكم أمّة وسطاً لتكونوا شهداء على الناس**'' کی عملی تفسیر تھا، بلکہ اس عظیم شخصیت نے اپنی تحریر وتقریر کو، اپنی زبان وقلم کو، اپنے ذہن وفکر کو، غرض یہ کہ اپنی پوری زندگی کو اس آیت کی تفسیر کے لیے وقف کردیا۔ یہ آپ ہی کی ذات گرامی کا حق تھا کہ آپ جامعیت واعتدال سے اس طرح پردہ کشائی کریں کہ ''مسلک دیوبند'' اپنے تمام اصول وفروع سمیت ایک جامع اور معتدل ''مکتب فکر'' بن کر سامنے آئے۔ یہ آپ ہی کا طرّہ امتیاز تھا کہ آپ نے علمائے دیوبند کے دینی رخ اور ان کے مسلکی مزاج کو اس اعتدال وجامعیت کے ساتھ بیان فرمایا کہ امت کو اس بات کا یقین ہوگیا کہ دیوبندی مکتب فکر ''**ما أنا عليه وأصحابي**'' کا حسین پرتو ہے۔ حکمت سے لبریز آپ کے خطبات کو سننے اور پڑھنے والے اس بات کی گواہی دے سکتے ہیں کہ آپ جب قرآن وسنت پر گفتگو فرماتے تو اپنے استاذ علامہ کشمیریؒ کا عکس نظر آتے، اسرار شریعت پر بولتے تو ایسا لگتا کہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی روح گویا ہے۔ حضرت نانوتویؒ کے علوم ومعارف کے تو آپ وارث وامین تھے، جب کہ حضرت تھانویؒ کے تزکیہ وتربیت نے آپ کو سلوک واحسان کے بلند مرتبے پر فائز کردیا تھا۔ آپ کی شخصیت سازی میں یہ عناصر اربعہ برابر کے شریک تھے، اور انھی عناصر اربعہ کے امتزاج نے آپ کے مزاج میں اعتدال وجامعیت پیدا کردی اور افراط وتفریط سے گویا آپ کو طبعی طور پر نفرت ہوگئی۔ غلو وتقصیر سے اظہار بیزاری کرتے ہوئے آپ تحریر فرماتے ہیں کہ: افراط

وتفریط محض جہالت کے شعبے ہیں، درحالیکہ دین ومذہب علم الٰہی کے چشمۂ صافی سے نکلا ہوا علم حقیقی کا شعبہ ہے نہ کہ جہالت کا، بلکہ علم وادراک کی بھی اصل ہے۔ادھر یہ افراطی اور تفریطی ،غلو اور مبالغہ ظلم وسفاہت کا شعبہ ہے نہ کہ علم وعقل کا۔اور کون نہیں جانتا کہ مذہب کی بنیاد عیاذ اباللہ ظلم وجہل نہیں بلکہ علم وعدل ہے، افراط وتفریط نہیں بلکہ اعتدال وقسط ہے۔

''علمائے دیوبند کا دینی رخ اور مسلکی مزاج'' حضرت حکیم الاسلامؒ کی ایک ایسی معرکۃ الآراء تصنیف ہے جس میں انھوں نے بہ ظاہر ''دیوبندی'' مکتب فکر کے بنیادی اصولوں سے پردہ کشائی کی ہے، لیکن درحقیقت پوری کتاب حکیم الاسلامؒ کے ''اعتدال فکر ونظر'' پر شاہد عدل ہے۔ ہر ہر باب میں آپ نے علمائے دیوبند کے جامع اور معتدل مسلک کو جس انداز سے بیان کیا ہے وہ آپ ہی کی ذات کا حق تھا کہ جس میں ''اعتدال'' رچ بس چکا تھا۔

تعارف اہل سنت

حضرت حکیم الاسلامؒ جامعیت اور اعتدال کی روشنی میں ''اہل سنت والجماعت'' کا تعارف کراتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ: ''اب اگر ضمیر کی صداقت سے نظر ڈالی جائے تو کتاب ومعلّم کتاب میں سے کسی ایک سے انقطاع اور دوسرے سے غالبانہ جوڑ، اور یہود ونصاریٰ کی افراط وتفریط سے بچ کر اگر کوئی طبقہ ان دونوں عنصروں سے پوری عقیدت وعظمت اور کمال اعتدال کے ساتھ پیروی کا تعلق قائم کیے ہوئے ہے تو وہ صرف اہل سنت والجماعت کا طبقہ ہے، جو نہ کتاب اللہ کو معلمین کتاب اور مربیان نقوش کی تعلیم وتربیت کے بغیر سمجھنے کی بلا میں گرفتار ہے کہ خدائی قانون کو اپنی رایوں اور نظریات کا کھلونا بنالے اور نہ مربیوں کی غلو زدہ عقیدت و محبت کا شکار ہے کہ ان کے ہر شخصی حال وقال اور کردار وگفتار کو قانون کی حیثیت دیتا ہو۔''

آج کل سلف کی پیروی کا دعویٰ کرنے والے کچھ نام نہاد متسلفوں نے تصوف اور احسان وسلوک کو شجرۂ ممنوعہ سمجھ لیا ہے، وہ تزکیۂ نفس کے اس طریقے کو بدعت بلکہ شرک کہنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔اولیاء اللہ کی توہین کے باوجود بھی ان کے دعوائے سلفیت میں کمی نہیں آتی، وہیں دوسری طرف ایسے غالی محبین ومعتقدین بھی ہیں جو قرآن وسنت کو بالائے طاق رکھ کر اکابر صوفیاء کے احوال واقوال سے حجت پکڑتے ہیں اور ان کی اس درجہ تعظیم وتوقیر کرتے ہیں کہ عیاذ اباللہ گویا وہی مشکل کشا اور دست گیر ہوں۔حکیم الاسلامؒ نے اپنے فکری اعتدال کی راہ نمائی میں اس سلسلے میں بھی ''علمائے دیوبند'' کے مسلکی مزاج کو بیان فرمایا، آپ تحریر فرماتے

ہیں کہ: علمائے دیوبند نے یہ راہِ اعتدال اختیار کی کہ نہ تو اس فنِّ احسان (تصوف) سے قطع نظر کر لینا ہی جائز سمجھتے ہیں کہ اسے دماغوں کو ماؤف کر دینے والا افیون سمجھ لیں اور نہ ان باطنی احوال کو اسٹیج کی رونق بناتے ہیں کہ اس کے ذریعے اپنی درویشی یا عرفان پناہی کی نمایش کریں۔ بلکہ شریعت ہی کا ایک باطنی حصہ سمجھ کر باطنی ہی انداز سے باطن کی اصلاح کے لیے صرف کرنا ضروری سمجھتے ہیں اور ساتھ ہی ان اہل باطن اہل اللہ کی حد درجہ عزت وعظمت دلوں میں لیے ہوئے ہیں۔ البتہ متصوّفہ اور بناوٹی صوفیوں کو نا قابل التفات سمجھتے ہیں جن کے یہاں تصوف کے معنی گیروے کپڑوں یا چند بندھی جڑی رسموں کی نقالی یا نمائشی اچھل کود کے سوا کوئی باطنی کیفیت یا وجد کا نشان نہ ہو''الا ماشاءاللہ''۔

غیر مقلدیت نے گذشتہ چند سالوں سے جس طرح سلفیت کا لبادہ اوڑھ کر امت کا رشتہ اسلاف سے منقطع کرنے کی کوشش کی ہے، وہ ''اعتدال فکر ونظر'' رکھنے والے علماء کو سنجیدگی سے غور کرنے پر مجبور کرتی ہے کہ وہ امت کے سامنے اجتہاد وتقلید کے سلسلے میں صحیح موقف اس انداز سے بیان کریں کہ نہ امت افتراق وانتشار کا شکار ہو اور نہ ہی اس کا رشتہ ائمہٴ دین اور علمائے راسخین سے منقطع ہو۔ حضرت حکیم الاسلامؒ نے اس سلسلے میں بھی اپنے فکری اعتدال کی روشنی میں علمائے دیوبند کے موقف کو واضح فرمایا ہے اور ان پر لگائے جانے والے ''کورانہ تقلید'' کے الزام کا مسکت جواب دیا ہے۔ آپ تحریر فرماتے ہیں کہ: پس وہ بلا شبہ مقلد اور فقہ معین کے پابند ہیں مگر اس تقلید میں بھی محقق ہیں جامد نہیں۔ تقلید ضرور ہے مگر کورانہ نہیں۔ لیکن اس شان تحقیق کے باوجود بھی وہ اور ان کی پوری علمی ذریت اپنے کو اجتہاد مطلق کا اہل نہیں سمجھتی۔ البتہ فقہ معین کے دائرہ میں رہ کر مسائل کی ترجیح اور ایک ہی دائرہ کی متماثل یا متخالف جزئیات میں سے حسب موقع ومحل اور حسب تقاضائے ظروفِ زمان ومکان، کسی خاص جزئی کے اخذ وترک یا ترجیح وانتخاب کی حد تک وہ اجتہاد کو منقطع بھی نہیں سمجھتے۔ اس لیے ان کا مسلک کورانہ تقلید اور اجتہاد مطلق کے درمیان ہے۔''

عقل ونقل

حضرت حکیم الاسلامؒ کی حیات کا ایک روشن پہلو ''مسائل کی عقلی تفہیم'' ہے، یہ ملکہ آپ کو اپنے جد امجد حضرت نانوتویؒ کی ''حکمت قاسمیہ'' سے ورثے میں ملا ہے۔ آپ نے جس انداز سے حضرت نانوتویؒ کے علوم ومعارف کی ترجمانی کی، اسرار شریعت سے پردہ کشائی کی اور مسائل کی عقلی تشریح کی وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ لیکن یہاں بھی آپ نے فکری اعتدال کو جانے نہیں دیا۔ افراط وتفریط سے بچتے ہوئے آپ نے

مضامین شریعت کی عقلی وجوہات بھی بیان کیں اور عقلی استدلال سے بھی کام لیا۔ لیکن نقل کو عقل کی میزان میں تولنے کی سخت مخالفت کی۔ آپ نے عقل کو نقل کی صحّت کا معیار نہیں بنایا، بلکہ اس طریقۂ کار کو اختلاف امت اور گمراہی کا سبب قرار دیا۔ آپ تحریر فرماتے ہیں کہ: ''خوارج نے عقائد کا استفادہ نقل صحیح کے بجائے عقل سلیم سے کرنا شروع کر دیا اور وحی خداوندی کو اپنی عقلوں کے تابع بنالیا حتی کہ متشابہات تک میں بھی عقلی گھوڑے دوڑائے اور ان کے من مانے معنی خود سے متعین کیے، جس سے بلحاظ عقائد ان کے نقش قدم پر بعد کے آنے والوں میں بھی عقل خام کی امامت میں کتنے ہی فرقے ابھر گئے، جو متضاد قسم کے عقائد وافکار کے دلدل میں پھنسے اور پھنس کر رہ گئے۔''

حضرت حکیم الاسلامؒ نے جہاں دیگر بے شمار مسائل میں نقطۂ اعتدال واضح کیا ہے، وہیں ''تشریح دین'' کے حوالے سے عقل ونقل کے درمیان بھی وصف اعتدال کو ملحوظ رکھا۔ آپ نے اہل حق کا تعارف کراتے ہوے ایک موقع پر تقریر میں فرمایا کہ: ''اگر آپ عقل سے یہ چاہیں کہ غیب کی چیزیں معلوم کروں تو عقل کی دوڑ صرف محسوسات تک ہے۔ وہ مغیبات تک نہیں پہنچ سکتی، وہ علم کی موجد وایجاد کنندہ نہیں ہے، وہ دریافت کنندہ ہے کہ علم سامنے آئے تو اس سے کچھ اصول نکال لے، کچھ جزئیات سامنے آئیں تو کلیات نکال لے، لیکن خود اصول وجزئیات بنالے یا واقعہ بنا دے، تو عقل موجد نہیں جو واقعات ایجاد کرے پیدا شدہ واقعات میں غور کر سکتی ہے۔''

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ''سائنس اور اسلام'' کے موضوع پر ہوئی آپ کی تقریر، اسلام کی حقیقت، اس کی غرض وغایت، مادّیت پرستی اور عقلیت پسندی جیسے موضوعات پر ایک عظیم دستاویز ہے۔ آپ نے سائنس (کہ جس کی بنیاد مادیت اور عقلیت ہے) اور اسلام کے درمیان نسبت کو اس تقریر کا موضوع بنایا اور موضوع کا حق ادا کر دیا۔ آپ فرماتے ہیں کہ: اس سے سائنس اور اسلام کی باہمی نسبت بھی واضح ہوگئی کہ ان میں وسیلہ ومقصود کی نسبت ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ جب تک سائنس کے کارنامے مذہب کے لیے خادم اور ذریعۂ تحصیل نہ بنیں گے، ان کا انجام خوش کن نہ ہوگا اور اسی کے ساتھ بطور ثمرہ یہ مقصود بھی حل ہوگیا کہ جب اسلام مقصود ہے اور سائنس اس کا وسیلہ تو اسلام کی مقصودیت کا تقاضہ یہ ہے کہ ترقی کا میدان اسلام کو بنایا جائے نہ کہ سائنس کو کہ ترقی ہمیشہ مقاصد میں کی جاتی ہے نہ کہ ذرائع وسائل میں۔ یعنی سائنس کے معمولات اس حد تک اختیار کیے جائیں، جس حد تک اسلام کو ان کی ضرورت ہے۔''

بریلویت اور حضرت حکیم الاسلامؒ

علمائے دیوبند اور علمائے بریلی کے درمیان اختلافات نے عوام الناس کو دو فرقوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ردّ و نکیر اور جواب و جواب الجواب نے اس دوری کو مزید بڑھا دیا۔ مناظروں اور مباحثوں نے اس اختلاف میں شدت پیدا کر دی۔ اس سے قطع نظر کہ کون حق پر ہے اور کون باطل پر، دونوں ہی طرف کے علماء کی جانب سے اختلاف امت کو اتحاد میں بدلنے کے لیے سنجیدہ کوششیں نہیں ہوئیں۔ اس بات پر شاید ہی کبھی غور ہوا ہو کہ یہ اختلافات حقیقی ہیں یا غلط فہمیوں کا نتیجہ۔ لیکن حضرت حکیم الاسلامؒ نے اس نازک اور حسّاس مسئلے میں بھی نقطۂ اعتدال کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ آپ نے اختلافات کو غلط فہمیوں سے تعبیر کر کے پورے قضیے کی روح ہی نکال دی، پھر جس خوش اسلوبی، عمدہ بیانی اور مصالحانہ انداز سے ان غلط فہمیوں کا ازالہ فرمایا ہے وہ ''راہِ اعتدال'' میں آپ کی کوششوں پر شاہد عدل ہے۔ آپ کی مندرجہ ذیل عبارت ہمیں یہ پیغام دیتی ہے کہ مناظروں اور مجادلوں سے بچتے ہوئے اتحاد و اتفاق کی خاطر کی جانے والی تمام کوششوں میں علمائے دیوبند اپنے موروثی ''فکری اعتدال'' کے ساتھ حصہ دار ہوں اور اختلاف کی اس لعنت سے امت کو نجات دلائیں۔ آپ تحریر فرماتے ہیں کہ:

''ہر جماعت میں کچھ نہ کچھ خوبیاں بھی ہوتی ہیں اور کم و بیش مخلصین بھی ہوتے ہیں لیکن افتراق کی نحوست سے ہر ایک کی خوبی سے دوسرا محروم ہے ساتھ ہی اس بناء پر بھی ہے کہ بریلوی ہوں یا دیوبندی تمام بنیادی باتوں، اقرارِ توحید، عظمتِ نبوت، عظمتِ صحابہؓ، حنفیت، طریقت، سلاسل طریقت، اولیاء اللہ سے انسلاک، سلسلۂ بیعت وارشاد، عقیدت و محبتِ اہل اللہ وغیرہ میں اشتراک کے باوجود اس قسم کے مزعومہ، بلکہ بتکلف آوردہ جزئیات کے ذریعہ افتراق بلکہ عناد آمیز فرقت اور بکرّات و مرّات اس کا احیاء و تجدید جہاں پوری قوم کا ضعف اور آزار ہے وہیں وہ اعداء اللہ اور اعداءِ دین کے لیے سببِ تضحیک و استہزاء بھی بنا ہوا ہے جس سے پوری قوم کے وقار اور عزت پر اثر پڑ رہا ہے۔

آج عوامی مناظروں کے چیلنج تو دیئے جاتے ہیں اور دوسرے لفظوں میں عوام کو خواص پر مسلط تو کیا جا رہا ہے جس سے عوامی سطح پر فتنہ ابھرتا اور نکھرتا جا رہا ہے، اور نتیجہ میں عوام دین سے بیزار ہی ہوتے چلے جا رہے ہیں جنہیں اہلِ وطن کے خلاف اشتعال دلا کر اکسا دیا جاتا ہے، لیکن یہ نہیں ہوتا جو ہونا چاہیے تھا کہ قوم کی مجموعی عزت و آبرو کی خاطر چند سنجیدہ علماء ان لوگوں کو بلائیں جن پر انہیں اعتراضات ہیں اور خود انہیں

سے پوچھیں کہ وہ کس حد تک ان سے الگ ہیں اور کس حد تک شریک عقیدہ وعمل ہیں۔ مشترک حصے کو ''اساس'' قرار دے کر بقیہ کے لیے اگر اس میں کسی حجت کے سبب توافق نہ ہو سکے حدود متعین کی جائیں جس سے کم سے کم منافرتِ باہمی اور تعصّبات کی آگ دھیمی پڑ جائے اور عوامی سطح کی اشتعال انگیزیاں کسی حد تک اعتدال پر آجائیں اور ایک دوسرے سے قریب ہو کر کسی باحجت گفت وشنید کا راستہ پڑ جائے۔''

اعتدال کی ضرورت

حضرت حکیم الاسلامؒ نے پوری زندگی اپنی تقریر وتحریر کے ذریعہ جس فکری اعتدال کی تعلیم دی ہے، آج اس کے تجدید واحیاء کی ضرورت ہے۔ اختلاف وانتشار کے اس دور میں آج امت مسلمہ کئی کئی پرسنل لاؤں، جمعیتوں، مشاورتوں اور تنظیموں میں تقسیم ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم یہ کوشش کریں کہ اگر ہمارا کسی جماعت کے ساتھ فروعی مسائل میں اختلاف ہے تو اس کو دور کیا جائے، ہم جو ایک ہی مکتب فکر سے وابستہ ہیں، ایک ہی جماعت کی طرف اپنا انتساب کرتے ہیں، حدیث وفقہ کے باب میں ایک ہی سند سے روایت کرتے ہیں اور ایک ہی درسگاہ یا اس کے زیر سایہ پروان چڑھے دیگر اداروں کے فیض یافتہ ہیں، افراط وتفریط کا شکار ہیں اور اختلاف وانتشار ہماری صفوں میں سرایت کر چکا ہے۔ آج سرزمین دیوبند نے جو کبھی ہماری وحدت کی علم برداری تھی ہمیں اس شخصیت کو یاد کرنے کی دعوت دی ہے جس نے اس اتحاد کو جلا بخشی تھی، جو اس اتحاد ہی کی خاطر قربان ہوا تھا اور جس نے اپنے فکری اعتدال کی بدولت ''جماعت دیوبند'' کو افراط وتفریط سے محفوظ رکھا۔ آج اس عظیم شخصیت کے احسان کا تھوڑا سا بدلہ صرف اسی صورت میں ادا ہو سکتا ہے کہ وہ ''اعتدال فکر ونظر'' جو قرآن وسنت سے نکل کر اسلاف امت سے ہوتا ہوا، ''فکر ولی اللہی'' کی تعبیر، ''حکمت قاسمیہ'' کی تشریح، ''علوم انوریہ'' کی تفہیم اور ''طریقت تھانویہ'' کے تزکیہ وتربیت کے اضافے کے بعد حضرت حکیم الاسلامؒ کی زبانی ہم تک پہنچا ہے، اس کا احیاء وتجدید ہو اور ہم اپنے تمام مسائل اسی ''فکری اعتدال'' کی روشنی میں طے کریں۔

وآخر دعوانا أن الحمد للّٰہ رب العٰلمین

............❖............

حضرت حکیم الاسلامؒ
مقاماتِ مقدسہ کی عظمت کا حدی خواں

مولانا مفتی محمد نوشاد نوری قاسمی
استاذ دارالعلوم وقف دیوبند

اسلامیانِ ہند کا وہ کون سا باشعور انسان ہوگا جو حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمی رحمہ اللہ (۱۸۹۷ء۔۱۹۸۳ء) کی دل آویز شخصیت اور روشن کارناموں سے ناواقف ہوگا، خاندانی شرافت اور ذاتی عظمتوں کا ایک کارواں ان کے ہم رکاب تھا، وہ بے مثال خطیب، جدت طراز مصنف، دارالعلوم دیوبند کے عظیم معمار، اہل سنت والجماعت کے افکار ونظریات کے عالمی نمائندہ، علم وادب کا بحر بیکراں اور شرافت وخوش اخلاقی کا باغ وبہار تھے۔

ان سب کے ساتھ وہ ایک صاحب دل انسان تھے، اہل دل نے ان کی مثالی تربیت کی تھی، ایسا دل جو اسلام کی عظمت اور مسلمانوں کی اصلاح کے جذبے سے معمور تھا، ان کی ہر تقریر اور ہر تحریر میں ان کے دل کا درد، ان کے باطن کی تڑپ اور ان کے پاکیزہ جذبات کا تموج موجود ہے۔

پچھلی صدی میں عالم اسلام نے اتنے انقلابات دیکھے کہ ان کا تصور بھی روح فرسا ہے، خلافت کا خاتمہ، استعمار کے شکنجے، بلاد اسلامیہ کی خانہ جنگیاں، مقامات مقدسہ کی بے حرمتی، عالم عربی کے قلب میں اسرائیل کا وجود، پھر ظلم وزیادتی کی نہ ختم ہونے والی داستان، نئے نئے ملحدانہ خیالات اور فلسفے، قومیت ووطنیت کا عفریت، کمیونزم، کیپٹلزم اور سوشلزم کے بلند بانگ نعرے؛ ایسے سنگین اور دلدوز واقعات تھے، جن سے کون سا مسلمان ہے جو بے چین نہیں ہوا، کون سی آنکھ ہے جو نم نہیں ہوئی، یہ واقعات فسانۂ عبرت

بن گئیے، لکھنے والوں نے لکھا، شعراء نے نظمیں کہیں، عوام نے احتجاجات کیے اور حکام قراردادوں سے آگے نہیں بڑھ سکے۔

عالم اسلام اور فلسطین اہل قلم کا پسندیدہ موضوع بن گیا، ہزاروں کتابیں مختلف زبانوں میں وجود میں آئیں، لاکھوں صفحات سیاہ کیے گئے، کچھ نے حالات وواقعات بیان کیے، کچھ نے تجزیاتی مطالعہ کیا، کچھ نے اسباب وعلل کی دریافت کی۔

ہندوستانی مسلمان شروع سے مقامات مقدسہ اور بلاد اسلامیہ کے تعلق سے حساس رہے ہیں، یہاں کے مفکرین، علماء اور دانشوران، شعراء اور اہل قلم نے مقامات مقدسہ کی عظمت وحرمت اور حفاظت و پاسداری کی ضرورت پر بہت ہی قیمتی تحریریں لکھیں اور ان کی ایک طویل تاریخ ہے۔

عالم عربی اور عالم اسلام کے حالات وواقعات پر حضرت حکیم الاسلامؒ کی نظر بڑی گہری تھی اور فطری طور پر ان حالات کا اثر ان کے دل ودماغ پر تھا، وہ ایک مدبر، مفکر اور دوررس انسان تھے، کسی بھی موضوع پر لکھتے اور بولتے وقت ان کا ذہن ان گوشوں کی طرف منتقل ہوتا، جو عام اہل علم وقلم کے نظروں سے اوجھل ہوتے۔

عالم اسلام اور مقامات مقدسہ حضرت حکیم الاسلامؒ کا بھی پسندیدہ موضوع تھا، تحریک خلافت وغیرہ کے موقع پر ان موضوعات پر شب وروز ان کی تقریریں ہوتیں، حج کے موقع پر حضرت کی تقریریں مقامات مقدسہ اور بلاد حرمین کی عظمت سے معمور ہوتیں؛ مگر ۱۹۶۴ء میں جب مؤتمر العالم الاسلامی میں شرکت کی غرض سے ان کا سفرِ مصر ہوا، پھر وہاں سے اردن، وادیٔ سینا، فلسطین اور بلاد شام سے گزر کر وہ حجاز پہونچے تو ایک خاص کیفیت دل پر طاری ہوئی، انہوں نے محسوس کیا کہ وہ بلاد عربیہ جن سے ملت اسلامیہ کا مستقبل اور ملی وجود وابستہ ہے، وہ مختلف اسلام مخالف تحریکوں کی آماجگاہ بن چکے ہیں، اسلام سے ان کا رشتہ کاٹ دینے کی بڑی منظّم سازشیں چل رہیں، انہیں قومیت کے نشے میں مست کر دیا گیا ہے، اسلامی وحدت کا خیال بھی ان کے ذہن ودماغ سے نکلتا جا رہا ہے، فکر ومزاج میں حد درجہ بے اعتدالی، اخلاق وکردار میں انتہائی بے راہ روی اور مشکل حالات میں بھی لہو ولعب اور عیش وطرب کی گرم بازاری جاری ہے، اس کا مطلب یہ کہ ان مقامات مقدسہ کے باشندگان ان مقامات کی شرعی اہمیت سے غافل ہیں اور یہ غفلت نہ صرف ان کے لیے؛ بلکہ پوری ملت اسلامیہ کے لیے سوہان روح ہے، اسی سفر کے دوران حضرتؒ کے ذہن ودماغ میں مقامات مقدسہ کی ایک منطقی ترتیب پیدا ہوئی اور وہ اس کے تانے بانے جوڑنے میں لگ گئے، تقریبا چھ سال کی محنت کے بعد، مقامات مقدسہ کی عظمت، ان کے باہمی رشتے اور حقیقی کردار کو بہت ہی واضح شکل میں مرتب کیا،

حضرت کی کتاب مقامات مقدسہ ان ہی خیالات کا مجموعہ ہے، جو حضرت کی سب سے آخری اور مفصل کتاب ہے جو سات سو ساٹھ پر مشتمل ہے۔

حضرت کا زاویہ نظر یہ تھا کہ ''یوں تو اسلامی نقطہ نظر سے جو مقام بھی کسی دینی علم وعمل یا اسلامی اخلاق وکمالات کا مرکز اور قرار گاہ بن جائے مقام مقدس کہلانے کا مستحق ہے'' (مقامات مقدسہ، ص ۱۱)؛ لیکن ان مقامات کا تقدس دراصل دوسرے مقامات کا فیضان ہے، اصل مقامات مقدسہ وہی مقامات ہیں جن میں تقدس کی لہریں براہ راست موج زن ہیں، اور ''وہ تین مقامات ہیں: ایک انجیر وزیتون سے گھرا ہوا شہر قدس شریف جو شام میں ہے، دوسرا صحرائے سینا کے دامن میں آیا ہوا پہاڑ طور سینین جو مصر میں واقع ہے اور تیسرا امن وامانت سے ڈھکا ہوا شہر مکہ مکرمہ جو حجاز میں ہے''۔(۱)

ان تینوں مقامات کی تقدیس کو متعین کرنے کے بعد حضرت نے ان کی شان مرکزیت اور ان کے باہمی رابطے کا نقشہ کھینچا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام عالمی اور آخری دین ہے، اب قیامت تک اسی دین اسلام کی جلوہ نمائی کا دور ہے اور کسی بھی دین اور ملت کا دوام تین بنیادی عناصر پر موقوف ہے، نمبر۱: عبادت ودیانت، نمبر۲: سیاست ونظام اجتماعیت، نمبر۳: عسکریت اور فوجی قوت۔

حضرت حکیم الاسلامؒ کے الفاظ میں ان عناصر کی مختصر سی وضاحت یہ ہے: ''اندریں صورت اسلام کے جامع نظام کی تشکیل قرآنی تصریحات کی روشنی میں اس طرح ہوجاتی ہے کہ انسانی سعادت کے لیے تو دیانت وعبادت ضروری تھی، ورنہ آدمی میں آدمیت اور اخلاقِ انسانیت ہی جاگزیں نہ ہوسکتے کہ وہ آدمی کہلاتا، پھر دین وعبادت کے قلوب میں جڑ پکڑنے اور دنیا میں اس کے پھیلنے اور بے روک ٹوک آگے بڑھنے کے لیے امن ضروری تھا، جس کا واحد ذریعہ ملک واقتدار اور دینی شوکت ہے، ورنہ دین کے بے کس اور بے یارومددگار رہ جانے سے خود غرضانِ جاہ ومال کو اس کے نوک وپلک کترنے اور اپنی ہوائے نفس کے مطابق کاٹنے، تراشنے اور فتنے پھیلانے کے مواقع ملتے رہتے، جس سے دین کی اصلی شکل وصورت ہی باقی نہ رہتی کہ اسے قوت یقین کے ساتھ پیش کیا جاسکتا، پھر اس دینی ملک کی سرحدات کی حفاظت کے لیے عسکریت اور ایک مضبوط ترین مرکزی چھاؤنی بھی ضروری تھی؛ ورنہ ملک پر جس غنیم کا جس وقت بھی جی چاہتا چڑھ دوڑتا اور حملہ آور ہوکر اس کے سارے نظام دیانت وسیاست کو پامال کرسکتا تھا، اس لیے فطری تقاضوں کے مطابق ایک عالمگیر اور جامع دین کے لیے جو پورے عالم بشریت کی بہبود وفلاح کے لیے دنیا میں لایا گیا ہو، یہ تین عناصر (دیانت، سیاست، عسکریت) ضروری اور ناگزیر تھے، جو اس کی زندگی کے بنیادی عناصر

کہے جاسکتے ہیں، جن میں اصل اصول دیانت ہے، اس کا وسیلہ سیاست ہے اور اس کا محافظ اور مدافع عسکریت ہے، اس لیے عسکریت تیسرے درجہ کا عنصر ٹھہرتا ہے؛ مگر ناگزیر اور ضروری ہے''۔(۲)

ان تینوں عناصر کی تعیین کے بعد، حضرتؒ نے دلائل کی روشنی میں ثابت کیا کہ اللہ تعالیٰ نے تینون عناصر کے لیے الگ الگ تین مراکز بنائے ہیں، مکہ مکرمہ کو مرکز دین وعبادت، قدس شریف کو مرکز سیاست وشوکت اور طور سینا (بلادِ مصر) کو مرکز تحفظ وعسکریت قرار دیا ہے اور تینوں کو باہم مربوط کر کے ایک ہی نظام خلافت کے زیر اثر قائم رکھا، اس طرح اسلام کا دینی تفوق اور دنیوی جلال وشوکت ان تینوں عناصر اور ان کے تین عالمی مراکز اور ان کے باہمی روابط اور ہم آہنگی سے مربوط ہوگئے، لہٰذا جب جب یہ مراکز کمزور ہوں گے اور ان کا اتحاد خطرے میں پڑے گا، ملت اسلامیہ کمزور ہوگی اور وہ اپنے حقیقی کردار سے بے دخل کر دی جائے گی۔

حضرت نے کیا خوب لکھا کہ ''بہرحال حجاز، شام اور مصر اسلام کے تینوں بنیادی مراکز مسلمانوں کے ہیں، جن سے پورے عالم اسلامی کی سہ نوعی حفاظت اور ترقی وابستہ ہے، یعنی عبادت، سیاست اور حفاظت کے تینوں پہلو انہی تین مراکز سے تعلق رکھتے ہیں، اس لیے ان کا مسلمانوں کے قبضہ میں بلحاظ تحفظ مذہب بھی رہنا ضروری ہے اور وہی اس کے مستحق بھی ہیں، جن پر کسی غیر کا قبضہ یا دخل کا اصولاً کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا''۔(۳)

مزید لکھتے ہیں: ''انہی تین مقدس ملکوں کے اتحاد سے عربی اتحاد اور عربی اتحاد سے پھر اسلامی اتحاد وابستہ ہے؛ کیوں کہ عرب اور عالم اسلام کا اتحاد صرف اسلام سے ممکن ہے اور اسلام کی شیرازہ بندی اس کے ان تین مراکز اور شعائر سے وابستہ ہے، اس لیے ان تینوں مراکز کے سربراہوں اور زعیموں پر یہ بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنی مخصوص سیاسی اغراض سے بالاتر ہو کر ان تینوں ممالک اور ان کے طبعی اتحاد کو صحیح معنی میں عالمی اتحاد کا وسیلہ ثابت کریں، جس کے تحت ان کی معقول سیاسی اغراض بھی فوت نہیں ہوسکتیں۔ یہ تینوں مقامات چوں کہ کلیدی ہیں، اس لیے یہ مسئلہ صاف ہے کہ وہ جس کے قبضے میں بھی ہوں گے، اس کے اثرات مشرق ومغرب میں پھیل جائیں گے، اگر مشرق کے ہاتھ میں ہوں گے، تو مغرب ان سے متاثر ہوگا اور اگر مغرب کے ہاتھ میں رہیں گے تو تو مشرق متاثر ہوگا، بالفاظ دیگر اگر وہ صحیح معنوں میں اسی نوع کی مرکزی قوت کے ساتھ جو ان کے لیے قدرت نے رکھی ہے مسلمانوں کے ہاتھ میں رہیں گے تو یہود ونصاریٰ ان کے زیر اثر رہیں گے، جو مغرب پر قابض ہیں، اور اگر یہود ونصاریٰ کے ہاتھ میں ہوں گے تو مسلمانوں کا ان کے زیر اثر رہنا لازمی ہوگا، جن کا رسوخ واثر مشرق میں ہے، اس لیے شرعی ہدایات میں، ان مرکزوں پر اسلام اور مسلمانوں کو قبضہ وتصرف قائم رکھنے پر زور دیا گیا ہے''۔(۴)

مقامات مقدسہ کے تعلق سے حضرت نے بڑی وضاحت سے یہ نقشہ کھینچا اور شرعی، عقلی اور تاریخی دلائل سے اس کی معنویت ثابت کی، یہ نقشہ اور اس کی تفصیلات حضرتؒ نے اپنی کتاب مقامات مقدسہ کے ۵۰۷ صفحات میں بہت تفصیل سے بیان کیا، جن میں شرعی دلائل کی جلوہ گری ہے تو عقلی دلائل ولطائف کا انبار ہے، تاریخی واقعات واحوال سے بھی استناد ہے اور عصر حاضر کے سیاسی اتار چڑھاؤ کی حکیمانہ تشریح بھی ہے؛ جس کی وجہ سے یہ نقشہ صرف ایک مصنف کا خیال نہ رہ کر، ایک اہم دینی مسئلہ اور تاریخی حقیقت بن جاتا ہے اور مقامات مقدسہ سے مسلمانوں کا تعلق کسی ایک عبادت میں محصور نہ ہوکر، ہر وقت کی دینی اور سیاسی ضرورت بن جاتا ہے۔

حضرت کو اس نقشہ پر شرح صدر تھا، انہوں نے اپنی عمر عزیز کے قیمتی سال اس میں صرف کیے اور اپنی تقریر وتحریر میں اس کی وضاحت کرتے رہے، مصر کی کانفرنس میں حضرت نے اس کی طرف بہت ہی جامع الفاظ اور دردانگیز اسلوب میں اشارہ کیا، جس کو کانفرنس کی انتظامیہ نے نوٹ کیا اور اپنی روداد میں اسے خاص جگہ دی، چناں چہ روداد کی رپورٹ میں یہ بات بڑی اہمیت سے لکھی گئی کہ: ”**السيد محمد طيب الهندبعد أن تناول طرفًا من تاريخ الإسلام أشار بصفة خاصة إلى أن المسلمين جميعا يعقدون آمالا كبارا على وحدة وتكتل مصر والشام والحجاز، فالحجاز مركز العبادة وإبراز الإسلام، والشام مركز الشوكة الإسلامية، ومصر مركز القوة العسكرية**“. (۵)

مصر سے واپسی کے بعد حضرت نے مقامات مقدسہ لکھنا شروع کیا، جو چھ سال میں پوری ہوئی، بعد میں بھی حضرت نے کتاب پر نظر ثانی کی اور اس وقت تک بعض اندیشے حقائق بن کر نظروں کے سامنے کھڑے تھے۔

مقامات مقدسہ کے تعلق سے مسلمانوں کی مجرمانہ غفلت

مقامات مقدسہ کی مرکزیت اور اہمیت واضح کرنے کے بعد حضرت نے اس تعلق سے مسلمانوں کی مجرمانہ غفلت کا بھی خوب تذکرہ اور تجزیہ کیا ہے، حضرت نے لکھا کہ مسلمان تو ان مراکز کی اہمیت کو نہیں سمجھ سکے؛ لیکن یہود ونصاریٰ نے اس کی مرکزیت کو سمجھا اور اپنے سازشی ذہن اور مکاریوں سے مقامات مقدسہ کو اپنے زیر اثر لانے کی کوشش کرنے لگے۔

حضرت کی کتاب مقامات مقدسہ کا یہ اقتباس پڑھیے اور حضرت کی نکتہ رسی اور دوراندیشی کی داد دیجیے:

”لیکن بصد حسرت وافسوس کہنا پڑتا ہے کہ مسلمانوں نے ان تینوں عالمی مرکزوں (مصر، شام اور حجاز) کے

بارہ میں دھوکا کھایا اور مغربی شاطروں کی چالوں میں آ کر ان کی اجتماعی مرکزیتوں کو تباہ کر ڈالا، افسوسناک حادثہ یہ ہے کہ مسلمان تو ان کی سیاسی سازشوں کو نہ بھانپ سکے؛ مگر ان شاطروں نے بھانپ لیا کہ وسط دنیا کے یہ تین ہمہ گیر مرکز، جس کے زیر اثر ہوں گے وہی مشرق و مغرب پر اثر انداز ہوگا؛ مگر ساتھ ہی وہ یہ بھی جانتے تھے کہ وہ ان ممالک کی جغرافیائی حیثیت سے گو فائدہ اٹھا سکتے ہیں مگر ان کی مذہبی تقدیس اور ان کی دینی حیثیت پر قابو نہیں پا سکتے، جو مسلمانوں کے دلوں میں عقیدتاً رچی ہوئی ہیں اور وہی ان کے عالمی اثرات کا اب بھی قدرتی ذریعہ بنی ہوئی ہے، اس لیے جب تک اس حیثیت کو ان کے دلوں سے محو یا مضمحل کر کے ان ممالک کو محض وطنی یا مروجہ ملکی اور جغرافیائی خطوں کی حیثیت میں نہ لے آیا جائے، انہیں اپنے اثرات کا کھلونا نہیں بنایا جا سکتا، اس لیے انہوں نے ابتداء میں بہت سادہ الفاظ میں دین، مذہب، شریعت اور دھرم کی عنوانوں کی جگہ قوم، وطن، نسل، رنگ اور زبان وغیرہ کے خوشنما نعروں کی داغ بیل ڈالی اور ان میں جاذبیت پیدا کرنے کے لیے دوسرے قدم پر اپنا اپنا خطہ اپنا اپنا اقتدار کا سرسبز باغ دکھلانا شروع کیا جو نفسیاتی طور پر جذبات کو اپیل کرتا ہے، ظاہر ہے کہ جب عرب و عجم اور بالخصوص عربوں میں روحانیت کے بجائے اس وطنی مادیت کی بھوک نے لے لی اور کتنی ہی پارٹیاں ان معاشی نعروں کے نام پر بن گئیں تو طبعی طور پر مسلمانوں ذہنی انقلاب رونما ہوا، اور عیاران فرنگ کا یہ منصوبہ بھی بآسانی پورا ہو گیا، اور ان پارٹیوں کی سطح بیں نگاہوں میں ان ہر سہ عالمی مراکز کی مذہبی اجتماعیت ختم ہو کر خطہ واری وطنیت کے دائرے میں آ گئی اور یہ مقدس مقامات بھی عام ملکوں کی طرح ایک ملک اور وطن کی حیثیت سے دیکھے جانے لگے، نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کے قلوب سے ان کی وہ عالمی مرکزیت یا مذہبی اجتماعیت اوجھل ہو گئی جو اسلامی نقطۂ نظر سے ان کے عالمی اتحاد اور عالمی نظام کی بنیاد تھی اور شاطروں کی اس گندم نمائی اور جو فروشی سے فریب خوردہ ہو کر مسلمانوں نے ان مقامات مقدسہ کے اقتدار کی روح اور تاثیری قوت خود اپنے ہی ہاتھوں سے کھو دی، بالفاظ دیگر جو کام دشمنانِ انسانیت آگے آ کر خود نہیں کر سکتے تھے وہ مسلمانوں ہی کے ہاتھوں انہوں نے کرایا اور ظاہر ہے کہ جب یہ مقدس خطے بھی دنیا کے عام ملکوں اور جغرافیائی رقبوں کی طرح ہو گئے، جس سے اسلام کے اتحاد عالمی اور نظم کا رشتہ قائم نہ رہا، تو ان وطنی بازیگروں نے ان کی مرکزیت سے اپنے کام نکالنے شروع کر دیے اور وہ مرکزیت ان کے کام آنے لگی، جو اسلام کے لیے وضع ہوئی تھی، جس کا خطرناک نتیجہ یہ نکلا کہ ان مقدس خطوں میں اغیار کے اثرات پہونچ گئے اور مسلمانوں کا ان پر اقتدار سراب کی مانند نمائشی ہو کر رہ گیا کہ یہ خطے ان کے رسوخ اقتدار سے آزاد ہیں اور اگر کچھ باقی بھی رہا تو وہ اقتدار اکثر و بیشتر بقدرۃ

الغیر ہے، جس میں خود اختیاری اور خود اقتداری کا جوہر برائے نام ہی رہ گیا ہے، خواہ وہ مصر وشام ہو یا حجاز؛ چہ جائے کہ دوسرے عربی خطے جس کے تاریخی شواہد موجود ہیں اور ہمیں کھلے دل سے اس کا اعتراف کرنا چاہیے کہ یہ سب کچھ ہمارے ہی ہاتھوں ہوا''۔(٦)

حضرت نے کتاب میں اسی پر اکتفاء نہیں کیا؛ بلکہ حجاز مصر اور شام کس کس طرح غیروں کے تصرف میں آئے اور غیروں نے کس کس طرح مسلمانوں ہی کے ہاتھوں ان کی مرکزی شان کو مجروح کیا، یہ سب باتیں بڑی تفصیل سے قلم بند کیں۔

مستقبل کا پروگرام

حضرت نے تمام مسلمانوں سے بالخصوص ان ممالک کے باشندگان سے اپیل کی ہے کہ وہ مغربی اصطلاحوں سے متاثر نہ ہوں، وہ نئے انداز سے اپنا سفر شروع کریں، عربوں کو یقین دہانی کرائی کہ وہ یہ سمجھ لیں کہ ان کی قسمت کا فیصلہ ہو چکا ہے اور وہ دین محمدی سے وابستگی ہے، لہٰذا عربوں کو ایک نئے حوصلے اور ولولے کے ساتھ، دین محمدی کی قیادت اور اس کی ذمہ داریوں کے لیے تیار ہونا چاہیے، ان کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ مقاماتِ مقدسہ کو محض ملک یا جگہ کی حیثیت سے نہ دیکھیں اور نہ انہیں دوسرے خطوں پر قیاس کریں؛ کیوں کہ یہ مقامات، اسلام کا گہوارہ ہیں، انسانیت کی جائے پناہ ہیں، عالمی قیادت کا مرکز ہیں اور پوری ملت کے لیے روشنی کا مینار ہیں، اسلامی حمیت میں کمزوری اور مقامات مقدسہ کے تعلق سے غفلت کے نتائج، عربوں سمیت پورے عالم اسلام اور مسلمانوں کے لیے خطرناک اور دوررس ہوں گے، ان ممالک کی مرکزیت، اسلامی شان وشوکت کے لیے سرمایۂ حیات ہے، اور ملت اسلامیہ کی ترقی کی روح ہے۔

بقول شاعر مشرق علامہ اقبالؒ:

یہ نکتہ پہلے سکھایا گیا کس امت کو — وصالِ مصطفوی، افتراقِ بولہبی
نہیں وجود، حدود و ثغور سے اس کا — محمدِ عربی سے ہے عالمِ عربی

حضرتؒ کا احساس ہے کہ عرب اب دشمنان کی چالبازیوں کو سمجھنے لگے ہیں اور تدارک کے لیے ہاتھ پیر چلانا شروع بھی کر دیا ہے؛ لیکن اب بھی اس کے لیے مناسب تدبیر اور وسائل واسباب کا مناسب استعمال سے وہ کوسوں دور ہیں، جب کہ دشمنان نت نئے حربے کے ساتھ کمربستہ ہیں اور پیہم حملہ زن ہیں، اس لیے موجودہ صورت حال میں مقاصد کا حصول کافی دشوار ہے۔

اسی لیے حضرتؒ نے اس رخ پر کام کرنے کے لیے ایک انتہائی جامع نقشہ اور لائحۂ عمل مرتب فرمایا،

جس میں سات دفعات ہیں، جن کو پیش نظر رکھ کر اگر کام کی ترتیب بنائی جائے تو امید ہے کہ بلادِ اسلامیہ پھر صحیح رخ پر گام زن ہو سکیں گے، حضرتؒ رقم طراز ہیں: ''یہ نسخۂ علاج بطور خلاصہ سات دفعات میں یہ ہے جو مسلمانوں کی عزت وحرمت اور عالم میں ان کی عالمی محبوبیت وہیبت کا مدار اور منشأ ہے، اور اس کے استعمال اور عملی پیروی سے وہ بارگاہ خداوندی سے خیر امت اور خیر الامم کے لقب کے مستحق ہوئے تھے:

۱۔ دین وسیاست کی وحدت

۲۔ عالمی سیاست بصورت خلافت

۳۔ عالمی دعوت

۴۔ عالمی اخوت

۵۔ عالمی مساوات

۶۔ عالمی امن واتحاد

۷۔ عالمی عبادت وشوکت وعسکریت کی سہ مرکزی وقوت''۔ (۷)

ہر سمجھ دار انسان سمجھ سکتا ہے کہ آج عربوں اور مسلمانوں کی زندگی سے یہ اصول کس قدر غائب اور ان کی نظروں سے کس قدر راوجھل ہیں، بلکہ یہ تمام اصول قرآنی ہیں، انہی اصولوں سے اسلام کے عالمی مقاصد پورے ہوں گے، اس لیے مفکرین امت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اسلام کے عالمی مشن کو سامنے رکھ کر ان اصولوں پر محنت کریں تاکہ پھر سے دنیا میں وہ باد بہاری چل پڑے، جس کا انتظار سالوں سے نہ صرف امت مسلمہ کو؛ بلکہ پوری انسانیت کو ہے۔

حضرت کے نقشۂ مقامات مقدسہ میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ حالات کی تمام تر سنگینیوں اور خطرناکیوں کے باوجود حضرتؒ امت مسلمہ کے روشن مستقبل کے لیے پر امید ہیں، انہیں نصوص شرعیہ کی روشنی میں یقین ہے کہ اسلام کا دوبارہ بول بالا ہوگا، اس کی عالمگیر حکومت قائم ہوگی، اس کا نظام عدل پوری دنیا پر نافذ ہوگا، حضرت کے الفاظ میں: ''خاتمۃ الکلام پر یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ باوجود ان مایوس کن حالات کے اسلام کی رحیم وکریم شریعت نے ایسی بشارتیں بھی دی ہیں جن سے قلوب میں مایوسی یا سستی کی تخم ریزی نہ ہونے پائے؛ بلکہ حقیقی امنگ اور حوصلہ باقی رہے، اور وہ یہ کہ جیسے اسلام کی شریعت بین الاقوامی ہے، اسی طرح اس کا ملک بھی بین الاقوامی اور عالمگیر ہے، جو بلحاظ کیفیت تو قرن اول میں اپنی تبلیغ عام سے بلحاظ شریعت بھی اور بلحاظ ملک وحکومت بھی عالمی ہی راستوں سے ابھرا اور دین وملک قوم بہ قوم اور

ملک مع شریعت کے دنیا کے خطوں میں عام ہوا جیسا کہ اس کی تاریخ شاہد ہے؛ لیکن یہ درجہ ابھی باقی تھا کہ بلحاظ کمیت وتعداد بھی یہ دین وملک اتنا عالمگیر ہو جائے کہ ملک اور شہر ہی نہیں؛ بلکہ ہر ملک کی ہر آبادی کا کوئی گھرانہ باقی نہ رہے کہ اس میں اسلام کا کلمہ داخل نہ ہو جائے؛ تاکہ دین وملک کی مکانی اور افرادی ہمہ گیری نمایاں ہو جائے''۔(۸)

وہ مایوسی اور تاریکی کے عالم میں بھی، امید کا چراغ اور حوصلے کی شمع روشن کیے ہوئے تھے، امید کی یہی کرن تھی کہ انھوں نے مقامات مقدسہ کی عظمت کی بازیابی کا نقشہ بنایا اور امت مسلمہ کے سامنے بڑی حکیمانہ اور منطقی تشریح کے ساتھ، فکر وعمل کی دعوت دی، انہوں نے امت کو اس کا مقام یاد دلایا، پیاسی انسانیت کی حقیقی ضرورت کا احساس کرایا، اجداد واسلاف کی عظمتوں کا حوالہ دیا، بے عملی اور بے راہ روی کی روش کو ترک کر کے اسلامی مشن کا علم بردار بننے کا پیغام دیا، حضرت کی دعوت کا خلاصہ شاعر مشرق کے الفاظ میں یہی تھا کہ:

چشمِ اقوام سے مخفی ہے حقیقت تیری ہے ابھی محفلِ ہستی کو ضرورت تیری
زندہ رکھتی ہے زمانے کو حرارت تیری کوکبِ قسمتِ امکاں ہے خلافت تیری
وقتِ فرصت ہے کہاں، کام ابھی باقی ہے نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

............❖............

(۱) مقامات مقدسہ، ص ۱۳
(۲) مقامات مقدسہ، ص ۵۲
(۳) مقامات مقدسہ، ص ۶۵۶
(۴) ایضا، ص ۶۵۶
(۵) مقامات مقدسہ، ص ۱۷
(۶) مقامات مقدسہ، ص ۶۷۶۔۶۷۷
(۷) مقامات مقدسہ، ص ۷۳۲
(۸) مقامات مقدسہ، ص ۷۳۵

............❖............

حضرت حکیم الاسلامؒ
اور
تاسیس مسلم پرسنل لاء بورڈ

مولانا محمد اظہار الحق قاسمی
استاذ دارالعلوم وقف دیوبند

اس فناء پذیر کائنات میں خلعت دوام ان ہی کو حاصل ہوتی ہے جو اپنی انفرادیت اور امتیاز کے دیے جلائے جاتے ہیں, جو اقلیم سخن کے تاجدار اور علم وعمل، فکروفن کے شہسوار ہوتے ہیں، جن کے فیض سے سیر تیں بنتی اور ڈھلتی ہیں وہ عزوافتخار کی پیشانی پر طرۂ امتیاز بن کر ہمیشہ زندہ وجاوید رہتے ہیں۔

حکیم الاسلامؒ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی شخصیت ان ہی دوائر علمیہ کی ایک ایسی آفاقی اور ہمہ جہت حیثیت کی تھی جن کی قابل تقلید زندگی، جہد مسلسل، حسن عمل، اخلاص ووفاء اور جذب وتحمل سے عبارت کے ساتھ دیگر بہت سے حسین عنوانات سے لبریز تھی، یقیناً ان کی حیات کا ہر باب بحر بیکراں اور بعد والوں کے لئے نشانِ منزل ہے، حضرت حکیم الاسلامؒ کی حیات کا ایک عظیم الشان باب تو دارالعلوم دیوبند کا ساٹھ سالہ دورِ اہتمام ہے، مزید برآں تحفظ دین وشریعت اور دفاع دین کی خاطر آپ کی عظیم و ناقابل فراموش خدمات بھی تاریخ کا ایک عظیم باب اور بعد والوں کے لئے مشعل راہ ہے۔

انقلابِ ہند سے پہلے تحفظ دین

ہندوستان میں مسلم قوانین اور خاص کر مسلم پرسنل لاء کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ مسلم عہد حکومت سے

قبل ہندو عہد میں بھی مسلمانوں کے یہاں شرعی قوانین ہی کا نفاذ تھا اور اس کے لئے منجانب حکومت مسلمان قاضی و والی مقرر ہوا کرتے تھے جسے ''ہنر مند'' یا ''ہنر من'' کہا جاتا تھا۔ قدیم سیاحوں کی کتب میں اس کا ذکر ملتا ہے۔ مغلیہ سلطنت میں بھی ہر قوم کا پرسنل لاء محفوظ رہا اور مسلمانوں پر ان کے شرعی قوانین نافذ رہے۔ انگریزی حکومت کے تسلط کے بعد بھی انہوں نے عدم مداخلت کی پالیسی جاری رکھی لیکن یہ صرف ایک سیاسی حکمت عملی تھی، ان کے دل کی آواز نہیں تھی۔ اس حکمت عملی کے تحت انہوں نے فقہ اسلام کو انگریزی زبان کا جامہ پہنانا شروع کیا، جس کے ذریعہ انہوں نے اہم مآخذ اسلامی بزبان انگریزی تیار کئے، جن حضرات نے قانون اسلامی کے مآخذ کو انگریزی زبان میں منتقل کیا وہ انگریزی زبان سے ناواقف، قانونِ اسلامی کے اصل سرچشموں سے نابلد، شریعت کے مزاج سے ناآشنا ہونے کے علاوہ اسلام کے بارے میں معاندانہ ذہن بھی رکھتے تھے۔ ان مآخذ کی تیاری کے بعد ۱۸۳۳ء اور ۱۸۵۵ء میں گورنمنٹ کی جانب سے دو کمیشن مقرر ہوئے اور دونوں ہی نے یہ تجویز پیش کی کہ مسلمان قاضیوں کے ذریعہ فیصلہ کے طریقے کو موقوف کر دیا جائے اور پھر ۱۸۶۴ء میں ہائی کورٹ ایکٹ کے ذریعہ پرانی عدالتیں منسوخ ہو گئیں اور قاضی کا عہدہ ختم ہو گیا، گویا یہ قانون شریعت کو غیر موثر بنانے کی بالواسطہ کوشش تھی، عہدۂ قضاء کے ختم ہونے کی وجہ سے مسلم پرسنل لاء کی حیثیت کو جو نقصان پہونچا وہ ظاہر ہے، چنانچہ ۱۸۶۶ء میں فوجداری کا قانون ختم ہوا پھر قانون شہادت اور قانون معاہدات منسوخ ہوئے اور بالآخر مسلمانوں کے معاشرتی قوانین میں تبدیلی کی راہیں ہموار کی جانے لگیں۔

قیام دارالعلوم دیوبند کے بعد

۱۸۶۶ء میں قیام دارالعلوم دیوبند کے ساتھ ہی حضرت نانوتویؒ نے عائلی قوانین کے اجراء کی فکر کی اس لئے کہ دارالعلوم دیوبند ایک تعلیمی ادارہ کے ساتھ ساتھ ایک علمی اور دینی تحریک بھی تھی، جہاں اشاعت علوم نبویؐ کے ساتھ اسلامی تہذیب وتمدن کی بقاء اور تحفظ شریعت کی جدوجہد بھی، اس تحریک کا ایک مؤثر اور قابل ذکر حصہ تھا۔ چنانچہ حضرت نانوتویؒ نے دارالعلوم دیوبند میں ہی غیر رسمی انداز سے عہدہ قضاء قائم فرمایا جس کے لئے حضرت مولانا یعقوب صاحب نانوتویؒ بحیثیت قاضی مقرر ہوئے، جس کے تحت پرسنل لاء کے عائلی مسائل اور الجھے ہوئے معاملات شرعی اصول پر طے ہونے لگے۔ بالآخر تغیر احوال نے اس نظام کے دور بھی ختم کر دیا لیکن تحفظ مسلم پرسنل لاء کی جو داغ بیل حضرت نانوتویؒ نے ڈالی تھی وہ دلوں کی زمین میں قائم ہو چکی تھی۔

ابھی انگریزی اقتدار پر نصف صدی بھی نہ گذری تھی کہ ہندوستانیوں میں سیاسی حقوق طلبی کا داعیہ پیدا

ہوا، عامۃً سیاسی جماعتوں نے سیاسی مطالبات شروع کئے اور مذہبی مطالبات نظر انداز کردیئے جس سے دینی حقوق یعنی پرسنل لاء کے کالعدم ہونے کا اندیشہ پیدا ہوا، پیش آمدہ احوال کے مدنظر فخر الاسلام حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ مہتمم خامس دارالعلوم دیوبند کی سربراہی میں علماء دیوبند کا ایک وفد میمورنڈم لے کر دہلی پہونچا۔ جس میں یہ صراحت تھی کہ مسلمانوں کے عائلی مسائل میں گورنمنٹ کوئی ایسا ایکٹ وضع نہ کرے جو شرعی قوانین سے متصادم ہو۔ ساتھ ہی یہ مطالبہ بھی تھا کہ ہندوستان میں پرسنل لاء کے اجراء کے لئے محکمہ قضا قائم کیا جائے، چوں کہ مسائل شرعیہ کی تنفیذ کے لئے مسلم حاکم شرط ہے، اس لئے قاضیوں کا انتخاب اہل سنت والجماعت سے ہو اور اس کونسل میں ہر فرقہ کے علماء نمائندے اور ممبر ہوں اور مسائل کا فیصلہ ہر فرقہ کے اپنے فقہی اصول کی بنیاد پر ہو۔

دوسرا مطالبہ یہ تھا کہ مذہبی شعائر، مساجد، مدارس، مقابر، اوقاف، خانقاہوں اور دیگر دینی رفاہِ عام کے اداروں کی حفاظت ونگرانی اور نظم ونسق کے لئے شیخ الاسلام کا عہدہ قائم کیا جائے جو تمام شعائر کو تنظیم کے ساتھ لے کر چلنے کا ذمہ دار ہو۔ ان مطالبات پر اس وقت کے پانچ سو علماء نے توثیقی دستخط ثبت فرمائے۔

۱۹۲۹ء میں مسلم اوقاف کی تنظیم کا مسئلہ اٹھا جو پرسنل لاء ہی کا ایک جز تھا۔ گورنمنٹ نے ایک کمیٹی مقرر کی جس نے اوقاف سے متعلق استفسارات ملک کے مختلف حلقوں میں بھیجے، یہ استفساری مراسلہ دارالعلوم کو بھی موصول ہوا، جس کا جواب اس وقت دارالعلوم دیوبند کے مہتمم سادس حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی نے دیا۔

۱۹۳۰ء میں حضرت حکیم الاسلامؒ سے دارالعلوم دیوبند کے اہتمام کی سپردگی کے بعد مراسلت کا سلسلہ حضرت حکیم الاسلامؒ سے قائم ہوا، اس دورانیہ میں حضرت نے مسائل وقف سے متعلق تفصیلات مرتب کرائیں، علاوہ ازیں اس موقع سے حضرت نے بذاتِ خود ''انصاف فی قانون الاوقاف'' نامی رسالہ بھی پوری جماعت کی طرف سے مرتب فرمایا جس پر تمام اکابر علماء کے دستخط ثبت ہوئے۔ یہ تمام کارروائی ایک کتابچہ کی صورت میں بھی طبع کرائی گئیں اور ممبران اسمبلی کے نام بھی روانہ کی گئیں۔ اسی دور میں شاردا ایکٹ کا مسئلہ اٹھا جو پرسنل لاء کا ایک مستقل جزء تھا۔ اسی موقع سے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ نے مستقل رسالہ مرتب فرمایا جس میں شاردا بل کے بنیادی محرکات اور عمر نکاح کے شرعی قانون میں ترمیم کئے جانے کی تردید کے ساتھ پیش کردہ اشکالات کا حل بھی تھا۔ ادھر عائلی مسائل کو قوانین شرع کے مطابق طے کرنے کے لئے حضرت مولانا محمد سجاد صاحبؒ نے بہار میں ''امارتِ شرعیہ'' قائم فرمائی۔ یہ امارت گویا مسلم پرسنل لاء کی عملی صورت تھی۔ آزادیٔ ہند سے کچھ قبل علماء دیوبند کی طرف سے

حضرت تھانویؒ نے رسالہ ''الحیلۃ الناجزۃ'' شائع فرمایا، جس کی بنیاد پر حضرت حکیم الاسلامؒ نے دارالعلوم دیوبند میں علماء کی ایک کمیٹی قائم فرمائی، جس نے مسلم پرسنل لاء کے تحفظ کے باب میں اصول شرع کی روشنی میں فیصلے کر کے سینکڑوں عورتوں کی مشکلات کا قرار واقعی حل پیش فرمایا، گویا ایک طرف دارالعلوم دیوبند تعلیمی محاذ سر کرتے ہوئے ترقیات کی طرف گامزن تھا وہیں دوسری جانب ملت اسلامیہ ہندیہ کی دینی قیادت اور تحفظ دین کا فریضہ انجام دے رہا تھا۔(۱)

انقلاب ہند کے بعد

آزادئ ہند کے بعد دستور ہند میں اقلیتوں کو اپنے مذہب پر عقیدہ رکھنے، عمل کرنے اور تبلیغ کرنے کے حق کو تسلیم کیا گیا۔ گویا مذہبی آزادی کے حق نے مسلم پرسنل لاء کے تحفظ کی ضمانت دی۔ معزز عدالتیں اسے تسلیم بھی کرتی رہیں۔ ملکی دستور کے رہنما اصول میں جو ہدایات شامل تھیں اس میں یہ بات بھی تھی کہ ملک میں بتدریج یکساں سول کوڈ نافذ کرنے کی کوشش کی جائے گی حالاں کہ دستور ساز کونسل کے بعض مسلم ممبران نے اعتراض بھی کیا مگر اسے قبول نہیں کیا گیا۔ مسلم اداروں اور زعماء کی آواز کو بھی معمولی اہمیت دی گئی اور سنی ان سنی کردی گئی۔ اس لئے یہ دفعہ جوں کی توں باقی رہی اور پھر تغیر احوال سے حکومت کے تیور سامنے آنے لگے اور اس دفعہ پر عمل کی کوشش بہتر ہوتی گئی۔ ۱۹۵۰ء میں ہندو کورٹ بل پیش کیا گیا، اس موقع پر وزیر قانون نے کہا کہ ہندو قوانین میں جو اصلاحات کی جارہی ہیں اسے ہندوستان کی تمام آبادی پر نافذ کیا جائے گا، گویا ایک بار پھر مسلم عائلی مسائل میں دخل اندازی کی کوششوں کا آغاز ہوگیا۔ ساتھ ہی اپنے آپ کو مسلم کہلانے والے کچھ لوگ بھی پرسنل لاء میں ترمیم وتبدیلی کا نعرہ لے کر کھڑے ہوگئے، جو شرعی مسائل کو لادینی فکر، معاشی اور سیاسی نقطۂ نظر سے دیکھتے اور سوچتے تھے، ان ہی دنوں حکیم الاسلامؒ نے دارالعلوم دیوبند میں پرسنل لاء کا علمی جائزہ لینے اور پیش کردہ شبہات کی جواب دہی کے لئے حضرات اساتذہ وارباب افتاء کی ایک کمیٹی بنام ''پرسنل لاء کمیٹی'' بنائی۔ ارکانِ کمیٹی کے لئے آپ نے چند امور بطور اصول بھی مرتب فرمائے تا کہ ان کی روشنی میں مدلل دفاع کا فریضہ انجام دیا جاسکے۔ امکانی حد تک پرسنل لاء کے زیر بحث مسائل کی جمع وترتیب کے ساتھ اشکالات وشبہات کے شرعی جوابات کا مواد فراہم کر کے مرتب کردیا گیا، گویا حضرت حکیم الاسلامؒ نے بایں طور تحفظ مسلم پرسنل لاء کے باب میں ایک اہم پیش رفت فرمائی۔

۱۹۶۲ء میں مہاراشٹرا اسمبلی کے ایک مسلم ممبر حسن علی حمدانی کی جانب سے ایک سے زائد شادی پر پابندی کے عنوان سے مسلم پرسنل لاء میں تبدیلی کو ایک باقاعدہ بل کی شکل میں پیش کیا گیا، گویا اس طرح ایک بار پھر

مسلم پرسنل لاء پر براہِ راست کھل کر حملہ کیا گیا، جس کے ذریعہ دفعہ ۴۴ کی آڑ میں پوشیدہ ارادے بھی کھل کر سامنے آگئے۔ پھر بات یہیں ختم نہیں ہوئی بلکہ مرکزی وزیر قانون نے مسلم پرسنل لاء میں اصلاحات کی خاطر کمیشن کے تقرر کا اعلان کر دیا، پھر حکومت سے وابستہ افراد نے بالواسطہ یا بلا واسطہ مسلم پرسنل لاء کے خلاف اپنے خیالات کا اظہار کرنا شروع کیا۔ اس موقع پر تمام جماعتوں، اداروں، تحریکوں حتیٰ کہ عوام وخواص کے ہر گروہ نے اور ہر طبقہ نے حکومت کے ارادوں کو بھانپ لیا اور اصلاح کے نام سے پرسنل لاء کے خاتمہ کے منصوبوں کی مذمت کی، ہر قسم کی ترمیم واصلاح کو مداخلت فی الدین قرار دے کر مسلم پرسنل لاء کی جگہ یکساں سول کوڈ یا اس کے مماثل قانون کے نفاذ کو مسلمانوں کے لئے نا قابل قبول قرار دیا لیکن مسلمانوں کا یہ ملک گیر احتجاج بھی صدا بصحرا ثابت ہوا اور ۶ ستمبر ۱۹۶۴ء کو مہاراشٹر اسمبلی میں یک زوجگی کے نفاذ پر بل پیش ہوا۔ ۷ جولائی ۱۹۷۲ء میں دوبارہ ایک سے زائد شادی پر پابندی کی آڑ میں مسلم پرسنل لاء میں تبدیلی کا بل پیش ہوا اور اس طرح ایک بار پھر مسلم پرسنل لاء کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا، طرح طرح کے مفروضہ من گھڑت اور مضحکہ خیز دلائل کی آڑ لے کر شریعت اسلامی کو نشانہ بنایا گیا۔ وہیں ان ہی دنوں ۱۹۷۲ء میں راجیہ سبھا میں متبنیٰ بل پیش ہوا، جس میں وزیر قانون نے یہ اعلان کیا کہ یہ قانون یکساں شہری قانون کی حیثیت سے تمام شہریوں پر نافذ ہوگا یعنی اس کا اطلاق ملک کے تمام شہریوں پر بشمول مسلمان کے ہوگا۔

یہ وہ احوال تھے جس سے ملت اسلامیہ ہندیہ دوچار تھی، ادھر مسلمانوں کی ہر جماعت، تنظیم اور اداروں نے پرزور الفاظ میں یہ اعلان شروع کیا کہ مسلم پرسنل لاء میں تبدیلی دین اسلام میں مداخلت ہے۔ یکساں سول کوڈ یا اس کے مماثل کوئی قانون مسلمانوں کے لئے نا قابل برداشت ہے۔

تاسیس مسلم پرسنل لاء بورڈ

دارالعلوم دیوبند جو ملتِ اسلامیہ ہندیہ کا دھڑکتا ہوا دل اور مسلمانوں کا ایک عظیم دینی واسلامی قلعہ ہے، اس نے مسلمانانِ ہند کو پیش آمدہ مسائل کے حل سے کبھی اپنے قدم پیچھے نہیں ہٹائے، بلکہ دینی مسائل کے حل کے ساتھ ملی قیادت کا فریضہ بھی انجام دیا، اسلامی احکام اور شریعت کے دفاع میں سینہ سپر رہا اور قابل قدر کارنامہ انجام دیا جس کے لئے آزادی ہند سے پہلے بھی مسلم پرسنل لاء کے سلسلے میں جدوجہد کرتا رہا۔ چنانچہ حضرت حکیم الاسلامؒ نے ۱۳،۱۴ مارچ ۱۹۷۲ء کو دارالعلوم دیوبند میں ایک نمائندہ اجتماع منعقد کیا، جس میں حضرت حکیم الاسلامؒ نے درج ذیل ارکان بطور خاص مدعو کئے۔

(۱)حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب (۲)حضرت مولانا منت اللہ رحمانی صاحب (۳)حضرت مولانا سعید احمد اکبرآبادی صاحب (۴)حضرت مولانا حامد الانصاری غازی صاحب (۵)ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب (۶)جناب بشیر احمد ایڈوکیٹ صاحب وغیرہم۔اس خاص اجتماع میں مسلم پرسنل لاء سے متعلق تمام امور زیر بحث آئے۔ان اعتراضات پر بھی غور وخوض کیا گیا جو مسلم پرسنل لاء کو بدنام کرنے کے سلسلے میں اٹھائے جارہے تھے۔نیز قوانین شرعیہ کے نہ صرف دفاع اور تحفظ بلکہ تحفظ کے حقیقی راستے یعنی ان کے عملی نفاذ کے طریقوں پر بھی غور کیا گیا۔

اس اجتماع کے بعد ایک مشترکہ بیان شائع کیا گیا جس میں کہا گیا کہ:

''اسلام ایک کامل اور مکمل دین ہے،اس کا نظام انسانی زندگی کے تمام ہی شعبوں پر حاوی نیز ہر دور اور ہر ملک کے انسانوں کے لئے یکساں طور پر فلاح کا ضامن ہے۔اسلام کی بنیادی کتاب قرآن کریم ہے اور اسلامی نظام کی واضح اور کامل تعبیر وتشریح سنت رسول اللہ ﷺ ہے۔''مسلم پرسنل لاء'' کے تحت جو معاملات آتے ہیں اور جس کے بارے میں اصل قانون شریعت نافذ ہے۔اس اجتماع کے خیال میں وہ خالصتاً مذہبی معاملات ہیں،جس پر امت کی امتیازی حیثیت اور ملی وتہذیبی انفرادیت کی بقاء موقوف ہے۔قانون شریعت ''مسلم پرسنل لاء'' کے بجائے مشترکہ سول کوڈ کے نفاذ کی کوشش یا بالواسطہ قانون سازی کے ذریعہ مسلم پرسنل لاء کو آہستہ آہستہ ختم کرنے کی کوشش، مذہب وتہذیب کی آزادی پر حملہ ہوگا جسے مسلمانانِ ہند کسی قیمت پر گوارہ نہیں کرسکے''۔(۲)

علاوہ ازیں طویل ترین بیان جاری کیا گیا،حضرت حکیم الاسلامؒ کی قیادت میں دارالعلوم دیوبند کا یہ اجتماع ملت اسلامیہ کے وجود کے لئے ایک تاریخ ساز کنونشن کا نقطہ آغاز بن گیا۔اسی اجتماع میں مسلم پرسنل لاء کنونشن کے انعقاد کے لئے ایک تیاری کمیٹی بنائی گئی جس کے کنوینر حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحب مدظلہ مقرر ہوئے۔اس کنونشن کا ہدف تھا کہ مسلم پرسنل لاء کے سلسلے میں اٹھائے جانے والے اعتراضات کا علمی اور تحقیقی جواب دینا، نیز مسلمانوں کی تمام جماعتوں اور مکاتب فکر اور طبقات فکر پر مشتمل ایک آل انڈیا پیمانہ کا کنونشن منعقد کرنا۔

مسلم پرسنل لاء میں تبدیلی کا مشورہ بمبئی سے اٹھا تھا تو اس وقت مہاراشٹر کی مسلم جماعتوں نے اس کی مذمت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، اسی کے پیش نظر تیاری کمیٹی کی نظریں کنونشن کے لئے بمبئی کی طرف اٹھنے لگیں۔۲۱ر اگست ۱۹۷۲ء کو اس کمیٹی کے ۱۴ر ارکان کا ایک وفد حضرت حکیم الاسلامؒ کی معیت میں بمبئی پہنچا۔پھر

۲۴/اگست ۱۹۷۲ء کو مسلمانانِ بمبئی کا ایک نمائندہ اجتماع منعقد ہوا، اس اہم اور تاریخی اجتماع میں بالاتفاق ایک آل انڈیا مسلم پرسنل لاء کنونشن کے شہر بمبئی میں انعقاد کا قطعی اور آخری فیصلہ لیا گیا، جس طرح مہاراشٹر سے مسلم پرسنل لاء کے خلاف آواز بلند ہوئی تھی، اسی طرح مہاراشٹر سے مسلم پرسنل لاء کے تحفظ کے لئے ایک تاریخ ساز قدم بڑھا اور اسی اجتماع میں کنونشن کی انتظامیہ کمیٹی کا قیام عمل میں آیا۔ انتظامیہ کمیٹی نے ناگزیر اقدامات کئے اور اس کے اقدامات سودمند ثابت ہوئے، پھر انتظامیہ کمیٹی کی ایک عام نشست میں انتظامیہ کمیٹی کو باقاعدہ مجلس استقبالیہ میں تبدیل کر دیا گیا۔ بالآخر ۲۷/۲۸/دسمبر ۱۹۷۲ء کو سرزمین بمبئی میں ایک تاریخ ساز کنونشن منعقد ہوا، جس کو مسلمانانِ ہند کے تمام مکاتب فکر کی بھرپور تائید حاصل ہوئی اور اس اجلاس میں باتفاق رائے آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے قیام کا فیصلہ لیا گیا اس اجلاس میں برصغیر ہند نے اتحاد امت کا ایسا نظارہ اس سے قبل نہیں دیکھا تھا، اس اجتماع میں شرکت کرنے والے تمام ہی مکاتب فکر کی نمائندہ شخصیات تھیں، اس اجلاس میں حضرت حکیم الاسلامؒ نے تمام حاضرین کے شکریہ کے ساتھ ایک طویل ترین تاریخ ساز خطبۂ صدارت پیش فرمایا، ۷/اپریل ۱۹۷۳ء کو حیدرآباد میں منعقدہ اجلاس میں بورڈ کی باضابطہ تشکیل عمل میں آئی، جس میں باتفاق رائے حضرت حکیم الاسلامؒ بورڈ کے پہلے صدر اور حضرت مولانا منت اللہ رحمانی صاحبؒ پہلے جنرل سکریٹری منتخب ہوئے۔ گویا مسلم پرسنل لاء کے تحفظ کے لئے حضرت نانوتویؒ کے دور سے جاری جدوجہد اور پھر حضرت حکیم الاسلامؒ کی تڑپ، سعی پیہم اور جہد مسلسل نے ایک تحریک کی شکل اختیار کرکے ایک مستحکم تنظیم کی صورت میں معرض وجود میں آئی۔ یعنی بورڈ کا قیام مسلم پرسنل لاء بورڈ کے تحفظ کے لئے عرصے سے جاری کوششوں کا تتمہ تھا۔ گویا بایں معنی بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ حضرت حکیم الاسلامؒ کی ذات ہی قیام آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کی اولین محرک اور ذریعہ بنی، جن کی آفاقی متفق علیہ شخصیت نے تمام مسالک ومکاتب کی نمائندہ شخصیات کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دیا، تحفظ دین وشریعت یعنی تحفظ مسلم پرسنل لاء کے باب میں یہ آپ کا ایسا عظیم الشان کارنامہ ہے جسے فراموش کرنا یقیناً عظیم ناانصافی ہے، تا قیام قیامت بورڈ سے تحفظ مسلم پرسنل لاء کے باب میں ہو رہی کوششوں (چاہے ان کا تعلق متبنی بل کی واپسی سے ہو یا نسبندی کے مسئلہ سے، اوقاف پر انکم ٹیکس کے مسئلہ ہو یا شاہ بانو کیس یا بابری مسجد کا معاملہ، ملت کی رہنمائی کے لئے مسلم پرسنل لاء کے تحت نظامِ قضاء کا قیام ہو یا اصلاح معاشرہ اور تحفظ دین کے لئے دیگر کوششیں) کا اجراء انشاء اللہ حضرت حکیم الاسلام علیہ الرحمہ کو پہنچتا رہے گا۔

............❖............

(۱) ماخوذ از خطبۂ صدارت، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ، بموقعہ تاسیس آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ)
(۲) ماخوذ از خطبۂ صدارت، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ، بموقعہ تاسیس آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ)

حجۃ الاسلام اکیڈمی دارالعلوم وقف دیوبند

اسلام نے اپنی تاریخ میں ہرآن اور ہرلمحہ یہ ثبوت پیش کیا ہے کہ اس کا چمن ہر موسم میں نئے نئے پھول کھلاسکتا ہے۔ عقل وادراک کے کارواں نے سے نقل ووحی کی روشنی میں سفر شروع کیا ہے، اس کے سامنے علم وحکمت، فکر وبصیرت اور فضل وکمال کی ایک وسیع الآفاق کائنات بے نقاب ہوتی چلی گئی۔ عقل ونقل کے اس حیرت زدہ ارتباط، اور روایت ودرایت کے اس محیر العقول اتفاق نے ابتدائے اسلام میں رجالِ دین کا ایک کہکشانی افق دریافت کیا، جس کو کرۂ ارضی پر ''اصحابِ رسول'' (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے نام سے جانا گیا، اور اس پاکیزہ گروہِ انسانی کے پایۂ استناد کو الم نشرح کرنے کے لیے ربِّ کائنات نے ''رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ'' کی شہادتِ افتخار اور سندِ اعزاز سے سرفراز فرمایا۔

اسلام کے اس عہدِ زریں کے بعد پھر ہر دور میں سیدنا الامام الاعظم ابوحنیفہؒ، سیدنا الامام مالک بن انسؒ، سیدنا الامام الشافعیؒ اور امام غزالیؒ جیسی شخصیات وجود میں آئیں۔ تیرہویں صدی کے موسم اور دینی احوال کے مناسب حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم النانوتوی علیہ الرحمہ کو وجود بخشا۔ حجۃ الاسلام علیہ الرحمہ اس بزم میں گو آخر میں آئے؛ لیکن پیچھے نہیں بیٹھے۔ انہوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں اور حیرت انگیز علم وحکمت کی بلندیوں سے ہر دور کے اساطینِ علم اور رجالِ معرفت کی تصویر پیش کی۔

دار العلوم دیوبند کی تاسیس کے انقلابی کارنامے اور برِّ صغیر میں دین کی وقیع اور رفیع خدمات کے حوالے سے وہ کون شخص ہے، جو ان کے بارِ احسان سے زیر بار، اور ان کے دینی وتعلیمی کارناموں کا منت کش نہیں ہے۔ ضرورت تھی کہ حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم النانوتویؒ کے علوم ومعارف اور افکار کو سہل زبان میں پیش کیا جائے، ان کی شخصیت اور انقلابی کارناموں سے دنیا کو متعارف کرایا جائے۔ یہ ایک ایسا اہم اور گراں قدر کام تھا کہ جس کی انجام دہی حلقۂ دارالعلوم دیوبند، قاسمی برادری اور فکرِ دیوبند کے ہر علمبردار کے کاندھوں پر فرض اور قرض کے درجے سے کم نہ تھی۔

حجۃ الاسلام اکیڈمی کا قیام بھی اسی سلسلہ کی ایک مفید کڑی ہے، حجۃ الاسلام اکیڈمی، دارالعلوم وقف دیوبند کو اس قلیل مدت کے اندر اربابِ علم ودانش کے حلقوں میں جو مقام حاصل ہوا ہے وہ خالص نصرتِ الٰہی ہی ہے، خدا تعالیٰ کے فضلِ عمیم اور احسانِ عظیم کا نتیجہ ہے۔

اہداف ومقاصد

- حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم النانوتویؒ کی شخصیت اور علوم پر تحقیقی کام۔
- علوم قاسمیہ کی تسہیل وتشریح کے ساتھ، علوم قاسمیہ کی روشنی میں جدید کلام کی تدوین کا کام۔
- حجۃ الاسلامؒ کے علوم ومعارف کی درجہ بندی علمی و تحقیقی مناہج پر۔
- حجۃ الاسلامؒ کے افکار اور فکر دیوبند کا صحیح تعارف۔
- حجۃ الاسلامؒ کی دینی بصیرت اور علمی عبقریت کا مبسوط جائزہ۔
- حجۃ الاسلام کے بالاختصاص تلامذہ کا تعارف اور علمی امتیاز کا تحقیقی جائزہ۔
- حجۃ الاسلام تاسیس دارالعلوم دیوبند اور خدمات جلیلہ بھی ایک مستقل موضوع تحقیق۔
- حجۃ الاسلام کی شخصیت عالم اسلام کی نظر میں کے موضوع پر تحقیق۔
- اکابر علماء دیوبند کی علمی وتحقیقی کتابوں کا بزبان عربی وانگلش ترجمہ بھی اولین ترجیحات میں۔
- اہم علمی نوادرات، مختلف موضوعات پر قدیم و جدید عربی کتب کے تراجم کی اشاعت۔
- اکابر دیوبند کی اہم علمی وتحقیقی کتابوں کی تسہیل وتشریح اور تلخیص۔
- شعبہ میں تحقیقی اور تصنیفی ذوق رکھنے والے باصلاحیت فضلاء کا مخصوص تعداد میں داخلہ اور ان سے مقالات لکھوانے کا کام،
- شعبہ کو تحقیق وتصنیف سے گہرا اختصاص او رمناسبت رکھنے والے اہل علم کی خدمات حاصل ہوں گی۔
- اہل علم واہل قلم حضرات کی معیاری نگارشات کے لئے ایک عالمی عربی مجلّہ محکمہ کی اشاعت۔
- عصری اسلوب میں صحافت اور تحریر وتصنیف کی تربیب اور تدریب۔

ISBN 978-93-84775-22-3
9 789384 775223

إحياء تراث السلف
مجمع حجة الإسلام
- للبحث والتحقيق -

Ḥujjat al-Islām Academy
Al-jamia al-Islamia Darululoom Waqf, Deoband
Eidgah Road, P.O. Deoband-247554, Distt: Saharanpur U.P. India
Tel : + 91-1336-222352, Mob: + 91-9897076726
Website: www.dud.edu.in, www.darululoomwaqf.com
Email: hujjatulislamacademy@dud.edu.in, hujjatulislamacademy2013@gmail.com